امداد الفتاویٰ

جدید مبوّب

جلد ۳

فتاوے حکیم الامت

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب جدید

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان

ناشر
ادارہ تالیفات اولیاء دیوبند
یو۔ پی، انڈیا

مبوّب

امداد الفتاویٰ جدید

حصّہ۳ سوم

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

(ولادت ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء — وفات ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء)

—— :. تبویب جدید :. ——

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم پاکستان

—— ناشر ——

ادارہ تالیفات اولیاء دیوبند ضلع سہارنپور (یوپی)

قیمت -/۶۰ روپیہ

نام مصنف حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
ترتیب جدید حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ
مفتی اعظم پاکستان

طابع

تعداد اشاعت ــــــــــــ ۱۰۰۰

ضخامت ــــــــــــ ۶۲۴ صفحات

سن طباعت ــــــــــــ ۱۴۰۱ھ

قیمت مجلد ــــــــــــ ۶۰ روپے

ناشر ادارہ تالیفات اولیاء

ہر قسم کی دینی علمی اصلاحی کتابیں ملنے کا پتہ

ادارہ تالیفات اولیا دیوبند (یوپی)

فہرست امداد الفتاویٰ مبوّب جلد سوّم

کتاب البیوع

السر المکنون

جلد سوم

امداد الفتاوےٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب البیوع

احتکار یعنی غلہ وغیرہ کو گرانی کے انتظار میں روکنے کے احکام

سوال (۱) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین کہ زید نے فصل پر شہر کے شہر میں گندم ہزار پانسو روپے کے خرید کرکے بھر رکھے، کہ عند الموقع فروخت کروں گا، اس عرصہ میں ایسا موقع بھی ہوا کہ اگر فروخت کرتا تو اس کو نفع ہوتا، تاہم انتظار گرانی ہے، سو یہ احتکار ہوا یا نہیں؟ اور اگر یہ احتکار نہیں ہے تو احتکار کی کیا تعریف ہے، اور کیا حکم ہے اس کی نسبت؟

الجواب، اگر اس کے روکنے سے لوگوں کو کچھ ضرر ہوا تو احتکار ہوا، ورنہ نہیں ہوا، کیونکہ احتکار کے معنے روکنا غلہ کا وقت ضرورت خلائق بنظر گرانی اور اس کی مدت میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک ایک ماہ بعض کے نزدیک چالیس روز، غرض یہ کہ جب لوگوں کو ضرورت پڑنے لگے اور روکنے سے ضرر ہونے لگے احتکار ہو جاتا ہے، ثم المدۃ اذا قصرت لایکون احتکاراً لعدم الضرر واذا طالت یکون احتکاراً مکروھا لتحقق الضرر ثم قیل ھی مقدرۃ باربعین یوماً وقیل بالشھر ھدایۃ مختصراً کتاب الکراھیۃ ۱۲ اور احتکار پر حدیث میں بڑی سخت وعیدیں لعنت وجذام و افلاس وغیرہ کی آئی ہیں۔ عن عمر عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال الجالب مرزوق والمحتکر ملعون، عن عمر بن الخطاب قال سمعت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یقول من احتکر علی المسلمین طعامھم ضربہ اللہ بالجذام والافلاس. مشکوۃ کتاب البیوع واللہ اعلم فقط

۲۸ شوال ۱۳۱۰ھ (امداد ثالث ص۱)

لہ اس کی یعنی روکنے کی ۱۲ س

بیع کے وقت قیمت کو دو شقوں میں دائر کرنا

سوال (۲) ایک شخص اپنا مال نقد ایک روپیہ کو فروخت کرتا ہے اور ادھار سترہ آنے کو بیچتا ہے یہ جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب ، اس کی دو صورتیں ہیں ، ایک تو یہ کہ وقت بیع کے ثمن کی تعیین نہیں کی ، بلکہ مشتری سے تردید کے ساتھ کہا کہ اگر اس کی قیمت اسی وقت دو گے تو ایک روپیہ لوں گا ، ورنہ سترہ آنے لوں گا یہ تو بوجہ جہالتِ ثمن کے جائز نہیں ۔

دوسری شکل یہ ہے کہ اول مشتری سے طے کر لیا ہو کہ نقد لیتے ہو یا ادھار ، اگر اس نے نقد لینے کو کہا تب تو ایک روپیہ قیمت ٹھیرائی ، اگر ادھار لینے کو کہا تو سترہ آنے ٹھیرائے ، یہ جائز ہے فی العالمگیریہ رجل باع علی انہ بالنقد بکذا و بالنسیئۃ بکذا او الی شھر بکذا والیٰ شھرین بکذا لم یجز کذا فی الخلاصۃ انتھیٰ جلد ثالث ص۱۳۴ مطبوعہ نولکشوری ، فقط واللہ اعلم ، (امداد ثالث ص۱)

قیمت میں رعایت کرنا یا بالکل چھوڑ دینا موجب ثواب ہے

سوال (۳) اگر کوئی شخص سودے میں خریدار کو بغرض ثواب کم قیمت پر مال دیدے ، مثلاً ۳۵ کوڑی کا مال ۳۰ کوڑی روپے میں دیدے تو کیا اس کمی قیمت پر ثواب ملے گا ، یا قیمت پوری لے کر اور پھر اس میں سے کچھ معاف کردے ، اس پر ثواب ملے گا ، فقط

جواب ۔ دونوں عمل موجب ثواب ہیں ، رعایت فی المعاملہ بھی ، اور ابراء و معافی بھی ، اور ہر ثواب جدا نوع کا ہے ، فقط ، یکم ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۶۰)

بائع کو پیشگی روپیہ دے کر مبیع کو تھوڑا تھوڑا وصول کرنا

سوال (۴) ان قصبات میں اکثر دودھ جو بدھا جاتا ہے قیمت اس میں کبھی پہلے کبھی پیچھے دی جاتی ہے ، اور متفرق طور سے وہ دودھ مالک سے وصول ہوتا ہے ، یہ جائز ہے یا ناجائز ، اگر جائز ہو تو کچھ شرائط بھی اس میں ملحوظ ہیں یا نہیں ؟

الجواب ۔ یہ معاملہ سلم نہیں ہے ، لعدم اجتماع شرائط فیہ ، بلکہ اگر بعد میں روپیہ دیں تب تو بیع نسیئہ ہے ، اور بلا تکلف جائز ہے ، اور اگر پیشگی دیدیں تو اس کے ذمہ قرض ہو جاتا ہے جس کو تھوڑا تھوڑا کاٹ دیتا ہے ، اس کو فقہاء نے مکروہ فرمایا ہے ۔ واللہ اعلم ، یکم ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ (امداد ثالث ص۹)

قصاب کو پیشگی روپیہ دے کر گوشت کا نرخ مقرر کرنا ۔

سوال (۵) یہاں یہ دستور ہے کہ بکر قصاب کو کچھ روپے پیشگی دیدیئے اور گوشت کے دام فی سیر ٹھیرالئے جو بازار کے نرخ سے کچھ کم ہوتا ہے ۔ مثلاً بازار میں ۴ سیر بکتا ہے ، لیکن ۳۰ سیر ٹھیرالیا ، اور گوشت آتا رہا ، اس کی یادداشت رکھی ، اور ختم ماہ پر حساب کردیا ، اور کمی بیشی پوری کر کے بیباقی کردی ، اور آیندہ ماہ کے لئے پھر نقد روپیہ دیدیا اور نیا معاہدہ

بھاؤ کا کر لیا، کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بازار کا بھاؤ ۳۰/ اور ۳/ اور ۲۰/ ہو جاتا ہے، مگر یہ مقررشدہ نرخ بدلا نہیں جاتا، اس کا اگلے مہینے میں لحاظ کر کے بھاؤ مقرر کرتے ہیں، قصاب کو یہ نفع ہوتا ہو کہ اس روپیہ سے بکریاں خریدتا ہے اور گوشت بیچتا ہے، اس کو کسی دوسرے سے روپیہ قرض لینے کی ضرورت نہیں ہوتی، اب غرض یہ ہے کہ کیا یہ جائز ہے؟

الجواب۔ یہ معاملہ حنفیہ کے نزدیک ناجائز ہے، اس لئے کہ جو کچھ پیشگی دیا گیا ہے وہ قرض ہے اور یہ رعایت قرض کے سبب کی ہے، اور بیع سلم کہہ نہیں سکتے اس لئے کہ اس میں کم سے کم مہلت ایک ماہ کی ہونی چاہیے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک چونکہ اجل شرط نہیں، اس لئے سلم میں داخل ہو سکتا ہے، چونکہ اس میں ابتلاء عام ہے، لہٰذا امام شافعیؒ کے قول پر عمل کی گنجائش ہے۔

۱۷ ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۱۲۲)

گوشت کی خریداری بعض شرائط پر

سوال (۶) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ یہاں بکر قصاب ۱۲/ سیر گوشت فروخت کیا کرتا ہے، زید نے بکر قصاب سے یہ کہا کہ دو ڈھائی سیر گوشت روزانہ ہم کو دیا کرو لیکن فی سیر ۸/ کے حساب سے لوں گا، بکر قصاب نے کہا کہ ۵۰/ قیمت پیشگی لوں گا، اور گوشت برابر دیا کروں گا جس وقت پورا ۵۰/ کا گوشت ہو جاوے گا، اور ہم تم برابر ہو جاویں گے۔ اس کے بعد اب پھر دوبارہ نئے سرے سے بعوض قیمت گوشت کے پچاس روپے پیشگی لوں گا، اور یہ بھی اقرار ہوا کہ اگر تمہارے پاس روپیہ نہ ہوا تو بلا پیشگی قیمت کے گوشت برابر دیا کروں گا ایسا لین دین شریعت میں درست ہے یا نہیں، اس سوال کا جواب خالد یہ دیتا ہے کہ ایسا لین دین درست نہیں ہے، قرض دے کر قرض والے سے فائدہ اٹھانا سود ہے۔ اور عمرو اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ یہ قرض نہیں ہے، یہ قیمت گوشت کی ہے، اگر کسی قسم کا قرض ہوتا تو وعدہ پر واپس لینے یا بلا وعدہ ہی واپس لینے کا اختیار زید کو رہتا، اور اس میں واپس لینے کا اختیار زید کو نہیں ہے، یہ شرعاً درست ہے، مولانا صاحب کس کا جواب صحیح ہے اور کس کا غلط ہے؟

تتمہ سوال؂، بکر قصاب نے سب شرط سوال اوّل کے موافق کیا، لیکن فرق اتنا کیا کہ بغیر پیشگی قیمت کے گوشت نہ دوں گا۔

الجواب بعد ضم التتمۃ المذکورۃ، بعد ضم تتمہ مذکورہ جواب یہ ہے کہ یہ معاملہ درست نہیں، اگر یہ قرض ہے تب تو خالد کی دلیل سے درست نہیں، اور اگر یہ قیمت ہے جیسا عمرو کہتا ہے تو اس میں عقد سلم کی شرائط موجود نہیں، اور دوسرا کوئی عقد صحیح نہیں، اس لئے درست نہیں،

۸ شوال ۱۳۳۴ھ (تتمہ خامسہ ص ۳۱۲)

؂ یہ سوال کی شق ثانی (دوسری صورت) ہے ۱۲ س

۵۵۳

فسخ وعدہ در تراجع نرخ وکم کردن قیمت بتراضی

سوال (۷) میں نے ایک گاڑی نمک کے لئے مبلغ پانسو ترپن روپیہ خزانہ سرکار میں جمع کئے تھے، اور رسید نمک محکمۂ نمک میں بھیجدی تھی، اور مال ابھی وہاں سے روانہ نہیں ہوا تھا، کہ اتنے میں قیمت نمک سرکار نے کم کردی، یعنی فی گاڑی سو روپے کم کردیئے اور بجائے پانسو ترپن کے چار سو ترپن قائم رکھے، اس لئے نرخ نمک کا تمام تجارت کانوں میں ارزاں ہوگیا، تو میں نے سرکار میں عرضی بھیجی، کہ نرخ ارزاں ہونے سے ہمارا سو روپیہ کا نقصان ہوگیا، اور سرکار نے بلا اطلاع پہلے دیئے ہوئے محصول کم کردیا، اور مال ہمارا روانہ نہیں ہوا ہے، اس لئے ہم کو سو روپیہ واپس ملنے چاہئیں، اس پر یہ جواب آیا، کہ کچھ عرصہ کے بعد مبلغ سو روپیہ واپس دیئے جاویں گے تو بندہ کو یہ دریافت کرنا ہے کہ روپیہ واپس لینا شرعاً درست ہے یا نہیں، اور سرکار مثل ہمارے اور تاجروں کو بھی روپیہ واپس دے گی۔

الجواب، اول تو صرف روپیہ کے ساتھ درخواست خریداری بھیجنے سے بیع نہیں ہوتی، اس لئے بائع و مشتری ہر دو کو نفس عقد سے یا وعدۂ نرخ خاص سے انکار و امتناع جائز ہے، اور اگر اس سے قطع نظر کی جاوے اور کسی طریق سے بیع متحقق ہو جاوے تب بھی حط ثمن بتراضی جائز ہے، اور صورت مسئولہ میں تراضی ثابت ہے، لہذا دونوں تقدیر پر روپیہ کی واپسی جائز ہے۔

۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۱ھ (امداد ثالث، ص ۶)

بیع کے بعد کچھ چیز زائد دینا

سوال (۸) بعد سودا خریدنے کے جو بائع بچوں یا بڑوں کو کچھ دیدیتا ہے جس کو رونگا کہتے ہیں وہ مطلقاً ناجائز ہے یا بلا اجبار درست ہے؟

الجواب، یہ زیادۃ فی المبیع ہے، اور حسب تصریح فقہاء مباح ہے، بشرط تراضی فقط واللہ اعلم ۱۲ ذیقعدہ ۱۳۲۵ھ (امداد ثالث ص ۲۵)

بیع بشرط حمل بائع الخ

سوال (۹) یہاں دستور و عرف ہے کہ جب بقال[1] سے ایک روپیہ یا زائد کا غلہ خرید جاوے تو وہ مشتری کے مکان تک پہنچا دیتا ہے یا مزدوری اس کی دیدیتا ہے یہ بیع صحیح ہے یا نہیں

الجواب۔ اصل قاعدہ سے بائع کا پہنچانا درست نہیں مگر جہاں عام عادت ہو جاوے وہاں تعامل کے سبب جواز کی گنجائش ہے اور مزدوری دیدینا ایک تاویل سے جائز ہے اور وہ تاویل حط[2] ثمن ہے۔ ۳ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۹۲)

رشوت دادن بکارکنان بائع را کہ مال جید دہند،

سوال (۱۰) جو نمک سرکاری مومیے آتا ہے وہ باریک آتا ہے، اور موٹے نمک کی قدر زیادہ ہے، بلکہ یوں کہا جائے کہ موٹے نمک کے بدلے

[1] بقال مودی بنیا ۱۲ اس، [2] قیمت کم کردینا ۱۲ اس

باریک کو کوئی نہیں لیتا، اور کبھی اتفاقاً موٹا بھی آجاتا ہے، میں اس کے لئے کوشاں ہوں کہ کسی تدبیر سے نمک موٹا ہی آیا کرے، تاکہ جلد مال نکلے، میں نے دو ایک شخصوں سے جو کان نمک کے قرب میں رہنے والے ہیں اس کا ذکر کیا تو انھوں نے موٹا نمک آنے کی یہ تدبیر بتلائی کہ جو نمک کے بھرانے والے وہاں ملازم سرکاری ہیں ان سے میل کر لیا جاوے اور فی گاڑی ان کو کچھ دیدیا جایا کرے اور کہدیا جاوے کہ ہمارے لئے گاڑی میں نمک موٹا بھر دیا کریں، تو وہ ایسا ہی کریں گے، کیونکہ اور تاجرین ایسا ہی کرتے ہیں تو بندہ کو اس بارہ میں یہ دریافت کرنا ہے کہ ایسا کرنا داخل رشوت ہے یا نہیں؟

الجواب (مقدمۂ اولیٰ) عقد میں اطلاق ہونے سے کہ خواہ سرکار موٹا نمک دے یا باریک مشتری کا حق خاص نمک کے ساتھ متعلق نہیں ہوتا اور تقیید سے کہ موٹا لیا جاوے خاص مہٹے کے ساتھ متعلق ہو جاوے گا۔ (مقدمہ ثانیہ) کسی کا حق نہ دینا ظلم ہے (مقدمہ ثالثہ) دفع ظلم کے لئے رشوت دینا جائز ہے، مقدمۂ ثلثہ سے ثابت ہو گیا کہ اطلاق میں یہ رشوت دینا حرام ہے اور تقیید میں جائز۔

۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۱ھ (امداد ثالث ص ۷)

بیع کے بعد بائع سے زر ثمن واپس لینا جائز نہیں مگر کافر حربی سے اس کی رضا کے ساتھ جائز ہے

سوال (۱۱) جب قیمت نمک کم ہوئی تو میرے ہاں ایک گاڑی مال رکھا ہوا تھا، بوجہ نرخ ارزاں ہو جانے کے قریب اسی روپیہ کے میرا نقصان ہوا، اور سرکار نے نوٹس یعنی اطلاع کم قیمت ہونے کی پہلے سے نہیں دی تھی اس وجہ سے نالش کر کے سرکار سے ہرجہ[ف] کا روپیہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگوں نے اس کی بھی نالش کر رکھی ہے، میں بلا آپ سے دریافت کئے ایسا نہیں کروں گا۔

الجواب، فی الھدایۃ نقصان السعر عبارۃ عن فتور رغبات الناس وذلک لا یعتبر فی البیع حتیٰ لا یثبت بہ الخیار فی الکفایۃ یعنی اذا تغیر سعر المشتری قبل القبض لا یثبت الخیار جب قبل القبض مشتری کا کوئی حق نہیں، تو بعد القبض رد بعض ثمن کا کب حق ہے؟ البتہ اگر بائع غیر اہل اسلام و غیر اہل ذمہ ہو، اور اپنے قانون کے موافق برضامندی کچھ دے، گو کسی عنوان سے ہو ایسے اموال کی اباحۃ کی بنا پر درخواست کرنا اور لے لینا سب جائز ہے،

۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۱ھ (امداد ثالث ص ۷)

حل شبہ متعلقہ تبدل حکم بتبدل ملک

سوال (۱۲) مسئلہ تبدل عین بہ تبدل ملک میں کچھ اشتباہ ہے، اگر اس کے یہی معنی ہیں جو فتاویٰ اشرفیہ[عہ] میں بحوالہ قصہ حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا منقول ہیں کہ اول کے پاس اس طریق حلال سے وہ شے آئی جو دوسرے کے لئے گو حلال نہو مگر اس کیلئے

ف ہرجہ: ہرجانہ نقصان خاص ۱۲ س، عہ دیکھئے جلد چہارم سوال ۶۰۲ مسائل شتیٰ ۱۲ س

جائز ہے، تو اکثر مسائل فقہیہ جو اسی پر متفرع ہیں لغو ہو جائیں گے خصوصاً بیوع فاسدہ، بائع مشتری اول کو بوجہ فساد بیع اقالہ ضروری ہے اور دوسرے کو نہیں، مثلاً انبہ خام درخت پر خریدے گئے اور ملک متبایعین کے اشتراک کے باعث یا صفقہ فی صفقہ یا شرط فی بیع کے باعث بیع میں فساد آیا، تو اقالہ ضروری ہے، اور اس مشتری کو پختہ ہولے پر ان انبہ کا استعمال ناجائز، مگر بازاروں میں فروخت ہوتے اور لوگ خرید کر کھاتے ہیں، ان کے لئے بوجہ تبدل ملک حلت کا فتویٰ ہے، آجکل جب کہ بیوع فاسدہ عموماً شائع ذائع ہیں، کوئی شے بھی قابل استعمال نہ رہے گی۔

جواب شاید تعبیر میں کچھ کوتاہی ہوگئی ہو، عجب نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے جو مطلقاً سمجھ رکھا ہے کہ گو کیسی ہی حرام چیز ہو، مگر دوسرے کے پاس پہونچکر حلال ہو جاتی ہے، یہ محض غلط ہے کیونکہ اموال مخلوطہ جس میں اکثر حصہ مغصوب یا ربوا یا رشوت ہو بتصریح فقہاء دوسرے کے لئے بھی ویسی ہی حرام ہیں، جیسے پہلے کے لئے، حالانکہ تبدل ملک یہاں بھی ہے، اس لئے اس قاعدہ کی تفسیر کرنا مقصود ہے، جس سے غرض ابطال عموم و اطلاق حکم حلت ہے، خلاصہ اس تفسیر کا یہ ہے کہ جو شے اول کے لئے باصلہ حلال ہوگی، بوصف کسی عارض سے اس میں کراہت پیدا ہو جاوے، وہ دوسرے کے لئے حلال ہوگی، اور چونکہ دوسری جگہ وہ عارض نہیں ہے اس لئے وہ خبث عارضی بھی نہو گا اور بیوع فاسدہ میں یہی قصہ ہے، اور جو اول کے لئے باصلہ حرام ہو وہ حرمت برابر متعدی رہے گی جیسے بیوع باطلہ، اور ربوا اور رشوت قبل الخلط یا بعد الخلط بشرط الاکثریہ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

۶ جمادی الاخریٰ ۱۳۲۲ھ (امداد ثالث ص ۱۱)

عدم جواز بیع بدست نابالغان بواسطۂ غیر ولی

سوال (۱۳) زید نے اپنے دو یتیم بھتیجوں کے ہاتھ ایک مکان بتولیت ان کی ماں کے فروخت کیا، بعد تھوڑے زمانہ کے اسی مکان مبیع کے متصل تھوڑی زمین ایک دوسرے شخص سے خرید کی، اور اس دوسرے شخص سے اپنے مکان مبیع کی تھوڑی زمین اس بیع نامہ میں لکھ دالی، اب جبکہ دونوں بھتیجے بالغ ہوئے تو اس پہلی بیع کو جو کہ ان کے چچا نے ان کے ہاتھ فروخت کیا ہے جائز رکھتے ہیں اور نہ دوسری بیع کو جو ان کے چچا نے اسی جائداد مبیعہ سابقہ کا ایک جزء اس دوسری زمین مبیعہ کے ساتھ خرید لی ہے نا جائز رکھتے ہیں اور اپنا پورا حق طلب کرتے ہیں تو زید کہتا ہے کہ اس پر میرا عرصہ سے قبضہ چلا آتا ہے، ان دونوں بیعوں کے جواز و عدم جواز میں شرع شریف کا کیا حکم ہے، اور اس قبضہ کا کچھ اعتبار ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فی الدر المختار[1] کتاب الماذون فی احکام الصبی و ولیہ ابوہ ثم وصیہ

[1] در مختار ص ۱۵۱ ج ۵

بعد موته ثم وصی وصیه القهستانی عن العمادیة ثم بعدهم جده الصحیح وان علا ثم وصیه ثم وصی وصیه قهستانی زاد کما فی القهستانی والزیلعی ثم الوالی بالطریق الاولیٰ ثم القاضی او وصیه دون الأمّ او وصیها وفی رد المحتار تحت قوله وولیه ابوه ای الصبی وفی الهندیة والمعتوه الذی یعقل البیع یاذن له الاب والوصی والجد دون الاخ والعم وحکمه حکم الصبی وفی الدر المختار فصل احکام الفضولی کل تصرف صدر منه وله مجیز حال وقوعه انعقد موقوفا ومالا مجیز له حالة العقد لاینعقد اصلا فی رد المحتار عقد عقدا ما لو فعله ولیه فی صباه لم یجز علیه فهذه کلها باطلة وان اجازها الصبی بعد بلوغه لم تجز لانه لا مجیز لها وقت العقد فلم تتوقف علی الاجازة ان روایات سے معلوم ہوا کہ آم اور عم ولی فی المال نہیں ہیں۔ اس لئے یہ تصرف فضولی کا ہے، اور چونکہ اس کا کوئی مجیز فی الحال نہ تھا لہذا وہ باطل ہوا، پس بعد بلوغ کے بیع اول کا جائز رکھنا معتبر نہیں۔ پس وہ مکان مبیع سابق بدستور زید کا ہے، اور زید پر واجب ہے کہ زر ثمن واپس کردے، البتہ اگر اب بتراضی بیع کریں تو جس مقدار سے بیع کریں گے صحیح ہو جاوے گی، واللہ اعلم وعلمہ اتم

۱۲ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ (امداد ثالث ص ۱۴)

نابالغ کی جائداد کو اس کی ماں یا چچا فروخت نہیں کرسکتے

سوال (۱۴۱) ماں کو اپنی اولاد صغار کی جائداد صحرائی وسکنائی بخوف تلف یا تنگی اخراجات کی وجہ سے کہ سوائے اس جائداد کے کوئی ذریعہ ان کے نان ونفقہ کا نہیں ہے فروخت کر دینا اس جائداد اور اس کی قیمت کا صرف کرنا ان کے ضروریات نان ونفقہ میں جائز ہے یا نہیں؟

جواب فی الدر المختار مع رد المحتار باب الوصی وجاز بیعه (ای الوصی) عقار صغیر من اجنبی لا من نفسه بضعف قیمته او لنفقة الصغیر او دین المیت او وصیة مرسلة لا نفاذ لها الامنه او لکون غلاته لا تزید علی مؤنته او خوف خرابه او نقصانه او کونه فی ید متغلب درر و اشباه ملخصا قلت وهذا لو البائع وصیا لا من قبل امٍّ او اخ فانهما (ای الام والاخ) لا یملکان بیع العقار مطلقا ولا شراء غیر طعام و کسوة ولو البائع ابا فان محمودا عند الناس او مستورا لحال یجوز ابن کمال فی رد المحتار قوله مطلقا ای ولو فی هذه المستثنیات واذا احتاج الحال الی بیعه یرفع الامر الی القاضی طـ جلد ۵ ص ۶۹۰۔ اس روایت سے ثابت ہوا کہ ماں کا بیع کرنا جائداد صغیر کو

ے شامی جلد ۴ ص ۱۹ ۱۲ س۔ عہ آم: ماں: عم چچا ۱۲ س

فی نفسہ جائز نہیں، بلکہ حاجت کے وقت حاکم مسلم کی طرف رجوع کیا جاوے اور حاکم مسلم کے نہ ہونے کے وقت کے متعلق جزئی نظر سے نہیں گذری لیکن چونکہ حاجت متحقق ہے اور حرج مدفوع ہے، لہذا بضرورت جائز معلوم ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

۲۵ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ (امداد ثالث ص ۱۵)

نابالغ کی جائداد کے بیچنے کا عدم جواز

سوال (۱۵) زید مثلاً فوت ہوا، اور دو پسر بکر اور عمرو نابالغ چھوڑے اور کچھ زمین وغیرہ مال چھوڑا، بعدہ بکر و عمرو پسران زید متوفی چونکہ بیع و شرار کو بخوبی جانتے تھے یعنی عاقل تھے، لہذا اپنی والدہ کے مشورہ اور اجازت سے کچھ حصہ زمین بیع کردیا، اور زر ثمن اپنے باپ زید متوفی کے واسطے مساکین کو صدقہ دیدیا، بعد اس بیع کے تخمیناً گیارہ سال گذرے ہوں گے کہ پسران زید متوفی میں ایک کی عمر ۱۸ سال کی یا زیادہ ہوئی اور دوسرے کی عمر ۱۶ سال یا زیادہ ہوئی تو عدالت میں بیع مذکور کی منسوخی کا دعویٰ کرنا چاہا جس کا مضمون مختصر یہ ہے کہ ہم پسران زید چونکہ بیع کے وقت نابالغ تھے، اب ہم بالغ ہوگئے ہیں، لہذا یہ بیع منسوخ ہونی چاہئے، ہم اس بیع پر راضی نہیں، مگر یہ دعویٰ انھوں نے لوگوں کے برانگیختہ کرنے سے کیا، اب یہ گذارش ہے کہ بیع مذکور اس حالت میں شرعاً منعقد ہوئی یا نہیں، اور ان کی والدہ کو برتقدیر نہ ہونے اور اولیا، عصبہ کے ولایت اجازت بیع کی ہے یا نہیں، اگر نہیں تو یہ بیع باطل ہوگی یا صحیح موقوف ہوگی، اور پسران زید کو خیار بلوغ ہوگا اگر خیار بلوغ ہو تو مثل مجیز کے موقوف ہوگا یا متوسع ہوگا، جب چاہیں فسخ کریں؟ اور اگر پسران زید کے اولیا، عصبہ ہوں، لیکن ان کی جانب سے صریح اجازت جواز بیع کی نہ ہو لیکن صریح انکار بھی نہ ہو مثلاً جب اولیا، عصبہ پسران زید کو پسران زید کی بیع کرنے کی اطلاع ہوگئی، لیکن اولیار نے سکوت کیا، عرصہ گیارہ سال تک کسی ولی نے بیع کی بابت اقرار یا انکار نہ کیا، تو یہ سکوت ان کا شرعاً اجازت ہوگی یا اجازت نہ ہوگی؟ یعنی شرعاً اس سکوت سے بیع مذکور جائز نافذ ہو جائے گی یا نہ ہوگی؟ اور اگر اولیا پسران زید نے زر ثمن اپنے ہاتھ سے پسران زید کے باپ زید متوفی کے واسطے صدقہ کرکے مساکین کو دیئے تو کیا ان کا یہ اپنے ہاتھ سے تصرف کرنا شرعاً اجازت ہے یا نہیں، اگر اس سکوت یا اس تصرف کی وجہ سے بیع نافذ ہو جائے تو پھر پسران زید کو بیع منسوخی کا دعویٰ کرنے کا استحقاق ہوگا یا نہ ہوگا؟ اور اگر بعد گذرنے گیارہ سال کے اولیار پسرانِ زید بیع مذکورہ کی اجازت دیویں یا اس سے انکار کریں تو باوجود سکوت کے زمانہ سابق میں اور اس تصرف کے جس کا ذکر بالا ہو چکا یہ اقرار یا انکار معتبر ہوگا یا وجود

بالغ ہو جائے پسران زید کے یا بعد بلوغت پسران زید کے ان کے اولیار کا انکار یا اقرار معتبر نہ ہوگا۔ برتقدیر صحت دعویٰ بیع منسوخی کے زرثمن جو کہ مشتری سے پسران زید نے وصول پائے تھے، مشتری کس کس سے وصول کرے گا، کیا پسران زید بلا ادائے زرثمن زمین کے زمین پر قبضہ کر سکتے ہیں یا بعد ادائے زرثمن قبضہ کر سکیں گے، اور شرعاً حد بلوغ ۱۵ سال ہیں یا ۱۸ سال مفتی بہ قول کونسا ہے، برائے مہربانی مفصل جواب عنایت فرمادیں مع حوالہ کتب کے برائے قطع نزع مخالفین کے جو کہ بالکل جاہل ہیں کل احتمالات مجوزہ غیر مجوزہ درج کئے گئے ہیں اور فریقین کی تسلی اسی میں ہوگی، اگر ممکن ہو تو جلدی جواب عنایت فرمادیں، اللہ تعالیٰ جناب کو اس کا اجر عطا فرمادیں۔

الجواب۔ نابالغ کی عقار کی بیع کا چونکہ اولیار کو بھی اختیار نہیں، لہذا یہ بیع باطل ہوگی موقوف وہ عقد ہوتا ہے جس کا بالفعل کوئی مجیز ہو، اور یہاں یہ شرط نہیں پائی جاتی، لہذا باطل ہوگی، بعد بلوغ کے اگر وہ بیع استینافاً کریں تو صحیح ہے، ورنہ اجازت دینے سے بھی صحیح نہ ہوگی، اور جو روپیہ مشتری نے بیع میں صرف کیا ہے اس کا ضمان اس شخص پر ہے جس کے ہاتھ میں وہ روپیہ پہنچا ہے، اس کی وجہ سے نابالغوں کے حق کا حبس مشتری کو جائز نہیں، اس تقریر سے انشاء اللہ تعالیٰ سب شقوق واحتمالات کا جواب ہوگیا، واللہ اعلم ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۲۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۴۹)

بیع یا رہن جائداد مشترک

سوال (۱۶) کیا فرماتے ہیں علمارِ دین دریں باب کہ ایک بیوہ مسلمان کل ترکہ جدی شوہر متوفی اپنے کو باوجود موجودگی چند اشخاص ورثار متوفی رہن یا بیع کر سکتی ہے یا نہیں؛ اگر کوئی ایسی بیوہ مثل جائداد مذکورہ کو بیع یا رہن کر دیوے تو وہ باطل سمجھی جائے گی یا صحیح، بینوا توجروا۔

الجواب۔ اس مبیع یا مرہون میں جس قدر حصہ شرعاً دوسرے ورثہ کا ہے، اور وہ ورثہ اس بیع ورہن سے رضامند نہیں ہیں، ان دوسروں کے حصہ میں تو بیع ورہن بالکل باطل ہے، اور جتنا اس بیوہ کا شرعی حصہ ہے اس کا حکم یہ ہے کہ رہن تو باطل ہے اور بیع ہو جاوے گی، پس خلاصہ یہ ہوا کہ یہ رہن تو بالکل ناجائز ہوا، اور بیع اپنے حصہ کی ہوگئی، غیروں کے حصے کی نہیں ہوئی، البتہ اگر جائداد منقسم ہوتی تو رہن بھی اپنے حصہ کا درست ہو جاتا۔ فی الدر المختار بخلاف نحو ضم الی مس برو نحوہ فانہ یصح اذ فی غیرہ اھ وفیہ وقبض المرتهن محوزاً ممیزاً لا مشاعاً اھ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم۔

۷ رمضان ۱۳۲۳ھ (امداد ثالث ص ۱۰)

حربی کا ذرا گراپنے کسی رشتہ دار کو فروخت کرے

سوال (۱۷) فنا احدی ملک من اهل الحرب الی مسلم هل بابنه عن احوا رهو ملك الا اوكان قرابة له وادخل دار هم مسلم بامان ثم اشترى عن

احدھم ابنہ ثم اخرجہ الی دارنا قہرا ملکہ واکثر المشائخ علی انہ لا یملکہم فی دارھم وھو الصحیح وعن محمد انہ یملکہ حتی لا یجبر علی الرد وعن ابی یوسف یجبر وقال الکرخی ان کانوا یرون جواز البیع فالبیع جائز والا فلا کما فی المحیط وفیہ اشعار بان الکفار فی دارھم احرار ولیس کذلک فانہم ارقاء فیہا وان لم یکن مالک لاحد علیہم علی ما فی عتاق المستصفی وغیرہ اہ جامع الرموز نولکشوری ص ۵۲۶ ۔ تنبیہ فی النہر عن منیۃ المفتی اذا باع الحربی ھناک ولدہ من مسلم عن الامام انہ لا یجوز ولا یجبر علی الرد وعن ابی یوسف انہ یجبر اذا خاصم الحربی ولو دخل دارنا بامان مع ولدہ فباع الولد لا یجوز فی الروایات اہ ای لان فی اجازۃ بیع الولد نقض امانہ کما فی ط عن الولوالجیۃ اہ شامی مجتبائی ج ۳ ص ۲۴۳ وفی المحیط مسلم دخل دار الحرب بامان فجاء رجل من اہل الحرب بامہ او بام ولدہ او بجدتہ او بخالتہ قد قہرھا یبیعہا من المسلم المستامن لا یشتریہا منہ لان الحربی ان ملکہا بالقہر فقد صارت حرۃ فاذا باعہا فقد باع الحرۃ ولو قہر حربی بعض احرارھم ثم جاء بہم الی المسلم المستامن فباعہم منہ ینظر ان کان الحکم عندھم ان من قہر منہم صاحبہ فقد صار ملکہ جاز الشراء لانہ باع المملوک وان لم یملکہ لا یجوز لانہ باع الحرام بحر الرائق ج ۵ ص ۱۰۱

جامع الرموز اور شامی کی عبارت سے واضح ہے کہ بیع صحیح ہو جاتی ہے یا کہ رد کرنا واجب نہیں ہے البتہ احراز بدار الاسلام کو بعض نے شرط لکھا ہے۔ اس کی نسبت آں حضرت کی کیا رائے ہے۔ بحر الرائق کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جائز نہیں، کیونکہ اگر قہر سے مالک بھی ہوگیا تو ذی رحم محرم کی وجہ سے آزاد ہو جاوے گا اس لئے بیع حر ہے۔ لیکن یہ عجیب ہے، اس لئے کہ فروع میں کفار حربی مخاطب نہیں، پس ذی رحم محرم کے مالک ہونے سے وہ آزاد کیسے ہو جاوے گا، لو فرضنا آزاد ہوگیا تو پھر مسلمان کے قبضہ سے ملک ہو جانا چاہئے، غایۃ ما فی الباب بیع صحیح نہ ہو، غرض کہ کچھ پوری تشفی نہیں ہوتی۔

الجواب، تامل سے معلوم ہوتا ہے کہ روایات میں تعارض نہیں البتہ اجمال اور ایک میں ایک قید کا دوسری میں دوسری قید کا اہمال ہے، اور مجموعہ کے اعتبار سے مقصود متحد ہے، جامع الرموز میں جو استثنا کیا ہے الا اذا کان قرابتہ لہ اس میں لہ کی ضمیر ملک کی طرف معلوم ہوتی ہے، اور یہ استثنا مبنی اس پر ہے کہ قرابت محرمیۃ موجب عتق ہے لیکن اس میں قید یہ ہو گی کہ جب اہل حرب کا یہ مذہب ہو کہ کوئی شخص اپنے ذی قرابت کا مالک نہیں ہوتا، جیسا کہ کرخی کے قول میں اور بحر کی آخر عبارت میں تصریح ہے اور یہ شبہ کہ استیلاء مسلم تو اس پر پایا گیا بایں وجہ مدفوع ہے کہ یہ استیلاء

دارالاسلام میں حاصل ہوا ہے، اور بطور قہر نہیں ہوا، البتہ دارالحرب میں اگر ہوتا یا دارالاسلام میں قہراً ہوتا موجب ملک ہوسکتا تھا، اور شامی کی عبارت میں جو لایجوز کہا ہے اس میں بھی وہی قید معلوم ہوتی ہے، کہ جب وہ اہل حرب اس بیع کو جائز نہ سمجھتے ہوں، اور غالباً ان قائلین کو اپنے زمانہ کے حربیین کا خیال ثابت ہوگیا ہوگا، اور لایجبر کی وجہ یہ ہے کہ یہاں استیلاء مسلم کا دارالحرب میں ہوا ہے، جو کہ موجب ملک ہے، اور بحر میں جو لایشتریہا اور باع الحرۃ کہا ہے وہ بھی مقید اسی قید مذکور کے ساتھ ہے، اور اس میں نفی مطلق ملک کی نہیں بلکہ قواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم بوجہ قبض کے مالک ہوجاویگا لیکن چونکہ مستامن کا ایسا فعل کہ جس کو وہ لوگ اس کے لئے ناجائز سمجھتے ہوں اور اس نے ایسے امور کا التزام بدلالت حال کرلیا ہے، یہ فعل عذر ہے، اس لئے لایشتریہا کہتے ہیں، اور فروع کا مخاطب ہونا ہماری طرف سے ہوگا، نہ یہ کہ خود ان کے معتقدات بھی ان پر حجت نہ ہوں اور یہ کہ احراز بدارالاسلام شرط ہے یا نہیں ظاہراً قواعد سے اشتراط راجح معلوم ہوتا ہے۔ جیسا غنائم کے احکام سے مفہوم ہوتا ہے امید ہے کہ جمیع اشکالات رفع ہوگئے ہوں، اور اگر کچھ باقی ہو تو اعادہ فرمایئے، واللہ اعلم۔

اس تحریر سے فتوی مقصود نہیں کیونکہ وہ محتاج نقل ہے۔ بلکہ توجیہ عبارات مقصود ہے فقط واللہ تعالیٰ اعلم، ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ (امداد جلد سوم ص ۱۶)

حفاظت جائداد کی غرض سے کسی کے نام بیع کرنا

سوال (۱۸) مورث نے قرض خواہ مہاجن سے محفوظ رکھنے کے خیال سے اپنی زوجہ کے نام اپنی جائداد کا بیع نامہ لکھ دیا، اس میں عرصہ گذر گیا، بعد انتقال اس شوہر اور زوجہ کے بوجہ نہ ہوتے اولاد پسری کے بجائے اس زوجہ کے بندوبست میں نام دختروں کا بانتظام سرکار بلا تحریک دختران کے چڑھا، اور عرصۂ دراز تک اس جائداد کا حاصل ان دختران کے بنی عم وصول کرکے ان کو دیتے رہے وہ اپنے صرف میں لاتی رہیں، اب تخمیناً دس سال کے بعد بعض بنی عم خواہشمند اس امر کے ہوئے کہ اس جائداد سے ہم کو حصہ ملنا چاہئے، مقصود یہ ہے کہ بیع نامہ جو اس مصلحت سے اس شخص نے اپنی زوجہ کے نام کیا، اور عرصہ تک اسی کے نام رہا، شوہر زوجہ کے روبرو انتقال کرگیا تھا، اس کی دختران کے نام جائداد منتقل ہوئی، اور عرصہ تک وہی اس سے نفع اٹھاتی رہیں، تو اب بنی عم کو کچھ ملے گا یا نہیں، اور یہ کل معاملہ درست رہا یا نہیں؟

الجواب - یہ بیع ہزل ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر متعاقدین اس کے ہزل ہونے پر متفق ہوں تب تو وہ مبیع بائع کی ملک سمجھی جاوے گی، اور اس کی وفات کے بعد اس کے سب ورثہ پر تقسیم ہوگی۔ اور اگر متعاقدین متفق نہ ہوں، مثلاً جس کے نام بیع ہے وہ یا اس کے مرنے کے بعد

اس کے ورثہ اس کی بیع حقیقی ہونے کے مدعی ہوں تو وہ بیع صحیح نافذ سمجھی جاوے گی اور جس کے نام بیع ہوئی ہے اس کی ملک سمجھی جاوے گی، اور اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ کو ملے گی، پس صورت مسئولہ میں اگر زوجہ کے ورثہ بشرطیکہ بالغین ہوں تسلیم کرلیں کہ یہ بیع فرضی تھی، تب تو شوہر کے انتقال کے بعد زوجہ اور دختران کے ساتھ ان دختروں کے بنی عم بھی بقدر حصص شرعیہ کے وارث ہوں گے اور اگر زوجہ کے ورثہ اس کو تسلیم نہ کریں بلکہ اس کو بیع واقعی کہتے ہوں، تو ان بنی عم کو میراث نہ ملے گی، بلکہ صرف زوجہ کے ورثہ میں کل جائداد تقسیم ہوگی، فقط واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم۔

۲۹ ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ (امداد ثالث ص ۱۷)

ہبہ یا بیع فرضی بنام بعضے ورثہ

سوال (۱۹) زید نے بحالت صحت وثبات عقل اپنی مملوکہ مقبوضہ جائداد غیر منقولہ زرعی وسکنی کو منجملہ چار ذکور وتین اناث اولاد صلبی کے صرف لڑکوں کے نام ہبہ نامہ لکھدیا، اور رجسٹری کرادیا، لڑکیوں کے رنجیدہ ہونے پر زبانی یہ ظاہر کیا کہ لڑکیوں کو محروم الارث کرنا مقصود نہیں ہے، بمصلحت ایسا کیا گیا ہے، ہبہ نامہ رجسٹری ہونے کے بعد زید جب تک زندہ رہا موہوبہ جائداد پر خود ہی قابض رہا، اور ہر چہار موہوب لہم میں جائداد مشترک رہی، نہ موہوب لہم قابض ہوئے نہ باہمی حصص منقسم ہوئے، اب زید کا انتقال ہوگیا، اور لڑکیاں میراث کی خواہشمند ہیں شرعاً حصہ مل سکتا ہے یا نہیں؟

سوال ثانی، صورت مذکورہ میں بجائے ہبہ نامہ کے اگر لڑکوں کے نام باپ نے فرضی بیع نامہ لکھ کر رجسٹری کرادیا، اور باقی صورت بجنسہ ہے پس یہ ہبہ یا بیع فرضی شرعاً معتبر ہے یا نہیں؟

الجواب عن الاول فی الدر المختار وهب اثنان دارا لواحد صح وبقلبه لكبيرين لا عندہ للشيوع فيما يحتمل القسمة اما ما لا يحتمله كالبيت فيصح اتفاقا قيدنا بكبيرين لانه لو وهب لكبير وصغير فی عيال الكبير او لابنيه صغير وكبير لم يجز اتفاقا فی رد المحتار قوله لم يجز والحيلة ان يسلم الدار الى الكبير ويهبها منهما، بزازيه وافاد انها للصغيرين تصح لعدم المزاحم لسبق قبض احدهما وحيث اتحد وليهما فلا شيوع فی قبضه ج۴ ص ۷۸۶ عبارت بالا سے معلوم ہوا کہ صورت مسئولہ عنہا میں سب موہوب لہم وقت ہبہ کے اگر نابالغ تھے، تب تو یہ ہبہ صحیح ہوگیا، اور صرف واہب کا یہ کہنا کہ بمصلحت ایسا کیا گیا ہے معتبر نہیں، اور اس صورت میں جائداد موہوبہ میں میراث جاری نہ ہوگی، اور اگر سب کبیر یعنی بالغ تھے یا بعضے کبیر اور بعضے صغیر تھے، تو یہ ہبہ بوجہ فقدان شرائط صحت ہبہ کے صحیح نہیں اور اس صورت میں زید کی لڑکیاں بھی مستحق میراث ہیں۔

الجواب عن الثانی فی الدر المختار بیع التلجیۃ قبیل کتاب الکفالۃ ولو تبایعا فی العلانیۃ ان اعترفا ببنائہ علی التلجیۃ فالبیع باطل لاتفاقھما انھما ھزلا بہ والا فلازم اس روایت سے ثابت ہوا کہ اگر یہ شخص جس کے نام بیع یا ہبہ ہے اقرار کرتا ہو کہ یہ فرضی تھی تو بیع و ہبہ کالعدم ہے، ورنہ نافذ ہے، واللہ اعلم، ۱۷ صفر ۱۳۲۵ھ (امداد ثالث ص ۹۷)

قبالہ میں زوجہ کا نام درج کردینا،

سوال (۲۰) زید نے اپنے روپیہ سے مکان خریدا اور قبالہ[1] میں نام اپنی زوجہ ہندہ کا کسی مصلحت سے بائع سے لکھوایا، اور ایجاب وقبول مابین بائع اور زید مشتری کے ہوا، اور اس کاغذ کی رجسٹری بھی ہوگئی، بعدہ ہندہ فوت ہوگئی، اور مہر ہندہ معاف کرچکی تھی، اس صورت میں مکان خریدشدہ زید کا ہے یا ورثۂ ہندہ کا (مولوی راغب اللہ از پانی پت)

الجواب، رکن بیع کا ایجاب وقبول ہے، جن میں ایجاب وقبول واقع ہوا ان کے ہی درمیان بیع متحقق ہوئی، تو جب ایجاب وقبول زید نے کیا تو ملک اس کی یقیناً ثابت ہوئی، اب انتقال ملک بغیر کسی عقد صحیح معتبر تام کے نہیں ہوگا تو صرف اس سے کہ کسی مصلحت سے بیوی کا نام درج کرادیا، زید کی ملک زائل اور بیوی کی ملک ثابت نہیں ہوگی، تاوقتیکہ کوئی عقد صحیح معتبر مفید انتقال ملک واقع نہ ہو، حالانکہ ہمیشہ تصرفات مالکانہ خود کرتا رہا۔ اور اب بھی اپنے آپ کو مالک بتلاتا ہے، پس اس میں ورثہ ہندہ کو کچھ دعوی نہیں پہونچتا، ہاں اگر ہبہ صحیح یا اقرار صحیح گواہوں سے ثابت کردیں اس وقت دعوے درست ہوگا، وبیع التلجیۃ وھو ان یظھرا عقداً وھما لایریدانہ یلجاء الیہ بخوف عدو وھو لیس ببیع فی الحقیقۃ بل کالھزل، جلد ۴ ص ۲۴۴ توجب تلجیہ میں عاقد کے لئے عقد صحیح نہیں ہوتا تو غیر عاقد کے لئے تو بدرجہ اولیٰ ثابت نہ ہوگا، واللہ اعلم فقط اللھم اعف عنی وعن جمیع المسلمین (امداد ثالث ص ۲۶)

بیع مرابحہ میں مثلیت ثمن کی شرط،

سوال (۲۱) اس طرف یہ رواج ہے کہ لوگ کپڑا دو طریقے سے خریدتے ہیں ایک یہ کہ اس کی قیمت میں نقد روپیہ دیتے ہیں، دوم یہ کہ روپیہ بھی دیتے ہیں اور سوت بھی بازار کے نرخ سے ذرا زیادہ قیمت کے حساب سے دیتے ہیں، تو جس صورت میں کہ صرف روپیہ دیتے ہیں تو ایک تھان مثلاً چودہ آنہ کو لیتے ہیں، اور اگر روپیہ وسوت دونوں دیتے ہیں تو ساڑھے چودہ آنے کو لیتے ہیں تو کیا حکم ہے پس جس شخص نے کہ کپڑا روپیہ وسوت دونوں دیکر خریدا ہے اس سے اگر کوئی کپڑا فی تھان مثلاً ایک آنہ منافع دے کر خریدے تو وہ منافع چودہ آنے پڑے گا، یا ساڑھے چودہ آنے پر، اور اصل قیمت کون معتبر ہوگی؟

[1] قبالہ:

الجواب، یہ بیع مرابحہ ہے، یہ اسی وقت صحیح ہے جب تمام ثمن نقد یا مثلی ہو اور دوسرا مشتری وہی دیتا ہو، پس جس صورت میں کچھ نقد اور کچھ سوت کی عوض تھان لیا ہے اور دوسرا مشتری سب نقد دیتا ہے نفع پر بیچنا درست نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم، وعلمہ اتم واحکم،

۲۵ محرم ۱۳۲۴ھ (امداد ثالث ص ۱۸)

تعامل جس کا فقہاء نے اعتبار کیا ہے اس کی تحقیق

سوال (۲۲) ایک امر یہ بھی قابل تحقیق ہے کہ فقہا اکثر مسائل میں مثل استصناع وغیرہ لکھا کرتے ہیں کہ تعامل کا اعتبار ہے، تعامل سے کیا مراد ہے، اور کس زمانہ کا تعامل معتبر ہے، بعض بعض جزئیں ایسی ہیں جو صحابہؓ تابعینؒ کے زمانہ میں موجود نہ تھیں، ان میں تعامل کا اعتبار ہو سکتا ہے یا نہیں، جیسے بطبع کہ کتاب چھپوانے میں استصناع کا اعتبار کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب، قال فی نور الانوار وتعامل الناس ملحق بالاجماع وقیل ثم اجماع من بعدھم ای بعد الصحابۃ من اھل کل عصر۔ اس سے معلوم ہوا کہ تعامل بھی مثل اجماع کسی عصر کے ساتھ خاص نہیں البتہ جو اجماع کا رکن ہے وہی اس میں بھی ہونا ضرور ہے، یعنی اس وقت کے علماء اس پر نکیر نہ رکھتے ہوں، اسی طرح فقہاء نے بہت سے نئے جزئیات کے جواز پر تعامل سے احتجاج کیا ہے۔ کما فی الھدایۃ فی البیع الفاسد ومن اشتری نعلا علی ان یحذوہ البائع الی قولہ یجوز للتعامل فیہ فصار کصبغ الثوب وللتعامل جوزنا الاستصناع وفیھا فی السلم ان استصنع الی قولہ للاجماع الثابت بالتعامل اھ پس اس بنا پر کتاب چھپوانا استصناع میں داخل ہوگا، واللہ تعالیٰ اعلم، وعلمہ اتم واحکم۔ ۲۶ محرم ۱۳۲۴ھ (امداد ثالث، ص ۱۹)

مورث کی جائداد کی بیع قبضہ سے پہلے

سوال[1] (۲۳) بعد سلام مسنون التماس ہے کہ ایک شخص فوت ہوا، چند وارث چھوڑے منجملہ کل وارثوں کے ایک وارث نے مال متروک کہ زمین اور باغ اور مکان وغیرہ ہے، قبضہ کے قبل اپنا حصہ بیع دوسرے شخص کے ہاتھ کر دیا، مشتری اور وارثان قابض نے بابت شئے مبیع علحدہ علحدہ فتویٰ طلب کیا ہے، اول دونوں فتاویٰ کا نقل علحدہ علحدہ ترسیل خدمت واسطے تصدیق کے ہے خادمانہ دست بستہ عرض ہے کہ جواب سے جلد سرفراز کیا جاوے کہ رفع تردد ہو (نقل استفتا، وارثان قابض مع فتویٰ) کیا فرماتے ہیں علمائے دین

---

[1] اس مسئلہ کے تین جواب ہیں تین مجیبوں کے یہاں لکھے گئے ہیں، تیسرا جواب حضرت مولانا صاحب مدظلہم کا ہے اور دو پہلے اس لئے نقل کئے گئے ہیں کہ جواب ثالث میں ان سے تعرض کیا گیا ہے ۱۲

اس مسئلہ میں کہ جو شے کسی کے قبضہ میں نہ ہو اس کو بیع کرے ؟

الجواب، حرام ہے، نہیں جائز ہے بیع، جیسا کہ مشکوٰۃ کی کتاب البیوع باب المنہی عنہا من البیوع میں ہے:۔ وعن حکیم بن حزام قال نہانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ابیع ما لیس عندی رواہ الترمذی وعن ابن عباس قال اما الذی نہی عنہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فہو الطعام ان یباع حتی ان یقبض قال ابن عباس فلا احسب کل شیء الا مثلہ فقط (کتبہ عبداللہ مدرس مدرسہ احمدی آرہ)

(نقل استفتائے مشتری) کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک مورث چند وارثان کو چھوڑ کر بقضائے الٰہی قضا کر گیا، ترکہ پر منجملہ وارثوں کے ایک وارث کا قبضہ نہیں ہوا، اور کل ترکہ مورث دوسرے وارثوں کے قبضہ میں رہا جس وارث کا قبضہ ترکہ مورث پر نہیں ہوا اس نے اپنا حصہ غیر مقبوضہ کسی کو بیع لکھ دیا، ایسی صورت میں بیع جائز ہوئی یا نہیں ؟ ترکہ مورث جو چھوڑ گیا وہ صرف زمین کاشت اور مکان اور درخت وغیرہ ہے الجواب ہو المصوب) قبل قبضہ کے بیع غیر منقول کا صحیح ہے بشرط عدم خوف ہلاکت کے، کما فی الدر المختار صفحہ ۱۷۹ مطبوعہ مصر جلد رابع، علی حاشیۃ رد المختار صح بیع عقار لا یخشی ہلاکہ قبل قبضہ من بائعہ وفی رد المختار قولہ من بائعہ متعلق بقبض لا ببیع ایضا درمختار کے اسی صفحہ میں ہے فلا یصح بیع منقول قبل قبضہ عالمگیریہ کی جلد ثالث صفحہ ۱۰ میں ہے من حکم المبیع اذا کان منقولا ان لا یجوز بیعہ قبل قبضہ وایضا فی الہدایۃ صفحہ ،، مطبوعہ لکھنؤ، یجوز بیع العقار قبل القبض عند ابی حنیفۃ ؒ وابی یوسف ؒ الخ مذکورہ بالا کتب مفتی بہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیع مثل زمین ومکان وغیرہ جو غیر منقول ہے قبل قبضہ کے جائز ہے جب کہ ہلاک ہو جانے کا خوف نہ ہووے، کتبہ محمد عمر اس جواب سے کما حقہ تشفی نہیں ہوئی، کیونکہ اس میں یہ عبارت ہے (جب کہ ہلاک ہو جانے کا خوف نہ ہووے) اس کا مطلب نہیں معلوم ہوا، کہ کیونکر ہلاک کا خوف ہے، اور کس طرح نہیں ہے۔ فقط

مکرر عرض آں کہ اس مسئلہ کے حل کرنے کی بابت بہشتی زیور کا پانچواں حصہ دیکھا گیا اس میں در بیان بیع باطل وفاسد یہ مسئلہ ہے (مسئلہ) زمین اور گاؤں اور مکان وغیرہ کے علاوہ جتنی چیزیں ہیں ان کے خریدنے کے بعد جب تک قبضہ نہ کرے تب تک بیچنا درست نہیں، اس سے وراثت کی شے غیر مقبوضہ منقول خواہ غیر منقول کا بیچنا جائز و نادرست ہونا معلوم نہ ہوا، امید کہ جواب سے مع حوالات کتب فقہ خواہ حدیث کے سرفراز فرمایا جاوے

الجواب، صورت مسئولہ میں بیع عقار ہے، جو میراث میں بائع کو پہنچی ہے، اور یہ جو علماء میں اختلاف ہے کہ قبل تبق بیع اس شے کی جائز ہے یا نہیں جس میں امام محمد مطلقاً ناجائز کہتے ہیں، اور امام

ابو حنیفہؒ و ابو یوسفؒ منقول میں ناجائز کہتے ہیں، اور عقار میں جائز، بشرطیکہ اس میں ہلاک کا خوف نہ ہو اور خوف یہ کہ مثلاً وہ مبیع مکان کا بالائی درجہ ہے، جبکہ درجہ زیرین نہ بیچا جاوے پس اگر درجہ زیریں گر جاوے تو درجہ بالائی بالکل ایسا ضائع ہوگا کہ پھر مالک اس کے بنانے پر قادر نہیں ہوگا، یا وہ مکان یا زمین کسی دریا کے کنارہ پر ہے کہ اس میں دریا برد ہونیکا احتمال ہے، یا کوئی ایسا موقع ہو کہ جہاں ریگ میں دب جانے کا احتمال غالب ہے، کما فی الدر المختار و رد المحتار الجلد الرابع فصل التصرف فی المبیع والثمن، تو یہ سب اختلاف اس شے کی بیع میں ہے جو کسی عقد میں عوض قرار دی گئی ہو جیسا اس ضابطہ سے معلوم ہوتا ہے، کل عوض ملک بعقد ینفسخ بھلاکہ قبل قبضہ فالتصرف فیہ غیر جائز وما لا فجائز عینی کذا فی الدر المختار الجلد المذکور الفصل المذکور، اور خود فتویٰ ثانی میں جو روایات منقول ہیں ان میں بھی تصریح ہے کہ مقصود بیان کرنا ہے حکم بیع ما ملکہ بالبیع قبل القبض کا، اور صورت مسئولہ میں یہ مبیع کسی عقد سے ملک میں نہیں آئی بلکہ میراث سے ملک میں آئی ہے جس میں انفساخ کا احتمال ہی نہیں، پس ایسی شے محل اختلاف علماء رہی ہی نہیں، بلکہ ائمہ موصوفین کے نزدیک بالاجماع مطلقاً اس میں یہ بیع درست ہو خواہ مبیع منقول ہو یا غیر منقول بہذا بلا خلاف امام محمدؒ کے یہ بیع جائز ہوگی۔ اما الحدیث المنقول فی الفتوی الاولیٰ فھو ایضاً محمول علیٰ ما ذکرو کما یفسرہ ما اخرجہ النسائی فی سننہ الکبریٰ (کما فی تخریج الزیلعی) عن حکیم بن حزامؓ قال قلت یا رسول اللہ انی رجل ابتاع ھذہ البیوع وابیعھا فما یحل لی منھا وما یحرم قال لا تبیعن شیئاً حتی تقبضہ واما تایدہ بالمعقول فلان علۃ ھذا النھی کما فی الھدایۃ غرر انفساخ العقد علی اعتبار الھلاک لانہ اذا ھلک قبل القبض ینفسخ البیع وعاد الی قدیم ملک البائع فیکون المشتری بائعاً ملک غیرہ الخ کذا فی الکفایۃ والحدیث الذی فیہ النھی عن بیع مالم یقبض معلول بہ عملا بدلائل الجواز کما فی الھدایۃ باب المرابحۃ والتولیۃ وظاہر ان ھذا الغرر منتف فی الملوک بحکم الارث لعدم احتمال الانفساخ فیہ کما ھو ظاہر فلا یشملہ الحدیث ولا قول محمدؒ فافھم وتامل، خلاصہ جواب یہ کہ اگر یہ مبیع اشیاء منقولہ بھی ہوتیں تب بھی بیع جائز ہوتی اور اگر غیر منقول فی معرض ہلاک ہوتی تب بھی جائز ہوتی، تو یہاں بدرجہ اولیٰ بلاشبہ بیع درست ہو گئی، البتہ اگر یہ مبیع ایسے شخص کے قبضہ میں ہو کہ نہ بائع اس سے بدون نالش کے لے سکتا ہے، اور نہ مشتری بدون نالش کے لے سکتا ہو، تو بوجہ غیر مقدور التسلیم ہونے کے بیع جائز نہ ہوگی، علی الاختلاف بین کونہ فاسداً او باطلاً کما فی الدر المختار و رد المحتار ص ۳، ۱۷، ۴، ۱ من جلد الرابع ۲۲ ربیع ۱۳۲۲ھ

(امداد ثالث ص ۱۹۰)

ایسے شخص کو زمین فروخت کرنا جو اس میں مندر بنائے

سوال (۲۴) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید ایک اراضی بضرورت حوائج خانہ داری واداے قرض وغیرہ ایک ہندو کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا ہے، اور غالب ہے کہ ہندو مذکور اس میں شوالہ وغیرہ بنائے، ایسی صورت میں زید کو اراضی مذکور کا اس ہندو کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب۔ جائز ہے، ولا باس ببیع العصیر ممن یعلم انہ یتخذہ خمرا وان آجر بیتا لیتخذ فیہ بیت نار او کنیسۃ او بیعۃ او یباع فیہ الخمر بالسواد فلا باس بہ ھدایہ ج ۴ ص ۴۵۶ واللہ اعلم۔

۴ شعبان ۱۳۰۲ھ (امداد ج ۳ ص ۲۶)

کسی زمین پر کفار کے قبضہ کا موجب ملک ہونا اور ایسی زمین میں درخت لگانے والا درختوں کا مالک ہوگا

سوال (۲۵) ایک سڑک سرکار کی جانب سے نکالی گئی، اور اس کا معاوضہ زمینداروں کو نہیں دیا گیا، اور زمینداروں کو معاوضہ نہ دینے کی یہ وجہ بیان کی گئی کہ سڑک پبلک یعنی عوام کی ہے، قاعدہ کی رو سے معاوضہ نہیں مل سکتا اور سڑک کے کنارے کنارے درخت لگانے کی اجازت عام لوگوں کو بایں شرط دی جاتی ہے کہ درخت لگانے والا پھل کا مالک رہے اور درخت خشک ہو جانے کے بعد لکڑی کاٹ کرلے جا سکتا ہے اور درخت شاداب اور کھڑا سرکار کا ہے، آیا درخت لگانے والا اس کے پھل کو بطور ملکیت خود فروخت کر سکتا ہے شرعاً جائز ہے یا نہیں، بینوا توجروا،

الجواب، استیلاء سرکار سے اس سڑک کی زمین اصلی مالک کی ملک سے خارج ہو گئی۔ جب باجازت سرکار کسی نے اس میں درخت لگایا، اس کا پھل بھی مملوک اس ہی لگانے والے شخص کا ہے، اس لئے اس پھل کا فروخت کرنا جائز ہے، جبکہ پھل نمودار ہو گیا ہو، اور کام میں لانے کے قابل ہو گیا ہو، ۱۱ صفر ۱۳۲۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۴۹)

نسخہ میں لکھی ہوئی دواؤں کی مقدار سے کم دینا یا تیار شدہ دواؤں میں سے کچھ رکھ لینا

سوال (۲۶) ایک حکیم صاحب کی زیر نگرانی ایک عطار ادویہ مفرد و مرکب فروخت کرتا ہے اس طریق پر کہ حکیم صاحب مریض کے حسب حال نسخہ لکھ کر اس عطار کو دیدیتے ہیں، مریض کو اس امر کی اطلاع بھی نہیں ہوتی کہ کیا ادویہ میرے واسطے تجویز ہوئی ہیں، بس عطار نے جو کچھ ادویہ دیدیں وہ بخوشی لیکر قیمت نسخہ دے گئے، اس صورت میں اگر عطار حکیم صاحب کے لکھے ہوئے اوزان سے قصداً یا بلا قصد ادویہ کم دیدے تو گنہگار ہوگا یا نہیں؟ اور قیمت نسخہ بتلاتے وقت عطار یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ جس قدر دوا تم کو دی جاوے گی اس کی یہ قیمت ہوگی۔ اور ایک اس عطار کا یہ بھی معمول ہے کہ جب حکیم صاحب کسی کے واسطے کوئی معجون یا خمیرہ یا حلوا

تجویز فرماتے ہیں تو یہ عطار اس آدمی سے کہہ دیتا ہے کہ تمہارے واسطے حکیم صاحب نے معجون یا حلوا وغیرہ تجویز فرمایا اور سب کی لاگت وغیرہ تین روپے یا پانچ روپے ہوتی ہے سو تم اس قدر دام جمع کردو تو یہ حلوا وغیرہ تیار کردیا جاوے۔ جب مریض دام دیتا ہے تب عطار دوا تیار کردیتا ہے اور دوا تیار ہونے کے بعد کچھ معجون وغیرہ خود بھی رکھ لیتا ہے، اور جس معجون کی تین روپے لاگت بتلائے ہیں وہ اصل لاگت دو روپے ہیں مگر عطار نے دوا پیسنے کوٹنے بنانے کی محنت وغیرہ لگاکر قیمت کل تین روپے بتلائے ہیں اور اس بات کو مریض بھی جانتا ہے کہ عطار نے اپنی محنت وغیرہ تمام اس میں لگائی ہے یہ تمام صورتیں جو عرض کیں اس میں کون سی جائز و کون سی ناجائز ہے، اور قیمت حلوا وغیرہ کی پیشگی لیکر بعد میں تیار کردینا کیسا ہے؟

الجواب، کم دینا دھوکہ ہے، کیونکہ مریض کو یہی خیال ہے کہ نسخہ کے موافق ادویہ دی ہیں البتہ اگر یہ کہدے کہ نسخہ سے دوائیں کم ہیں تو کچھ مضائقہ نہیں، اور جو دوا دام لیکر بنائی ہے اس کا حساب پورا بتانا واجب ہے اور وہ سب بنی ہوئی دوا ملک مریض کی ہے، اس میں سے خود رکھ لینا حرام ہے۔ (تتمہ اولیٰ ص ۱۵۴)

بائع و مشتری کی موجودگی میں مبیع کا ایک مرتبہ تولنا کافی ہے

سوال (۲۷) اشیاء موزونہ اگر بائع و مشتری کی موجودگی میں وزن کی گئی تو مشتری کو بلا اعادۂ وزن صرف کرنا اور بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، جائز ہے، فی الخانیۃ لو اشتری کیلیاً مکایلۃً او موزوناً موازنۃ فکال البائع بحضرۃ المشتری، قال الامام ابن الفضل یکفیہ کیل البائع ویجوز لہ ان یتصرف فیہ قبل ان یکیلہ اھ شامی ج ۴ ص ۲۵۵، فقط۔ (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۰)

کسی کے نام جائیداد خریدنے سے اس کی ملک نہ ہونا

سوال (۲۸) کیا فرماتے ہیں علمائے دین رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین اس مسئلہ میں کہ مثلاً زید نے اگر اپنے بیٹے عمرو کے نام کسی مصلحت سے بعوض اپنے مال کے کوئی معاش خرید کی جیسا کہ فی زماننا اکثر رائج اور عرف میں بنام اسم فرضی مشہور ہے تو آیا وہ معاش زید کی ملک ہوگی یا عمرو کی اور بھی زید کو اس میں اختیار نقل و تصرف مثل بیع و ہبہ وغیرہ کا ہے یا نہیں، بینوا توجروا۔

الجواب، رکن بیع کا ایجاب و قبول ہے، جن کے درمیان ایجاب و قبول ہوا مبیع اسی کی ملک ہوگی، پس زید نے اگرچہ بمصلحت اپنے بیٹے کے نام سے معاش خرید کی زید ہی کی ملک ہوگی، نظیر اس کی بیع تلجیہ ہے کہ دو شخص کسی وجہ سے بیع ظاہر کریں، اور مقصود بیع نہ ہو، سو وہ بیع مفید ملک نہیں ہوتی جب باوجود ایجاب و قبول کے بوجہ عدم قصد ثبوت حکم کے ملک نہیں ہوتی تو جس کے ساتھ ایجاب و

قبول تک نہیں ہوا اور نہ اس کے ہاتھ بائع کا بیچنے کا قصد ہے نہ اس کے لئے مشتری کا خریدنے کا قصد ہے اس کی ملک کیونکر ہو سکتی ہے. فی الدر المختار وبیع التلجئة وھو ان یظھرا عقدا وھما لا یریدانه یلجا الیه لخوف عدو وھو لیس ببیع فی الحقیقة بل کالھزل اھ پس مشتری ہی کی ملک ہو گی اور اس کو تصرفات مالکانہ جائز ہوں گے، تاوقتیکہ کوئی سبب صحیح موجب انتقال ملک جس سے عمر کی ملک ہو جائے نہ پایا جائے، ہاں بعض اشیاء میں بوجہ عرف کے نفس اشتراء سے مشتری لہٗ کی ملک ہو جاتی ہے، جیسے چھوٹے بچے کے لئے کپڑے بنائے جاویں نفس اتخاذ سے اس کی ملک ہو جاتے ہیں فی الدر المختار عن الخلاصة وفیھا اتخذ لولدہٖ اولتلمیذہ ثیابا ثم اراد دفعھا لغیرہ لیس له ذلك مالم یبین وقت الاتخاذ انھا عاریة انتھی، نہ اس وجہ سے کہ اشتراء لہٗ موجب ملک ہے. بلکہ اس وجہ سے کہ قرائن دال ہیں ہبہ پر اور ہبہ للصغیر میں باپ کا ایجاب اگرچہ دلالۃً ہو کافی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر اعارہ کی تصریح کر دے تو صغیر کی ملک نہیں ہوتی، کما مر اور یہی وجہ ہے کہ کبیر کے لئے اگر کپڑے بنائے تو قبل تسلیم اس کی ملک نہ ہوں گے. فی رد المحتار تحت قوله لولدہٖ ای الصغیر واما الکبیر فلا بد من التسلیم کما فی جامع الفتاوی انتھی، اور زمین وغیرہ خریدنے میں جب قرائن عدم ہبہ پر دال ہیں تو ہبہ بھی صحیح نہیں ہوا، پس نہ بیعًا نہ ہبةً کسی طرح بیٹے کی ملک نہیں خواہ صغیر ہو یا کبیر واللہ اعلم وانما اطلنا الکلام فی ھذا المقام لانه من مطارح الاعلام فکم من اقدام نبید علت وکم من افہام فیه ضلت واللہ ولی العصمة۔ (امداد ثالث ص ۱۰۲)

خریدن جائداد بنام شخصے دیگر | **سوال (۲۹)** ما قولکم رحمکم اللہ تعالیٰ دریں کہ زید نے اپنے زرکسوبہ سے ایک موضع میں اپنے ایک پسر مسمیٰ عمرو کے نام جو وقت اشتراء نابالغ تھا بقدر ۳/۲ پائی کے حصہ خرید کر دیا اور اسی طرح ۲/۱ حصہ دوسرے پسر مسمیٰ بکر کے بحالت نابالغی خرید کر دیا ہے. یہ ہر دو پسران بطن زوجہ اولیٰ سے ہیں. اور چند عرصہ تک ولایۃً اپنے زیر انتظام رکھ کر کئی سال قبل از ممات خود حصص خرید کردہ مذکورہ عمرو و بکر کو دیدیا، اب عند الشرع یہ حصص مملوکہ عمرو و بکر ہیں یا ترکہ زید؟

الجواب، کسی کے نام خرید کرنے سے تو خود ہی مالک ہوا تھا، مگر جواب ان لڑکوں کو دیدیا تو وہ لڑکے یعنی عمرو و بکر مالک ہو گئے، ترکہ زید میں داخل نہیں، البتہ یہ دینا اگر موافق شرائط شرع کے نہ ہو تو موجب ملک نہیں ہو گا، اور اس صورت میں ترکہ زید میں داخل ہو گا،

۳۰ ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ

(تتمہ اولیٰ ص ۱۹۲)

کسی دوسرے کے نام جائداد خرید کرنا

سوال (۳۰) ایک شخص نے جائداد کا کچھ حصہ اپنے لڑکے کے نام سے خرید کر انتقال کیا تو وہ حصہ سب ورثہ میں تقسیم ہوگا یا کیا کسی کے نام سے خریدنا ہبہ سمجھا جا سکتا ہے، یا یہ فعل مہمل ہے، آج کل یہ معاملہ بکثرت رائج ہے، اس کی طرف پوری توجہ ضروری ہے۔

الجواب. کسی کے نام سے جائداد خریدنے کے بارہ میں میں نے بہت دفعہ غور کیا، اور غالباً ایک دو بار لکھا بھی ہے، ہبہ تو کسی طرح ہو نہیں سکتا، کیونکہ ہبہ ہوتا ہے بعد ملک کے اور یہاں پہلے سے ملک نہیں، اس اشترا ہی سے تو خود مالک ہی ہوا ہے، اور بعد اشترا، کوئی عقد پایا نہیں گیا البتہ اگر بعد اشترا کے کوئی تصرف موجب تملیک پایا جاوے، تو بیشک ملک اس کی ہو جاتی، واذلیس فلیس، اس لئے یہ فعل مہمل ہے، اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ یہ اشترا، فضولی ہے تو اس مشتری لہٗ کی اجازت کے بعد اس کی ملک ہو جانا چاہئے، جواب یہ ہے کہ بیع للغیر میں تو اجازت غیر سے اس غیر پر نفاذ ہوتا ہے، مگر شرا، للغیر میں خود مشتری پر نفاذ ہوتا ہے، کذا فی الدر المختار، پس اس غیر کی تملیک کے لئے عقد جدید کی حاجت ہوگی فقط، آپ بھی غور کیجئے۔

۱۵ رشوال ۱۳۳۱ھ (حوادث اول وثانی ص ۱۲۱)

کسی کے نام جائیداد خریدنے سے اس کی ملک نہ ہونا

سوال (۳۱) زید مرحوم نے اپنی وفات سے ایک سال قبل اپنی زوجہ مسماۃ ہندہ کے نام سے دہلی میں ایک مکان خریدا، وثیقہ میں محض مسماۃ مذکورہ ہی کا نام ہے، پھر مسماۃ مسطورہ نے تقریباً ایک سال ہوا کہ مکان مذکور کو بیع بھی کر دیا، اب منجملہ زرثمن جو کچھ باقی تھا اس کو عمرو برادر کلاں زید مرحوم اور بکر داماد زید مرحوم اور خالد وبشیر برادران علاتی زید مرحوم نے مسماۃ ہندہ سے جبراً لیکر نذیر کے پاس اپنی طرف سے بطور امانت رکھوا دیا ہے، اور ہندہ زوجۂ زید مرحوم مشتریہ ومالکہ مکان کو جس کا عقد ثانی بعد عدت قدیر سے ہو گیا تھا کہا ہے کہ ہم فتویٰ لینے کے بعد جس جس وارث کو جو جو پہنچتا ہوگا خود دیں گے، کیونکہ روپیہ صرف زید مرحوم کا تھا، تیرانہ تھا، وہ ان کے ورثہ میں تقسیم ہونا ضروری ہے وہ ترکہ ہے، یہ بھی لحاظ رہے کہ زید مرحوم کی تین لڑکیاں اس وقت موجود ہیں، ایک شادی شدہ صاحب اولاد ہے، اور دو نابالغات، اب ارشاد ہو کہ بروئے شریعت غرّا کیا ہونا چاہئے بینوا توجروا۔

الجواب۔ کسی کے نام جائداد خریدنے کی حقیقت یہ ہے کہ اس کو ہبہ کرنا مقصود ہوتا ہے اور ہبہ کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ موہوب وقت ہبہ ملک واہب میں ہو، اور ظاہر ہے کہ ملک بعد اشترا کے ثابت ہوگی، سو اس سے بعد کوئی عقد دال علی التملیک ہونا چاہئے، اور بدون اس کے

وہ مشتری لہ مالک نہ ہوگا بلکہ وہ بدستور ملک مشتری کی رہے گی۔ پس اس بنا پر یہ جائداد ملک زید مرحوم کی قرار پاکر داخل ترکہ ہوگی، اور مثل دیگر ترکہ کے ۲۴ [ف] سہام پر منقسم ہوکر ہندہ کو ۳ اور اور دونوں [۲] دختروں کو ۸، ۸ اور عمرو کو ۵ ملیں گے، اور خالد اور بشیر محروم ہیں، اور یہ تقسیم میراث بعد تقدیم حقوق متقدمہ علی الارث مثل ادائے مہر و دیگر قرضہ وغیرہ کے ہوگی،

۲۱ رجب ۱۳۲۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۹۸)

نرخ ٹھیر اکر بلا ایجاب و قبول مبیع پر قبضہ کر لینا کافی ہے

سوال (۳۲) اگر بیع میں ایجاب و قبول نہ ہوا بلکہ مشتری نے نرخ ٹھہرا کر اور قیمت بتلا کر کہ اس قدر داموں کی دیدو بائع سے شئے مبیعہ لیکر اپنے قبضہ میں کرلی تو قبل ادائے ثمن مشتری کو مبیع کے واپس کرنے کا اختیار ہے اور بیع ناتمام سمجھی جائیگی یا نہیں

الجواب، بیع تمام ہوگئی، واپسی کا اختیار نہیں، فی الدر المختار ولو التعاطی من احد الجانبین علی الاصح فتح به یفتی فیض الخ ومثل له فی رد المحتار بعین ما سئل عنه، ج ۴ ص ۱۶ فقط

۱۱ شعبان ۱۳۲۹ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۰)

کٹھل کا مسلم خریدنا

سوال (۳۳) کٹھل کا مسلم خریدنا کہ معلوم نہیں کہ اس میں کس قدر کوا ہے اس حالت میں اس کو خریدنا مباح ہے یا نہیں ؟

الجواب۔ اگر کووں کا کوئی خاص عدد خرطہ ٹھہرایا جاوے تو اس کی بیع مسلم کی درست ہے خواہ کم نکلے یا زیادہ، فقط (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۰)

بیع و شراء کا وعدہ حکم میں بیع و شراء کے نہیں

سوال (۳۴) عمرو نے زید سے کہا کہ تم مجھ کو یک صد روپیہ کا مال جفت پاپوش منگادو، میں تم سے ۵ر کا منافع دے کر ادھار ایک ماہ کے واسطے خرید کرلوں گا، یا جس قدر مدت کے واسطے تم دوگے اسی حساب سے منافع دونگا، یعنی پانچ روپے یک صدی کا منافع ایک ماہ کے واسطے ہو، جب مال آجاوے گا اس وقت مدت ادھار اور منافع کی معین ہوجاوے گی۔ اس کے جواب میں زید نے کہا کہ میں منگا دوں گا، مگر اطمینان کے واسطے بجائے یک صد کے دو صد کا رقعہ لکھادو گا تاکہ تم خلاف عہدی نہ کرو، عمرو نے منظور کیا ؟

الجواب، اس میں دو مقام قابل جواب ہیں، ایک یہ کہ زید و عمرو میں جو گفتگو ہوئی یہ وعدہ محضہ ہے کسی کے ذمہ بحکم عقد لازم نہیں، اگر زید کے منگانے کے بعد بھی عمرو انکار کردے تو زید کو مجبور کرنیکا

[ف] کل ترکہ ۷۲ سہام پر منقسم ہوکر ہندہ کو ۹ اور تین دختروں میں سے ہر ایک کو ۱۶، ۱۶، ۱۶ اور عمرو کو ۱۵ ملیں گے ۱۲ رشید احمد عفی عنہ؛ [۲] سوال میں تین دختروں کا ذکر ہے اس لئے مسئلہ کی تخریج اسی طرح ہوگی جو مفتی رشید احمد صاحب نے حاشیہ میں فرمائی ہے ۱۲ سعید احمد۔

کوئی حق نہیں، پس اگر عرف و عادت میں عمرو مجبور سمجھا جاتا ہو تو یہ معاملہ حرام ہے، ورنہ حلال، اسی طرح عمرو کو اور مثل عمرو کے زید کو بھی یہ اختیار حاصل ہے کہ وعدۂ بیع برقائم رہنے کی صورت میں منافع کی مقدار میں تغیر و تبدل کردیں، یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایک ماہ کے ادھار کی صورت میں پانچ روپے سیکڑہ نفع کا ٹھہراتھا، باقی زیادہ لکھانا یہ بیع بمنزلہ نفی مقدار الثمن ہے، اگر عمرو کی بدعہدی کی صورت میں بھی زید مقدار واقعی ثمن سے زیادہ وصول نہ کرے تو جائز ہے ورنہ حرام ہے، نیز زید پر واجب ہوگا کہ ورثہ کو اس کی اطلاع کردے تاکہ زید کے بعد وہ عمرو کو پریشان نہ کریں۔ ۲۰ محرم ۱۳۳۵ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۱)

بیع و شراء کا وعدہ حکم میں بیع و شراء کے نہیں

سوال (۳۵) عمرو نے زید کو مبلغ سو روپے واسطے خریدنے جفت پاپوش کے دیئے اور کوئی اجرت بطور معاوضہ خریداری کے قرار نہیں پائی، متعاقدین میں اجرت کی نسبت ذکر بھی نہیں آیا، اور قبل خریداری مال اور دینے زر کی قیمت کے باہمی یہ امر طے ہوچکا تھا کہ یہ مال مبلغ سوا چھ روپے سیکڑہ کے منافع سے بمیعاد ایک مہینے کے تم کو دیدیں گے، مال دساور[1] سے خرید کر زید اپنے گھر لے آیا، اور عمرو کو بلا کر مال دکھلا کر جوڑ دیا یعنی شمار کرادیا، اور دونوں نے سمجھ لیا کہ یہ مال مبلغ سو روپے کا ہے، اس کے بعد عمرو نے زید سے دریافت کیا کہ تم یہ مال ہم سے کس قدر مدت کے واسطے بشرح منافع مذکور بالا لیتے ہو، زید نے کہا کہ ایک ماہ کے واسطے لیتا ہوں، عمرو نے اس کو قبول کیا، بعد ختم ہونے مدت ایک ماہ کے عمرو نے زید سے اصل روپیہ مع منافع طلب کیا، زید نے صرف منافع مبلغ سوا چھ روپے عمرو کو دے کر اصل روپیہ کی نسبت عذر کیا کہ میرے پاس اس وقت موجود نہیں ہے، بلکہ کچھ مال موجود ہے کچھ نقد ہے اور کچھ اُدھار میں ہے عمرو نے کہا کہ اگر تمہارے پاس زر اصل موجود نہیں ہے تو تم اس کے عوض میں اس قدر مال آئندہ کے لئے مجھ کو دے کر اور جوڑ دو اگر پھر ہم سے اس کو خرید لو، زید نے مبلغ سو روپے کا مال اپنے پاس دکھلایا، اور عمرو کو دے کر جوڑ دیا، اور پھر بشرح منافع بالا عمرو سے خرید لیا، اور مدت کبھی ایک ماہ تراضی طرفین سے قرار پاتی ہے، اور کبھی زائد۔

الجواب - یہاں دو بیعیں علی سبیل التعاقب ہیں، ایک وہ کہ زید نے عمرو سے مال خریدا اس کا حکم یہ ہے کہ اگر زید عمرو کو اور عمرو زید کو بیع و شراء پر بنا بر وعدۂ سابقہ مجبور نہ کرے تو جائز ہے، اور اگر مجبور کرے ناجائز ہے، دوسرے بیع وہ جو سو روپیہ بقیہ زر ثمن کے عوض میں زید نے عمرو کو دیا، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس میں یہ شرط ٹھہری کہ پھر عمرو سے زید اس کو خرید لے گا تو حرام ہے، اور اگر یہ شرط نہ ٹھہری پھر اگر خرید لے آزادی سے جدید رائے سے خرید لے تو جائز ہے۔

(تتمہ اولیٰ ص ۱۶۴)

[1] دساور پردیس ۱۲ اس

مال تجارت لانے کے لئے اجیر بنانا پھر اجیر کے ہاتھ فروخت کرنا

سوال (۳۶) زید نے عمرو سے کہا کہ میں تم کو روپیہ دیتا ہوں، اور تمہارے لانے کی اور بار برداری کی اجرت دکرایہ دیتا ہوں، تم میرے اجیر بن کر مال لا دو تاکہ پھر تم اس مال میں نقص نہ بتاؤ۔

الجواب: اس کہنے سے عمرو کا حق مال کو ناقص بتلانے کا وقت بیع مرابحہ فیما بینہما زائل نہیں ہوا، عمرو کو مثل مشتری اجنبی کے تمام حقوق حاصل ہیں، البتہ زید کو یہ اختیار ہے کہ جس وقت عمرو اجیر وکیل بننے کی حیثیت سے مال لایا ہے اگر ناقص مال لانے سے منع کر دیا تھا تو ناقص ہونے کی صورت میں عمرو سے بوجہ مخالفت کرنے کے روپیہ لے مگر جب مال کو قبول کر لیا تو زید کو تو کوئی حق نہیں رہا، مگر عمرو کو بھی حق حاصل ہے۔ (تتمہ اولیٰ ص ۶۲)

وکیل بالشراء نے مؤکل کے مال کے ساتھ کچھ اپنا مال بھی خریدا اب اس کو مؤکل سے بطور مرابحہ خریدنا جائز ہے یا نہیں!

سوال (۳۷) زید نے عمرو کو روپیہ دیا اور عمرو مال خرید کر لایا اور اپنے گھر اتارا اس میں اپنا بھی ذاتی مال اور زید کے روپیہ کا بھی شامل ہے پھر اس کو تقسیم کیا تقسیم کر کے زید کے روپے کا مال زید کے سپرد کر دیا، اور شمار کرا دیا زید نے قبضہ کر کے عمرو سے کہا کہ تم اپنے وعدہ کے موافق اگر خرید کرتے ہو تو کس قدر مدت کے واسطے ادھار خریدتے ہو، عمرو نے کہا ایک ماہ کے واسطے خریدتا ہوں اور پانچ روپے منافع کے قسط وار ہر ہفتہ ایک روپیہ دیتا رہوں گا، غرض آخر ماہ تک منافع کا روپیہ بے باق کر دوں گا اور اصل دیدوں گا۔

الجواب۔ (قولہ زید نے عمرو کو الیٰ قولہ تقسیم کیا) اقول اگر باذن زید روپیہ شامل ہوا ہے تو یہ بیع تو زید کے ذمہ لازم ہوگئی، مگر پھر زید و عمرو میں جو بیع مرابحہ ٹھہری ہے وہ جائز نہیں ہاں مستقل بیع بلا قید مرابحہ ہو تو جائز ہے، البتہ اگر زید کے روپے کا مال بالکل الگ خریدا ہے، اور الگ ہی رکھا تب مرابحہ جائز ہے (قولہ تقسیم کر کے الیٰ قولہ اصل دیدوں گا) اقول اگر زید کے روپیہ کا خریدا ہوا مال بالکل علٰحدہ ہوتا تب یہ بیع درست ہوتی، بشرائط مذکورہ نمبر ۱ و نمبر ۲[1]۔ ۲۰ محرم ۱۳۳۳ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۲)

وکیل بالشراء نے اپنے مؤکل سے مال خریدا اور ثمن قسط وار دینے کا وعدہ پورا نہ کیا

سوال (۳۸) عمرو اپنے عہد کے موافق ایک ماہ کے بعد زید کو روپیہ نہیں دیتا، اور روپیہ جمع کر رکھا ہے، اور اس روپے سے اب خود مال لاتا ہے اور فروخت کرتا رہتا ہے، منافع اٹھاتا ہے، کبھی ڈیڑھ ماہ میں کبھی دو ماہ میں، غرض خلاف عہد زیادہ مدت میں روپیہ اصل مع منافع کے دیتا ہے، مگر جس قدر مدت عہد سے زیادہ ہوتی ہے نہ اس کا منافع طلب ہوتا ہے نہ دیا لیا جاتا ہے،

[1] مراد اوپر کے دو سوال و جواب ہیں ۱۲ منہ نمبر ۱ یہاں سوال ۳۵ ہے اور نمبر ۲ یہاں سوال ۳۶ ہے ۱۲ س

الجواب۔ جب زیادہ نہیں لیا جاتا زید پر کوئی گناہ نہیں، عمرو پر وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا مگر شرائط وعدہ کا لحاظ واجب ہے[1]۔ ۳۰ محرم ۱۳۳۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۲)

اجیر لانے والے کے ہاتھ نفع پر مال فروخت کرنا اور ثمن کی میعاد مقرر کرنا۔

سوال (۳۹) عمرو نے زید کو مبلغ ستانوے روپے واسطے خرید لانے مال کے دِیساور سے دیئے، اور مبلغ تین روپے اجرت خریداری کے زید کو دیدیئے، زید نے دساور سے مال جفت پاپوش کا قیمتی ستانوے روپے کا لاکر عمرو کے چھوڑ دیا، اور مال اپنے ہی مکان پر لاکر اتارا عمرو کے مکان یا دکان پر نہیں اُتارا، عمرو نے قبل منگوانے مال کے یہ شرط کرلی تھی کہ جس وقت تم مال ہمارا چھوڑ دو گے ہم کو اختیار ہوگا خواہ ہم تم کو دیدیں گے یا اپنی دوکان یا مکان پر لے جائیں گے۔ اور تم کو نہیں دیں گے، عمرو نے بعد چھوڑ لینے کے زید سے دریافت کیا کہ تم یہ مال کس طریقہ سے لیتے ہو زید نے کہا کہ پانچ ماہ کے لئے لیتا ہوں، اور مبلغ اٹھارہ روپے منافع کے دوں گا، اور زر اصل و منافع دونوں ملاکر جو رقم ہوگی (مثلاً صورت موجودہ میں ستانوے اصل اور اٹھارہ منافع کے کل مبلغ ایک سو پندرہ روپے ہوئے) اس کو پانچ روپے بارہ آنہ ہفتہ کے حساب سے ادا کروں گا۔

الجواب۔ یہ بیع مرابحہ بتاجیل الثمن ہے، اور بقیود مذکورۂ سوال درست ہے۔

۲۰ محرم الحرام ۱۳۳۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۵)

نابالغ بلا اذن ولی ادھار کوئی چیز خریدے تو ثمن بعد بلوغ واجب ہوگا یا نہیں۔

سوال (۴۰) نابالغ نے کوئی چیز خریدی بلا اذن ولی اور ثمن ادا نہیں کیا تو بالغ ہونے کے بعد ادا کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب۔ اگر بعد بیع کے ولی نے اذن دیدیا تب تو بیع صحیح ہوگئی، اور ثمن واجب ہوگیا، بعد بلوغ کے بھی ادا کرنا ہوگا، اور اگر اذن نہیں دیا اور وہ شے ہلاک ہوگئی تو ادا کرنا واجب نہ ہوگا۔ فی الدرالمختار اول کتاب الحجر الصبی المحجور مواخذ بافعاله الی قوله الا فی مسائل وعد منها، مابیع منه بلا اذن اھ وجهه ان التسلیط وجد من المالك۔ (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۷)

بیع وارث جائداد را کہ دراں حق موصی لہ باشد

سوال (۴۱) زید بائع عمرو مشتری کے ہاتھ اس جائداد کو جس میں وصیت کی گئی تھی اور جس کو موصی لہم نے قبول کرلیا تھا بغیر ادائے حق موصی لہم فروخت کرکے کل زر ثمن اپنے تصرف میں کیا، اور موصی لہم کو ان کا حق نہیں دیا، تو اس صورت میں موصی لہم کا مطالبہ عمرو مشتری سے ہوگا کہ جائداد اس کے قبضہ میں ہے یا زید بائع سے فقط۔

الجواب۔ دوسرے شخص کی ملک کو بلا اس کے اذن کے بیچنا بیع فضولی ہے، جس کے فسخ اور اجازت کا مالک کو اختیار ہے، پس اگر اس بیع کو موصی لہم جائز رکھیں تو ان کا حق ثمن میں متعلق ہوگا جس کا

---

[1] جو بیان سوال ۳۴ و ۳۶ میں ہوا کیونکہ یہ بیع لہ دیساور: پردیس ۱۲ س

زید بائع سے مطالبہ کریں گے، اور اگر اس بیع کو موصیٰ لہم رد کردیں تو پھر اختیار ہے، خواہ زید بائع سے جائداد کا مطالبہ کریں کہ وہ غاصب ہے، اور خواہ عمرو مشتری سے اور پھر وہ اس کا ثمن زید بائع سے لیگا، اور اگر بعض موصیٰ لہم جائز رکھیں اور بعض جائز نہ رکھیں تو ہر ایک کے لئے بتفصیل بالا جدا جدا حکم ہوگا۔ فی الدر المختار والاصح انہ ای العقار یضمن بالبیع والتسلیم الخ۔ ۸ شعبان ۱۳۳۱ھ

(تتمہ ثانیہ ص ۶۳)

مبیع میں جتنے عیوب ہوں سب کو ظاہر کرنا واجب ہے

سوال (۴۲) گھوڑے میں شرعاً کوئی عیب نہیں ہے مگر عرفاً اس کے عیوب بہت بتلائے جاتے ہیں، مسلمان کو گھوڑا بیچنے کی ضرورت ہے اگر اس عرفی عیب کو ظاہر کرتا ہے تو نقصان کا اندیشہ ہے، اگر اس عیب کو ظاہر نہ کرے تو شرعاً گنہگار تو نہ ہوگا؟

الجواب، فی الدر المختار باب خیار العیب عن القنیۃ لو ظہران الدار مشومۃ ینبغی ان یمکن من الرد لان الناس لا یرغبون فیہا اھ، اس سے معلوم ہوا کہ عیوب عرفیہ کو بھی ظاہر کرنا واجب ہے یا یوں کہہ دے کہ ہم کسی عیب کے ذمہ دار نہیں۔ (تتمہ ثانیہ ص ۱۲۰)

بیع زمین مستاجرہ

سوال (۴۳) اگر کوئی شخص اپنی زمین کا کسی شخص کو ٹھیکہ دیدے، اور زر ٹھیکہ پہلے سب وصول کرلے، تو ایسی صورت میں مالک زمین کو فروخت کرسکتا ہے یا نہیں، کیونکہ مشتری کو قبضہ بعد گذرنے میعاد ٹھیکہ کے اس صورت میں ملے گا اس سے قبل نہیں مل سکتا، تو بروقت بیع کے قبضہ نہ حاصل ہونے کی وجہ سے یہ بیع جائز ہے یا نہیں، اور اگر بائع کو اس نقصان کے عوض مشتری کو اس قدر سالوں کی آمدنی جتنے سالوں اس کا قبضہ نہیں ہونے کا بروئے حساب ٹھیکہ یا بطور تخمینہ کے دینی گوارا کرے تو یہ روپیہ لینا مشتری کو جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب، فروخت نہیں کرسکتا کہ دوسرے کا ضرر ہے، اور یہ بیع موقوف رہے گی، اور جو چیز قبضہ میں نہ آوے اس کا نفع لینا جائز نہیں تو اس نفع کا عوض بھی درست نہیں، اور مشتری پر ادائے ثمن بھی واجب نہیں، بعد انقضائے مدت اجارہ بیع نافذ ہوجاوے گی، اور مشتری کو استحقاق قبضہ کا ہوگا اور بائع پر تسلیم مبیع اور مشتری پر تسلیم ثمن واجب ہوگا، فی الدر المختار ویوقف بیعہ الی انقضاء مدتہا (ای الاجارۃ) ھو المختار، ج ۲ ص ۵۸، ۲۹ صفر ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۲۸)

کتابیں پڑھنے کے بعد ان کی بیع

سوال (۴۴) کتاب پڑھ کر فروخت کرنا جائز ہے یا ناجائز وجہ شبہ یہ کہ اس کا پڑھنا ہی اس کا استعمال ہے بہر مستعمل کے دام کم ہوتے ہیں۔

الجواب، اگر استعمال سے کچھ رونق وغیرہ میں کمی ہوگئی ہو تو مشتری کو اطلاع کردینا

بوقت بیع کے واجب ہے۔ ۲۵ ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۳۶)

عدم انعقاد بیع بدون بیع نامہ

سوال (۵۴) کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنا مکان متصل مسجد بیچنا تھا پارہ رائے پور متولیان مسجد مذکور کے ہاتھ مسجد کے مصرف کیلئے بیع کرنے کا معاہدہ کرکے دس روپے پیشگی لے کر رسید لکھ دیا اور بقیہ قیمت مبلغ ساللعہ ۳۴۰ روپیہ وصول پانے پر بیع نامہ لکھ کر تکمیل رجسٹری کا اقرار کیا، لیکن ایک ہی دو روز کے بعد زید نے اس مکان کو بکر کے نام ہبہ کر دیا اور ہبہ نامہ کو رجسٹری کرا دیا، شرائط ہبہ نامہ یہ تھے کہ بکر تا حین حیات زید اس کے اخراجات کا کفیل رہے! در اگر زندگی اور قوت قائم رہے تو زید کو حج کرنے کا پورا خرچ دے اور بصورت موت اس کے تجہیز و تکفین فاتحہ چہلم وغیرہ کا بار اپنے ذمہ لے، اس تحریر ہبہ نامہ کے بعد زید چند مہینہ تک زندہ رہا اور متولیان مسجد نے نہ اپنے دس روپے زر پیشگی کا تقاضا کیا، اور نہ تکمیل تحریر بیعنامہ کے لئے زید کو مجبور کیا، زید نے وہ دس روپے کی رقم اپنے ایک ہی خواہ کے پاس تحریر رسید کے وقت امانت رکھا تھا اور وہ شخص مسجد کے انتظامیہ انجمن کا ایک جوشیلہ ممبر ہے، اور بیعنامہ کرانے کے لئے رسید لکھانے کا محرک بھی تھا، زید کا انتقال ہوگیا، مگر یہ رقم دس روپے کی ممبر مذکور سے واپس نہیں لی، اور نہ اس رقم کے لئے کوئی زبانی وصیت کی، بعد انتقال زید متولیان و ممبران مسجد کمیٹی نے بکر کو تجہیز و تکفین نہ کرنے دیا۔ اور اپنے خیال کے مطابق ہبہ نامہ کو ناجائز سمجھ کر اور اس دس روپیہ کی رسید کو مکمل بیعنامہ سمجھ کر بقیہ رقم ساللعہ ۳۴۰ میں سے قریب ساٹھ روپے کے زید کی تجہیز و تکفین فاتحہ، چہلم وغیرہ میں صرف کیا، بکر نے مجبور ہو کر فاتحہ چہلم وغیرہ کیا، مگر تجہیز و تکفین سے بجبر ممبران مسجد باز رہا۔ اور اس سختی کے برتاؤ سے رنجیدہ ہو کر ایک شخص غیر خالد کے ہاتھ مکان مذکور کا مبلغ دو سو روپیہ پر بیع کر کے رجسٹری کرا دیا، اور قبضہ دخل بھی دیدیا، اب ممبران مسجد عدالت سے چارہ جو ہیں کہ زید کے معاہدہ کی بنا پر تماعہ ۳۵۰ میں سے دس روپیہ زید نے رسید لکھتے وقت نقد لئے تھے اور ۶۰ اس کی تجہیز و تکفین و فاتحہ وغیرہ میں صرف ہوا، اس لئے بقیہ الفہ ۲۸۰ روپے میں سے خرچہ نالش وغیرہ وضع کرنے کے بعد بقیہ قیمت پر خالد بیعنامہ کر دینے پر مجبور کیا جاوے پس استفسار یہ ہے (۱) آیا معاہدہ زبانی و تحریر رسید بنام ممبران مسجد حکم بیعنامہ کا رکھتا ہے، اگر حکم بیعنامہ کا رکھتا ہے تو قیمت مکان بعد زید کے انتقال کے کس کو دی جاوے اس لئے کہ زید نے اپنا کوئی وارث نہیں چھوڑا ہے، اور نہ یہ معلوم ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی وارث موجود ہے یا نہیں، کیونکہ زید بذات خاص کسی غیر جگہ سے آکر آباد ہوا تھا، اور کچھ پتہ و نشان نہیں بتلایا (۲) اور اگر یہ معاہدہ بیعنامہ نہیں ٹھہرا تو بکر کے نام ہبہ نامہ جائز ہوا یا نہیں، اور اگر خالد سے از سر نو زر ثمن مقرر کر کے یہ مکان مسجد کی رقم سے ممبران

مسجد خرید لیں تو یہ زمین توسیع مسجد و دیگر مصرف مسجد میں لائی جا سکتی ہے یا نہیں، بینوا توجروا،

الجواب، یہ معاہدہ جو فیما بین زید و متولیان مسجد کے ہوا یہ بیع شرعی نہیں محض وعدہ ہے جس کا بلا وجہ خلاف کرنا عند اللہ موجب مواخذہ ہوتا ہے لیکن قضاءً اس میں مجبور نہیں کیا جا سکتا خاص کر جب کہ قبل تکمیل وہ وعدہ کرنے والا بھی مرجائے، پس جب یہ بیع نہیں ہے تو اس کو شرعاً اختیار تھا کہ بکر کے نام ہبہ کردے، اور گو جن شرائط مذکورہ فی السوال پر ہبہ کیا ہے، یہ شرائط فاسد ہیں، مگر ہبہ شرائط فاسدہ سے فاسد نہیں ہوتا، خود وہ شرائط ہی باطل اور لغو ہو جاتی ہیں، پس اگر دوسری شرائط صحت ہبہ کی پائی گئی ہوں تو وہ مکان بکر کی ملک ہوگیا، اور اگر شرائط صحت کی نہ پائی گئی ہوں تو مکان زید کی ملک بدستور رہا۔ لیکن متولیانِ مسجد سے کسی حال میں اس مکان کا کوئی تعلق نہیں رہا، جیسا ان کا غلط خیال ہے، اور اس لئے اس غلط خیال کی بنا پر جو کچھ انھوں نے خرچ کیا ہے اس کے ذمہ دار وہ خود ہیں، وہ اس رقم کو نہ تحویلِ مسجد سے وصول کر سکتے ہیں نہ کسی اور شخص سے، اس کا تاوان خود ان پر پڑے گا۔ پھر آگے جو بکر نے خالد کے نام بیع کردیا ہے اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر مکان زید کی ملک تھا تب تو یہ بیع درست نہیں ہوئی اور بدستور زید کی ملک رہا، اور اگر بکر کی ملک تھا تو اب خالد کی ملک ہوگیا بہر حال مکان اب بکر کی ملک تو نہیں ہے یا تو زید کی ملک ہے اور یا خالد کی، پس اگر خالد کی ملک ہے تب تو اس سے کسی قسم کا جبر خالد پر جائز نہیں ہاں اس کی رضا سے خریدنا درست ہے، اور اگر زید کی ملک ہے اور کوئی اس کا وارث معلوم نہیں تو اول اس کے کرایہ وغیرہ سے مسجد کے دس وصول کئے جاویں اور اس کے ورثہ کو تلاش کیا جاوے جب یاس ہو جاوے تو اس وقت مکرر سوال کیا جاوے، کہ لاوارث مال کا شرعاً کیا حکم ہے،

۱۸ ذیقعدہ ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۸۶)

سوال	
سوال (۴۶) میاں بی بی میں قبل تحریر بیعنامہ کوئی قرار داد یا ایجاب و قبول نہیں ہوا بعد تحریر بیعنامہ و رجسٹری بی بی کو معلوم ہوا۔	تحریر و رجسٹری بیعنامہ بلا اطلاع

الجواب، یہ شرعاً بیع نہیں ہوئی۔ ۴ شعبان ۱۳۳۰ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۶)

سوال	
سوال (۴۷) جناب عالی تحصیل اراضی کا روپیہ جو بذمہ کاشتکار زمیندار کا ہوتا ہے، اسی روپے کے عوض برضامندی فریقین اگر غلہ یا	بیع غلہ واجب فی الذمہ بدست صاحب حق بشرط قبض ثمن در مجلس

کوئی جنس پیداوار فصل کی خرید کرلی جاوے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب۔ جائز ہے، بشرطیکہ جتنی کی خریداری ٹھہری ہے، وہ سب فوراً وصول کرلیا جاوے یہ جائز نہیں کہ نرخ مقرر کرکے نصف اب لے لیا، اور نصف اس کے ذمہ سمجھا گیا، اگر ایسا اتفاق ہو تو

جس قدر غلہ وہ کاشتکار فی الحال دے سکتا ہے، صرف اسی کا معاملہ کیا جاوے، باقی کا پھر ایسے ہی وقت کیا جاوے، جب کہ وہ غلہ ادا ہو سکے، اور یہی حکم ہے اس کا کہ کاشتکار کے ذمہ غلہ تھا اور اس کے عوض روپیہ لے لیا۔ ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ (تتمہ ثالثہ، ص ۳۰)

مچھلی کی بیع کی مختلف صورتیں

سوال (۴۰) ولا یجوز بیع السمک قبل ان یصطاد لانہ باع ما لا یملکہ ولا فی حظیرۃ اذا کان لا یؤخذ الا بصید لانہ غیر مقدور التسلیم ومعناہ اذا اخذہ ثم القاہ فیہا ولو کان یؤخذ من غیر حیلۃ جاز الا اذا اجتمعت فیہا بانفسہا ولم یسد علیہا المدخل لعدم الملک زید الا اذا اجتمعت فیہا سے حظیرۂ صغیرہ مراد لیتا ہے، اور اپنے استدلال میں عبارت عنایہ کو جو اس کی شرح ہے پیش کرتا ہے۔ قولہ اذا اجتمعت الخ استثناء من قولہ جاز یعنی الحظیرۃ اذا کانت صغیرۃ اخذ من غیر حیلۃ جاز الا اذا اجتمعت فیہا بانفسہا ولم یسد علیہا المدخل فانہ لا یجوز لعدم الملک وھو استثناء منقطع لکونہ غیر مستثنی من الماخوذ الملقی فی الحظیرۃ والمجتمع بنفسہ لیس بداخل فیہ وفیہ اشارۃ الی انہ لو سد صاحب الحظیرۃ علیہا ملکہا اما بمجرد الاجتماع فی ملکہ فلا کما لو باض الطیر فی ارض انسان او فرخت فانہ لا یملک لعدم الاحراز اس بنا پر اس اطراف میں جو تالاب ہوتے ہیں جن کو یہاں کے عرف میں پوکھرا بولتے ہیں، ان کی بیع سمک کو باطل ٹھیراتا ہے، کیونکہ یہ حظیرۂ کبیرہ ہیں، اور ان تالابوں کی مقدار مختلف ہوتی ہے، کوئی تالاب بیس بیگہ کا اور کوئی اس سے بھی زیادہ اور کوئی آٹھ بیگہ اور کوئی دس بیگہ کا، غرض کہ اس کی کوئی خاص مقدار معین نہیں ہے، اور پھر اس میں بھی دو طرح کے تالاب ہیں، بعض تو متصل ندی کے جن کا مدخل اس ندی میں ہوتا ہے، اور بعض بارش کے اس کے مدخل کو باندھ دیتے ہیں، یا خود بخود اس مدخل سے ندی کا پانی متصل ہو جاتا ہے اور بعض تالاب وہ ہیں جو بعض بارش کے پانی سے بھر جاتے ہیں، اور اِدھر اُدھر سے مچھلیاں آجاتی ہیں، اب پوچھنا یہ ہے کہ ان دونوں قسموں کے تالاب کا حکم جداگانہ ہے، یا ایک یعنی مالک زمین تالاب ان دونوں کی مچھلیوں کو اپنی ملک سمجھ کر عند الشرع فروخت کر سکتا ہے یا نہیں زید، اس شرح عنایہ کی وجہ سے یہ سمجھ رہا ہے کہ جو تالاب کہ جن کی مقدار پہلے مذکور ہوئی ہے حکم حظیرۂ صغیرہ کا نہیں رکھتے، لہٰذا بہر صورت تالاب کی مچھلیاں بوجہ سد مدخل کے مالک زمین کو فروخت کرنا اور دوسروں کو منع کرنا درست نہیں جانتا ہے اور عبارت (عینی) وقید بہ لانہ لو سد موضع الدخول حتی صار بحیث یعتذر علی الخروج فقد صار آخذا لہ بمنزلۃ ما لو وقع فی شبکتہ فیجوز بیعہ کو حظیرۂ صغیرہ پر محمول کرتا ہے تاکہ عینی اور عنایہ میں موافقت ہو جائے، زید کا اس عبارت مذکورہ سے یہ سمجھنا صواب ہے یا خطا، اگر

دوسرے استدلال میں بہشتی زیور اور صفائی معاملات جس میں تالاب کی مچھلیوں کی بیع مطلقاً باطل اور حرام ٹھہرائی گئی ہے پیش کرتا ہے، اور زید یہ بھی کہتا ہے کہ حظیرۂ صغیرہ جب مراد ہے تو زمین چاہے کسی کی ہو باندھنے والا ہی مالک سمجھا جائیگا نہ کہ صاحب زمین، جیسا کہ عنایہ کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے وفیہ اشارۃ الی انہ لوسد صاحب الحظیرۃ علیہا ملکہا اما بمجرد الاجتماع فی ملکہ فلا کما لو باض الطیر فی ارض انسان او فرخت فانہ لا یملک لعدم الاحراز اور حظیرۂ صغیرہ کے مدخل کو جب بند کردیا جاوے تو مالک اس کا باندھنے والا ہے، اسی طرح اگر کبیرہ ہو تو محض بند ڈال دینے سے باندھنے والا مالک ہو جاتا ہے یا نہیں، اگر مالک ہو جاتا ہے تو ایک ندی فرض کی جائے کہ خط سے نکلی اور کئی کوس تک جاکر کسی بڑے دریا میں مل گئی، اب اس ندی کو چار پانچ کوس کے بعد عرضاً باندھ دیا تو جس قدر آب محاط کے اندر مچھلیاں ہیں ان سے زید لوگوں کو روک سکتا ہے اور مالک اس کا عند الشرع قرار دیا جاسکتا ہے یا نہیں اور حظیرۂ صغیرہ کی عند الشرع کیا مقدار ہے۔

الجواب، یہاں دو حکم الگ الگ ہیں: ایک تو مچھلی کا ملک میں داخل ہونا دوسرا ملک میں داخل ہونے کے بعد بیع کا جائز ہونا، سو حکم اول کے لئے قبضہ واحراز شرط ہے جس کی ایک صورت یہ ہے کہ مچھلی کو پکڑ کر ڈال دے، اور ایک صورت یہ ہے کہ ان کے از خود جمع ہو جانے کے بعد بند لگا دے، جس سے وہ خروج پر قادر نہ ہوں، عینی کی عبارت مذکورہ فی السوال اسی کے متعلق ہے اور اس میں صغیرہ وکبیرہ کی کوئی قید نہیں، اور حکم ثانی کے لئے قدرت علی التسلیم شرط ہے، جس کی ایک صورت یہ ہے کہ حظیرہ سے نکال کر کسی ظرف میں رکھی ہوئی ہو دوسری صورت یہ ہے کہ حظیرۂ صغیرہ میں ہو کہ جب چاہیں بلا تکلف پکڑ لیں عنایہ کی عبارت مذکورہ فی السوال اس کے متعلق ہے اور اس میں صغیرہ کی قید ہے پس عینی اور عنایہ میں تطابق موقوف نہیں ہے اس پر کہ عینی میں بھی صغیرہ مراد لیا جاوے، پوری عبارتیں دیکھنے سے یہ امر بالکل واضح ہے، پس پوکھرے جن کا ذکر سوال میں ہے ان میں تفصیل یہ ہے کہ جو ندی سے متصل ہیں اور ندی سے اس میں مچھلی آنے کے بعد اس کے مدخل کو بند کر دیتے ہیں اس کی مچھلی ملک میں داخل ہو جاتی ہے کما ذکر فی العنایۃ والعینی او سد صاحب الحظیرۃ علیہا ملکہ اھ ولو سد موضع الدخول حتی صار بحیث لا یقدر علی الخروج فقد صار آخذ الہ اھ اور جو بند نہیں کیا خود ندی سے اس کا اتصال جاتا رہا تو اس میں دیکھنا چاہئے کہ اس تالاب کو آیا اس غرض کے لئے پہلے سے مہیا کیا گیا تھا یا نہیں اگر مہیا کیا گیا تھا تو بدون بند کئے ہوئے بھی ملک میں داخل ہو جاویں گی: ورنہ نہیں، فی منحۃ الخالق برقان کان معد لہ حظیرۃ دخلہا السمک فاما ان یکون اعد ہالذلک اولا فان کان اعدہا لذلک

فما دخلہا ملکہ ولیس لاحد ان یاخذہ الی قولہ وان لم یکن اعدھا لذلک لا یملک ما یدخل فیہا فلا یجوز بیعہ لعدم الملک الخ اور جو ندی سے متصل نہیں بارش کے پانی سے بھر جاتے ہیں اور مچھلیاں یا تو ان میں پیدا ہو جاتی ہیں یا ادھر اُدھر سے جمع ہو جاتی ہیں، ان میں بند لگانے کا تو تحقق ہی نہیں ہوتا اب صرف یہ دیکھا جاوے گا کہ آیا اس کو پہلے سے اس کام کے لئے مہیا کر رکھا تھا یا نہیں بصورت اولیٰ میں مچھلی ملک میں داخل ہو جاویں گی، اور صورت ثانیہ میں نہیں، وقد ذکر دلیلہ آنفاً۔

یہ تو تفصیل ہوئی مچھلیوں کے مملوک وغیر مملوک ہونے میں، اب جواز بیع یعنی صحۃ وعدم فساد کیلئے مملوک ہونے کے بعد یہ شرط ہے کہ وہ مقدور التسلیم ہو، چونکہ خطیرہ کبیرہ میں یہ قدرت نہیں ہے اسلئے اس کے لئے خطیرہ کا صغیرہ ہونا شرط ہوگا، چنانچہ فتح القدیر میں بھی بعد عبارت لیس لاحد ان یاخذہ کے جو حوالہ ہے سمک کے مملوک ہو جانے پر یہ عبارت ہے، ثم ان کان یؤخذ بغیر حیلۃ اصطیاد جاز بیعہ لانہ مملوک مقدور التسلیم مثل السمکۃ فی جبّ وان لم یکن یوخذ الا بحیلۃ لا یجوز بیعہ لعدم القدرۃ علی التسلیم عقیب البیع اھ باقی بہشتی زیور وصفائی معاملات کی عبارت مختصر اور متعلق بعض صورتوں کے ہے، اس سے شبہ نہ کرنا چاہئے، ان دونوں رسالوں میں تفصیل نہیں لکھی، بعض کثیر الوقوع صورتوں کو لکھدیا، باقی رہی یہ بات کہ اگر خطیرہ کی (صغیرۃ کانت او کبیرۃ کما مر) زمین کسی کی ہو اور بند ڈالنے والا دوسرا شخص ہو تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر زمین والے نے اس زمین اور خطیرہ کو اس کیلئے مہیا کر رکھا تھا تو اس سے وہی مالک ہوگا، بند ڈالنے والا مالک نہ ہوگا، اور اگر اس نے مہیا نہیں کر رکھا تھا تو مقتضا قواعد کا یہ ہے کہ یہ بند ڈالنے والا مالک ہو جاوے، اور اگر اس میں اختلاف ہو تو زمین والے کا قول معتبر ہوگا کہ میں نے مہیا کر رکھا تھا اور جس صورت میں بند ڈالنے والا مالک ہو جاوے تو مالک زمین کو اس پر جبر جائز ہے، کہ فوراً میری زمین خالی کر دے کہ غیر کی ملک کو مشغول کرنا بدون اس کی رضا کے جائز نہیں۔ اور ندی مذکور فی آخر السوال کو حرضا باندھ دینے کی صورت سمجھ میں نہیں آئی، مگر قواعد مذکورہ فی الجواب سے اس کا حکم نکال لینا چاہئے، اور خطیرہ صغیرہ کی حد کسی پیمائش سے نہیں ہے بلکہ یہی حد ہے کہ ممکن الاخذ منہا بلا تکلف واحتیال کما فی العنایۃ اولی عبارتہا المذکور فی السوال۔

۲۰ صفر ۱۳۳۳ھ (حوادث ثالثہ ص ۱۲۷)

تالاب میں مچھلی کی بیع

سوال (۴۹) تالاب میں مچھلی فروخت کرنے کی مسئلہ کی کیا تحقیق ہوئی جائز ہے یا ناجائز مطلع فرماکر سرفراز فرماویں اگر ناجائز ہو تو فتح القدیر کی روایت کے کیا معنی اور اگر جائز ہو تو جو اور کتابوں میں ناجائز لکھا ہے اس کی کیا توجیہ فقط۔

الجواب ولا یجوز بیع السمک قبل الاصطیاد لانہ باع ما لا یملکہ ولا فی حظیرۃ اذا کان لا یؤخذ الا بصید لانہ غیر مقدور التسلیم ومعناہ اذا اخذہ ثم القاہ فیہا ولو کان یؤخذ من غیر حیلۃ جاز الا اذا اجتمعت فیہا بانفسہا ولم یسد علیہا المدخل لعدم الملک ھدایہ اخیرین اول باب البیع الفاسد وایضاً فیہا اخر المسائل المنثورۃ واذا افرخ طیر فی ارض رجل فھو لمن اخذہ وکذا اذا باض فیہا وکذا اذا تکنس فیہا ظبی الی قولہ وصاحب الارض لم یعد ارضہ لذلک فصار کنصب شبکۃ للجفاف وکما اذا دخل الصید دارہ او وقع ما نثر من السکر والدراھم فی ثیابہ لم یکن لہ ما لم یکفہ او کان مستعداً لہ اھ وفی فتح القدیر علی القول الاول المذکور للھدایۃ فان کانت لہ حظیرۃ قد خلہا السمک فاما ان یکون اعدھا لذلک لا یملک ما یدخل فیہا فلا یجوز بیعہ لعدم الملک الا ان یسد الحظیرۃ اذا دخل فحینئذ یملکہ ولو لم یعد ھا لذلک ولکنہ اخذہ ثم ارسلہ فی الحظیرۃ ملکہ اھ مختصراً بنا بر روایات مذکورہ کے اس مقام میں دو کلام ہیں ایک مچھلی کے مملوک و غیر مملوک ہونے کے متعلق دوسرے اس کے جواز بیع و عدم جواز کے متعلق سو امر اول میں تین صورتیں ہیں اور ہر صورت کا جدا حکم ہے۔ ایک صورت یہ کہ مچھلی پکڑ کر یا خرید کر تالاب میں چھوڑے اس کا حکم یہ ہے کہ وہ مچھلی اور اُس کی نسل سب اس چھوڑنے والے کی مملوک ہیں دوسرے کو بلا اذن پکڑنا درست نہیں دوسری صورت یہ کہ خود پکڑ کر یا خرید کر نہیں چھوڑی لیکن مچھلیوں کے آنے کی کوئی خاص تدبیر کی ہے یا آجانے کے بعد اُن کے روک لینے کا کوئی خاص سامان کیا ہے اس کا حکم یہ ہے کہ اس اعداد اور اس سامان انسداد سے بھی اس شخص کی ملک ہو جاتی ہے مگر صرف نیت کر لینے کو اعداد نہ کہیں گے۔ لان معناہ سامان کردن لا محض قصد کردن۔ تیسری صورت یہ کہ ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت نہیں ہوئی بلکہ قدرتی طور پر مچھلیاں پیدا ہو گئیں یا آگئیں نہ ان کے جمع کرنے کا کوئی اہتمام کیا اور نہ اُن کے منع یعنی روک دینے کا کوئی انتظام کیا اس کا حکم یہ ہے کہ قبل پکڑنے کے کسی کی ملک نہ ہو گی۔ یہ تو امر اول میں تفصیل تھی اور امر دوم میں تفصیل یہ ہے کہ جن صورتوں میں کہ مچھلی داخل ملک ہی نہیں ہوئی اس میں تو بدون پکڑے ہوئے بیع کرنا مطلقاً جائز نہیں اور جن صورتوں میں داخل ملک ہو گئی اس میں دیکھنا چاہیے اگر پکڑنے کے لئے کچھ حیلہ و تدبیر کی ضرورت ہے تب بھی بیع جائز نہیں لانہ غیر مقدور التسلیم اور اگر بلا کسی تدبیر کے پکڑنا آسان ہو تو بیع جائز ہے مثلاً کسی چھوٹے گڑھے یا برتن میں ہو کہ ہاتھ ڈال کر پکڑ سکیں اور جن کتب میں مطلقاً ناجائز

لکھا ہے مراد اس سے خاص صورتیں عدم جواز کی ہیں، ۲۹ ذی الحجہ ۱۳۲۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۵۴)

حکم بیع سمک در تالاب

سوال (۵۰) ہمارے اطراف میں پوکھرے ندی کے قریب ہوتے ہیں جب موسم بارش کم ہوتا ہے تو مالک پوکھرا اُس کا مخرج و مدخل بند کر دیتا ہے یعنی باندھ ڈال کر ندی سے جُدا کر لیتے ہیں ایسی صورت میں مالک پوکھر کو دوسروں کو مچھلی کے شکار سے روکنا درست ہے یا نہیں اگر ناجائز ہو تو ہدایہ کی اس عبارت کا کیا منشا ہے۔ الا اذا اجتمعت بانفسہا ولم یسد علیہا المدخل منشا شبہ یہ ہے کہ اگر لم یسد کی جگہ یسد علیہا المخرج ہو تو اس کے لئے کیا حکم ہے۔

الجواب۔ یہاں دو حکم جدا جدا ہیں ایک تو مچھلی کا مالک ہو جانا سو اس کا قاعدہ یہ ہے کہ بند لگا دینے سے ملک میں داخل ہو جاتی ہے اور اس کی فرع یہ ہوگی کہ اس کا روکنا جائز ہوگا۔ دوسرا حکم مملوک مچھلی کا بیع کرنا سو اس کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر وہ مملوک مچھلی مقدور التسلیم ہو تو بیع جائز ہے ورنہ نہیں دلیل ھذا کلہ مافی الہدایۃ ولا یجوز بیع السمک قبل ان یصطاد لانہ باع ما لا یملکہ ولا فی حظیرۃ اذا کان لا یوخذ الا بصید لانہ غیر مقدور التسلیم ومعناہ اذا اخذہ ثم القاہ فیہا ولو کان یوخذ من غیر حیلۃ جاز الا اذا اجتمعت فیہا بانفسہا ولم یسد علیہا المدخل لعدم الملک وفی العینی وقید بہ لانہ لو سد موضع الدخول حتی صار بحیث لا یقدر علی الخروج فقد صار آخذا انہ بمنزلۃ مالو وقع فی شبکۃ فیجوز بیعہ

۲ صفر ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۱۲)

مچھلی کی بیع تالاب میں

سوال (۵۱) صفائی معاملات میں ایک مسئلہ مرقوم ہے وہ یہ ہے کہ تالاب یا دریا ماہی گیروں کو دیدیا جاتا ہے اور دوسروں کو اس تالاب سے مچھلی پکڑنے نہیں دیتا یہ بیع باطل ہے؟ وفیہ بعد سطرین بلکہ سب کو مچھلیاں پکڑنے کا شرعاً حق حاصل ہے، از یں مسئلہ زید می گوید کہ بدون اطلاع مالکِ تالاب خفیہ اگر تالاب سے مچھلیاں پکڑ لاوے تو کچھ گناہ نہیں ہوگا، کیونکہ شرعاً اس میں سب کا حق ہے تو حضرت یہ قول زید کا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب، زید کا قول صحیح ہے اور خفیہ مچھلی پکڑنا تالاب سے درست ہے، لیکن اگر مالک تالاب نے مچھلیاں کہیں سے لا کر اپنے ہاتھ سے چھوڑی ہوں تو وہ مچھلیوں کا مالک ہوگا، اور پھر خفیہ پکڑنا درست نہیں، لیکن بیع کرنا بدون پکڑے ہوئے پھر بھی درست نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم،

۱۲ ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ

(امداد ثالث ص ۱۹)

نعم البدل بودن سلم از بنک زمینداران

سوال (۵۲) یہاں یہ رواج ہے کہ کاشتکاران تخم ریزی کے وقت مہاجنوں سے غلہ قرض لیتے ہیں، اور یہ شرط ہوتی ہے کہ فصل کٹنے کے بعد ڈیوڑھا یا سوایا غلہ واپس دیں گے، یہ طریقہ کاشتکاران کی تباہی کا باعث ہوتا ہے اور مہاجنان حساب و وزن وغیرہ میں بھی طرح طرح سے زیادتی کرتے ہیں جس کو کاشتکاران اہل غرض ہونے کی وجہ سے پورا کرتے ہیں (۲) اکثر زمینداروں کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اپنی رعایا کو اس مصیبت و نقصان سے بچانے کی کوئی جائز تدبیر ہو تو اس پر عمل کیا جاوے۔ ساتھ ہی اس کے اپنا روپیہ لگانے کا کچھ ماحصل اور فائدہ تجارتی بھی ضرور حاصل ہونا چاہئے، تاکہ نقصان اٹھانا نہ پڑے، اور جو فائدہ غیروں کو ہوتا ہے وہ خود حاصل کریں (۳) منجانب سرکار رعایا و کاشتکاران کی امداد کے لئے ایک طریقہ دیہاتی بنکوں کا جاری ہے جس کو کوآپریٹیو بنک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس میں مشترکہ سرمایہ ہوتا ہے، اور چار آنے اس کی ممبری کی فیس ہے جو لوگ ممبر ہوتے ہیں ان میں سے ہم قوم دس آدمی ایک ساتھ قرض لیتے ہیں اور اس کی ادائیگی کی ذمہ داری مشترکہ و منفردہ طور پر دسوں آدمیوں پر ہوتی ہے اور چھ روپے فی صدی سے زیادہ سود نہیں لیا جاتا ہے در حقیقت ایسے بنکوں کا قیام کاشتکاران کے لئے بہت مفید ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ مسلمان زمینداران بوجہ شرعی ناجوازی کے ایسے بنک نہیں قائم کرسکتے اور اس لئے وہ اپنی رعایا کی امداد کرنے سے مجبور ہو جاتے ہیں۔ (۴) لہذا سوال یہ ہے کہ وہ کونسا طریقہ اختیار کریں جو شرعاً جائز ہو، اور ان کے کاشتکاران بجائے مہاجنوں کے پنجوں میں پھنسنے اور تباہ ہونے کے خود اپنے زمینداران سے اپنی ضروریات کے لئے قرض لیں، اور اس کے شرائط ایسے ہوں کہ زمیندار کو اپنے سرمایہ لگانے سے تجارتی فائدہ بھی ہو اور کاشتکار یا رعایا مہاجنوں کی سخت شرائط کے نقصان سے بھی محفوظ رہیں، (۵) ایک تدبیر جو خیال میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ تخم ریزی یا اور ضروریات کے موقع پر نقد روپیہ زمیندار سے کاشتکاران لیں، اور اپنا کام چلا دیں، جس وقت نئی فصل کاٹی جاوے اس وقت نرخ بازار کے حساب سے جو اس وقت غالباً ارزاں ہوگا بہ نسبت اس وقت کے جب کہ تخم ریزی ہوتی ہے غلہ دیں۔ ایسی صورت میں ارزانی و گرانی میں جو فرق ہوگا وہی قرض دہندہ کا نفع ہوگا آیا ایسی صورت شرعاً اپنے کاشتکاران کو فائدہ پہنچانے اور خود فائدہ حاصل کرنے کی جائز ہے یا نہیں ہے، اور اگر نہیں ہے تو وہ دوسری اور کون صورت ہے جس کے اختیار کرنے سے زمیندار قرض دہندہ اور کاشتکار قرض گیرندہ کو نفع حاصل ہو، چونکہ یہ مسئلہ بہت ضروری ہے اور اس کی ضرورت عام طور پر محسوس کی جاتی ہے، اور بعد

بحث و مباحثہ اس کے مفید ہونے پر سرکار اور عوام سب کو اتفاق ہے، اور ہزارہا بنک ایسے قائم ہوچکے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں، اور منجانب سرکار بہت توجہ ہے اور ترغیب دلائی جاتی ہے کہ اس طریقہ سے کاشتکاران کی مدد زمیندار کریں۔ اور مہاجنوں کے پنجۂ ظلم سے ان کو نجات دلائی جائے، ساتھ ہی اس کے جو شخص اپنا روپیہ پھنسائیگا اس کو بھی کچھ فائدہ جب تک نہ ہو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اپنا روپیہ اس میں لگائے، اور روپیہ نہ لگانے میں یہ نقص پڑتا ہے کہ اگر ہمسایہ زمیندار کوئی بنک کھولے تو اس کی رعایا خوش حال اور فارغ البال ہوتی ہے بخلاف اس کے ہم اگر اپنی رعایا کی مدد نہ کریں تو بوجہ شرعی ناجواز کے ہماری رعایا اس فائدہ سے محروم ہو جاتی ہے، اور اس کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے، لہذا مسلمان زمینداران کے لئے کوئی جائز طریقہ ضرور علمار کرام مدظلہم کو ایسا تجویز فرمانا چاہئے جس میں فائدہ تو وہی حاصل ہو جو دیہاتی بنک قائم کرنے کا مقصود ہے، لیکن اس میں معصیت نہ ہو، جواب باصواب سے سرفراز فرمائیے۔

الجواب۔ جو تدبیر سوال کے نمبر ۵ میں لکھی ہے وہ بعد کسی قدر ترمیم کے شریعت کے موافق جائز ہوسکتی ہے، یعنی تخم ریزی کے وقت جو نقد روپیہ کاشتکاروں کو دیا جاوے اس کا غلہ فصل پر لے لیا کریں، مگر نرخ بوقت روپیہ دینے کے معین ہو جاوے یعنی یہ نہ ہو کہ بازار میں اس وقت جو نرخ ہوگا اس سے اتنا زیادہ لیں گے، بلکہ اس طرح معین ہو کہ ہم دس سیر یا بارہ سیر کا لیں گے خواہ بازار کا نرخ کچھ بھی ہو، اور اپنے نزدیک تخمینہ کرکے اسی حساب کے موافق ذہن میں سمجھ لیں، اگر کسی قدر کمی بیشی بھی ہوئی تو بمقابلہ جواز شرعی اور غالب اوقات میں جانبین کی مصالح کے مرعی ہونے کے ایسی کمی بیشی کوئی چیز نہیں، اس کو شریعت میں بیع سلم کہتے ہیں، اس کے جواز میں اور بھی بعض سہل شرائط ہیں رسالہ صفائی معاملات میں ملاحظہ فرمالی جاویں، جس میں ایک شرط جو بوجہ ابتلائے عام کے زیادہ اہتمام کے قابل ہے یہ بھی ہے کہ وقت موعود پر اگر غلہ موعود وصول نہ ہوسکے تو اس کے عوض میں نہ تو دوسری جنس لینا درست ہے اور نہ روپیہ مقدار بڑھا کر لینا درست ہے، بلکہ اگر روپیہ لے تو جس قدر دیا تھا اسی قدر لے لے، اور اگر جنس لے تو وہی لے اور وہ اگر اس وقت میسر نہ ہوسکے تو مہلت دیدے، اور بعد مہلت پھر وہی لے جو ٹھہری تھی، اور اگر اب بھی کسی جزو میں شبہ باقی رہے تو استفسار کرلیا جاوے، واللہ اعلم۔

۱۲ ربیع الاول ۱۳۳۲ھ

(تتمہ رابعہ ص ۶۴)

حکم بنک زمینداران

سوال (۵۳) جالندھر شہر میں ایک انجمن بنام خادمان اسلام عرصہ سات سال سے منعقد ہے اس کے زیر آوردہ ایک اسلامیہ ہائی اسکول ہے، جس میں انگریزی عربی فارسی حساب وغیرہ کے علاوہ ابتدائی جماعتوں یعنی پرائمری حصہ میں قرآن شریف اور مڈل اور ہائی جماعتوں میں فقہ وحدیث شریف بھی پڑھائی جاتی ہے، لیکن دیگر مضامین بہ نسبت دینیات غالب ہیں، اس کا اجراء قوم کی مختلف قسم کی امداد وعطیات، بیاہ شادی و زکوٰۃ و صدقات وگاہ بگاہ زمینداری بنکوں کے منافع یعنی سودی پیسہ روپیہ سے بھی ہے، لیکن تقسیم تنخواہ و اخراجات میں کوئی تمیز نہیں ہے، تمام قسم کا روپیہ پیسہ یکجا جمع ہوکر اس سے تنخواہیں وغیرہ، سامان تعلیم وغیرہ خریدا جاتا ہے، ایسے مدرسہ میں تعلیم کام وغیرہ کے لئے ملازمت کرنا اور اجراء مدرسہ کے لئے مذکورہ صورتوں کی آمدنی کا مہیا کرنا گناہ تو نہیں، مہربانی فرماکر جواب باصواب سے مطلع فرمادیں تاکہ میرے دل کی تسلی کا موجب ہو، کیونکہ خاکسار انجمن ہذا کے دفتر میں محرر کا کام اور روپیہ پیسہ کی وصولی کا کام کررہا ہے۔ فقط

(اس سوال کے جواب میں صاحب فتاویٰ نے مضمون ذیل بھیجا)

زمیندارہ بنک کی کیا صورت ہے اس کا جواب اس تحقیق پر موقوف ہے۔ آہ

اس کے جواب میں پھر ذیل کا سوال آیا۔

محرر کا کام یعنی بیرون جات میں وصولی چندہ کے لئے خط وکتابت کرنا وصولی چندہ ماہواری چندہ دہندگان سے روپیہ پیسہ وصول کرکے باقاعدہ حساب رکھنا، زمینداری بنک کی صورت، پنجاب میں زمیندار قوم یا دیگر مسلمان کہلانے والے لوگ آپس میں مل کر روپیہ جمع کرکے ایک بنک بنالیتے ہیں، اس جمع شدہ روپے میں سے جس شخص کو ضرورت ہو وہ ایک پیسہ فی روپیہ ماہوار سود دے کر روپے لیجاتا ہے، ادائیگی قرضہ کے وقت سود بشرح صدر شمار کرکے اصل زر سے سود ادا کرجاتا ہے، سال بھر بعد روپیہ کا حساب ہوتا ہے، جتنی رقم سود کی بڑھ جائے وہ آپس میں ممبران بنک میں تقسیم ہوجاتی ہے، اس بڑھوتری یعنی سود میں سے کچھ رقم مدرسہ ہذا کے اجراء کے لئے بھی پہنچ جاتی ہے، غرضیکہ مدرسہ ہذا کا اجراء مختلف قسم کی آمدنی پر موقوف ہے۔

الجواب، اس بنک کی آمدنی تو حرام ہے باقی جس مدرسہ میں اس سے مدد کی جاتی ہے، اگر دوسری حلال آمدنی غالب اور یہ حرام آمدنی مغلوب اور کم ہے، تب تو اس مدرسہ کی نوکری اور مجموعہ سے تنخواہ لینا حلال ہے ورنہ حرام، ۳ محرم سنہ ۱۳۳۲ھ

(تتمہ رابعہ ص ۵۹)

عدم جواز معاملہ بنکنگ | **سوال** (۵۳) بنکنگ کا کاروبار جائز ہے یا نہیں، کوئی آدمی اگر کوئی بھاری کاروبار یا چا، یا باغیچہ کھولنا چاہے تو کسی کمپنی سے وہ بندوبست کرتا ہے، جتنے خرچ کی سال بھر میں اس کاروبار یا چا، یا باغیچہ میں ضرورت ہوگی وہ کمپنی اسے دیتی جائے گی لیکن جتنی چار کی سال بھر میں اس باغ میں آمدنی ہوگی، وہ سب کی سب اس کمپنی کو بھیجنی ہوگی، کمپنی مذکور اس چار کو فروخت کرتی ہے، جتنا کہ کمپنی کا خرچ سال میں ہوتا ہے چارج کر وصول کرلیتی ہے، اور کمپنی مذکور نے جو اصل روپیہ دیا تھا اسکا سود بھی اس سے لیتی ہے، باقی روپیہ بچت رہ جاتا ہے، تو اس باغیچہ والے کو بھیجدیتی ہے۔ تو اس قسم کا بنکنگ کا روبار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، اس سوال کا حاصل تو صرف اتنا ہے کہ کوئی شخص بڑی تجارت کرنا چاہتا ہو اور سرمایہ اس کے پاس ہے نہیں، اس لئے وہ کسی سے قرض سودی لیتا ہے، اور اس تجارت میں اس کو جتنی آمدنی ہوتی جاتی ہے، وہ آمدنی اس قرض خواہ کو دیتا رہتا ہے پھر اخیر میں حساب ہونے سے اس کے پاس اگر اصل اور سود سے زائد کچھ رقم پہنچ گئی وہ اس کو واپس کر دیتا ہے، بس اصل سوال تو اتنا ہے اور اس کا جواب ظاہر ہے کہ سودی قرض لینا حرام ہے، باقی اس سوال میں جو مثال فرض کی گئی ہے اسمیں علاوہ اس سوال کے دو امر قابل تعرض ہیں، ایک یہ کہ باغیچہ چار کا خریدنا جائز ہے یا نہیں، سو یہ ایک مستقل مسئلہ ہے، اگر اس کو مقصوداً پوچھا جاوے، اور سوال میں پوری حقیقت معاملہ کی ظاہر کیجاوے تو اس کا جواب ممکن ہے۔ دوسرا امر یہ کہ اس مال کو مقرض یعنی قرض خواہ بیچتا ہے، یہ جائز ہے یا نہیں، سو اس میں تفصیل یہ ہے کہ آیا مقرض کا بیچنا عقد کے اندر داخل و شرط ہے یا اتفاقاً بلا جبر یکے بعد دیگرے ایسا اتفاق ہو جاتا ہے، شق اول پر یہ معاملہ فاسد ہے، اور شق ثانی میں جائز ہے،

۲۴ شعبان ۱۳۳۷ھ (حوادث خامسہ ص ۲۶)

منافع بنک | **سوال** (۵۴) اگر بنک گھر میں روپیہ جمع کیا جاوے تو اس کے سود سے منتفع ہونا جائز ہے یا نہیں، مگر صاحب بنک قوم نصرانی ہیں۔

الجواب۔ سود نصوص قطعیہ سے حرام ہے، اور اطلاق نصوص سے اس میں نصرانی وغیر نصرانی سب برابر ہیں، واباحۃ الشئ لایستلزم جواز العقد بہ فافہم واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم،

۱۳ ذیقعدہ ۱۳۲۱ھ (امداد ج ۳، ص ۳۶، حوادث اول ۲، ص ۸۸)

ہنڈی و نوٹ میں بٹہ لینا | **سوال** (۵۵) ہنڈی و نوٹ میں بٹہ لینا دینا درست ہے یا نہیں۔

الجواب۔ نہیں۔

(تتمہ اولیٰ ص ۱۶۹)

حکم کمی بیشی در نوٹ یا ہنڈوی وغیرہ

سوال (۵۶) السلام علیکم۔ ہم لوگ بیوپاری اور تاجر ہیں اکثر ہنڈی کا لین دین کرنا پڑتا ہے۔ اور اس پر دو چار آنہ یا کم و زیادہ کا بٹہ لینا دینا بھی پڑتا ہے اس لئے دریافت کرتے ہیں کہ از روئے شرع سود تو نہیں ہے۔ دوسرے نوٹ یا اشرفیوں پر بعض دفعہ دو چار آنے دینے پڑتے ہیں اور ایسے ہی ہم کبھی لے بھی لیتے ہیں مثلاً ایک اشرفی کے پندرہ روپے دیں گے اور اس کے بدلے میں ایک اشرفی اور ایک آنہ لیں گے تو یہ بھی جائز ہے یا نہیں۔ براہ نوازش مطلع فرمادیں۔

الجواب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ہنڈی کا بٹہ اگر ویسا ہی ہے جیسا نوٹ پر لیا دیا جاتا ہے تب تو حکم یہ ہے کہ اس میں اور نوٹ میں کمی بیشی ناجائز ہے اور اشرفی کو پندرہ روپیہ سے کم پر یا زیادہ پر فروخت کرنا درست ہے اس شرط پر کہ عوضین دست بدست قرض میں کمی بیشی درست نہیں۔ ۲۲ صفر ۱۳۳۲ھ (حوادث حصہ ثانیہ ص ۱۳۲)

بینک زمینداران

سوال (۵۷) زمینداری بینک جو دیہات میں کھولے گئے ہیں اور اس کا قاعدہ یہ ہے کہ پانچ یا دس یا بیس روپے جس قدر مقدرت ہو بینک میں پیشتر سے بنام مد حصص داخل کرائے جاتے ہیں جو ایسی امانت رکھتا ہے وہ حصہ دار تصور کیا جاتا ہے، یعنی وہ اس بینک سے لین دین کر سکتا ہے، اور روپے کا جو اس نے پیشتر سے جمع کیا ہے بعد دس سال کے سود ملے گا، وہ اس طرح ہوگا کہ سرکاری سود ساڑھے آٹھ روپے سال ہے اور زمینداروں سے ساڑھے بارہ روپے سال وصول کیا جاتا ہے، چار روپے سال کی جو بچت ہے بعد دس سال کے منقسم کی جاوے گی، اس کی کوئی شرح مقرر نہ ہوگی، بلکہ بچت پر منحصر ہے جو کچھ حصہ رسدی ہو کر مل جاوے گا، اور چونکہ انہیں سے چار روپے سال کے حساب سے زیادتی وصول کی، جا کر یہ بچت ہوئی ہے، لہذا یہ طریقہ از روئے شرع کیسا ہے؟

الجواب۔ چونکہ سرکار اس میں وکیل ہے زمینداروں کی، اس لئے یہ ایسا ہے جیسے خود زمیندار باہم سود لیتے ہیں، پس بالکل جائز نہیں، ربیع الاول ۱۳۳۲ھ (حوادث اول ۲ ص ۱۳۳)

سیونگ بینک اور ڈاک خانہ میں روپیہ رکھنے اور سود لینے کا حکم

سوال (۵۸) دارالحرب میں بعض لوگ سیونگ بینک میں روپیہ رکھتے ہیں اور سالانہ سود بھی لیتے ہیں، کیا مسلمان کے لئے یہ جائز ہے؟

الجواب۔ یہ فعل معصیت ہے مگر اس سے جو مال حاصل ہو وہ مباح ہو سکتا ہے اور اس مسئلہ میں اختلاف بھی ہے، ۱۴ جمادی الاخری ۱۳۲۶ھ

(تتمہ اولیٰ ص ۱۵۵)

مبیع کی قیمت کم کرنے کے لئے بائع کی رضا شرط ہے اور بیع مرابحہ میں اس کا اظہار ضروری ہے

سوال (۵۹) کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ہم تاجر لوگ کاریگروں سے جو مال خرید کرتے ہیں ایک پیسہ روپیہ کٹوتی کاٹ کر مال کی قیمت دیتے ہیں، اور اس بات کا اعلان کاریگروں سے پہلے کر دیا گیا ہے، اس صورت میں یہ بیع شرعاً جائز ہے یا ناجائز، صورت ثانی اگر بائع کٹوتی سے راضی نہ ہو تو کیا حکم اور ناراض ہو تو کیا حکم؟ صورت ثالث یہ ہے کہ پیسہ روپیہ کاٹ کر جو مال خریدا جاتا ہے بیوپاری کو پورا ایک روپیہ کا بتلا کر نفع فی روپیہ لیا جاتا ہے، یعنی بیوپاری کو کٹوتی مجرا نہیں دی جاتی یہ امر جائز یا ناجائز؟

الجواب پہلا اعلان کافی نہیں، خریداری کے وقت بائع کو اطلاع کرنی چاہئے کہ ایسا کیا جاوے گا اور اگر خریداری کے وقت نہ کہا تو پھر اس کا جواز بائع کی رضامندی پر موقوف ہے، اور بدون رضامندی کے ناجائز ہے، اور حقیقت اس کٹوتی کی حط ثمن ہے، اور اس کٹوتی کے بعد بیوپاری کو بھی اس کی اطلاع ضروری ہے، جبکہ نفع پر معاملہ ہو پورا روپیہ بتلانا حرام ہے، کیونکہ حط ثمن اصل عقد کے ساتھ ملحق ہو جاتا ہے، گویا پونے سولہ آنہ پر اول ہی سے معاملہ ہوا، ۱۸ جمادی الاخریٰ ۱۳۳۳ھ

(تتمہ رابعہ ص ۴۳)

تحقیق حکم بیع المضطر

سوال (۶۰) وقتیکہ شمایاں در جلسہ مدرسہ عبدالرب صاحب مرحوم تشریف آوردہ بودید پس درانجا وزاں صاحب یک دوست بندہ تفتیش کردہ بود کہ بیع مضطر بغبن فاحش یا شرائے وے بغبن فاحش جائز ست یا نہ، جناب درجواب فرمودہ کہ بیع وشراء مضطر غیر مکروہ جائز صحیح ست دریں بارہ عرض کردہ می شود کہ درمختار درآخر بیع الفاسد فرمودہ وفی التحف بیع المضطر وشرائہ فاسد وصاحب ردالمحتار زیر ایں قول تحقیق کردہ وبعد ازاں تحقیق بیع وشراء مضطر بغبن فاحش فاسد گردانید، چونکہ عبارت وے طویل بود ازیں وجہ نقل کردہ شد طحطاوی حاشیہ درمختار تحت قول مذکور فرمودہ هو ان یضطر الرجل الی طعام او شراب او لباس او غیرها ولا یبیعها البائع الا باکثر من ثمنها بکثیر وکذا فی الشراء منہ کذا فی المنح انتهی حلبی، نیز در شرح الاوطار حاشیہ درمختار بزبان اردو در استدلال برفساد بیع وشراء مذکور حدیث شریف نقل کردہ کہ مروی ست از علی کرم اللہ وجہہ نهی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع المضطر وشرائہ، (ابوداؤد) اقوال مذکور الصدر دلالت می کند برفساد پس بر تقدیر صحت دستخط کردہ واپس ارسال فرمائید واگر برخلاف آنجناب را روایۃ راجح معلوم میشود آں را تحریر کردہ عنایت فرمائید عنداللہ ماجور وعند الناس مشکور خواہید گردید۔

الجواب ، در ذہن من ہماں بود کہ زبانی جواب دادہ بودم غالباً مبنیش اقوال شراح حدیث است
کما قال الخطابی هذا یکون من وجهین احدهما ان یضطر الی العقد من طریق الاکراه علیه
وهذا بیع فاسد لا ینعقد والثانی ان یضطر الی البیع لدین رکبه او مؤنة ترهقه فیبیع
ما فی یده بالوکس بالضرورة وهذا سبیله فی حق الدین والمروة ان لا یباع علی هذا الوجه ولکن
یعان ویقرض الی المیسرة او یشتری سلعته بقیمتها فان عقد البیع مع الضرورة علی هذا الوجه
صح ولم یفسخ مع کراهة اهل العلم له مص علی ابی داؤد وفی المرقاة من النهایة مثله وفی
اللمعات المراد به المکره ای لا ینبغی ان یشتری ویبتاع من المکره وقیل یجوز ان
یراد من المضطر المحتاج الذی اضطر الی البیع لدین رکبه او مؤنة لحقه فیبیعه رخیصا
بحکم الضرورة فالمروة تقتضی ان لا یشتری منه ویعان ویقرض مثلا اھ الحال در مختار و رد المختار
را مطالعہ نمودم و ازاں ترددے در دل پیدا شد لیکن بعد تامل راجح ہماں قول خود مینماید و عمل قول در مختار
و رد المحتار صورتے خاص معلوم می شود و آں آنست کہ دریں عبارت مذکور ہست ومثاله مالو الزمه
القاضی ببیع ماله لایفاء دینه او الزمه الذمی ببیع مصحف او عبد مسلم ونحو ذلک اھ
یعنی صورتیکہ دراں بیع مال از حاکم معین کردہ شود و معنی نحو ذلک ہمیں ست و قرینہ بریں حمل آں قول
مصنف ست کہ صاحب رد المحتار بطور استدراک نقل کردہ ولو صادره السلطان ولم یعین بیع
ماله فباع صح اھ پس بنابریں تقریر حاجت آں جواب نیست علامہ شامی بصیغۂ تمریض نقل کردہ فرمودہ
تامل هذا ما عندی فان لم یطمئن قلبکم فراجعوا الاکابر ولست بمصر علی ذلک ۔

۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ (تتمہ خامسہ ص ۲)

جو کتاب کتب خانہ میں موجود ہو اس کی بیع کا وعدہ پھر کتاب خرید کر نفع کے ساتھ فروخت کا حکم

سوال (۶۱) زید را بکر گفت مرا کتاب شرح وقایہ می باید زید گفت موجود نیست طلبیدہ میدہم و از مطبع بذریعہ
وی پی طلبیدہ بقیمت خویش یعنی از بکر چیزے نگرفتہ بلکہ بزر خویش قیمتش ادا نمودہ بکر را بنفع قلیل یا
کثیر بیع نمود مثلاً چہار روپیہ قیمت وی پی ادا نمودہ بہ پنج روپیہ بکر را دادہ ایں جائز ست یا نہ وجہ
شبہ ایں کہ چونکہ بطلبش زید طلبیدہ است ہماں قیمت او را دادن ضروری باشد یا نہ و اگر ظاہر نماید کہ
بہ پنج روپیہ آمدہ دریں صورت ناجوازش معلوم و ظاہر است ، ۳ جمادی الاخری ۱۳۳۹ھ

الجواب ، چونکہ احتمال غالب ست کہ بکر را ہمیں گماں باشد کہ زید برائے من خرید می کند
و بناءً علیہ مرا بہماں ثمن میدہد کہ خود خرید کردہ و سکوت در موضع بیان مثل بیان باشد لہذا شرط جواز

حج ردیہ گرفتن آنست کہ زید تصریح نماید کہ من برائے خود خرید می کنم باز بشما معاملہ می نمایم و چوں معاملہ بشما جدید باشد شمارا اختیار خواہد بود کہ خرید کنید یا نہ کنید و مرا اختیار خواہد بود خواہ ثمن خرید خود بدست شما فروشم خواہ نفع ہم گیرم و بدون ایں تصریح جائز نمی نماید ، (تتمہ خامسہ ص ۱۹۰)

کھوٹے سکہ کو سودے کی قیمت میں ادا کرنا

سوال (۶۲) محرر دکان نے غلطی سے ایک کھوٹی اکنی لے لی، جسے میں نے علیحدہ رکھدیا، اور اس کے چلانے کی ممانعت کر دی، لیکن انھوں نے خیر خواہی سمجھ کر اسے چلا دیا اور مجھے خوشخبری سنائی میں ناراض ہوا اور جہاں وہ اکنی چلائی گئی تھی دوسری کھری اکنی بھیج دی کہ کھوٹی واپس کر دو اس نے یہ جواب دیا کہ وہ ہمارے یہاں سے بھی چل گئی، اس صورت میں اس ایک آنہ کو کیا کرنا چاہیے، خود تو استعمال کرنا جائز نہ ہوگا، کیونکہ اگر غلطی سے ہم نے کسی سے دھوکا کھایا تو اب یہ حلال نہیں کہ ہم کسی کو دھوکہ دیں۔

الجواب - جہاں وہ کھوٹی اکنی چلائی گئی ہے، چونکہ اس سے اس کا حق واجب ادا نہیں ہوا اس لئے یہ کھری اکنی شرعاً اسی کا حق ہے، باقی اس کا واپس کر دینا چونکہ اس کی بنار فاسد پر اس لئے یہ واپسی معتبر نہیں، اب اس صاحب حق کو مکرر اطلاع دی جاوے کہ تمہارا حق ہمارے ذمہ ہے، اور وہ حق کھوٹی اکنی سے ادا نہیں ہوا البتہ اگر اس کھوٹی اکنی کو تم برضائے خود اپنے حق کا عوض سمجھو تو پھر حق ادا ہو گیا، اس اطلاع کے بعد اگر وہ اس کھوٹی پر راضی ہو جاوے تو وہ کھری اکنی آپ کی ہے، صرف کیجئے، اور اگر وہ اس کھری کو لینا چاہے تو اس کو دیدی جاوے، اور اس دوسری صورت میں اس شخص پر دو امر واجب ہیں، ایک کھوٹی اکنی کو واپس کرنا جس کے معاف کر دینے کا آپ کو اختیار ہے، دوسرے جہاں وہ کھوٹی اکنی اس نے چلائی ہے اس کو اطلاع دینا، اور دوسری اکنی دینا، اور یہ دوسرا امر ہر حال میں اس کے ذمہ واجب ہے، اور یہ کھوٹی اکنی جس کے ہاتھ بھی آوے اس کو کنوئیں میں پھینک دینا چاہئے، اور جو معلوم نہ ہو کہاں گئی تو ضرور جہاں یہ اول بار چلی ہے اس کے ذمہ کسی کا حق رہا ہے، وہ بہ نیت صاحب حق کی نیت سے اس کو تصدق کر دے۔ ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۰۷)

عقد بیع کے بعد قبضہ سے پہلے جو عیب مبیع میں پیدا ہو جاوے اس کی وجہ سے مبیع کی واپسی

سوال (۶۳) حکم شرعی اس مسئلہ میں کیا ہے کہ میں نے ایک راس بھینس خرید کی، زر قیمت ادا کر دیا، بھینس جنگل میں بائع کے قبضہ میں تھی، اس نے شام کو دینے کا اقرار کیا تھا، جنگل میں میرا لڑکا اس کو دیکھنے گیا، اور وہاں سے اس کو لانا چاہا، لیکن وہ نہیں آسکی اور بھاگ کر جنگل میں بائع کے قبضہ میں رہی، شام کو بائع اس بھینس کو لایا کہ اس نے بچہ دیدیا ہے جس سے وہ خراب ہو گئی، اور اس بھینس کی وہ حیثیت نہیں رہی جو خریدتے وقت

تھی، بائع کا یہ بھی بیان ہے کہ یہ بھینس جنگل میں میرے لڑکے کے لانے کی وجہ سے جو بھاگ گی ہے اس سے بچہ ڈالدیا ہے، مگر اس کی کوئی تصدیق نہیں ہے، اب یہ بھینس کس کی ہے؟ آیا بائع کے قبضہ میں ہے اس کی یعنی یا میری ہے، بھینس اب تک بائع کے پاس ہے۔

الجواب، فی الھدایہ باب خیار العیب تحت قول محمد فاذا قام احلف باللہ الخ ما نصہ لان العیب قد یحدث بعد البیع قبل التسلیم وھو موجب للرد۔ بنا بر روایت مذکورہ کے حکم یہ ہے کہ اگر اس بھینس پر لڑکے کو قبضہ کرا دیا گیا تھا، پھر اس کے ہاتھ سے نکل کر بھاگ گئی تب تو وہ بھینس مشتری کی ہو گئی، اور اگر لڑکے کو قبضہ نہیں کرایا گیا تو بھینس بائع کی ہے۔ (النور شعبان ۱۳۵۸ھ ص ۵)

اراضی فلسطین کی بیع یہودیوں کے ہاتھ

السوال (۲۴۶) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، ما حکم الشریعۃ الاسلامیۃ المطھرۃ فی بعض المسلمین الذین یبیعون اراضی بلاد فلسطین المقدسۃ او یتوسطون ببیعھا للیھود الطامعین الذین یقصدون من شراء ھذہ الاراضی والعقارات جلاء المسلمین عن ھذہ البلاد المقدسۃ والاستیلاء علی المسجد الاقصی الذی بارک اللہ حولہ و انشاء کنیستھم الھیکل مکانہ وتشکیل دولۃ یھودیۃ فی فلسطین بمساعدۃ بعض الدول المعادیۃ للاسلام والتی تبذل کل جھد فی محاربتہ وما ھو الرادع لھم عن ھذا العمل المنکر، وھل اذا افتی بعض العلماء بکفر من باع ارضہ للیھود او توسط ببیع ارض غیرہ لھم لمساعدۃ اھل الکفر علی المسلمین و لموالاتہ للیھود الذین یعملون لیلاً ونھاراً لطرد المسلمین وابعادھم عن بلاد فلسطین والمسجد الاقصی الذی اسری اللہ برسولہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم الیہ وحرمانھم من الصلوٰۃ علیھم ومن الدفن فی مقابر المسلمین لخروجھم عن الاسلام وفیہ عبرۃ لغیرھم ممن تسول لہ نفسہ اقتراف مثل خطیئتھم، فما قولکم فی فتواھم، واذا کان ھناک زاجر خلافھا فاذکروا فیہ توجروا ولکم من اللہ الاجر والثواب۔

الجواب۔ وھو الموفق للصدق والصواب، اما عن الجزء الاول فلنمھد اولاً الدلائل ثم نشید بھا المسائل، ففی الدر المختار فصل الجزیۃ احکام اھل الذمۃ ما نصہ ولا یعمل بسلام فی رد المحتار ای لا یستعمل ولا یعمل لانہ عز و کل ما کان کذلک یمنعون عنہ قلت ومن ھذا الاصل تعرف احکام کثیرۃ در منتقی اھ وھذا اصل کلی وھھنا جزئیات نسردھا ففی الدر المختار الذمی اذا اشتری دارا ای اراد شراءھا فی المصر لا ینبغی ان تباع منہ فلو اشتری یجبر علی بیعھا من المسلم وقیل لا یجبر الا اذا کثر درر، فی رد المحتار قولہ

الذمی اذا اشتری دارا الخ قال السرخسی فی شرح السیر فان مَصَّرَ الامام فی اراضیهم للمسلمین
کما مصّر عمر رضی اللہ عنہ البصرۃ والکوفۃ فاشتری بہا اهل الذمۃ دورا وسکنوا مع المسلمین لم یمنعوا
من ذلک فانا قبلنا منهم عقد الذمۃ لیقفوا علی محاسن الدین فعسیٰ ان یؤمنوا واختلاطهم بالمسلمین
والسکن معهم یحقق هذا المعنی وکان شیخنا الامام شمس الائمۃ الحلوانی یقول هذا اذا قلوا
وکانوا بحیث لا تتعطل جماعات المسلمین ولا تتقلل الجماعۃ بسکناهم بهذه الصفۃ فاما اذا کثروا علیٰ
وجہ یؤدی الی تعطیل بعض الجماعات او تقلیلها منعوا من ذلک وأُمروا ان یسکنوا ناحیۃ لیس
فیها للمسلمین جماعۃ وهذا محفوظ من ابی یوسف فی الامالی اھ ثم فی الدر المختار بعد اسطر
(واذا تکاری اهل الذمۃ دورا فیما بین المسلمین لیسکنوا فیها) فی المصر (جاز) لعود نفعہ
الینا ولیروا تعاملنا فیسلموا (بشرط عدم تقلیل الجماعات بسکناهم) شرطہ الامام
الحلوانی (فان لزم ذلک من سکناهم امروا بالاعتزال عنهم والسکنیٰ بناحیۃ لیس فیها
مسلمون) وهو محفوظ عن ابو یوسف بحر عن الذخیرۃ، وفی رد المحتار تحت القول
الآتی من الدر المختار لکن رده الخ ما نصہ فتحصل من مجموع کلام الحلوانی والتمرتاشی
انہ اذا لزم من سکناهم فی المصر تقلیل الجماعۃ امروا بالسکنیٰ فی ناحیۃ خارج المصر لیس
فیها جماعۃ للمسلمین وان لم یلزم ذلک یسکنون فی المصر بین المسلمین مقهورین لا فی
محلۃ خاصۃ لانہ یلزم منہ ان یکون لهم فی مصر المسلمین منعۃ کمنعۃ المسلمین بسبب
اجتماعهم فی محلتهم فافهم ثم فی رد المحتار بعد اسطر بعنوان التنبیہ ما نصہ قال فی الدر المنتقی
وکذا یمنعون عن التعلی فی بنائهم علی المسلمین ومن المساواۃ عند بعض العلماء نعم یبقی لقدیم
ثم قال بعد بحث طویل والحدیث الشریف لا یفید ان لهم ما لنا من العز والشرف بل فی
المعاملات من العقود ونحوها للادلۃ الدالۃ علی الزامهم الصغار وعدم التمرد للمسلمین وصرح
الشافعیۃ بان منعهم عن التعلی واجب وان ذلک لحق اللہ تعالیٰ وتعظیم دینہ فلا یباح برضا
الجار المسلم اھ وقواعدنا لا تاباہ ولقد مر انہ یحرم تعظیمہ ولا یخفی ان الرضا باستعلائہ تعظیم
لہ هذا ما ظهر لی فی هذا المحل واللہ تعالیٰ اعلم اھ قلت وفی الباب روایات لا تحصیٰ ولا تعد وفیما ذکرنا کفایۃ
انشاء اللہ تعالیٰ واذا کان هذا حکم الکراء والشراء للدار، والتعلی فی البناء والجدار فکیف
حکم بیع المسلمین اراضیهم من الکفار وهو اقویٰ اسباب العزۃ والشوکۃ والقوۃ والصولۃ
واذا کان هذا حکم الذمیین وهم مقهورون تحت حکم الاسلام فکیف حکم غیر الذمیین الذی لیس

فی شیٔ من الاستسلام وھو کما قال اللہ تعالیٰ لا یالونکم خبالا و کما قال تعالیٰ لا یرقبون فی مؤمن الّا ولا ذمۃ وکما قال اللہ تعالیٰ ان یثقفوکم یکونوا لکم اعداء ویبسطوا الیکم ایدیھم والسنتھم بالسوء وودوا لو تکفرون، وللہ در القائل ؎

احبابنا نوب الزمان کثیرۃ　　وامرّ منھا رفعۃ السفھاء

فمتیٰ یفیق الدھر من سکراتہ؟　　واری الیھود بذلۃ الفقھاء!!

واما عن الجزء الثانی فان کان اھل ھذہ الفتاوی من اھل البصیرۃ والکیاسۃ فاقرب محاملھا ھی السیاسۃ، والعلماء لھم فی امثالھا حق الریاسۃ، وھذا اٰخر الجواب فی ھذا الباب واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ اشرف علی التھانوی من الھند الحنفی الفاروقی عفی عنہ للثلث الاول فی رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ

(النور شعبان ۱۳۵۴ھ ص ۹)

خریدن جلد یا لحم حیوان قبل ذبح

سوال (۶۵) کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ بکری یا گائے وغیرہ کی کسی شخص نے قبل ذبح کے اگر گوشت کا اندازہ کر کے ان کی قیمت طے کی اور چمڑے کی قیمت علیحدہ دوسرے شخص سے طے کرائی اور اسی وقت قیمت بھی سب آدمیوں نے دیدی یا ٹھہر کر دی اور دوسری صورت یہ ہے کہ قبل ذبح کے فقط گوشت یا فقط چمڑے کی قیمت طے کی اگر قبل ذبح کے ایسی صورت کی جائے تو اس کا گوشت بعد ذبح کے خریدنا یا کھانا جائز ہے یا نہیں بینوا توجروا

الجواب، فی الدر المختار صور البیع الفاسد وکذا اکل ما اتصالہ خلقی کجلد حیوان ونوی تمر وبزر بطیخ اھ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بیع فاسد تھی اور بیع فاسد میں گو متعاقدین گنہگار ہوتے ہیں مگر مبیع بعد قبضہ کے مملوک ہو جاتی ہے پس گوشت بھی مملوک ہو گیا اس لئے بعد ذبح کے اس گوشت کا خریدنا جائز ہے۔ ۲۹ رمضان ۱۳۳۲ھ　(تتمہ ثانیہ ص ۱۷۲)

زمیندار اپنی رعایا کے قصابوں سے ارزاں نرخ پر گوشت خریدیں اس کا حکم

سوال (۶۶) قصاب رعایا میں ہمیشہ سے یہ دستور ہے کہ بمقابلہ دیگر اشخاص کے زمیندار کو کم نرخ پر گوشت دیتے ہیں، اور بعض جگہ ایک آنہ سیر معین ہے خواہ نرخ کچھ ہو یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، ایک طرح جائز ہے کہ وہ قصاب اس زمیندار کے مکان میں مثلاً رہتا ہو یا اور کوئی انتفاع اس سے ایسا حاصل کرتا ہو جس کی اجرت لینا شرعاً جائز ہو اور اس اجرت میں یہ بات ٹھہر جاوے کہ ہر ماہ اس قدر گوشت ہم اتنے نرخ پر لیں گے اور مہینے میں اس مقدار سے زیادہ نہ بڑھیں، کم رہے تو

مضائقہ نہیں اس طرح درست ہے، جتنا احتمال مہینہ بھر میں ہو اس سے کچھ زیادہ مقدار ٹھہرا لینے میں خطرہ نہ رہے گا، مگر حساب یاد رکھنا ہوگا، ۳ صفر ۱۳۳۲ھ (تتمہ رابعہ ص ۲۳)

زمینداروں کا کاشتکاروں سے شادی کے موقع پر گھی بنرخ ارزاں خرید نا غیر معین مقدار پر

سوال (۶۷) زمینداروں میں دستور ہے کہ شادی کے وقت کاشتکاروں سے فی ہل ایک روپیہ دے کر گھی لیتے ہیں، اور کاشتکار ایک روپیہ لے کر سوا روپے کا گھی دیتے ہیں۔

الجواب، یہ ناجائز ہے کیونکہ اس کی مجموعی مقدار معین نہیں، کہ کتنا گھی ایک سال میں مثلاً لیا جاوے گا، ۲۶ شوال ۱۳۳۳ھ (حوادث ثالثہ ص ۱۵۸)

کھڑی ہوئی گھاس کی بیع بعض اعذار کی حالت میں

سوال (۶۸) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں عہ فقہ کی کتابوں میں بیع باطل و فاسد کے بیان میں لکھا ہوا ہے کہ کھڑی ہوئی گھاس بیچنا درست نہیں ہے جبکہ زمیندار نے قبل جمنے کے پانی نہ دیا ہو اور خودرو ہو، جو زمین قابل مزروعہ کے نہیں ہوتی فراز نشیب ہوتی ہے، اور بارش میں ڈوب بھی جاتی ہے، اس زمین پر علی العموم گھاس جما کرتی ہے اور زمیندار لوگ پانی تو نہیں دیتے مگر اس کی نگرانی و حفاظت کرتے ہیں، اور سرکار مزروعہ سے کم لگان تشخیص کر کے مالگذاری بھی لیتی ہے، اور زمینداروں کو اس کی مالگذاری دینی پڑتی ہے، اور جب کہ زمیندار کو چرائی لینا ناجائز ہو تو ایسی صورت میں زمیندار بلا وجہ نقصان اٹھاتا ہے، اور گرد و نواح کے لوگ مویشیان تجارتی رکھتے ہیں، یعنی گئے اور بھینس بکثرت پالتے ہیں، اور اس کا گھی اور دودھ اور بیل و بھینسا جو اس سے پیدا ہوتا ہے فروخت کرتے ہیں، اور چند روز کے بعد وہی مالکان مویشیان اپنا استحقاق قائم کرتے ہیں، کہ ہم عرصۂ دراز سے بلا معاوضہ چراتے ہیں، مالک زمین کو روکنے کا کوئی حق نہیں ہے زمیندار دو نقصان اٹھاتا ہے، ایک تو سرکار کو مالگذاری ادا کرتا ہے۔ دوسرے بعد چندے زمین پر اس کا کوئی استحقاق خاص بہ نسبت اور لوگوں کے باقی نہیں رہتا، بلکہ کسی وقت میں اگر زمین قابل مزروعہ کے ہو جاتی ہے، اور زمیندار اس کو مزروعہ کرنا یا کرانا چاہتا ہے تو وہی مالکان مویشیان نالش فوجداری میں کرتے ہیں، اور بیچارہ زمیندار بلا وجہ مفت پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور جس قدر ایسی زمین پرتی عہ کے گرد و نواح میں کھیت رہتے ہیں ان کھیتوں کو بھی مویشیان نقصان پہنچاتے ہیں، زمیندار مالگذاری سرکار کہاں سے ادا کرے، ایسی صورت میں زمیندار کو کیا چارہ کار ہے، یعنی اس زمین پرتی کی چرائی لینا اور بغرض تحفظ استحقاق آئندہ مویشیوں کو روکنا جائز ہے یا ناجائز،

عہ اور ایسی قسم کی زمین پرتی پر گھاس جمتی ہے، اور مویشیوں کو چرنے وغیرہ سے روکا جاتا ہے، اور

حفاظت کی جاتی ہے، مگر زمیندار پانی نہیں دیتا ہے، اور جب وہ گھاس بڑی ہو جاتی ہے، اس کو گھاس کلاں اور کھر بھی کہتے ہیں، اور وہ دیہاتوں میں نہایت کارآمد ہوتی ہے، یعنی کل مکانات آدمیوں کے رہنے اور مویشیوں کے رہنے کے اور کل ضرورتوں کے مکانات اسی سے چھائے جاتے ہیں، علاوہ اس کے اور کوئی شے ایسی نہیں ہے کہ جس سے مکانات دیہات کے چھائے جائیں، اور وہ گھاس کلاں یعنی کھر قیمتی ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں پرتی زمین کی گھاس کی حفاظت کرنا اور بیع کرنا جائز ہے یا ناجائز، اور اگر علی العموم پرتی زمین کی گھاس ہر شخص چرا دیا کرے اور حفاظت نہ کرے تو دیہات میں مکانات چھانے کی ضرورت کیونکر رفع ہو سکتی ہے؟ بینوا توجروا،

الجواب، جو گھاس سیدھی کھڑی ہو جاوے، یعنی تنہ دار ہو، جیسے پولا جس میں سینکیں نکلتی ہیں وہ ہر حال میں زمیندار کی ملک ہے، اور جو ایسی نہ ہو بلکہ زمین پر پھیلتی ہو اس میں یہ تفصیل ہے، کہ اگر وہ اس شخص کے پانی دینے سے پیدا ہوئی ہے تب بھی اس کی ملک ہے اور جو از خود پیدا ہوئی ہے وہ ملک نہیں اور محض حفاظت سے ملک نہیں ہوتی پس ایسی گھاس کا بدون کاٹے ہوئے بیچنا یا کسی کو اس کے لینے سے روکنا جائز نہیں اور مالگذاری دینے سے اس کا جواز لازم نہیں آتا۔ لان اخذ الخراج ان کان بحق فظاہر وان کان بغیر حق فلان المظلوم لا یظلم غیرہ، البتہ اگر مواشی کو اس میں چرنے کی اجازت دینے سے کوئی ضرر بیّن ہو جیسا سوال میں لکھا ہے فی قولہ یہی مالکان مویشیان الخ تو اس صورت خاص میں اس سے تو روکنا جائز ہے لیکن بیع یا اجارہ جائز نہیں، بلکہ اگر مواشی والوں کو گھاس کی ضرورت ہو اور قریب موقع پر مفت گھاس میسر نہ ہو تو اس مالک گیاہ سے کہا جاوے گا کہ یا تو گھاس چرانے کی اجازت دو یا گھاس کٹوا کر دو، البتہ اگر اجازت میں زمیندار کا کوئی معتد بہ ضرر ہو اور ممانعت میں عامہ کا معتد بہ ضرر نہ ہو تو امید ہے کہ فقہاء کے لکھے ہوئے حیلہ پر عمل کرنے میں ملامت نہ ہوگی، اور وہ حیلہ یہ ہے کہ جس زمین میں گھاس ہے اس کو کسی شخص کے ہاتھ کسی اور کام کیلئے اجارہ پر دیدے، مثلاً اس میں مواشی کو کھڑا کیا کریں گے و مثل ذلک پس وہ دام کرایہ کے ہوں گے، گھاس کے نہ ہوں گے، کذا فی الدر المختار و رد المحتار باب البیع الفاسد و باب الشرب،

۲۷ شعبان ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ ص ۶۶)

جواز بعض صور صفقۃ فی صفقۃ

سوال (۶۹) نہی عن صفقۃ فی صفقۃ کے ظاہری معنی کے لحاظ سے بعض امور ناجائز معلوم ہوتے ہیں حالانکہ بکثرت خاص و عام میں شائع ہیں مثلاً گھڑی کی مرمت کہ ٹوٹے ہوئے پرزے کو نکال کر صحیح پرزہ لگادے گا تو اس پرزہ کی تو بیع ہے اور لگانے کا اجارہ۔ نمبر ۲ چارپائی بنوانا اور بان اپنے پاس سے نہ دینا اس میں بان کی بیع ہے اور بننے کا اجارہ، نمبر ۳ سقہ سے

پانی لینا کہ جب اس نے کنوئیں سے پانی نکال کر اپنے ظروف میں لیا تو اس کی ملک ہو گیا سو پانی کی بیع ہوئی اور وہاں سے لانے کا اجارہ نیز بیع مالیس عندہ بھی ہے ۲۲ کوئی زیور یا انگوٹھی جڑنے کو دینا کہ نگینوں کی بیع ہے اور لگانے کا اجارہ وغیر ذلک من المعاملات الرائجۃ۔

الجواب، تعامل کی وجہ سے کہ بلانکیر شائع ہے جو ایک نوع کا اجماع ہے یہ سب معاملات جائز ہیں پس نص عام مخصوص البعض ہے جیسا فقہائے صباغی و خیاطی میں اس کی اجازت دی ہے کہ صبغ اور خیط صانع کا ہوتا ہے اور اس میں اجارہ بھی ہوتا ہے۔ وھذا ظاھر جدا۔ فقط واللہ اعلم، (امداد ثالث ص۳)

گھاس کی بیع و شراء غیر مسلم سے

سوال (۷۰) ۱ گھاس خودرو کو کفار یا سرکار سے خریدنا کیسا ہے؟ ۲ اور کفار کے ہاتھ بیچنا کیسا ہے؟

الجواب۔ ۱ درست نہیں، ۲ بعض کے نزدیک درست ہے،

۹ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ ص ۲۰)

کاشت کی ہوئی گھاس کو فروخت کرنا

سوال (۷۱) بہشتی زیور میں گھاس کے ملک ہونے کے متعلق حضرت نے تحریر فرمایا ہے کہ البتہ اگر پانی دے کر سینچا اور خدمت کی ہو تو اس کی ملک ہو جاوے گی اب بیچنا بھی جائز ہے، اور لوگوں کو منع کرنا بھی جائز،

خدمت کی صراحت فرمادی جائے کہ کس طور کی خدمت، یا مالک زمین اگر گھاس کا پھول ڈالدے جس کی وجہ سے گھاس اُگے، آیا اس صورت میں بھی گھاس اس کی ملک ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب۔ بدرجہ اولیٰ ملک ہو جاوے گی سقی سے غرس کو اس کے حصول میں زیادہ دخل ہے فی ردالمحتار واخص من ذلک کلہ وھو ان یحتش الکلاء او انبتہ فی ارضہ فھو ملک لہ ولیس لاحد اخذہ بوجہ محصولہ بکسبہ ذخیرہ وغیرھا ملخصا ج ۵ ص ۳۵۴،

۱۰ رمضان ۱۳۳۷ھ (تتمہ خامسہ ص ۹۱)

اقالہ (واپسی بیع) اور بیع بالخیار

تعریف اقالہ وبیع بالخیار | **سوال** (۵۲) بیع اقالہ اور بیع بالخیار کی کیا تعریف ہے، اور کیا فقہ میں اس سے بحث کی گئی ہے؟

الجواب، اقالہ یہ ہے کہ ایک بیع تام ہوگئی، پھر مشتری یا بائع پچھتایا اور دوسرے سے واپسی بیع کی درخواست کی، اور اس نے خوشی سے واپس کرلیا اور بیع بشرط الخیار یہ ہے کہ ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ ہم اسی مدت تک واپس کرلینے کا اختیار ہے، یہ تو تعریف ہے، رہی بحث سو بہت سے مباحث اس کے متعلق لکھے ہیں، اگر کوئی خاص امر دریافت کیا جاوے تو جواب ممکن ہے۔

۹ جمادی الاخریٰ ۱۳۲۳ھ (امداد ثالث ص۱)

تحقیق حدیث خیار مجلس | **سوال** (۵۳) روی البخاری فی ص۲۸۳ حدثنا قتیبۃ ثنا لیث عن نافع عن ابن عمر عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم انہ قال اذا تبایع الرجلان فکل واحد منھما بالخیار مالم یتفرقا وکان جمیعا او یخیر احدھما الآخر (فان خیر احدھما الآخر نسائی) فتبایعا علی ذلک فقد وجب البیع وان تفرقا بعد ان تبایعا ولم یترک واحد منھما البیع فقد وجب البیع ص۲۸۳ کتاب البیوع وھذہ الروایۃ رواھا النسائی بعین ھذا السند ومتنہ سوی انہ زاد لفظ الشرط ثم روی البخاری فی تلک الصفحۃ عن عبد اللّٰہ بن عمر قال بعت من امیر المومنین عثمان الی قولہ فلما تبایعنا رجعت علی عقبی حتی خرجت من بیتہ خشیۃ ان یرادنی البیع وکانت السنۃ ان المتبایعین بالخیار حتی یتفرقا الخ ففی ھاتین الروایتین المرفوعتین حقیقۃ وحکما بیان واضح لثبوت خیار المجلس وقاطع لکل تاویل ولا یعارضہ مارواہ النسائی ص۲۱۵ من عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال المتبایعان بالخیار مالم یفترقا الا ان یکون صفقۃ خیار ولا یحل لہ ان یفارق صاحبہ خشیۃ ان یستقیلہ اھ لان ھذا متکلم فیہ ولو سلم فھو لا یعارض الصحیح ولو سلم فھی اشارۃ والاولی کالصریح اوصریح والاشارۃ لا تفوق الصراحۃ واما قول ابن عمر ما ادرکت الصفقۃ حیا مجموعا فھو من المبتاع رواہ البخاری ص۲۸۲ فھذا وان احتج بہ البخاری فھو غیر تام وغیر مفید لنا لانا لا نقول بما اذا الھلاک قبل القبض عندنا یوجب فسخ البیع وکون الھالک من مال البائع لا من

المتاع فما لا نقول به کیف نحتج به فلا یفید نا اثبات المخالفة بین قوله وفعله فهما وان تعارضا
بقیت روایة سالمة بل ینبغی ان یؤول هذا الاخیر ویراد بالصفقة الصفقة التامة باعتبار
جمیع شرائطه ومن شرائطه التفرق بالابدان فمعنی هذا القول ما ادرکت الصفقة بعد
التفرق بالابدان حیا مجموعا فهو من المبتاع فمجرد قول النخعی رد الحدیث الصحیح مرفوعا
وموقوفا یمجه الطبع ویستنکره ولا نرید من جانبکم ذکر ما رواه الشراح اما الاحناف اذ هو رد
الحدیث الصریح الصحیح لا غیر بل معاملته مع تمار تدل علی ان تلک السنة کانت مستمرة عندهم

الجواب، هذه الشبهة من شبهات القدیمة ولا شک فی ان ظاهر الاحادیث هو ثبوت
خیار المجلس لکن لا یصح الحکم بکون المذهب الحنفی مخالفا للاحادیث یقینا مادامت
الاحادیث تحتمل التاویل ولو کان فیه شیء من البعد ولا یسلم احد من اهل المذاهب
المتبوعة عن نحو هذه التاویلات کما حمل بعض الشافعیة قوله علیه السلام فاقرأ ما تیسر معک
من القرآن علی الفاتحة فانها متیسرة واقرب لاثل الحنفیة قوله علیه السلام لا یحل له ان
یفارقه خشیة ان یستقیله رواه الخمسة الا ابن ماجة ورواه الدارقطنی کذا فی النیل جزء
ص ۲۹ ففیه دلیل علی ان صاحبه لا یملک الفسخ الا من جهة الاستقالة واما قول المخالفین
انه لو کان المراد حقیقة الاستقالة لم تمنعه من المفارقة لانها لا تختص بمجلس العقد
فالجواب عنه ان قرب العهد بالعقد له دخل مشاهد فی تأثر کل من المتعاقدین بالتماس
الاخر اما قوله لا یحل فمحمول علی الکراهة من حیث انه لا یلیق بالمروة وحسن معاشرة المسلم
کما اضطر الیه ایضا القائلون بخیار المجلس فان حل المفارقة اجماعی عندنا وعندهم جمیعا
واما کونه متکلما فیه فیعتبر لو کان معارضا للصحیح ولم یعارض بعد تاویل الصحیح واقرب
التاویلات حمل التفرق بالابدان علی الاستحباب تحسینا للمعاملة مع المسلم کما ذکر فی
تقریر حدیث الاستقالة واما قول المخالفین انه لو کان المراد تفرق الاقوال فخلا الحدیث
عن الفائدة وذلک ان العلم محیط بان المشتری ما لم یوجد منه قبول المبیع فهو بالخیار وکذلک
البائع خیاره فی ملکه ثابت قبل ان یعقد البیع اھ فغیر ملتفت الیه لانه یمکن ان یکون مقصود
الشارع نفی بعض بیوع الجاهلیة من نحو الملامسة والمنابذة فلم یکن خالیا عن الفائدة
واما دعوی کون بعض الفاظ الحدیث غیر محتمل للتاویل کقوله علیه السلام فان خیر احدهما
الاخر فتبایعا علی ذلک فقد وجب البیع وان تفرقا بعد ان تبایعا ولم یترک واحد منهما

البیع فقد وجب البیع اھ فیستوعد لان معنی قولہ فقد وجب البیع فی الاول ای بشرط الخیار حیث خیر احدھما الآخر وفی الثانی ای البیع البات حیث لم یشترط فیہ الخیار ولیس لفظ اصرح منہ ولیس الامام متفردا فی ھذا بل قد ذھب الیہ النخعی والمالکیۃ والثوری واللیث وزید بن علی وغیرھم کما فی النیل ج ۵ ص ۷۴ واللہ اعلم ۔ ۱۰ ربیع الآخر ۱۳۳۲ھ (تتمہ رابعہ ص ۲۳)

دھوکہ سے معاملہ بیع کا کرلیا تو مشتری کو خیار نہیں

سوال (۷۴) ہمارے اطراف میں بسا اوقات اس طرح دیا جاتا ہے کہ ایک نرخ میں کرکے فی روپیہ کے حساب سے چیت کے ادھار غلہ دیا جاتا ہے، اور چیت میں روپیہ لیا جاتا ہے، امسال بھی ایسا ہی ہوا، مگر اسامیوں نے یہ دھوکہ دیا کہ ہماری بڑی پٹی کا یہ حوالہ دیا کہ ان کے یہاں فی روپیہ چھ سیر گندم دیا گیا ہے، اس لئے میں نے بھی اسی نرخ پر دیدیا، مگر اسی روز سہ پہر کو معلوم ہوا کہ مجھے دھوکہ دیا گیا، اور جانچنے پر معلوم ہوا کہ بڑی پٹی میں ساڑھے پانچ سیر گندم فی روپیہ دیا گیا ہے، ایسی میں چھ سیر کی جگہ ساڑھے پانچ سیر نرخ فی روپیہ رکھ سکتا ہوں یا نہیں، غلہ میرے قبضہ سے نکل گیا ہے، مگر ابھی اسامیوں نے کھیت میں نہیں ڈالا ہے، بلکہ گھر پر موجود ہے، میں نے یہ کہلوا دیا ہے کہ بڑی پٹی میں ساڑھے پانچ سیر گندم دیا گیا ہے، اب میں نے بھی ساڑھے پانچ سیر بھاؤ کردیا ہے جس کو یہ بھاؤ منظور ہو رکھے ورنہ میرا گندم واپس کرجا دے، لیکن کسی نے واپس نہیں کیا۔

الجواب ، فی الھدایۃ فیما یکرہ من البیوع وعن تلقی الجلب وھذا اذا کان یضر باھل البلد فان کان لا یضر فلا باس بہ الا اذا لبس السعر علی الواردین فحینئذ یکرہ لما فیہ من الغرر والضرر الی قولہ وکل ذلک یکرہ ولا یفسد بہ البیع لان الفساد فی معنی خارج زائد لا فی صلب العقد ولا فی شرائط الصحۃ ج ۳ ص ۴۵ ، اس روایت سے معلوم ہوا کہ اسامیوں کو اس دھوکہ دینے سے گناہ ہوا لیکن بیع صحیح ہوگئی، آپ کو نہ غلہ کا واپس کرنا جائز ہے اور نہ دام زیادہ لینا، آپ ان کی روایت کی تحقیق خود کرسکتے تھے، ان پر کیوں اعتماد کیا؟ ۱۷ محرم ۱۳۳۲ھ (تتمہ رابعہ ص ۶۱)

مشتری بائع کو مبیع کی حالت بیان کرنے میں دھوکہ دے

سوال (۷۵) کیا حکم شریعت کا ہے اس صورت میں کہ زید پانی پت میں رہتا ہے اور عمرو گیا میں، زید نے عمرو سے کہا کہ تمہاری جائداد جس کا غلہ للغہ سالانہ کا وصول ہوتا ہے، پانی پت میں ہے، اور پانی پت میں نرخ غلہ ارزاں ہوگیا ہے، ان کے باہمی عقد بیع ہوگیا، بعد بیع عمرو کو معلوم ہوا کہ زید نے مجھکو فریب دیا، غلہ ارزاں فروخت نہیں ہوتا، نوبت بعدالت پہونچی، عمرو نے عدالت میں بیان تحریری دیا کہ زید نے مجھ کو فریب دیا، اور مجھ سے کہا کہ پانی پت میں غلہ تین من کا فروخت ہوتا ہے، اور اب معلوم ہوا کہ غلہ دو من سے بھی کم فروخت ہوتا ہے، اس کے بعد یہ

مقدمہ ثالثوں کے پاس آیا، ثالثوں سے عمرو نے بیان کیا کہ زید نے مجھے فریب دیا تھا اور کہا تھا کہ غلہ چار پانچ من فی صدی فروخت ہوتا ہے اور شہادت سے بھی عمرو نے یہ بات ثابت کر دی کہ زید نے عمرو سے بیشک یہ کہا تھا کہ پانی پت میں چار پانچ من غلہ فی صدی فروخت ہوتا ہے، پس اس صورت میں عمرو کے دونوں بیان جو ظاہرا متعارض معلوم ہوتے ہیں، اس کے اثبات دعویٰ کے بھی مضر اور شہادت کے مسقط ہیں یا نہیں، یعنی فریب چار پانچ من فی صدی کا جو شہادت سے ثابت ہو وہ ثابت رہے گا، یا اول بیان کے معارض ہونے سے ساقط ہو جائے گا، اور شہادت ساقط ہوگی، یا دوسرے بیان کی مثبت رہے گی۔

الجواب - عبارت سوال کی ناکافی ہے، زبانی بیان سے معلوم ہوا کہ مطلب یہ ہے کہ جس زمین میں اس قدر غلہ حاصل ہوتا ہے یعنی دو من چونتیس سیر یا دو من سے بھی کم یا چار پانچ من مثلاً وہ جائداد سو روپے کو فروخت ہوتی ہے اور میرے نزدیک عمرو کے ان دونوں بیانوں کا تعارض مضر نہیں کیونکہ جب مقدمہ ثالثوں کے سپرد بتراضی طرفین ہو گیا، تو مجلس قضا اب اس حکم کی مجلس ہوگی اور پہلا بیان مجلس قضا سے خارج ہوگا جس کا اعتبار نہیں، اور اس مجلس میں جو دعویٰ کیا ہے، وہ اور شہادت متوافق ہیں، لہٰذا پہلے بیان کا تعارض مضر نہیں، لیکن باوجود مضر نہ ہونے کے عمرو کے اصل مقصود کو نافع نہیں، کیونکہ اصل مقصود اس کا خیار فسخ کا حاصل کرنا ہے، جیسا کہ خود اس سوال کی بھی عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔ اور دوسرے پرچے سے جو اس کے ساتھ جواب کی غرض سے آیا ہے زیادہ واضح ہوتا ہے، اس میں بائع کا نام زید فرض کیا گیا ہے، اور اس میں عمرو اس دوسرے پرچے میں خیار فسخ بائع کے لئے نہ ہونا مدلل و مفصل مذکور ہے واللہ اعلم۔ والدلیل هذا فی الهدایة الشهادة اذا وافقت الدعوی قبلت وان خالفتها لم تقبل و فی حاشیتها بو من مل علی قوله کتاب الدعوی هی فی عرف الفقهاء عبارة عن مطالبة حق فی مجلس من له الخلاص عند ثبوته الی قوله شرط صحتها مجلس القضاء فالدعوی فی غیر مجلس القضاء لا تصح الخ واللہ اعلم،

یوم عرفہ ۱۳۲۲ھ (امداد ثالث ص ۱۲)

تتمہ سوال سابق | **سوال** (۷۰) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید کی ملکیت کی جائداد جس کا [illegible] غلہ سال بھر میں آتا ہے، پانی پت میں عمرو کے قبضہ اور تصرف میں ہے، اور زید گیا میں رہتا ہے، زید سے عمرو نے گیا میں جا کر کہا کہ تمہارا غلہ میرے پاس بمقدار [illegible] موجود ہے، زید نے اس کو [illegible] سمجھ کر چودہ سو کو عمرو کے ہاتھ فروخت کر دیا، بعدہٗ زید کو معلوم ہوا کہ میری جائداد کی آمدنی [illegible] من کو زیادہ ہے، اب عمرو چاہتا ہے کہ یہ بیع بابت قرار دی جائے اور زید کہتا ہے کہ مجھے

مقدار کمیت میں فریب کیا گیا ہے، مجھے خیار فسخ ہے، میں اب اس بیع کو قائم رکھنا نہیں چاہتا
عمرو کا خیال ہے غایۃ ما فی الباب یہ ہے کہ جو زائد غلہ اس کا ہے اس کی قیمت اسی طرح دلا دی جاوے
کیونکہ بیع ہو چکی تھی، اس مسئلہ کی بابت علماء دین سے سوال ہے کہ اس صورت میں زید بائع کو بہ
سبب غبن فاحش خیار فسخ ہے یا نہیں؟

سوال دوم یہ ہے کہ نرخ کے اندر فریب دینے سے حق فسخ حاصل ہوتا ہے، یا مقدار مبیع کے
اندر فریب دینے سے بھی حق فسخ حاصل ہوتا ہے؟

الجواب، عبارت سوال کی ناکافی ہے، زبانی بیان سے معلوم ہوا کہ صورت سوال یہ ہے کہ بیع
جائداد کی ہوئی ہے، اور اس کی آمدنی زیادہ غلہ کی ہے، اور مشتری نے دھوکہ دے کر بائع کو کم بتلائی
جس سے گراں چیز ارزاں فروخت کر دی، اس صورت میں جواب یہ ہے کہ عمرو کو گناہ بہت ہوا لیکن
زید کو خیار فسخ حاصل نہیں، البتہ عمرو پر فیما بینہ وبین اللہ واجب ہے کہ زید کی رضا وطیب نفس حاصل کرے،
والدلائل ھذہ فی الھدایۃ ومن باع مالم یرہ فلا خیار لہ وکان ابو حنیفۃ یقول اولا لہ الخیار اعتبارا
بخیار العیب وخیار الشرط وھذا لان لزوم العقد بتمام الرضا زوالا وثبوتا ولا یتحقق ذلک الا
بالعلم باوصاف المبیع وذلک بالرؤیۃ فلم یکن البائع راضیا بالزوال ووجہ القول المرجوع الیہ
انہ معلق بالشراء لما روینا فلا یثبت دونہ وروی (قال الزیلعی اخرجہ الطحاوی ثم البیھقی عن علقمۃ
ابن ابی وقاص) ان عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ باع ارضا بالبصرۃ من طلحۃ بن عبید اللہ فقیل
لطلحۃ انک قد غبنت فقال لی الخیار لانی اشتریت مالم ارہ وقیل لعثمان انک قد غبنت فقال لی
الخیار لانی بعت مالم ارہ فحکما بینھما جبیر بن مطعم فقضی بالخیار لطلحۃ وکان ذلک بمحضر من الصحابۃ
اھ قلت لما لم یثبت الخیار للبائع مع عدم رؤیتہ لذات المبیع ففی عدم رؤیۃ الوصف الذی ھو
الریع اولیٰ کما ھو ظاھر وفیھا وعن تلقی الجلب وھذا اذا کان یضر باھل البلدۃ فان کان لا یضر
فلا بأس بہ الا اذا لبس السعر علی الواردین فحینئذ یکرہ لما فیہ من الغرر والضرر اھ قلت ومطلق الکراھۃ
یفید التحریم وھذا دلیل کون فعل ھذا المشتری حراما وفی الحدیث الا لا یحل مال
امرئ الا بطیب نفسہ قلت والی لا یحضر فی مخرجہ الآن وھو دلیل علی وجوب رضاء البائع
دیانۃ واللہ اعلم۔

(جواب سوال دوم) اگر یہ سوال بھی متعلق سوال اول کے ہے جیسا کہ ظاہر ہے تو سمجھ لینا چاہئے
کہ یہ فریب نرخ ہی میں ہوا ہے، مقدار مبیع میں نہیں ہوا اور اس کا جواب گذر چکا، اور اگر مقدار مبیع کو مستقلاً

پوچھا ہے تو جواب یہ ہے کہ اگر مبیع جائداد یعنی عقار ہے اور ثمن جملہ ٹھیرا ہے تو بعد میں مقدار زیادہ معلوم ہونے سے بائع کو خیار نہیں ہوتا۔ فی الہدایۃ ومن اشتری ثوبا علی انہ عشرۃ اذرع بعشرۃ دراہم او ارضا علی انہا مائۃ ذراع فوجدہا اقل فالمشتری بالخیار ان شاء اخذہا بجملۃ الثمن وان شاء ترک و ان وجدہا اکثر من الذراع الذی سماہ فہو للمشتری ولا خیار للبائع الخ ۔ واللہ اعلم

یوم عرفہ ۱۳۲۲ھ (امداد ثالث ص ۱۳)

بیع سلم (بدھنی)

مسلم الیہ کو بیع کے لئے وکیل بنانا اور بدھنی کے وقت مسلم فیہ کے موجود ہونے کی شرط

سوال (۷۷) یہاں شیرہ کی تجارت کی صورت یہ ہے کہ کھنسال والوں کو قبل فصل شیرہ کے پیشگی روپیہ دیدیا جاتا ہے، اور نرخ اسی وقت قرار پا جاتا ہے کہ ہم فصل میں اس نرخ سے شیرہ لیں گے، اور اتنا روپیہ دیتے ہیں، اس روپیہ کا اس نرخ سے زیادہ لیں گے، یہ بات قرار پا جاتی ہے، جب فصل آئی اور جو بھی نرخ ہوا مالک شیرہ خود ہی جتنا شیرہ نکلتا جاتا ہے، خود اس ہی نرخ سے فروخت کرتا رہتا ہے، اور تعداد معین فروخت ہو جانے پر حساب کر دیتا ہے، مثلاً زید نے عمرو کو سو روپے دیئے اور یہ بات قرار پائی کہ چھ سیر کا شیرہ چھ سو سیر ہمارا رہا، جب فصل آئی اور شیرہ راب میں سے نکلتا گیا اور نرخ تین سیر ہو گیا تو مالک اس کو بحساب تین سیر فروخت کرتا رہا، جب چھ سو سیر نکل چکا تو اس نے حساب کر دیا؟

الجواب: فی الدر المختار فی السلم شرط دوام وجودہ وفیہ شرط حملہ الی منزلہ بعد الایفاء فی المکان المشروط لم یصح لاجتماع الصفقتین الاجارۃ والتجارۃ وفیہ لا یجوز التصرف الی تولیۃ ولا لرب السلم فی المسلم فیہ قبل قبضہ، پس اولاً قبل فصل سلم ٹھیرانا جائز نہیں للروایۃ الاولیٰ اور اگر بعد فصل ٹھیرائیں تو جب تک شیرہ پر خود رب السلم قبضہ نہ کر لے اس میں تصرف کرنا جیسے بیع کرنا خواہ خود خواہ بذریعہ وکیل غیر قابض جائز نہیں، اور یہاں وکیل بائع ہے جس کا قبضہ بجائے قبضہ رب السلم نہیں، اسلئے یہ بیع منجانب رب السلم نہیں، للروایۃ الثالثۃ، اور اگر خود رب السلم بھی قبضہ کر لے تب بھی یہ شرط ٹھیرانا کہ مسلم الیہ بیع کرایا کریگا، شرط زائد ہے، اور صفقہ توکیل کا صفقہ سلم کے ساتھ جمع کرنا ہے، اس لئے جائز نہیں للروایۃ الثانیۃ، البتہ اگر فصل میں مسلم فیہ موجود ہو اور توکیل مشروط نہ ہو، اور بعد تیاری شیرہ قبضہ کر کے توکیل جدید مسلم الیہ کو وکیل بنا دے تب جائز ہے، فقط واللہ اعلم، ۴ شعبان المعظم ۱۳۲۱ھ (امداد ثالث ص)

بیع سلم میں مشتری کے مرنے سے معاملہ قائم رہتا ہے بائع کے مرنے سے باطل ہو جاتا ہے

سوال (۷۸) زید نے بدعمی کی بیع بیس روپے اس عقد پر عمرو کو دیئے کہ پانچ سال میں فی سال دو من گیہوں کے حساب سے دس من گیہوں ادا کرے، ایک سال کے بعد دو من گیہوں کچا اناج ادا کر کے زید کا انتقال ہو گیا اب سوال یہ ہے کہ زید کے ورثہ عمرو سے آئندہ چار سال میں عقد سابق کے موافق آٹھ من گیہوں وصول کر سکتے ہیں یا نہیں، غرض احد المتعاقدین کی موت سے معاملہ و معاہدہ سابق فسخ ہو جائے گا یا باقی رہیگا اسی طرح عمرو کے انتقال ہونے سے عمرو کے ورثہ پر زید کا تقاضا چلے گا یا نہیں یا دونوں صورتوں میں اصل روپیہ کا مطالبہ اور ادا واجب ہوگا؟

الجواب، فی الدر المختار ویبطل الاجل بموت المسلم الیہ لا بموت رب السلم فیؤخذ المسلم فیہ من ترکتہ حالاً لبطلان الاجل بموت المدیون لا الدائن الخ اس روایت سے معلوم ہوا کہ صورت مسئولہ میں زید کے مرنے سے کہ وہ رب السلم ہے عقد بحالہ رہیگا زید کے ورثہ عمرو سے موافق عقد کے وصول کریں گے، اور عمرو کے مرنے سے کہ وہ مسلم الیہ ہے میعاد باطل ہو جائے گی، بقیہ گیہوں عمرو کے ترکے سے وصول کرلئے جائیں گے، (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۶)

روپیہ پیسہ میں بیع سلم کا عدم جواز

سوال (۷۹) روپیہ پیسے میں بیع سلم درست ہے یا نہیں یعنی ایک شخص نے کسی مدیون کو آج دس روپے دئے، ایک سال بعد پچاس روپے کے پیسے دینا ہوگا، اسی طرح کا بیع سلم درست ہے یا نہیں، اس مسئلہ میں نزاع ہے لہٰذا جواب کو بیع حوالہ کتب تحریر فرمایئے۔

الجواب، اگر مقصود صرف مبادلۂ فلوس و روپے ہی کا ہوتا، تو بوجہ عدم مانع کے یہ بیع درست ہوتی لیکن مقصود تو یہاں دوسرا ہے، یعنی سود ایک حیلہ سے لینا اس لئے یہ جائز نہ ہوگا، جس طرح فقہاء نے بیع عینہ کو باوجود انطباق علی قواعد الجواز کے اسی وجہ سے حرام کہا ہے، وہذا ظاہر جداً، ۲۲ شوال ۱۳۳۱ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۷)

افیون کی بیع سلم

سوال (۸۰) افیون کی کھیتی کرنا اس طریقہ سے کہ اس کا خریدنے والا انگریز ہے جو اس تخم ریزی کے زمانہ میں پیشگی کچھ خرچ دیتا ہے، اور جب پھول تیار ہوتا ہے تو پھلوں کو توڑ کر مٹی کے تاوہ میں جو مثل تنور کے ہے گرم کر کے اس پر پھلوں کو بچھا کر کپڑوں کی گدی سے اس کو دباتے ہیں تو بھاپ سے وہ باہم سمٹ جاتا ہے، مثل روٹی کے تو اس کو دھوپ میں سکھلاتے ہیں اور جب افیون تیار ہوتا ہے تو افیون اور روٹی دونوں اس کے طلب پر تول کے حساب سے فروخت

؎ تفصیل سوال ۹۵ میں دیکھیں ۱۲ اس

کراتے ہیں، اور وہ اپنا دیا ہوا پیشگی لے لیتا ہے، یہ جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا عند الجلیل،

الجواب - یہ سلم ہے، اگر سب شرائط جواز پائی جاویں تو جائز ہے،

۲۸ جمادی الثانی ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ص ۱۰۰)

تحقیق معنی انقطاع در بیع سلم

سوال (۱۸) دیار بنگالہ کے آدمی وہاں پر بیع سلم کرتے ہیں، ساتھ مدت معین مع شرائط مذکورہ شرع کے، لیکن ان ملکوں میں ایسا کوئی بازار نہیں ہے، کہ ہر روز ہر وقت میں بیع و فروخت کی جاوے، البتہ اندرون ہفتہ کے جائے واحد میں دو دن بازار قائم ہوتا ہے، اور اطراف و جوانب کے بازاروں کے حساب سے ہر روز بازار پایا بھی جاتا ہے، اور اکثر مقررہ بازاروں میں وقت معین پر شالی و غلہ کثرت سے بیع و فروخت ہوتا ہے اور بعض بازاروں میں نہیں، اور کوئی بازار اور کوئی دکان اور گدام ایسا نہیں ہے کہ جہاں ہر روز و ہر وقت خرید و فروخت کی جاوے، البتہ وقت خاص اور معین پر موجود ہوتا ہے، ولیکن ہر محلہ اور ہر بستی میں ہر وقت بلا قیل و قال خرید و فروخت جاری ہے جس وقت چاہے اس وقت مل سکتا ہے، اور بہت لوگ بہ نیت تجارت کے اپنے گھروں میں خرید کر گدام معمور رکھتے ہیں، اور فروخت بھی کرتے ہیں، اور کوئی عالم علمائے سلف و خلف سے آج تک مانع و غیر مجوز نہیں ہوا، بلکہ علمائے محققین سابقین و حال کے فتویٰ و تحریرات جائز اور درست برپائے جاتے ہیں، مگر اس وقت ایک شخص ان ملکوں کی بیع و سلم کو بالکل حرام و ناجائز بیان کرتا ہے اور دلیل لاتا ہے کہ بازار میں گدام ہونا شرط ہے، اور اس گدام میں ہر وقت خرید و فروخت پایا جانا ضروری ہے، اور محلوں اور گھروں کے گدام کی خرید و فروخت کو درست و جائز نہ ہوگا، اب علمائے محققین کی خدمت میں التماس یہ ہے کہ اس صورت مرقومۃ الصدر کے ساتھ ان ملکوں کی بیع سلم وہاں پر درست و جائز ہو سکتی ہے یا نہیں، بحوالہ کتب معتبرہ تحریر فرماویں، بینوا توجروا۔

الجواب. فی الدر المختار و منقطع لا یوجد فی الاسواق من وقت العقد الی وقت الاستحقاق ولو انقطع فی اقلیم دون اٰخر لم یجز فی المنقطع، فی رد المحتار حد الانقطاع ان لا یوجد فی الاسواق وان کان فی البیوت کذا فی التبیین: شرنبلالیہ و مثلہ فی الفتح والبحر والنہر قولہ لم یجز فی المنقطع ای المنقطع فیہ لانہ لا یمکن احضارہ الا بمشقۃ عظیمۃ فیعجز عن التسلیم بحر ج ۴ ص ۳۱۷، ۳۱۸

اس روایت سے معلوم ہوا کہ صورت مسئول عنہا میں سلم جائز ہے، اور فی البیوت کے معنی ہیں کہ اس کا بقیمت ملنا سہل نہ ہو، اور جب وہ ہر وقت بقیمت مل سکتی ہے تو جائز ہے، بلکہ فی اقلیم دون آخر سے معلوم ہوتا ہو کہ اگر خاص اس بستی میں بھی نہ ملے مگر قرب و جوار میں مل سکے تب بھی جائز ہے، ۳ محرم ۱۳۳۲ھ (تتمہ رابعہ ص ۹)

بیع صرف اور رائج الوقت سکوں نوٹوں کی بیع

(سونے چاندی کی بیع)

روپیہ کا تبادلہ پیسوں سے اور کچھ پیسوں پر قبضہ

سوال (۸۲) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مبادلۃ الربیہ بالفلوس بایں طور کہ احد المتعاقدین نے روپیہ بالفعل دیا، اور آخر نے روپے کے کچھ پیسے بالفعل دیئے، اور کچھ پیسے ادھار رکھے جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب، یہ مسائل مصرح و مسلّم ہیں ۱ بیع معدوم باطل ہے بجز سلم کے ۲ سلم کے شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اقل مدت اس میں تسلیم مسلم فیہ کے لئے ایک ماہ ہونا چاہئے، اور مسلم فیہ بالفعل نہ دیا جاوے، ۳ قدر و جنس میں سے اگر دو چیزیں ایک وصف میں بھی متحد ہوں تو تفاضل جائز اور نسیہ حرام ہے، ۴ جو مباح ذریعہ غیر مباح کا بنے ناجائز ہے، ۵ قرض میں مطالبہ مثل کا استحقاق ہوتا ہے، اب مبادلہ مسئولہ میں کئی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ روپیہ قرض دیا گیا، اور یہ شرط بھی کی کہ اس کے عوض میں اتنے پیسے لیں گے یہ ناجائز ہے، خواہ پیسے کم ہوں یا زیادہ حسب مسئلہ ۵ ۔ دوسرے یہ کہ قرض نہیں دیا گیا، بلکہ مبادلہ مقصود ہے، اور دوسرے شخص کے پاس پیسے موجود نہیں ہیں یہ بھی ناجائز ہے خواہ پیسے کم ہوں یا زیادہ حسب مسئلہ ۱ تیسرے یہ کہ پیسے موجود ہیں مگر اس وقت کسی وجہ سے آئے نہیں، پس اگر تانبے کا وزنی ہونے کا لحاظ کیا جاوے تو روپیہ او پیسے متحد القدر نہ ہوں گے، ان میں نسیہ جائز نہیں خواہ پیسے کم ہوں یا زیادہ حسب مسئلہ ۳ اور اگر اس کے وزنی ہونے کا اعتبار نہ کیا جاوے خواہ اس وجہ سے کہ اصطلاحاً یہ معدود ہے، خواہ اس وجہ سے کہ اس کے وزن کے باٹ چاندی تولنے کے باٹ سے مختلف ہیں تو یہ مبادلہ جائز ہے کما اختلف الشیخانؒ و محمدؒ، چوتھے یہ کہ مبادلہ سلم مقصود ہے، لیکن کچھ پیسے اس وقت لے لئے یا ایک ماہ سے کم مدت مقرر ہوئی یا کچھ مدت مقرر نہیں ہوئی تب بھی ناجائز ہے حسب مسئلہ ۲ : پانچویں یہ کہ دونوں طرف معقود علیہ موجود ہوں، اور اس کے وزنی ہونے کا لحاظ نہ کیا جاوے لیکن زیادہ لینے میں فتح باب ربوٰ کا اندیشہ ہو تب بھی ناجائز ہے حسب مسئلہ ۴ : چھٹے یہ کہ صورت سلم میں اندیشہ ربوٰ کا نہ ہو تب جائز ہے لعدم المحٰظر، واللہ اعلم، ۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۵ھ (امداد ثالث ص ۲ ج ۳)

پیسوں کا بدلہ روپیوں سے

سوال (۸۳) تعلیم الدین کے صفحہ ۴۳ میں ہے، اکثر رواج ہے کہ روپیہ دے کر کچھ پیسے لیتے ہیں، اور کچھ پیسے گھنٹہ بھر کے بعد لیتے ہیں، یہ معاملہ جائز نہیں ہے، انتہیٰ، اور بظاہر یہ مخالف درمختار اور عالمگیری کے ہے، بالتفصیل ارقام فرمایا جاوے۔ عبارت عالمگیری یہ ہے ص ۱۶۱

جلد ثالث مطبع کشوری فی الفصل الثالث فی بیع الفلوس واذا اشتری الرجل فلوسا بدراھم ونقد الثمن ولم یکن الفلوس عند البائع فالبیع جائز وکذا لو افترقا بعد قبض الفلوس قبل قبض الدراھم کذا فی المبسوط وروی الحسن عن ابی حنیفة رح اذا اشتری فلوسا بدراھم ولیس عند ھذا فلوس ولا عند الاٰخر دراھم ثم ان احدھما دفع وتفرقا جاز وان لم ینقد واحد منھما حتی تفرقا لم یجز کذا فی المحیط انتھی وعبارت درمختار این ست جلد ثالث باب الربوٰ باع فلوسا بمثلھا اوبدراھم اوبدنانیر فان نقد احدھما جاز انتھی اور اس مقام پر شامی میں کچھ تفصیل ہے وہ بھی ذرا بسط سے ارقام فرمائیے۔

الجواب، اصل میں اس مسئلہ میں قدرے تفصیل ہے جس کو باعتبار عادت غالبہ کے غیر ضروری سمجھکر مصرح نہیں لکھا؛ وہ تفصیل یہ ہے کہ کچھ پیسے ادھار رہ جانے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ اس شخص کی ملک میں پیسے موجود ہیں، مگر بالفعل اس کے پاس یعنی اس کے قبضہ میں نہیں، دوسرے یہ کہ خود ملک ہی میں نہیں حکم عدم جواز کا جو میں نے لکھا ہے، وہ دوسری صورت کا ہے، کیونکہ یہ بیع المعدوم ہے، جس میں صرف بیع سلم کی اجازت ہے، اور یہاں شرائط سلم متحقق نہیں، اور پہلی صورت میں چونکہ بیع المعدوم لازم نہیں آتی، لہذا وہ جائز ہے، یہ تفصیل ہوئی، باقی اس کی تصریح نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عوام کی عادت غالب یہی دوسری صورت ہے، اس لئے سدًّا للذرائع مطلقاً لکھدیا ہے، باقی روایات جو نقل فرمائی گئی ہیں ان کا حاصل صرف اتنا ہے کہ تقابض شرط نہیں، سو میں بھی اس کا قائل ہوں، چنانچہ صورت اولیٰ کو جائز کہتا ہوں، اور تقابض کے عدم اشتراط سے مبیع کے مملوک للبائع ہونے کا عدم اشتراط لازم نہیں آتا اور دوسری صورت میں یہی لازم آتا ہے، پس مدار نہی کا بیع المعدوم ہے نہ کہ اشتراط تقابض، واللہ اعلم، ۱۸ ربیع الثانی ۱۳۲۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۵۱)

صفائی معاملات

سوال (۴۸) صفائی معاملات ص ۱۷ سطر ۹ پر تحریر ہے۔ اسی طرح جس جگہ چاندی کو چاندی کے بدلے یا سونے کو سونے کے بدلے کم زیادہ کرکے بیچتا ہو مگر حیلہ جواز کے لئے کم جانب میں ایک پیسہ یا ایک پائی مثلاً ملالیں کہ جس کی قیمت اس قدر نہ ہو جس قدر دوسری طرف زیادہ مال ہے یہ بھی مکروہ ہے کذا فی الہدایہ اور بہشتی زیور میں کسی جگہ در باب بیان سود یہ تحریر ہے کم جانب پیسہ ملالیں یا دونوں شخص ایک ایک پیسہ ترازو کے پلڑے میں رکھدیں تو جائز ہوگا ان دونوں عبارتوں کا مطلب اور فرق کیا ہے۔

الجواب، اس میں تفصیل یہ ہے بدلین کی قیمت عرفاً اگر متقارب ہو اس وقت تو یہ حیلہ

جائز ہے اور اگر تفاوت بتفاوت فاحش ہو تو ناجائز ہے، ہدایہ میں۔ دوسری صورت ہے۔
کما یدل علیہ قولہ حیث قدر دوسری طرف زیادہ مال ہے اور بہشتی زیور میں پہلی صورت۔

۱۸ رجب ۱۳۲۹ھ (النور رمضان ۱۳۵۹ھ ص ۱۸)

پیسوں کا بدلہ روپے سے

سوال (۸۵) بقال نقد روپیہ لے کر پیسے ½ ۱۳ گنڈے دیتے ہیں اور ادھار ہو تو ¼ ۱۳ گنڈے دیا کرتے ہیں دوانی چوانی نہیں دیتے اس کا کیا حکم ہے

الجواب: پیسے مبیع اور روپیہ ثمن قرار دینے سے یہ صورت جائز ہے۔

۱۰ رمضان ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۳۶)

کمی زیادتی کے ساتھ نوٹ کی بیع میں ایک طرف پیسے ملا لینا کافی نہیں

سوال (۸۶) چاندی خریدنے میں جس طرح روپیہ کے ساتھ بخیال تبدیل جنس پیسہ ملا لیا کرتے ہیں، ایسے ہی اگر نوٹ یا کوٹھی کے روپیہ جمع شدہ کی بیع میں کریں، نیز ریزگاری خریدنے میں جو صراف کے یہاں رہ جاوے، اسے پیسہ تصور کریں تو کیا قباحت ہے، فقط

الجواب: یہ حیلہ تو بیع یدا بید میں ہو سکتا ہے کہ اس میں مماثلت شرط نہیں، اور نوٹ اور کوٹھی کے جمع شدہ روپیہ کی بیع درحقیقت حوالہ ہے، کہ قرض میں داخل ہے جس کا حکم مماثلت ہے اور اس حیلہ میں وہ فائت ہے، لہذا درست نہیں، یہ جب ہے کہ کمی بیشی پر معاملہ کیا جاوے ورنہ علی السوار مضائقہ نہیں کہ عدم مماثلت عقد میں شرط نہیں ٹھہرائی اور ادا کے وقت استبدال جائز ہی ہے، اور ریزگاری کے معاملہ میں اگر بقیہ کو پیسہ تصور کیا جاوے تاہم معدوم ہے لہذا قیاس مع الفارق ہے (تتمہ اولیٰ ص ۵۵)

مبادلہ روپیہ بریزگاری وقت تفاوت وزن

سوال (۸۷) روپے کی ریزگاری مثلاً ایک اٹھنی اور ایک چونی اور ایک دونی لینا جائز ہے یا نہیں، جب کہ روپے کے مقابلہ میں ان سب ریزگاری کا وزن برابر نہ ہو؟

الجواب، چونکہ اصل وضع میں ریزگاری اسی انداز سے بنائی جاتی ہے کہ ایک روپے کے برابر ہو اور تفاوت کسی عارض فرسودگی وغیرہ سے بہت شاذ و نادر ہوتا ہے جو یقینی نہیں پھر وہ بھی اس قدر قلیل کہ اس کی کوئی معتد بہ قیمت نہیں۔ اس لئے بقاعدۂ الیقین لایزول بالشک والنادر کالمعدوم وجزئیہ درمختار وذرۃ من ذھب وفضۃ مما لا یدخل تحت الوزن بمثلیھا فجاز الفضل لفقد القدر ۱۲ مصریہ ج ۴ ص ۲۰۰، اس تفاوت کا اعتبار نہیں اور اگر کسی مقام پر زیادت یقینی ہو تو زیادہ کو زبان سے معاف کرالے فی الرد المختار عن الخلاصۃ لو باع درھما بدرھم واحدھما اکثر وزنا فحللہ زیادتہ جاز الخ ج ۴ ص ۲۲۵　　۱۹ محرم ۱۳۳۲ھ　　(حوادث اول ص ۱۲۷)

حکم کمی بیشی در نوٹ و ہنڈی یا در مبادلہ اشرفی

سوال (۸۸) کیا ارشاد فرماتے ہیں علماء دین و حامیان شرع متین اس باب میں کہ زید نے عمرو کے ہاتھ ہزار روپے کے نوٹ گیارہ سو روپے کے بدلے فروخت کئے، اور عمرو مشتری نے زید بائع سے کہدیا کہ ان نوٹوں کا زرِ ثمن یعنی گیارہ سو روپے چھ ماہ کے بعد ادا کروں گا تو ارشاد فرمایئے کہ یہ بیع جائز ہے یا نہیں، اور زید کے لئے سو روپے زائد سود ہونگے یا نہیں اور یہ بیع باطل ہے یا فاسد، یا جائز، ایک صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ جنس بدل گئی اس لئے یہ معاملہ جائز ہے، اور زید کو عمرو سے گیارہ سو روپے چھ ماہ کے بعد لینا جائز ہے؟ عنایت فرماکر مفصل بحوالۂ کتب جواب باصواب تحریر فرمایئے، فقط بینوا، توجروا،

(۲) اگر سو روپے کے کوئی شخص نوٹ یا گنی کسی کے ہاتھ سو سے کم یا زیادہ کو بدلے یا فروخت کرے تو کیسا ہے، بینوا توجروا،

الجواب، معاملہ نوٹ حوالہ ہے بیع نہیں، اس لئے یہ دونوں صورتیں حرام اور سود ہیں، کمی بیشی جائز نہیں، اور یہ بہت ہی ظاہر ہے (حوادث اول ص ۸)

سوال (۸۹) ایک شخص مسلمان مالدار ہے، جب کوئی شخص اس سے مثلاً نقدی قرض ایک سو ساٹھ روپے لینے کے واسطے آتا ہے تو وہ اس طریق سے قرض دیتا ہے کہ ایک کپڑا جس کی قیمت دس روپے ہے، پچاس روپے اور بڑھاکر گویا ساٹھ روپے میں خریدار کو دیتا ہے، حالانکہ مشتری بھی اس بات کو جانتا ہے کہ یہ چیز دس روپے کی ہے، اس کے ساتھ ہی ایک سو روپیہ اور دیتا ہے۔ پھر بوعدہ مقررہ یہ جملہ ایک سو ساٹھ روپے لیا جاتا ہے، شخص مذکور کو کپڑے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی، مگر وہ مجبوراً طریقہ مذکورہ بالا کو اپنی حاجت روائی کے لئے منظور و قبول کرلیتا ہے۔ اور دوسری صورت قرض مسطورۂ شرح صدر یہ ہے کہ ایک سو روپے کا نوٹ ایک سو ساٹھ روپے میں دیا جاتا ہے، ان دونوں صورتوں میں یہ مزید روپیہ لینا درست ہے یا نہیں؟

الجواب، قصد و نیت تو بالکل سود لینے کی ہے، اس لئے باطناً بھی حرام ہے اور قرض مشروط بقبول المبیع بھی اس لئے ظاہراً بھی حرام ہے، غرض کسی طرح یہ معاملہ حلال نہیں اور نوٹ کا معاملہ مذکورہ فی السوال کا حرام ہونا تو اس سے زیادہ صریح ہے، فقط

۲ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۸)

مدیون کا مال قرض کے طور پر رعایت سے خریدنا۔

سوال (۹۰) زید کا روپیہ اصل عمرو کے ذمہ باقی ہے اور مدت مہلت گذرچکی، زید نے کہا کہ اگر تمہارے پاس روپیہ نہیں ہے تو مال تمہارے

پاس بہت موجود ہے، ہمارے پاس روپیہ نہیں ہے تم قرض اپنا مال ہم کو دیدو مگر مال ہم خود دیکھ کر لیں گے اور جو ہم نے دیا تھا وہ مال نہ لیں گے، اس وقت جو مال تمہارے پاس موجود ہے اس میں سے چھانٹ کر لیں گے، اور نہ تمہاری خرید پر لیں گے بلکہ جیسا بچے گا وہ لیں گے، عمرو نے کہا اچھا لیلو زید نے عمرو سے مال خریدا اور کہا کہ قرض ہمارے ذمہ ہے، ہم دو چار روز میں اس مال کا روپیہ دیدیں گے، عمرو نے کہا کہ اچھا پھر زید نے کہا کہ اب ہمارے اس مال کو اگر تم منافع سے خریدتے ہو تو خرید لو، عمرو نے کہا کہ میں ... کے منافع سے خریدتا ہوں مگر روپیہ ایک ماہ میں دوں گا، زید نے کہا اچھا لے لو، زید نے اپنے قبضہ سے عمرو کے قبضہ میں دیدیا شمار کرا دیا۔

الجواب، یہ حرام ہے کہ ادھار کی یہ رعایت (جیسے کہ زید کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے، اگر تمہارے پاس روپیہ نہیں ہے تو مال تمہارے پاس بہت موجود ہے ہمارے پاس روپیہ نہیں ہے تم قرض اپنا مال ہم کو دیدو) بوجہ عمرو کے مدیون ہونے کے ہے البتہ یہ جائز ہے کہ زید کا جتنا روپیہ عمرو کے ذمہ رہ گیا ہے اس کے عوض میں مال اس طرح خرید کرے کہ وہ روپیہ مجرا ہو جاوے پھر عمرو کو اختیار ہے خواہ اس مال کو خریدے یا نہ خریدے، ۲۰ محرم ۱۳۳۶ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۳)

نوٹ کی بیع کی صورتیں

سوال (۹۱) نوٹ کی بیع تین طرح سے کی جاتی ہے، پہلا طریقہ دس کا نوٹ دس کو، دوسرا طریقہ دس کا نوٹ پونے دس کو، نو روپے تین چونیاں، تیسرا طریقہ دس کا نوٹ پونے دس کو، نو روپے بارہ آنے کے پیسے اس میں کون سی صورت جائز ہے؟

الجواب، اول جائز، ثانی اور ثالث ناجائز، (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۹)

نوٹ کا سکہ ہونا

سوال - (۹۲) نوٹ کاغذی سکہ ہے، مثل اور سکوں کے ہے یا نہیں؟

الجواب، نہیں، ۱۱ رجب المرجب ۱۳۲۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۵)

حکم کمی بیشی در نوٹ و ہنڈی یا در مبادلۂ اشرفی،

تتمہ سوال (۹۳) وعلیٰ ہذا ان دونوں کو دے کر ان کی قیمت دو چار روز کے بعد لینا؟

الجواب، یہ درست ہے۔ (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۹)

سوال (۹۴) والد صاحب قبلہ نے ایک عرصہ سے منی آرڈر بھیجنا چھوڑ دیا ہے بجائے اس کے نوٹ بھیجتے ہیں، نوٹ جہاں جاتے ہیں وہ اس کو فی سیکڑا کچھ آنوں کی کمی سے لیتے ہیں یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب - نوٹ کمی سے لینا دینا دونوں ناجائز ہیں۔ مگر میرے نزدیک اس کمی کو بدل میں

حرمت و خباثت پیدا نہیں ہوتی، اس کی وجہ محتاج تطویل ہے ورنہ لکھ دیتا (امداد ثالث ص ۱۳)

سوال (۹۵) بندہ کے یہاں نمک کی تجارت ہوتی ہے، اور تین جگہ کارخانہ ہے، ایک آڑتی بہت معتبر مل گیا ہے، اس نے روپے بھیجنے کی سبیل یہ رکھی ہے کہ جب مال فروخت ہو جاوے تو نوٹ بھیج دیتا ہے، ایک بار میرے ذمہ اس کے روپے چاہتے تھے بوجوہ دیر میں پہونچنے روپے کے اس نے سود لگایا تو بندہ نے اس کو سود نہیں دیا اور یہ لکھا کہ ہمارے مذہب میں سود لینا اور دینا دونوں ناجائز ہیں اس لئے ہم معاملہ سود کا ہرگز نہیں کر سکتے، اس نے لکھا کہ ہم سود نہیں لیں گے، اور یہ بھی معاملہ طے ہو گیا کہ سود کا لین دین کبھی نہ ہوگا، البتہ جب نوٹ بھیجتا ہے تو کمی کے ساتھ بھیجتا ہے، مثلاً فی سیکڑہ دو آنے یا تین آنہ کاٹتا ہے، ان کے یہاں کٹ کی شرح مختلف اوقات میں مختلف طور سے معین ہوتی ہے، اور کچھ حصہ ہمارے روپے میں سے گوسالہ کے نام کا بھی کاٹتا ہے، اور یہ ہماری ہی تخصیص نہیں، بلکہ ان کے یہاں کا قاعدہ ہر ایک سے یہی ہے، سو بندہ یہ دریافت کرتا ہے کہ یہ امر دونوں جائز نہیں معلوم ہوتے، اس کے بارہ میں کیا کیا جاوے۔ ..... اگر اس سے یہ کہا جاوے کہ یہ معاملہ ہم نہیں کریں گے تو وہ ہرگز نہ مانے گا، کیونکہ نوٹ میں کمی ان کے یہاں سود میں شمار نہیں، اور گوسالہ کی نسبت بھی نہیں مان سکتا کیونکہ صرف ہمارے لئے قانون جدید نہیں معین کرے گا، تو اب کیا حیلہ کیا جاوے جس سے معاملہ شریعت کے موافق رہے، اور یہ بھی تحریر فرمائیے کہ اگر وہ یہ معاملہ رکھے تو مجھ پر مواخذہ اخروی رہے گا یا نہیں اور نوٹ میں کمی زیادتی صرف مسلمانوں کے درمیان ناجائز ہے، یا جب ایک جانب مسلم ہو اور دوسری جانب کافر تو بھی جائز ہے یا نہیں؟ جملہ امور کو مفصلاً تحریر فرما دیجئے۔

الجواب۔ نوٹ کی حقیقت حوالہ ہے، اور حوالہ میں کمی بیشی جب معروف یا مشروط ہو ربوا ہے البتہ اگر بلا شرط و عرف ہو تو بعض صورتوں میں تاویل صحیح کی ہو سکتی ہے، مگر اب ممکن نہیں، میری سمجھ میں تو اس کی تدبیر بجز اس کے کہ نقد روپیہ اس سے لیا جاوے اور کچھ نہیں آتی، یا اس پر یہ بات ثابت کر دی جاوے کہ ہمارے مذہب میں یہ سود ہے یا اس کی کچھ آڑھت بڑھا کر حق ٹھہرا دیا جاوے اور یہ کہہ دیا جاوے کہ نوٹ برابر سرابر لیا جاوے گا؛ اور تمہاری کمی اس اضافہ سے پوری کر دی جاوے گی۔ اور یہ تدبیر غالباً سہل ہے، رہا گوسالہ کا قصہ سو اگر وہ آڑھتی آپ کا مشتری ہوتا اور آپ اس کے بائع ہوتے تب تو بتاویل حط ثمن کے یہ جائز ہو سکتا تھا گویا اپنا روپیہ وہاں دیتا ہے، اور آپ کو ثمن کم دیتا ہے، لیکن آڑھتی وکیل ہوتا ہے وہاں یہ تاویل ممکن نہیں، اس لئے میرے نزدیک اسے یوں سمجھا دیا جاوے کہ حق آڑھت اور حصہ گوسالہ یہ سب مجموعہ حق آڑھت میں شمار کرنا چاہئے، پھر خواہ

دونوں میں کسی طرح لکھے کچھ حرج نہیں، فقط واللہ اعلم۔ (امداد ثالث ص ۱۳۱) حوادث اول ۲ ص ۸۲

سوال (۹۶) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک جگہ پر مسجد کا روپیہ جمع ہے، انجمن کا خیال ہے کہ کوئی حیلہ ایسا قائم ہو جس سے اس روپے کی ترقی ہو، اور انجمن کو نفع ہو لیکن سود تو اس روپے کا لے نہیں سکتے وہ تو بالکل حرام ہے لیکن عمرو کہتا ہے کہ صورت مستفسرہ میں نوٹ کا لین دین بحیثیت بیع وشراء ہے تو چونکہ نوٹ اور روپیہ دونوں ایک جنس سے نہیں، اس لئے اگر ہزار روپے کا نوٹ گیارہ سو روپے یا کم وبیش نقد میں یا ہزار روپیہ نقد گیارہ سو یا کم وبیش کے نوٹ میں ایک مدت معین کے وعدہ پر ادھار خریدا یا بیچا جاوے تو اس کا خریدنا جائز اور اس کا نفع حلال ہے فتح القدیر میں ہے، ولو باع کاغذۃ بالف یجوز ولا یکرہ: انتہیٰ زید کہتا ہے اوپر کے مسئلہ کی صورت بیاج کی ہے، اس لئے حرام ہے، اس مسئلہ کی سخت ضرورت ہے، بہت جلد جواب دیں، مع ثبوت حدیث وفقہ کے مولانا .... صاحب ومولانا .... صاحب جائز کہتے ہیں، قاضی صاحب مفتی بھوپال حرام کہتے ہیں، اس لئے حضور سے دریافت کی ضرورت ہوئی۔

جواب مفتی صاحب بھوپال کا قول حق ہے اور فتح القدیر کی عبارت سے استدلال باطل ہے وہاں کاغذ مبیع ہے، اور نوٹ مبیع نہیں ہے، سند حوالہ ہے، ۲۲ جمادی الثانیہ ۱۳۲۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۵)

حکم خریدن نوٹ وساورن[1]

سوال (۹۷) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں معروضہ ذیل میں وھو ہذا، زید کو ضرورت نوٹ اور ساورن سکہ رائجہ کی ہے، نوٹ سو روپے کا ننانوے روپے بارہ آنے کو اور ساورن پندرہ روپے کی سولہ روپے چار آنہ کو ملتی ہیں، نوٹ کی خرید سے فیصدی چار آنے کا نفع اور ساورن کی خرید پر فی ساورن ایک روپیہ چار آنہ کا نقصان ہے۔ یہ بیع وشراء جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

جواب۔ نوٹ کا یہ معاملہ ناجائز ہے اور ساورن کا جائز ہے بشرطیکہ قیمت ساورن کی دست بدست فوراً مل جاوے، (تتمہ خامسہ ص ۵۷)

سوال (۹۸) عرض یہ ہے کہ آجکل نقد روپیہ نہیں ملتا ہے، ہر جگہ نوٹ کا چلن ہو گیا ہے ہم لوگوں کو اکثر گوٹہ کناری خریدنا ہوتا ہے، جس کے عوض بجز نوٹ کے اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی ہے نہ اس شخص کے پاس روپیہ ہوتا ہے کہ اس سے لیکر خرید کر لیں۔ اور نہ روپے کی عوض میں اس کو نوٹ دیدیا جیسا کہ آپ نے کسی کتاب میں لکھا ہے۔ اس لئے دریافت طلب یہ امر ہے کہ اس کے سوا اور کیا صورت کی جاوے، جس سے یہ معاملہ عند الشرع صحیح ہو جاوے،

الجواب، یا تو تھوڑی دیر کے لئے کسی اور سے نقد روپیہ لے لیا جاوے، اور یا اگر یہ بھی نہ ہو سکے

[1] ساورن، گنّی، پونڈ انگریزی لفظ ہے ۱۲ اسید

توکسی ایسی چیز کے عوض میں دست بدست گوٹہ کناری خرید اجاوے جس کی قیمت اتنے روپیوں کی ہو مثلاً کسی کپڑے کے عوض میں، پھر اس کپڑے کو بعوض نوٹ کے خرید لیا جاوے، اگر دوسرے عاقد کو پہلے سے سمجھا دیا جاوے تو وہ اس طرح کرنے پر راضی ہو جاوے گا، سنہ ۱۳۳۶ھ (حوادث خامسہ ص ۳۴)

حقیقت مبادلہ نوٹ بروپیہ

سوال (۹۹) امر دریافت طلب یہ ہے کہ "الامداد" بابت ماہ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۳۵ھ کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ نوٹ نہ حقیقۃً نقد ہے نہ حکماً بلکہ سند نقد ہے، اگر ایسا ہی تو شبہ ہوتا ہے کہ نوٹ کی بیع بالعوض روپے کے جائز نہ ہو، اس لئے کہ بیع صرف میں لین دین دست بدست شرط ہے، اور یہاں ایک جانب سے حوالہ ہے، جواز کی کیا صورت ہے؟

جواب، مبادلہ مقصود نہیں، جس میں یداً بید شرط ہے، بلکہ ایک شخص سے قرض لیتا ہے اور اس کو خزانہ پر حوالہ کرکے نوٹ دیتا ہے، قرض میں یداً بید شرط نہیں، ۲۵ رجب ۱۳۳۶ھ (حوادث تتمہ ثالثہ ص ۳)

بٹہ برنوٹ

سوال (۱۰۰)، نوٹ خواہ ہنڈوی کا کلیتا درست ہے یا نہیں یعنی نوٹ کبھی کچھ زیادہ کو بکتا ہے اور کبھی کچھ کم کو جیسے سو روپیہ کا نوٹ ہے تو کبھی ننانوے روپے آٹھ آنے کو بکتا ہے اور کبھی سو روپے چار آنہ کو علیٰ ہذا القیاس ہنڈوی میں بھی کمی یا زیادتی ہوتی رہتی ہے پس آیا زیادتی وکمی داخل ربوا ہے یا نہیں اور نوٹ و روپیہ کو ایک جنس سے سمجھا جاوے گا یا دو جنس علیٰ ہذا ہنڈوی

الجواب، نوٹ کے ہم جنس یا غیر جنس ہونے کی تحقیق اس وقت مفید ہے جب وہ خود مبیع ہو نوٹ کا لین دین بیع نہیں بلکہ حوالہ ہے اور ظاہر ہے محتال بہ میں کمی بیشی ربوا ہے لہذا یہ بٹہ حرام ہے، ۹ شوال ۱۳۳۲ھ۔ (حوادث ا و ۲ ص ۱۰۴)

عدم شراء سیم بعوض نوٹ

سوال (۱۰۱) اگر پانچ روپیہ کی چاندی مجھ کو خریدنا منظور ہے، اور میں نے بجائے پانچ روپے کے پانچ روپے کا نوٹ دیا، اور یوں کہا کہ اس نوٹ کی جو پانچ روپے کا ہے مجھ کو چاندی دیدو۔ اور اس نے نوٹ لے کر وزن میں ساڑھے سات روپے بھر چاندی مجھ کو دی، یہ سود تو نہ ہوگا،

الجواب۔ نوٹ سے چاندی خریدنا درست نہیں، اول اس نوٹ کو کسی سے بھنالے، پھر روپے سے چاندی خریدے اور ربوا سے بچنے کی وہی مشہور تدبیر کرے کہ کم چاندی کی طرف پیسے ملالے،

۱۹ محرم ۱۳۳۲ھ (حوادث ا، ۲ ص ۱۲۶)

عدم جواز فروخت گنی بعوض نوٹ وتدبیر جواز

سوال (۱۰۲) ایک مسئلہ درپیش ہے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً بمبئی میں ایک گنی رائج ہے پندرہ روپے کی، اور اس گنی کا نرخ دہلی میں مثلاً سترہ روپے

ہے اور کلکتہ میں چودہ روپے، اور ایک نوٹ ہے پندرہ روپے کا جو کہ سب جگہ ایک ہی طرح پر چلتا ہے، اب ایک شخص نے کلکتہ میں ایک گنی چودہ روپے میں خریدی اور دہلی میں اسکو بعوض سترہ روپے نوٹ کے بیچ ڈالا، یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، قاعدہ سے تو جائز نہیں معلوم ہوتا، البتہ نوٹ والا اپنے نوٹ سترہ روپے کے بیچ کر خواہ اسی گنی والے ہی کے ہاتھ بیچ ڈالے پھر ان روپیوں سے گنی دست بدست لے لے یہ درست ہے،

۳ر صفر ۱۳۳۶ھ (حوادث خامسہ ص ۳۲)

سونے چاندی کے تاروں سے بنے ہوئے کپڑوں اور گوٹے کی بیع میں ادھار نا جائز ہے،

سوال (۳۔۱۰) مولوی محمد احسن صاحب مرحوم نے رسالہ تافعہ خریداران، بیان بیع صرف میں بنارسی کپڑے جن میں سچے کلابتوں لگے ہیں ان کو سیف محلی پر قیاس کر کے بیع نسیہ کا ناجواز تحریر فرمایا ہے اور میں جو غور کرتا ہوں تو ناجواز سمجھ میں نہیں آتا، لہذا جناب سے استفاضۃً دریافت کرتا ہوں، دینی معاملہ متعلق بحلال و حرام ہے بہت جلد ایک نظر غائر ڈال کر میری فہم کی تصحیح و تغلیط فرماویں، علامہ شامی نے ذیل قول درمختار والاصل انہ متی بیع نقد مع غیرہ کمفضض ومزرکش بنقد من جنسہ شرط زیادۃ الثمن فلو مثلہ او اقل او جھل بطل ولو بغیر جنسہ شرط التقابض فقط، تنبیہ کر کے ایک مبسوط عبارت بذکر حکم اعلام الثوب تحریر کی ہے، اس کو پورے طور پر آپ ملاحظہ فرماویں، اس میں کی عبارت مندرجہ ذیل سے مجھے جواز بیع نسیہ پارچہائے بنارسی مثل کمخواب، ساڑی، دوپٹہ سوت وغیرہ جن میں سچے کلابتو لگتے ہیں سمجھ میں آیا ہے:

(۱) بخلاف علم الثوب والابریسم فی الذھب فانہ لا یعتبر لانہ تبع محض اھ:

(۲) وحاصل ھذا انہ اعتبار المنسوج قولا واحدا واختلاف الروایۃ فی ذھب السقف والعلم وان المعتمد عدم اعتبارہ فی المنسوج اھ،

(۳) ولکن لذلک علم الثوب لان الشرع اھدر اعتبارہ حتی حل استعمالہ

جلد ۴ ص ۲۶۰

یہ تینوں عبارتیں شامی میں ذیل تنبیہ ہیں، آیا ان عبارات سے جواز بیع نسیہ ثابت ہوتا ہے یا نہیں امید کہ بہت جلد مفصل جواب سے مطمئن فرماویں۔

الجواب، معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے قولاً واحداً کے معنے یہ سمجھے کہ یہ اقوال مختلفہ میں سے ایک قول ہے اور ان المعتمد کو اس کا قول مقابل سمجھے، اگر یہ مطلب ہوتا تو

جواز کا سمجھنا ٹھیک تھا، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے، بلکہ قولاً واحداً کے یہ معنی ہیں کہ ان میں بس ایک ہی قول ہے، کسی کا اس میں اختلاف نہیں، اس لئے اس کے متصل ہی اس کا مقابل اختلاف الروایۃ الخ آیا، مطلب یہ ہے کہ اس میں تو ایک ہی قول ہے، اور ذہب سقف وعلم میں اختلاف ہے، چنانچہ اس سے اوپر کی عبارت میں ان دونوں کا مختلف فیہ ہونا بھی نقل کیا گیا ہے، فی قولہ ان فی اعتبار الذہب فی السقف روایتین فلا یعتبر العلم فی الثوب وعن ابی حنیفۃ وابی یوسف انہ یعتبر اھ، اور اگر وہ مطلب ہوتا جو مبنیٰ ہے سوال کا تو قطع نظر اس سے کہ قولاً واحداً اس معنی میں مستعمل نہیں دیکھا گیا اس پر یہ اشکال واقع ہوگا کہ اوپر کی عبارت میں یہ مضمون کہیں بھی نہیں گذرا کہ ان المعتمد عدم اعتبارہ فی المنسوج، پھر اس کو حاصل کے ذیل میں بیان کرنا کہاں صحیح ہوگا، دوسرے اس صورت میں حق عبارت کا یہ تھا ان المعتمد عدم اعتبار المنسوج، تاکہ مقابل ہوتا اوپر کی عبارات اعتبار المنسوج کا، تیسرے اس صورت میں عدم اعتبارہ کی ضمیر مجرور کا مرجع کون ہوگا اور جواس کا واقعی مطلب ہے اس پر یہ ضمیر راجع ہے علم کی طرف، یعنی منسوج میں علم کا اعتبار نہ ہونا معتمد ہے اور اس طرح علم کا غیر معتبر ہونا اوپر مذکور ہو چکا ہے، جو کہ منسوج کے علم کو بھی شامل ہے، پس منسوج کا حکم عدم جواز ہی رہا،

۲۲ ربیع الآخر ۱۳۳۳ھ (حوادث ثالث ص ۱۳۴)

سوال (۱۰۴) میری سچے گوٹے کی دُکان ہے، جس میں بعض میں چاندی زائد ہوتی ہے اور بعض میں ریشم زائد ہوتا ہے، تحقیق طلب یہ گذارش ہے کہ اس کو قرض اور تفاضلاً بیچنا اور خریدنا جائز ہے یا نہیں، یہاں کے بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس کو قرض وغیرہ بیچنا ناجائز ہے، اس کا حکم مطلقاً چاندی کے مثل ہے، اور ریشم تو علٰحدہ رہتا ہے، اس میں ملتا نہیں ہے، اور بعض فرماتے ہیں کہ گوٹہ کی بیع قرض اور کم وبیش اس لئے جائز ہے کہ اس کی تکمیل ریشم سے ہوتی ہے، اور اس کو قرض اور نقد ہر طرح بیچنا جائز ہے، اب تردد ہے کہ کس پر عمل کروں حضور اقدس کے ارشادِ گرامی کا منتظر ہوں اور اس پر آمادہ ہوں کہ اگر فی الحقیقت اس کو قرض خریدنا وغیرہ جائز نہیں تو گوٹہ کی دُکان چھوڑ کر کوئی اور کام شروع کر دوں گا؟

الجواب، فی الدر المختار الاصل انہ متی بیع نقد مع غیرہ کمفضض ومزرکش بنقد

من جنسہ شرط زیادۃ الثمن فلو مثلہ او اقل او جھل بطل ولو بغیر جنسہ شرط التقابض فقط فی رد المحتار عن التاتارخانیۃ بخلاف علم الثوب والابریسم فی الذھب فانہ لا یعتبر (ای لا یعتبر العلم فی الاول فیجوز ولا یعتبر الابریسم فی الثانی فلا یجوز ۱۲) لانہ تبع محض اھ وفیہ ایضاً حاصل ھذا کلہ اعتبار المنسوج قولاً واحداً الی قولہ ومثلہ المنسوج بالذھب فانہ قائم بعینہ غیر تابع بل ھو مقصود بالبیع الخ (باب الصرف) یہ روایات صریح ہیں عدم جواز میں، اور تصریح فقہاء کے مقابلہ میں ہمارا قیاس معتبر نہیں، لیکن اگر کم وبیش یا نسیۃً معاملہ کرنے کا موقع پیش آجاوے تو اس کا ایک حیلہ ہوسکتا ہے، کم وبیش میں تو دونوں طرف دو دو پیسے مثلاً ملا لئے جاویں، اور نسیہ کی صورت میں اپنے پاس سے خریدار کو روپیہ قرض دے کر قیمت میں لے لیا، پھر وہ قرض اس کے ذمہ رہا، ۱۹ رمضان المبارک ۱۳۴۹ھ

(النور جمادی الثانیہ ۱۳۵۰ھ ص ۵)

جس عمامہ میں تھوڑا سا کلابتون شامل ہو اس کی بیع ہی ادھار نا جائز ہے۔

سوال (۱۰۵) ہمارے یہاں شہر میں پگڑیاں بُنی جاتی ہیں، ان میں کلابتون بنا جاتا ہے دونوں پلوں پر ماشہ، دو ماشہ، ۶ ماشہ تک بلکہ تولہ بھر تک، دہلی وغیرہ کے خریدار آتے ہیں، پگڑیاں عموماً ادھار لے جاتے ہیں، یعنی ساتھ روپیہ نہیں لاتے، گھر سے جا کر ادا کرتے ہیں، پگڑی میں کلابتون نسبتاً اصل پگڑی سے کم وبیش کم قیمت کا ہوتا ہے، مثلاً دو روپے کی پگڑی ہوئی تو اس میں کلابتون ایک آنے سے لیکر ۱۰/۔ ٹک کا ہوتا ہے، بڑی دقت یہ ہے کہ خریدار اتنا بھی پیشگی نہیں لاتے اور نہیں دیتے کہ کلابتون کی قیمت کی مقدار نقد وصول ہوجایا کرے، خریدار ہندو مسلمان دونوں ہوتے ہیں، ہندو بکثرت مسلمان بالکل کم، تجارت پیشہ مسلمان سخت ابتلا میں ہیں، جس سے بعض مخلص بندگان خدا حیران وششدر رہیں، کہ کیا کریں، لہذا عرض ہے کہ کیا کوئی شرعی مخلص ہے کہ اس بُنے ہوئے کلابتون کی بیع تبعاً پگڑیوں کے ساتھ ادھار بیچنا جائز ہو، جناب کی مستنبط رائے ہو تو مستدل اور فقہی روایت ہو تو اصل عبارت یا حوالہ کتاب مع صفحہ وباب بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

الجواب، فی الدر المختار باب الصرف والاصل انہ متی بیع نقد مع

غیرہ کمفضض ومزرکش بنقد من جنسہ شرط زیادۃ الثمن فلو مثلہ او اقل او جھل بطل ولو بغیر جنسہ شرط التقابض فقط، فی رد المختار تحت قولہ کمفضض ومزرکش عن التاتارخانیہ بخلاف علم الثوب والابریشم فی الذھب فانہ لا یعتبر لانہ تبع محض اھ دقیقہ بعد اسطر ومثلہ المنسوج بالذھب (ای الخالص بلا ابریشم) فانہ قائم بعینہ غیر تابع بل ھو مقصود بالبیع کالحلیۃ والطوق وبہ صار الثوب ثوبا ولذا یسمی ثوب ذھب بخلاف المسؤل انہ مجود لون لاعین قائمۃ وبخلاف العلم فی الثوب فانہ تبع محض فان الثوب لا یسمی بہ ثوب ذھب الخ ج ۴ ص ۳۶ ، مطبوعہ مصر ۱۲۹۷ھ ،

ان روایات سے معلوم ہوا کہ صورت مسئولہ میں ادھار بیچنا جائز ہے ،

۲۳ ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ (تتمہ خامسہ ص ۱۸۸)

گوٹہ کو نوٹ کے عوض میں بیع کرنے کی تدبیر

سوال (۱۰۶) عرض یہ ہے کہ آجکل نقد روپیہ نہیں ملتا ہے، ہر جگہ نوٹ کا چلن ہو گیا ہے، ہم لوگوں کو اکثر گوٹہ کناری خرید نا ہوتا ہے جس کے عوض بجز نوٹ کے اور کوئی صورت نہیں ہوسکتی ہے، نہ اس شخص کے پاس روپیہ ہوتا ہے کہ اس سے لیکر خرید کرلیں، اور یہ روپے کے عوض میں اس کو نوٹ دیدیں، جیسا کہ آپ نے کسی کتاب میں لکھا ہے، اس لئے دریافت طلب یہ امر ہے کہ اس کے سوا اور کیا صورت کی جاوے جس سے یہ معاملہ عند الشرع صحیح ہو جاوے ؟

الجواب، یا تو تھوڑی دیر کے لئے کسی اور سے نقد روپیہ لے لیا جاوے، اور یا اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کسی ایسی چیز کے عوض میں بدست گوٹہ کناری خریدا جاوے جس کی قیمت اتنے روپیوں کی ہو، مثلاً کسی کپڑے کے عوض میں. پھر اس کپڑے کو بعوض نوٹ کے خرید لیا جاوے۔ اگر دوسرے عاقد کو پہلے سے سمجھا دیا جاوے تو وہ اس طرح کرنے پر راضی ہو جاوے گا، شوال ۱۳۳۰ھ (حوادث خامسہ ص ۴۴)

سنار کو زیور بنانے کے لئے روپیہ دیدینا

سوال (۱۰۷) احقر نے ایک شخص کو سونے کی بالیاں پرانی بغرض فروخت دی تھیں اور ذکر تھا کہ اتنے بر تو بنیں گی، انہوں نے ان کو ۵۰ روپے کو فروخت کر کے سنار کو روپیہ دیدیا، اور کہدیا کہ اس میں تھوڑا

سونا اور ڈال کر ۱؎ تولہ کی نئی بالیاں بنادے حساب بعد میں کر دیا جاوے گا، چنانچہ اس نے اتنے ہی وزن کی بنادیں یہ صورت ناجائز ہوتی ہے۔ ایک صاحب یہ تاویل کرتے ہیں کہ ؎ جو پیشگی دئے گئے ہیں وہ سنار کے پاس امانت یا قرض سمجھے جائیں، اور زیور دست بدست ؎ کو خرید اجائے، اس میں نسیہ نہ ہوگا۔ اب چونکہ ؎ بذمہ سنار واجب الادا ہیں اس لئے وہ مقدار ساقط کر کے ؎ اور اس کو دیدو، یا یوں کرو کہ ؎ روپے نقد دے کر دست بدست اس سے زیور لے لو، پھر اپنے ؎ کا مطالبہ اس سے کرو اور ایک صاحب یہ تاویل کرتے ہیں کہ سنار تمہاری طرف سے ؎ روپیہ کا سونا خریدنے کے لئے وکیل ہے، ؎ تم سے پیشگی لے چکا ہے، اور دس کا سونا اپنے پاس سے خرید لایا ہے، اس کا مطالبہ اب کرتا ہے، حضور اس میں کیا فتویٰ دیتے ہیں؟

الجواب، تاویل ثالث تو چل نہیں سکتی، کیونکہ وکالت بلا توکیل کیسے ہوگی، اور توکیل یہاں ہے نہیں، لہٰذا یہ بالیاں جدید سنار کی ملک ہوں گی، اور اب ان کی بیع جدید ہوگی، پس اگر وہ ؎ بعینہٖ سنار کے پاس موجود ہیں تو قرض کی تاویل نہیں ہو سکتی کیونکہ نہ تصریحاً قرض دیا نہ تصرف کی وجہ سے اس کے ذمہ دین ہوا پس لا بد امانت ہوگی اور امانت میں روپیہ معین ہوتا ہے، تو عقد متعلق اس روپیہ سے ہوگا، اور وہ مجلس بیع موجود نہیں تو نسیہ لازم آنے سے ناجائز ہوگا، پس جب نہ قرض ہوا نہ امانت سے عقد کا متعلق ہونا جائز ہوا، اس صورت میں صرف یہ صورت جائز ہو سکے گی کہ اپنی امانت اول وصول کرے اور اس میں دس روپے اور ملادے اور صورت بدست خرید لے، اور اگر وہ ؎ اس کے ضمان میں داخل ہو گیا ہے، خواہ بوجہ صرف کر ڈالنے کے یا بوجہ مخلوط کر دینے کے، تو البتہ وہ دین ہو گیا ہے، اس صورت میں تاویل اول چل سکتی ہے، اور تاویل ثانی بے تکلف صحیح ہے، فقط واللہ اعلم　　(امداد ثالث ص ۳۲)

سنار کو قیمت چاندی کی دینا

سوال (۱۰۸) اگر کسی ہندو سنار کو دس روپے نقد اور آٹھ آنہ کے پیسے دے کر کہا کہ اس کی جس قدر چاندی آوے لاکر فلاں قسم کا زیور بنادینا، اور اس زیور کی مزدوری بعد تیاری بارہ آنے دیدیں گے اس معاملہ میں کوئی گناہ تو لازم نہیں آوے گا؟

الجواب، اگر دو امر کا یقینی اطمینان ہو تو جائز ہے، ایک یہ کہ سنار چاندی اپنے پاس سے نہ لگادیگا، دوسرے یہ کہ انہیں داموں سے خریدیگا بدلے گا نہیں، مگر چونکہ اس کا

اطمینان مشکل ہے، اس لئے بہتر ہے کہ ان دس روپے اور پیسوں کی چاندی خود خرید کر خواہ اس سنار سے یا دوسرے کسی سے خرید کر پھر اس سنار کو دیدے، اور بنوائی ٹھیرا لے
یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۲۹ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۷۱)

سوال (۱۰۹) ۱ سوائے ان چند اشیاء کے جن کا ذکر حدیث شریف میں ہے (سونا چاندی، گیہوں جو، کھجور، نمک) دیگر اشیاء کی خرید و فروخت زیادتی کمی کے ساتھ دست بدست یا بطور قرض جائز ہے یا ناجائز؟

روپیہ یا چاندی کی بیع چاندی کے سوا دوسرے سکوں سے بطور ادھار

۲ ایک نقرئی روپیہ سکہ مروجہ وقت کی فروخت بالنسیہ بالعوض بیس آنہ سکہ تانبہ مروجہ وقت یا بالعوض بیس اکنیوں کے جائز ہے یا ناجائز؟

۳ ایک تولہ چاندی کی خرید و فروخت بالعوض تیس آنہ کے سکے کے جو تانبہ کا ہو بالنسیہ جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب (۱) فی الھدایۃ الربوا محرم فی کل مکیل او موزون اذا بیع بجنسہ متفاضلا وفیھا اذا عدم الوصفان الجنس والمعنی المضموم الیہ حل التفاضل والنسأ واذا وجد احرم التفاضل والنسأ واذا وجد احدھما وعدم الاخر حل التفاضل وحرم النسأ (ص ۶۱، ۶۳ ج ۲) اس میں تصریح ہے کہ بجز ان چھ چیزوں کے بھی تمام مکیلات و موزونات میں ربوٰ جاری ہوتا ہے، اس تفصیل سے کہ ان میں جو چیزیں ہم جنس ہیں ان میں کمی بیشی بھی اور نسیہ بھی حرام ہے، اور جو چیزیں ہم جنس نہیں ہیں مگر موزون یا مکیل ہونے کے وصف میں شریک ہیں، ان میں کمی بیشی تو جائز ہے، مگر نسیہ حرام ہے، البتہ انہی ہم جنس چیزوں میں اور اسی طرح عددی متقارب چیزوں میں قرض لینا دینا جائز ہے، مگر حکم قرض کا یہ ہے کہ اس کا مثل واپس کرنا واجب ہوتا ہے قرض دیتے کے وقت غیر مثل کی شرط حرام ہوتی ہے گو قرض ادا کرنے وقت بتراضی طرفین اس کی عوض دوسری چیز لے لی جاوے، مثلاً روپیہ قرض لیا تو اس وقت دوسری چیز کا شرط ٹھہرانا کہ اس کے عوض گنی یا اتنی اکنی لیں گے یہ حرام ہے، پھر خواہ ادا کرتے وقت باہمی رضامندی سے جو کہ ابھی حاصل ہوئی ہے، گنی یا بہت سی اکنی لے لی، اور دیدی جاویں، فی الدر المختار القرض عقد مخصوص یرد علی دفع مال مثلی لاخر لیرد مثلہ وصح القرض فی

فی مثلی لا فی غیرہ فیصح استقراض الدراھم والدنانیر وکذا کل مایکال ویوزن اویعد متقاربا اھ ملخصا (ص ۴۴، ۴۵، ج ۲)

(۲) اس کا جزو اول حرام ہے للروایات المذکورۃ فی جواب السوال الاول اور دوسر جزو میں یہ تفصیل ہے کہ اگر بطور قرض کے ہے تب تو حرام ہے، للروایات السابقہ، اور اگر بطور بیع کے ہے تو یہ سلم ہے، اور سلم میں علاوہ دیگر شرائط کے ایک حکم ضروری یہ ہے کہ اگر مسلم الیہ کو مسلم فیہ پر قدرت نہ ہو تو رب السلم کو اپنا اصلی راس المال واپس کر کے اس کے بدل میں دوسری چیز لینا جائز نہیں، فی الھدایۃ ولا یجوز التصرف فی راس مال السلم والمسلم فیہ قبل القبض الخ (ص ۸۱ ج ۲)

(۳) اس میں وہی تفصیل ہے جو جواب سوال دوم کے جزو دوم میں ہے اور سوال دوم کے جزو دوم اور سوال اخیر میں سلم کی اجازت یہ جب ہے کہ مقصود اس حیلہ سے سود نہ ہو، اور نہ اس کا حکم مثل بیع عینیہ کے ہے، جس کی نسبت ہدایہ میں ہے وھو مکروہ، اور کفایہ میں ہے اخترعہ اکلۃ الربوا، اور فتح القدیر میں ہے وقال محمد ھذا البیع فی قلبی کامثال الجبال ذمیم الخ (ص ۱۰۷ ج ۲) اور فتح القدیر حاشیہ ہدایہ میں ایسے ہی ایک حیلہ کی نسبت ہدایہ کے قول فمع الکراھۃ پر لکھا ہے، انما کرہ لانھما باشرا الحیلۃ لسقوط الربوا کبیع العینیۃ فانہ مکروہ بھذا اور اس کے بعد لکھا ہے ینبغی ان یکون قول ابی حنیفۃ ایضا علی الکراھۃ کما ھو ظاھر اطلاق المصنف من غیر ذکر خلاف اور اس کے قبل لکھا ہے قیل لمحمد کیف تجدہ فی قلبک قال مثل الجبل (ص ۹۲، ج ۲) اور مکروہ سے مراد ایسے مقام پر مکروہ تحریمی ہے، جو قریب حرام کے اور عادت کرنا اس کا حرام ہے اور عادات ناس سے یہ امر متعین ہے کہ وہ اس کو بجائے سود کے استعمال کرتے ہیں اس لئے اس کو حرام لکھا جاوے گا،

۲۴ جمادی الثانی ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۴۳)

اضرار کفار کے لئے الخ

سوال (۱۱۰۰) طرابلس پر اٹلی کا قبضہ ہو جانے سے ہندوستان کے مسلمانوں میں جس قدر بے چینی ہے ایک گونہ اثر اس کا دہلی میں بھی ہے چنانچہ دہلی کے ایک جلسہ میں یہ بھی کہا گیا کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ اٹلی کے ساتھ تجارتی لڑائی کریں اٹلی ساخت کے کل سامان کا استعمال ترک کر دیں خرید و فروخت بالکل چھوڑ دیں جو ایسا کریگا

وہ کافر ہے سلطان کا خیر خواہ نہیں اٹلی کا حامی ہے اور اس کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے اسی جلسہ میں اٹلی ساخت کی ترکی ٹوپیاں اتار اتار کر جلا دیں میری دوکان پر سامان اکثر قیمتی ہوتا ہے جس میں بہت سی چیزیں اٹلی ساخت بٹوا، قینچی، چاقو، بٹن، استرہ وغیرہ وغیرہ بھی ہوتے ہیں لوگوں نے بہت تنگ کرنا شروع کیا کہ ان چیزوں کا فروخت کرنا چھوڑ دو فقط

الجواب، کافر ہونے کی تو کوئی وجہ نہیں اور بلکہ بیع ناجائز بھی نہیں۔ لیکن افضل یہی ہے بشرطیکہ اپنا ضرر اور اتلاف مال نہ ہو ورنہ افضل کیا جائز بھی نہیں فقط

۱۰ ذی قعدہ ۱۳۲۹ھ (حوادث اول ص ۳۲)

سوال، طرابلس پر اٹلی کا قبضہ ہو جانے سے . . . الخ اضرار کفار کے لئے ان کی بنائی ہوئی چیزوں کی تجارت ترک کرنا (یہ مضمون بعینہ اس صفحہ کے صفحہ پر درج ہو چکا ہے)

متعلق سوال ۱۲۰ حق

سوال، (۱۱۱) عمرو نے زید سے اپنا روپیہ طلب کیا مع منافع کے اور زید نے دیدیا پھر اسی جگہ بیٹھے بیٹھے زید نے کہا کہ اگر دوبارہ پھر مال خرید کر ہم کو ادھار دیدو تو ہم وہی منافع ایک ماہ کا (صہ) پانچ روپیہ دیں گے اس نے کہا کہ ہم اور کہیں سے مال نہیں منگاتے کیونکہ ہمارا خود جانا نہیں ہوتا اور تم کو وکیل یا اجیر بنانے میں ہم کو خیال ہے خیانت کا البتہ تمہارے پاس اگر مال موجود ہو تو ہمارے ہاتھ فروخت کر دو اور اس کی قیمت ہم سے لے لو پھر اس مال کو ہم سے خرید لینا، ادھار کی جو مدت معین کرو گے۔ یہ بات قرار پا کر عمرو نے زید سے مال خرید کر قیمت دیدی پھر اسی جگہ بیٹھے بیٹھے عمرو نے کہا کہ تم اس مال کو خریدتے ہو خرید لو زید نے کہا میں خریدتا ہوں جو منافع پانچ روپیہ کا پہلے دیا تھا اسی منافع سے ایک ماہ کی مہلت سے لیتا ہوں عمرو نے دیدیا اور زید نے منظور کیا۔

الجواب، یہ معاملہ[ہ] مبنی ہے شرط پر جس کا حرام ہونا اوپر مذکور ہوا ہے پس یہ بناء الفاسد علی الفاسد ہے، پھر یہ تمام صورتیں بیع کی غیر مقصود ہیں اس لئے کہ مدیون ان صورتوں میں مجبور کیا جاتا ہے مقصود اس ظاہری صورت سے نفع حاصل کرنا ہے بلا رضا مندی صاحب معاملہ کے اس لئے بھی ناجائز ہے۔ ۲۰ محرم الحرام ۱۳۳۰ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۳)

ہ اصل کتاب میں چند سوالوں کا سلسلہ تھا تبویب کی مناسبت سے وہ مختلف ابواب میں منقسم ہو گئے اور جس سوال کا حوالہ لکھا ہے وہ مبوب امداد الفتاویٰ جلد سوم میں (ص ۹۰) پر آیا ہے ۱۲ محمد شفیع

بیع فاسد

سلسلہ وار خریدن و فروختن ٹکٹ کارخانہ ہائے تجارت

سوال (۱۱۲) آجکل بعض انگریزی تجارتوں کا یہ حال ہے کہ کاغذ فروخت کرتے ہیں، اور اس میں چار ٹکٹ لگے ہوتے ہیں جس کو وہ شخص اسی قیمت کو مثلاً ایک روپیہ پر چار اشخاص کے ہاتھ فروخت کر ڈالتا ہے، اور ان اشخاص سے وہ روپیہ وصول کرکے اور ان کا پتہ کمپنی کو لکھ کر بھیجدیتا ہے، صاحب کمپنی ایک گھڑی اس شخص کو بھیجتا ہے، اور ان چار اشخاص کے نام ایک ایک کاغذ ویسا ہی بھیجدیتا ہے، جس میں ویسے ہی چار ٹکٹ بھی ہوتے ہیں، جس کو وہ چاروں شخص لوگوں کے ہاتھ اسی قیمت کو مثلاً ایک روپیہ کو پھر بیچ ڈالتے ہیں جب روپیہ ان لوگوں کے پاس آجاتا ہے تو وہ لوگ بھی صاحب کمپنی کے نام روپیہ اور جن کے ہاتھ وہ ٹکٹ فروخت کئے ہیں ان کا پتہ وغیرہ لکھ کر بھیجدیتے ہیں، صاحب کمپنی ایک ایک گھڑی ان کے نام بھیجدیتا ہے اور ایک ایک کاغذ ویسا ہی جن کے نام انھوں نے ٹکٹ فروخت کئے ہیں صاحب کمپنی بھیجدیتا ہے پھر وہ لوگ بھی ویسا ہی عمل کرتے ہیں۔ اور اسی طرح اس کا اجرا رہتا ہے ہاں البتہ جس شخص کے ٹکٹ فروخت نہ ہوں گے وہ البتہ نقصان اٹھائے گا، تو شرعاً یہ بیع جائز ہے یا نہیں، اور شرعاً ایسا کرنا کیسا ہے،

الجواب، حاصل حقیقت اس معاملہ کا یہ ہے کہ بائع مشتری اول سے بلا واسطہ اور دوسرے مشتریوں سے بواسطۂ مشتری اول یا ثانی یا ثالث وغیرہم کے یہ معاہدہ کرتا ہے کہ تم نے جو روپیہ بھیجا ہے اگر تم اتنے خریدار پیدا کرلو تو اس روپیہ مرسلہ کے عوض ہم نے تمھارے ہاتھ گھڑی فروخت کردی، ورنہ تمھارا روپیہ ہم ضبط کرلیں گے، سو اس میں دونوں شرطیں فاسد و باطل ہیں، دوسرے خریداروں کے پیدا کرنے کی تقدیر پر فروخت کرنا بھی کہ وہ تنجیز بیع کے وقت (مقرون بشرط فاسد مخالف مقتضائے عقد ہونے کی وجہ سے) عقد فاسد بحکم ربوٰہ اور تعلیق کے وقت (تعلیق الملک علی الخطر ہونے کی وجہ سے) قمار ہے، اور ربوٰ اور قمار دونو حرام ہیں اسی طرح دوسری شرط یعنی خریدار پیدا نہ کرنے کے تقدیر پر روپیہ کا ضبط ہوجانا بھی کہ صریح اکل بالباطل ہو اور یہ تاویل ہرگز مقبول نہیں ہوسکتی کہ روپیہ کے عوض ٹکٹ دیا ہے کیونکہ ٹکٹ یقیناً مبیع نہیں ہے، ورنہ بعد خرید ٹکٹ معاملہ ختم ہوجاتا، ٹکٹ فروخت کرکے

گھڑی کا استحقاق ہرگز نہ ہوتا جیسا تمام عقود میں یہی ہوتا ہے، پس صاف ظاہر ہے کہ ٹکٹ مبیع نہیں بلکہ روپیہ کی رسید ہے، جب دونوں شرطوں کا فاسد و باطل ہونا ثابت ہوگیا تو ایسا معاملہ بھی بالیقین حرام اور متضمن ربٰو اور قمار و اکل بالباطل ہے، اور کسی طرح اس میں جواز کی گنجائش نہیں، قال اللہ تعالیٰ احل اللہ البیع وحرم الربٰو وقال اللہ تعالیٰ انما الخمر والمیسر الی قولہ رجس من عمل الشیطان الآیۃ وقال تعالیٰ ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الآیۃ، وقال صلی اللہ علیہ وسلم کل شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل ونہی علیہ السلام عن بیع وشرط وفی جمیع الکتب الفقہیہ صرحوا بعدم جواز البیع مشروط بما لا یقتضیہ العقد ولا یلائمہ وفیہ نفع لاحدھما کما لا یخفی علی من طالعھا، واللہ اعلم (امداد ثالث ص ۹)

مبیع کے معلوم ہونے کی شرط اور اس کی توضیح

سوال (۱۱۳) زید کپڑے کی بند گٹھری خریدتا ہے، گٹھری میں جس قدر کپڑا ہے اس کا نمونہ اور مقدار سب بتادی گئی ہے مگر مقدار کل بتائی گئی ہے یہ نہیں معلوم کہ پارچہ اور ٹکڑا کتنے کتنے گز کا ہے، بیع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مبیع کا معلوم ہونا شرط ہے خواہ بیان تقدیر سے یا اشارہ سے، اول تو یہاں مقدار بھی بتلادی ہے، اور اگر اس کو معتبر نہ سمجھا جاوے تو مثال لیہ تو ضروری ہے، لہٰذا یہ بیع جائز ہے، ۱۲ جمادی الاخریٰ ۱۳۲۲ھ (امداد ثالث ص ۱۱)

ایسی جائداد جس پر قبضہ نہ کرسکے اس کی بیع،

سوال (۱۱۴) ایک شخص نے اپنی جائداد مقبوضہ غیر منقولہ کے شامل اس جائداد غیر مقبوضہ غیر منقولہ (جو مکان و زمین کاشت ہے) کو بھی بیع کردیا جو بعد ممات مورث کے بائع کے قبضہ میں وراثت آئی، بلکہ ہنوز دوسرے لوگوں وارثان کے قبضہ و تصرف میں ہے، اور زرثمن اس کا اس طور سے ہوا کہ جو جائداد مقبوضہ بیع ہوئی، اس کا زرثمن تو ایک مقدار میں مشتری سے بائع نے وصول پایا، مگر جائداد غیر مقبوضہ جو شامل اس کے بیع کی گئی ہے اس کے زرثمن کی نسبت فیمابین بائع و مشتری یہ معاہدہ قرار پایا کہ اس دخل و قبضہ کرنے میں مشتری قبل از بیع جو کچھ خرچ کرچکا ہے، اور پھر بہ تکمیل بیع خرچ کرے گا، وہ سب مجرا دے کر جو کچھ زرثمن میں سے باقی رہے گا اس میں سے صرف نصف حصہ بائع کو مشتری ادا کرے گا اور نصف حصہ مشتری ہضم کرے گا، اور اگر مشتری قبضہ دخل میں ناکامیاب رہا تو اس صورت میں مشتری بائع کو کچھ اس زرثمن میں سے نہیں دے گا، اور جو کچھ مشتری قبضہ کرنے میں جائداد مذکور کے خرچ کرچکا ہے اس کی زیر باری صرف مشتری کے ذمہ رہے گی بائع سے اس کا مطالبہ نہیں ہوگا، ایسا ہی

شرط کی وجہ سے ہنوز تقابض البدلین نہیں ہوا ہے، یعنی مشتری کو بیع نامہ نہیں ملا ہے پس ایسی شرطیہ بیع جائز ہے یا ناجائز، اور مشتری کو دعویٰ کرنے کا حق ہے یا نہیں، اور یہ سب جائداد ہے، مکان وزمین وکاشت ہے، اور وہ تکراری شے مبیعہ جو کہ از وارثان کے قبضہ میں ہے ہنوز غیر منقسم ہے۔

الجواب، فی الھدایہ وکذا لوارسلہ (ای الطیر) من یدہ لانہ غیر مقدور التسلیم وفیھا ومن جمع بین حر وعبد او شاۃ ذکیۃ ومیتۃ بطل البیع فیھما ومن جمع بین عبد و مدبر او بین عبدہ وعبد غیرہ صح البیع بحصتہ من الثمن وفیھا کل شرط لا یقتضیہ العقد وفیہ منفعۃ لاحد المتعاقدین اوللمعقود علیہ وھو من اھل الاستحقاق یفسدہ وفیھا بخلاف ما اذا لم یسم ثمن کل واحد لانہ مجھول، ان روایات سے یہ امور ثابت ہوئے (۱) اول عبارت سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جائداد غیر مقبوضہ کا اس وارث قابض کے ہاتھ سے چھڑانا امر مشکوک ہے، پس اگر ایسا ہے تو بوجہ غیر مقدور التسلیم ہونے کے اس کی بیع صحیح نہیں ہوئی، (۲) جو جائداد مقبوضہ بیع کی گئی ہے اس کی بیع درست ہوگئی، (۳) جائداد غیر مقبوض اگر مقدور التسلیم بھی ہو تب بھی بوجہ غیر متعین ہونے ثمن کے اس کی بیع درست نہیں ہوئی، خلاصہ جواب یہ ہے کہ جائداد مقبوضہ کی بیع درست ہوگئی اور غیر مقبوضہ کی بیع دو وجہ سے درست نہیں ہوئی، بوجہ عدم قدرت علی التسلیم اور عدم تعیین ثمن، واللہ اعلم، ۳ صفر ۱۳۲۵ھ (امداد ثالث ص ۲۲)

بیع میں دھرم کھاتہ کی شرط **سوال** (۱۱۵) زید نے خالد کے ہاتھ کوئی شے فروخت کی، بایں الفاظ کہ میں نے یہ صندوق مثلاً تمہارے ہاتھ فروخت کیا اس شرط پر کہ ہر سیکڑے پر ایک یا دو پیسہ للہ کے خرچ کے واسطے ہم کو دو ورنہ میں نہیں دوں گا، اس قسم کی بیع وشراء شرعاً درست ہے یا نہیں، اگر درست ہے تو دینے والے کا ثواب زیادہ ہے یا خرچ کرنے والے کا؟ اور در صورت جائز ہونے کے یہ بھی علی التفصیل بیان فرمایئے کہ یہ لینا دینا کسی خاص قوم کے ساتھ ہے یا عام ہے کہ ہنود ہو یا مسلمان ہو یا کوئی کتابی ہو؟ مفصل بیان سے ممنون ومشکور فرمایئے اور اس مال کے مصارف مسجد وگورستان ومدرسہ ہو سکتے ہیں یا نہیں، اگر نہیں تو کس کس مقام میں صرف ہو سکتے ہیں؟

الجواب، چونکہ بیع میں بعد طے ہو جانے ثمن کے بھی ثمن میں زیادت درست ہے

اس لئے یہ صورت اس تاویل سے جائز ہو سکتی ہے۔ مگر اس تاویل کی بنا پر یہ ایک پیسہ یا دو پیسہ اس بائع کی ملک ہوں گے، اس کو اختیار ہو گا خواہ اس مصرف میں صرف کرے یا صرف نہ کرے، اس پر کسی کا جبر نہ ہو سکے گا، اور جب اس کی ملک ہے تو ثواب اس کے صرف کا صرف بائع کو ہو گا مشتری کو نہ ہو گا، اور جب ملک ہی تو یہ اختیار بھی بائع کو ہے کہ جہاں چاہے صرف کرے بشرطیکہ مصرف معصیت نہ ہو۔

۱۰ شوال ۱۳۲۸ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۵۶)

خوراک خریدنے کے لئے پیشگی قیمت دیدینا۔ جمع بین العمل والصنع

سوال (۱۱۶) مدرسہ میں طلبہ سے خوراکی جو لی جاتی ہے یہ کس عقد میں داخل ہے، آیا بیع ہے؟ تو پیشگی معاوضہ لیتا کراہت سے خالی نہ ہو گا، یا کہ یہ استصناع ہے کسی اور عقد میں تو داخل ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے، نیز گھڑی بنوانا... یا چارپائی بنوانا جن میں بیع اور عمل دونوں شامل ہیں، آیا ان کے جواز کی گنجائش ہے کہ استصناع میں داخل کر کے جائز کہہ دیا جاوے، اور بلا نکیر سب کا کرنا تعامل سمجھا جاوے گا یا عقد فی عقد کے سبب سے منع کیا جاوے آج کل بکثرت ایسے معاملات ہیں جن میں عقد فی عقد یا کہ بیع اور عمل دونوں شامل ہوتے ہیں؟

الجواب طلبہ کی خوراکی بیع استجرار میں داخل ہے، شامیؒ نے اس کے جواز میں مبسوط بحث لکھی ہے[ع] اور فقہاء نے بیع اور عمل کے جمع کرنے کی بعض صورتیں متعارف لکھ کر اجازت دی ہے یہ بھی اسی میں داخل ہی جیسے خیاط کہ عمل اور تاگہ دونوں اس کے ذمہ ہوں، یا صباغ کہ عمل اور صبغ دونوں اس کے ذمہ ہوں۔

۱۱ جمادی الاولیٰ ۔۔۔ (حوادث اول ثانی ص ۲۳)

اگر بیع میں یہ شرط کی جاوے کہ قیمت کا اتنا حصہ واپس کرنا پڑیگا تو بیع فاسد ہے اور بیع فاسد کا حکم سود ہوتا

سوال (۱۱۷) حضور یہاں ایک اصول ہے جس پر مجھکو سود ہونے کا شبہ ہوتا ہے، بلکہ یہاں ایک مولوی صاحب سے دریافت بھی کیا، لیکن انھوں نے فرمایا کہ سود تو نہیں ہے لیکن بیع کے خلاف ہے، ان کے فرمانے سے میری طبیعت کو اطمینان نہیں ہوا وہ اصول یہ ہے کہ مثلاً سو روپے کا مال فروخت کیا پندرہ یوم کی میعاد پر یعنی سو روپے کا مال پندرہ یوم کیلئے قرض دیا اب اگر لینے والا پندرہ ہی یوم میں دے گا تو اس کو دو روپے دیں گے کٹوتی کے، اگر اس نے پندرہ یوم میں نہ دیئے ایک ماہ میں دیئے تو اس کو بجائے دو روپے کے ایک روپیہ دیں گے،

ع شامی ج ۴ ص ۱۶

اگر اس نے ایک ماہ میں بھی نہ دیئے تو اس کو نہیں دیتے، الغرض دو روپے سیکڑہ کٹوتی ہے پندرہ یوم تک؟

الجواب - عرف کے سبب یہ شرط ہے اور فاسد ہے، اور شرط فاسد سے بیع فاسد ہو جاتی ہے اور بیع فاسد بتصریح فقہاء ربوا یعنی معاملہ سود میں داخل ہے،

۱۲ ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ (تتمہ خامسہ ص ۱۰۴)

روئی کا مبادلہ کتے ہوئے سوت کے ساتھ ناجائز ہے

سوال (۱۱۸) اکثر عورتیں چرخہ چلانے لگی ہیں، اور سوت کو روئی سے بدلتی ہیں اس طور سے کہ سیر بھر سوت دے کر ڈیڑھ سیر روئی اس کے بدلہ میں لیتی ہیں، اور فاضل روئی ان کو جو آدھ سیر بدلہ میں ملتی ہے وہ اپنی مزدوری سمجھتی ہیں اور جو اس طور کا معاملہ کرتے ہیں وہ بخوشی ادلا بدلا کرتے ہیں، اس طور کے ادلے بدلے میں سود تو نہیں ہوتا ہے، اور اگر سود ہوتا ہے تو پھر کون سی صورت اس سے بچنے کی اختیار کریں، اور اپنی محنت کس طور سے وصول کریں؟ اس کی کوئی صورت بچنے کی سہل بتلائی جاوے تاکہ ان کو اس مسئلہ سے آگاہ کر دیا جاوے، چونکہ اس طرف اس طور سے سوت کو روئی سے بدلنے کا رواج ہے، اس لئے چرخہ جو چلاتی ہیں ایسا ہی کرتی ہیں، اس میں ان کو نفع ہوتا ہے،

الجواب، فی الھدایۃ واختلفوا فی القطن بغزلہ قال العینی ای فی بیع القطن بغزل القطن متساویا وزنا قال بعضھم یجوز لان اصلھما واحد وکلاھما موزون وقال بعضھم لا یجوز والیہ ذھب صاحب خلاصۃ الفتاوی لان القطن ینقص اذا غزل فصار کالحنطۃ مع الدقیق اھ، اس روایت سے معلوم ہوا کہ صورت مسئول عنہا جائز نہیں صرف ایک حیلہ جواز کا ہو سکتا ہے کہ سوت اور روئی کا مبادلہ نہ کریں بلکہ سوت کو داموں کے عوض میں بیچیں پھر ان داموں کے عوض روئی لے لیں یا روئی کو داموں کے عوض بیچیں پھر ان داموں کے عوض سوت لیلیں،

۱۸ رمضان ۱۳۳۹ھ (تتمہ خامسہ ص ۱۹۵)

کپڑے کی بیع بعوض نقد اور سوت کے

سوال (۱۱۹) کیا فرماتے ہیں علماء دین وشرع متین امور مستفسرہ ذیل میں قصبہ مؤمیں کپڑے کے خریدار اس قسم کے زیادہ ہیں جو مال کی قیمت میں نصف سوت اور نصف زر نقد دیا کرتے ہیں، اگر اسامی یعنی بائع چاہے کہ مال کی قیمت بلا سوت کے کل زر نقد ملے تو خریدار مال خریدنے سے باز رہے گا، لیکن کل زر نقد دے کر مال خریدنا قبول نہیں کریگا اور اسامی یعنی بائع کا حرج ہونے لگے گا اس صورت میں اسامی اپنا مال نصف سوت اور

نصف زرنقد پر فروخت کرے تو یہ بیع جائز ہے یا ناجائز، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک سو روپے کا مال فروخت ہوگا تو پچاس روپے کا سوت اور پچاس روپے زرنقد سے مال کی قیمت ادا کی جائے گی لیکن اس امر کا ذکر بائع اور مشتری کے درمیان خرید و فروخت کے وقت نہیں کیا جاتا ہے، مال کی قیمت طے کر لیتے ہیں کہ چالیس روپے کا ہوا یا پچاس روپے کا ہوا اور سوت کا نرخ بعض وقت قبل سے معلوم رہتا ہے اور بعض وقت مال فروخت ہو جانے کے بعد طے ہوتا ہے، اس معاملہ میں بائع اور مشتری دونوں رضامند ہو جاتے ہیں تو اس میں کیا قباحت ہے اس کا جواب بہت جلد عطا ہو (تم السوال)

پھر یہاں سے اس پر یہ تنقیح کی گئی

یہ دست بدست ہوتا ہے یا اول قیمت دی جاتی ہے، پھر ایک میعاد کے بعد مال یا اسکا عکس اور میعاد معین ہوتی ہے یا نہیں (تم التنقیح)

اس تنقیح کا یہ جواب آیا

واضح ہو کہ بائع جس وقت مال اپنا فروخت کرتا ہے، اس کے مال کی قیمت میں کبھی اسی وقت دست بدست نصف سوت اور نصف زرنقد سے دام مل جاتے ہیں، لیکن اکثر خریدار دام دینے میں تاخیر کرتے ہیں، اور تاخیر کی میعاد ایک ہفتہ سے چار ہفتہ تک ٹھیرائی گئی ہے، یعنی ایک ہفتہ یا چار ہفتہ میں اس کے مال کی قیمت میں نصف سوت اور نصف زرنقد سے دام ملے گا، لیکن مال کی قیمت میں بائع کو جو سوت ملتا ہے، وہ اصلی نرخ سے کسی قدر گراں پڑتا ہے، یعنی فی بنڈل دو آنہ یعنی اگر اصلی نرخ بازار کے آٹھ روپے بنڈل ہوگی، تو مال کی قیمت میں جب سوت دیں گے تو دو آنہ اوپر آٹھ روپے بنڈل کا نرخ کر کے دیں گے، اس طرح پر کہ سولہ روپے مال کی قیمت ہوگی تو آٹھ روپے دو آنے کا ایک بنڈل سوت دیں گے اور سات روپے چودہ آنے نقد دیں گے، اس طرح پر بیع و شراء درست ہے یا نہیں، فقط؟

لے سو دوالے خریدار ہندو مارواڑی اور مسلمان بھی ہیں قصبہ کے اندر جو کپڑا کارگاہوں میں تیار ہو کر سوت والے خریدار کی دوکان پر فروخت ہوتا ہے اسی کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس کا جواب حسب ذیل دیا گیا

الجواب، باقتضائے المعروف کالمشروط یہ تو یقینی ہوگیا کہ ثمن دو چیزوں کا مجموعہ ہے، نقد اور سوت، پس یہ کہنا کہ سولہ روپے قیمت ہے مثلاً اس کے معنی مصطلح بقاعدۂ بالا یہ ہیں کہ اس کی قیمت آٹھ روپے نقد اور آٹھ روپے کا سوت ہے مثلاً سو اگر مجلس ہی میں تقابض ہو جاوے یعنی خریدار نے کپڑے پر قبضہ کرلیا، اور بائع نے ثمن، یعنی نقد اور سوت پر، تب تو بلاتکلف یہ بیع جائز ہے، اور اگر کل ثمن مجلس میں نہیں دیا گیا یا سوت نہیں دیا تو اس صورت میں بیع کے جائز ہونے کی یہ شرط ہے۔ کہ عقد کے وقت سوت کا نرخ اور یہ کہ کتنا سوت دینا ہوگا تصریحاً مقرر ہو جاوے، کیونکہ یہاں سوت جزو ثمن ہے، اور ثمن کا معلوم ہونا صحت بیع کی شرط ہے، اما نفس الجواز فلما فی الدرالمختار جاز بیع کرباس بقطن وغزل مطلقاً، کیفما کان لاختلافهما جنسا ام قلت ویستثنی منه ثوب یمکن نقضه فیعود غزلاً فانه یشترط فیه التقابض کمافی ردالمحتار ج ۴ ص ۲۸۵، ۲۸۶

۱۵ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۰۲)

عدم جواز بیع معدوم

سوال (۱۲۰) چمی فرمایند علمائے دین ومفتیان شرع متین اندریں مسئلہ کہ شخصے بقیمت دو آنہ چیزے خریدہ یک روپیہ بدست بائع داد و فلوس ہشت آنہ مشتری را دادہ گفت کہ مابقی شش آنہ بعد چند ساعت بگیرید و نیز بائع از ہنود ست اکنوں ایں بیع دگرفتن فلوس مابقی شرعاً روا باشد یا نہ بینوا بالکتاب توجروا عندالملک الوہاب۔

الجواب، فلوس مبیع است وبیع معدوم شرعاً جائز نیست الا السلم بشرائط، البتہ اگر فلوس موجود باشد گو قبض موخر باشد جائز ست لاکن عوام رعایت ایں شرط نمی کنند لہٰذا منع ازاں مطلقاً اصلح است وہٰذا کلہ ظاہر، ۴ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ ص ۵۸)

پھلوں اور پھولوں کی بیع

آم کے پھول (کھیں) کی بیع کافر کے ہاتھ

سوال، (۱۲۱) اگر آم کا مول (یعنی پھول) کسی کافر نے مسلمان مالک باغ سے خرید کیا تو اس کافر سے اور مسلمانوں کو آم لینے جائز ہیں یا نہیں اور ان کا کھانا کیسا ہے؟

الجواب، جائز نہیں ؟ (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۶)

دار الحرب میں کافر مالک باغ سے درختوں کا پھول دکھرا خریدنا

سوال (۱۲۲) اگر کسی کافر مالک باغ سے مسلمانوں نے مول خرید کیا تو ان مسلمانوں سے اور مسلمانوں کو خرید کرنا اور کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، جائز ہے، (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۶)

بائع و مشتری دونوں غیر مسلم ہوں اور وہ کہر کی بیع کریں تو مسلمانوں کو اس کا پھل خریدنا

سوال (۱۲۳) اگر مالک باغ بھی کافر ہے اور خریدنے والا مول کا بھی کافر ہے تو ان سے اور مسلمانوں کو آم لے کر کھانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب، جائز ہے، (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۶)

بیع ثمار بہ بعض شروط مروجہ

سوال، (۱۲۴) باغ کا غیر پختہ پھل کسی کو قیمت کرکے بیچ دیا جائے، اس شرط پر کہ پختہ ہونے تک پانی صاحب باغ دیا کرے گا باقی پرداخت مشتری کرے گا، مدت معروفہ پختہ ہونے تک مہلت ہوتی ہے جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب، فی الدر المختار وان شرط ترکہا علی الاشجار فسد البیع کشرط القطع علی البائع حاوی وقیل (قائلہ محمد) لا یفسد اذا تناھت الثمرۃ للتعارف فکان شرطا یقتضیہ العقد وبہ یفتی بحر عن الاسرار الخ فی رد المحتار قبیل القول المن کور تحت قولہ وافتی الحلوانی بالجواز لو اخرج اکثر بعد بحث طویل قلت لکن یخفی تحقق الضرورۃ فی زماننا ولا سیما فی مثل دمشق الشام کثیرۃ الاشجار والثمار الی آخر ما قال، واطال ج ۴ ص ۵۹ فی الدر المختار ولا بیع بشرط الی قولہ ولم یجر العرف بہ الخ وفیہ اوجری العرف بہ الی قولہ استحسانا للتعامل بلا نکیر فی رد المحتار بعد کلام طویل ومقتضی ھذا انہ لو حدث عرف فی شرط غیر الشرط فی النعل والثوب والقبقاب ان یکون معتبرا اذا لم یؤد الی المنازعۃ الخ، ص ۱۲۶ تا ص ۱۹، ان روایات سے معلوم ہوا کہ فی نفسہ تو یہ معاملہ خلاف قاعدہ ہے، لیکن اگر کہیں ایسا عرف عام ہو جاوے تو درست ہے، اور جو عرف عام نہ ہو درست نہیں،

۲۸ رمضان ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ ص ۷۹)

بیع ثمار قبل ظہور | **سوال** (۱۲۵) اگر قرضدار کو باغ کا پھل دو تین سال ۵۰۰ روپے میں لکھدیئے جاویں جو پیداوار ہو کیسا ہے؟

الجواب، فی الدر المختار اما قبل الظہور فلا یصح اتفاقا فی رد المحتار عن الفتح لاخلاف فی عدم جواز بیع الثمار قبل ان تظہر الخ جلد ۴ ص ۵۸، اس سے معلوم ہوا کہ یہ معاملہ مطلقاً ناجائز ہے، ۲۸ رمضان ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ ص ۹۷)

پھل خریدنے والے سے کچھ مقدار جنس (پھل) کی مقرر کرنا | **سوال** (۱۲۶) جناب کے بہشتی زیور میں میں نے یہ مسئلہ دیکھا ہے کہ اگر بہار باغ بیع کی جاوے تو نقد قیمت کے ہمراہ کچھ مقدار آم کی بطور جنس لینے کے طے کر لی جاوے تو جائز ہے، پیشتر سے مجھ کو یہ علم تھا کہ قیمت کے ہمراہ جنس ناجائز ہے لہٰذا مثلاً کسی شخص نے اپنا باغ بیع کیا مبلغ سو روپے کو، یعنی مشتری سے یہ کہا کہ کل بہار کے سو روپے لوں گا اور دس من آم بھی اسی باغ کے تم سے بغیر قیمت کے لوں گا، گویا بالکل قیمت سو روپے نقد اور دس من آم ہوئے تو یہ جنس علاوہ نقد جائز ہوگی یا نہیں، امید کہ جواب باصواب مطلع فرمایا جاوے، بینوا توجروا، فقط۔

الجواب، میں نے یہ مسئلہ ایک تاویل سے لکھا تھا کہ گویا یہ مقدار بیع سے مستثنیٰ ہوگئی اور استثناء مبیع سے مقدار معلوم ومعین کا جائز ہے اور اس کو لکھ کر ایک محقق عالم صاحب الفتاویٰ کو بھی دکھلا لیا تھا، انھوں نے بھی موافقت فرمائی، مگر بعد چندے ایک دوسرے گذشتہ بزرگ کا فتویٰ اس کی ممانعت کا مجھ سے ایک ثقہ نے نقل کیا، اور وہ ممانعت بھی ایک قاعدہ پر مبنی معلوم ہوئی، وہ یہ کہ یہ کیا معلوم کہ پھل اتنا ہاتھ آجاوے گا کہ اس میں سے اس قدر دے سکے گا تب سے اس مسئلہ میں تردد ہو گیا، بہتر یہی ہے کہ یہی سوال وجواب دیوبند وسہارنپور بھیجکر مسئلہ کی تنقیح کر لی جاوے اس وقت تو یوں سمجھ میں آرہا ہے کہ اگر یہ مقدار اس قدر ہو کہ یقیناً مل جاویگی اور کوئی نزاع نہ ہوگا تو کچھ حرج نہ ہوگا ورنہ منع کیا جاوے، ۷ جمادی الثانیہ ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۵۰)

پھل خریدنے والے سے کچھ مقدار جنس (پھل) کی مقرر کرنا | **سوال** (۱۲۷) کیا حکم ہے شرع شریف کا اس مسئلہ میں کہ لوگ اپنا باغ پھل ظاہر ہونے پر جب وقت فروخت کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ یہ قیمت لیں گے اور اس قدر یعنی ہزار یا پانسو انبہ ہم لیں گے، خریدار اپنا سمجھوتہ بابتہ قیمت کر کے خرید لیتا ہے، اور انبہ دینے پر بھی راضی ہو جاتا ہے، اب دریافت طلب یہ بات ہے کہ یہ انبہ لینے جائز ہیں یا نہیں اگر ناجائز تو صورت جواز کیا، اور جائز ہے تو مطلقاً یا کسی خاص درخت کے انبہ کی تعیین کرے،

اکثر باغ والے اس صورت سے فروخت کرتے ہیں کہ ہم باغ خود تو کھا نہیں سکتے اس صورت سے کھا بھی لیتے ہیں اور فروخت بھی کر دیتے ہیں، دیوبند کو لکھا تھا، مفتی صاحب نے لکھا کہ تعداد انبہ ہزار یا پانچسو کرے خاص درخت کی تعیین نہ کرے یہ جائز ہے، در مختار میں ہے، حسب اتفاق مراد آباد کے نوجوان علماء یہاں ایک تقریب میں آئے اُن کے سامنے بھی ذکر ہوا تو انہوں نے فرمایا ناجائز ہے، بیع مجہول ہے، صفقہ فی صفقتین ہے، اس سے خلجان ہو گیا، لہذا گذارش ہے کہ حضرت بھی اس کا جواب تحریر فرماویں تاکہ کسی امر کا وثوق ہو جاوے، فقط۔

الجواب، اول اس عقد کی حقیقت سمجھنا ضروری ہے، سو اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ انبہ معہودہ کو بدل قرار دیا جاوے، یعنی مشتری بدل میں دو چیزوں کے دینے کا وعدہ کرے، ایک اتنا روپیہ دوسرا اتنا انبہ، یہ تو ظاہر ہے کہ ناجائز ہے، دوسرا احتمال یہ کہ اتنی تعداد کے انبہ بیع سے مستثنیٰ سمجھے جاویں سو اس میں بھی یہ خدشہ ہے کہ اول تو انبہ مقدار میں متفاوت کوئی چھوٹا کوئی بڑا، اس میں نزاع کا احتمال دوسرے ممکن ہے کہ کل انبہ اتنے ہی پیدا ہوں تو استثناء کہاں صحیح ہوگا تیسرے جب یہ مستثنیٰ ہوا تو غیر مبیع ہوگا، پھر مشتری کے ذمہ اس کی حفاظت کیسے ہوگی، لیکن تعامل عام کے سبب یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب عادۃً نزاع نہ ہو اور غالباً انبہ زیادہ ہوں تو جائز کہیں گے اور اگر کسی خاص درخت کو پورا مستثنیٰ کر لیں تو اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں، ۲۲ ذیقعدہ ۱۳۳۹ھ

(تتمہ خامسہ ص ۱۹۸)

اشتراط بعض ثمرات بیع در ثمن ثمرات

سوال، (۱۲۸) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید نے بہار باغ سو روپے میں فروخت کی مشتری نے پچاس روپے نقد وقت بیع کے دیدیئے اور پچاس روپے کا اختتام بہار پر وعدہ کیا، یہ روپیہ جو اختتام بہار پر دیا جائے گا اس پر بائع مشتری سے روپیہ سیکڑہ ڈالی کے آم لے گا یہ آم لینے جائز ہیں یا نہیں؟

دوسری صورت یہ ہے کہ کل روپیہ بوقت بیع لے لیا، اس پر بھی کسی قدر آم مشتری سے لئے جاتے ہیں لیکن اس صورت میں روپیہ سیکڑہ نہیں لیا جاتا ہے، بلکہ اس سے کم جوڑے ہوجاتے یہ جائز ہے یا نہیں، ڈالی کے قائم کہنے نہ کرنے میں ثمن کی کمی بیشی بھی ہوتی ہے،

الجواب، یہ اس تاویل سے جائز ہو سکتا ہے کہ جتنے انبہ مقرر ہوئے ہیں گویا یہ بیع سے مستثنیٰ ہیں اور استثناء میں مستثنیٰ کا اس طرح معلوم ہونا چاہیے، کہ متبایعین میں نزاع نہ ہو، سو اگر ایسی ہی تعیین ہو جاوے تو گنجائش ہے۔ اور ہر چند کہ آم ذوات القیم ہیں، لیکن بضرورت

تعامل ان کے اشجار کی تعیین سے جو تقارب ان کے احادیث میں ہے اس سے وہ ملحق بذوات الامثال ہو سکتا ہے، ۲۹ رجب ۱۳۳۱ھ (حوادث اول و ثانی ص ۱۰۸)

جو پھل ظہور سے پہلے فروخت کئے گئے ہوں مالک اصلی کو ان کی خریداری حلال ہے

سوال (۱۲۹) میرے والد کے پاس گاؤں میں کچھ باغ جن کا ٹھیکہ تین چار سال ہوئے کہ والد صاحب نے دس سال کے واسطے رجسٹری کرا دیا ہے، اور اس ٹھیکہ دار سے علاوہ زر مقررہ کے کچھ آم بھی بطور ڈالی کے ٹھہر گئے ہیں، اب یہ فرما دیجئے کہ یہ ڈالی کے آم جب گھر آویں تو میں اپنے صرف میں لا سکتا ہوں یا نہیں، علاوہ اس کے اس گاؤں میں کچھ جزو میرا بھی ہے مگر غیر تقسیم شدہ اور وہ بالکل والد کے قبضہ میں ہے، اور میرا اس وجہ سے ہے کہ مجھے میراث میں ملا ہے، فقط

الجواب یہ بیع باطل تھی، اور آم سب مالک اصلی کی ملک ہیں، پس اس میں سے جو آم ڈالی میں آویں گے وہ بھی مالک ہی کی ملک ہیں، اس لئے حلال ہیں، لیکن جس جگہ عوام اس دقیقہ کو نہ سمجھ سکیں تو ایسے شخص کو نہ کھانا چاہئے جس سے عوام پر اثر پہونچے،

۲۵ جمادی الثانیہ ۱۳۳۲ھ (حوادث اول و دوم ص ۱۴۳)

پھلوں اور پھولوں کی بیع

سوال (۱۳۱) فی الدر المختار (ومن باع ثمرة بارزة) اما قبل الظهور فلا یصح اتفاقا (ظهر صلاحها او لا صح فی الاصح) ولو برز بعضها دون بعض لا یصح (فی ظاهر المذهب) وصححه السرخسی وافتی الحلوانی بالجواز لو الخارج اکثر زیلعی (ویقطعها المشتری فی الحال) جبرا علیه (وان شرط ترکها علی الاشجار فسد) البیع کشرط القطع علی البائع حاوی (وقیل) قائله محمد (لا) یفسد (اذا تناهت) الثمرة للتعارف فکان شرطا یقتضیه العقد (وبه یفتی) بحر عن الاسرار لکن فی القهستانی عن المضمرات انه علی قولهما الفتوی فتنبه قید باشتراط الترک لانه لو شراها مطلقا وترکها باذن البائع طاب له الزیادة وان بغیر اذنه تصدق بما زاد فی ذاتها وان بعد ما تناهت لم یتصدق بشیء وان استاجر الشجر الی وقت الادراک بطلت الاجارة وطابت الزیادة لبقاء الاذن ولو استاجر الارض لترک الزرع فسدت لجهالة المدة ولم تطب الزیادة ملتقی الابحر لفساد الاذن بفساد الاجارة بخلاف الباطل کما حررناه فی شرحه مطلب فساد المتضمن یوجب فساد المتضمن والحیلة ان یاخذ الشجرة معاملة علی ان له جزءا من الف جزء وان یشتری اصول الرطبة کالباذنجان واشجار البطیخ والخیار لکون الحادث للمشتری وفی الورع

والحشيش يشتري الموجود ببعض الثمن ويستاجر الارض مدة معلومة يعلم فيها
الادراك بباقي الثمن وفي الاشجار الموجود ويحل له البائع ما يوجد فان خاف ان يرجع يقول
على اني متى رجعت في الاذن تكون ماذونا في الترك وشمني ملخصا وفي رد المحتار تحت
قوله ظهر صلاحها او لا ما نصه وعندنا ان كان بحال لا ينتفع به في الاكل ولا في علف
الدواب فيه خلاف بين المشائخ قيل لا يجوز ونسبه قاضي خان لعامة مشائخنا
والصحيح انه يجوز لانه مال منتفع به في ثاني الحال ان لم يكن منتفعا به في الحال
والحيلة في جوازه باتفاق المشائخ ان يبيع الكمثرى اول ما تخرج مع اوراق الشجر فيجوز
فيها تبعا للاوراق كانه ورق كله وان كان بحيث ينتفع به ولو علفا للدواب فالبيع
جائز باتفاق اهل المذهب اذا باع بشرط القطع او مطلقا اه وفيه قوله وافتى الحلواني
بالجواز وزعم انه مروي عن اصحابنا وكذا حكي عن الامام الفضلي وقال استحسن فيه
لتعامل الناس وفي نزع الناس عن عادتهم حرج قال في الفتح وقد رأيت رواية في نحو هذا
عن محمد في بيع الورد على الاشجار فان الورد متلاحق وجوز البيع في الكل وهو قول مالك اه
وفيه بعد اسطر قلت لكن لا يخفى تحقق الضرورة في زماننا ولا سيما في مثل
دمشق الشام كثيرة الاشجار والثمار فانه لغلبة الجهل على الناس لا يمكن الزامهم
بالتخلص باحد الطرق المذكورة وان امكن ذلك بالنسبة الى بعض افراد الناس لا يمكن
بالنسبة الى عامتهم وفي نزعهم من عادتهم حرج كما علمت ويلزم تحريم اكل الثمار
في هذه البلدان اذ لا تباع الا كذلك والنبي صلى الله عليه وسلم انما رخص في السلم
للضرورة مع انه بيع المعدوم فحيث تحققت الضرورة هنا ايضا امكن الحاقه بالسلم
بطريق الدلالة فلم يكن مصادما للنص فلذا جعلوه من الاستحسان لان القياس عدم
الجواز والظاهر كلام الفتح الميل الى الجواز ولذا اورد له الرواية عن محمد بل تقدم
ان الحلواني رواه عن اصحابنا وما ضاق الامر الا اتسع ولا يخفى ان هذا مسوغ للعدول
عن ظاهر الرواية كما يعلم من رسالتنا المسماة نشر العرف في بناء بعض الاحكام على العرف
فراجعها قوله لو الخارج اكثر ذكر في البحر عن الفتح ان ما نقله شمس الائمة عن الامام
الفضلي لم يقيده عنه بكون الموجود وقت العقد اكثر بل قال عنه اجعل الموجود اصلا
وما يحدث بعد ذلك تبعا قوله جبرا عليه مفاده انه لا خيار للمشتري في ابطال البيع اذا

امتنع البائع عن ابقاء الثمار علی الاشجار وفیہ بحث لصاحب البحر والنھر سیذکرہ الشارح اٰخر الباب ونصہ فی اٰخر الباب ھکذا قال فی النھر ولا فرق یظھر بین المشتری والبائع فی رد المحتار اصلہ لصاحب البحر وحاصلہ البحث انہ ینبغی علی قیاس ھذا انہ لو باع ثمرۃ بدون للشجر ولم یرض البائع باعارۃ الشجر ان یتخیر المشتری ایضاً ان شاء ابطل البیع او قطعھا لان فی القطع اتلاف المال وفیہ ضرر علیہ الخ قولہ فتنبہ اشار بہ الی اختلاف التصحیح وتخییر المفتی فی الافتاء بایھما شاء لکن حیث کان قول محمد ھو الاستحسان یترجح علی قولھما تامل وفیہ تحت قولہ کما حررناہ فی شرحہ ما نصہ و حاصل الفرق کما فی الفتح وغیرہ ان الفاسد لہ وجود لانہ فائت الوصف دون الاصل فکان الاذن ثابتاً فی ضمنہ فیفسد بخلاف الباطل فانہ لا وجود لہ اصلاً فلم یوجد الاذن قولہ وان یشتری الخ، ھذہ حیلۃ ثانیۃ وبیانہ ان المشتری اما ان یکون مما یوجد شیئاً فشیئاً وقد وجد بعضہ اولم یوجد منہ شیئ کالباذنجان والبطیخ والخیار او یوجد کلہ لکنہ لم یدرک کالزرع والحشیش او یکون وجد بعضہ دون بعض کثمر الاشجار المختلفۃ الانواع، ففی الاول یشتری الاصول ببعض الثمن ویستاجر الارض مدۃ معلومۃ بباقی الثمن لئلا یامرہ البائع بالقلع قبل خروج الباقی او قبل الادراک، وفی الثانی یشتری الموجود من الحشیش والزرع ویستاجر الارض کما قلنا وفی الثالث یشتری الموجود من الثمر بکل الثمن ویحل لہ البائع ما سیوجد لان استیجار الارض لا یتاتی ھنا لان الاشجار باقیۃ علی ملک البائع وقیامھا علی الارض مانع من صحۃ استیجار الارض ج ۴ ص ۴۱ تا ۴۲

روایات بالا سے امور ذیل مستفاد ہوئے۔

۱۔ پھل جب تک نکل نہ آوے اس کی بیع مطلقاً ناجائز ہے، اور حیلہ سلم کا اس لئے نہیں ہوسکتا کہ اس میں مسلم فیہ کا وقت عقد کے اس جگہ پایا جانا شرط ہے۔

۲۔ پھل نکل آنے کے بعد بیع جائز ہے، اگر قابل انتفاع ہو تو اتفاقاً ورنہ اختلافاً،

۳۔ اگر کچھ ظاہر ہوا اور کچھ ظاہر نہیں ہوا اس کو امام فضلی نے جائز کہا ہے۔

۴۔ بعد صحت بیع کے بائع نے مشتری کو پھل کے درخت پر رہنے دینے کی اجازت دیدی صراحۃً یا دلالۃً تو پھل حلال رہے گا،

۵۔ اگر بائع اس اذن پر راضی نہ ہو تو بعض کے نزدیک مشتری بیع کو فسخ کرسکتا ہے۔

۶۔ جو پھل تھوڑا تھوڑا آتا ہو جیسے امرود تو بعض کے ظاہر ہونے کے بعد بیع درست ہے،

۷۔ اسی طرح گلاب وغیرہ کے پھولوں کا یہی حکم ہے کہ بعض کا ظاہر ہو جانا کافی ہے، اور اگرچہ احکام مذکورہ میں سے بعض میں اختلاف بھی ہے، مگر ابتلائے عام میں گنجائش ہی۔

زمین مع انبہ ٹھیکہ پر ہو تو اس کا پھل کھانا　**سوال** (۱۳۱) اگر کسی باغ کا ٹھیکہ مع زمین کے کاشت پر ہو اور اس کے ساتھ بہار باغ انبہ کا بھی ٹھیکہ ہو تو اس باغ کے آم کھانا جائز ہے یا نہیں۔

الجواب۔ نہیں (تتمۂ اولیٰ ص ۱۶۶)

ضمیمہ مضمون بالا

ان ثمار کے متعلق ہمارے اضلاع میں ایک رسم ہے کہ بائعِ ثمار مشتری سے ثمن کے علاوہ ایک مقدار خاص سے کچھ ثمر لینا بھی ٹھہرالیتا ہے، مثلاً پختگی پر ہم اتنے وزن سے ثمر کنار یا اتنی تعداد سے ثمر انبہ بھی تم سے لیں گے، اور وہ اس کو منظور کرلیتا ہے، اور وقت پر دیدیتا ہے کبھی یکبارگی اور کبھی متفرق کر کے، اور اس میں نزاع واختلاف بھی اکثر نہیں ہوتا، اور کبھی پھل کی پیداوار میں کمی ہوتی ہے تو بعض بائعین اس مقدار میں بھی کمی کر دیتے ہیں، اور اس کو اصطلاح میں جلتس کہتے ہیں، پس یہ مسئلہ بھی قابل بحث ہے، سو ایک توجیہ تو اس کے جواز کی اس کو استثناء میں داخل کرنے سے محتمل ہے مگر یہ اس لئے صحیح نہیں کہ اس تقدیر پر مشتری فی الفور بائع سے مطالبہ کر سکتا ہے، کہ اپنا پھل غیر مبیع میرے مبیع پھل سے تقسیم کر کے متمیز کر دو اور وہ انکار نہیں کر سکتا اور بائع اس کو ایک وقت خاص تک اس کی حفاظت کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا، حالانکہ یہ عرف اور شرط اور مقصود کے خلاف ہے،

اور ایک توجیہ یہ محتمل ہے کہ ثمن دو چیزوں کو کہا جاوے، ایک تو روپے کی رقم، دوسرا اتنا پھل، لیکن یہ اس لئے صحیح نہیں کہ ایک تو خود مبیع کے ایک جزو کو ثمن ٹھہرانا جائز نہیں، دوسرے اس صورت میں ثمن وقت بیع کے مقدور التسلیم نہیں، پس یہ دونوں توجیہیں قواعد پر منطبق نہیں ہوتیں، مگر اس میں ابتلاء عام ہے، اس لئے ضرورت معلوم ہوتی ہے اس کو کسی کلیہ پر منطبق کرنے کی، سو احقر کے خیال میں یہ توجیہ آتی ہے کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ بعد تکمیل بیع کے بھی تراضی

متاقدین سے ثمن میں بھی اور مبیع میں بھی زیادت جائز ہے، اور حط یعنی کمی بھی جائز ہے، جیسا
زیادہ کے خریدار کو کمیشن واپس کرنا جس کی حقیقت حط ثمن ہے عام طور سے رائج ہے، اسی
طرح اس کو حط مبیع میں داخل کہا جاوے، یعنی بیع تو ہوگئی کل کی، مگر بیع میں یہ شرط ٹھہر گئی کہ
مشتری اس قدر مبیع پھر بائع کو فلاں وقت واپس کردے گا، اور ہر چند کہ وقت کی شرط
قواعد سے اس پر لازم نہیں، مگر فقہ میں اس کی بھی تصریح ہے، کہ جو وعدہ ضمن عقد میں ہو وہ
لازم ہو جاتا ہے اس لئے اس کو لازم بھی کہا جاویگا، اب صرف اس میں دو شبہے رہ گئے۔ ایک یہ کہ
شاید اتنا پیدا نہ ہو، دوسرے اگر پیدا بھی ہو تو اس کے احاد متفاوت ہوتے ہیں تعیین کیسے
ہوگی، جواب اس کا یہ ہے کہ ہم اس کا التزام کریں گے کہ یہ مقدار جنس کی اتنی ہونا چاہئے کہ
اس میں یہ شبہہ نہ رہے، اور تفاوت کا تدارک یہ ہے کہ مؤدی کا وصف بیان کردیا جاوے
کہ بڑا ہوگا یا چھوٹا، یا مخلوط، جس میں نزاع نہ ہو، اور جہالت یسیرہ کا بہت جگہ تحمل کرلیا گیا ہے فقط

اشرف علی یکم صفر ۱۳۳۴ھ

مضمون مذکور پر یہ سوالات کئے گئے جو مع اجوبہ ذیل میں منقول ہیں

سوال ۱، عبارت بالا کے شروع میں ہے "افتی الحلوانی بالجواز لو الخارج اکثر"
اور اس کے بعد ہے "قولہ وافتی الحلوانی بالجواز زعم انہ مروی عن اصحابنا وکذا حکی
عن الفضلی" ان عبارات سے معلوم ہوا ہے کہ قول بالجواز مشروط بخروج الاکثر ہے، لیکن امر
از امور مستفادہ میں یہ قید رہ گئی ہے اس سے اطلاق مفہوم ہوتا ہے،

الجواب، حلوانی کی اس قید کے خلاف امام فضلی سے منقول ہوا ہے جو اوپر کی اس
عبارت میں مذکور ہوا ہے ذکر فی البحر عن الفتح ان مانقلہ شمس الائمۃ عن الامام الفضلی الخ

تتمہ سوال ۱ نیز اس کے متعلق دریافت طلب یہ امر ہے کہ یہ صورت آیا ایک
ہی درخت کے ساتھ مخصوص ہے یا ایک باغ میں بھی جاری ہوگی، جب کہ اس کے اکثر درختوں
میں پھل آگیا ہو اور بعض میں بالکل نہ آیا ہو والظاہر ہو الاول،

الجواب، نعم الظاہر ہو الاول عند من اعتبر ہذا القید وقد علمت الکلام فیہ،

سوال ۲ لا یخفی تحقق الضرورۃ فی زماننا ولا سیما فی دمشق الشام کثیرۃ الاشجار
والثمار فانہ لغلبۃ الجہل علی الناس لا یمکن الزامہم بالتخلص باحد الطرق المشہورۃ الخ

وغیرہ عبارات منقولہ سے دو امر مستفاد ہوتے ہیں ایک یہ کہ عموم بلویٰ بھی قیاس کو چھوڑ دینے کے لئے کافی ہے، اور اس کا اثر صرف نجاست وطہارت تک محدود نہیں بلکہ تحلیل وتحریم پر بھی اس کا اثر ہے، کیونکہ تعامل مذکور فی العبارات المنقولۃ تعامل مصطلح تو ہے نہیں اس لئے کہ اول تو تعامل مصطلح اجماع کی قسم ہے، اور اجماع مجتہدین کا معتبر ہے، نہ کہ عام علماء وفقہاء کا، پھر اگر ہو بھی تو نہ تمام علماء کا عملاً اس کے جواز پر اتفاق ہوا ہے نہ قولاً تو لامحالہ تعامل مذکور بمعنی تعارف ہوگا، ویدل علیہ ایضا نص السلم اذ لا اجماع فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم بل ہناک الابتلاء العام وضرورۃ الناس والحرج فقط بلکہ اگر غور کیا جاوے تو تعامل قسم اجماع کوئی مستقل دلیل جواز نہیں بلکہ اصل وجہ تعامل وتعارف ناس ہے، پس جبکہ مجتہدین نے ابتلائے عام دیکھا اور ممانعت کو مفضی الی الحرج سمجھا جو کہ دلیل ہے جواز کی، اس لئے انہوں نے عملاً وقولاً او سکوتاً عوام سے اتفاق کیا، پس اصل دلیل جواز تعامل ناس ہی ہوا جو کہ سند اجماع ہے، دوسرے یہ کہ ترک قیاس کیلئے کسی خاص خطہ میں وہاں کے عوام کا ابتلائے عام جس کا انسداد مفضی الی الحرج اور قریب قریب ناممکن ہو کافی ہے، اس کی ضرورت نہیں کہ ابتلاء تمام عالم میں ہو کما یدل علیہ قولہ لاسیما فی دمشق الشام الخ اس کا ایک جواب سمجھ میں آیا تھا وہ یہ کہ اگر اصحاب مذہب میں سے کسی سے کوئی غیر ظاہر روایات بھی منقول ہو تو اس وقت عموم بلویٰ کا لحاظ کر کے اس پر فتویٰ دیا جا سکتا ہے، لیکن جبکہ کوئی روایت ہی نہ ہو تو ایسا نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس جواب میں یہ خدشہ ہے کہ یہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ اس روایت غیر ظاہرہ کے لئے کوئی اور وجہ علاوہ عموم بلویٰ اور ضرورت ناس کے ہو لیکن اگر ضرورت ناس اور حرج ہی اس کا سبب بھی ہو تو پھر وہی صورت پیدا ہو جاتی ہے، پھر عبارت والنبی صلی اللہ علیہ وسلم انما رخص فی السلم للضرورۃ مع انہ بیع المعدوم فحیث تحقق الضرورۃ ہہنا ایضاً امکن الحاقہ بالسلم بالدلالۃ فلم یکن مصادما للنص اس تاویل وتوجیہ سے آئی ہے، کیونکہ جب یہ اصول مقرر ہو گیا تو اس کی ضرورت نہ رہی کہ کوئی روایت اصحاب مذہب سے صریحاً منقول ہو کہ فلاں امر جائز ہے، کیونکہ صراحۃً ونصاً موجود نہ ہونے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان کے زمانہ میں ایسی صورت ہی پیش نہ آئی ہو یا پیش آئی ہو اور ضرورت ناس نہ ہو، اس لئے مطابق قیاس حکم بیان کیا گیا ہو اور تقدیراً تو مذکور ہے ہی، کیونکہ کلیہ کل ما تحققت الضرورۃ فیہ فہو جائز عندنا بدلالۃ نص السلم موجود ہے، پس اس کبریٰ کے ساتھ صغریٰ

سہلۃ الحصول ہذا ما تحقق فیہ الضرورۃ ملانے سے ہذا جائز عندنا بدلالۃ النص السلم نتیجہ صریح ہے۔ اگر کہا جاوے کہ ضرورت کی تشخیص وتقدیر کے لئے ضرورت ہے اجتہاد کی، تو یہ کچھ دل کو نہیں لگتا کیونکہ ابتلائے عام اور حرج مشاہدہ اور تجربہ سے معلوم ہو سکتا ہے اس کے لئے کسی اجتہاد کی ضرورت نہیں وایضا لایساعدہ نص السلم، پس اس اصول کی بنا پر بہت سے مسائل کے جواز کا حکم کرنا پڑے گا جیسے باغوں کا پھل آنے سے پہلے بیچنا وغیرہ،

الجواب، خود ضرورت عامہ دلیل مستقل نہیں، جب تک کسی کلیہ شرعیہ میں وہ صورت داخل نہ ہو جیسا عبارات مذکورۂ سوال میں صرف ضرورت کو جواز کے لئے کافی نہیں سمجھا بلکہ ضرورت کو داعی قرار دیا کسی کلیہ میں داخل کرنے کا مثل الحاق بالسلم وغیرہ کے، اور بیع قبل ظہور الثمار میں یہ الحاق ہو نہیں سکتا، اسی طرح کوئی دوسرا کلیہ بھی نہیں چلتا، فلا یقاس احدہما علی الآخر، اور سلم میں اس کا داخل نہ ہونا ظاہر ہے، کیونکہ اگر اشتراط وجود مسلم فیہ من وقت العقد الی حلول الاجل سے قطع نظر کر کے شافعی کا مذہب بھی لے لیا جاوے کہ ان کے نزدیک صرف وجود وقت الحلول کافی ہے، تب بھی یہ اس لئے سلم نہیں کہ اولاً مقدار ثمار کی متعین نہیں، ثانیاً کوئی اجل معین نہیں، ثالثاً اجل پر مشتری بائع سے مطالبہ نہیں کرتا، بلکہ بائع اول ہی سے اشجار کو مشتری کے سپرد کر دیتا ہے، اور وہ اسی وقت سے اس پر قابض ہو جاتا ہے، پھر خواہ ثمر قلیل ہو یا کثیر ہو اور خواہ نہ ہو، رابعاً اکثر ثمار عددی متقارب یا وزنی متماثل نہیں، خامساً اکثر پورا ثمن پیشگی یک مشت بھی تسلیم نہیں کیا جاتا، غرض یہ سلم کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

سوال ۳ تحریر فرمایا گیا ہے کہ احقر کے خیال میں یہ توجیہ آتی ہے الخ اس میں شبہ یہ ہے کہ حط وزیادۃ فی الثمن او فی المبیع اگرچہ بعد تمامی بیع ہوتا ہم اصل عقد کے ساتھ ملحق ہوتے ہیں یعنی پہلا ثمن اور مبیع، ثمن ومبیع نہیں رہتے، بلکہ ما بعد الزیادۃ والحط ہی اصل ثمن ومبیع قرار پاتے ہیں پس جبکہ یہ قاعدہ مسلم ہے تو اگر اصل عقد ہی میں حط مبیع متحقق ہو گیا، تو گو عملدرآمد اور قبض کسی وقت ہو لیکن یہ حط استثناء ہی سمجھا جاوے گا لان الاستثناء ہو اخراج الداخل وکذلک الحط اور اگر اس طرح شرط کی گئی ہے کہ اس وقت تو ہم کل تمہارے ہاتھ بیچ ڈالتے ہیں، لیکن وقت معہود پر تم کو اس قدر واپس کرنا ہوگا تو یہ ایک ایسی شرط ہے جو مقتضی عقد کے خلاف بھی ہے۔ لان مقتضاہ ہو استبداد المشتری بالتصرف فیہ کیف شاء، اور اس میں احد المتعاقدین کا نفع بھی ہے۔ پس شرط مذکور مفسد بیع ہوگی، رہا بعد تمام

البیع حط کا جائز ہونا، سو یہ مستلزم اس کے جواز اشتراط کو نہیں، چنانچہ بائع کا بعد قبض ثمن برضامندی مشتری مبیع کو کچھ عرصہ تک اپنے پاس رکھنا اور اس سے منتفع ہونا جائز ہے، مگر شرط جائز نہیں، اور حط فی نفس العقد استثنا ہے، فحیث مایجوز الاستثنا یجوز الحط والا فلا۔

الجواب، یہ شبہ صحیح ہے، لیکن بیع بشرط الوفا میں ایسے ہی اشتراط کو جائز کہا گیا ہے اگرچہ مقتضی عقد کے خلاف تھا، اور چونکہ بائع کا بعد قبض ثمن برضامندی مشتری مبیع کو اپنے پاس رکھنا اس میں ابتلا نہیں ہے، اس لئے اس میں کسی تاویل کی کوشش کی ضرورت نہیں اگر ابتلا ہوتا اور کوئی تاویل چل بھی جاتی تو اس میں بھی ایسا حکم کر دیا جاتا اور صرف ضرورت بدون تمشیہ کسی تاویل کے کافی نہیں کما مر فی الجواب عن ثانی الثانی فقط،

اشرف علی ۱۴ صفر ۱۳۳۴ھ (تزجیح ثالث ص ۲۲۵)

گنا پیدا ہونے سے پہلے اس کی خریداری کا حکم

سوال، (۱۳۲) آج کل یہ دستور ہوگیا ہے کہ پیداوار ایکھ یعنی رس کا معاملہ خرید ایسے وقت ہو جاتا ہے کہ کہیں ایکھ بوئی بھی نہیں جاتی ہے، کہیں کچھ کچھ بوئی جاتی ہے، اگر نہیں خریدی جاتی تو عین وقت پر جب کہ رس تیار ہو ملتی ہی نہیں ہے اس صورت میں خریداری کھنڈسال کی اجازت ہو سکتی ہے یا نہیں، اگر اجازت نہ ہو تو غالب کھنڈسال ہی نہ ہو یا بہت ہی زاید قیمت دینے پر شاید ملے۔

الجواب، عقد سلم میں بیع کا وقت میعاد تک برابر پایا جانا حنفیہ کے نزدیک شرط ہے۔ اگر یہ شرط نہ پائی گئی تو عقد سلم جائز نہ ہوگا، لیکن شافعیؒ کے نزدیک صرف وقت میعاد پر پایا جانا کافی ہے، کذا فی الہدایہ، تو اگر ضرورت میں اس قول پر عمل کر لیا جاوے تو کچھ ملامت نہیں رخصت ہے، ۲۷ رجب ۱۳۳۵ھ (تتمہ خامسہ ص ۱۵۱)

بیع بالوفا

بعض صورتیں جو بیع بالوفا سے مشابہ ہیں ناجائز ہیں

سوال (۱۳۳) زید اپنی جائداد غیر منقولہ عمرو کے ہاتھ چند شروط پر بیع کرتا ہے اولاً جائداد مذکورہ ایک مقررہ مدت تک (مثلاً دس یا پندرہ سال تک) موافق بیع کے عمرو کی کہلائے گی، ثانیاً اس کے کل منافع مدت معینہ تک عمرو ہی کے ہوں گے، ثالثاً تاریخ مشروط کے اختتام پر بائع ثمن معطی مشتری کو واپس دے کر مبیع لے لیگا، رابعاً بائع نے اگر تاریخ معینہ میں ثمن نہ دیا یا نہ دے سکا تو مبیع

مشتری کی ہو جائے گی، یہ بیع صحیح ہوگی یا نہیں، اگر نہیں تو کون سی قسم میں داخل ہے، اور مدت مقرر کر کے واپس لینا کیسا ہے، جمیع عرصہ کے کل منافع مشتری کے لئے جائز ہوں گے، یا ربوا ثمن وقت معینہ میں ادا کرنے کی صورت میں پکے طور پر مبیع مشتری کی ہو جاتی ہے، اس کے پیشتر معاملہ مذبذب رہتا ہے، ایسا معاملہ کیسا ہے،

الجواب ۔ یہ شرائط موجب فساد بیع ہیں، اس لئے یہ عقد حرام ہے، آگے ربنا، الفاسد علی الفاسد یہ صورت بگاڑی ہوئی بیع بشرط الوفا کی ہے، مگر اس کا طریق دوسرا ہے پھر وہ بھی اصل مذہب میں جائز نہیں۔

۹ جمادی الاخریٰ ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۳۹)

حکم بیع بالوفاء | **سوال**، (۱۳۴) ایک شخص زید اپنا گاؤں فروخت کرتا ہے، لیکن اس شرط پر کہ ایک میعاد معین کے اندر اگر زر ثمن واپس کر دے، تو گاؤں مبیعہ واپس لے لے ایسا معاملہ اور استفادہ اس گاؤں سے مشتری کو شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

۲ ایک شخص اپنے گاؤں کو واسطے اطمینان قرضہ کے دائن کے قبضہ میں دیتا ہے، اور یہ معاہدہ ہوتا ہے، فریقین میں کہ تا ادائیگی قرضہ کے وہ اس گاؤں پر قابض اور متصرف رہے اور اس کا انتظام اور حفاظت اور سرکاری مطالبہ اور جملہ نفع ونقصان جو کچھ بھی ہو وہ ذمہ دائن کے ہوگا، مدیون کو نفع ونقصان سے کچھ سروکار نہ ہوگا، اور حال یہ ہے کہ ایسی صورت میں بظاہر اکثر فائدہ اور گاہے نقصان ہوتا ہے۔ مثلاً خشک سالی ہو جاوے، مزارعان فرار ہو جائیں، سرکاری مطالبہ دینا پڑے۔ لہذا ایسا معاملہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، صورت مندرجہ سوال اول ظاہراً بیع وقصداً رہن ہے، اور صورت مندرجہ سوال ثانی صریح رہن ہے، سو رہن صریح میں تو اگر انتفاع مرتہن کا مشروط یا معروف ہو بلا اختلاف حرام ہے، فی الدر المختار ثم نقل عن التهذيب انه يكره للمرتهن ان ينتفع بالرهن وان اذن له الراهن قال المصنف وعليه يحمل ما عن محمد بن اسلم من انه لا يحل للمرتهن ذلك ولو بالاذن لانه ربوا قلت وتعليله يفيد انها تحريمية فتامله اه قلت هذا في المشروط وقد تقرر ان المعروف كالمشروط اور رہن قصداً و بیع ظاہراً کو بیع الوفاء کہتے ہیں سو اصل قواعد مذہب کی رو سے یہ بھی رہن ہے، اور انتفاع اس سے حرام ہے اور اگر وہ بیع ہے تو

بوجہ مشروط ہونے کے بیع فاسد ہے، تب بھی حرام ہے، لیکن بعض متاخرین نے اجازت دی ہے، پس بلا اضطرار شدید تو اس کا ارتکاب نہ کرے، اور اضطرار شدید میں بائع کو اختیار ہے کہ فتویٰ متاخرین پر عمل کرے، اگرچہ مشتری کو کوئی اضطرار نہیں، والتفصیل فی الدر المختار قبیل کتاب الکفالۃ، فقط واللہ اعلم،

یکم ذی الحجہ ۱۳۲۰ھ (امداد ج ۳ ص ۸۸)

حکم مواضعت قبل عقد در بیع الوفا،

سوال، (۱۳۵) فتاویٰ قاضی خاں ج ۲ ص ۳۸۴ مطبوعہ نول کشور میں ہے۔ واختلفوا فی بیع الوفاء او البیع الجائز الی ان قال وان ذکر البیع من غیر شرط ثم ذکر الشرط علی وجہ المواعدۃ جاز البیع ویلزمہ الوفاء بالوعد لان المواعدۃ قد تکون لازمۃ لحاجۃ الناس اھ اس عبارت کا مطلب کیا ہے آیا یہ بھی جائز ہے کہ بائع سے مشتری کہدے کہ تم بیع تو ہمارے ساتھ بلا شرط کر دو، مگر ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ اتنی مدت میں اگر تم چاہو گے تو ہم تمہاری شے اسی قیمت میں واپس کر دیں گے یا اس قدر نفع کے ساتھ تمہارے ہاتھ بیچ ڈالیں گے اس پر بائع رضامند ہو جاوے، اور کہدے کہ میں نے بلا شرط تمہارے ہاتھ فلاں شے اتنی قیمت میں بیچی، مشتری قبول کرے اور وعدہ کی پختگی کے لئے دستاویز لکھدے یا صرف یہی جائز ہے کہ بیع بلا شرط بلا کسی قرارداد کے ہو اور بعد البیع مشتری بائع کی درخواست پر یا بلا درخواست واپس کر دینے کا وعدہ کرے، صرف دوسری صورت کے جواز سے حاجت ناس مندفع نہیں ہوتی، کیونکہ اول تو بائع کا واپسی کی درخواست کرنا ہی مستبعد ہے جبکہ وہ بلا توقع واپسی کے بیع کر چکا ہے، دوسرے مشتری کا ایسی درخواست کو مان لینا یا اپنی طرف سے وعدہ میں پیش قدمی کرنا اور بھی مستبعد ہے، اس سے حاجت ناس مندفع نہیں ہوتی۔

الجواب، آپ کا شبہ صحیح ہے واقعی بدون اس کے کہ عقد کے قبل یا عقد کے ساتھ شرط وفا کا ذکر کیا جاوے، حاجت مندفع نہیں ہوتی، اور ان دونوں صورتوں میں اصل مذہب فساد عقد ہے، کما فی الدر المختار ثم ان ذکرا الفسخ فیہ او قبلہ اوزعماہ غیر لازم کان بیعا فاسدا ولو بعدہ علی وجہ المیعاد جاز ولزم الوفاء بہ الخ اور بعض کے نزدیک عقد کے قبل ذکر کی ہوئی شرط کا اعتبار ہی نہیں اور عقد

فاسد نہ ہوگا، لیکن وہ بیع بشرط الوفا نہ ہوگی، کما فی الدر المختار لو تواضعا علی الوفاء قبل العقد ثم عقدا خالیا عن شرط الوفاء فالعقد جائز ولا عبرۃ للمواضعۃ ج ۴ ص ۲۸۱ لیکن کثیر من المتاخرین کا فتویٰ ہے کہ قبل عقد ذکر کی ہوئی شرط بھی معتبر اور عقد جائز ہے لضرورۃ الناس وفی رد المحتار وقد سئل الخیر الرملی عن رجلین تواضعا علی بیع الوفاء قبل عقدہ وعقد البیع خالیا عن الشرط فاجاب بانہ صرح فی الخلاصۃ والفیض والتتارخانیۃ وغیرھا بانہ یکون علی ما تواضعا، ج ۴ ص ۱۸۷، فقط ۱۷ رمضان ۱۳۳۳ھ

سوال، پہلے سوال کے جواب کے ضمن میں ارشاد ہوا ہے لیکن کثیر من المتاخرین کا فتویٰ ہے کہ قبل ذکر کی ہوئی شرط معتبر اور عقد جائز ہے، لضرورۃ الناس وفی رد المحتار وقد سئل خیر الرملی عن رجلین تواضعا علی بیع الوفاء قبل عقدہ وعقد البیع خالیا عن الشرط فاجاب بانہ صرح فی الخلاصۃ والفیض والتتارخانیۃ وغیرھا بانہ یکون علی ما تواضعا ج ۴ ص ۱۸۷، انتھیٰ، اس میں دریافت طلب یہ امر ہے کہ خیر رملی کے جواب سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں نہ تو اس بیع کا جواز ہی معلوم ہوتا ہے اور نہ عدم جواز ہی کیونکہ یکون علی ما تواضعا سے صرف اس قدر ظاہر ہوا کہ مواضعت پیشین غیر معتبر نہیں ہوگی کما زعمہ البعض بلکہ معتبر ہوگی اور عقد صورۃ مطلق عن الشرط ہوگا ومعنی مقید بہ مگر یہ نہ ظاہر ہوا کہ یہ عقد جو صورۃ مطلق عن الشرط ومعنی مقید بالشرط ہو بنا علی اصل المذہب فاسد ہے یا لضرورۃ الناس جائز، ایسی حالت میں اس کے نقل کرنے سے جو مقصد ہے وہ معلوم نہ ہوا۔

الجواب، واقعی یہ عبارت جواز عقد سے ساکت ہے، مقصود زیادہ اس کے نقل کرنے سے شرط کے معتبر ہونے پر استدلال ہے، بمقابلہ زعم بعض کے، اور جواز عقد کی دلیل لضرورۃ الناس ہے اور نقلی دلیل اس کی دوسری روایات فقہیہ ہیں جن کی طرف لضرورۃ الناس میں اشارہ ہوگیا، مثلاً در مختار میں ہے فیھا القول السادس فی بیع الوفاء انہ صحیح لحاجۃ الناس فرارا من الربوا وقالوا ما ضاق علی الناس امرا لا اتسع حکمہ فی رد المختار قولہ فیھا ای فی البزازیۃ وھو من کلام الاشباہ، ج ۴ ص ۲۸۶

۲۹ رمضان ۱۳۳۳ھ (حوادث ثالثہ ص ۱۴۰)

جائز و ناجائز یا مکروہ معاملات بیع

آلات معاصی و مزامیر یا آلات سینما وغیرہ کی بیع

سوال (۱۳۶) (۱) اشیاء بجنے والی مثل گھونگرو ٹالی وغیرہ و اشیاء مستعملہ موسیقی مثل تار لوہا و پیتل وغیرہ و اشیاء مستعملہ ہنود مثل بندے و ستارے وغیرہ کسی مسلمان یا کافر کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

۲ - جو مسلمان یا کافر گانے ناچنے کا پیشہ کرتے ہیں ان کے ہاتھ کوئی سودا بیچنا درست ہے یا نہیں ؟

۳ - ایسے معاملات میں کافر اور مسلم برابر ہیں یا کچھ فرق ہے ؟

۴ - کفار شرک اگر اپنی عبادت گاہ کی تعمیر کے واسطے یا بتوں کی پرستش کے لئے کوئی چیز کسی مسلمان سے خریدیں یا کسی مسلمان کو اجرت پر رکھیں تو اس چیز کا ان کے ہاتھ فروخت کرنا یا اجرت لینا جائز ہے یا نہیں ؟

۵ - بتوں پر چڑھی ہوئی چیز مثل میوہ جات یا کوئی اور شئے پھر خرید کر اس کی تجارت کرنا یا اس کو خود کھانا اور استعمال میں لانا جائز ہے یا نہیں ، بینوا توجروا ۔

الجواب ۱ ، گھونگرو ٹالی وغیرہ کا استعمال اگر بغرض اظہار شان و شوکت ہو تو ناجائز ہے ، اور اگر اس کے باندھنے سے جانور کو چلنے میں نشاط اور آسانی ہوتی ہو یا راہ چلنے والوں کی اطلاع کی غرض سے کہ وہ سامنے سے ہٹ جاویں باندھا جاوے تو جائز ہے ، فی العالمگیریۃ الباب السابع عشر من الکراہیۃ قال محمد فی السیر فاما کان فی دار الاسلام دفیہ منفعۃ لصاحب الراحلۃ فلا باس بہ قال وفی الجوس منفعۃ جمۃ الخ

اور اشیاء مستعملہ موسیقی کا استعمال مطلقاً ناجائز ہے اور بندے و ستارے وغیرہ کا استعمال عورتوں اور لڑکیوں کے لئے جائز ہے گو پیتل وغیرہ کی ہوں ، ان چیزوں کی صرف انگوٹھی ناجائز ہے ، فی الدر المختار قبیل النظر والمس من کتاب الکراھیۃ ولا تتختم الا بالفضۃ فیحرم بغیرھا کحجر وذھب وحدید وصفر ورصاص وغیرھا لما مر فاذا ثبت کراھیۃ لبسھا للتختم یثبت کراھیۃ بیعھا و صنعھا لما فیہ من الاعانۃ علی ما لا یجوز وکل ما ادی الی ما لا یجوز لا یجوز اھ قلت ویستثنی الذھب ایضا

للنساء ویبقی الباقی علی العموم وفی رد المحتار تحت قولہ فیحرم لغیرھا من الجوھر والتختم بالحدید والصفر والنحاس والرصاص مکروہ للرجال والنساء اھ قلت وتخصیص التختم بیبیح لبسھا لا للتختم للنساء، جب وجوہ استعمال میں جائز و ناجائز کی تعیین ہوگئی تو اب حکم بیع کا جاننا چاہئے، سو اس باب میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جس چیز کی عین سے معصیت قائم ہو اس کا بیع کرنا ممنوع ہے، اور جس چیز میں تغیر و تبدل کے بعد معصیت کا آلہ بنایا جاوے اس کی بیع جائز ہے، گو خلاف اولیٰ ہے۔ فی الدر المختار فصل البیع من کتاب الکراھیۃ وجاز بیع عصیر عنب ممن یعلم ان یتخذہ خمرا لان المعصیۃ لا تقوم بعینہ بل بعد تغیرہ وقیل یکرہ لاعانتہ علی المعصیۃ بخلاف بیع امرد ممن یلوط بہ وبیع سلاح من اھل الفتنۃ لان المعصیۃ تقوم بعینہ فی رد المحتار فی تفصیل ھذہ العبارۃ وعلم من ھذا انہ لا یکرہ بیع مالم تقم المعصیۃ بہ کبیع الجاریۃ المغنیۃ والکبش النطوح والحمامۃ الطیارۃ والعصیر والخشب ممن یتخذ منہ المعازف اھ پس صورت مسئولہ میں گھونگرو تالی جب کہ تفاخر کے لئے مستعمل نہ ہوں، اور بندے ستارہ مطلقاً اور تار وغیرہ جو آلات موسیقی میں کام آویں خلاف اولیٰ فروخت کرنا جائز ہیں اور جواز و عدم جواز بیع میں مسلمان کافر کا ایک حکم ہے، فی رد المحتار فی المقام المذکور والاصح خطابھم وعلیہ فیکون اعانۃ علی المعصیۃ فلا فرق بین المسلم والکافر فی بیع المعصیۃ بینھما اھ،

(جواب سوال دوم) جائز نہیں جب کہ ظاہراً اسی آمدنی سے دام دیں فی الدر المختار۔ فصل البیع من الکراھیۃ وجاز اخذ دین علی کافر من ثمن خمر لصحۃ بیعہ بخلاف دین علی المسلم لبطلانہ اھ اقول علل الجواز بالصحۃ وحرمۃ الرقص والغناء عام فلا یثبت الجواز،

(جواب سوال سوم) برابر ہیں جیسا گذر چکا،

(جواب سوال چہارم) امام صاحب کے نزدیک جائز ہے، صاحبین کے نزدیک ممنوع ہے، لہذا احتیاط بہتر ہے، اور جو کوئی غریب مبتلا ہو اس پر دارو گیر نہ کرے، فی الدر المختار بعد مسئلۃ العصیر وجاز تعمیر کنیسۃ وحمل خمر ذمی بنفسہ او دابتہ باجر لا عصرھا لقیام المعصیۃ بعینہ فی رد المحتار قولہ وحمل خمر

ذمی قال الزیلعی وھذا عندہ وقالا ھو مکروہ آہ

(جواب سوال پنجم) جائز نہیں لحرمتہ لعموم قولہ تعالیٰ وما اہل بہ لغیر اللہ واللہ اعلم،
۲۰ ذی الحجہ ۱۳۲۱ھ (امداد ثالث ص ۸)

تحقیق حدیث مصراۃ | **سوال** (۱۳۷) انا ندعی ان حدیث المصراۃ مخالف للقیاس الصحیح من کل وجہ ومثل ھذا اذا روی غیر الفقیہ یرد و بنوا علیہ ما بنوا لکن ھذا الحدیث قد رواہ صاحب الصحیح فی ص ۲۸۸ عن ابن مسعودؓ موقوفا ولما کان ھذا الحکم غیر مدرک بالرأی کما ندعی فالموقوف لہ حکم الرفع ایضًا والراوی لھذا فقیہ فلابد ان یترک القیاس لان الراوی فقیہ فما المناص عن ھذا؟

الجواب، ما قالوا فی حدیث المصراۃ لم یلصق بقلبی قط وانما الذی اری فیہ حمل ھذا الحدیث علی ما اذا اشترط الخیار فی العقد وقرینۃ ھذا الحمل ما ورد فی روایۃ من اشتری مصراۃ فھو منھا بالخیار ثلاثۃ ایام ان شاء امسکھا وان شاء ردھا ومعھا صاعا من تمر لا سمراء رواہ الجماعۃ الا البخاری کذا فی نیل الاوطار ج ۵ ص ۷۷، ۷۸، واما تخصیص الصاع من التمر فمحمول علی الصلح والمشورۃ فلم یخالف القیاس،

۱۰ ربیع الآخر ۱۳۳۲ھ (تتمہ رابعہ ص ۲۳)

اسٹامپ کی بیع | **سوال**، (۱۳۸) اگر کوئی شخص کاغذات اسٹامپ عدالت دیوانی کمیشن مقررہ لے کر فروخت کرے جن پر اکثر آدمی سود کا دعویٰ وغیرہ دائر کرتے ہیں ان کا فروخت کرنا کیسا ہے، اور کاغذات اسٹامپ عدالت فوجداری کے جن پر اکثر سود ولین دین کے دعوے لکھے جاتے ہیں ان کا فروخت کرنا کیسا ہے مفصل حال سے اطلاع بخشیں، بینوا توجروا،

الجواب، کاغذات اسٹامپ میں دو مقام میں کلام ہے، ایک یہ کہ فی نفسہ لیسنس دار کو ان کا بیچنا جائز ہے یا نہیں، اور دوسرے یہ کہ ایسے شخص کے ہاتھ بیچنا جو ان پر سودی مضمون لکھے گا، آپ نے امر ثانی کو پوچھا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اس بیع نا جائز نہیں ہوتی ہے اور چونکہ لکھنا باختیار کاتب ہوگا اسلئے کاغذ بیچنے والا معین نہ کہا جاویگا،
۲ ذی الحجہ ۱۳۲۶ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۵۷)

اسٹامپ کو اس کی مقررہ قیمت سے زائد پر فروخت کرنا

سوال، (۱۳۹) لیسنس دار جو اسٹامپ خزانہ سے بیچنے کیلئے لاتے ہیں تو ان کو ایک روپے پر تین پیسے کمیشن کے طور پر دیئے جاتے ہیں یعنی ایک روپے کا اسٹامپ سوا پندرہ آنہ پر ملتا ہے، اور لیسنس داروں کو یہ ہدایت قانوناً ہوتی ہے کہ وہ ایک روپیہ سے زائد میں اس اسٹامپ کو نہ بیچیں، اب قابل دریافت یہ بات ہے کہ اگر یہ شخص ایک روپے والے اسٹامپ کو مثلاً ایک روپے یا سترہ آنے میں فروخت کرے تو شرعاً جائز ہوگا یا ناجائز۔

الجواب، حقیقت میں یہ بیع نہیں ہے، بلکہ معاملات کے طے کرنے کے لئے جو عملہ درکار ہے اس عملہ کے مصارف اہل معاملات سے بدیں صورت لئے جاتے ہیں کہ انہی کے نفع کے لئے اس عملہ کی ضرورت پڑی اس لئے اس کے مصارف کا ذمہ دار انہی کو بنانا چاہئے اور لیسنس دار بھی مصارف پیشگی داخل کرکے اہل معاملہ سے وصول کرنے کی اجازت حاصل کرلیتا ہے، اور اس تعجیل ایفاء کے صلہ میں اس کو کمیشن ملتا ہے، پس یہ شخص عدالت کا وکیل ہے مبیع کا ثمن لینے والا نہیں، اس لئے مؤکل کے خلاف کرکے زائد وصول کرنا حرام ہوگا، فقط، ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۹ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۵۹)

سرکاری درختوں کا ملازم سرکار کو نیلام میں خریدنا

سوال، (۱۴۰) سرکاری درخت جو سڑک کے کناروں پر کھڑے ہوتے ہیں جس وقت خشک ہوجاتے ہیں نیلام کردیئے جاتے ہیں اور ان کی قیمت بحق سرکار داخل خزانہ ہوجاتی ہے، ایسے درخت یا عام طور پر کل سرکاری چیزوں کے لئے قانوناً ممانعت ہے کہ کوئی سرکاری ملازم خواہ کسی مرتبہ اور حیثیت کا ہو نیلام میں نہ خریدے، اگر کسی افسر نیلام کنندہ نے بلا رو رعایت ایک درخت کو نیلام کیا اور جلسہ عام میں جتنی قیمت اس کی بولی میں آسکتی تھی وہ بولی گئی اور پھر اس نے اخیر قیمت پر کچھ اضافہ کرکے دوسرے کے نام سے بولی بلوائی اور خود خرید لیا یعنی اتنی قیمت پر خریدا کہ پھر اس سے زیادہ کسی نے نہیں قیمت بڑھائی تو کیا اس نیلام کنندہ کا یہ فعل شرعی طور پر جائز ہوگا یا نہیں، اور اگر وہ ایسا کرچکا ہے تو اس درخت خرید شدہ کے ساتھ اب اس کو کیا کرنا چاہئے؟

الجواب، جب ممانعت ہے تو خریدنا جائز نہیں، البتہ یہ درست ہے کہ کوئی اور خریدے، پھر یہ ملازم اس سے خریدے مگر اس خریدار کے ساتھ رعایت درست نہیں، کہ

در حقیقت مقصود اپنے نفس کے ساتھ رعایت ہے فقط ۱۸ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۶)

مندروں کے اوقاف خریدنا

سوال (۱۴۱) چونکہ کفار کا مندروں وغیرہ پر وقف کرنا موقوف شئے کو ملک واقف سے خارج نہیں کرتا ہے پس اس صورت میں اس قسم کی کوئی زمین وغیر واقف سے خرید کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب - جائز ہے، (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۵)

مندروں کے وقف کو اس کے متولی سے خریدنا

سوال (۱۴۲) درصورت جواز کسی زمین کا جو کسی کافر نے اپنے اعتقاد کے مطابق کسی مندر پر وقف کر کے کسی دوسرے کافر کو اس زمین موقوف کا متولی بنا دیا ہو مگر وہ زمین بنجر ہونے کی وجہ سے مذکور متولی اس زمین کو فروخت کر کے مبلغ مذکور مندر کے لئے کسی دوسرے ذریعہ آمدنی میں داخل کر دینا چاہتا ہے، چونکہ یہ زمین آئندہ درست ہونے کی امید ہے بالفعل جو قیمت دی جائے گی اس سے بہت زیادہ قیمتی ہونے کی امید ہے، پس اس زمین کو کسی مسلمان کا متولی سے خرید کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۲ - درصورت جواز بصورتیکہ واقف کا کوئی وارث موجود ہو اور وہ اپنے اعتقاد کے موافق موقوف ملک خود کو کوئی حق نہیں خیال کرتا ہو متولی غیر وارث کے پاس سے خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، متولی مالک نہیں اس لئے اس سے خریدنا بدون اذن اصل مالک کے جائز نہیں۔

۲ - اس سے اوپر جواب گذر چکا، (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۵)

کافر نے جو برتن کسی مسلم سے اصل اور سود کے عوض خریدے ہوں دوسرے مسلم کو اس کی خریداری

سوال (۱۴۳) زید مسلم نے کسی ہندو مہاجن کے یہاں اپنا برتن رکھ کر کچھ قرض سودی لیا، زید نے کچھ مدت تک قرض ادا نہ کر سکنے کے بعد مہاجن سے کہدیا، یا اس کو مجبوراً کہنا پڑا کہ اب تم میرے برتنوں کو اصل مع سود کے معاوضہ میں لے لو، کیونکہ حساب لگانے سے اصل مع سود قیمت برتن سے کہیں زیادہ ہوگیا ہے، چنانچہ مہاجن نے اپنی رقم وصول کرنے کے لئے برتنوں کو خالد مسلم کے ہاتھ فروخت کر ڈالا، اب امر دریافت طلب یہ ہے کہ خالد مسلم کو ایسے برتنوں کا خریدنا جائز ہوگا یا نہیں،

جواب، جائز ہے،

سوال ضمیمہ سوال بالا، دوسرے یہ کہ اگر راہن غیر مسلم ہو تو مسئلہ کی کیا صورت ہوگی؟

جواب ضمیمہ جواب بالا، باقی واقعہ اگر یہی ہے تو یہی حکم ہے۔

سوال ضمیمہ سوال بالا، یا اگر زید نے اپنے برتنوں کی نسبت مہاجن سے کچھ نہ کہا ہو تو خالد کا مہاجن سے ان برتنوں کا خریدنا جائز ہوگا یا نہیں؟

جواب۔ ضمیمہ بالا، نہیں، ۷ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۱۳۹)

مریض کی فرمائش پر دوا تیار کرنا اور لاگت سے زائد قیمت لینا

سوال (۱۴۴) میرے پاس نسخہ آتشک کا نہایت مجرب ہے، ایک مدت سے میں نے سیکڑوں آدمیوں کو بنا دیا قریب قریب سب اچھے ہوگئے، طریقہ بنانے کا میں یہ کرتا رہا اور اب بھی کرتا ہوں کہ اصل قیمت سے زیادہ دام مریض سے لے لیا گیا، اور لے لیتا ہوں۔ اور باقی دام اپنے صرف میں لایا گیا اور لاتا ہوں اب تک اس طرف اس کے جائز اور ناجائز ہونے کا خیال نہ تھا، اب خود بخود یہ خیال ہے کہ اس طرح سے قیمت لے لینا جائز ہے یا ناجائز ہے، طبیعت کو کچھ کراہت سی محسوس ہوتی ہے، اگر ناجائز ہے تو آئندہ کے لئے تدارک ممکن ہے، مگر گذشتہ کے لئے جس کی تعداد سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کی ہوگی کیا تدارک ہو سکتا ہے، اور خدا جانے کہاں کہاں کے آدمی آئے اور دوا لے گئے، اطلاعاً گذارش ہے، جو ارشاد ہو اس پر عمل کیا جاوے۔

الجواب، اگر صاحب فرمائش کو اس امر کی اطلاع اور اطلاع کے بعد اذن و رضا ہو تب تو بچی ہوئی رقم صرف میں لانا جائز ہے، ورنہ ناجائز ہے، کیونکہ یہ معاملہ بیع نہیں تھا کہ دیئے ہوئے داموں کو ثمن کہا جاوے، کیونکہ بیع معدوم ہے، سلم و استصناع بھی نہیں، کیونکہ اس کے شرائط مفقود ہیں، اجارہ بھی نہیں کہ اجرت مجہول ہے، محض توکیل ہے اور وکیل محض امین ہے، پس بچی ہوئی رقم اصل صاحب فرمائش کی ملک ہے، اس لئے اس میں تصرف کرنا مشروط باذن ہے، باقی یہ کہ اہل حقوق غیر معلوم ہیں اور حقوق کی مقدار بھی مجہول، سو جہاں تک یاد آوے ادا یا طلب ابراء ضروری ہے، اور جو یاد نہ آوے تخمینہ کر کے مالکوں کی طرف سے ان داموں کا تصدق کیا جاوے، ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۱۰)

آب زمزم کی تجارت کا جواز

سوال (۱۴۵) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مکہ معظمہ سے آب زمزم تجارت کے واسطے لا سکتے ہیں یا نہیں؟ وہاں سے بھر بھر کر لائیں یہاں اس کی تجارت کریں اور مقصود یہ ہے کہ نفع بھی ہو اور ثواب بھی ملے، تو یہ صورت اس متبرک پانی کی تجارت کرنے کی جائز ہے یا نہیں؟ جائز ہونے کی صورت میں ہندو کافر کے ہاتھ بھی بیچ سکتے ہیں یا نہیں، مفصل جواب لکھیں،

الجواب، بظاہر اس تجارت سے کوئی امر مانع جواز نہیں، متقوم بھی ہے، احراز سے ملک میں بھی داخل ہو جاتا ہے، اور بلانکیر زمزمیاں بیچنے کا تعامل بھی ہے، جس میں دونوں جزو مبیع ہوتے ہیں، اور متبرک ہونا بھی مانع نہیں ہو سکتا، قرآن مجید سب سے زیادہ متبرک ہے، اور اس کی بیع و شرا سب جائز ہے، اور مشتری کا کافر ہونا بھی بظاہر مانع صحت بیع نہیں، ہاں احتمالاً محل احترام ہونے کی بنا پر خلاف اولیٰ یا مکروہ کہا جا سکتا ہے، باقی ثواب ہونا محتاج نقل ہے ولم اجد النقل،

۲۲ ربیع ثانی ۱۳۴۱ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۳۶)

مردار جانوروں یا مخلوط جانوروں کی چربی خریدنا

سوال، (۱۴۶) چربی کی تجارت کا دستور ہے، اور اس میں مرے ہوئے حلال جانوروں کی بھی چربی اور ذبح کئے ہوئے جانوروں کی بھی چربی ملا کر جلا کر خرید و فروخت کی جاتی ہے، یہ خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں، اور فقط مرے ہوئے حلال جانور کی چربی کی تجارت کا کیا حکم ہے، جائز ہے یا حرام؟

الجواب، مخلوط کا خریدنا اور اس سے انتفاع غیر اکل میں جائز ہے، جب کہ خالص حلال کی نہ ملتی ہو لیکن بیچنا جائز نہیں، اور صرف مرے ہوئے حلال جانور کی چربی کی بیع اور اس سے انتفاع ہر قسم کا حرام ہے، اور اگر حلال جانور کی چربی بدون قصد خلط بالنجس کے اتفاقاً نجس ہو جاوے تو اس کی بیع بھی جائز ہے، اور انتفاع بھی غیر اکل میں، فی الدر المختار وشعر الخنزیر الی قوله حتی لو لم یوجد بلا ثمن جاز الشراء للضرورة وکره البیع فلا یطیب ثمنه وفیه ونجیز بیع الدهن المتنجس والانتفاع به فی غیر الاکل بخلاف الودك فی رد المحتار ای دهن المیتة الخ ج ۵، ص ۱۷۵، ۱۷۶،

۹ ذیقعدہ ۱۳۳۰ھ (حوادث اول و ثانی ص ۶۲)

غیر طبیب کو دوائیں بیچنے کا حکم

سوال (۱۴۷) باوجود حکیم و طبیب باقاعدہ نہ ہونے کے اور باوجود تشخیص مرض وغیرہ کرکے علاج نہ کرنے کے کتب طب سے ادویہ مرکبہ و کشتہ جات کے نسخے دیکھ کر ان کا تیار کرنا اور ان کے اوصاف و اثرات کا اشتہار دیکر ان کی تجارت کرنا کیسا ہے؟

الجواب، نفع مشروط کو غیر مشروط بتانا حرام ہے، اس لئے یہ تجارت ناجائز ہے،

(النور، ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ ص ۱۰)

حکم بیع ٹکی جس کے جلانے سے سانپ کی تصویر بن جاتی ہے

سوال، (۱۴۸) انگریزی دوا سے ایک ٹکی تیار کی جاتی ہے اس کو ماچس سے جب جلایا جاتا ہے تو جل جل کر مثل زرد سانپ کے

نکلنا شروع ہوتا ہے اور دیکھنے میں وہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بل سے سانپ نکلتا آرہا ہے، حالانکہ وہ جلی ہوئی راکھ ہوتی ہے ایسی ٹکیاں بناکر فروخت کرنا کیسا ہے۔

الجواب، کیا یہ ٹکیہ بجز سانپ بنانے کے اور کسی کام میں آسکتی ہے، اگر ایسا ہے تو اس کا فروخت کرنا جائز ہے، آگے تصویر بنانے کے کام میں لانا یہ فاعل مختار کا فعل ہے، سبب کی طرف اس کی نسبت نہ ہوگی، اگرچہ خلاف تقویٰ اس صورت میں بھی ہے، اور اگر صرف اسی کام میں آتی ہے تو اعانت علی المعصیۃ کی وجہ سے فروخت کرنا حرام ہے، اور وہ معصیت سانپ کی تصویر بنانا ہے، اور تصویر کا سامان کرنا بحکم تصویر ہی ہے، جیسا فوٹو سے تصویر بنانے کا حکم ہے کہ تصویر خود اتر آتی ہے، مگر سامان مہیا کرتا ہے فوٹو گرافر،

۴ جمادی الاخری ۱۳۵۵ھ (النور ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ ص ۱)

بیع مرہون برضا مرتہن

سوال (۹۴۱) ایک ہندو کے دو بسوہ مسمیٰ غلام جیلانی خاں کے پاس بچاس پچاس سال کے واسطے رہن دخلی تھے، مسمیٰ زید نے اسی ہندو سے ان بسوؤں کا بیعنامہ لکھالیا، اور غلام جیلانی خاں کے روپے کی دہانید کرالی، اور اس خیال سے کہ شریعت محمدیہ میں شے مرہون سے نفع اٹھانا ناجائز ہے غلام جیلانی خاں کو آمادہ کرکے اقرار نامہ لکھالیا کہ از روئے شریعت کے پنچ جو فیصلہ کردیں گے فریقین کو قبول و منظور ہوگا، زید نے بعد اس کے عدالت سے یہ فیصلہ بھی حاصل کرلیا کہ مشتری یعنی زید بحیثیت مالک ہونے کے اور غلام جیلانی خاں بحیثیت مرتہن ہونے کے تحصیل وصول کرسکتے ہیں، اور جبکہ زید تحصیل وصول کرے تو غلام جیلانی خاں از روئے کاغذات پٹواری زید سے کل آمدنی سال بسال لے لیا کریں، فریقین میں اس کی بابت مدت تک نزاع رہا، پھر زید نے عمرو سے کچھ معاملہ تجارت کا کیا، اس کی بابت زید کے ذمہ کچھ روپیہ عمرو کا ہوگیا اسکی ادائی میں زید کو دشواری ہوئی، اس لئے انھیں دو بسوؤں کا بیعنامہ زید نے عمرو کے نام کردیا، اور وعدہ کیا کہ دو بسوؤں کی تحصیل وصول کرکے میں تم کو ادا کردیا کروں گا، اتفاق سے غلام جیلانی کا غصہ ہوا اور زید کو تحصیل وصول دشوار ہوئی، عمرو نے زید سے کہا کہ ہمارا روپیہ تو بالکل معرض تلف میں آیا چاہتا ہے، اس لئے ہمارے روپے کی کچھ سبیل ہونا چاہئے زید نے عمرو کے روپیہ کا یہ انتظام کیا کہ ایک دوسرے کھیت کا عمرو کے نام بیعنامہ کردیا، یہ کھیت دو بسوؤں سے علیحدہ ہے اور یہ اقرار کیا کہ مبلغ ایک سو باسٹھ روپے جو فاضل رہتے ہیں ان کو ادا کردوں گا، اس کھیت کے بیعنامہ کے وقت یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ کھیت ایک کایستھ کو پاس

ایک روپیہ ماہواری سود پر رہن ہے، چنانچہ یہ روپیہ کالستھ کا مع سود کے عمرو کو دینا پڑا اب یہ ارشاد ہو کہ یہ تینوں بیعنامے از روئے شریعت محمدیہ جائز ہوئے یا نہیں، فقط

الجواب، بیع اول جو کہ درمیان ہندو اور زید کے ہوئی وہ بحالت مرہون ہونے اس زمین کے ہوئی ہے، اور چونکہ غلام جیلانی مرتہن اس بیع پر رضامند ہے لہذا وہ بیع صحیح اور نافذ ہوگی، وہو الشرط فی صحۃ بیع المرہون، اور زر رہن غلام جیلانی کا بذمہ ہندو کے تھا ہے اور زر ثمن ہندو کا بذمہ زید چاہیے، اور زید نے جو زر رہن کا دینا اپنے ذمہ رکھ لیا یہ حوالہ ہے اور چونکہ زید اور غلام جیلانی و ہندو سب اس حوالے پر راضی ہیں۔ لہذا یہ حوالہ بھی صحیح ہو گیا، وہو الشرط فی صحۃ الحوالۃ۔ اور غلام جیلانی نے جو کچھ روپیہ اس رہن سے وصول کیا ہے، اس کا حکم چونکہ پوچھا نہیں گیا لہذا قلم انداز کیا جاتا ہے، اور چونکہ اس بیع پر رضا المرتہن سے رہن ٹوٹ چکا ہے، لہذا غلام جیلانی مرتہن نہیں رہا، لہذا یہ فیصلہ عدالت کا شرعاً جائز نہیں۔ البتہ حوالہ کی وجہ سے غلام جیلانی زید سے اپنے زر رہن کا مطالبہ کر سکتا ہے، اور جس طرح بن پڑے وصول کر سکتا ہے، یہ کلام تھا بیع اول میں، اور بیع ثانی جو کہ درمیان زید کے اور عمرو کے ہوئی اس کی صحت بالکل ظاہر ہے اور یہ وعدہ کہ بسوؤں کی تحصیل کرکے الخ محض لغو ہے، بلکہ اگر یہ شرط داخل عقد ہوتی تو بیع کو فاسد کر دیتی، مگر سوال میں یہ امر مجمل اور مبہم رہ گیا کہ زید کے ذمہ جو روپیہ عمرو کا تھا ان دو بسوؤں کا بیعنامہ اس روپے کے عوض میں برابر سرابر ہوا یا اس سے زائد روپیہ کی عوض میں ٹھہرایا اس سے کم روپے کی عوض میں ٹھہرا، برابری اور بیشی کی صورت میں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر کھیت کا بیعنامہ کرکے بیع اول کا اقالہ کیا گیا یا نہیں، اور کمی کی صورت میں آیا وہ کمی اس کھیت کی بیع سے پوری ہوئی یا نہیں، اگر ہو گئی تو فاضل روپے کے کیا معنی، اس ابہام کے سبب بیع ثالث پر مفصل کلام نہیں ہو سکتا، مجملاً اس قدر لکھا جاتا ہے، اگر یہ کالستھ اس بیع پر راضی تھا تو بیع صحیح ہو گئی اور رہن فسخ ہو گیا، اور کالستھ کا دین عمرو کے ذمہ نہیں تھا، اور اگر یہ اس ادا میں مجبور تھا تو جس قدر روپیہ کالستھ کو دیا ہے وہ زید سے وصول کر سکتا ہے، واللہ اعلم، ۹ ذیقعدہ ۱۳۲۵ھ (امداد ثالث ص ۴۲)

مرتہن کا ثمار مرہونہ کو خرید و فروخت کرنا

سوال (۱۵۰) باغ مرہون کے پھل مشتری کو جائز ہیں یا نہیں، اگر ناجائز ہیں تو کیوں، اس لئے کہ مرتہن تو ماموں ہے کہ اثمار فروخت کر کے

قیمت جمع رکھے اور شے مرہون کے ساتھ واپس کرے، پھر اس کا خرید نا اور کھانا کیوں ممنوع ہے، رہا فسادِ عقد سو مشتری بہ بیع فاسد کا ہدیہ جائز ہے۔

الجواب، مرتہن کے مامور بالبیع ہونے میں راہن کا وہ اذن معتبر ہے، جو بہ نیت تملک باطل مرتہن کے نہ ہو ورنہ وہ ربوا ہے، اور وہ اذن غیر معتبر ہے، لہٰذا وہ تصرف شے غیر مملوک میں ہوگا، جس طرح متعارف سود میں ماہوار بنام نہاد سود دیا جاوے حالانکہ بر شے حساب اصل میں شمار کیا جانا واجب ہے، مگر پھر بھی جب تک اس نام سے لیا جاوے گا محرم الاستعمال ہے، بخلاف مقیس علیہ کے کہ وہ تصرف اپنی ملک میں ہے، اس لئے مقیس میں مشتری کے لئے بھی ناجائز ہے، اور مقیس علیہ میں ہدیہ لینا مثلاً جائز ہے، واللہ اعلم،

۲۰ ربیع الاول ۱۳۳۲ھ (امداد ثالث ص ۹۱)

کارخانوں کے نام فروخت کرنا

سوال (۱۵۱) برخوردار فلاں سلمہ کی خواہش ہے کہ مجھ کو کلکتہ کی دکان کا نام علیحدہ علیحدہ علاوہ اپنے بھائیوں کے دیدیا جاوے، اور مطبع فلاں سلمہ کو دیا جاوے مال کی برابری تقسیم چاہتے ہیں اس میں شرعاً جیسا کہ میں نے بذریعہ ہبہ نامہ تینوں لڑکوں کو برابر دیا ہے، اس میں کمی بیشی نہیں چاہئے، نہ میں دے سکتا ہوں، وہ کام اپنا علیحدہ کرنا چاہتے ہیں اس تقسیم میں صرف نام ان کو دینا شرعاً گناہ نہ ہوگا؟ اگر شرعاً کوئی گناہ نہ ہوا تو سوچوں گا کہ تقسیم کر دینا اچھا ہے، قانوناً نام تنہا ان کو دینے میں کچھ معاوضہ زر نقد ان کو دینا ہوگا، اور میں منجانب دیگر بھائیوں نابالغ بحیثیت پدر و ولی ہونے کے معاوضہ تجویز کر سکتا ہوں اور مال تقسیم تو غالباً برابر کرنے میں کچھ حرج نہ ہوگا،

الجواب۔ نام ایک حق محض ہے جو شرعاً متقوم نہیں اور اس کا عوض لینا بھی جائز نہیں کحق الشفعۃ لیکن علامہ شامی نے حموی سے بعض حقوق کے عوض لینے کے جواز کی بعض فروع سے تائید کی ہے۔ حیث قال لکن قال الحموی وقد استخرج شیخ مشائخنا نور الدین علی المقدسی حجۃ الاعتیاض عن ذلک فی شرحہ علی نظم الکنز من فرع فی مبسوط السرخسی وھو ان العبد الموصی برقبتہ لشخص وبخدمتہ لآخر الی قولہ ولکنہ اسقاط لحقہ بہ کما لو صالح موصی لہ بالرقبۃ علی مال دفعہ للموصی لہ بالخدمۃ لیسلم العبد لہ اھ قال فربما یشھد ھذا للنزول عن الوظائف بمال اھ، اس کے بعد حق شفعہ میں اور اس میں کچھ فرق کیا ہے، حیث قال ولقائل ان یقول ھذا حق جعلہ الشارع لدفع الضرر د

ذلک حق فیہ صلۃ ولا جامع بینہما فافترقا و ھو الذی یظہر لی قولہ وھذا الکلام وجیہ لا یخفی علی نبیہ ثم ای قولہ ان عدم جواز الاعتیاض عن الحق لیس علی اطلاقہ ص ۶۱ ج ۲۷
اور نام کارخانہ بھی مشابہ حق وظائف کے ہے کہ ثابت علیٰ وجہ الاصالۃ ہے نہ کہ دفع ضرر کیلئے اور دونوں بالفعل امور اضافیہ سے ہیں، اور مستقبل میں دونوں ذریعہ ہیں تحصیل مال کے پس اس بنا، پر اس کے عوض دینے میں گنجائش معلوم ہوتی ہے گو لینے والے کیلئے لینا خلاف تقویٰ ہے، مگر ضرورت میں اس کو بھی اجازت ہو جاوے گی،

۲۰ ربیع الآخر ۱۳۳۴ھ (تتمہ رابعہ ص ۶۹)

حوادث الفتاوےٰ

جدید آلات اور جدید معاملات کے احکام

تجارتی کارخانوں کے ٹکٹ کی سلسلہ وار خرید و فروخت

سوال (۱۵۲) آجکل بعض انگریزی تجارتوں کا یہ حال ہے کہ کاغذ فروخت کرتے ہیں، اور اس میں چار ٹکٹ لگے ہوتے ہیں، جس کو وہ شخص اسی قیمت کو مثلاً ایک روپے پر چار اشخاص کے ہاتھ فروخت کر ڈالتا ہے، اور ان اشخاص سے وہ روپیہ وصول کر کے اور ان کا پتہ کمپنی کو لکھ کر بھیج دیتا ہے، صاحب کمپنی ایک گھڑی اس شخص کو بھیجتا ہے اور ان چار اشخاص کے نام ایک ایک کاغذ ویسا ہی بھیج دیتا ہے، جس میں ویسے چار ٹکٹ بھی ہوتے ہیں جسکو وہ چاروں شخص لوگوں کے ہاتھ اسی قیمت کو مثلاً ایک روپیہ کو پھر بیچ ڈالتے ہیں، جب روپیہ ان لوگوں کے پاس آجاتا ہے تو وہ لوگ بھی صاحب کمپنی کے نام روپیہ اور جن کے ہاتھ وہ ٹکٹ فروخت کئے ہیں ان کا پتہ وغیرہ لکھ کر بھیج دیتے ہیں، صاحب کمپنی ایک ایک گھڑی ان کے نام بھیج دیتا ہے، اور ایک ایک کاغذ ویسا ہی جن کے نام انھوں نے ٹکٹ فروخت کئے ہیں صاحب کمپنی بھیج دیتا ہے، پھر وہ لوگ بھی ویسا ہی عمل کرتے ہیں، اور اسی طرح اجرار رہتا ہے، ہاں البتہ جس شخص کے ٹکٹ فروخت نہ ہوں گے وہ البتہ نقصان اٹھاوے گا تو شرعاً یہ بیع جائز ہے یا نہیں اور شرعاً ایسا کرنا کیسا ہے؟

الجواب ، حاصل حقیقت اس معاملہ کا یہ ہے کہ بائع مشتری اول سے بلا واسطہ اور دوسرے مشتریوں سے بواسطہ مشتری اول یا ثانی یا ثالث وغیرہم کے یہ معاہدہ کرتا ہے کہ جتنے

ف یہ سوال غلطی سے مکرر درج ہو گیا۔ پہلے صفحہ ۹۰ پر یہ سوال و جواب آچکا ہے۔ "نعمانی"

جو روپیہ بھیجا ہے اگر تم اتنے خریدار پیدا کر لو تو اس روپے مرسلہ کے عوض ہم نے تمہارے ہاتھ گھڑی فروخت کر دی ورنہ تمہارا روپیہ ہم ضبط کر لیں گے، سو اس میں دونوں شرطیں فاسد اور باطل ہیں، دوسرے خریداروں کے پیدا کرنے کی تقدیر پر فروخت کرنا بھی کہ وہ تنجیز بیع کے وقت (مقرون بشرط فاسد مخالف مقتضائے عقد ہونے کی وجہ سے) عقد فاسد بحکم ربوا ہے، اور تعلیق کے وقت (تعلیق الملک علی الخطر ہونے کی وجہ سے) قمار ہے اور ربوا اور قمار دونوں حرام ہیں، اسی طرح دوسری شرط یعنی خریدار نہ پیدا کرنے کی تقدیر پر روپیہ کا ضبط ہو جانا بھی کہ صریح اکل بالباطل ہے، اور یہ تاویل ہرگز مقبول نہیں ہو سکتی کہ روپیہ کے عوض ٹکٹ دیا ہی کیونکہ ٹکٹ یقیناً مبیع نہیں ہے، ورنہ بعد خرید ٹکٹ معاملہ ختم ہو جاتا ٹکٹ فروخت کر کے گھڑی کا استحقاق ہرگز نہیں ہوتا، جیسا تمام عقود میں یہی ہوتا ہے، پس صاف ظاہر ہے کہ ٹکٹ بیع نہیں ہے، بلکہ روپیہ کی رسید ہے، جب دونوں شرطوں کا فاسد اور باطل ہونا ثابت ہو گیا تو ایسا معاملہ بھی بالیقین حرام اور متضمن ربوا اور قمار و اکل بالباطل ہے، اور کسی طرح اس میں جواز کی گنجائش نہیں، قال اللہ تعالیٰ احل اللہ البیع وحرم الربوا، وقال اللہ تعالیٰ انما الخمر والمیسر الی قولہ رجس من عمل الشیطان الآیۃ وقال اللہ تعالیٰ ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الآیۃ، وقال صلی اللہ علیہ وسلم کل شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل ونھی علیہ السلام عن بیع وشرط فی جمیع الکتب الفقھیۃ صرحوا بعدم جواز بیع مشروط بما لا یقتضیہ العقد ولا یلائمہ وفیہ نفع لاحدھما کما لا یخفی علی من طالعھا واللہ اعلم۔ (حوادث اول و ثانی ص ۸۲)

جواز خرید نیلام

سوال، (۱۵۳) نیلام سرکاری خریدنا جائز ہے یا نہیں، وجہ شبہ یہ ہے کہ بائع اور، اور مبیع اور کی

الجواب، فی الدر المختار فصل الحبس وابد حبس الموسر لانہ جزاء الظلم قلت وسیجیٔ فی الحجر انہ یباع مالہ لدینہ عندھما وبہ یفتی وحینئذ فلا تابید بل تبینہ ثم قال فی کتاب الحجر لا یبیع القاضی عرضہ ولا عقارہ للدین خلافا لھما وبہ ای بقولھما ببیعھما للدین یفتی اختیار وصححہ فی تصحیح القدوری اس کی حق واجب کے استیفاء کے لئے کسی کا مال نیلام کر دینا حاکم کو بقول صاحبین کے جائز ہے، اور اس کے مفتی بہ ہونے کے سبب اسی پر عمل ہے۔ (تتمہ اولیٰ ص ۱۵۱)

حکم نیلام حاکم

سوال (۱۵۴) جو چیز کہ نیلام ہوتی ہے تو وہ غیر کی ہوتی ہے، اور کم دام میں فروخت ہوتی ہے، تو اس کا خریدنا جائز ہے یا نہیں، مسجد یا غیر کے لئے یا اپنے لئے، بینوا توجروا۔

الجواب، خریدنا جائز ہے، اما اذا کان برضاء المالک فظاھر واذا کان بغیر رضاہ فان کان البائع حاکما مسلما فلما فی الدر المختار لایبیع القاضی عرضہ ولا عقارہ للدین خلافا لھما وبہ یفتی اختیار وصححہ فی تصحیح القدوری وفی رد المحتار ومسئلۃ فی الملتقی (ج ۴، ص ۱۴۵) وان کان حاکما غیر مسلم فلو لنفسہ فالجواز للاستیلاء لانہ بہ یتملک فیبیع ملک نفسہ ولو لغیرہ فالجواز للضرورۃ کما فی رد المحتار فی نفاذ قضاء المرتشی مانصہ وینبغی اعتمادہ للضرورۃ فی ھذا الزمان والا بطلت جمیع القضایا الواقعۃ الآن الی قولہ فیلزم تعطیل الاحکام وفیہ لو اعتبر العدالۃ لانسد باب القضاء فکذا یقال ھھنا (ج ۴، ص ۱۴۱) قلت فکما حکم بالنفاذ مع قیام المانع ھھنا یحکم فیما نحن فیہ کذلک، فقط، ۸ شعبان ۱۳۳۳ھ (حوادث ثالث ص ۱۴۲)

درزیوں کی مشین قسطوں پر خریدنا

سوال (۱۵۵) خیاطوں میں یہ طریقہ بکثرت مروج ہے کہ کمپنی سے کپڑے سینے کی مشین قسط پر لیتے ہیں، یعنی مشین کمپنی سے لیتے وقت کمپنی کو ایک کرایہ نامہ تحریر کر دیتے ہیں، اور پانچ روپے ماہوار ادا کرتے ہیں، حتیٰ کہ قیمت مشین کی اصلی قیمت سے کچھ بڑھ جاتی ہے، مگر چونکہ یک مشت ڈیڑھ سو روپیہ دینا گراں معلوم ہوتا ہے، اور یہ ماہواری قسط پونے دو سو روپے کچھ معلوم نہیں دیتا، جب کہ پورا روپیہ ہو جاتا ہے تو بیع نامہ ہو جاتا ہے اور اگر پانچ روپے بھی باقی رہ جاتے ہیں تو کمپنی مشین زبردستی اٹھا لیتی ہے، تو اب یہ صورت اس طرح پر قسط وار روپیہ ادا کر کے جو کہ نقدی قیمت سے تیس چالیس روپیہ زیادہ ہوتا ہے درست ہے یا نہیں۔

الجواب، معاملہ مذکورہ ناجائز ہے، مگر ناجائز ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ ادھار میں قیمت زیادہ لے لی، کیونکہ نسیہ میں بہ نسبت نقد کے زیادہ قیمت لے لینا جب کہ مجلس عقد میں نقد یا ادھار ہونا متعین ہو جائے جائز ہے، بلکہ ناجائز ہونے کی وجہ دوسری ہے وہ یہ کہ یہ معاملہ یا بیع ہے یا اجارہ، اگر بیع ہے تو یہ شرط فاسد ہے کہ ادنیٰ جزو قیمت رہ جانے پر واپس کر لیں گے، اور ادا شدہ رقم کو کالعدم سمجھا جاوے گا، اور اگر اجارہ ہے تو یہ شرط فاسد ہے کہ زرِ کرایہ کے عوض میں بیع کر دیں گے، اور ایسا کوئی معاملہ شریعت میں نہیں کہ ایک صورت میں بیع ہو اور ایک صورت میں اجارہ، ۱۰ رجب ۱۳۳۱ھ (تتمہ خامسہ ص ۳۶۸)

خرچہ عدالت وصول کرنا اور حکومت کے نیلام کی صحت

سوال، (۱۵۶) عدالت جو خرچہ قانون (یا کبھی احیاناً رقم حرجہ) فریق ناکام سے کامیاب کو دلاتی ہے، شرعاً لینا جائز ہے یا نہیں، اگرچہ کل مصارف مقدمہ کا صرف قانونی خرچہ ملتا ہے، اور اکثر خرچہ نہیں ملتا، ہمارے مقدمہ کی جو صورت ہے کہ مجبوراً اپنے حق کی حفاظت کے لئے نالش کرنا پڑی، اور فریق مخالف کی طرف سے بالکل مخاصمانہ کاروائیوں کی وجہ سے بہت سے ہم کو مصارف برداشت کرنے پڑے، یہ کل مصارف ان کے اس واقعی شرعی حق سے جو بعد کامیابی ہم کو ادا کرنا چاہئے اگر ہم منہا کر لیں تو جائز ہوگا یا ناجائز؟ نیز یہ کہ مکان متنازعہ بدون ہماری کسی قسم کی کوشش کے (صمام ؟) کو مثلاً نیلام ہوگیا (ممکن ہے کہ خریدار نے کم بولی پر چھڑالیا ہو) لیکن آٹھ روز تک بولی ہوئی، ایک دن خود مکان پر عندالموقع ہوئی، لیکن اس سے زائد قیمت نہ لگی مدیون نے عذرداری کی کہ مالیت دوہزار کی ہے کم پر بدی گئی۔ مگر عدالت نے یہ عذر تسلیم نہ کیا خارج کردیا۔ پھر عذرداری کی کہ ہم سے رقم مطالبہ اب لیلی جائے، اور نیلام جو کہ کم کو ہوگیا ہے منسوخ کیا جائے، وہ بھی خارج ہوئی گویا عدالت نے قطعاً (صمام ؟) ہی کا مکان قرار دیا، اگر ہماری طرف سے مقدمہ نہ لڑایا جائے تو اتنی ہی رقم میں غیر کے ہاتھ قطعی بیع ہوچکا ہے، ایک حبہ بھی مدیون کو زائد نہ ملے گا، تو ہماری کامیابی کی صورت میں ہم اسی قدر قیمت مکان میں سے فریق مخالف کا حق شرعی ادا کرنے کے پابند ہوں گے یا اس کی قیمت مطلوبہ کے؟

الجواب، جب کسی کو اپنے حق کی حفاظت کے لئے بمجبوری نالش کرنا پڑے اور فریق مخالف کی طرف سے بالکل مخاصمانہ کاروائیوں کی وجہ سے بہت سے مصارف برداشت کرنا پڑیں تو اس صورت میں خرچہ کا روپیہ لینا بعض علماء کے نزدیک (منہم مولانا رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ) جائز ہے، یا اگر کسی حساب میں منہا ہوسکیں تو ان علماء کے نزدیک یہ بھی جائز ہوگا اور عدالت کا نیلام گو بلا رضائے مدیون ہو جاوے نافذ ہے، پس سب حسابوں میں اسی قیمت کا اعتبار ہوگا، جس پر وہ بحکم عدالت نیلام ہوا ہے، ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ

(حوادث اول و ثانی ص ۲۰)

حکم دعویٰ زوجہ ناشزہ برشوہر برائے نان و نفقہ گذشتہ و آئندہ و دعویٰ شوہر بر زوجہ بمائے بھتی و خرچہ مقد

سوال، (۱۵۷) حامداً و مصلیاً و مسلماً، اما بعد کیا فرماتے ہیں علمائے دین شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک زن و شوہر میں بعد نکاح تخمیناً پندرہ سال تک اتفاق و اتحاد قائم رہا

اور اب عرصہ تخمیناً نو سال سے نزاع قائم ہے، اور زن مذکورہ نے اپنے والدین کے مکان پر رہ کر اپنے شوہر سے مہر معجل بھی وصول کر لیا، دین مہر وصول کر لینے سے پہلے اور بعد شوہر مذکور اپنی زوجہ کو اپنے مکان پر بلانے کی ہر کوشش کرتا رہا تاکہ وہ حقوق زوجیت ادا کرے مگر زوجہ مذکورہ چند شرائط کے ساتھ آنا چاہتی ہے، یعنی یہ کہ میں نے جتنی مدت تک اپنے والدین کے گھر رہ کر کھایا ہے، اور پیا ہے، وہ ادا کر دے، اور آئندہ خورونوش کے ایسے انتظام پر مصر رہی کہ شوہر اپنی جائداد میرے نام منتقل کر دے یا مکفول کر دے تاکہ بروقت ضرورت میں جہاں چاہوں رہ کر وصول کرتی رہوں، حالانکہ یہ امر شوہر کے اختیار میں نہیں رہا تھا کیونکہ شوہر مذکور اپنی تمام جائداد وقف علی الاولاد کر چکا ہے، اور وقف نامہ کے ذریعہ سے زوجہ مذکورہ کے نان ونفقہ کا انتظام بھی اس کے حصہ شرعی کے موافق اس طرح کر دیا، کہ وہ شوہر کے گھر رہ کر نان ونفقہ وصول کرتی رہے، مگر اس انتظام کو زوجہ مذکورہ نے قبول نہیں کیا، نوبت بایں جا رسید کہ فریقین نے اپنا اپنا دعویٰ عدالت مجاز میں دائر کر دیا۔ شوہر کا یہ دعویٰ ہے کہ زوجہ دلائی جائے اور خرچہ مقدمہ کا دلایا جاوے۔ اور زوجہ کا یہ دعویٰ ہے کہ گذشتہ نان ونفقہ جو اپنے والدین کے گھر رہ کر کھایا ہے دلایا جاوے، اور آئندہ نان ونفقہ کا انتظام اس طرح پر شوہر کی جائداد سے کرایا جاوے کہ میں جہاں چاہوں رہ کر وصول کرتی رہوں، اب فریقین نے اپنے معاملات مذکورہ عدالت سے اٹھا کر سپرد ثالثی کر دیئے ہیں، جو ثالث صاحب مقبولہ فریقین مقرر ہوئے ہیں، اور فریقین چاہتے ہیں کہ معاملات مذکورہ بروئے شرع محمدی طے ہو جاویں معاملات مذکورہ بالا میں شرع محمدیؐ کا کیا حکم ہے؟ اور کیا فیصلہ بروئے شرع ہونا چاہیے؟

الجواب: زوج کا دعویٰ صحیح ہے، زوجہ دلائے جانے کا تو بالاتفاق، اور خرچہ دلائے جانے کا علی الاختلاف بین العلماء اور زوجہ کا دعویٰ باطل ہے، کیونکہ یہ ناشزہ[عہ] ہے، اور ناشزہ کا نفقہ زمانِ نشوز کا واجب نہیں، البتہ مہر معجل ملنے سے پہلے کا نان ونفقہ واجب تھا، کیونکہ ہمبستری سے انکار کرنے کا حق امام صاحب کے نزدیک بعد تمکین کے بھی عورت کو حاصل ہے، اسی

عہ فی العقود الدریہ ص۵۷ جلد اول الناشزۃ ہی التی تخرج من منزل الزوج بغیر اذنہ فہذہ تسقط نفقتہا وکسوتہا کذا فی تاری الہدایہ وافتی ایضا بان لہا ان تمنع من النقلۃ، مع طلبیۃ لصداقہا الحال ما المنجم اوالمکسرۃ فلیس لہا الامتناع بسببہا فان امتنعت لسببہا فہی ناشزۃ لا نفقۃ لہا ولا کسوۃ ما دامت علی ذلک قال فی البحر المراد بالخروج کونہا فی غیر منزلہ بغیر اذنہ فیشمل ما اذا امتنعت عن المجیٔ الی منزلہ ابتداءً بعد ایفاء معجل مہرہا اھ ومثلہ فی النہر اھ ۱۲ منہ

طرح مرد کے گھر آنے سے انکار کرنے کا بھی، اور نفقہ واجب رہے گا، لیکن جو زمانہ گذر جاتا ہے، اس کا نفقہ ساقط ہو جاتا ہے، البتہ اگر بحکم حاکم یا برضامندی جانبین کوئی مقدار نفقہ کی متعین ہو جاوے تو درصورت وجوب نفقہ زمانہ گذشتہ کا بھی دلایا جاتا ہے، فی العالمگیریہ وان نشزت فلا نفقۃ لہا حتی تعود الی منزلہ والناشزۃ ھی الخارجۃ عن منزل زوجہا المانعۃ نفسہا منہ (ای بغیر حق)، ثم بعد اسطر وان کانت سلمت نفسہا ثم امتنعت لاستیفاء المھر لم تکن ناشزۃ فی قول ابی حنیفۃ کذا فی فتاوی قاضی خان، ثم بعد اسطر اذا تغیبت المرأۃ عن زوجہا اوابت ان تتحول معہ حیث یرید من البلدان وقد اوفاھا مھرھا، فلا نفقۃ لہا علیہ وان لم یعطہا مھرھا وباقی المسئلۃ بحالہا فلہا النفقۃ، ھذا اذا لم یدخل بہا وان دخل بہا فکذلک الجواب فی قول ابی حنیفۃ وفی الھدایۃ اذا مضت مدۃ لم ینفق الزوج علیہا وطالبتہ بذلک فلا شئ لہا الا ان یکون القاضی فرض لہا النفقۃ اوصالحت الزوج علی مقدار نفقتہا فیقضی لہا بنفقۃ ما مضی اھ یہ تفصیل تو عورت کے پہلے مطالبہ میں ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مہر مل جانے کے بعد کے زمانہ کا نفقہ تو واجب ہی نہیں، اور مہر لینے سے پہلے کا نفقہ واجب تھا، لیکن اگر اس کی کوئی مقدار پہلے سے عدالت یا رضا سے معین تھی، تو یہ واجب دلایا جاوے گا، ورنہ حاکم یا ثالث نہ دلاوے گا۔ آخرت کا مواخذہ باقی رہے گا، اور دوسرا مطالبہ عورت کا وہ محض باطل ہے عورت کا نفقہ آناً فآناً واجب ہوتا ہے اس کے عوض جائداد لکھ دینا شوہر پر واجب نہیں، لعشرین من ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۰۸)

ایک غیر مسلم شخص متوفی کا ترکہ اور ورثاء

سوال (۱۵۸) (الف) ایک غیر مسلم شخص مرا اور اس کا ترکہ اس کی بیوی کو پہنچا اس کے مرنے کے سات سال بعد ایک بیوی کے لڑکی ہوئی جسکو ڈاکٹروں نے اسی کا حمل بتلایا اور گورنمنٹ نے اس کو جائداد دلوادی، پھر اس لڑکی کے ایک لڑکا ہوا اور اس لڑکے کو اس کی نانی نے متبنیٰ کرلیا اس لئے وہ قابض جائداد کا رہا پھر اس مرنے والے کے ایک دُور کے رشتہ دار نے جائداد کا دعویٰ کیا اور وکیلوں کی معرفت ان ورثہ سے مقدمہ کیا اور محنتانہ وکلاء کا یہ ٹھہرا کہ اگر کامیابی ہوگئی تو کل جائداد میں سے ۹/۱۶ حصے وکیلوں کو دیں گے اور اس کا ایک معاہدہ لکھا گیا اتفاق سے اس وقت جائداد کا مقدمہ خارج ہوگیا اور زبانی وکیلوں سے معاہدہ فسخ کردیا گیا۔ مگر اس عہد نامہ کی واپسی یا

رسید وغیرہ نہیں لی گئی کچھ دن کے بعد اس دعویدار نے اپیل کیا اور اس میں اُس کو کامیابی ہوگئی تو اس رجسٹری شدہ عہدنامہ کی بنار پر وکیلوں نے اس سے ۹ حصہ زمین کا لے لیا اس زمین کو مسلمان مزارع پہلے سے کاشت کرتے چلے آئے ہیں اور بوجہ موروثی ہونے کے لگان بہت کم ہے اب حسب ذیل سوالات ہیں

۱؎ صورت بالا میں یہ وکیل مالک زمین کے ہوگئے یا نہیں۔

۲؎ اگر موروثی کاشتکار زمین پر قبضہ رکھے تو جائز ہے یا نہیں اور ناجائز ہونے کی تقدیر پر آمدنی اس کی موروثی کاشتکار کے لئے جائز ہے یا نہیں۔

۳؎ اگر یہ کاشتکار زمیندار سے زمین خریدنا چاہے اور بوجہ اپنی موروثیت کے کم دام میں زمین خرید لے تو اس میں گنہگار تو نہ ہوگا اور زمین کا مالک ہو جاوے گا یا نہیں۔

۴؎ اور حکومت کے قانون میں موروثی اور مالک اگر مل کر زمین کو فروخت کریں تو روپیہ نصفا نصف ملتا ہے تو کیا یہ روپیہ موروثی کو لینا جائز ہے۔

۵؎ قبضہ حرام ہونے کی تقدیر پر گذشتہ قبضہ سے توبہ کا کیا طریق ہے۔

الجواب، من المولوی عبد الکریم الگمتھلوی، ۱؎ یہ وکیل اس زمین کے مالک ہوگئے ہیں خواہ وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہی کیوں نہ ہوں، کیونکہ اس معاہدہ کا زبانی فسخ قانوناً معتبر نہیں اور اس عہدنامہ کے مطابق جو زمین لی گئی ہے وہ قانون کے مطابق ہے۔

۲؎ موروثی قبضہ کا رکھنا جائز نہیں ہے، البتہ جو آمدنی حاصل ہو چکی وہ جائز ہے بوجہ استیلاء کے لیکن اب اس زمین کا واپس کر دینا لازم ہے۔

۳؎ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تو اس کو کم داموں پر خریدنا جائز نہیں ہے اور ان کا قول احوط و اسلم ہے، البتہ امام محمدؒ کے قول پر یہ صورت جائز ہے، پس اگر کوئی اُن کے قول پر عمل کرے تو اس کی گنجائش ہے مگر ہے خلاف احتیاط۔

تنبیہ:- اس پر معاملہ سود کو قیاس نہ کیا جاوے۔

۴؎ اس کا حکم بھی مثل ۳؎ کے ہے۔

۵؎ فقط قبضہ اٹھا لینا کافی ہے دنیز توبہ کرنا باقی رہا تدارک قبضہ گزشتہ کا سو اس کی ضرورت نہیں ہے فقط۔

والدلائل ھذہ

۱؎ فی شرح السیر الکبیر (ص ۳۲۴) وعلیٰ ھذا الوغصب بعضھم مالاً ثم اسلموا او اختصموا

فی ذلک فان القاضی ینظر فی حکمهم قبل ان یسلموا فان علموا ان من حکمهم ان الغاصب یملک المغصوب بالغصب لو باعه الغاصب یرد شیٔ الخ اس سے معلوم ہوا کہ اہل حرب جو کچھ موافق قانون غصب وغیرہ کریں سب موجب تملک ہے۔

۲؎ منافع کا استیلاء کی وجہ سے مالک ہو جانا تو بالکل ظاہر ہی ہے اور زمین پر قبضہ کا جائز نہ ہونا اس واسطے ہے کہ مجرد قبضہ کی وجہ سے استیلاء تو ثابت نہیں ہوا جبکہ قانوناً اصل مالک کو مالک قرار دیا جاتا ہے اور عقد اجارہ ختم ہو چکا پس یہ قبضہ نہ کسی عقد شرعی کے تحت میں ہے نہ استیلاء کا تحقیق ہوا اس واسطے ناجائز ہے۔

۳؎ ۴؎ فی شرح السیر الکبیر (۲۹/۴) وکذلک لو ادعی المسلم المستامن عبدا فی ید بعضهم باطلا (ای عندہم) واقام بینة فاخذہ ملکهم من الحربی ودفعه الیه ثم اسلم فهو له لتمام احرازہ بحکم ملکهم ولکن ینبغی له ان یردہ علی صاحبه لان هذا غدر منه بمنزلة ما لو اخذ مال بعضهم سرا فاخرجه وهناک یفتی بالرد لانه انما غدر بامان نفسه فهذا مثله اھ

اس سے معلوم ہوا کہ اگر استیلاء کی وہ صورت اختیار کی جاوے جو قانون سلطان حرب کے خلاف نہ ہو تو پھر امام محمدؒ کے نزدیک ایسی کا فتویٰ بھی نہ دیا جاوے گا (گو شرعاً وہ صورت ممنوع ہو کیونکہ یہ جزئیہ مذکورہ غصب کے جزئیہ کے بعد ہے)

اور امام ابو یوسفؒ کا قول مجھے نہیں ملا مگر امداد الاحکام میں مورخہ ۱۸ صفر ۴۷ھ یہ عبارت ہے واما علی قول ابی یوسف فلا یجوز للمسلم (ای المستامن) فی دار الحرب ما لا یجوز فی دار الاسلام اور ربوا میں جو اختلاف ہے وہ اس کا موید بھی ہے۔ واللہ اعلم

۵؎ ھذا کله ظاهر۔ التصدیق لجواب الذی کتبه المولوی عبدالکریم صحیح

اشرف علی ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۴۹ھ

۱۵۸ (ب) **سوال متعلق جواب بالا**، قاضی دریں ملک چنانچہ فرمودند مفقود است لاکن حاکم وقت علاقہ بعض وقت اسسٹنٹ وتحصیلدار ومنصف کسے نہ کسے مسلمان می باشد لہذا او شان چنیں فیصلہ قضا یعنی فسخ نکاح ہرگز ہرگز نمی کنند واگر قصداً کنند و نخواہند کرد مگر علمائے ایں طرف نیم علم خطرۂ ایمان بالکل بے علم وکم فہم ومتعصب اند ایں حاکمان را حکم کفر در پردہ وعاملان را کفر ظاہر خواہند داد وعلی ہذا القیاس قاضی حنفی مقرر سرکار وعوام مردم کہ در ضلع

۵؎ دیکھئے جلد ہذا ص ۱۳۲ کتاب القضاء

دیگر باشد از خوف خلاف مذہب قطعاً حکم فسخ نکاح مفقود الزوج نخواہد کرد آرے دریں جا شہرے قاضی حنفی بود اہل حدیث شدہ است لاکن بر فیصلہا اجرت بے اندازہ می گیرد اگر جائز باشد ازو فتوی گرفتن مفقود الزوج ازو حکم گیرد و دیگر عالم اہل حدیث ہم است چیزے نخواہد گرفت و قریب است اگر جائز باشد ازو حکم گیریم و اگر جائے ایں چنیں قاضی لایق فتوی معلوم باشد اطلاع فرمایند تا ازو رجوع کردہ شود

الجواب، اگر قاضی عرفیست شرعاً قاضی نیست و اگر قاضی شرعیست کہ برائے فصل خصومات مقرر کردہ شد قضایش نافذ می شود اگرچہ اجرت گرفتن او را جائز نباشد فی رد المحتار واما اذا ارتشی الی قولہ فعلی ما فی الحمادیۃ فیہ ثلثۃ اقوال قیل ان قضاءہ نافذ فیما ارتشی فیہ و فی غیرہ والاول اختار البزدوی واستحسنہ فی الفتح الی ان قال و ینبغی اعتمادہ للضرورۃ فی ھذا الزمان اھ مختصراً لکن محض فتوے گرفتن از کسے کافی نیست کما نقلہ المفتی سعد اللہ المرحوم الرامفوری فی فتاواہ وعبارتہ ھکذا قال البزازی فی فتاواہ قال السرخسی ھذا اشرط اخر وھو ان یصیر حادثۃ فیجری بین یدی القاضی من خصم علی خصم حتی لو فات ھذا الشرط لا ینفذ القضاء لانہ فتوی اھ۔ ۱۰ رشعبان ۱۳۲۱ھ

کسی کی اشیا کو روپیہ دے کر قرقی سے بچالیا تو یہ چیزیں روپیہ دینے والے کی ملک نہ ہوں گی

سوال (۱۵۹) زید و عمرو باہم معاشرت کرتے رہے زید نے چند درخت نصب کئے، عمرو کا ایک مکان تھا، اتفاقاً عمرو نے کسی کوری کے پانی کو روک دیا، کوری نے مقدمہ دائر کیا، اس کی ڈگری ہوگئی، اس کے بعد کوری نے اپنے کھیت کے نقصان میں عمرو کی چیزوں کو قرق کرادیا، اس میں درخت و مکان مذکور سب قرق ہوگئے، اس کے بعد زید نے ایک جگہ سے روپیہ قرض لاکر دیا اور سب چیزوں کو قرقی سے بچالیا، اور قرض مذکور کو زید نے ادا کیا، عمرو کاروبار سے معذور تھا، اب وہ سب چیزیں زید کی ہوں گی یا عمرو کی؟

الجواب، چونکہ کوئی سبب اسباب تملک سے نہیں پایا گیا، لہذا یہ چیزیں زید کی ملک نہیں ہوئیں، البتہ اگر یہ قرض زید نے عمرو کے کہنے سے ادا کیا ہے تو اپنی رقم کا مطالبہ عمرو سے کر سکتا ہے اور اگر بدون اس کے کہے ادا کردیا تو مطالبہ رقم کا بھی نہیں ہوسکتا، اور چیزیں ہر حال میں عمرو کی ہیں واللہ تعالے اعلم،

۱۹ ربیع الثانی ۱۳۲۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۵۱)

ضمانت کمیشن پر ایجنٹ بنانا

سوال، (۱۶۰) زید غیر مسلم ساکن ملک امریکہ نے عمرو مسلم ساکن ہند سے کہا کہ اگر تم مجھے دو ہزار روپیہ بطور ضمانت دیدو تو میں تم کو اپنا مال فروخت کرنے کے لئے ایجنٹ مقرر کردوں گا اور فی عدد ایک آنہ کمیشن دوں گا، عمرو نے منظور کرکے دو ہزار روپیہ زید کو دیدیا، اور دو ہزار روپے سے دو چند سہ چند مال فروخت کے واسطے دینے کا وعدہ کرکے دیتا ہے، اور عمرو اس کو فروخت کرتا ہے، یہ صورت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، جائز ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس غیر مسلم کو جو روپیہ بطور ضمانت دیا ہے اسمیں دینے والے کی یہ اجازت نہ ہو کہ اس سے تجارت وغیرہ کرکے منتفع ہو، اگر وہ بدون اس کی اجازت کے ایسا کرے گا تو اس کا بار خود اس کے ذمہ ہوگا، ۱۶ رمضان ۱۳۲۷ھ

(تتمہ اولیٰ ص ۱۵۲)

تجارت پیشہ ہندو مسلمانوں میں یہ طے ہونا کہ کوئی جز مساجد اور مندروں میں خرچ کیا جاوے گا

سوال، (۱۶۱) ایک بازار میں یہ رواج قدیم مابین ہندو مسلمان مقرر ہے کہ ہندو مسلمان گاڑیبان جب اپنا مال یعنی قند سیاہ باہر سے لاکر وہاں کے تجارت پیشہ ہندو مسلمان کارخانہ چینی والے کے ہاتھ بیچتے ہیں تو کل قیمت اپنی لیکر اس میں سے ایک آنہ حسب رواج وہاں کے بغرض مصارف مدرس و امام مسجد و پوجاری شوالہ بخوشی دیتے ہیں، جس کو امام مسجد و پوجاری لیکر اپنے تصرف میں لاتے ہیں، خواہ وہ خریدار مال ہندو ہو یا مسلمان ہو، اس رقم کو اپنے پاس امانۃً رکھتا ہے، اور کل رقم وصول شدہ اپنے اپنے موقع پر یعنی بوقت طلب پوجاری و امام کو دیتا ہے، نہ ہندو کارخانہ والوں کو مسلمان مدرس و امام کے دینے میں عذر ہے نہ مسلمان کارخانہ والوں کو ہندو پوجاری کے دینے میں رقم معلومہ کے کوئی حجت پیش ہوتی ہے، اسی طرح سے ایک زمانۂ دراز سے سلسلۂ انتظام قائم ہے، اب اس وقت بعض مسلمانوں کو یہ تردد پیش ہے کہ اس طرح کی رقم امانت کا ہندو مسلمان کو اپنے پاس رکھنا اور ان کے پوجاری کو یا مدرس و امام مسجد کو دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں، اور ایسی مشارکت دینی کاموں میں روا ہے یا نہیں

الجواب، درست نہیں سب مل کر اس انتظام کو اس طرح بدل دیں کہ ہندو صرف ہندوؤں سے لیا کریں اور مساجد میں خرچ نہ کریں، اور مسلمان صرف مسلمانوں سے لیا کریں اور پوجاریوں پر خرچ نہ کریں، اور جب تک ایسا انتظام مقرر نہ ہو تو مسلمان ایسا کریں کہ اگر ہندو سے ان کو لینے کا موقع آوے تو نہ لیں کہ اختیاری بات ہے اور جب نہیں لیں گے تو ان سے

کوئی پجاری بھی نہیں مانگ سکتا، اور مانگے تو یہ جواب دے سکتا ہے کہ ہم نے خود ہی ہنڈوں سے نہیں لیا ہے تو ہم تم کو کیسے دیں، اور اگر ہندوؤں کو وہ ایک آنہ دینے کا موقع پڑے اور وہ مجبور کر کے لینا چاہیں تو یوں کرے کہ دام پورے وصول کر کے ایک آنہ واپس نہ دے بلکہ اس سے یوں کہے کہ مجھ کو ایک آنہ قیمت مجوزہ میں کم دیدو، اور نیت یہ رکھے کہ میں ایک آنہ اس کو معاف کرتا ہوں، اور مسلمان سے لینا بھی جب درست ہے کہ وہ خوشی سے دے، اور جو شخص کہ محض اس رسم کی پابندی سے دیتا ہو اس سے لینا جائز نہیں۔

۲۷ ذیقعدہ ۱۳۲۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۵۲)

کپڑا اور روئی اور ٹرام ریلوے کے حصص خریدنا

سوال (۱۶۲) ۱۔ کپڑے اور روئی بنانے کے ملوں کے شیر یعنی حصص کمپنی مذکورہ کے خریدنا درست جائز ہے یا نہیں؟

۲۔ اور ٹرام ریلوے کے حصص خریدنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب، ۱، ۲، اگر حصہ صرف نقد روپیہ تھا تب تو اس کے خریدنے کیلئے برابر سرابر ہونا شرط ہے، اور اگر حصہ میں آلات کا جزو بھی ہے تو بدون اس شرط کے بھی درست ہے

۱۴ جمادی الاخری ۱۳۲۶ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۵۵)

حصص کمپنی

سوال (۱۶۳) اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ شریک ہو کر کمپنی بناتے ہیں، اور تجارتی کاروبار کرتے ہیں، ان کمپنیوں کے حصص اکثر فروخت ہوتے رہتے ہیں، جو لوگ حصص خریدتے ہیں ان پر سالانہ منافع جس قدر کمپنی کو ہو تقسیم کر دیا جاتا ہے، کبھی کم کبھی زیادہ اسی طرح اگر کمپنی کو نقصان ہو تو حصہ داران اپنے حصوں کی نسبت سے نقصان کے ذمہ دار ہوتے ہیں، ایسے حصص خرید کرنا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب، تجارتی کمپنی جس میں مختلف کاروبار ہوتے ہیں اور سودی معاملات بھی ہوتے ہیں اور جس کے حصے فروخت ہوتے ہیں اس کا حکم یہ ہے کہ چونکہ ہر حصہ دار اپنے حصہ کا مالک ہے، اور عملہ کاربار میں ان حصہ داروں کا وکیل ہوتا ہے، اور شرعاً ان کا فعل حصہ داروں کی طرف منسوب ہوگا، اگر وہ کوئی ناجائز تجارت کریں گے اور یقیناً کرتے ہیں حتیٰ کہ مسلمانوں سے بھی سود لیا جاتا ہے تو ایسا ہی ہوگا جیسے خود حصہ دار کریں اس لئے ایسی کمپنی میں شرکت ناجائز ہے، اسی طرح حصص خریدنا چونکہ یہ روپیہ[1] کا مبادلہ روپیہ سے ہے، اور دست بدست نہیں

---

[1] کمپنیوں کے حصص بصورت عروض تجارت یا مشنری ہوتے ہیں اس لئے روپیہ کا مبادلہ روپیہ کے نہیں بلکہ عروض سے ہے جو کہ نسیئۃً بھی جائز ہے ۱۲ رشید احمد عفی عنہ۔

اس لئے جائز نہیں، اور قرض کی تاویل بھی قواعد پر منطبق نہیں ہوتی۔ (النور ربیع الاول ۱۳۵۱ھ ص ۱۰)

گورنمنٹ کو قرضہ دینے کا حکم

سوال (۱۶۴) اکثر گورنمنٹ یہ اعلان کرتی ہے کہ ہمیں اس قدر قرضہ کی ضرورت ہے، اور اتنی مدت میں یہ قرضہ ادا کیا جائے گا۔ جب تک قرضہ ادا ہوگا اس قدر فی صدی سود دیا جائے گا، یہ سود جائز ہے یا ناجائز، بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہیے کہ گورنمنٹ سے سود لینا جائز ہے یا نہیں، میرے خیال میں گورنمنٹی بنک میں روپیہ رکھ کر سود لینے میں اور مندرجہ بالا صورت میں فرق ہے، جو خاص فرق میرے خیال میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ گورنمنٹی بنک میں پبلک کے اور لوگ بھی حصہ دار ہوتے ہیں مسلمان بھی اس کے حصہ دار ہوتے ہیں، ایک دو مثال میرے ذہن میں بھی ہیں، یہ ضرور ہے کہ اور لوگوں کا حصہ نسبۃً بہت قلیل ہوتا ہے، ہندوستان میں کوئی بنک ایسا نہیں ہے جس کی مالک خالص گورنمنٹ ہو، گورنمنٹ کو سود پر قرضہ دینے میں اس سے یہ خاص فرق ہے کہ ایسی صورت میں جو سود آئے گا وہ قطعی گورنمنٹ کے خزانہ سے آئے گا، گورنمنٹ نے ہمارا لگان خلاف معاہدہ کم کر دیا، اور حسب قانون ساختہ خود مالگذاری اسی نسبت سے کم نہیں کی، تو کیا گورنمنٹ سے ہم سود بھی نہیں لے سکتے، میں نہیں کہہ سکتا کہ مندرجہ بالا دلیل کچھ اہمیت شرعاً رکھتی ہے یا نہیں؟

الجواب، گورنمنٹی بنک جس میں پبلک کے اور لوگ بھی شریک ہوتے ہیں، گو اور وں کا حصہ قلیل ہوتا ہے، اس کی حقیقت بھی مثل صورتِ بالا کے ہے اور حکم بھی مثل حکم بالا کے۔

خاص گورنمنٹ کو قرض دینا، جس میں سود خاص گورنمنٹی خزانہ سے آتا ہے یہ مسئلہ اس میں داخل ہے کہ غیر مسلم غیر ذمی سے سود لیا گیا، یہی مسئلہ ہے جو علماء میں مختلف فیہ ہے، جس میں اجتناب تورع ہے، اور ارتکاب توسع ہے، واللہ اعلم، ۲ ذیقعدہ ۱۳۵۲ھ (النور ربیع الاول ۱۳۵۴ھ ص ۱۰)

ریل پر آئے ہوئے مال کو نیلام پر خریدنا

سوال (۱۶۵) قانون ریلوے میں ایک مدت مقرر ہے، کہ اگر اس عرصہ میں مالک مال آ ملا گیا تب تو اس کو مال دیدیا جاتا ہے، ورنہ بعد گذرنے مدت کے اگر پھل وغیرہ ہوتے ہیں تو تیسرے دن نیلام کر دیئے جاتے ہیں، سو اس مال کا خریدنا قاعدہ شرعیہ سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، اگر یہ معلوم ہو کہ وہ دام مالک کو دیئے جاتے ہیں تو خریدنا جائز ہے والا لا... (تتمہ اولیٰ ص ۱۵۹)

بلا طلب کوئی اخبار یا رسالہ بھیجنے سے بیع نہ ہونا!

سوال (۱۶۶) عرصہ ایک سال کا ہوا کہ ایک ہندو نے میرے پاس ایک رسالہ بھیجا جس میں وید کی قدامت لکھی تھی، اور کچھ نسخہ

جات بھی تھے، میں نے اس کو رکھ لیا اور وہ رسالہ ماہوار آتا رہا، اور میں نے انکار نہیں کیا سال گزرنے پر ایک پرچہ ویلیو دو روپیہ کا آیا میں نے اس کو واپس کر دیا، اور لکھدیا کہ چونکہ آپ بلا طلب پرچے بھیجتے تھے، اس لئے میں انکار کرتا ہوں، انہوں نے بطور ہدایت یہ بھی لکھا تھا جو کہ پہلے پرچے کے بھیجنے پر انکار نہ کریں گے ان کے نام پرچہ جاری رہے گا، تو اب یہ پوچھتا ہوں کہ قیمت میرے ذمہ واجب عندالشرع ہے یا نہیں ؟

الجواب، آپ کو انکار کر دینا واجب تھا، خواہ خط بھیجکر خواہ پرچہ واپس کر کے اب قیمت تو واجب نہیں ہوئی لیکن سب پرچوں کا واپس کر دینا واجب ہے، وہ آپکی ملک نہیں -

۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۰ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۵)

اشتراط مثلیت ثمن در مرابحہ | **سوال**، (۱۶۷) اس طرف یہ رواج ہے کہ لوگ کپڑا دو طریقہ سے خریدتے ہیں ایک یہ کہ اس کی قیمت میں نقد روپیہ دیتے ہیں، تو جس صورت میں کہ صرف روپیہ دیتے ہیں تو ایک تھان مثلاً چودہ آنے کو لیتے ہیں اور اگر روپیہ و سوت دونوں دیتے ہیں تو ساڑھے چودہ آنے کو لیتے ہیں تو کیا حکم ہے، پس جس شخص نے کپڑا روپیہ سوت دونوں دے کر خریدا ہے اس سے اگر کوئی کپڑا انی تھان مثلاً ایک آنہ منافع دے کر خریدے تو وہ منافع چودہ آنے پر ہوگا یا ساڑھے چودہ آنے پر، اور اصل قیمت کون معتبر ہوگی ؟

الجواب، یہ بیع مرابحت ہے، یہ اسی وقت صحیح ہے جب تمام ثمن نقد یا مثلی ہو، اور دوسرا مشتری وہی دیتا ہو، پس جس صورت میں کچھ نقد اور کچھ سوت کی عوض تھان لیتا ہے، اور دوسرا مشتری سب نقد دیتا ہے، نفع پر بیچنا درست نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم و احکم،

۲۵ محرم ۱۳۲۲ھ (حوادث اول وثانی ص ۱۲)

قیمت پیشگی ادا کرنا | **سوال**، (۱۶۸) بعض اہل مطابع اشتہار دیتے ہیں کہ فلاں کتاب کے طبع کرنے کا انتظام کیا گیا ہے، جو صاحب اس قدر قیمت پیشگی بھیجدیں گے وہ اس رعایت کے مستحق ہوں گے یہ معاملہ کیسا ہے ؟

الجواب، متاخرین نے جائز رکھا ہے اور اس کی تفصیل بیع استجرا میں صاحب درالمختار نے ذکر کی ہے، ج ۴ ص ۱۰ و بعض عبارتہ ہذا و ہذا (ای دفع دراھم الی الخباز والاخذ کل یوم خمسۃ امناء) حلال وان کان نیتہ وقت الدفع الشراء لانہ بمجرد النیۃ لاینعقد البیع

وانما ینعقد البیع الآن بالتعاطی والآن المبیع معلوم فینعقد البیع صحیحا اھ قلت کذا یقال فی ھذا ان المبیع لما وجد انعقد البیع فلم یلزم بیع المعدوم

۴ ربیع الثانی ۱۳۳۱ھ (حوادث اول وثانی ص ۱۶)

اخبار غیر معلوم مدت کے لئے کسی مقرر قیمت کے بدلہ میں جاری کرنا جائز نہیں

سوال، (۱۶۹) بعض مالک اخبار کی جانب سے اشتہار ہوتا ہے کہ اس قدر روپیہ داخل کردینے سے تمام عمر کے واسطے اخبار جاری کردیا جاوے گا یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، جائز نہیں کیونکہ مبیع مجہول ہے،

۴ ربیع الثانی ۱۳۳۱ھ (حوادث اول وثانی ص ۱۷)

نقلی چیزوں کو نقلی ظاہر کرکے فروخت کرنا۔

سوال، (۱۷۰) گھی، عنبر، مشک وغیرہ مصنوعی تیار کیا جاوے اور یہ کہہ کر یہ اصلی نہیں مصنوعی ہے کم قیمت پر اس کو فروخت کیا جاوے کیا یہ بھی دھوکہ وخداع ونا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، یہ دھوکہ نہیں ہے جائز ہے، البتہ ورع کے خلاف اس لئے ہے کہ مشتری سے خداع کا احتمال ہے، اور اس کی بیع ایک درجہ میں اس کا سبب ہے۔ (حوادث اول وثانی ص ۲۰)

اشتہاری کتابوں کو قیمت مندرجہ اشتہار سے زائد پر فروخت کرنا

سوال، (۱۷۱) کسی کتاب کا رعایتی اشتہار شائع کردینے کے بعد ایسے شخص سے جس کو وہ اشتہار نہیں ملا اور یدیں وجہ وہ سابق پوری قیمت پر کتاب کی فرمائش کرتا ہے، پوری قیمت لے لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، ایسا اشتہار ایک وعدۂ عام ہے، جس میں کسی کی اطلاع وعدم اطلاع برابر ہے پس جو حکم اشتہار دیکھنے والے کا ہے وہی نہ دیکھنے والے کا یعنی دونوں صورتوں میں بیع حلال ہے اور خلف وعدہ کی کراہت لازم ہے، (حوادث اول وثانی ص ۲۱)

خرید غلہ کے وقت نرخ طے نہ کرنا،

سوال (۱۷۲) اکثر دیہات میں یہ قاعدہ ہوگیا ہے کہ غلہ خواہ بغرض تجارت یا بغرض خرچ یومیہ کاشتکار سے خرید کرو تو وہ نرخ جس وقت اکتیج کا نرخ مقرر ہو اس وقت طے کرتے ہیں، بغیر طے ہوئے خرچ اکیتج کے کاشتکار ہرگز نرخ طے نہیں کرتے ہیں، میں نے کچھ غلہ امسال خریدا باوجودیکہ میں زمیندار ہوں مگر کاشتکاروں نے نرخ طے نہیں کیا؟ اور غلہ دیتے رہے، جب اکتیج گردونواح میں طے ہوگئی تب کہا کہ اکتیج کے بھاؤ دیں گے، میں نے انکار کیا یعنی علیحدہ نرخ اب طے کروں گا، غرض کہ اس وقت کوئی فیصلہ نہیں کیا، ایسے موقع پر اکتیج کا

نرخ جائز ہو سکتا ہے، اب تو عام رواج یہی ہو گیا ہے؟

الجواب، لفظ اکیتج سمجھ میں نہیں آتا، بہرحال دوسرے وقت پر اس کا رکھنا اور بیع کے وقت طے نہ کرنا حرام ہے، ۱۹ شعبان ۱۳۳۱ھ (حوادث اول وثانی ص ۱۱۴)

اس کی تحقیق کہ اگر پارسل شکستہ ہو جاوے تو یہ نقصان بائع کے ذمہ ہے یا مشتری کے

سوال، (۱۷۳) میں نے ایک دوا فروش سے کچھ ادویات مرکب منگائی تھیں، اس پارسل کی ادویات مجھ کو ٹوٹ پھوٹ کر وصول ہوئیں، چونکہ بذریعہ ویلیو پارسل بھیجی گئی تھیں یہ نقصان کس کا ہوگا؟

الجواب، آپ کا ہوا، اگر مرسل نے پارسل بنانے میں متعارف احتیاط کی تھی،

۲۴ جمادی الثانی ۱۳۳۱ھ (حوادث اول وثانی ص ۹۰)

ریاست سے سوختہ خریدنا

سوال، (۱۷۴) تمام ریاستوں میں خواہ وہ ہندو کی ریاست ہو یا مسلمان کی محکمہ جنگلات قائم ہیں اور ان میں خودرو گھاس اور خودرو چھوٹے بڑے درخت کٹوا کر جمع کرائے جاتے ہیں، اور رعایا کے ہاتھ فروخت کئے جاتے ہیں، یہ لین دین شرعاً کیسا ہے؟

الجواب، جب ریاست نے کٹوا کر قبضہ کر لیا وہ ریاست کی ملک ہو گئے، اب اگر رعایا کے ہاتھ فروخت کریں جائز ہے، ۹ شوال ۱۳۳۱ھ (حوادث اول وثانی ص ۱۲۱)

جو چیز کسی دوسرے کے نام پر فرضی طور سے خریدی جاوے وہ اس کی ملک نہیں ہوتی

سوال (۱۷۵) قاضی محمد یعقوب و قاضی محمد یوسف و قاضی محمد اسحاق تین بھائی تھے، قاضی محمد یعقوب نے ایک علاقہ اپنی لڑکی اور اپنے ایک بھتیجے عبدالسلام ابن قاضی محمد اسحاق کے نام خرید کیا، اور داخل خارج بھی انہیں دونوں کے نام کرا دیا، قیمت اس علاقہ کی اس طریقہ پر ادا کی کہ بائع کے حق میں ایک دستاویز لکھدی جس میں انھوں نے یہ نہیں لکھا کہ یہ دستاویز قیمت ہے اس علاقہ کی جو ان کی لڑکی اور بھتیجے کے نام خریدا گیا ہے، بلکہ یہ لکھا کہ یہ قرضہ میں اپنی ذاتی ضروریات کے لئے مثلاً ادائیگی مالگذاری و قرضہ ذاتی و دیگر ضروریات خانگی کے لئے لے رہا ہوں، اور اپنی ذاتی جائداد وغیرہ اس قرضہ کی علت میں مکفول و مستغرق کر دیا دستاویز بیع نامہ و دستاویز قرضہ غالباً ایک ساتھ ہی لکھی گئی یا دو تین روز کا فرق ہوگا، قاضی محمد یعقوب صاحب کا انتقال ہو گیا، انھوں نے علاوہ اس علاقہ کے اور جائداد بھی چھوڑی ہے، اب یہ سوال ایسا پیدا ہوا ہے۔ (۱) آیا اس علاقہ میں جو خریدا گیا ہے ان کے ورثا شرع محمدی کی رُو سے حصہ لے سکتے ہیں یا نہیں؟ (۲) اگر حصہ ان کو نہیں مل سکتا تو کیا وہ قرضہ کے ذمہ دار ہوتے

ہیں یا نہیں ؟

الجواب، کسی کے نام جائداد خریدنے سے شرعاً اس کی ملک نہیں ہوتی، کیونکہ خریدنے کے قبل تو دوسرے کی ملک تھی غیر کی ملک میں تصرف ہبہ وغیرہ کا نافذ نہیں ہوتا، اور بعد خریدنے کے کوئی عقد موجب انتقال پایا نہیں گیا، اس بناء پر شرعاً وہ جائداد قاضی محمد یعقوب کی ملک ہے، اور زرِ ثمن بھی انہیں کے ذمہ ہے، جس کے واسطے دستاویز قرضہ کی لکھدی ہے پس بائع کا قرضہ ادا کر کے باقی جائداد مشتری کی سب ورثہ شرعی کو ملے گی، بقدر حصص شرعیہ. فی الدر المختار بیع الفضولی قید بالبیع لانہ لو اشتری لغیرہ نفذ علیہ۔

اشرف علی ۱۹ محرم ۱۳۳۲ھ (حوادث اول ۲ ص ۱۲۷)

جو کتاب اپنے پاس نہ ہو اور فہرست میں درج کردی جائے اس کا حکم

سوال (۱۷۶) کتاب موجود نہ ہو فہرست میں اس کا نام ڈال دینا کہ اہتمام کر کے فرمائش پر دیدیں گے، جائز ہے یا ناجائز ؟

الجواب، یہ معاملہ اس تاویل سے صحیح ہو سکتا ہے کہ فرمائش کو ایجاب نہ کہا جاوے، کیونکہ اس وقت مبیع ملک بائع سے معدوم ہے، بلکہ بائع کی روانگی کو ایجاب اور صاحب فرمائش کے وصول کو قبول کہا جاوے، البتہ اس پر یہ التزام کرنا پڑے گا کہ اگر صاحب فرمائش وصول نہ کرے بلکہ واپس کر دے تو بائع اس پر جبر نہیں کر سکتا،

۲۵ ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ (حوادث ۱، ۲ ص ۱۳۷)

بیع مرابحہ مع توکیل اور بعض معاملات کا بحکم سود ہونا

سوال (۱۷۷) زید اپنی آسامیوں سے کہدیتا ہے کہ قرب وجوار میں مویشیاں گائے، بیل، بھینس، بکری وغیرہ تلاش کر کے اپنی اپنی پسند کا جانور طے کر آؤ، پھر ہم روپیہ لیکر چلیں گے، نقداً خرید کر کے اپنی ملک کریں گے، بعدہٗ فوراً ہی روپیہ ہم نفع جوڑ کر ادھار بوعدہ ایک سال تم کو دیدیں گے، جس جانور کو جو شخص قیمتاً طے کر آوے گا، وہ جانور اسی شخص کو ادھار نفع پر دیا جاوے گا، اس طرح آسامیوں کی مدد سے خرید کر ادھار دینا درست ہے یا نہیں ؟

الجواب، اس کی چند صورتیں ہیں اور ہر ایک کا جدا حکم ہے، ایک صورت یہ کہ زید نے آسامی کو خریدنے کا وکیل بنا دیا، اور آسامی نے زید کے لئے خریدا، اس صورت میں مواشی ملک زید کی ہوگی، اور زید کو اس کے بعد اختیار ہوگا خواہ آسامی کے ہاتھ فروخت کرے یا نہ کرے، اور اسی طرح آسامی کو اختیار ہوگا کہ خواہ زید سے خریدے یا نہ خریدے

کوئی کسی کو مجبور نہیں کر سکتا، تو اس صورت میں اگر آسامی اپنی خوشی سے زید سے نفع پر خریدے تو جائز ہے، اس میں سود وغیرہ کا کوئی شبہ نہیں، دوسری صورت یہ کہ زید نے آسامی کو وکیل خریدنے کا نہیں بنایا، صرف پسند کرنے کے لئے بھیجدیا، اور آسامی نے مالک مواشی سے کوئی گفتگو جس سے خریداری سمجھی جاوے نہیں کی، یہاں تک کہ مالک مواشی بھی سمجھتا ہے کہ ابھی مجھ سے نہیں خریدا ہے میں بھی بیچنے نہ بیچنے کا مختار ہوں، اور دوسرا ابھی خریدنے نہ خریدنے کا مختار ہے۔ اس کے بعد زید نے آکر خود خریدا اور پھر خرید کر نفع پر آسامی کے ہاتھ ان کی خوشی سے بیچدیا، اور مثل پہلی صورت کے یہاں بھی ہر ایک بیچنے اور خریدنے میں آزاد ہے یہ صورت بھی جائز ہے، کوئی شبہ نہیں، تیسری صورت یہ ہے کہ آسامی نے اپنے طور پر جاکر مواشی کو اپنے لئے خریدلیا، اور زید نے صرف جاکر اس کی قیمت آسامیوں کے کہنے سے ادا کردی، اس صورت میں ابتداء ہی سے وہ مواشی ملک آسامی کی ہوگا۔ اور زید کو ادائے ثمن کرنا یہ گویا آسامی کو روپیہ قرض دینا ہوگا، جب قرض ہے تو ظاہر ہے کہ نفع لینا صریح سود ہے اور حرام ہے،

۱۰ رمضان ۱۳۳۲ھ (حوادث اول ص ۱۴۵)

رشوت دے کر سرکاری مال ملازمین سرکار سے خریدنا

سوال، (۱۰۸) ایک شخص ملازم انگریزی رشوت دے کر ٹھیکہ بنانے ظروف آہنی کا لیتا ہے اور چند روز استعمال سرکاری کے بعد بلا ناقص ہوئے ان ظروف کو ناقص کراکے ارزاں نیلام کرا دیتا ہے، اور وہ شخص ٹھیکہ دار خود ہی خرید کر اور کچھ روغن وغیرہ سے ان کو نیا ظاہر کر کے اسی ملازم سرکاری کی معرفت پورے داموں کو فروخت کرتا ہے، اس شخص کا مال فعل حرام رشوت دھوکہ دہی سے حرام ہوگا، یا مکروہ، ایک عالم فرماتے ہیں کہ اس کا فعل حرام موجب گناہ ہے۔ مگر اس بیع کے ثمن میں کچھ نقصان و کراہت نہیں، اس لئے کہ عقد صحیح ہے۔ اور ملازم سرکاری وکیل بیع ہے، اور وکیل بیع کو قیمت سے کم ثمن پر بیع کرنے کا اختیار ہے، ایک صاحب فرماتے ہیں کہ اس کے مال میں کراہت تحریم ہے اور شخص مذکور کے مال مذکور میں بیع جائز و اجرت جائز کا بھی مال ملا ہوا ہو تو اس کی دعوت کھانی بلا کراہت تحریم جائز ہے یا نہیں، اور مال مذکور میں جائز مال نہ ہو تو اس کو زکوٰۃ اس مال کی دینی واجب ہے یا نہیں؟

الجواب، یہ فعل بھی حرام ہے اور وہ ثمن بھی حرام ہے، اور یہ سمجھنا علی الاطلاق غلط ہے

کہ وکیل بالبیع کو قیمت سے کم ثمن پر بیع کرنے کا اختیار ہے، یہ اختیار تو مستفاد ہوا ہے مؤکل ہی سے، جس امر کا مؤکل نے اختیار نہ دیا ہو ہرگز اختیار نہ ہوگا، اور یہاں دلیل قائم ہے اس کی کہ اس بیع بالاقل اور اسی طرح اشترار بعد التسویہ کی اجازت مؤکل نے نہیں دی، کیونکہ اگر اس کو معلوم ہو کہ اس طور پر یہ بیع و شرا ہوتا ہے ہرگز اس کو جائز نہ رکھے گا، پس اس امر کا یقیناً معلوم ہونا دلیل ہے عدم اذن کی، پس یہ مال حرام ہوگا، لیکن مملوک ہو جانے کی وجہ سے زکوٰۃ واجب ہوگی، اور دعوت اس وقت جائز ہے جب اس مال سے زائد حلال ہو۔

۱۵ رمضان ۱۳۳۲ھ (حوادث ۱، ۲، ص ۱۴۷)

سکہ غالبیہ کا عرف کے ساتھ مقید ہونا

سوال (۱۷۹) مؤمیں اکثر گورکھپوری پیسہ چلتا ہے، کبھی تو ایک روپے کا بیس گنڈہ ملتا ہے، تو ایک آنے کے پانچ پیسے ہوئے، اور کبھی اکیس گنڈے تو ایک آنہ کے ۵ ۱/۴ پیسے ہوئے اور مؤ کے خریداروں کا قاعدہ ہے کہ ہر صورت میں ایک آنہ کے پانچ پیسے دیں گے، اور کوڑی ہرگز نہ دیں گے، البتہ اگر تین دو کھٹے سے زیادہ کوڑی ہو جاوے تو ایک پیسہ مستم دیں گے، اور اگر اس سے کم ہو تو کچھ نہیں دیں گے، اور یہ بات درمیان بائع اور مشتری کے پنچائتوں میں طے ہو چکی ہے، ساتھ ہی اس کے اکثر بیچنے والوں کو بوجہ کوڑی نکل جانے کے افسوس ہوتا ہے، بعض دفعہ تو کچھ کہہ بھی دیتے ہیں، تو آیا ان کوڑی لینے سے معاوضہ قیامت کے روز کا باقی رہے گا یا نہیں، اور یہ سلب حق الغیر ہے یا نہیں، اور المعروف کالمشروط کے قاعدے سے یہ بیع کیسی ہے؟

الجواب، اگر یہ عرف مشہور عام ہے تو المعروف کالمشروط کے قاعدے سے یہ بیع اسی طریق کے ساتھ جائز ہے، اور کچھ مواخذہ نہیں، اور اگر مشہور عام نہیں ہے تو قبل بیع اس کا ظاہر کر دینا واجب ہے، ۹ شوال ۱۳۳۲ھ (حوادث ۱، ۲، ص ۱۵۵)

ویلو کی حقیقت اور نقصان ہو جانے کی صورت میں ضمان اس کا کس پر ہے اس کی تحقیق

سوال (۱۸۰) میں نے ایک فرمائش بذریعہ ویلیو ڈگوارہ ضلع چھپرہ خوب لعل خیمہ فروش کے پاس روانہ کیا، مال ریل میں تین تھان نکل گیا، اس کا نقصان مجھکو دینا ہوگا یا خوب لعل خریدار مال کو، دوسرے یہ کہ میں نے ہر خریدار سے کہہ دیا ہے کہ ریل میں جس کسی کا مال چوری جائے گا میں نہیں دونگا، مگر مذکورہ بالا خریدار سے یہ اقرار نہیں ہے شرع شریف کا کیا حکم ہے۔

الجواب عرف تجار سے خصوص اس امر سے کہ ویلو کے ضائع ہونے کے وقت اہل الم آگے

مطالبہ مال بھیجنے والا ہی کرتا ہے منگانے والا نہیں کرتا، یہی معلوم ہوتا ہے کہ اہل ڈاک وکیل بائع کے ہیں مشتری کے نہیں، جب یہ لوگ مشتری کو دیتے ہیں اس وقت بیع ہوتی ہے، تو اس کے قبل چونکہ وہ مال بائع کا ہے اس لئے جو نقصان ہوگا اسی بھیجنے والے کا ہوگا،

۱۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ (حوادث ۱ و ۲ ص ۱۶۲)

ماہواری رسالہ یا اخبار ڈاکخانہ سے ضائع ہوجاوے تو مکرر لینا جائز ہے

سوال، (۱۸۱) رسائل ماہواری جو ارسال ہوا کرتے ہیں وہ اگر ڈاک میں ضائع ہوجاویں تو مشتری بائع سے دوبارہ طلب کرسکتا ہے یا نہیں، شرعی حکم اس باب میں کیا ہے۔

جواب، پورا شرح صدر تو ہے نہیں لیکن قواعد سے رجحان اس طرف ہے کہ دوبارہ طلب کرسکتا ہے لان الظاهر ان عملة البوسطة وكلاء للبائع لا للمشتری، فليراجع الى العلماء الآخرين فقط۔

۱۴ محرم ۱۳۳۳ھ (حوادث خامسہ ص ۲۴)

بیع تعاطی اور پارچہ جس کے اطراف یکساں ہوں کمیں بقدر موضوع بیع کا نقاؤ

سوال، (۱۸۲) پانچ آنے گز کے حساب سے تین گز کپڑا خریدا مشتری نے ایک روپیہ جیب سے نکال کر مالک کو دینے کی نیت سے پھینکا، مالک گفتگو میں مشغول تھا، مشتری نے باقی چار پیسے واپس مانگے، مالک نے نوکر سے واپسی کے پیسے کا عدد دریافت کرکے مشتری کو دیا، مشتری نے وہ پیسے لئے اور کپڑا اٹھالیا، بیع صحیح ہوئی یا نہیں؟

الجواب، یہ بیع تعاطی ہے گو زبان سے ایجاب وقبول نہیں ہوا مگر بیع صحیح ہوگئی، فقط۔

یکم محرم روز جمعہ ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۱۲۶)

حکم مرمت گراموفون

سوال، (۱۸۳) خاکسار کا پیشہ گھڑی سازی ہے اس کے علاوہ گراموفون باجہ کی بھی مرمت کیا کرتا تھا، مگر میرے ایک کرم دوست نے کہا کہ گراموفون کی مرمت کرنا ازروئے شرع شریف ناجائز وممنوع ہے، باجہ مذکور میں مندرجہ ذیل مرمت کی جاتی ہے۔

(۱) اسپرنگ ٹوٹ جائے تو اسے جوڑ دینا یا نیا اسپرنگ لگا دینا (۲) باجے کے چکروں کے دانتوں میں یا چولوں میں کچھ خرابی ہو تو درست کردینا یا نیا چکر لگا دینا (۳) باجے میں گھڑگھڑاہٹ کی آواز پیدا ہوجائے جس سے ریکارڈ کی آواز میں خلل پیدا ہوتا ہو تو اسے مٹا دینا، الخلاصہ کیا اس آلۂ لہو ولعب کی مرمت کرنے سے راقم الحروف کا شمار بھی لہو ولعب میں مشغول رہنے والوں کی مدد کرنے والوں میں محسوب ہوگا، اور گناہوں میں برابر کا شریک، نامشروعیت کی یہی دلیل میرے دوست نے

بیان کی ہے، لہٰذا اس مسئلہ میں جو حکم از روئے شرع شریف ہو بیان فرما کر عند اللہ ماجور اور عند الناس مشکور ہوں؟

الجواب: فی الهدایة ومن کسر لمسلم بربطا او طبلا او مزمارا الی قوله فهو ضامن وبیع هذه الاشیاء جائز وهذا عند ابی حنیفة وقال ابو یوسف ومحمد لا یضمن ولا یجوز بیعها الی قوله ولابی حنیفة انها اموال لصلاحیتها لما یحل من وجوه الانتفاع وان صلحت لما لا یحل فصار کالامة المغنیة وهذا لان الفساد بفعل فاعل مختار فلا یوجب سقوط التقوم وجواز البیع والتضمین مرتبان علی المالیة والتقوم ثم قال وتجب قیمتها غیر صالحة للهو کما فی الجاریة المغنیة والکبش النطوح والحمامة الطیارة والدیك المقاتل الخ (آخر کتاب الغصب) وفیها من اجر بیتا لیتخذ فیه بیت نار الی قوله او یباع فیه الخمر بالسواد فلا باس به وهذا عند ابی حنیفة وقالا لا ینبغی ان یکریه لشیء من ذلك لانه اعانة علی المعصیة وله ان الاجارة ترد علی منفعة البیت ولهذا تجب الاجرة بمجرد التسلیم ولا معصیة فیه وانما المعصیة بفعل المستاجر وهو مختار فیه فقطع نسبته عنه (فصل فی البیع)

روایات مذکورہ اپنی علت سے صورتِ سوال کو مدلول روایات کے ساتھ ملحق کر رہی ہیں، اس لئے یہ صورت بھی مختلف فیہ ہے پس جس شخص کی دوسری وجہ معاش کافی ہو اس کو تو منع کے قول پر عمل کرنا چاہئے، اور جس شخص کی دوسری وجہ معاش کافی نہ ہو، وہ جواز کے قول پر عمل کر سکتا ہے، ۱۹ ذیقعدہ ۱۳۴۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۰۶)

فونوگراف اور آلات لہو ولعب کی باجبرت مرمت کرانا

سوال، (۱۸۴) فدوی آہنگری کا کام کرتا ہے، اس میں بعض لوگ اشیاء غیر مشروعہ بھی برائے مرمت لے آتے ہیں، مثل نقارہ وفونوگراف وغیرہ تو آیا اُن کی مرمت کر دینا عند الشرع جائز ہے یا نہیں، اور جو ان کی اجرت ہوگی وہ کسبِ حلال سمجھی جائے گی یا حرام؟

الجواب، ان اشیاء کی مرمت درست نہیں،

۷ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۸۲، حوادث ص ۴۰)

سرکاری نرخ پر غلہ خریدنا

سوال (۱۸۵)، ضلع میں غلہ کا نرخ پانچ سیر، پونے پانچ سیر کا تھا، اب اس کا نرخ منجانب گورنمنٹ چھ سوا چھ سیر سُنا جا رہا ہے، ہماری شریعت مقدسہ اس میں کیا حکم فرماتی ہے اس زیادتی کے ساتھ خریدا جائے یا نہ خریدا جائے تو ان کی نیت میں تو غلہ خریدنے وقت یہی بات

ہوتی ہے کہ گراں ہوگا تب بیچیں گے، جو ارشاد عالی ہو تعمیل کی جائے۔

جواب، فی الدر المختار لا یسعر حاکم الا اذا تعدی الارباب عن القیمۃ تعدیا فاحشا فیسعر بمشورۃ اھل الرأی وقال مالک علی الوالی التسعیر عام الغلاء وفی الاختیار ثم اذا سعر وخاف البائع ضرب الامام لو نقص لا یحل للمشتری فی رد المحتار قولہ ولا یحل للمشتری ای لا یحل لہ الشراء بما سعرہ الامام لان البائع فی معنی المکرہ کما ذکرہ الزیلعی اقول وفیہ تامل لان مثل ما قالوا فیمن صادرہ السلطان بمال ولم یعین بیع مالہ فصار یبیع املاکہ بنفسہ ینفذ بیعہ لانہ غیر مکرہ علی البیع وھھنا کذلک لان لہ ان لا یبیع اصلا ولذا قال فی الھدایۃ ومن باع منھم بما قدرہ الامام صح لانہ غیر مکرہ علی البیع الخ لان الامام لم یامرہ بالبیع وانما امرہ ان لا یزید الثمن علی کذا او فرق ما بینھما فلیتامل اھ (ج ۵، ص ۳۹۴، ۳۹۵) اس مجموعی عبارت سے معلوم ہوا کہ صورت مسئولہ میں جواز متردد فیہ ضرور ہے لیکن اقدم بالجواز میں گنجائش ہے اور اگر کوئی احتیاط کرے تو اس کی ہمت ہے، خلاصہ یہ کہ فتویٰ جواز پر ہے، وانا اختار شق الجواز لضعف ہمتی، اور تقویٰ تحرز میں ہے، وبعض احبابی اختار شق التقوی لقوۃ ہمتہ، فقط　(حوادث خامسہ ص ۲۳)

بعض سرکاری مجامع میں تجارت

سوال، (۱۰۶) ایک شخص رائے دیتے ہیں کہ دربار انگریزی کی نمائش میں جو ماہ جنوری آئندہ دہلی میں ہونے والا ہے، کوئی دوکان مرادآبادی برتنوں یا اور کسی مال کی کھولی جاوے، یا دربار کے کسی کام کا ٹھیکہ لیا جاوے، احقر نے جواب میں کہا کہ دربار کے کام کا ٹھیکہ اعانت مجمع کفار ہے، اور نمائش بھی ایسی ہے، اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ دربار کا ٹھیکہ اعانت ہے، نمائش ایسی نہیں، کیونکہ نمائش بعد ختم دربار ہوگی اس سے غرض دربار کی آرائش نہیں ہے بلکہ ملک کی صنعت و حرفت کی جانچ منظور ہے، جس طرح دیگر اوقات میں مختلف مقامات میں نمائشیں ہوا کرتی ہیں، اس میں حضور کا کیا ارشاد ہے، اگر شرکت ایسے مجمعوں کی ناجائز ہے تو اپنے دواخانہ کے اشتہارات تقسیم کرانا درست ہے یا نہیں،

الجواب، کفار کا مجمع مطلقاً معصیت نہیں ہے، بلکہ صرف جو کسی معصیت یا کفر کی غرض سے منعقد کیا جائے ایسے مجمع کی شرکت و اعانت سب حرام ہے، اور جو کسی غرض مباح سے ہو جیسے مجمع مسئول عنہ کہ محض تزاید سرور و استحکام امر حکومت کے لئے ہوگا، میرے نزدیک اس کا یہ حکم نہیں، ہاں اگر کسی مقتدا کی شرکت سے یہ احتمال ہے کہ عوام الناس میری سند پکڑ کر دوسرے

ناجائز مجامع کو اس پر قیاس کر کے بد احتیاطی کرنے لگیں گے، وہاں اس عارض کی وجہ سے سداً للذرائع خاص ایسے شخص کو بچنا واجب ہوگا، اور اشتہار تقسیم کرانا تو ہر حال میں جائز ہے، اسکو تکثیر سواد سے کچھ مس نہیں واللہ تعالےٰ اعلم (حوادث اول ص ۷۵)

اہل ہنود سے مٹھائی خریدنا | **سوال** (۱۸۷) اہل ہنود کی دکان سے مٹھائی وغیرہ خریدنا اور ان کے یہاں کا کھانا کھانا جائز ہے یا نہیں، اگر ہے تو کس طرح؟

الجواب، اگر ظاہراً کوئی نجاست نہ ہو تو جائز ہے لیکن اگر اس پر بھی اپنے بھائی مسلمان کو نفع پہنچا دے تو زیادہ بہتر ہے، ۸ رمضان ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ص ۱۱۶)

دندان ساز کو پیشگی قیمت واجرت لینا | **سوال** (۱۸۸) دندان سازی میں ہمارے لوگوں کا قاعدہ ہے کہ دانت بنوانے والے اصحاب سے کام شروع کرتے وقت نصف یا نصف سے کم قیمت پہلے روز پیشگی لے لیتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ شخص دانت بنوا کر لگوانے نہ آئے تو بالکل ہمارا ہی نقصان نہ ہو بلکہ کچھ یا نصف اس کا بھی ہو، کیونکہ ایک شخص کے منہ کی ناپ کے مطابق بنائے ہوئے دانت دوسرے شخص کے منہ میں کبھی نہیں آسکتے گویا یہ امر ناممکن ہے، چنانچہ ایک شخص کے دانت بنانے شروع کئے تھے، جن کی قیمت اٹھارہ روپے مقرر ہوئی تھی، اور پانچ روپے بیانہ لے کر کام شروع کیا، اب وہ شخص مر گیا ہے، مگر دانت اس کے تیار پڑے ہیں، تو اب اس کے پانچ روپے ہم رکھ سکتے ہیں یا اس کے وارثوں کو واپس کر دینے چاہئیں؟

الجواب، فی الهداية مسائل الاستصناع: والصحيح انه يجوز بيعا لا عدة والمعدوم قد يعتبر موجودا حكما الى قوله وهذا كله هو الصحيح، فی الكفاية فان قيل لو كان بيعا لما بطل بموت الصانع او المستصنع، قلنا الخ ان روایات سے یہ امور مستفاد ہوئے، اول یہ معاملہ وعدہ نہیں بیع ہے، تو بنوانے والا لینے سے انکار نہیں کر سکتا، اور انکار کی صورت میں صانع زر ثمن رکھ سکتا ہے، دوئم یہ کہ ایک کے مرجانے پر وہ معاملہ فسخ ہو جاوے گا، اس صورت میں وصول شدہ روپے کا صانع کے ذمہ واپس کرنا ضروری ہے،

قرب ۱۳۳۸ھ (حوادث خامس ص ۳۲)

مشتری مرجائے تو رقم بیعانہ کی واپسی | **سوال** (۱۸۹) اب ایک اور بات دریافت طلب ہے کہ ایک شخص دانت تیار کرنے کو کہہ گیا اور پانچ روپے پیشگی بطور بیانہ دے گیا تھا، اور

دانت تیار ہونے پر آیا اور منہ میں لگوائے، مگر دانتوں میں ایک نقص رہ گیا تھا، دانت درست کرنے کی غرض سے پھر اتار لئے گئے، چنانچہ درست شدہ دانت لینے آنے سے پہلے وہ شخص فوت ہو گیا، اب اس جگہ کیا مسئلہ ہے روپیہ وارثوں کو واپس کروں یا نہ کروں۔؟

الجواب، میرے نزدیک جب وہ بنے ہوئے دانت لے چکا اور وہ موافق فرمائش کے تھے اور ایسی خفیف کمی جو عرف کی موافق ہو موافقت فرمائش کے خلاف نہیں ہے، تو وہ بیع کامل ہو گئی اور بنوانے والا دانت کا مالک ہو گیا، اس لئے بنانے والا بقیہ دام کا مستحق ہے اور بقیہ کا وہ مطالبہ کرے گا۔　　قرب ۱۳۳۶ھ (حوادث خامسہ ص ۳۳)

کتاب الربوا

حکم منی آرڈر و حل بعض شبہات متعلقہ منی آرڈر

سوال، (۱۹۰) زید اور عمرو میں منی آرڈر کے ذریعہ سے روپیہ بھیجنے میں گفتگو ہے، زید کہتا ہے کہ منی آرڈر کے ذریعہ سے روپیہ بھیجنا جائز ہے، اور جواز کی دلیل یہ بیان کرتا ہے کہ ہر چیز میں اصل اباحت ہے، عمرو کہتا ہے کہ چونکہ منی آرڈر کے ذریعہ سے روپیہ بھیجنا کسی معاملہ شرعی کے تحت میں داخل نہیں اس لئے ناجائز ہے، زید کہتا ہے کہ یہ معاملہ شرعی کے تحت میں داخل ہے، اور داخل ہونے کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اگر کوئی کسی حمال سے کام لے اور اجرت پیشگی دیدے تو جائز ہے، عمرو کہتا ہے کہ منی آرڈر کے ذریعہ سے روپیہ بھیجنے میں اور حمال سے کام لینے میں اور پیشگی اجرت دینے میں فرق ہے۔ پہلی صورت کو دوسری صورت پر قیاس کرنا صحیح نہیں، کیونکہ منی آرڈر میں تو شرط ہے کہ روپیہ پہنچانے کی اجرت پیشگی لے لی جاوے اور حمال کو پیشگی اجرت دینا شرط نہیں بلکہ دینے والے کا احسان ہے، اگر پیشگی اجرت نہ دے تو حمال شرعاً یا عرفاً تقاضا نہیں کر سکتا، اور منی آرڈر تو اس وقت تک روانہ ہی نہیں ہو سکتا جب تک پیشگی اجرت نہ دے، اس کے علاوہ ناجائز ہونے کی وجہ عمرو ایک اور بھی بیان کرتا ہے، وہ کہتا ہے حمال پر قیاس کرنا اس وجہ سے بھی صحیح نہیں کہ حمال کے پاس جب تک وہ بوجھ ہے وہ اس کا امین ہے، اگر حمال سے وہ بوجھ کھو جاوے تو تاوان نہ لیا جاوے گا، جیسا امین سے نہیں لیا جاتا، اور منی آرڈر کا روپیہ ڈاک خانہ والوں کے پاس سے کھو جاوے تو اس کا تاوان لیا جاتا ہے، اور ڈاکخانہ سے

گویا شرط ہے کہ اگر روپیہ کھو جاوے تو تاوان دے گا، اس کے علاوہ ناجائز ہونے کی وجہ ایک اور بھی بیان کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ حمال پر قیاس کرنا اس وجہ سے بھی صحیح نہیں کہ حمال کے پاس جب تک وہ بوجھ ہے وہ اس کا امین ہے، اور امین پر واجب ہے کہ جو چیز امانت میں دی جائے بعینہ وہی واپس کرے اور منی آرڈر میں سب جانتے ہیں کہ وہی روپیہ بعینہ نہیں ملتا بلکہ اس کی مثل دوسرا روپیہ ملتا ہے، زید کہتا ہے کہ عموم بلویٰ و دفع حرج اور تعامل علماء و صلحاء کی وجہ سے بعض ناجائز چیزیں بھی جائز ہو جاتی ہیں اور یہ تو مباح الاصل ہے یہ کیونکر ناجائز ہوگا، مثلاً غلہ کی بالیوں کو بیلوں سے پامال کراتے ہیں اور بیل اس میں بول و براز کرتے ہیں۔ اس کو سب جانتے ہیں، پھر عموم بلویٰ و دفع حرج اور تعامل علماء و صلحاء یا تعامل خلائق کی وجہ سے اس کو سب حلال جانتے ہیں، اور اس غلہ کا سب استعمال کرتے ہیں، اسی طرح اگر منی آرڈر بھی بالفرض ناجائز ہو تو جائز ہو جائیگا اب از روئے شرع شریف اس گفتگو کا فیصلہ فرمائیے، اور قول فیصل ارشاد فرمائیے تاکہ قلب کو تسکین ہو۔

الجواب، قاعدہ کلیہ ہے الاقراض تقتضی بامثالہا، اور منصوص ہے کہ قرض میں کمی بیشی کی شرط ربوا ہے، اب سمجھنا چاہئے کہ منی آرڈر کا روپیہ جو ڈاک خانہ میں داخل کیا جاتا ہے آیا وہ امانت ہے اور اہل ڈاک اجیر، یا قرض ہے اور اہل ڈاک مستقرض، سو چونکہ یقیناً معلوم ہے کہ وہ روپیہ بعینہ نہیں بھیجا جاتا، اور نیز قانون ہے کہ اگر ڈاک خانہ سے وہ روپیہ اتفاقاً ضائع ہو جاوے تو اہل ڈاک اس کا ضمان دیتے ہیں ان دونوں امر سے معلوم ہوا کہ وہ امانت نہیں، بلکہ قرض ہے جو دوسری جگہ ادا کیا جاتا ہے، پس فیس بھی جزو قرض ہوا، اور مقام وصول پر چونکہ بوضع فیس ادا کیا جاتا ہے، اس لئے قرض میں کمی بیشی لازم آئی، یہ وجہ اس کے ممنوع ہونے کی ہے، بلکہ اگر یہ فیس بھی نہ ہو تب بھی حسب قاعدہ کلیہ کل قرض جر نفعاً فہو ربوا بوجہ منفعت سقوط خطر طریق کے داخل سفتجہ ہو کر مکروہ ہے، فی الدر المختار کتاب الحوالہ و کرہت السفتجہ، اور چونکہ یہ عقد اجارہ نہیں ہے جیسا اوپر مذکور ہوا، لہذا مسئلہ حمال سے اس کو کوئی مس نہیں، کما ہو ظاہر اور عموم بلویٰ طہارات و نجاسات میں مؤثر ہے، نہ حلت او حرمت میں اور تعامل اس کو نہیں کہتے، بلکہ وہ ایک قسم ہے اجماع کی، اور اس میں شرائط اجماع کا پایا جانا ضروری ہے منجملہ اس کے یہ بھی کہ

علماء عصر واحد بلا نکیر اس کو قبول کرلیں، متنازع فیہ میں یہ امر مفقود ہے، اس لئے یہ تعامل نہیں ہے ایک رواج عامیانہ ہے، جو شرعاً حجۃ نہیں، اس سے سب نظائر مذکورہ زید کا جواب نکل آیا، واللہ اعلم

البتہ بہت عرق ریزی سے اس قدر تاویل کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ فیس کو اجرت کتابت درو انگی فارم کی کہا جاوے، اس سے حرمت تفاضل تو دفع ہو جاوے گی، مگر کراہت سفتجہ کی باقی رہیگی، واللہ اعلم،

۱۸ ذیقعدہ ۱۳۲۰ھ (امداد ج ۳ ص ۲۷ و حوادث اول ص ۱۲)

حل شبہات متعلق منی آرڈر

سوال، (۱۹۱) آیا جواز منی آرڈر کی یہ تاویل ہو سکتی ہے یا نہیں کہ اس معاملہ کو اجارہ اور فیس کو روپیہ پہونچانے کی اجرت کہا جاوے، اور اس پر جو دو شبہے ہوتے ہیں، ایک یہ کہ روپیہ بعینہٖ نہیں پہنچایا جاتا، دوسرے ہلاک سے ڈاک خانہ پر ضمان مشروط ہوتا ہے، ان کا آیا یہ جواب ہو سکتا ہے یا نہیں کہ روپیہ بوجہ نقد ہونے کے تعیین سے متعین نہیں ہوتا بلکہ ہر مثلی کا یہی حکم ہے، کہ اس میں تعیین نہیں ہوتی جیسے انڈا کہ خلقتاً مثلی ہے، اور چھتری کہ عنفاً مثلی ہے اور ضمان اجیر مشترک پر ایسی صورت میں کہ ہلاک بفعل اجیر نہ ہو گو وہ ہلاک ممکن الاحتراز ہو، صاحبین کے نزدیک مشروع ہے، بینوا توجروا،

الجواب، یہ تاویل صحیح نہیں، انہیں دو شبہوں کی وجہ سے جو سوال میں مذکور ہیں، اور ان کے جو جواب دیئے گئے ہیں ان میں سے اول کا جواب تو بالاجماع صحیح نہیں، کیونکہ یہ عدم تعیین صرف عقود میں ہے، باقی امانات و غصوب میں نقود بھی متعین ہیں، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کا روپیہ کسی کے پاس امانت ہو تو اس کو بلا اذن مالک کے یہ جائز نہیں کہ اس روپے کو خرچ کرے کہ دوسرا اس کا عوض دیدوں گا، البتہ اگر اذن سے ایسا کیا تو پھر وہ قرض ہو جائے گا، اسی طرح اگر کسی کا روپیہ غصب کرلیا، اور اس کے موجود رہتے ہوئے چاہے کہ یہ واپس نہ کروں اپنے پاس سے دوسرا دیدوں تو مالک کو انکار کر دینے کا اور بعینہٖ اپنا روپیہ لینے کا حق حاصل ہے، اور دوسرے مثلیات غیر نقود میں تو یہ حکم بہت زیادہ ظاہر ہے، مثلاً کسی نے کسی کے پاس مرغ کے دس انڈے امانت رکھے، یا یہ کہ اس نے اس سے غصب کرلئے اور ان کے ہوتے ہوئے وہ امین یا غاصب بدون رضائے مالک کے یہ چاہے کہ یہ وہ انڈے نہ دوں، بلکہ دوسرے انڈے اپنے پاس سے دیدوں تو اس کو یہ حق حاصل نہیں، اور اگر رضا سے ایسا ہو تو وہ لہٰذا امانت یا رد مغصوب نہ رہے گا، بلکہ مبادلہ اور بیع میں داخل ہو جائے گا، اور ذوات القیم میں یہ حکم اور بھی زیادہ ظاہر ہے، گو نظر ظاہری میں کوئی چیز مثلی معلوم ہوتی ہو، مثلاً کسی نے کسی کے پاس کسی خاص نمبر کی چھتری امانت

رکھی یا اس نے اس سے غصب کرلی۔ یہ امین یا غاصب اگر یہ چاہے کہ وہ چھتری خود رکھ کر دوسرے کسی نمبر کی دیدوں تو یہ حق اس کو حاصل نہیں جس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ متعین ہے، بہرحال امانات و غصوب میں خود نقود بھی متعین ہوتے ہیں: تا بغیر نقد شئی یا قیمتی چہ رسد؟ فقہاء نے اس قاعدہ کی تصریح بھی کی ہے۔ اور الفاظ حدیث علی الید ما اخذت بھی اس پر صاف دال ہیں پس یہ جواب مؤول کا صحیح نہیں ہوا۔

اور دوسرے شبہ کا جواب اول تو امام صاحبؒ کے قول پر صحیح نہیں، دوسرے اگر روپیہ بعینہ جاتا تو صاحبینؒ کے قول پر صحیح ہوسکتا تھا، اور جب یہ نہیں تو وہ اجارہ ہی ہیں جو ڈاک خانہ کو اجیر مشترک کہا جاوے، اس لئے صاحبین کے قول پر بھی یہ جواب نہ چلا، تیسرے اگر اس سے قطع نظر بھی کرلی جائے تب بھی پہلا شبہ تو ہر حال میں باقی ہے، سو اس معاملہ کے اجارہ نہ ہونے پر جو دو دلیلیں تھیں غایۃ مافی الباب ایک منتفی ہو جاوے گی۔ مگر جو باقی ہے وہ بھی اثبات دعوئی کے لئے کافی ہے، کیونکہ دعوے کے لئے مطلق دلیل کی حاجت ہے، نہ کہ دلیل خاص کی، یہی وجہ ہے کہ اہل فن نے اس کی تصریح کی ہے کہ نفی دلیل خاص مستلزم نفی مدلول کو نہیں کیونکہ خاص کی نفی سے عام کی نفی لازم نہیں آتی، خلاصہ یہ ہے کہ جواز منی آرڈر کی وہ تاویل جو سائل نے نقل کی ہے صحیح نہیں اور یہ معاملہ اقراض اور استقراض ہی میں داخل ہے، اگرچہ متعاقدین کا یہ قصد نہ ہو۔ جس طرح سے کہ امانت کے باذن صرف کر دینے سے وہ قرض ہو جاتا ہے گو اس کا قصد نہ ہو، البتہ فیس کو اجرت کتابت و روانگی فارم کی کہہ کر حرمت تفاضل کو دفع کیا جاسکتا ہے لیکن کراہت سفتجہ کے رفع کی کوئی وجہ خیال میں نہیں آتی، گو ابتلائے عام کی وجہ سے دل ضرور چاہتا ہے کہ اس کی بھی کوئی وجہ نکل آوے۔ اور اکثر غور بھی کیا جاتا ہے، اور اس کا بھی انتظار رہتا ہے کہ کوئی دوسرے صاحب علم مطلع فرماویں حتیٰ کہ اگر یہ بھی نقل صحیح سے معلوم ہو جاوے کہ سفتجہ کے جواز کی طرف ائمہ اربعہ میں سے کوئی امام گئے ہیں تب بھی بضرورت اس پر عمل کرنے کو جائز کہا جاوے گا، لیکن قواعد حقہ سے خروج کی جرأت نہیں ہوتی اور حدیث اجرؤہم علی الفتیا اجرؤہم علی النار سے ڈر لگتا ہے،　کتبہ اشرف علی

۲۲ جمادی الاخری ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ۲ ص ۲۴)

تحقیق منی آرڈر

سوال (۱۹۲) منی آرڈر کے ذریعہ سے جو روپیہ روانہ کیا جاتا ہے تو یہ معاملہ نہ تو اجارہ ہے، کیونکہ یہ روپیہ بعینہ نہیں پہونچتا اور نہ قرض اس صورت میں منی آرڈر کرنا کیونکر درست ہوگا، اور اگر منی آرڈر کرنا درست نہ ہو تو اس میں حرج عظیم ہے کیونکہ ہنڈوی اگر کھائی جاوے

تو اولاً اس کا لکھانا مکروہ ہے، اور اگر نہ بھی ہو تو وہ بٹہ سے اکثر ملتی ہے، علیٰ ہذا القیاس نوٹ اور اکثر دفعہ بٹہ پر بھی نہیں ملتی ہے، پس اس صورت میں نہایت مشکل ہے، اور اگر تھوڑی رقم مثلاً پانچ روپے سے کم روانہ کرنا ہو تو نہ اس کا نوٹ مل سکتا ہے نہ ہنڈی، اس صورت میں بجز اس کے اور کیا صورت ہوگی کہ بھیجنے والا خود روپیہ لیکر جاوے اور اس میں نہایت تنگی ہے تو اس صورت میں کیا کیا جاوے؟

الجواب منی آرڈر مرکب ہے دو معاملوں سے، ایک قرض جو اصل رقم سے متعلق ہے دوسرے اجارہ جو فارم کے لکھنے اور روانہ کرنے پر بنام فیس کے دی جاتی ہے، اور دونوں معاملے جائز ہیں پس دونوں کا مجموعہ بھی جائز ہے اور چونکہ اس میں ابتلائے عام ہے اس لئے یہ تاویل کر کے جواز کا فتویٰ مناسب ہے، ۹ شوال ۱۳۳۲ھ (حوادث اول، ۲، ص ۱۵۴)

تدبیر حفظ از بیع نوٹ بر کمی و از اعانت گئو سالہ

سوال (۱۹۳) بندہ کے یہاں نمک کی تجارت ہوتی ہے اور تین جگہ کارخانہ ہے، ایک آڑتی بہت معتبر مل گیا ہے، اس نے روپیہ بھیجنے کی سبیل یہ رکھی ہے کہ جب مال فروخت ہو جاوے تو نوٹ بھیجدیتا ہے، ایک بار میرے ذمہ اس کے روپے چاہتے تھے، بوجہ دیر میں پہنچنے روپے کے اس نے سود لگایا، تو بندہ نے اس کو سود نہیں دیا، اور یہ لکھا کہ ہمارے مذہب میں سود لینا اور دینا دونوں ناجائز ہیں، اس لئے ہم معاملہ سود کا ہرگز نہیں کر سکتے، اس نے لکھا ہے کہ ہم سود نہیں لیں گے اور یہ بھی معاملہ طے ہو گیا کہ سود کا لین دین کبھی نہ ہوگا، البتہ جب نوٹ بھیجتا ہے تو کمی کے ساتھ بھیجتا ہے، مثلاً فی سیکڑہ دو آنہ تین آنہ کاٹتا ہے، ان کے یہاں کمٹ کی شرح مختلف اوقات میں مختلف طور سے معین ہوتی ہے، اور کچھ حصہ ہمارے روپے میں سے گئو سالہ کے نام کا بھی کاٹتا ہے، اور یہ ہماری ہی تخصیص نہیں، بلکہ ان کے یہاں کا قاعدہ ہر ایک سے یہی ہے، سو بندہ یہ دریافت کرتا ہے کہ یہ امر دونوں جائز نہیں معلوم ہوتے، اس کے بارے میں کیا کیا جاوے اگر اس سے یہ کہا جاوے کہ یہ معاملہ ہم نہیں کریں گے۔ تو وہ ہرگز نہ مانے گا کیونکہ نوٹ میں کمی ان کے یہاں سود میں شمار نہیں اور گئو سالہ کی نسبت بھی نہیں مان سکتا، کیونکہ صرف ہمارے لئے قانون جدید نہیں معین کرے گا، تو اب کیا حیلہ کیا جاوے، جس سے معاملہ شریعت کے موافق رہے، اور یہ بھی تحریر فرمائیے کہ اگر وہ یہ معاملہ رکھے تو مجھ پر مواخذہ اخروی رہیگا یا نہیں، اور نوٹ میں کمی زیادتی صرف مسلمانوں کے درمیان ناجائز ہے، احب ایک

جانب مسلم ہو اور دوسری جانب کافر تو بھی جائز ہے یا نہیں، جملہ امور کو مفصلاً تحریر فرما دیجئے۔

الجواب، نوٹ کی حقیقت حوالہ ہے، اور حوالہ میں کمی بیشی جب معروف یا مشروط ہو ربوا ہے۔ البتہ اگر بلا شرط و عرف ہو تو بعض صورتوں میں تاویل صلح کی ہو سکتی ہے، مگر اب ممکن نہیں، میری سمجھ میں تو اس کی تدبیر بجز اس کے کہ نقد روپیہ اس سے لیا جاوے اور کچھ نہیں آتی، یا اس پر یہ بات ثابت کر دی جاوے کہ یہ طریقہ ہمارے مذہب میں سود ہے یا اس کی کچھ آڑھت بڑھا کر حق ٹھیرا دیا جاوے، اور یہ کہدیا جاوے کہ نوٹ برابر سرابر لیا جاوے گا اور تمہاری کمی اس اضافہ سے پوری کر دی جاوے گی، اور یہ تدبیر غالباً سہل ہے، رہا گوسالہ کا قصہ سو اگر وہ آڑھتی آپ کا مشتری ہوتا اور آپ اس سے بائع ہوتے تب تو بتاویل حط ثمن کے جائز ہو سکتا تھا۔ گویا اپنا روپیہ وہاں دیتا ہے اور آپ کو ثمن کم دیتا ہے، لیکن آڑھتی تو وکیل ہوتا ہے، وہاں یہ تاویل ممکن نہیں، اس لئے میرے نزدیک اسے یوں کہا دیا جاوے حق آڑھت اور حق گوسالہ یہ سب مجموعہ حق آڑھت میں شمار کرنا چاہئے۔ پھر خواہ وہ بہی میں کسی طرح لکھے، کچھ حرج نہیں، واللہ اعلم۔ (حوادث اول ۲ ص ۸۴)

سوال (۱۹۴) ایک شخص سود لیتا ہے، اور لوگ اس سے سود پر لیتے ہیں وہ غرض پر لیتے ہیں، جب اُن لوگوں کو بیچاروں کو کوئی سامان نہیں	دفع شبہ براءت سود دہندہ از گناہ

ہوتا یا کوئی دستگرداں نہیں دیتا تب وہ مجبوراً قرض سود پر روپیہ لیتا ہے تب ایسی حالت میں دونوں سود لینے والا اور دینے والا کیونکر گنہگار ہو گا وہ بیچارہ تو مجبوری کو لیتا ہے، جب کوئی سامان نہیں ہوتا ہے ورنہ نہیں لیتا، جب کوئی شخص دوسرا قرض بے سود کے دیدیوے تب کیونکر لے تب ایسی حالت میں صرف لینے والا گنہگار ہو گا دینے والا کیوں ہو گا؟

جواب، جو لوگ سودی روپیہ لیتے ہیں جہاں تک دیکھا گیا ہے فضول کے لئے لیتے ہیں اور جو ضرورت میں بھی لیتے ہیں تو اپنے گھر کے ذخیرہ کو زیور اسباب کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں کہ یہ بھی اپنے پاس رہے اور قرض سے کام چل جاوے، پس یہ بھی ضرورت میں لینا نہ ہوا، وہ ضرورت یوں بھی پوری ہو سکتی ہے کہ اول سب چیزیں اپنی بیچ ڈالیں، یا اپنی شان اور وضع محفوظ رکھنے کے واسطے مزدوری محنت کرنے کو عار سمجھتے ہیں، سو عقلاً و شرعاً یہ ضرورتیں قابل اعتبار نہیں، پھر ان سب کے بعد ایسے اضطرار کے وقت مردار کھانا بھیک مانگ لینا درست ہے، پس سود پر قرض لینے کی کسی

حالت میں ضرورت نہیں ہے، اس لئے یہ گنہگار ہوگا، فقط واللہ اعلم

۲۵ رشعبان ۱۳۲۱ھ (امداد، ج ۳، ص ۳۳)

حکم رقمے کہ بنام سود ملازماں را از سرکار بدست می آید

سوال (۱۹۵) چند لوگ گورنمنٹ نوکر ہیں، یعنی رسالہ میں نوکر ہوئے، کسی کو سولہ برس ہوئے اور کوئی اٹھارہ برس کا نوکر ہے اور کوئی بیس برس کا نوکر ہے۔ اور جب نوکر ہوئے تھے تو یہ قاعدہ نہ تھا، جواب دو چار سال کے نیا جاری ہوا ہے، یعنی ہر ایک سوار کا فی ماہ پانچ روپے سرکار کاٹ لیتی ہے، تعداد اڑھائی سو روپے کی ہے، جبکہ ڈھائی سو روپیہ پورا ہو جاتا ہے، پھر نہیں کاٹا جاتا ہی، اور وہ روپیہ بنک میں جمع ہو جاتا ہے۔ اور اس روپیہ کا سود ہر ماہ سرکار دیتی ہے، اور جو لوگ کہ سود لینے میں انکار کرتے ہیں تو سرکار ان سے دستخط کرالیتی ہے، اور سود کا روپیہ بھی اصل روپیہ میں ملا دیتی ہے، اور وہ روپیہ اپنے صرف میں آتا ہے، یعنی اگر سوار کا گھوڑا مر جاتا ہے تو سوار کو سرکار اُسی روپیہ سے گھوڑا خرید کر دیتی ہے، اور جس کا گھوڑا نہیں مرتا ہے تو اس کو سرکار ہر ماہ سود دیتی ہے، غرض کوئی بچنے کی صورت نہیں، کہ اس کا روزگار بھی قائم رہے اور سود سے بھی بچے مگر گھوڑا نہ مرے تو جس وقت نوکری چھوڑ کر آوے اس وقت اس کا روپیہ جمع و سود کُل سرکار دیتی ہے اور اگر وہ چاہے کہ میں جمع لے لوں اور سود نہ لوں تو اس کی جمع کا روپیہ بھی مارا جاتا ہے اور تنخواہ مبلغ ۲۳ روپیہ ماہوار کی ہے

الجواب - خاص اس صورت میں سرکار جو سود کے نام سے دیتی ہے وہ سود نہیں ہے اسکا لینا درست ہے، لیکن خدارا دوسری صورتوں کو اس پر قیاس نہ کیا جاوے لان مالہم مباح برضاہم وانما یلحق فی بعض الصور اثم العقد ولا عقد بالجبر، لیکن اگر یہ مقدار سود مذکور کی مساکین میں صرف کر دی جاوے تو خوب ہے، دع ما یریبک الی ما لا یریبک فقط،

۲۷ صفر ۱۳۳۲ھ (امداد ج ۳ ص ۳۳ و حوادث ۱ و ۲، ص ۸۴)

محکمہ ریل میں ملازمین کی تنخواہ کا کوئی جزو جو کٹ جاتا ہے اور وہ مع سود ملتا ہے اس سود کا حکم

سوال (۱۹۶) محکمہ ریل میں جن ملازمین کو پندرہ روپے ماہوار یا اس سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے، ان کی تنخواہ کا بارھواں حصہ کاٹ لیا جاتا ہے، اور سرکار میں جمع رہتا ہے یعنی ایک سال میں ایک ماہ کی تنخواہ کٹ کر سرکار میں رہتی ہے، اس روپیہ پر منافع ریلوے کی آمدنی کے حساب سے ملتا ہے، بعض وقت اصل رقم کے برابر بعض وقت زیادہ بھی اور بعض وقت کم، غرض کہ جس قدر منافع ہو اُسی قدر ہوتا ہے یہ منافع ملازم

کو ملتا نہیں، بلکہ ریلوے میں جمع رہتا ہے، ان دونوں رقموں پر سود بھی ملتا ہے تین روپے فی صدی یا چار روپے فی صدی، اس ریاست کی ریلوے میں جس قدر مسلمان ہیں اُن میں سے تمام یہ منافع لیتے ہیں، اور سود اکثر نہیں لیتے ہیں اور بعض لیتے بھی ہیں، تنخواہ کا بارھواں حصہ انہیں لوگوں کا کاٹا جاتا ہے جن کی ملازمت مستقل ہو اور پندرہ یا پندرہ سے زیادہ تنخواہ ہو، غیر مستقل اور پندرہ روپے کم تنخواہ والوں سے نہیں کاٹا جاتا، یہ تمام روپیہ صرف اُس وقت ملتا ہے جب ملازم ملازمت ترک کرے اور کوئی حرکت ایسی نہ کی ہو جو بدنامی کے ساتھ علیحدہ کیا جاوے ورنہ نہیں ملتا، مدت ملازمت کے زمانہ میں اگر کوئی وصول کرنا چاہے تو نہیں کرسکتا، ملازمت گورنمنٹ میں پنشن ملتی ہے، ریلوے میں پنشن نہیں بجائے پنشن یہ روپیہ ملتا ہے، ملازم کو بہ مجبوری یہ روپیہ کٹوانا پڑتا ہے، اس کا اختیار نہیں کہ کٹوائے یا نہ کٹوائے، آپ اس منافع کی رقم کے بارے میں کیا فرماتے ہیں، یہ سود میں تو شمار نہیں، یہ قاعدہ ہر ایک ریلوے میں ہے،

الجواب، لینا اس کا جائز ہے اور یہ سود نہیں ہے، وجہ اس کی تحریر سے سمجھ میں نہیں آسکتی، ۲۷ جمادی الاخریٰ ۱۳۳۷ھ (حوادث اول ص ۳۳، تتمہ اولیٰ ص ۱۶۸)

سوال (۱۹۷) گورنمنٹ دریافت کرتی ہے کہ ہر ملازمین سرکار اپنی تنخواہ میں سے ۶¼ سے ۱۲½ روپیہ صدی کے حساب سے ہر مہینہ میں خزانہ سرکار میں جمع کریں، اور وہ کل رقم بعد علیحدہ ہونے نوکری سرکاری کے خواہ پنشن ہونے پر یا خود نوکری چھوڑ دے اس وقت کل روپیہ اس کا بمعہ چار روپے فی صدی سود کے سرکار واپس دے گی؟

الجواب، جواب مسئلہ کا یہ ہے کہ تنخواہ کا کوئی جزو اس طرح وضع کرا دینا اور پھر یکمشت وصول کرلینا اگرچہ اس کے ساتھ سود کے نام سے کچھ رقم ملے یہ سب جائز ہے، کیونکہ درحقیقت وہ سود نہیں ہے اس لئے کہ تنخواہ کا جو جزو وصول نہیں ہوا وہ اس ملازم کی ملک میں داخل نہیں ہوا پس وہ رقم زائد اس کی مملوک شے سے منتفع ہونے پر نہیں دی گئی، بلکہ تبرع ابتدائی ہے، گو گورنمنٹ اس کو اپنی اصطلاح میں سود ہی کہے، فقط، ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ

(حوادث اول و دوم ص ۳۴ و تتمہ اولیٰ ص ۱۷۰)

سوال (۱۹۸) ریلوے ملازموں کو پنشن نہیں ملتی ہے، بجائے اس کے وہاں یہ قانون ہے کہ ملازم کی تنخواہ سے مثلاً فی صدی دو روپے کاٹ لیتے ہیں، اور یہ وضع تنخواہ حسب قانون ریلوے لازم ہے، چاہے کوئی راضی ہو یا نہ ہو، اور جس قدر ماہ بماہ وضع کرتے

ہیں اسی قدر کمپنی یا گورنمنٹ اپنی طرف سے اس شخص کے لئے نام زد کردیتی ہے اور یہ مجموعہ جو ماہ بماہ اس کی تنخواہ سے اور کمپنی کی طرف سے ہی اس کو تجارت میں لگادیتے ہیں، اور اس کے اصول مقررہ کے مطابق اس کے نفع کو جس کو وہ سود کہتے ہیں. برابر اس کے لئے رکھتے جاتے ہیں، جب ملازمت کا زمانہ ختم ہوجاتا ہے تو یہ سب روپیہ اس کو یک مُشت دیدیتے ہیں تنخواہ سے جو کچھ وضع کرلیتے ہیں وہ تو اس کا حق ہے، اس کی حلت میں تو کوئی شبہ نہیں اور کمپنی اپنی طرف سے جو ڈبل روپیہ اس کے لئے نام زد کرتی ہے وہ بھی عطاء سلطانی یا انعام کہا جا سکتا ہے،، رہا وہ سود تو کیا اس کو سود کہہ کے لینا حرام کہا جاوے یا وہ بھی محسوب انعام میں ہوگا، کمپنی والے اس کو سود ہی کہتے ہیں، چنانچہ ہر سہ ماہی میں اس کا حساب بھیجتے رہتے ہیں، کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سب انعام اور جائز ہے وہ چاہے اس کو سود کہیں یا جو چاہے کہیں، بندہ نے اس مسئلہ میں بہت غور کیا تو اس طرف زیادہ خیال جاتا ہے، حضور جوارشاد فرمادیں

جواب ، بندہ کا مدت سے یہ خیال تھا کہ یہ بھی صلہ ہے، تسمیہ سے حرمت نہیں آتی۔

۸ ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ (حوادث خامسہ ص ۳۶)

سوال (۱۹۹) بعض سرکاری ملازم گورنمنٹ سے بذریعہ کاغذات طے کرلیتے ہیں کہ ہماری تنخواہ سے دس روپے مثلاً وضع کرلیا جاوے اور مثلاً بیس. برس بعد اس روپے سے جتنا جمع ہو یکمشت ہم کو دیا جائے، اب سرکاری دستور العمل یہ ہے کہ روپیہ وضع ہونا شروع ہوجاتا ہے، اگر یہ ملازم بیس برس تک زندہ رہا تو یکمشت اپنا جمع شدہ روپیہ وصول کرلیتا ہے اس سے قبل کچھ وصول نہیں کرسکتا، لیکن اگر مرگیا تو بغیر شرط کے خود گورنمنٹ وارثان میت کو اتنا روپیہ دیدیتی ہے جتنا اس ملازم کا بیس برس میں جمع ہوتا، اگرچہ ملازم یہ کارروائی کرنے کے دو ماہ بعد ہی مرجائے اور زندہ رہنے کے تقدیر پر جمع شدہ پر کچھ اضافہ بھی ملتا ہے، بعض لوگ اس کو قمار میں داخل کرتے ہیں، حالانکہ تعریف صادق نہیں آتی کیونکہ مال من الجانبین نہیں ہے، اس لئے کہ تنخواہ کا حصہ غیر مقبوض ابھی تک ملک میں داخل نہیں جیسے جناب کے حوادث الفتاوی صفحہ ۳۵ سے ظاہر ہوتا ہے، اب اس مسئلہ کے متعلق جواز و عدم جواز کی تصریح فرمادیں اور نیز یہ شبہ بھی رفع فرمادیں کہ موافق کتب فقہیہ اجارہ میں اجرۃ شروط ثلاثہ میں سے ایک شرط پائے جانے سے مملوک ہوجاتی ہے تعجیل یا شرط

تعجیل، یا استیفاء منافع، اب ملازم جب ایک ماہ کام کر چکا تو ایک ماہ کے منافع کا تو استیفاء ہو گیا، لہٰذا ایک ماہ کی اجرت بھی مملوک ہونی چاہئے اگرچہ قبضہ نہ ہوا ہو، علاوہ اس کے شرط تعجیل اگرچہ نہیں ہے، المعروف کالمشروط کا قاعدہ جو فقہاء کام میں لاتے ہیں یہاں کیوں نہ جاری کیا جائے۔ حالانکہ دستور العمل بھی تائید کرتا ہے، کہ ماہواری تنخواہ باقاعدہ نہ ملنے سے ملازمت ترک کر دی جاتی ہے، اب حصہ غیر مقبوض جو مملوک نہیں ہے، اس کو مدلل و موجہ فرمانے کی تکلیف دی جاتی ہے اور یہ بھی معلوم کرنا مقصود ہے کہ مطلقاً اجارات کا یہ قاعدہ ہے یا ملازمت ہی کے ساتھ یہ مختص ہے؟

الجواب، اصل مدار اس معاملہ کے جواز کا اباحۃ مال حربی برضاہ ہے جو علماء اس کو جائز رکھتے ہیں، ان کے نزدیک اس میں سب مذکورہ صورتیں داخل ہو گئیں، باقی میں نے یہ چاہا تھا کہ کسی عقد غیر مختلف فیہ میں اس کو داخل کر لیا جاوے، اس وقت حوادث والی توجیہ خیال میں آئی، اور استیفاء معقود علیہ سے مملوک ہو جانا ذہن میں نہیں رہا، مگر کبھی کبھی کھٹک ہوتی تھی، آج آپ کی تنبیہ سے (جزاکم اللہ تعالیٰ) کتاب دیکھی۔ وہ بناء میری غلط ثابت ہوئی (کذا فی الہدایۃ باب الاجر متی یستحق) اب یہ توجیہ مدار جواز نہ رہی، صرف بناء اول باقی رہی، جو مختلف فیہ ہے، اور علاوہ میں جو آپ نے تعجیل کی نسبت لکھا ہے وہ مفہوم نہیں ہوا، کیونکہ تعجیل سے مراد یہ ہے کہ استیفاء منافع سے قبل دیدیا جاوے، یہاں یہ نہیں ہے

۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۲ھ (تتمہ ترجیح خامس ص ۱۳)

السوال (۲۰۰) بعض محکموں میں گورنمنٹ جبراً تنخواہ سے کچھ کاٹ لیتی ہے اور جتنا کاٹتی ہے قریب قریب اتنا ہی اپنے پاس سے بنام سود جمع کرتی رہتی ہے، پھر پنشن کے بعد وہ سب روپیہ ملتا ہے، درمیان میں اگر کوئی ضرورت واقع ہو تو تین ماہ کی تنخواہ کی مقدار تک مل سکتا ہے، جس کو ۲۴ ماہ میں باقساط وصول کر لیا جاتا ہے لیکن سود بھی دینا پڑتا ہے (لیکن وہ سود بھی اسی کے حساب میں لگا دیا جاتا ہے، تاکہ روپیہ نکالنے کی وجہ سے جو سود میں کمی واقع ہو گئی تھی وہ پوری ہو جاوے، اور روپیہ نکالنے کی وجہ سے اس رقم میں کوئی فرق واقع نہ ہو جو بعد پنشن کے ملے گی)، شرعاً اس طرح روپیہ نکالنا جائز ہے یا نہیں، کیونکہ اس میں سود دینا پڑتا ہے

لہ جب اجرت قبیل اعیان سے ہو تو استیفاء منافع سے اجرت کا مملوک ہو جانا معقول ہے اور اگر نقود ہیں جیسے ہو کمافی صورۃ السوال تو اسکا مملوک ہونا معقول نہیں کمافی ثمن المبیع، لہٰذا بنام سود دی ہوئی رقم حلال ہے ۱۲ شفیع عفی عنہ

گو وہ اپنے ہی حساب میں جمع ہو جاتا ہے ؟

الجواب، اس سوال میں دو جزء قابلِ تحقیق ہیں، ایک اپنی تنخواہ کی رقم پر گورنمنٹ سے سود لینا، سو یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، اس لئے ایسے شخص کو خصوصیت کے ساتھ گنجائش ہے جس کی تنخواہ جبراً وضع کرلی جاوے، دوسرا جزء جو رقم درمیان میں لی جاتی ہے اس پر سود دینا، سو یہ اس مسئلہ مختلف فیہا میں تو داخل نہیں، کیونکہ وہ مسئلہ اخذ سود کا ہے۔ اور یہ اعطاء سود ہے جس کی حرمت متفق علیہا ہے، لیکن اس میں ایک تاویل ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ یہ شخص گورنمنٹ سے قرض نہیں لیتا۔ بلکہ اس کا جو قرض گورنمنٹ کے ذمہ ہے، اس کے ایک حصہ کا مطالبہ کرتا ہے، جس کا اس کو شرعاً حق ہے، پھر جس وقت اس رقم کو واپس کرتا ہے یہ واپسی ادائے قرض نہیں بلکہ مثل دیگر رقم جمع شدہ کے یہ بھی گورنمنٹ کو قرض ہی دیتا ہے، اور جب واپس کردہ رقم خود اس کی ملک ہے، اور سود ہوتا ہے دوسرے کی مملوک رقم پر، اس لئے یہ جو سود کے نام سے دیا گیا ہے سود نہیں ہے، پس اس کا دینا اعطاء سود بھی نہیں اس لئے اس کو ناجائز نہ کہا جاوے گا، بلکہ اخذ مذکور کی حلت تو مختلف فیہ بھی ہے اور اس اعطاء کی حلت اس تاویل پر متفق علیہ ہوگی، البتہ پھر اس رقم پر جو اخیر میں گورنمنٹ سے سود لیا جاوے گا وہ پھر اخذ مختلف فیہ ہوگا کما سبق واللہ اعلم۔ ۱۲ شوال ۱۳۵۲ھ (النور ص ۹ ربیع الاول ۱۳۵۴ھ)

نفع پرامیسری نوٹ

سوال (۲۰۱) انگریزی پرامیسری نوٹ کے منافع کا لینا گورنمنٹ سے جائز ہے یا ناجائز، بینوا توجروا،

الجواب، فی الھدایۃ ولا ربوا بین المسلم والحربی دلت ھذہ الروایۃ بعد تفصیلہا بتعلیلہا علی کون المال الذی حصل من حربی برضاہ بلا غدر ولو بالعقود الفاسدۃ او الباطلۃ مباحاً عند ابی حنیفۃ واباحۃ المال لا یستلزم اباحۃ العقد کما اذا باع الحرمن المستقرض الجاحد لاستیفاء حقہ والوعید الوارد فی النصوص لم ینحصر فی اکل المال بل یعم الاکل والعقد والاعانۃ کما روی لعن اللہ اکل الربوا ومؤکلہ وشاہدیہ وکاتبہ الحدیث فاقتضی ھذا المجموع ان المال فی الصورۃ المسئول منہا مباح وھذا العقد حرام اثم فالاخذ من المسلم والذمی یاثم باثمین ومن حربی باثم واحد ھذا اذا ثبت کون الدار دار حرب ولم یثبت توۃ دلیل الجمہور والا فلا مساغ لاباحۃ المال ایضاً واللہ اعلم ۹ ربیع الثانی ۱۳۲۲ھ

(امداد، ج ۲، ص ۱۴۳، حوادث اول، ص ۸۶)

ربوا در ہندوستان | **سوال** (۲۰۲) ہندوستان میں یہود و نصاریٰ سے سود لینا حسب رائے مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ درست معلوم ہوتا ہے، اور حسب تحریر مولانا عبدالحیٔ صاحب علیہ الرحمۃ نادرست ، از روئے تحقیق کس کا قول معتبر ہے؟

جواب - احقر نے دونوں بزرگوں کی تحریر نہیں دیکھی ورنہ شاید ان کے متعلق کچھ کہہ سکتا بہرحال نفس مسئلہ میں جو کچھ میری سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے لا یباح العقد لکونہ ربوا نھی عنہ نصا قطعیا ویباح المال المأخوذ لان مال الحربی مباح برضاہ بلا عذر ولو اراد احد من اصحاب الفتاوی حکم بحل العقد مقصودا واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم، ۱۲ شعبان ۱۳۲۲ھ

سوال متعلق سوال بالا

(توضیح سوال مذکور) اقول یختلج فی قلبی اما اولا فان العلامۃ الدھلوی قد صرح بجواز اخذ الربوا من الحربی کما یدل علیہ کلامہ المنقول ولم یقل صراحۃ ولا اشارۃ ان المال مباح دون العقد واما ثانیا فلان العقد الربوی من الحربی لا یخلو عن ان یکون اما صحیحا او فاسدا او باطلا فعلی الاول لا یصح الحکم بعدم اباحۃ العقد کما ھو ظاھر وعلی الثانی الحکم بعدم اباحۃ العقد صحیح اما الحکم باباحۃ المال فغیر صحیح لان فساد العقد یورث خباثۃ فی المال کما ھو مصرح فی الفقہ وعلی الثالث فحکم العقد والمال ظاھر ولم تجد فی الکتب نوعا من العقد بحیث یکون العقد فاسدا او باطلا والمال حلالا واما ثالثا فان النص المحرم قولہ تعالیٰ احل اللہ البیع وحرم الربوا قطعی والخبر لا ربوا الحدیث لیس متواترا ولا مشھورا فبای حجۃ خصص اصحابنا نصا قطعیا فعلیکم الجواب بالدلیل لیشفی العلیل، مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ کی عبارت محررہ ذیل میں مذکور ہے،

مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالعزیز قدس سرہ ج اول ص ۳۳ (سوال) تمامی قلیم نصاریٰ باتفاق دار الحرب ہست یا نہ اگر ہست اہل اسلام را از ان نصاریٰ سود گرفتن جائز ست یا نہ؟ (جواب) بشرطیکہ در دار الحرب در روایات فقہیہ مذکور است ملاحظ

باید نمود چنانچہ برخے ازاں دریں قرطاس ثبت خواہد شد دریں اقلیم آں شروط با یدجست اگر محقق شدند پس دار الحرب قرار یافت وبحکم اذا ثبت الشئی ثبت بلوازمہ ہرگاہ دار الحرب شد ربوا گرفتن ودادن بکفرۂ آنجا جائز شد، زیراکہ در ہدایہ مذکورست ولاربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب وقاعدہ مقرراست کہ الاطلاق فی الروایات نفی عن تعمیمہ پس ہر دو صورت اخذ واعطا در نفی داخل لیکن مسلمان را باید کہ در دادنِ سود بحربی احتیاط کند بے ضرورت ندہد، ایضاً فیہ ص۲۶ (سوال) سود دادن بحربیان درست است یا نہ (جواب) عبارات کتب فقہیہ عام واقع شدہ اند دادن وگرفتن را شامل اند مثل لاربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب، وقاضی ثناء اللہ صاحبؒ پانی پتی در رسالہ توجیہ دادن سود نیز نوشتہ اند ایں وقت فقیر را یاد نیست لیکن ایں قدر ظاہر است کہ گرفتن سود از حربیان بایں وجہ حلال ست کہ مال حربی مباح است اگر در ضمن آں نقض عہد نباشد وحربی چوں خود بخود دہد بلاشبہ حلال خواہد بود دادنِ سود بحربیاں بایں وجہ حلال ست کہ خورانیدن حرام بمسلمان درست نیست وآنہا حرام خوارند اگر چیزے بطریق سود دادہ خواہد شد بیش ازیں نیست کہ حرام خواہد خورد

الجواب، قد رأیت کلامہ رحمہ اللہ تعالٰی الدال علی ما فہمتم فی قولکم اولا ولکن حجیتہ الدال تتوقف علی صحتہ فی نفسہ وثبوتہ بالدلیل ولو یثبت ثم اطلاقہ فی الاخذ والاعطاء مخالف لما صرح بہ فی الشامیۃ ان الفتح مؤید لہ بالسیر الکبیر من ان مرادھم ما اذا حصلت الزیادۃ للمسلم لا مطلقا وما قلتم ثانیا فاقول عن العقد عندی فاسد او باطل ولا نسلم استلزام فساد العقد او بطلانہ لخبث المال الاتری ان عقد بیع الحر حرام وباطل لکن لو باع من مدیونہ الجاحد للدین بمثل دینہ وقبض المال نادیا للاستیفاء بحقہ یحل المال مع بطلان العقد ویتاید بما فی رد المحتار من قول الدر المختار مطلقا بقولہ ای ولو بعقد فاسد تحت قولہ لان مالہ ثمہ مباح فیحل برضاہ مطلقا آہ فحکم بکون العقد فاسد او کون المال حلالا وما قلتم ثالثا فالنص محرم للعقد وھو فیما ذھبت الیہ فی فہم مراد اصحابنا حرام ولم ار احدا من اصحاب الفتاوی فی المذاہب حکم بحلہ مقصود الماحل المال فالآیۃ غیر متعرضۃ لہ اثباتا او نفیا فلا دلالۃ ولا تخصیص، واللہ اعلم، ۱۳، ذیقعدہ ۱۳۳۱ھ

(امداد، ج ۳ ص ۴۴ حوادث اول ۲ ص ۸۶)

ربوا ہندوستان | **السوال** (۲۰۳) امداد الفتاوی جلد سوم کتاب الربوا، ص ۳۴ و ۳۵ کو میں نے مطالعہ کیا، اس میں (لا یباح العقد الخ) اور (ولم ار احداً من اصحاب الفتاوی الخ) کے متعلق بدائع الصنائع کی عبارت سے ہمارے فہم ناقص میں کچھ شبہ ہوتا ہے، اس لئے بدائع کی عبارت کو بعینہ نقل کرتا ہوں لھما ای لابی حنیفۃ رح ومحمد رح ان مال الحربی لیس بمعصوم بل ھو مباح فی نفسہ الا ان المسلم المستامن ممنوع من تملکہ من غیر رضاہ لما فیہ من الغدر والخیانۃ فاذا بذلہ باختیارہ ورضاہ فقد زال ھذا المعنی فکان الاخذ استیلاء علی مال مباح غیر مملوک وانہ مشروع مفید للملک کالاستیلاء علی الحطب والحشیش وبہ تبین ان العقد ھھنا لیس بتملک بل ھو تحصیل شرط التملک وھو الرضاء لان ملک الحربی لا یزول بدونہ ومالم یزل ملکہ لا یقع الاخذ تملکا لکنہ اذا زال فالملک للمسلم یثبت بالاخذ والاستیلاء لا بالعقد فلا یتحقق الربوا لان الربوا اسم لفضل یستفاد بالعقد (بدائع الصنائع جلد ۵ فصل شرائط جریان الربوا صفحہ ۱۹۲) جس عبارت پر لکیر ہے اس کو امداد الفتاوی کی مذکورہ عبارت کے بظاہر مخالف سمجھتا ہوں، اگر غیر مناسب نہ سمجھا جاوے تو رفع شبہ فرما کر سرفراز فرمایا جاوے

الجواب: ظاہر تو وہی ہے جو آپ نے سمجھا، لیکن اتنا سوال اور بھی باقی رہ جاتا ہے کہ خود تلفظ بصیغۃ العقد کا شرعاً کیا حکم ہے، کیا اس تلفظ کو معصیت نہ کہیں گے جیسے کسی مسلمہ فاسقہ سے نکاح ہونا موقوف ہے اس کی رضا پر، اگر وہ رضا موقوف ہو کسی کلمہ فسقیہ کے تلفظ پر، تو اس تلفظ کا کیا حکم ہوگا، میری یہی مراد ہے، کیونکہ عقد کی اصل حقیقت صیغہ خاصہ کا تلفظ ہے، گو کہیں دلیل سے غیر تلفظ قائم مقام تلفظ کے ہو جاوے، (النور ص ۳۱ شعبان ۱۳۵۲ھ)

رسالہ رافع الضنک عن منافع البنک[1]

حکم سود از بنک | **سوال** (۲۰۴) علماء حنفیہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے سوالات ذیل ہیں، ان کے جوابات بحوالہ اسناد تحریر فرمائے جائیں۔

---

[1] تنبیہ از حضرت حکیم الامۃ دام ظلہم العالی:- یہ رسالہ بنک وغیرہ سے سود لینے کے مسئلہ میں میری آخری تحقیق ہے، اگر کوئی تحریر میری اس کے خلاف دیکھی جاوے وہ سب اس سے منسوخ (یعنی مرجوع عنہ) ہے ۱۲ اشرف علی

[2] دیکھیے سوال ۲۰۵

سونگ بنک اور بنگال بنک اور لندن بنک کہ جس کی شاخیں اکثر مقامات پر ہندوستان میں ہیں کہ جو خالص گورنمنٹ انگلشیہ کے سرمایہ سے ہیں، اس میں روپیہ داخل کرکے اس کا سود لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں، گورنمنٹ انگلشیہ کو ملک ہندوستان میں کسی قسم کا قرضہ دینا اور اس کا سود لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں، آمدنی وقف کا ایسے بنکوں میں یا ایسے قرضوں میں صرف کرکے اس کا سود مصارف وقف میں صرف کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں، بینوا توجروا،

الجواب ۔ اولاً چند اصول بطور مقدمات کے ممہد کرتا ہوں، پھر جواب عرض کروں گا۔

مقدمہ اولیٰ، جو مسئلہ ہمارے اصحاب میں مختلف فیہ ہو اس کی قواعد ترجیح میں بعد تطبیق بین الاقوال المختلفۃ یہ فیصلہ ہے کہ جو شخص قوت دلیل کو سمجھ سکتا ہے، وہ اس قول کو لے جو دلیلاً اقویٰ ہو، فی مقدمۃ الدر المختار رسم المفتی ان ما اتفق علیہ اصحابنا فی الروایات الظاہرۃ یفتی بہ قطعا واختلف فیما اختلفوا فیہ والاصح کما فی السراجیۃ وغیرہا انہ یفتی بقول الامام علی الاطلاق ثم بقول الثانی ثم بقول الثالث ثم بقول زفر والحسن بن زیاد وصحح فی الحاوی القدسی قوۃ المدرک فی رد المحتار قوۃ المدرک ای الدلیل وبہ عبر فی الحاوی قال والذی یظہر فی التوفیق ای بین ما فی الحاوی وما فی السراجیۃ ان من کان لہ قوۃ ادراک بقوۃ المدرک یفتی بالقول القوی المدرک والا فالترتیب اول یدل علیہ قول السراجیۃ والاول اصح اذا لم یکن المفتی مجتہدا فہو صریح فی ان المجتہد یعنی من کان اہلا للنظر فی الدلیل یتبع من الاقوال ما کان اقوی دلیلا والا اتبع الترتیب السابق وعن ہذا تراہم قد یرجحون قول بعض اصحابہ علی قولہ کما رجحوا قول زفر وحدہ فی سبع عشرۃ مسئلۃ فتتبع ما رجحوہ لانہم اہل النظر فی الدلیل،

مقدمہ ثانیہ مسئلہ ربوا بین المسلم والحربی مختلف فیہ ہے امام صاحب اور امام محمد چند قیود کے ساتھ جواز کی طرف گئے ہیں، اور ابو یوسف اور ائمہ ثلاثہ عدم جواز کی طرف، فی الدر المختار باب الربوا، ولا بین حربی ومسلم مستامن ولو بعقد فاسد او قمار ثمہ لان مالہ ثمہ مباح فیحل برضاہ مطلقا بلا عذر خلافا للثانی والثلاثۃ وحکم من اسلم فی دار الحرب ولم یہاجر کحربی فللمسلم الربا معہ خلافا لہما الی قولہ قلت ومنہ یعلم حکم من اسلما ثمہ ولم یہاجرا فی رد المحتار احترز بالحربی عن

المسلم الاصلی والذمی وکذا عن المسلم الحربی اذا ھاجر الینا ثم عاد الیھم فانہ لیس للمسلم ان یرابی معہ اتفاقا کما یذکرہ الشارح۔

مقدمہ ثالثہ، اعانت علی المعصیۃ معصیت ہے، قال اللہ تعالیٰ تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔

مقدمہ رابعہ، اگر کسی کا قول یا فعل دوسرے کے لئے سبب وقوع فی المعصیت کا ہو جاوے اور وہ حد ضرورت تک نہ پہنچا ہو، تو اس کا ترک اس پر واجب ہے، فروع کثیرہ فقہیہ اس اصل پر مبنی ہیں۔

مقدمہ خامسہ کالتتمۃ للرابعہ، مواقع تہمت و بدنامی سے بچنا ضروریات سے ہے،

مقدمہ سادسہ، اسباب نہی کے مختلف و متعدد ہو سکتے ہیں، تو ایک کے رفع سے باقی کا رفع لازم نہیں آتا، وہذا ظاہر،

مقدمہ سابعہ، کسی کے فتویٰ جواز کے بعد اس فعل کو ترک کرنا صاحب فتویٰ کی مخالفت نہیں ہے، البتہ فتویٰ وجوب کے بعد اس فعل کو ترک کرنا یا فتویٰ حرمت کے بعد اس فعل کا ارتکاب کرنا یہ بیشک مخالفت ہے۔

بعد تمہید ان مقدمات کے اب جواب عرض کرتا ہوں کہ مقدمۂ ثانیہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور قائلین بالجواز کے نزدیک بھی اس میں اتنی قیود ہیں۔

نمبر (۱) وہ محل دار الحرب ہو، نمبر (۲) معاملہ ربوا کا حربی سے ہو، نمبر (۳) مسلم اصلی سے نہ ہو، اور نہ ذمی سے ہو، اور مسلم اصلی وہ ہے جو دار الحرب میں آنے کے قبل اسلام لایا ہو خود یا تبعاً للآبار، نمبر (۴) معاملہ کرنے والا وہ مسلم ہو جو دار الاسلام سے دار الحرب میں امن لے کر آیا ہو، یا وہ مسلم ہو جو دار الحرب ہی میں اسلام لایا ہو وہ مسلم اصلی نہ ہو جو خود دار الحرب میں رہتا ہو، اس قید رابع کی تصریح کہیں نظر سے نہیں گذری مگر اس قاعدہ کی تصریح ہے کہ روایات فقہیہ کے مفاہیم حجت ہیں، اس بنا پر مذکورہ روایات سے یہ قید لازم ہے، اس کے بعد جو دونوں قولوں کے دلائل میں نظر کی گئی تو ابو یوسفؒ کے دلائل قوی ہیں، چنانچہ مفصلاً رسالہ تحذیر الاخوان میں ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے صرف ایک دلیل اس وقت ذکر کرتا ہوں۔ آیات تحریم ربوا میں ارشاد ہے، یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ اور ظاہر ہے کہ اس بقیہ ربوا کا معاملہ

جس وقت ہوا ہے لینے والے دینے والے سب حربی تھے، تو تحریم کے بعد اگر حربی سے ایسا معاملہ جائز ہوتا تو تحریم کے قبل تو بدرجۂ اولیٰ جائز ہوتا۔ اور وہ رقم حلال ہوتی، تو اس کا ترک کرنا کیوں فرض ہوتا، اور یہ نص قطعی ہے ثبوتاً بھی دلالۃً بھی، اور طرفین کی دلیل یا خبرِ واحد ہے یا قیاس جو کہ ظنی ہیں، اور قطعی کی تقدیم کا وجوب ظنی پر اجماعی ہے گو امام صاحبؒ پر سے اعتراض اس طرح مدفوع ہوسکتا ہے کہ اس قطعی میں سے بعض افراد مخصوص ہوجانے سے دلالۃً ظنی ہوگیا، لیکن یہ عذر گو دافع اعتراض ہوسکتا ہے مگر نافع قوت دلیل نہیں ہوسکتا یہ تو اس دلیل میں ثبوتاً کلام ہے اور دلالۃً یہ احتمال ہے کہ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں لا ربوا بین المسلم والحربی، اس میں احتمال ہے کہ یہ نفی نہی کے لئے ہو جیسا قرآن مجید میں لَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَاجِدَالَ فِي الْحَجِّ میں بعینہٖ یہی معنی ہیں، چونکہ حربی کے مال کے غیر معصوم ہونے سے شبہ اس کے جواز کا ہوسکتا تھا، حضورؐ نے اس جواز کی نفی فرمادی ہو، چنانچہ خود کتب فقہیہ میں اس قسم کی عبارت اس معنی میں وارد ہے، ففی الدر المختار عقیب الروایات المذکورۃ فلو ہاجر الینا ثم عاد الیہم فلا ربوا اتفاقاً جوہرہ فی رد المحتار ای لا یجوز الربوا معہ فھو نفی بمعنی النہی کما فی قولہ فلا رفث ولا فسوق فافہم، جب ابو یوسفؒ کے اس قول کا قوی ہونا ثابت ہوگیا، تو اس پر عمل ہوگا، جیسا مقدمہ اولیٰ میں ذکر کیا گیا تو اس قول پر اب اس کے متعلق سب سوالوں کا جواب یہ ہے کہ لا یجوز اور اگر علی سبیل التنزل امام صاحب ہی کے قول کو لیا جاوے تب بھی وہ مقید ہے، قیود مذکورہ کے ساتھ اور انہیں حسب ذیل کلام ہے،

نمبر (۱) ہندوستان کو بہت علماء نے دار الاسلام کہا ہے، دلیل اس قول کی رسالہ تحذیر الاخوان میں مذکور ہے،

نمبر (۲ و ۳) دار الحرب ہونے کی تقدیر پر بھی بہت سے لوگ غیر حربی سے معاملہ کرتے ہیں یعنی مسلم اصلی سے یا ان غیر مسلموں سے جو دار الاسلام ہونے کے وقت سے ذمی چلے آرہے ہیں۔

نمبر (۴) اس سے بھی قطع نظر کرکے جو مسلمان یہ معاملہ کرتے ہیں وہ یہاں ہی رہتے ہیں کسی دار الاسلام سے یہاں نہیں آئے اس میں بنک سے معاملہ کرنے والے بھی داخل ہیں کہ یہ قید چہارم ان میں نہیں پائی جاتی تو اس بنا پر خود امام صاحب کے قول پر بھی یہ معاملہ جائز نہ ہوا، اور اگر ان قیود سے کلاً یا بعضاً قطع نظر بھی کرلی جاوے تب بھی بنک کے معاملے میں یہ تفصیل ہوگی کہ جس بنک میں روپیہ داخل کیا ہے آیا وہ علی الاطلاق سرمایہ اور سود کا ذمہ دار ہے

خواہ اس کو نفع ہو یا نقصان یا ایسا نہیں بلکہ نقصان ہونے سے حصہ داروں پر بھی وہ نقصان ڈالا جاتا ہے، اگر صورت ثانیہ ہے تو اس کی حقیقت شرکت ہے قرض نہیں، اور ایک شریک یا اس کے ملازمین دوسرے شریک کا وکیل ہوتا ہے اور وکیل کا فعل شرعاً موکل کی طرف منسوب ہوتا ہے، اور بنک والے جیسا حصہ داروں کو سود دیتے ہیں اسی طرح دوسرے قرضخواہوں سے سود لیتے ہیں، اور ان قرضخواہوں میں کوئی قید اسلام اصلی یا غیر اصلی یا کفر کی نہیں، پس وکالت کے واسطے سے گویا اس حصہ دار نے مطلقاً مسلمانوں سے بھی سود لیا جو کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں، اور پہلی صورت میں یہ محذور تو لازم نہیں آیا کیونکہ یہ بنک والوں کے ذمہ قرض اور ان کی ملک ہو گیا لیکن دوسرا یہ محذور ضرور لازم آیا کہ اس شخص نے ایسے لوگوں کو قرض دیا جو اس سے ربوا کا نفع حاصل کریں گے تو یہ ان کی اعانت ہوئی، معصیت پر جو کہ مقدمہ ثالثہ کی رو سے معصیت ہے، پھر اس قول کے لینے سے اس وقت جو مفاسد اعتقادیہ وعملیہ شائع ہوتے ہیں مشاہدہ ہیں کہ عوام سب قیود سے قطع نظر کر کے ان صورتوں کے مرتکب ہونے لگے ہیں جو بالاجماع ناجائز ہیں اس لئے کسی کو اس قول پر عمل کرنے کی اجازت نہ ہوگی، جیسا کہ مقدمہ رابعہ میں مذکور ہوا، پھر یہ بھی مشاہدہ ہے کہ کفار کی زبانوں پر عموماً مسلمان اور جہلاء کے زبانوں پر خصوصاً علماء سخت بدنام ہوئے ہیں کہ ان لوگوں نے سود کو حلال کر دیا، اور تفصیل وتقیید کو کون ذکر کرتا ہے اس تہمت سے بچنا بھی واجب ہے اور وہ موقوف ہے اس قول کے ترک پر جیسا کہ مقدمہ خامسہ میں مذکور ہوا، اب یہاں سے یہ دو شبہے بھی زائل ہو گئے کہ اگر ہم سب قیود کی رعایت کرلیں تو اجازت ہونا چاہئے، یا یہ کہ اس قول کے ترک سے امام صاحب کی مخالفت لازم آتی ہے. جواب اول کا یہ ہے کہ قیود کی رعایت سے غایت ما فی الباب یہ لازم آیا کہ ایک سبب نہی کا مرتفع ہو گیا، مگر اس سے دوسرے اسباب نہی کا ارتفاع لازم نہیں آیا جن کا ذکر مقدمہ ثالثہ ورابعہ وخامسہ میں ہے، اور نہی کے لئے ایک سبب کافی ہے، پس نہی باقی رہی جیسا کہ مقدمہ سادسہ میں مذکور ہوا۔ اور دوسرے کا جواب یہ ہے کہ امام صاحب نے اس کو واجب نہیں فرمایا کہ اس کا ترک مخالفت سمجھا جاوے جیسا کہ مقدمہ سابعہ میں مذکور ہے، اور چونکہ یہ جواب اس باب میں بفضلہ تعالیٰ جامع مانع واقع ہو گیا کہ اگر مستقلاً شائع ہو تو انشاء اللہ تعالیٰ نافع ہو اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس کا ایک

لقب بھی رکھدیا جاوے، چنانچہ رافع الضنک (یعنی الضیق) عن منافع البنک تجویز کرتا ہوں۔

لسبع عشرین من ربیع الاول ۱۳۲۴ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۰۳)

دفع شبہ حلتِ سود بعلت افلاس مسلمانان

سوال (۲۰۵) بنظرِ حالت موجودہ وافلاس مسلمانان کیا سود کا لین دین خواہ آپس میں ہو خواہ غیر اقوام سے شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، جب آیت تحریم ربوا کی نازل ہوئی ہے افلاس اس وقت سے زیادہ تھا، اور نیز بہت سا سود ان معاملات کے متعلق باقی تھا جو کہ زمانۂ جاہلیت اور حالتِ کفر میں ہوگئے تھے اُس پر بھی حکم ہوا کہ سود چھوڑ دو ورنہ خدا اور رسول کی طرف سے اشتہار جنگ ہے جب متعاقدین کی حالتِ کفر کا سود وصول کرنا جائز نہیں رکھا گیا تو ابتداءً ایسا معاملہ کرنا کیونکر جائز سمجھا جاوے گا، دوسرے زمانۂ نزولِ وحی میں جو کفار بنی اسرائیل تھے ان کی شکایت قرآن میں موجود ہے، وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ، جب کفار کے لئے اجازت نہیں جو بعض علماء کے نزدیک مخاطب بالفروع بھی نہیں اور اسی بناء پر بعض علماء ربوا کو عقود ذمیین سے مستثنیٰ کہتے ہیں کما فی کتاب الغصب من الہدایۃ تو مسلمانوں کو جو کہ اجماعاً مخاطب بالفروع ہیں کیونکر اجازت ہوگی، اور رحمتِ مہداۃ باب الصلح میں بیہقی سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار نجران سے جن شروط پر صلح کی تھی ان میں یہ بھی قید تھی، مالم یحدثوا حدثا او یاکلوا الربا، جب کفار کو اکل ربوا سے روکا گیا تو مسلمانوں کو کیسے حلال ہوگا وما فی الکتب الفقہیۃ من انہ لاربوا بین المسلم والحربی فلا یستلزم اباحۃ المال اباحۃ العقد، واللہ اعلم،

۲۳ ذی قعدہ ۱۳۲۲ھ (امداد ص ۸۹ ج ۳، حوادث ۱، ۳۶ ص)

حکم بیمہ کمپنی

سوال (۲۰۶) یہ مسئلہ استفسار طلب ہے کہ حضور والا کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں اکثر کمپنیاں (جماعت تجارت) ایسی ہیں جو جان اور مال کا بیمہ کیا کرتی ہیں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جماعت تجارت کی جو مشترک قائم ہیں وہ مال منقولہ وغیر منقولہ پر ایک کمیشن سالانہ لیا کرتی ہیں، اور اگر اندر سال کے وہ مال صرف بذریعہ آتشزدگی کے تلف ہوجاوے تو جس قدر تعیین مال پر انھوں نے کمیشن لیا ہے اس قدر تعیین یک مشت مالک مال تلف شدہ کو دیدیا کرتے ہیں اکثر لوگ اپنی جائداد کا بیمہ کرایا کرتے ہیں، یہ طریقہ اس قدر رائج ہے کہ غالباً اس سے آنجناب بھی واقف ہوں گے، پس آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ آیا یہ طریقہ بیمہ کا شرعاً جائز ہوسکتا ہے یا نہیں، تمثیلاً یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ اکثر لوگ نوٹ وغیرہ بذریعہ رجسٹری شدہ لفافہ کے

ڈاک کی معرفت روانہ کیا کرتے ہیں جس سے مقصود صرف حفاظت نوٹ ہوتی ہے، پس اگر بیمہ کرنا ناجائز ہوگا تو غالباً رجسٹری کرکے نوٹ روانہ کرنا بھی خلاف شرع شریف ہوگا۔ امید کہ یہ سمع خراشی معاف فرمائی جاوے۔

الجواب، ان اشتہاری و تجارتی بیموں میں کمپنیاں جو مالک کو خاص صورتوں میں معاوضہ دیتی ہیں صورۃً تو وہ عوض ہے اس مال تلف شدہ کا، مگر واقع میں عوض ہے اس رقم کا جو ماہانہ یا سالانہ داخل کی جاتی ہے، کیونکہ ان کو مقصود وہی ہے ورنہ مال ضائع سے ان کو کیا نفع ہو سکتا ہے، پس باعتبار صورت کے تو یہ قمار ہے لانہ تعلیق الملک علی الخطر والمال فی الجانبین اور باعتبار حقیقت کے سود ہے، لعدم اشتراط المساواۃ فی الجانبین فیما یجب فیہ المساواۃ، اور قمار اور سود دونوں حرام ہیں، پس یہ معاملہ یقیناً حرام ہے، اسی طرح جان بیمہ صورۃً رشوت ہے لان المال فیہ عوض من غیر متقوم وہو النفس اور حقیقۃً سود ہے لعین ما مر فی المال، رہا بیمہ زیور وغیرہ کا جو ڈاک خانہ میں کرایا جاتا ہے، اس کی حقیقت اور ہے کیونکہ ڈاک خانہ والے اس چیز کو پہونچاتے ہیں اور اجرت لیتے ہیں، پس یہ معاملہ عقد اجارہ ہے اور عملۂ ڈاک اجیر ہیں، اور بیمہ زیادت اجر ہے، اور ان کی یہ ذمہ داری تاوان کی اشتراط الضمان علی الاجیر ہے، جس کو بعض فقہاء نے جائز کہا ہے بخلاف مذکورہ بیموں کے کہ کمپنی اس مال یا جان میں کوئی عمل نہیں کرتی، اس میں یہ تاویل محتمل نہیں فی الدرالمختار باب الودیعۃ و اشتراط الضمان علی الامین الخ وفی رد المحتار وانظر حاشیۃ الفتال وقد یفرق بانہ ھھنا مستاجر علی الحفظ قصدا بخلاف الاجیر المشترک فانہ مستاجر علی العمل تامل وفی الدرالمختار باب ضمان الاجیر ولا یضمن ما ھلک فی یدہ الی قولہ خلافا للاشباہ فی رد المحتار ای من انہ ان شرط ضمانہ ضمن اجماعا ح وھو منقول عن الخلاصۃ وعزاہ ابن الملک للجامع اھ قلت وفی ھذا العقد الذی یقال لہ بیمہ یستاجر بالزیادۃ علی الحفظ قصدا فکان اولی بالجواز من الاجیر المشترک ویضمن علی العمل، واللہ اعلم، ۱۵ رمضان ۱۳۲۳ھ

(امداد ص ۳۷ ج ۳، حوادث اول و دوم ص ۸۹)

حکم تبادلۂ آلو و شکر قند بغلۂ نسیہ

سوال (۲۰۷) آلو یا شکر قند دے کر اس کے عوض میں ایک مدت معینہ کے بعد غلہ لینا کس طور پر جائز ہے، مثلاً ایک روپیہ من کے

حساب سے آلو فروخت ہوتے ہیں تو اب ایک من آلو دے کر ایک روپیہ کا غلہ مدت معینہ کے بعد اس نرخ پر کہ جس نرخ سے اس وقت بازار میں غلہ فروخت ہوتا ہو لینا چاہئے یا حال میں جو نرخ غلہ کا ہے اسی حساب سے لینا چاہئے، بالتفصیل بیان فرمائیے گا

الجواب، فی الدر المختار باب الربوا وان وجد احدھما ای القدر وحدہ او الجنس حل الفضل وحرم النسأ ولو مع التساوی وفی رد المحتار فی الصفحۃ الآتیۃ وعلتہ القدر ھو القدر المتفق کبیع موزون بموزون او مکیل بمکیل بخلاف المختلف کبیع مکیل بموزون نسیئۃ فانہ جائز اھ اور گیہوں و جو طرفین کے نزدیک بوجہ نص کے ہمیشہ کے لئے ہیں اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بوجہ ہمارے عرف کے وزنی اور دوسرے غلے بالاتفاق تبعاً للعرف وزنی ہیں، کما صرح بہ فی کتب الفقہ اور آلو اور شکر قند موزون ہیں، پس آلو و شکر و قند کے عوض اگر گیہوں یا جو نسیۃً فروخت کئے جاویں تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تو کسی طرح جائز نہیں، لما مر من الدر المختار، اور طرفینؒ کے نزدیک اگر وزن غلہ کا معین ہو جاوے کہ بیس سیر مثلاً لیں گے خواہ نرخ حال و آئندہ کا اس سے کم ہو یا زیادہ ہو تو جائز ہے، لما سبق من رد المحتار، اور اگر اسی عنوان سے فروخت کیا کہ جو نرخ ہوگا مثلاً یہ نا جائز ہے اور اگر گیہوں اور جو کے علاوہ اور غلات ٹھیرائے ہیں تو بوجہ لزوم شبہ کے متحد القدر اشیاء میں نا جائز ہے، جیسا اوپر مذکور ہوا، واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم۔ ۲۰ شوال ۱۳۲۳ھ (امداد ص ۳۸، ج ۳)

دفع شبہ خبث مال حاصل برضا حربی

سوال (۲۰۸) مال الحربی فی دار الحرب للمسلم مباح لا مملوک و الملک یحصل اما بالبیع الصحیح او بالھبۃ او بالاحراز فی دار الاسلام فظھر ان الملک کما یحصل بالبیع الصحیح صحیحا کذلک یکون بالفاسد فاسدا و خبیثا فینبغی ان یکون مال الربوا مع کونہ مباح الاصل خبیث الملک والعجب ان فقہائنا لم یصرحوا بخبثہ بل یتبادر من کلامھم انہ طیب فعلیکم بدفع ھذا الاشکال فقط۔

الجواب، الجواب عن السؤال الخاص انہ لا دلیل علی انحصار اسباب الملک فیما ذکر فان الماء والکلاء سواء وجدا فی دار الاسلام او فی دار الحرب یحصل الملک فیھما بمجرد الید من غیر اشتراط الاحراز فی دار الاسلام فلما احتمل

المسلم المستامن مال الحربی بشرط ان لا یعذر فانہ حرام حصل بہ الملک من حیث انہ اخذ مع قطع النظر عن قید خارج عن حقیقتہ کالقصر یتعلق بمجرد السفر من غیر نظر الی وصف کونہ معصیۃ لیکون القصر ایضا غیر مشروع کما قالت بہ الشافعیۃ واللہ تعالیٰ اعلم (امداد ج ۳ ص ۳۹)

ابطال حیلہ سود بفلوس دادن و روپیہ گرفتن،

سوال (۲۰۹) زید کو ضرورت ہوئی کسی قدر روپیہ کی، پس عمرو کے پاس گیا اور کچھ روپیہ طلب کیا، عمرو نے ۱۹ لوٹے اور بارہ ٹکے دیدیئے اور اس وقت مبلغ ایک روپے کے چوبیس ٹکے ملتے ہیں اور زید سے عمرو نے مبلغ ۲۰ روپے لکھوائے یعنی مبلغ ۱۹ دیئے اور پورے ۲۰ لکھوالئے اور بعد ختم اجل مقررہ کے اس سے وصول کرلئے یہ لین دین عند الشرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، انیس روپیہ تو یقیناً قرض ہیں، اور بارہ ٹکے میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ قرض ہے دوسرے یہ کہ بیع ہے، شق اول پر حسب قاعدۂ شرعیہ الاقراض تقضی بامثالہا یہ شرط ٹھیرانا حرام ہے کہ اس کے عوض میں پورے آٹھ آنے لئے جاویں گے۔ اور تقدیر ثانی پر چونکہ یہ بیع شرط قرض ہے جانب مقرض سے یا یہ بیع مشروط بقرض ہی جانب مستقرض سے اس وجہ سے حسب حدیث لایحل سلف وبیع حرام ہے، غرض دونوں صورتوں میں یہ معاملہ حرام ہے، سود خواروں نے ایسے حیلے ایجاد کئے ہیں اس لئے اگر کسی تکلف سے کسی قاعدہ پر اس کو منطبق بھی کرلیا جاوے تب بھی بوجہ فساد غرض کے ممنوع ہوگا، فقط۔

۲۰ صفر ۱۳۲۵ھ (امداد ص ۳۹ ج ۳)

رعایت در کرایہ بشرط وصول پیشگی

سوال (۲۱۰) ہمارے ملک میں سود سے بچنے کے لئے یہ حیلہ نکالا ہے، مثلاً کسی کو کچھ روپے کی ضرورت محسوس ہوئی اس نے دوسرے سے یوں کہا کہ بھائی اگر تم مجھ کو پانچ برس کا کرایہ پیشگی دو تو چار روپیہ کرایہ والی زمین، دو روپے کو دیدیں گے اس پر وہ راضی ہوگیا دس روپیہ دیدیا اور پانچ برس کے لئے زمین پر اپنا قبضہ کرلیا، درست ہے یا نہیں؟

الجواب، صورت مسئولہ درست ہے مع الکراہت کبیع الجنۃ کما فی الہدایہ،

۳ ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ (امداد، ص ۳۹ ج ۳)

تقسیم انعام از رقم سود بعض اسکول

سوال (۲۱۱) حاجی محسن شیرازی جو ہگلی میں تھے انھوں نے

ایک فنڈ یعنی چندہ سرکار انگلشیہ میں وقف کر دیا ہے اس کے سود سے انگریزی کالج واسکولوں میں جو طلبہ مسلمانانِ انگریزی خواناں کو سالانہ امتحان میں کامیاب ہونے سے بخشش دیا جاتا ہے، آیا روا ہے یا نہیں ؟

الجواب، اس آمدنی سے انعام وغیرہ جو دیا جاتا ہے لینا جائز ہے؛ لیکن اس جواز سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ انگریزوں سے سود کا معاملہ کرنا درست ہے جیسا بعضے لوگ سمجھ گئے ہیں، بلکہ اس جائز ہونے کی بنا دوسرا امر ہے جو مختصر تحریر سے پورا منکشف نہیں ہوسکتا، اور مطول تحریر کی فرصت نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم،

۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۵ھ (امداد، ص ۸۰، ج ۳)

تحقیق تساوی وتفاوت سود دہندہ وگیرندہ	**سوال** (۲۱۲) سود لینے والے اور دینے والے دونوں پر عذاب برابر ہوگا، یا کچھ فرق ہوگا:

الجواب، اطلاق حدیث سے تو دونوں برابر معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے قال لعن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اٰکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء رواہ مسلم مگر شراح حدیث کے کلام سے مفہوم ہوتا ہے کہ مقدار گناہ میں تفاوت ہے، اگرچہ نفس گناہ میں دونوں شریک ہیں کما فی المرقاۃ تحت الحدیث المذکور فی الاثم وان کانوا مختلفین فی قدرہ الخ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ دینے والے کو تو صرف دینے کا گناہ ہوگا اور لینے والے کو لینے کا بھی اور اس کے صرف واستعمال کا بھی، یا یہ کہ دینے والے کو بہ نسبت لینے والے کے کچھ اضطرار ہے، واللہ اعلم بحقیقت الحال لیکن جب دونوں میں گناہ ہے تو اب کم وزائد ہونے سے کچھ حرمت تو زائل ہوتی نہیں، جیسا کہ پاخانہ بھی گندہ ہے اور پیشاب بھی گندہ ہے اگرچہ ایک دوسرے سے زیادہ گندہ ہو مگر گندگی دونوں میں ہے سب سے بچنا چاہیے، (تتمہ ثالثہ ص ۵۳)

طریق جائز تجارت مرغان	**سوال** (۲۱۳) در تجارتِ مرغان کدام طریق برائے شرکت جائز ست وکدام ناجائز ست،

الجواب، اگر دو کس یا زیادہ رقمہائے خود مخلوط کردہ مرغان را خرید کنند ودر منافع ومحاصل شریک باشند جائز است واگر مرغان از ان یک کس ما باشند ودیگرے خدمت آنہا کند ودر حاصل شرکت قرار یابد ناجائز ست واگر صورتے دیگر مراد سائل باشد

بعد بریافتش جواب ممکن ست، (تتمہ اولیٰ ص ۱۴۱۴)

دائن کا دین کو کم میں بیچنا یا دائن کا دین کو کسی کے ہاتھ کم میں بیچنا

سوال (۲۱۴) ۱؎ زید کا قرض دس روپیہ عمر کے ذمہ ہے خالد نے زید سے کہا، کہ تمہارا جو روپیہ عمر کے ذمہ ہے اس کو میرے ہاتھ بیع کر دو میں وصول کر لوں گا، ۲؎ یا یوں کہا کہ دس کے مجھ سے پونے دس لے لو، میں عمر سے دس وصول کر لوں گا؟

الجواب، ۱؎ بیع جائز نہیں، ۲؎ حرام ہے، (تتمہ اولیٰ ص ۱۶۹)

حکم ادا کردن قرض سکہ انگریزی بسکہ حیدرآبادی

سوال (۲۱۵) حیدرآباد کے اور انگریزی روپے میں ہمیشہ تفاوت رہتا ہے، حیدرآباد کا روپیہ انگریزی روپے سے کم رہتا ہے، مگر وہ کمی کبھی معین نہیں ہے کبھی انگریزی سو روپے کے بدلے وہاں کے ایک سو دس روپے، کبھی بارہ کبھی چودہ، کبھی ایک سو سولہ اور اس سے زائد ملتے ہیں، اس صورت میں اگر کسی کو حیدرآباد میں انگریزی سو روپے ایسے وقت میں دیئے جاویں جب کہ وہاں، وہ ایک سو دس کو چلتے ہیں اور وہ قرض واپس ایسے وقت میں کر رہا ہے جبکہ وہ ایک سو پانچ کو چلتے ہیں یا اس کے برعکس کسی نے انگریزی علاقہ کے باشندہ سے ایسے زمانہ میں ایک سو پانچ روپے حیدرآبادی قرض لئے جبکہ وہ انگریزی سو روپے کے برابر تھے، اور اب وہ اسی ایک سو پانچ حیدرآبادی ایسے وقت میں واپس دیتا ہے جبکہ وہ پچانوے انگریزی کے برابر ہیں ان دونوں صورتوں میں قرض دینے والے کا نقصان ہے آیا اس نقصان کو کسی قاعدہ سے مقروض سے لیا جانا ممکن ہے یا نہیں اور جو صورت ان دونوں کے بالکل برعکس ہو گی اس میں مقروض کا نقصان ہو گا۔ مثلاً اس نے انگریزی سو روپے ایسے وقت میں لئے جبکہ وہ حیدرآبادی کے ایک سو دس کے برابر تھے، اور اب دیتے وقت ایک سو بیس حیدرآبادی میں سو انگریزی مہیا ہوئے آیا اس طور کا نقصان یا نفع سود تو نہ ہو گا؟

الجواب، الاقراض تقضی بامثالہا کے قاعدہ سے جس قسم کا روپیہ قرض لیا تھا اس قسم کا واجب الادا ہو گا، تفاوت فی القیمت کا اعتبار نہ ہو گا، اس تفاوت کی بنا پر جس نقصان کی شرط عقد میں ٹھیرانا یا بلا شرط لینا جب کہ متعارف ہو ربوا اور حرام ہے، البتہ اگر متعاقدین بلا شرط اور بلا عرف ادا کے وقت اس پر رضا مند ہو جاویں، کہ نرخ موجود کے اعتبار سے جس قدر پیسے اس رقم قرضہ کے ہوئے ہوں وہ پیسے ادا کر دیں تو یہ جائز ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اسی مجلس میں

سب حساب بے باق ہو جاوے، اور اگر اتنے پیسے نہ ہوں تو جتنے پیسے موجود ہوں اسی قدر رقم کا حساب کریں، بقیہ کا اس شرط مذکور کے موافق پھر کریں۔

۱۷ رمضان ۱۳۳۹ھ (حوادث خامس، ص ۱۴)

استعانت در امور خیر از رقم سود گیرندہ

سوال، (۲۱۶) جو شخص کہ سود لیتا ہے اس کے روپیے کسی کار خیر میں مدد جائز ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب، شرع میں اعتبار غالب کا ہے، لان فی التحرز عن القلیل کثیر حرج وما جعل الیہ فی الدین من حرج پس اگر غالب حلال ہے تو مصارف خیر میں صرف کرنا جائز ورنہ حرام لقولہ علیہ السلام ان اللہ طیب لا یقبل الا الطیب رواہ مسلم وقولہ علیہ السلام لا یکسب عبد مال حرام فیتصدق منہ فیقبل منہ رواہ احمد، (تتمہ ثالثہ ص ۵۳)

وقت جائز بودن بیع ثمر انبہ

سوال (۲۱۷) وقت جائز بودن باغ انبہ خریدن آخر وقت آں کدام ست یعنی وقتے کہ انبہ بدرخت نمایاں شود کہ تخمینہ آں کردہ شود کہ فی درخت ایں مقدار ثمر خواہد بود بیع جائز ست یا کہ ثمر پختہ شدن شرط ست ہمچنیں حکم سائر ثمرات مثل فالسہ وغیرہ ہست، یا حکم ہر کدام جداگانہ است،

الجواب، فی الدر المختار ومن باع ثمرۃ بارزۃ اما قبل الظھور فلا یصح اتفاقا ظھر صلاحھا او لا صح فی الاصح ولو برز بعضھا دون بعض فلا یصح فی ظاھر المذھب وصححہ السرخسی وافتی الحلوانی بالجواز لو الخارج اکثر ویقطعھا المشتری فی الحال وان شرط ترکھا علی الاشجار فسد البیع وقیل قائلہ محمد لا یفسد اذا تناھت الثمرۃ آہ مختصرا وفی رد المحتار تحت قولہ وافتی الحلوانی قال فی الفتح وقد رایت روایۃ فی نحو ھذا عن محمد رح فی بیع الورد علی الاشجار فان الورد متلاحق وجواز البیع فی الکل الی قولہ والاصح انہ لا یجوز لان المصیر الی مثل ھذہ الطریقۃ عند تحقق الضرورۃ ولا ضرورۃ ھنا لانہ یمکنہ ان یبیع الاصول الخ ج ۴، ص ۵۹، ازیں روایت چند امور مستفاد شد، اول وقت نمایاں شدن ثمر بیع او جائز است لیکن اشتراط ترک او بر درختاں چناں کہ متعارف است جائز نیست دوم ہرگاہ ثمر بالیقین ختم شود بیعش مع شرط ترک مذکور بقول امام محمد رح کہ بعضے برآں فتویٰ نقل

کردہ اند جائز ست، سوم ثمار دو قسم می باشد۔ بعضے آن کہ در ظہور مجتمع می شود مثل انبہ وغیرہ و بعضے مجتمع نمی شوند بلکہ علی سبیل التعاقب والتلاحق ظاہر می باشد مثل امرود وغیرہ پس حکمے کہ مذکور است برائے قسم اول ست اما قسم دوم پس شرط جواز بعض ظہور بعضے است ولیس، (تتمہ اولیٰ ص ۱۴۳)

مدرس کو سود کے حساب کی تعلیم دینا اگرچہ اس میں عنوان سود کا ہو جائز ہے

سوال (۲۱۸) احقر سرکاری مدرسہ میں درجہ سوم و چہارم کی تعلیم دیتا ہے، اور درجہ چہارم کو ہر سال میں چار ماہ سود کے نکالنے کا قاعدہ بتلانا پڑتا ہے، اور سوالات متفرقہ حل کرلتے پڑتے ہیں، علاوہ اس کے باقی عرصہ میں اور اس عرصہ میں اور حساب بھی سکھلاتا ہوں، اور مدرسہ میں ہندو اور مسلمان سب قسم کے طلبہ ہیں، لہٰذا اس درجہ کو تعلیم دینا میرے واسطے جائز ہے یا نہیں درجہ سوم میں اور حساب کی تعلیم ہے سود کی نہیں ہے فقط

الجواب۔ آپ قبل تعلیم یہ کہدیا کریں کہ میں جو لفظ سود کہوں گا مراد میری وہ نفع جائز ہوگا جو کہ بلا شرط خود نیت کیلے کہ میں جب اس کا قرض ادا کروں گا تو میں اپنے دل سے اور خوشی سے بدون اس کے استحقاق و مطالبہ کے اتنے حساب سے تبرعاً زیادہ دیدونگا؛ بس اتنا کہہ کر پھر وہ حساب سکھلادیں، تعلیم کا گناہ تو اسی وقت جاتا رہا، اب اس سے اگر ناجائز طور پر کوئی کام لے گا تو اس پر وبال ہوگا، فقط۔ ۳ ذی الحجہ سنہ ۱۳۳ھ

سوال بر جواب سابق (۲۱۹) احقر نے جو مسئلہ سود کے سوالوں کی تعلیم دینے کے بارہ میں دریافت کیا تھا، اس کا جواب حضور والا نے یہ تحریر فرمایا تھا کہ قبل تعلیم یہ کہدیا کرو کہ میں جو لفظ سود کہوں گا مراد میری وہ نفع جائز ہوگا جو کہ بلا شرط خود نیت کیلے کہ جب میں اسکا قرض ادا کروں گا تو میں اپنے دل سے اور خوشی سے بدون اس کے استحقاق اور مطالبہ کے اتنے حساب سے تبرعاً زیادہ دیدوں گا بس اتنا کہہ کر وہ حساب سکھلادو تعلیم کا گناہ تو اسی وقت جاتا رہا، اب اگر اس سے ناجائز طور پر کوئی کام لے گا تو اس پر وبال ہوگا۔ اب عرض خدمت بابرکت میں یہ ہے کہ سوالات مذکورہ کی عبارت سے تو پہلے ہی سے شرط کرلیتا اور شرح مقرر ہونا ظاہر ہے، جیسا کہ ذیل کے سوالات سے جو کہ بطور نمونہ لکھتا ہوں ظاہر ہوگا،

سوالات

(۱) ۴۰۰ روپیہ کا ۴ اپریل سے ۱۶ جون تک بشرح ۳ فیصدی سود بتاؤ،

(۲) کتنے اصل کے ۹۰۰ روپیہ ۵ سال میں بشرح ۴ فیصدی ہو جائے گی،

(۳) کتنے سال میں ایک رقم بشرح ۳ ½ فیصدی اپنی سے سہ چند ہو جائے گی،

(۴) کس شرح سے ۳۰۰ روپے کے ۳۳۷ روپیہ ۸ ر ۵ سال میں ہو جائیں گے،

(۵) ایک شخص نے اپنے دوست کو ۱۲۵۰ روپیہ ۴ فیصدی سود پر اس شرط پر دیے کہ وہ اس کو اصل مع سود ۱۶۶۶ روپیہ ۱۰ ر ۸ پائی دے تو بتاؤ وہ شخص اس کا روپیہ کتنے دن اپنے پاس رکھ سکتا ہے،

مندرجہ بالا طرز کے سوال مجھکو طلبہ کو بتلانے اور سمجھانے پڑتے ہیں، میں نے جو یہ سوالات لکھے ہیں یہ عبارت بعینہ حساب کی کتابوں سے نقل کر دی ہے، ایسے ہی سوالوں میں سالانہ امتحان لیا جاتا ہے، بدیں وجہ کوئی نئی عبارت سوالات کی اپنی طرف سے بنا کر سوالات مذکور نہیں سمجھائے جا سکتے، اس کے بارہ میں جو کچھ شریعت مطہرہ کا حکم ہو ارشاد فرمایئے، تاکہ اس کے مطابق عمل کیا جاوے۔

الجواب، چونکہ حربی کو حربی سے سود لینے میں کوئی خطاب شرعی نہیں ہے، اس لئے اس کو حرام نہ کہا جاوے گا، پس سود کی ایک صورت ایسی نکلی جو حرام نہیں، اور یہ مسئلہ ہے کہ جس امر میں ایک صورت بھی حلال ہو اس کی تعلیم اعانت علی الحرام نہیں پس آپ اس نیت سے سکھلاتے رہیئے۔

۲ صفر ۱۳۳۱ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۸۴، حوادث اول ص ۴۴)

سوال (۲۲۰) ایک شخص نے اپنے مطالبہ تعداد سو روپیہ کا دعویٰ کیا، عدالت نے خلاف اصلیت بجائے سو روپیہ کے انسی روپیہ کی ڈگری صادر کی، اور خلاف خواہش مدعی کے سود بھی دلایا۔ تو اب مدعی انسی روپے زر ڈگری کے علاوہ بیس روپیہ مد سود سے لیکر اپنا پانا فلتنی پورا لے سکتا ہے یا نہیں؟

سو روپیہ کے دعوے میں انسی کی ڈگری ہو اور بیس سود کے ملیں تو جائز ہے یا نہیں

الجواب، لے سکتا ہے، (تتمہ اولیٰ ص ۱۷۱، حوادث ۱ و ۲ ص ۳۵)

سوال (۲۲۱) ایک شخص نے اپنے مطالبہ سو روپے کا دعویٰ کیا عدالت نے خلاف اصلیت بجائے سو روپے کے ایک سو

اگر سو روپے کا دعویٰ ہو اور ایک سو بیس مع سود ملیں تو جائز ہے یا نہیں،

بیس روپے کی ڈگری دی تو مدعی کو صرف سو روپے لینا چاہئے یا ایک سو بیس ؟

الجواب، صرف سو روپے، (تتمہ اولیٰ ص ۱۷۱ وحوادث اول ص ۳۵)

ڈگری کو فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں

سوال (۲۲۲) شکل مندرجہ نمبر[1] کے ڈگری کو مدعی بقدر اصل ڈگری یعنی اسی روپے کو ایک دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کرتا ہے، خود تو سود نہیں لیتا ہے، لیکن اس کے علم میں یہ بات ہے کہ وہ سود لے گا یا اس سے نفع لیوے کسی سبب سے اس کے ہاتھ یہ ڈگری فروخت کرتا ہے آیا اس بائع پر کوئی مواخذہ ہے یا نہیں؟

الجواب، اگر یہ بائع مشتری سے حکم شرعی سے اطلاع کر کے خیر خواہانہ منع کر دے پھر بائع سبکدوش ہو جاوے گا، مگر خود ڈگری کا فروخت کرنا ہی محل کلام ہے، کیونکہ روپیہ روپیہ کا مبادلہ ہے جو مشروط ہے دست بدست ہونے کے ساتھ، اور یہ یہاں مفقود ہے، اس کی تدبیر یہ ہے کہ یہ بائع اس مشتری سے اسی روپے قرض لے اور مشتری سے کہے کہ ہمارا اتنا قرض فلاں مدعیٰ علیہ کے ذمہ آتا ہے ہم تم کو اس پر حوالہ کرتے ہیں تم اس سے وصول کر لو، اس طرح درست ہے، مگر اس میں ایک شکل شرط یہ ہے کہ وہ مدعیٰ علیہ بھی خوشی سے اس معاملہ سے رضامند ہو، اور اگر وہ رضامند نہ ہو تو ایک اور تدبیر یہ ہے کہ یہ بائع اس مشتری سے قرض لے کر اس کو وکیل بنادے کہ تم مدعیٰ علیہ سے وصول کر لو، اور وصول کرنے کے بعد تم اپنے قرضہ میں رکھ لو اس طرح درست ہے۔

۱۰ صفر ۱۳۲۹ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۷۱ وحوادث اول ص ۳۶)

تحقیق اثم باخذ سود از مسلم و کافر

سوال (۲۲۳) کیا کافروں سے اور مسلمانوں سے سود لینے میں مواخذہ برابر ہوگا یا کم؟

الجواب، نصوص تحریم ربوا تو فارق نہیں ہیں، پس ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں برابر مواخذہ ہوگا، لیکن اگر بوجہ زیادہ احترام مال مسلم کے فرق ہو تو مستبعد نہیں، واللہ اعلم مگر وہی مثال[2] مذکور جواب سوال دوم یہاں بھی خیال کرنا چاہیے۔ (تتمہ ثالثہ ص ۵۳)

سود سے روپے میں خبث نہ آنا

سوال (۲۲۴) کوئی مسلمان کسی ہندو کے پاس سے کسی ضرورت کے موقع پر سودی قرض لیتا ہے، اور اس سے اپنا بیوپار چلاتا ہے، یا کوئی زمین خریدتا ہے، چند دن کے بعد قرضہ مع سود ادا کر دیتا ہے، اپنی باقی ماندہ ملک

---

[1] یعنی سوال نمبر ۲۲۰۔ ۱۲ منہ [2] یعنی سوال نمبر ۲۱۲ کے جواب میں پیشاب اور پائخانہ کی جو مثال آئی ہے ۱۲ س

کو پاک ملک سمجھتا ہے اور یہ بھی اعتقاد رکھتا ہے کہ سود کے دینے سے تو خود گنہگار ہوا، مگر اس کی حرمت باقی ماندہ ملک میں سرایت نہیں کرے گی خیال کرتا ہے، کیونکہ یہ شخص سود دیا ہے لیا تو نہیں پس اس ملک کا کیا حکم ہے؟

الجواب، اس شخص نے جو سمجھا ہے صحیح ہے۔ (تتمہ اولیٰ ص ۱۷۲)

دار الحرب میں حرمت ربوا کے استدلال بآیہ کریمہ یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوا پر ایک شبہ مع جواب

سوال (۲۲۵) در تفسیر آیۃ شریف یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوا الآیۃ در سورۂ بقر پارہ تلک الرسل چوں رسیدم و استنباط گرامی در بارۂ اخذ ربوا بحکم حرمت در دار الحرب نیز بنظر کشیدم اشتباہے در خاطر پیدا شد کہ محض بغرض استفادہ و تعلم نہ بہ خیال بحث و مناظرہ در خدمت عرض می دارم امید کہ برائے رفع ایں اشتباہ و دفع ایں خلجان کلمات چند از کلک گوہر سلک بہ معرض بیان خواہند آورد و للارض من کاس الکرام نصیب و آں اینکہ مستدل جناب در آیۃ شریف ایں است کہ ہرگاہ ایں معاملہ عقد ربوا در مکہ معظمہ کہ دراں وقت مقام اہل شرک و دار حرب بود بوقوع آمدہ و حکم رد آں گردیدہ است لہٰذا ایں حکم مستنبط می شود کہ ربوا در دار حرب نیز حرام ست ہذا ما قلتم دریں تقریر از دو وجہ بحث ست اول ایں کہ در صدر آیت خطاب است کہ یا ایہا الذین آمنوا یعنی ایں حکم مخصوص بمومنان است دوم از روایت شان نزول آیۂ شریف کہ ہم جناب در حاشیہ تفسیر خود آوردہ اند معلوم می شود کہ مورد آیۃ شریف ہر دو یعنی ربوا گیرندہ و دہندہ از اہل اسلام بودند و ایں معنی خارج البحث است چرا کہ مجوزین ربوا میگویند کہ ربوا بین الحربی الغیر المستامن والمسلم جائز است خواہ در دار الاسلام خواہ در دار الحرب نہ بین المومنین۔

الجواب، قولکم، ایں حکم مخصوص بمومنان است، قولی غور باید فرمود کہ کدام حکم یعنی ایں حکم کہ معاملہ سودی کہ در دار الحرب بوقوع آمدہ بود دراں ہنگام متعاقدین مسلم نبودند بلکہ حربی بودند اگر آں وقت ایں معاملہ مباح بودے مالے کہ بحکم ایں معاملہ مباح واجب شدہ بود گر فتنش حلال بودے، کما یظہر من نظیرہ المذکور فی التفسیر من تبایع التصیر اثنین الخمر، غالباً وقت سوال بریں قید نظر سامی نگماشتہ کہ آں ہنگام متعاقدین مسلم نبودند و در روایت مذکورہ حاشیہ ایں قید مصرح است حیث ذکر فیہا ان بنی مخزوم کانوا یداینون بنی المغیرۃ فی الجاہلیۃ بالربوا، قولکم از اہل اسلام بودند الخ قولی وقت نزول آیت لاریب از اہل اسلام بودند نہ کہ وقت

تعاقد کہ دراں روایت قید فی الجاہلیۃ صریح است واگر باوجود ایں تصریح دعویٰ اسلام متعاقدین دروقت تعاقد کردہ شود تاہم ایں قدر مسلم باشد کہ در وقت عقد مکہ معظمہ دار الحرب بود و متعاقدین ہمانجا مقیم بودند و مجوزین ربوا اباحتش را مخصوص بحربی غیر مستامن و مسلم نمیگویند بلکہ عام میگویند مسلم غیر مہاجر را واو را دریں باب در حکم حربی قرار میدہند کما صرح بہ الفقہا حیث قالوا بعد قولہم ولا بین حربی و مسلم ما نصہ وحکم من اسلم فی دار الحرب ولم یہاجر کحربی فللمسلم الربوا بنفسہ کذا فی الدر المختار وغیرہ پس ہرگاہ استنباط را در باب مسلمین غیر مہاجرین تسلیم فرمودند بنا بر روایت فقہیہ مذکورہ صحت عمومش ہم واجب التسلیم باشد وہذا ہو المطلوب باز مدارات دلال بریں آیت منحصر نیست من دلائل دیگر ہم دارم فقط ، ۱۱ ربیع الثانی سنہ ۱۳۳۰ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۷۲)

تحقیق حکم اخذ زیادت برقم ضمانت سرکاری

سوال (۲۲۶) کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید سرکاری ملازم تھا۔ اس کے وقت ملازمت کچھ روپیہ بطور ضمانت ڈاکخانہ میں جمع کر دیا گیا تھا، اب زید ملازمت سے ترک تعلق کرتا ہے تو اس زرِ ضمانت کے ساتھ پچیس روپے سرکار سے سود کا ملتا ہے، زید اس کو اپنے تحت تصرف میں لانا نہیں چاہتا تو اس کو کیا کرے آیا خیرات کر سکتا ہے یا چندہ روم میں دے سکتا ہے یا نہیں، کس مصرف میں صرف کرے، ثواب مرتب ہوگا یا نہیں، اگر نہیں ثواب مرتب ہوگا تو گنہگار تو نہیں ہوگا، فقط۔

الجواب، بعض علماء کے نزدیک اس کا لینا جائز ہے، اگر اس قول پر عمل کر لیا جاوے گنجائش ہے اور بہتر ہے کہ امداد مجروحین ترک میں دیدیا جاوے، انشاء اللہ تعالیٰ گناہ نہ ہوگا،

۱۲ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثانیہ ص ۲۰)

وصول خرچہ مقدمہ بعنوان سود سرکاری

سوال (۲۲۷) مدیون پر نالش کرنے پر (خواہ زمیندارہ حیثیت سے ہو یا بلا لین دین کے نالش ہو) خود ڈگری شدہ اس مقدار سے جو مدعی اپنے حقوق کے ثبوت میں خرچ کرتا ہے لازمی طور پر بہت کم ہوتا ہے، زائد خرچ کے وصول کی مدیون سے کوئی صورت نہیں، نہ عدالت ڈگری دیتی ہے، البتہ عدالت سود لگانے کی اجازت دیتی ہے، مذہباً ناجائز ہے کیا یہ جائز ہوگا کہ مدعی سود لگا کر دعویٰ دائر کرے اور مقدار سود میں اپنا زائد خرچ محسوب کر لے، اگر تعداد سود خرچ سے زائد سے زیادہ ہو تو مدعی اس زائد سود کو مدیون کو واگذار کردے۔

الجواب، جن اہل علم کے نزدیک خرچہ لینا جائز ہے وہ اس کی بھی اجازت دیتے ہیں۔

۱۹ ج ۲ سنہ ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۱۴۰)

حکم مبادلۂ زر بسیم نسیئۃ

سوال (۲۲۸) زید نے اپنے ملازم بکر کے ہاتھ چار اشرفیاں اس غرض سے عمرو کے پاس بھیجیں کہ ان اشرفیوں کے روپے لے آئے، عمرو نے چاروں اشرفیاں لے لیں اور گھر کے اندر گیا، وہاں سے کسی اور ملازم کے ہاتھ بکر کے پاس ان چار اشرفیوں کے روپے بھیجدیئے، یا خود عمرو روپے لے آیا اور بکر کے حوالہ کردیئے، بکر نے یہ روپے زید کو جاکر دیدیئے، یہ طریقہ درست ہے یا نہیں

الجواب، نہیں ایک ہی جلسہ میں دست بدست لین دین ضروری ہے،

۱۹ محرم ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۱۸)

حرام وسود بودن نفع بوجہ قرض

سوال (۲۲۹) عمرو نے بکر سے سو روپے قرض لئے اور کچھ زمین عمرو نے بکر کو پانچ سال کے واسطے اس شرط پر دیدی کہ اس کی پیداواری پانچ سال تک لئے جاؤ، پھر بعد پانچ سال کے میری زمین دیدیجیو، اور اس زمین کی پیداوار پانچ سال کی سو روپے سے زیادہ ہوتی ہے تو ایسا لین دین جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، ظاہر تو یہی ہے کہ یہ رعایت جو عمرو نے بکر کی کی ہے بوجہ قرض کے کی ہے اس لئے یہ حرام اور سود ہے، ۹ رجب ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۵۲)

ربوا

سوال (۲۳۰) بکر نے کئی ہزار روپے ایک پیچ (مشین) میں جس میں کہ سرسوں کا تیل نکالا جاتا ہے باستغراق پیچ مذکور دے کر یہ شرط کی ہے کہ اس روپے سے جس قدر سرسوں خریدی جاوے گی اس پر کمیشن فیصدی ایک روپیہ دیا جاوے گا اور تیل کی بکری پر بھی ایک روپیہ فی صدی کمیشن دیا جاوے گا، غرض اسی طرح پر اس کا دور خرید و فروخت کا جاری رہے گا اور کمیشن بھی ملتا رہے گا اور سال دو سال میں روپیہ جس قدر دیا ہے وہ سب واپس کردیا جاوے گا، کمیشن کا حساب ششماہی پر کرکے جو کچھ حساب سے برآمد ہوگا دیا جائیگا اور تا بیباقی اصل روپیہ پیچ میں مستغرق رہے گا، یہ صورت جائز ہے یا نہیں۔

الجواب، معاملہ مذکورہ قرض ہے، چنانچہ اصل روپیہ کی بیباقی کی شرط اس کی دلیل ظاہر ہے اور جو کچھ کمیشن ٹھہرا ہے وہ زیادۃ علی القرض ہے، پس یہ صریح سود ہے۔

۲۵ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ

حکم امانت زر در بینک در صور خاصہ

سوال (۲۳۱) اگر کوئی شخص اپنا روپیہ وصول کرنے کے بعد سود جمع رہنے دے اور جس وقت اپنی ضرورت کے وقت اپنے پاس روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے بینک سے

قرضے اور سود کے مطالبہ کے وقت اُسی مد سے جو بینک کے اس کے حساب کی قائم کی ہے ادا کر دے تو یہ صورت سودی لین دین کی جائز ہوگی یا نہیں۔ اس شخص کی نیت محض یہی ہے کہ بینک کے سود سے نہ خود منتفع ہوا ور نہ بینک کو اپنے پاس سے کچھ دے گویا عطائے تو بلقائے تو۔ بینوا توجروا۔

الجواب عن التتمة - جن اہل علم نے بینک سے خود سود لینے کی گنجائش دی ہے ان کے نزدیک تو جو سود وہاں جمع ہوا ہے وہ اس شخص کی ملک ہے تو اس ہی دینا ایسا ہی ہے جیسا اپنے گھر سے دینا اس تقدیر پر یہ حیلہ کافی نہیں اور مسلم کا سود دینا غیر مسلم کو کسی کے نزدیک جائز نہیں اور جو اہل علم بینک سے سود لینے کو حرام کہتے ہیں ان کے نزدیک جو سود وہاں جمع ہے وہ اس شخص کی ملک نہیں ان کے نزدیک یہ حیلہ کافی ہے البتہ رقم جمع کرنے کے وقت جو معاملہ سود کا بینک والوں سے ٹھہرا ہے اسی طرح قرض لینے کے وقت بھی سود دینے کا وعدہ کیا ہے یہ البتہ ان حضرات کے نزدیک موجب گناہ ہوا بہر حال صورت مذکورہ میں یہ شخص گناہ سے کسی حال میں محفوظ نہ رہا خواہ سود ٹھہرانے کا گناہ ہوا خواہ سود دینے کا، واللہ اعلم۔　　۹ جمادی الثانی ۱۳۳۲ھ　　(حوادث اول ۲ ص ۱۳۷)

جاری کردن اخبار بعوض نفع رقم خاص

سوال (۲۳۲) بعض اخبار والے ایسا کرتے ہیں کہ اس قدر روپیہ دفتر میں جمع کر دینے سے جب تک وہ روپیہ دفتر میں جمع رہے گا مالک روپے کے نام اخبار جاری رہے گا اور جب وہ روپیہ واپس منگالیں گے کہ جس کے منگانے کا ہر وقت اختیار ہے اخبار بند کر دیا جاوے گا، یہ صورت معاملہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، یہ روپیہ دینا قرض کے طور پر ہے، اور اخبار اس کے نفع میں، پس ظاہر ہے کہ حرام اور سود ہے۔　　۴ ربیع الثانی ۱۳۳۱ھ (حوادث ا، ۲ ص ۱۷)

حکم جمع کردن روپیہ بلا سود در ڈاک خانہ وحکم سود گرفتن از ڈاکخانہ باز تصدق کردن

سوال (۲۳۳) ۱۔ ڈاکخانہ میں بلا سود روپیہ جمع کرنا جائز ہے یا نہیں، ۲۔ ڈاک خانہ میں سودی روپیہ جمع کرنا اور وہ رقم اہل حاجت کو دیدینا جائز ہے یا نہیں، یہ محکمہ غیر مسلموں کا ہے اور اس میں خسارہ کا احتمال بظاہر بہت ہی کم، قریب نہ ہونے کے ہے، کیونکہ ڈاکخانہ میں روپیہ بلا سودی بطور امانت کے ہے، جس وقت چاہو واپس لے لو، کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اور کوئی سود نہ لے تو نہیں دیتے ہیں، اپنے ہاں رکھتے ہوں گے، چنانچہ میرا کچھ روپیہ بلا سودی جمع ہے،

جواب، ڈاک خانہ کے معاملہ میں جب کہ خسارہ کا احتمال قریب نہ ہونے کے ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے اس لئے گنجائش ہے چند شرائط سے:-

۱ اس کا اظہار نہ کیا جاوے کہ میں نے روپیہ داخل کیا۔ ۲ کوئی دوسرا سند نہ پکڑ لے ۳ خود یہ صاحب معاملہ دوسرے معاملات فاسدہ کو اس پر قیاس کر کے جائز نہ سمجھنے لگے ۴ سود نہ لینے کی صورت میں ڈاکخانہ والے اس سود کی رقم کو ناجائز مصرف میں خرچ نہ کریں، اور وہاں سے لیکر اہل حاجت کو دینا بھی اسی اختلاف کی بنا پر گنجائش رکھتا ہے اور شرط ۴ میں جو مصرف ناجائز مذکور ہے اس میں یہ بھی آگیا کہ ڈاک خانہ والے اس پر سود لیتے ہوں، اور اگر یہ شرط ۴ محقق نہ ہو تو ان کے پاس سود نہ چھوڑے، اور یہ تفصیل اس کے لئے ہے جو روپیہ داخل کر چکا ہو، ورنہ اصل میں وہاں داخل نہ کرنا ہی مناسب بلکہ واجب ہی، کیونکہ ہر حال میں یہ شخص معاصی میں ان کا معین بنتا ہے،

۲۷ صفر ۱۳۴۳ھ (تتمہ خامسہ ص ۳۲۴)

> نوٹ کا سکہ نہ ہونا بلکہ سند قرض ہونا

سوال (۲۳۴)، نوٹ کاغذی سکہ ہے، مثل اور سکوں کے ہے یا نہیں؟

الجواب، نہیں، ۱۱ رجب ۱۳۲۷ھ (حوادث اول ۲ ص ۳۴)

> سند قرض بودن نوٹ سرکاری

سوال (۲۳۵) گزارش این کہ حسن العزیز کے جزو مجالس الحکمت (الربیع مصطفائی) کی مجلس ۳۰ سیتم میں دیکھنے سے نوٹ کا تمالی ہونا معلوم ہوا، جس سے ایک شبہ ہوتا ہے جو تحریر خدمت کرتا ہوں، امید کہ جواب باصواب مطلع فرما دیں، اور وہ یہ کہ مثلاً کسی شخص نے دوسرے شخص سے ایک سو روپے نقد قرضہ لئے، اور اس کو ادا کرتے وقت سو روپے کا ایک نوٹ دیا، اب وہ نوٹ اس روپے لینے والے شخص کے پاس جل جائے یا اور کسی صورت سے ہلاک ہو گیا تو اب وہ شخص مدیون اس ادائے قرض سے بری ہو گیا یا کہ اس کے ذمہ اور سو روپے ادا کرنا ہوگا، بظاہر سرکاری قانون کے مطابق تو وہ روپے ادا ہوگئے، کیونکہ سرکار نے نوٹ کو نفس مال قرار دیا ہے، بنابریں اکثر واقعات سے مشاہدہ کیا گیا ہے کہ نوٹ جل گئے، اور باوجود ان کے نمبر موجود ہوتے کے سرکار سے اُن جلے ہوئے نوٹوں کے روپے وصول نہ ہو سکے، کیونکہ سرکار کے نزدیک اس نفس نوٹ کا بتلانا ضروری ہے، خواہ وہ جلے یا پھٹے ہوئے ہی کیوں نہ ہوں۔

جواب، جب جلے ہوئے دکھلانے سے روپیہ مل جاتا ہے، اس سے تو صاف

معلوم ہوتا ہے کہ سرکار بھی نوٹ کو سند مال سمجھتی ہے، اگر مال ہوتا تو اگر کوئی کپڑا خریدے اور وہ جل جاوے تو اس کو جلا ہوا دکھلا کر کیا کوئی شخص روپیہ لے سکتا ہے، ۳۶ھ

سوال ضمیمہ سوال بالا، اور موافق قانون شریعت بوجہ نوٹ کو نفس مال یا حکم میں مال کے (کیونکہ وہ سند مال ہے) نہ قرار دیئے جانے کے وہ قرض لیئے ہوئے سو روپے ادا نہیں ہوئے، جیسے کہ نفس نوٹ سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی؛ اب اس امر میں تردد ہے کہ وہ ضائع شدہ نوٹ (جو قرض میں دیئے گئے) کے سو روپے قرض میں ادا ہوئے یا نہیں۔

جواب ضمیمہ بالا، چونکہ سند مال ہونے کی صورت میں یہ حوالہ ہے جو برضا محیل ومحتال ومحتال علیہ ہوا ہے، اور حوالہ میں مدیون بالکل بری ہو جاتا ہے، اس لئے قرض ادا ہوگیا، البتہ اتنا شبہ ضرور ہے کہ حوالہ میں درصورت توی دین عود کرتا ہے تو آیا نوٹ کا ضیاع جزو توی میں داخل ہے یا نہیں، یہ شبہ مجھ کو پڑا ناہے، جس میں اب تک شفا نہیں ہوئی، اس کو علماء سے تحقیق فرمالیا جاوے، ۳۶ھ (حوادث خامسہ ص ۳۳)

خلط کردن اہل انجمن آرد یکدیگر را

سوال (۲۳۶) انجمن پر اناج بھیجا گیا اور بیٹھ کر دیکھا گیا تو اکثر آدمیوں کے آٹے میں سے انھوں نے نکالا اور بعض بعض کے آٹے میں دوسروں کا نکلا ہوا جو جمع ہے وہ ڈالدیا، تو اس کا کیا بندوبست کرنا چاہیئے بلکہ یہ ناممکن بات ہے کہ جتنا آدمی کا اناج پڑے اتنا ہی آٹا ملے، بلکہ دوسروں کا ملا کر پورا کرتے ہیں،

الجواب، جب ان لوگوں نے سب میں سے نکال کر مخلوط کرلیا، یہ لوگ اس کے مالک بملک خبیث ہوگئے، پھر جب دوسروں کے آٹے میں اس میں سے ملایا گیا چونکہ یہ مقدار میں اصل آٹے سے کم ہے اس لئے غالب کا اعتبار کرکے کل آٹے کو حلال کہا جاویگا، خصوص جب اس کا انتظام اختیاری نہیں معاف کہا جائے گا، یکم شعبان المعظم ۳۴ھ (تتمہ رابعہ ص ۷)

حکم امانت زر در بینک در صور خاصہ

سوال (۲۳۷) بینک میں جمع کرنے کی دو صورتیں ہیں ۱ میعادی ۲ غیر میعادی، میعادی وہ رقم ہے جو اجل معلوم کے لئے بینک میں رکھی جاتی ہے، اور بینک اس پر سود دیتی ہے، لیکن اصل حلول اجل سے پہلے نہیں مل سکتی، غیر میعادی وہ رقم ہے جو اجل مجہول کے لئے بینک میں رکھی جاتی ہے، اور بینک اس پر سود نہیں دیتی؛ بینک جس طرح لوگوں کا روپیہ اپنے یہاں جمع کرتی ہے، اسی طرح اپنے یہاں سے قرض بھی دیتی ہے تو اکثر بلکہ تمام تاجر اپنی دستی ضرورت کے لئے بینک سے روپیہ قرض لے لیتے ہیں، لیکن بینک

خود تو ایک ہی صورت میں سود دیتی اور لیتی بہر صورت ہے، اور دینے سے کوئی مستثنی نہیں، تو اگر کوئی شخص اپنا روپیہ میعادی جمع کیلئے اور سود بینک سے وصول نہ کرے، اس کا حساب علیحدہ کھلوا دے، اور جب اپنی ضرورت کے وقت بینک سے روپیہ قرض لے، اور بوقت ادا بینک اس سے سود کا مطالبہ کرے تو یہ اسی حساب سے وصول کرنے کی اجازت دیدے تو اس طرح کا سودی لین دین جائز ہوگا یا نہیں، یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ جتنی بڑی تجارتیں ہیں، بغیر قرض لئے نہیں چل سکتیں فقط، بینوا توجروا

الجواب، اس تدبیر میں اور متعارف طور پر لین دین میں کوئی فرق نہیں، کیا یہ ممکن نہیں کہ غیر میعادی جمع کیا جاوے، جس پر سود نہیں ملتا اور جب اپنے کو ضرورت ہو تو اپنی اصل رقم ہی سے لے تو سود دینا بھی نہ پڑے، ۸ جمادی الثانی ۱۳۳۲ھ

(حوادث ا د ۲ ص ۱۳۷)

عدم مؤثر بودن عموم بلوی در باب ربوا وغیرہ از معاملات حلال وحرام در صورت جواز بعض تجارت کہ بظاہر در اشتباہ سود می شود

سوال، (۲۳۹) بمبئی سے مال منگانے کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ۱ خود جا کر خریدا جاوے ۲ مالک دوکان سے بذریعہ خط منگایا جاوے (الف) روپیہ پیشگی بھیج کر یا (ب) بذریعہ وی پی، پہلی صورت میں تو وہاں کے ایام قیام و آمد و رفت میں اس قدر خرچ و حرج ہوتا ہے کہ نفع اس قدر محتمل نہیں، یہ صورت بوجہ فوت غرض تجارت نہیں اختیار کی جا سکتی، دوسری صورت میں مالک دوکان فرمائش کی سماعت نہیں کرتا، کیونکہ اس کا رواج نہیں ہے کہ ان لوگوں سے اس ذریعہ سے کوئی چیز خریدی جاوے لہذا صرف تیسری ہی صورت متعین ہو گئی، اس کی صورت (الف) میں اکثر نقصان ہوتا ہے، کیونکہ جب روپیہ ان کے ہاتھ میں پہونچ جاتا ہے تو جیسا مال چاہتے ہیں بھیجدیتے ہیں اور وہ خواہ مخواہ لینا پڑتا ہے، اس میں بھی نقصان ہوتا ہے جس سے تجارت کی غرض (نفع) فوت ہو جاتی ہے، صورت (ب) میں کوئی تجارتی خدشہ نہیں کیونکہ مال آنے پر دام دینا پڑتے ہیں واپس کر دینے کا اختیار باقی رہتا ہے لیکن اس صورت میں بیجک میں منجملہ دوسرے مدوں کے ایک مد آڑھت اور ایک سود کی بھی ہوتی ہے کیونکہ دلال یا تو قرض لے کر یا مالدار ہوئے تو اپنے پاس سے مال روانہ کرتے ہیں اور اس روپے کا سود لگا لیتے ہیں، آجکل علی العموم جس قدر بڑی بڑی تجارتیں ہیں ان میں ضرور سود دینا پڑتا ہے، اور کوئی

صورت بجز ترک تجارت اس سے مفر کی نہیں ہے، آیا اس صورت میں بوجہ عموم بلوی اس طرح کا سود لینا جائز ہوگا یا نہیں، بینوا توجروا۔

الجواب، عموم بلوی حلال وحرام میں موثر نہیں ہوتا محض اس وجہ سے سود دینا جائز نہیں ہوسکتا اگر ایسا حیلہ کیا جاوے کہ دلال سے سمجھا دیا جاوے کہ ہم کو بجائے سود کے عنوان سے اطلاع دینے کے اس عنوان سے لکھا کرے کہ ہم اصل ثمن میں اس قدر زیادت کرتے ہیں اور یہ تاجر اس کو قبول کر لیا کرے، تو اس میں جواز کی گنجائش ہے، کیونکہ بعد تمام عقد کے زیادتی فی الثمن بتراضی متعاقدین جائز ہے، مگر شرط اس میں یہ ہے کہ دلال مال خرید کر اس تاجر کے ہاتھ فروخت کیا کرے، ۸ جمادی الاخری ۱۳۳۶ھ

تتمہ سوال بالا (۲۴۰) حیلہ مذکورہ فی الجواب پر بظاہر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ صرف وصفِ عنوانی یعنی لفظ سود کو ترک کر دینے سے جواز کی گنجائش ہے کیونکہ بحکم انما الاعمال بالنیات اس کی حقیقت تو سود ہی ہے اور اسی اصل کی بنا پر سقوط زکوٰۃ میں حیلہ ہبہ مردود قرار دیا ہے اور یہ حیلہ بھی قریب قریب اسی کی نظیر ہے، کیونکہ یہ بھی ازالہ حق اللہ ہے اور وہ بھی اس شبہ کا کیا جواب ہے، فقط، بینوا توجروا۔

الجواب عن التتمہ، یہ حیلہ بمجبوری کیا گیا ہے اور اس میں کسی غرض شارع کا ابطال لازم نہیں آتا، کیونکہ حرمت سود کی صورتیں ہزاروں اب بھی باقی ہیں، جن میں کوئی حیلہ نہیں چلتا بخلاف حیلۂ اسقاط زکوٰۃ کے کہ اول تو وہاں کوئی اضطرار نہیں۔ دوسرے اس میں غرض شارع کا ابطال لازم آتا ہے، کیونکہ اگر سب ایسا کرنے لگیں تو گویا شارع علیہ السلام کا اہل اموال پر زکوٰۃ کا فرض کرنا ہی لغو ہو جاتا ہے، اور فرضیت زکوٰۃ کی کوئی صورت ہی نہ رہے گی باوجود اہل نصاب کے پائے جانے کے یہ غرض تو متعلق تشریع کے ہے۔ دوسری غرض یہ باطل ہوگی کہ مقصود زکوٰۃ سے اغناء مسکین ہے، اس کی نوبت نہ آوے گی، یہ غرض متعلق غایت تشریع کے ہے، فشتان ما بینہما۔ ۹ جمادی الاخری ۱۳۳۶ھ (حوادث اول ص ۱۳۸)

سوال (۲۴۱) ڈگری دادن سود بر ہندو — ایک شخص مسلمان زمیندار نے ایک ہندو پر نالش بقایا لگان تین سو روپے کی کری، اور سود مو۲۶ ملہ لگایا وہ مسلمان کہتا ہے کہ سود دباعنت (دباؤ) کے واسطے لگایا ڈگری پر میں خود صرف نہ کروں گا کسی غریب کو دیدوں گا یہ سود کا لگانا اس کو جائز ہے یا حرام ہے؟

الجواب، فقہ میں ایسی روایت ہے جس سے اس مسلمان کو اس ہندو سے اس مویشی[۲۰] روپے لینے کی گنجائش ہے، مگر اس میں شرط یہ ہے کہ وہ ہندو راضی ہو کر دیدے اور رضا بھی دینے کے وقت کی معتبر ہے، نہ کہ وعدہ و معاہدہ کے وقت کی، پس اگر وہ ہندو اس ڈگری پر دل سے راضی ہو تو ڈگری دینا جائز ہے اور اگر وہ اس پر راضی نہ ہو تو ناجائز ہے، اور ڈگری کے بعد بھی دینا اسی کی مرضی پر ہے جبر درست نہیں،

۲۸ رمضان ۱۳۳۳ھ (حوادث سوم ص ۱۵۳)

سود گرفتن ضامن از ملازم کہ ضمانتش کردہ

سوال (۲۴۲) سرکاری ملازمتوں میں خصوصاً محکمہ ڈاک میں جو شخص ملازمت کا امیدوار ہوتا ہے اس کو نقد یا جائداد کی ضمانت داخل کرنی پڑتی ہے، اور جو لوگ بوجہ ناداری کے اس پر قادر نہیں ہوتے ان کی ضمانت ایک کمپنی کرتی ہے، جو ضمانت نامہ اس کی درخواست پر سرکاری محکمہ میں داخل کردیتی ہے اور اپنے مقررہ نرخ پر اس رقم ضمانت کا سود اس ملازم سے لیتی رہتی ہے جس کی ضمانت اس نے کی ہے پس اگر اس ملازم پر کچھ تاوان پڑتا ہے تو باضابطہ وہ رقم سے ضامن یعنی بنک کو دینی پڑتی ہے ورنہ جب تک سلسلۂ ملازمت اور یہ ضمانت قائم رہے، ماہوار رقم سود یا تنخواہ سے کٹ جاتی ہے یا اس کو بھیجنی پڑتی ہے، پس یہ ضمانت شرعاً جائز ہے یا نہیں، اور حاجتمند طالب ملازمت کو ناداری کے عذر بلا ملازمت گذارہ نہ ہوسکنے کی معذوری پر شرعاً کچھ گنجائش ادائے سود کے متعلق نکل سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب، قاعدہ سے تو یہ معاملہ خلاف شرع ہے، کیونکہ مقتضا ضمان کا صرف اس قدر ہے کہ جس قدر روپیہ کمپنی کو دینا پڑا ہے اتنا اس شخص سے وصول کرلے زائد لینا ظاہر ہے کہ ناجائز ہے لیکن مضطر کو یہ زائد دینا امید ہے کہ قابل عفو ہوگا، لیکن ہمیشہ استغفار کرتا رہے اور جب دوسری سبیل پیدا ہو ترک کردے،

۵ رجب ۱۳۳۵ھ (تتمہ رابعہ ص ۷۳)

عدم جواز تخفیف اجرت زمین بسبب قرض

سوال (۲۴۳) ایک شخص اپنی زمین کو مزارعت پر دیتا ہے، کہ پیداوار میں نصف کاشتکار کا اور نصف مالک زمین کا ہے اور چونکہ زمین کے خواہشمند اور بھی ہیں، اب کاشتکار مالک زمین کو کچھ روپیہ قرض دیتا ہے، تاکہ ادائے قرضہ دوسرے کو یہ زمین نہ دیوے، تو یہ قرض لینا جائز ہوگا؟

الجواب، کلیہ کل قرض جر نفعا فہو ربوا میں داخل ہونے کی وجہ سے یہ حرام ہے،

۲۲ ربیع الاول ۱۳۳۴ھ (تتمہ رابعہ ص ۱۹)

کشف الدجیٰ عن وجہ الربوٰا

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ وبعد فقد اطلعنا علی الاستفتاء الذی ورد علینا من الصدارۃ العالیۃ والمحکمۃ الشرعیۃ لدولۃ الآصفیۃ فی حقیقۃ الربوا فاردنا ان نخرج للمستفتی ما عندنا من العلم وفق طلبہ ونوضح لطریق الحق ومحجۃ الصدق انجاحاً للمراد ودما رابہ وباللہ اعتصد فیما اعتمد وھو حسبی ونعم الوکیل ولنذکر قبل الشروع فی الجواب اصولاً موضوعۃ لیتیسر لنا بہا طریق الایجاز فی بیان الصواب ۔

ترجمہ۔ الحمد للہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ، اما بعد اس زمانہ میں ایک رسالہ صدارت عالیہ اور محکمۂ شرعیہ دولت آصفیہ حیدرآباد دکن سے بعنوان استفتاء شائع ہوا ہے، جس میں اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ربوا (سود) صرف بیع وشرا، (خرید وفروخت) ہی میں متحقق ہوتا ہے، قرض میں متحقق نہیں ہوتا (لہٰذا قرض میں نفع لینا جائز ہے وہ ربا نہیں) چونکہ اس رسالہ سے عوام اور بعض خواص کی بھی گمراہی کا اندیشہ تھا، اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ اس کا جواب مفصل دیا جائے، اور ان تلبیسات کا راز طشت از بام کیا جائے، جن سے لوگوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کی گئی ہے، پس خدا کے بھروسہ پر ہم حقیقت ربا (سود) کو واضح کرنے کے لئے قلم اٹھاتے ہیں اور جواب سے پہلے چند اصول موضوعہ بیان کردینا چاہتے ہیں تاکہ جواب میں اختصار سہل ہوجائے ۔

الاصل الاول ان اجماع المجتہدین حجۃ لا یجوز لاحد خلافہ والائمۃ المجتہدون اذا اختلفوا فی مسألۃ فی ای عصر کان علی اقوال کان اجماعاً منہم علی ان ماعداہا باطل ولا یجوز لمن بعدہم احداث قول آخر (نور الانوار ۲۲۳)	اصل اول، مجتہدین کا اجماع واتفاق حجت ہے کسی کو اس کی مخالفت جائز نہیں اور ائمہ مجتہدین سے جب کسی زمانہ میں کسی مسئلہ کے اندر چند مختلف اقوال منقول ہوں تو ان کے بعد والوں کو اس مسئلہ میں اقوال مجتہدین کے علاوہ کسی جدید قول کا قائل ہونا جائز نہیں (نور الانوار ۲۲۳)

وکذا صرح به الاصولیون قاطبة ومن اراد التفصیل فلیراجع التوضیح والتلویح واحکام الاحکام وفواتح الرحموت وغیرها۔

اس قاعدہ کو تمام اہل اصول نے صراحۃً بیان فرمایا ہے جس کو تفصیل کا شوق ہو وہ توضیح تلویح احکام الاحکام اور فواتح الرحموت وغیرہ کا مطالعہ کرے۔

الاصل ثانی، العامی ومن لیس له اهلیة الاجتهاد وان کان محصلا لبعض العلوم المعتبرة فی الاجتهاد یلزمه اتباع قول المجتهدین والاخذ بفتواهم عند المحققین من الاصولیین (احکام الاحکام للآمدی ص ۳۰۶ ج ۴) اھ ولا یجوز الاجتهاد فی القرآن والحدیث والعمل باجتهاده مالم یظهر موافقته لقول المجتهدین۔

اصل دوم جس شخص میں اجتہاد کی اہلیت (وقابلیت) نہ ہو خواہ وہ عامی محض ہو یا کسی قدر ان علوم کو حاصل کر چکا ہو جو اجتہاد کی شرائط میں سے ہیں ان دونوں کو مجتہدین کے قول اور فتویٰ کا اتباع لازم ہے، محققین اہل اصول کا یہی مذہب ہے (احکام الاحکام للآمدی ص ۳۰۶ ج ۴) یعنی جس کو اجتہاد کی قابلیت نہ ہو اسے خود قرآن وحدیث سے مسائل مستنبط کرنا اور اپنے استنباط پر عمل کرنا جائز نہیں، جب تک اس کے قول کا مجتہدین کے قول سے موافق ہونا ظاہر نہ ہو جائے۔

الاصل الثالث: الثابت بدلالة النص ما ثبت بمعنی النص لغة لا اجتهادا ولیس المراد به معناه اللغوی الموضوع له بل معناه الالتزامی کالایلام من التافیف والحاصل انه اذا وجد فی معنی النص علة یفهم کل من یعرف اللغة ان الحکم فی المنطوق لاجلها فدلالة النص والثابت بدلالة النص کالثابت بالعبارة والاشارة فی الثبوت بالنظم والقطعیة وهو فوق القیاس لان المعنی فی القیاس مدرك رأیا لا لغة بخلاف الدلالة اھ

اصل سوم، دلالۃ النص اور قیاس الگ الگ دو چیزیں ہیں، کیونکہ قیاس سے جو بات مفہوم ہوتی ہے وہ عقل اور فہم کی مدد سے مفہوم ہوتی ہے، اور دلالۃ النص سے جو مسئلہ معلوم ہوتا ہے اس پر خود کلام کی دلالت ہوتی ہے، جس کو ہر نادان بخوبی سمجھتا ہے، دلالۃ النص کا حاصل یہ ہے کہ کلام کے معنی میں ایک علت ایسی موجود ہے جس سے ہر زبان دان سمجھ لیتا ہے کہ اس کلام میں جو حکم مذکور ہے وہ اسی علت پر مبنی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا

نور الانوار ص ۱۴۸، والتوضیح مع التلویح ص ۱۳۶ مصری)

کہ ماں باپ کو اُف بھی نہ کہو، نہ ان کو دھمکاؤ، اس سے ہر شخص جس کو زبانِ عربی سے واقفیت ہو سمجھتا ہے کہ اُف کہنے سے اس لئے منع کیا گیا ہے تاکہ والدین کو اذیت نہ ہو، اور یہی سمجھے گا کہ جب اُف کہنا حرام ہے، تو ان کو گالی دینا اور مارنا پیٹنا بدرجۂ اولیٰ حرام ہوگا، اور اس کو قیاس نہیں کہہ سکتے، کیونکہ قیاس سے کسی بات کا سمجھنا صرف مجتہد کا کام ہے، اور دلالۃ النص کو ہر زباندان سمجھتا ہے پس دلالۃ النص کا درجہ قیاس سے بالاتر ہے، اور اس سے جو مسئلہ معلوم ہوگا وہ اسی طرح قطعی اور یقینی ہوگا جس طرح عبارۃ النص اور اشارۃ النص وغیرہ کا مدلول قطعی ہوتا ہے، (نور الانوار، ص ۱۴۸، توضیح تلویح مصری ص ۱۳۶ ج ۱)

الاصل الرابع، مدار التصحیح والتضعیف للحدیث لیس علی الاسناد فقط فاذا قیل هذا حدیث صحیح فمعناه قبلناه عملا بظاهر الاسناد لانه مقطوع به فی نفس الامر لجواز الخطاء والنسیان علی الثقة واذا قیل هذا حدیث ضعیف فمعناه لم یصح اسناده علی الشرط المذکور لانه کذب فی نفس الامر لجواز صدق الکاذب واصابة من هو کثیر الخطاء اه (تدریب الراوی ص ۱۸ و ۱۹) المجتهد لما استدل بحدیث کان ذلک تصحیحا له کذا فی التحریر لابن الهمام وغیره اه (شامی ص ۵۷ ج ۴) قال ابو الحسن بن الحصار رحمه

اصل چہارم، حدیث کے صحیح وضعیف ہونے کا مدار فقط سند ہی پر نہیں (بلکہ نیز قرائن وحالات کو بھی اس میں دخل ہے)، تو جب یہ کہا جائے کہ یہ حدیث صحیح ہے، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے ظاہر اسناد کو دیکھ کر اسے قبول کر لیا ہے، اور یہ معنی نہیں کہ واقع میں یہ حدیث قطعی اور یقینی ہے کیونکہ راوی ثقہ سے بھی بھول چوک ہو سکتی ہے اور جب یہ کہا جائے کہ فلاں حدیث ضعیف ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسکی سند شرائط کے موافق صحیح نہیں یہ مطلب نہیں ہوتا کہ واقع میں یہ حدیث غلط ہے، کیونکہ جھوٹے کا بھی سچ بول دینا اور غلطی کرنے والے کا گاہے درستی پر آجانا ممکن ہے (تدریب الراوی ص ۱۸ و ۱۹) مجتہد کا کسی حدیث سے استدلال کرنا اس کے نزدیک حدیث کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے (شامی ص ۵۷ ج ۴ بحوالہ تحریر ابن ہمام وغیرہ)

ابو الحسن بن حصار مالکی نے اپنی کتاب

تهذيب المدارك على موطا مالك قد
يعلم الفقيه صحة الحديث
اذا لم يكن في سنده كذاب
بموافقة اية من كتاب الله
او بعض اصول الشريعة فيحمله
ذلك على قبوله والعمل به اھ
(كذا في تدريب الراوي ص۱۶)
وقال المحقق ابن الهمام في
الفتح اذا تأيد الضعيف
عما يدل على صحته من القرائن
كان صحيحا اھ (ص ۲۸۳ ج ۱)
وقد يحكم للحديث بالصحة
اذا تلقاه الناس بالقبول
وان لم يكن له اسناد صحيح
قال ابن عبد البر في الاستذكار
لما حكى عن الترمذي ان البخاري
صحح حديث البحر هو الطهور
ماءه واهل الحديث لا
يصححون مثل اسناده لكن
الحديث عندي صحيح لان العلماء
تلقوه بالقبول اھ من تدريب
الراوي ص۱۵ والقبول يكون
تارة بالقول وتارة بالعمل
عليه قال المحقق في الفتح و
قول الترمذي العمل عليه عند

تقریب المدارک میں فرمایا ہے کہ فقیہ کو بعض دفعہ
حدیث کا صحیح ہونا قرآن کی کسی آیت کے موافق
ہونے یا بعض اصول شریعت کے مطابق ہونے
سے بھی معلوم ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اس
کے قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے مجبور
ہو جاتا ہے بشرطیکہ حدیث کی سند میں کوئی کذاب
(وضاع) نہ ہو (کیونکہ اس صورت میں تو اس کو
حدیث کہنا ہی صحیح نہیں تدریب الراوی ص۱۶)
محقق ابن ہمام فتح القدیر میں فرماتے ہیں کہ حدیث
ضعیف کی تائید جب ایسے قرائن سے ہو رہی ہو
جو اس کے صحیح ہونے پر دلالت کرتے ہوں تو وہ صحیح
ہو جائے گی (ص ۲۸۳ ج ۱) تلقی بالقبول کی وجہ سے
بھی حدیث کی صحت کا حکم کیا جاتا ہے، (اور تلقی
بالقبول کے معنی ہیں کہ علماء عام طور پر حدیث
کو قبول کرلیں) چنانچہ حافظ ابن عبدالبر ترمذی کا یہ
قول کہ بخاری نے حدیث البحر ہو الطہور ماءہ
کو صحیح کہا ہے نقل کرکے فرماتے ہیں کہ گو محدثین ایسی
سند کو صحیح نہیں کہتے (جیسی اس حدیث کی ہے)
مگر میرے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے کیونکہ
علماء نے اس کو ہاتھوں ہاتھ قبول کے
ساتھ لیا ہے اھ تدریب ص ۱۵) اور علماء کا کسی
حدیث کو قبول کرنا کبھی قول سے ہوتا ہے، کبھی عمل
سے، چنانچہ محقق ابن الہمام نے فتح القدیر میں فرمایا
ہے کہ ترمذی کا حدیث بیان کرکے یہ کہنا کہ اہل علم کا

ہ ترجمہ سمندر کا پانی بالکل پاک ہے ۱۲

عمل اسی پر ہے حدیث کے اصل کے قوی ہونے پر دلالت کرتا ہے گو اس کی یہ خاص سند ضعیف ہو (ص ۱۸۸، ج ۱) حافظ سیوطی نے تعقبات میں فرمایا ہے کہ حدیث من عہ جمع بین الصلوتین من غیر عذر فقد اتی بابا من الکبائر کو ترمذی نے روایت کرکے کہا ہے کہ اس کے راوی حسین کو احمد وغیرہ نے ضعیف بتلایا ہے مگر اہل علم کا عمل اسی پر ہے پس ترمذی نے اس بات پر اشارہ کر دیا ہے کہ اہل علم کے قول سے حدیث کو قوت ہو گئی ہے اور بہت سے علماء نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ حدیث کے صحیح ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اہل علم کا فتویٰ اس کے موافق ہو، اگرچہ اس کی سند قابل اعتماد نہ ہو (ص ۱۳)

الاصل الخامس، الحدیث المرفوع الضعیف اذا تأید باقوال الصحابة او قول اکثر العلماء فهو مقبول محتج به کالمرسل عند من لا یحتج به اذا تأید بشیء من ذلک کان حجة اتفاقا و من اراد التفصیل فلیراجع تدریب الراوی ورسالتنا المسماة بانهاء السکن وقد مر فی الاصل الرابع ما یؤیده ویشیده۔

اصل پنجم، حدیث مرفوع ضعیف کی تائید اگر صحابہ کے اقوال یا اکثر علماء کے اقوال سے ہوئی ہو تو حدیث مقبول ہوگی، اور اس سے استدلال صحیح ہوگا، جیسے مرسل بعض کے نزدیک حجت نہیں مگر جب وہ اقوال صحابہ یا اقوال اکثر علماء سے مؤید ہو تو اتفاقاً حجت ہے، جس کو تفصیل مطلوب ہو وہ تدریب الراوی اور ہمارا رسالہ انہاء السکن مطالعہ کرے اور اصل چہارم میں بھی اس کے کچھ مؤیدات مذکور ہو چکے ہیں۔

الاصل السادس، ان الاجل لا قیمة له مستقلا عند الشارع صرح به الفقهاء قاطبة واعترف به المستفتی فی هذا الاستفتاء ایضا (صفحہ ۸ سطر اخیر)

اصل ششم، زمانہ اور مدت کے لئے بالاستقلال شریعت میں کچھ قیمت نہیں، تمام فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے، اور خود مستفتی نے بھی صفحہ ۸ میں اس کا اعتراف کیا ہے۔

الاصل السابع، علة حرمة الربوا کونه ظلما وغبنا قوله تعالیٰ فان تبتم فلکم رءوس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون الآیة فما کان من معاملات

اصل ہفتم، ربوا (سود) کے حرام ہونے کی علت یہ ہے کہ وہ ظلم کی فرد ہے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں فان تبتم فلکم رءوس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون پس جن معاملات مالیہ میں ظلم زیادہ ہوگا وہ ربا کے

عہ (ترجمہ) جس نے دو نمازوں کو بدون عذر کے ایک وقت میں جمع کیا اس نے بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ۱۲

المال بحیث یکون الظلم فیہ اکثر کان اولی بکونہ ربا من غیرہ لضرورۃ وجود المعلول مع وجود العلۃ قال ابن رشد فی بدایۃ المجتہد وذلک انہ یظہر من الشرع ان المقصود بتحریم الربا انما ہو لمکان الغبن الکثیر الذی فیہ وان العدل فی المعاملات انما ہو مقاربۃ التساوی اھ (ص ج ۲)

الاصل الثامن اقوال التابعین فی تفسیر الآیات حجۃ قال ابن القیم فی الاعلام ومن تامل کتب الائمۃ ومن بعدہم وجدہا مشحونۃ بالاحتجاج بتفسیر التابعی اھ (ص ۲۳۲ ج ۲)

وبعد ذلک فلنشرع فی الجواب و بیان الحق والصواب فیما سئلنا عنہ فنقول الفضل المشروط فی القرض ربا محرم لا یجوز للمسلم اخذہ من اخیہ المسلم ابدا لاجماع العلماء المجتہدین علی حرمتہ فلم یقل احد منہم بجواز الفضل المشروط فی القرض ومن ادعی غیر ذلک نسئلہ ہل ہو مجتہد او غیر مجتہد فان ادعی الاجتہاد وتیسر لہ الامر ودونہ خرط القتاد فلیجعل نفسہ عرضۃ للامتحان لکی یکرم او یہان وایضا فلا یجوز لہ وان کان مجتہدا

تحت میں بہ نسبت دوسرے معاملات کے بدرجہ اولیٰ داخل ہوں گے، کیونکہ وجود علت کیساتھ وجود معلول ضروری ہے، قاضی ابن رشد بدایۃ المجتہد میں لکھتے ہیں کہ شریعت (میں نظر کرنے) سے یہ بات ظاہر ہے کہ ربوا (سود) کے حرام کرنے کا منشا، یہ ہے کہ ربوا میں بہت ظلم ہے اور معاملات میں عدل یہ ہے کہ فریقین قریب قریب مساوی رہیں۔

اصل ہشتم، آیات کی تفسیر میں اقوال تابعین حجت ہیں، علامہ ابن القیم اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں کہ جو شخص ائمہ کی اور ان کے بعد والے علماء کی کتابوں میں تامل کرے گا وہ ان کو تابعی کی تفسیر کے ساتھ استدلال سے بھرا ہوا پائے گا اھ (ص ۲۳۲ ج ۲)

اب ہم اصول موضوعہ کے بعد استفتاء مذکور کا جواب لکھنا شروع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرض میں یہ شرط لگانا کہ اصل سے زیادہ وصول کیا جائے گا حرام ہے، اور زیادہ رقم ربا (سود) ہے جس کا مسلمان کو مسلمان سے لینا ہرگز جائز نہیں، کیونکہ ائمہ مجتہدین کا اس کی حرمت پر اجماع ہے، کسی نے بھی قرض میں زیادت مشروط کو جائز نہیں کہا اور جو اس کے خلاف کا مدعی ہو ہم اس سے سوال کریں گے کہ وہ مجتہد ہے یا غیر مجتہد اگر وہ اجتہاد کا مدعی ہو تو اپنے آپکو امتحان کا نشانہ بنائے تاکہ اس کی ذلت و عزت کا اظہار ہو جائے پھر مجتہد کو بھی تو ایسی بات کا ایجاد کرنا

احداث قول قد اجمع السابقون
من المجتهدين على بطلانه فقد قال
فی رحمۃ الامۃ واذا اقترض رجل من
رجل قرضا فهل يجوز ان ينتفع بشیٔ
من مال المقترض اولا يجوز ذلك مالم
تجر عادة به قبل القرض قال ابوحنيفة
ومالك واحمد لا يجوز وان لم يشرطه
وقال الشافعی ان كان من غير شرط جاز و
الخبر محمول على ما شرط اھ (ص ۷۰) وهذا
هو مختار الكرخی منا وقال شمس الائمة
الحلوانی بمثل ما قال الثلثة كما سيأتی
فقد اجمعوا على حرمة الفضل المشروط
فی القرض واتفقوا ايضا على الاحتجاج
بحديث النهی عن كل قرض جر نفعا وانما
اختلفوا فی تاويله واستدلال المجتهد
بحديث تصحيح له كما تقدم فی الاصل
الرابع فبطل ما زعمه المستفتی انه غير
ثابت ولا اصل له (ص ۳) وانه متروك
العمل باتفاق الائمة (ص ۵) وان اعترف
بقصوره عن درجة الاجتهاد قلنا له
فلا يجوز لك الاستنباط من القرآن
والحديث بل يلزمك اتباع اقوال
المجتهدين المقتدى بهم فی الدين
فارنا نصا منهم على جواز ما ادعيت
جوازه وان لم تفعل ولن تفعل ابدا

جائز نہیں، جس کے باطل ہونے پر مجتہدین سابقین
کا اجماع ہو چکا ہو، چنانچہ رحمۃ الامۃ میں ہے کہ
جب کوئی شخص دوسرے سے قرض لے تو کیا اس کو
یہ جائز ہے کہ قرض لینے والے سے کچھ مالی نفع حاصل
کرلے؟ یا یہ جائز نہیں مگر جب کہ قرض سے پہلے بھی
ہدیہ وغیرہ دینے کی) عادت جاری ہو تو امام ابو
حنیفہ اور مالک و احمد نے فرمایا ہے کہ قرض لینے
والے سے مالی نفع حاصل کرنا جائز نہیں اگرچہ بغیر
شرط ہی کے حاصل ہو، اور امام شافعیؒ نے
فرمایا ہے کہ بغیر شرط کے نفع حاصل ہو تو جائز ہے
اور وہ حدیث جس میں قرض سے نفع حاصل کرنے
کی ممانعت ہے اشرط کی صورت پر محمول ہے
(ص ۷۰) حنفیہ میں سے امام کرخی نے امام شافعی
کے قول کو اختیار کیا ہے، اور شمس الائمہ حلوانیؒ
نے ائمہ ثلاثہ (ابوحنیفہ، مالک و احمد) کی موافقت
کی ہے، جیسا آئندہ معلوم ہوگا، پس رحمۃ الامۃ
کی عبارت سے امور ذیل مستفاد ہوئے (۱) یہ
کہ قرض سے شرط کے ساتھ نفع حاصل کرنا اجماعاً
سب ائمہ کے نزدیک حرام ہے (۲) یہ کہ جس
حدیث میں قرض سے نفع حاصل کرنے کی ممانعت
ہے اس سے تمام ائمہ نے بالاتفاق احتجاج و
استدلال کیا ہے، اگر کچھ اختلاف ہے تو اس کی
تفسیر میں ہے، اور مجتہد کا کسی حدیث سے استدلال
کرنا اس کی صحت کی دلیل ہے (ملاحظہ ہو اصل چہارم)
پس مستفتی کا اس حدیث کو بے اصل وغیرہ ثابت

فاتق اللہ ولاتلق بیدیک الی التھلکۃ بالقول فی دین اللہ بغیر علم ولاھدی ولاکتاب منیر۔ ولم تأت المستفتی بدلیل علی جواز الفضل المشروط فی القرض من اقوال المجتہدین بل حاصل کلامہ کلہ ان لادلیل علی حرمتہ من القرآن والحدیث وحیثما اطلع فی کلام الفقہاء علی حرمتہ وانہ ربا یردہ بقولہ انہ لا دلیل علیہ ونحوہ ولم یدر المسکین ان قول المجتہد بمجردہ دلیل فی حق العامی وان کان محصلاً لبعض العلوم المتداولۃ وھو حجۃ ملزمۃ لایجوز للعامی خلافہ کما تقرر فی الاصل الثانی۔

کرنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ یہ حدیث باتفاق امت متروک العمل ہے باطل وغلط ہے اور اگر مستفتی اپنے کو مجتہد قرار نہیں دیتا بلکہ اجتہاد سے اپنی نااہلیت و قصور کا اعتراف کرتا ہے تو اس صورت میں ہم اس سے ادب کے ساتھ یہ کہیں گے کہ تم کو بلاواسطہ قرآن وحدیث سے کسی مسئلہ کا مستنبط کرنا جائز نہیں بلکہ تم کو اقوال مجتہدین کا اتباع لازم ہے، اب تم ہم کو مجتہدین کا کوئی قول دکھلاؤ جس میں انہوں نے اس صورت کو جائز قرار دیا ہو جس کے جائز ہونے کا تم نے دعویٰ کیا ہے۔ اگر ایسا نہ کرسکو اور قیامت تک تم ایسا نہیں کرسکتے تو اللہ سے ڈرو دین الٰہی میں رائے کو دخل دے کر اپنے آپ کو تباہ نہ کرو۔ غضب یہ ہے کہ مستفتی نے قرض میں شرط کے ساتھ نفع حاصل کرنے کے جواز پر اقوال مجتہدین سے کوئی دلیل قائم نہیں کی بلکہ اس کی تمامتر تقریر کا حاصل یہ ہے کہ اس کے حرام ہونے پر قرآن وحدیث سے کوئی دلیل نہیں ملتی اور فقہاء کے اقوال میں جہاں اس کے حرام ہونے اور ربوا ہونے کا ثبوت اس کی نظر سے گذرتا ہے، اس کو یہ کہہ کر رد کردیتا ہے کہ یہ دعویٰ بے دلیل ہے حالانکہ عامی کے حق میں گو اس نے کچھ علوم بھی حاصل کرلئے ہوں خود مجتہد کا قول ہی دلیل ہے اور ایسی قوی حجت ہے جس کی مخالفت کا عامی کو کچھ حق نہیں (ملاحظہ ہو اصل ۲)

ولعل ھذا القدر کاف لجواب ھذا الاستفتاء بطولہ واف للمستفتی فی انجاز سؤلہ وانجاح مأمولہ ولکن نرید ان نتکلم علی ماابداہ من الدلائل بالتفصیل حیث یشفی بہ الغلیل ویمیز الصحیح من العلیل

ہم کو امید ہے کہ اس مختصر تقریر سے مستفتی کے طویل استفتاء کا کافی جواب ہوگیا ہے اور مستفتی کا مدعی اسی سے پورا ہوچکا مگر ہم مفصل طریقہ سے اس کے دلائل کا بھی جواب دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ سائل کی پوری تسلی ہوجائے

منقول فقد زعم المستفتی از الامۃ
بعد اتفاقها علی ان المعنی اللغوی للربا
لیس مرادا فی الآیۃ تشعبت فرقتین
فالائمۃ وجمهور العلماء علموا هذه
الافراد بالسنۃ فالربا عندهم منحصر
فی البیع لاغیر وذهب البعض الی
ان اللام فی الربا للعهد والمراد به ربا
الجاهلیۃ الخ قلت اما الائمۃ فلم یرد
منهم تصریح باجمال الآیۃ اصلا و
من ادعی فلیرنا نصوصهم واما المتاخرون
من العلماء فقد ذهب بعضهم الی ما
قال المستفتی وقد بقی قول آخر ذکره
ابن العربی فی احکام القرآن له وصححه
ونصه قال علماءنا الربا فی اللغۃ هو
الزیادۃ ولابد فی الزیادۃ من مزید
علیه تظهر الزیادۃ به فلاجل ذلک
اختلفوا هل هی عامۃ فی تحریم کل ربا
او مجملۃ لابیان لها الا من غیرها
والصحیح انها عامۃ وکان الربا عندهم
معروفا الی ان قال ان من زعم ان
هذه الآیۃ مجملۃ فلم یفهم مقاطع
الشریعۃ فان الله تعالی ارسل رسوله
صلی الله علیه وسلم الی قوم هو منهم
بلغتهم وانزل علیه کتابه تیسیرا منه
بلسانه ولسانهم والربا فی اللغۃ الزیادۃ

اور اس کو صحیح وغلط کا امتیاز ہو جائے، تو ہم کہتے
ہیں کہ مستفتی نے دعوی کیا ہے کہ امت اس بات
پر اتفاق کر کے کہ آیۃ ربا میں ربا کے لغوی معنی مراد نہیں
دو فرقوں کی طرف منقسم ہوگئی ہے۔ ائمہ (اربعہ) اور
جمہور علماء نے تو یہ کہا ہے کہ لفظ ربا آیت میں مجمل
ہے اور اس کے افراد کی تعیین حدیث سے معلوم ہوتی
ہے (اور حدیث میں جتنی صورتیں مذکور ہیں سب
بیع وشراء کے موافق ہیں) تو ان کے نزدیک ربا بیع
میں منحصر ہے اس کے سوا کسی صورت میں ربا نہیں
ہوسکتی اور بعض نے یہ کہا کہ ربوا میں لام عہد کا ہے
جس سے مراد زمانۂ جاہلیت کی ربا ہے الخ میں
کہتا ہوں کہ ائمہ سے تو اس باب میں کچھ بھی تصریح
منقول نہیں جس کو دعوی ہو وہ ان کی نصوص
پیش کرے ہاں علماء متاخرین سے یہ بحث منقول
ہے جن میں سے بعض نے تو وہی کہا ہے جو مستفتی
نے ذکر کیا ہے اور ایک قول اور بھی باقی رہ گیا جس کو
علامہ ابن العربی نے احکام القرآن میں ذکر کیا ہے
اور اسی کو صحیح کہا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ لغت میں
تو ربا کے معنی زیادت کے ہیں اور زیادت اسی وقت
متحقق ہوسکتی ہے جبکہ کوئی دوسری چیز بھی مقابلہ میں
موجود ہو جس کی نسبت سے کسی شے کا زیادہ ہونا معلوم
ہو اسی لئے علماء نے اس امر میں اختلاف کیا ہے کہ
آیا یہ آیت ہر ربا کے حرام بتلانے میں عام ہے، یا
ایسی مجمل ہے کہ اس کے معنی دوسرے کلام ہی سے
سمجھ میں آسکتے ہیں خود اس کے کچھ معنی مفہوم نہیں

والمراد به فی الآیة کل زیادة لم
یقابلها عوض اھ ملخصا (ج ۱ ص ۱۰۱ و ۱۰۲)
فان قیل لو کان الربا باقیا علی حکمه
فی اصل اللغة لما خفی علی عمر لانه
کان عالما باسماء اللغة لکونه من
اھلها قلنا لفظ الربا کالمیسر فالمیسر
اشتقاقه فی اللغة من الیسر او الیسار[1]
سمی به اللعب بالازلام ای القمار عرفا
لما فیه من اخذ المال بیسر وسهولة
من غیر کد ولا تعب او لانه سبب لیسار
والغنی اھ فکذلک الربا کان فی اللغة
عاما لکل زیادة ولکن خص فی العرف
بکل زیادة لا یقابلها عوض بدلیل
تفرقتهم بین البیع والربا کما یشعر به
قولهم انما البیع مثل الربا ولا شک
ان البیع والتجارة یقصد بهما الربح
والزیادة فثبت ان مطلق الزیادة
لم یکن ربا عندهم فبقاء لفظ الربا
علی حکمه فی اصل اللغة لا یتصور اصلا
بل المراد بقاءه عاما لکل ما کان یطلق
علیه الربا عرفا ولو کان الشارع اقتصر
فی تحریم الربا علی ما کان یطلق علیه
فی العرف لما خفی علی عمر لکونه من
اھل العرف ولکنه حرم مع ذلک

ہوتے، اور صحیح یہ ہے کہ آیت ربا عام ہے
اور ربا کے معنی اہل عرب کو معلوم تھے اور جس
نے یہ دعوئے کیا ہے کہ یہ آیت مجمل ہے اس نے
شریعت کے مقاصد کو نہیں سمجھا کیونکہ اللہ تعالٰے
نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی قوم کی
طرف رسول بنا کر بھیجا تھا جو آپ کی برادری کے
لوگ تھے اور ان کی زبان آپ کی زبان تھی اور
اللہ تعالٰے نے آپ پر کتاب بھی اسی زبان
میں نازل فرمائی جو آپ کی اور قوم کی زبان
تھی۔ اور ربا کے معنی لغت میں تو زیادت کے
ہیں مگر آیت ربا میں اس سے مراد وہ زیادت
ہے جس کے مقابلہ میں کوئی عوض نہ ہو آھ

سوال، اگر ربا کے معنی مجمل نہیں بلکہ لغوی
معنی مراد ہیں تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر
اس کے معنی کیوں مخفی رہے (جیسا بعض روایات
سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے
اور آپؐ نے ربا کی تفسیر نہیں فرمائی) حالانکہ
حضرت عمر زبان داں تھے لغوی معنی ان سے
مخفی نہیں رہ سکتے تھے۔

جواب۔ لفظ ربا لفظ میسر کے مثل ہے
کہ جس طرح میسر لغت میں یُسر یا یسار سے مشتق
ہے جس کے معنی آسانی اور تونگری کے ہیں
پھر عرف میں قمار (جوا) کو میسر کہنے لگے کیونکہ

[1] قال الامام الفخر الرازی فی تفسیر قوله تعالی یسئلونک عن الخمر والمیسر ۱۲

وادخل فیہ صوراً اخر ماکان یطلق علیہ لفظ الربا فی العرف فاستشکل عمر رضی اللہ عنہ لخفاء العلۃ الجامعۃ بین تلک الصور و لاجل ذٰلک اختلف العلماء المجتہدون فی علۃ الربا فقال ابوحنیفۃ علتہا اتحاد الجنس والقدر وقال الشافعی الجنس والطعم والثمنیۃ،

اس میں آسانی سے مال بل جاتا ہے یا اس سے غنا اور تونگری حاصل ہوجاتی ہے۔ اسی طرح لفظ ربا لغت میں تو ہر زیادت کو عام ہے لیکن عرف میں اس زیادت کے ساتھ مخصوص ہوگیا ہے جس کے مقابلہ میں کوئی عوض نہ ہو اس کی دلیل یہ ہے کہ اہل عرب بیع اور ربا میں فرق کرتے، اور دونوں کو الگ الگ دو چیزیں جانتے تھے،

جیسا ان کے قول انما البیع مثل الربا سے معلوم ہوتا ہے، (جس کے معنی یہی ہیں کہ بیع تو مثل ربا ہی کے ہے اور ظاہر ہے کہ تشبیہ میں مشبہ و مشبہ بہ دو چیزیں الگ الگ ہوتی ہیں) اور سب جانتے ہیں کہ بیع و تجارت سے نفع اور زیادت ہی مقصود ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ ہر زیادت کو ربا نہ سمجھتے تھے ورنہ بیع و ربا میں فرق نہ کہتے پس لفظ ربا کو اصل معنی لغوی پر محمول کرنا تو کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا بلکہ جو لوگ لفظ ربا کو عام کہتے ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ جن صورتوں پر عرف میں لفظ ربا کا اطلاق ہوتا تھا یہ لفظ ان سب کو عام ہے اب اگر شارع علیہ السلام صرف انہی صورتوں کے حرام کرنے پر اکتفا فرماتے جو عرفاً ربا سے مفہوم ہوتی تھیں تو حضرت عمرؓ کو اس میں ہرگز کوئی اشکال واقع نہ ہوتا کیوں کہ وہ خود اہل عرف سے تھے۔ لیکن شارع نے ربا کے تحت میں بعض صورتیں ایسی بھی داخل کی ہیں جن پر عرف میں لفظ ربا کا اطلاق نہ ہوتا تھا۔ اس لئے حضرت عمرؓ کو اشکال پیش آیا کیوں کہ ان سب صورتوں کے حرام ہونے کی علت جامعہ مخفی تھی اور اسی وجہ سے علماء مجتہدین میں علت ربا کے سمجھنے میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ امام ابوحنیفہ نے اس کی علت اتحاد جنس و قدر سمجھی۔

وقال مالک القوت والادخار مع الجنس فهذا هو سبب خفاءه علی عمر رضی اللہ عنہ لا ما زعمہ بعضهم من الاجمال فی الاٰیۃ فان قیل فما معنی قول من قال بالاجمال فی اٰیۃ الربا قلنا لیس معناہ انہا مجملۃ من اصلہا وان العرب لم

امام شافعی نے جنس و طعم و ثمنیۃ کو علت سمجھا اور امام مالک نے جنس و قُوت و ادخار کو علت بتلایا پس حضرت عمرؓ کے اشکال کا یہ منشا تھا نہ یہ کہ لفظ ربا مجمل ہے جیسا بعضوں نے سمجھا ہے۔

سوال، پھر جن لوگوں نے آیت ربا کو مجمل

تعرف الربا الابيان الرسول صلى
الله عليه وسلم كيف وقد حكى الله
قولهم انما البيع مثل الربا الدال على
تفرقتهم بينهما وامرهم بترك ما
بقى لهم من الربا الدال على اخذهم
اياه ويمتنع الاخذ بدون المعرفة بل
معناه انها صارت مجملة حين ادخل
الشارع فيه اشياء لم يكن يطلق عليها
الربا عرفا فقد قال صلى الله عليه وسلم
الربا ثلثة وسبعون بابا الحديث
وسيأتى ونظيره قوله تعالى وامسحوا
برؤسكم فانه ظاهر فى وجوب المسح
على الرأس مجمل فى مقداره ولا يصح
القول بانه مجمل من كل وجه ولا
بيان له الا من السنة بل لو لم يرد
بيان المقدار من السنة لوجب المسح
على كل الرأس او على ادنى ما يصح اطلاق
مسح الرأس عليه فكذا ههنا فالاية
ظاهرة فى تحريم الربا العرفى ومجملة
فى تحريم غيره من انواع الربا الشرعية
هكذا ينبغى ان يفهم المقام فالربا
اثنان عرفى وشرعى كما قال
الرازى ونصه: اعلم ان
الربا قسمان ربا
النسيئة وربا الفضل اما

کہا ہے ان کے قول کا کیا مطلب ہے۔
جواب۔ ان کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں
کہ یہ آیت اصل سے ایسی مجمل ہے کہ اہل عرب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے
پہلے ربا کو جانتے اور سمجھتے ہی نہ تھے اور یہ کیونکر
ہو سکتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں
مشرکین کا یہ قول نقل فرمایا ہے انما البیع مثل
الربا جو اس بات کو بتلا رہا ہے کہ اہل عرب
بیع اور ربا میں فرق کرتے اور ان کو الگ
الگ جانتے تھے، نیز اللہ تعالیٰ نے ان کو
باقی ماندہ ربا کے چھوڑنے کا حکم فرمایا ہے جس
سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ ربا لیتے تھے اور بدون
جانے بوجھے کسی معاملہ کا لین دین دشوار ہے
(پس جو علماء ربا کو مجمل کہتے ہیں ان کا یہ مطلب
ہرگز نہیں کہ اہل عرب حضورؐ کے بیان سے
پہلے ربا کو جانتے ہی نہ تھے) بلکہ ان کا مطلب
یہ ہے کہ جب شارع علیہ السلام نے ربا میں
ایسی صورتوں کو بھی داخل کر دیا جن پر عرف
میں ربا کا اطلاق نہ ہوتا تھا اس وقت
ربا مجمل ہو گئی (اس سے پہلے مجمل نہ تھی)
چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد
ہے کہ ربا کی تہتر قسمیں ہیں اور یہ حدیث
آئندہ آوے گی۔ (خلاصہ یہ کہ ربا کے معنی
میں تو اجمال نہیں، ہاں اس کی انواع و
اقسام میں اجمال ہے) اور اس کی ایسی مثال ہے۔

ربا النسیئۃ[له] فهو الامر الذی کان مشهوراً متعارفاً فی الجاهلیۃ وذلك انهم کانوا یدفعون المال علی ان یاخذ واکل شهر قدراً معیناً و یکون رأس المال باقیاً ثم اذا حل الدین طالبوا المدیون برأس المال فان تعذر علیه الاداء زادوا فی الحق والاجل فهذا هو الربا الذی کانوا فی الجاهلیۃ یتعاملون به واما ربا النقد فهو ان یباع من الحنطۃ بمنوین منها وما اشبه ذلك اذا عرفت هذا فنقول المروی عن ابن عباس انه کان لا یحرم الا القسم الاول فکان یقول لا ربا الا فی النسیئۃ وکان یجوز ربوا النقد ثم انه رجع عنه اھ (ص ۳۵۱-ج ۲) قلت وخلاف ابن عباس فی ربا النقد دلیل علی ان الربا الحقیقی هو الاول دون ربا النقد والالزم کون الحقیقی مختلفاً فیه مخفیاً عن مثل ابن عباس وذلك

جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد وامسحوا برؤسکم سر پر مسح کے واجب ہونے کو صاف صاف بیان کر رہا ہے مگر مقدار کے بارے میں مجمل ہے (کہ آیا پورے سر کا مسح فرض ہے یا چوتھائی کا) اور یہ کہنا صحیح نہیں کہ یہ آیت بالکل مجمل ہے جس کا بیان حدیث ہی سے معلوم ہو سکتا ہے، نہیں بلکہ اگر حدیث سے مقدار مسح نہ معلوم ہوتی تو تمام سر کا مسح کرنا فرض ہوتا یا اس ادنیٰ مقدار کا جس پر عرف میں مسح راس کا اطلاق صحیح ہو، اسی طرح یہاں سمجھو (اگر حدیث سے ربا کی انواع و اقسام معلوم نہ ہوتیں تو عرفاً جن صورتوں پر ربا کا اطلاق ہوتا تھا وہ اس آیت سے یقیناً حرام ہوتیں) الغرض یہ آیت ربا عرفی کے حرام قرار دینے میں تو ظاہر ہے اور جن صورتوں کو شریعت نے اس کے ساتھ ملحق کیا ہے ان کے بارہ میں مجمل ہے، خوب سمجھ لو۔

پس ربا کی دو قسمیں ہوئیں ایک ربا عرفی دوسرے ربا شرعی جیسا امام رازی نے فرمایا ہے کہ جاننا چاہئے ربا دو قسم پر ہے (۱) ربا النسیئۃ

له اعترض علیه المستفتی ان ربا النسیئۃ لا یکون الا فی البیع وهو الثمن المؤجل ای والفضل المشروط فی القرض لیس بربا النسیئۃ لکون القرض غیر البیع ۲۴ ومنه و ۲۵ قلت لا شك ان لفظ النسیئۃ قد یطلق مقیداً بالبیع الی اجل ایضاً واما انه لا یطلق علی القرض فباطل لان النساء والنسیئۃ هو التاخیر لغۃ وعرفاً والنسیئۃ الاخیرۃ واستنساه سأله ان ینسأه دینه (ای یؤخره) کذا فی القاموس وهو یعم البیع والقرض جمیعاً یقال النقد خیر من النسیئۃ ای العاجل ولا یجوز تخصیصه بالبیع کما لا یخفی علی من له مسکۃ باللسان واحتج الجصاص فی احکام القران له علی عدم جواز التاجیل فی القرض بقوله صلی اللہ علیہ وسلم انما الربا فی النسیئۃ وقال ولم یفرق بین البیع والقرض فهو علی الجمیع اھ (ص ۴۸۴ ج ۱) وهذا صریح فی عموم النسیئۃ البیع والقرض جمیعاً فبطل ما زعمه هذا المستفتی بمجرد رأیه ۱۲ منه

بعید وابعد وانما یتصور الاختلاف والخفاء فی الغیر الحقیقی الملحق بالحقیقی وقال الجصاص الرازی فمن الربا ما ھو بیع ومنہ ما لیس ببیع وھو ربا اھل الجاھلیۃ وھو القرض المشروط فیہ الاجل وزیادۃ مال علی المستقرض اھ (ص ۴۶۹ ج ۱)

دوسرے ربا الفضل۔ ربا النسئہ۔ تو وہ ہے جو زمانہ جاہلیت میں مشہور و معروف تھی جس کی صورت یہ تھی کہ لوگ اپنا مال مدت معینہ کے لئے اس شرط پر قرض دیا کرتے تھے کہ ہر مہینہ کچھ مقدار معین لیا کریں گے اور اصل رقم محفوظ رہیگی پھر جب مدت ختم ہو جاتی تو مدیون سے اصل رقم کا مطالبہ کرتے اگر وہ اس وقت ادا نہ کر سکتا تو اصل رقم کو بڑھا دیتے اور اس زیادت کے عوض میں مدت بھی بڑھا دی جاتی، یہ وہ صورت ربا کی تھی جس پر زمانہ جاہلیت میں لین دین ہوتا تھا، اور ربا النقد یہ ہے کہ مثلاً ایک سیر گیہوں دو سیر گیہوں کے عوض فروخت کیا جائے جب اس کو سمجھ گئے تو اب سنو! کہ عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ وہ ربا کی صرف قسم اول کو حرام سمجھتے اور فرماتے تھے کہ ربا صرف نسئہ میں ہے، اور ربا النقد کو اولاً جائز کہتے تھے پھر اس سے رجوع فرمالیا اھ (ص ۳۵۱ ج ۲) میں کہتا ہوں کہ ربا النقد میں ابن عباس کا اختلاف اس امر کی دلیل ہے کہ ربا حقیقی ربا النسئہ ہے ورنہ لازم آئے گا کہ ربا حقیقی حضرت ابن عباس جیسے (فقیہ و امام التفسیر) پر مخفی رہے اور ربا حقیقی کی حرمت متفق علیہ نہ ہو مختلف فیہ ہو اور اس میں جس قدر بعد ہے ظاہر ہے، بلکہ اختلاف و خفاء ربا غیر حقیقی ہی میں ہو سکتا ہے جو حقیقی کے ساتھ ملحق ہے۔

پس اس سے ان علماء کی تائید ہوتی ہے جنھوں نے جاہلیت کی ربا کو ربا حقیقی اور حدیث ابو سعید و عبادہ کی ربا کو ربا غیر حقیقی کہا ہے جیسا آئندہ آوے گا، اور ربا النسئہ میں جو تاویل[1] مستفتی نے کی ہے ہم نے حاشیہ غربیہ میں اس کا جواب دیدیا ہے، اور امام جصاص رازی نے فرمایا ہے کہ ربا کی ایک قسم تو وہ ہے جو بیع میں ہو اور ایک قسم وہ ہے جو بیع کے علاوہ ہو اور یہ اہل جاہلیت کی ربا ہے جو قرض لینے والے پر ایک خاص مدت کے اندر کچھ زیادہ

---

[1] مستفتی نے ربا النسئہ میں یہ تاویل کی ہے کہ اس سے مراد بیع ثمن مؤجل ہی جیسے چاندی کو چاندی یا سونے کے عوض بطریق اُدھار کے بیع کرنا اور قرض میں زیادت کی شرط لگا کر زائد وصول کرنا ربا النسئہ نہیں ہے کیونکہ قرض بیع میں داخل نہیں اسکا جواب یہ ہے کہ ہم کو اس سے انکار نہیں کہ بیع بثمن مؤجل پر بھی نسئہ کا اطلاق ہوتا ہے لیکن نسئہ کو بیع کے ساتھ خاص کرنا غلط ہے بلکہ قرض پر بھی نسئہ کا اطلاق ہوتا ہے چنانچہ محاورہ ہے النقد خیر من النسئہ اور امام جصاص رازی نے تصریح کی ہے کہ لفظ نسئہ بیع و قرض دونوں کو عام ہے پس مستفتی کا محض اپنی رائے سے نسئہ کو بیع کے

رقم لینے کی شرط کرتے تھے الخ (اس سے بھی معلوم ہوا کہ ربا کی دو قسمیں ہیں)

وبه ظهر بطلان قول المستفتي فالربا عندهم منحصر في البيع لا غير الخ وهذا والله فرية بلا مرية وكيف يجوز القول بحصره في البيع وسياق الآية يدل على التفرقة بينهما قال تعالى حاكيا عن المشركين ذلك بانهم قالوا انما البيع مثل الربوا (وهل يمثل الشئ ويشبه الا بغيره) واحل الله البيع وحرم الربا فكل من سمع هذه الآية من اهل اللسان تبادر الى فهمه التغاير بين البيع والربا وان الربا الذي نعاه الله الى اهله وذمهم لاجله ليس عين البيع ولا منحصرا فيه و يا لجرأة هذا المستفتي كيف عزى القول بحصر الربا في البيع الى الائمة والجمهور وهذا الجصاص الرازي وهو من الحفاظ للحديث ومن طبقة القدماء من فقهاء الحنفية وهذا الفخر الرازي وهو من افاضل المتأخرين كلاهما مصرحان بكون الربا المتعارف في الجاهلية (الذي نهى القرآن عنه) غير البيع ولم يرد احد من القدماء ولا المتأخرين رد عليهما ما قالاه غير هذا المستفتي الذي نشأ في الهند

اور اس سے مستفتی کے اس دعوی کا کہ ربا جمہور ائمہ کے نزدیک بیع میں منحصر ہے بطلان ظاہر ہو گیا اور بخدا یہ صریح بہتان ہے اور کوئی عالم بیع میں ربا کے منحصر ہونے کا کیونکر قائل ہو سکتا ہے جبکہ آیت قرآنی کا سیاق صاف بتلا رہا ہے کہ بیع و ربا الگ الگ دو چیزیں ہیں چنانچہ حق تعالی نے مشرکین کا قول نقل فرمایا ہے ذلک بانہم قالوا انما البیع مثل الربوا (ترجمہ :- یہ سزا اس واسطے ہے کہ مشرکین کہتے ہیں کہ بیع تو ربا کے مشابہ ہے اور مشابہت وتشبیہ دو مغائر چیزوں ہی میں ہوا کرتی ہے ۱۲) واحل اللہ البیع وحرم الربوا (ترجمہ :- حالانکہ اللہ تعالی نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام) اہل زبان میں سے جو کوئی بھی اس آیت کو سنے گا وہ اس سے بیع و ربا میں تغائر ہی سمجھے گا اور یہ بھی جان لے گا کہ جس ربا کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سود لینے والوں کی مذمت فرما رہے ہیں وہ عین بیع نہیں ہے نہ بیع میں منحصر ہے ہم کو مستفتی کی جرأت پر تعجب ہے کہ اس نے جمہور ائمہ کی طرف یہ بات کیونکر منسوب کر دی کہ وہ ربا کو بیع میں منحصر مانتے ہیں حالانکہ جصاص رازی جو حافظ حدیث ہونے کی ساتھ فقہاء حنفیہ کے اعلی طبقہ سے ہیں اور امام فخر رازی جو افاضل متاخرین سے ہیں دونوں اس بات کو صاف صاف بتلا رہے ہیں۔

فی المأة الرابع عشر وھو زمان انقراض
العلوم وقبض العلماء فلا حول ولا قوۃ الا
باللہ العلی العظیم ولا ریب ان الجصاص
والفخر الرازی من اعلم الناس باقوال الجمہور
من العلماء فی عصرھما فکیف یجوز ان
ینسب الی الجمہور القول بحصر الربوا
فی البیع مع تصریح ھؤلاء بخلاف۔
وقال الحافظ فی الفتح واصل الربا
الزیادۃ اما فی نفس الشئ کقولہ
تعالی اھتزت وربت واما فی مقابلۃ
کدرھم بدرھمین فقیل ھو حقیقۃ
فیھما وقیل حقیقۃ فی الاول مجاز
فی الثانی زاد ابن سریج انہ فی الثانی
حقیقۃ شرعیۃ عـہ ویطلق الربا علی کل
بیع محرم اھ (ص ۲۶۴ ج ۴) ولا یخفی ان
الزیادۃ فی المقابلۃ تعم البیع والقرض
وغیرھما جمیعا وھذہ حقیقۃ شرعیۃ
وعرفیۃ وقد یطلق الربا علی کل بیع
محرم سواء کان فیہ زیادۃ اولا کبیع
حبل الحبلۃ وبیع مالم یضمن ونحوھما
واطلاق الربا علیہ مجاز شرعا ولغۃ
وعرفا وقال الفقیہ ابو الولید القاضی
ابن رشد فی بدایۃ المجتہد لہ
اتفق العلماء علی ان الربا یوجد فی

کہ جاہلیت کی ربا جس سے قرآن میں ممانعت
کی گئی ہے) بیع میں نہ تھی، بلکہ قرض میں تھی اور
قدما و متاخرین میں سے کسی نے بھی ان کے قول
کو رد نہیں کیا سوا اس مستفتی کے جو ہندوستان
میں چودھویں صدی کے اندر ایسے زمانہ میں
پیدا ہوا ہے جو مسلمانان در گور و مسلمانی در کتاب
کا مصداق ہے فلا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی
العظیم اور یقیناً امام جصاص و فخر رازی اپنے
زمانہ میں علما و جمہور کے اقوال کو سب سے
زیادہ جاننے والے تھے پھر جمہور کی طرف یہ قول
کیونکر منسوب کیا جا سکتا ہے کہ وہ ربا کو بیع میں
منحصر مانتے ہیں جب کہ ایسے ایسے علما اس کے
خلاف کی تصریح کر رہے ہیں، اور حافظ ابن حجر
نے فتح الباری میں فرمایا ہے کہ ربا کے اصلی معنی
زیادت کے ہیں خواہ کوئی چیز خود اپنی ذات
سے زیادہ ہو جائے جیسے اللہ تعالے فرماتے ہیں
اھتزت وربت کہ زمین بارش سے لہلہاتی
اور ابھرتی ہے یا دوسری شے کے مقابلہ میں
زیادہ ہو جیسے ایک درہم کے عوض دو درہم
لئے جائیں پھر بعض کا قول یہ ہے کہ دونوں معنی
حقیقی ہیں، اور بعض کا قول یہ ہے کہ پہلے معنی
حقیقی ہیں اور دوسرے معنی مجازی ابن سریج
کہتے ہیں کہ دوسرے معنی شریعت کی اصلاح
میں حقیقی ہیں (میں کہتا ہوں بلکہ یہ عرفاً بھی حقیقی

عـہ قلت بل حقیقۃ عرفیۃ یدل علیہ تفرقۃ المشرکین بین الربا والبیع والیہ یشیر کلام ابن العربی کما تقدم ذکرہ ۱۲ منہ

شيئين في البيع وفيما تقرر في الذمة من بيع وسلف وغير ذلك فاما الربا فيما تقرر في الذمة فهو صنفان صنف متفق عليه،

ہیں، اور ہرناجائز بیع پر بھی ربا کا اطلاق ہوتا ہے، اھ اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کا دوسری کے مقابلہ میں زیادہ ہونا بیع اور قرض سب کو شامل ہے، یہ تو ربا کے معنی شرعاً وعرفاً حقیقی ہیں۔ اور کبھی ہرناجائز بیع کو بھی ربا کہدیتے ہیں، اس پر ربا کا اطلاق مجازی ہے شرعاً بھی اور لغۃً وعرفاً بھی۔ اور فقیہ ابوالولید قاضی ابن رشد بدایۃ المجتہد میں فرماتے ہیں کہ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ربا دو صورتوں میں پائی جاتی ہے ایک بیع میں دوسری اس (دَین) میں جو ذمہ پر واجب ہو خواہ بیع کی وجہ سے واجب ہوا ہو یا قرض وغیرہ کی وجہ سے۔ پھر جو ربا واجب فی الذمہ ہو اس کی دو قسمیں ہیں ایک کی حرمت پر تو سب کا اتفاق ہے۔

وهو ربا الجاهلية الذي نهي عنه وذلك انهم كانوا يسلفون بالزيادة وينظرون وكانوا يقولون انظرني ازدك وهذا هو الذي عناه عليه الصلوة والسلام بقوله في حجة الوداع الا وان ربا الجاهلية موضوع واول ربا اضعه ربا العباس بن عبد المطلب والثاني ضع وتعجل وهو مختلف فيه واما الربا في البيع فان العلماء اجمعوا على انه صنفان نسيئة وتفاضل وانما صار جمهور الفقهاء الى ان الربا في هذين النوعين لثبوت ذلك عنه صلى الله عليه وسلم اھ (ص ۷۷ ج ۲) وهل بعد اجماع العلماء على كون الربا في البيع وفيما

اور وہ جاہلیت کی ربا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، اس کا طریقہ یہ تھا کہ لوگ زیادہ رقم وصول کرنے کی شرط کرکے دوسروں کو قرض دیتے اور (مدت تمام ہونے کے بعد مہلت دیا کرتے اور اس وقت قرضخواہ) یوں کہتے کہ تم ہم کو مہلت دیدو ہم تم کو کچھ (رقم) زیادہ دیدینگے اور یہی وہ ربا ہے جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج وداع میں فرمایا تھا کہ جاہلیت کی ربا سب کی سب ساقط کردی گئی اور سب سے پہلے جس ربا کو میں ساقط کرتا ہوں وہ عباس بن عبدالمطلب کی ربا ہے، اور دوسری قسم یہ ہے کہ قرض دہندہ سے مقروض یوں کہے کہ تو اتنا معاف کردے اور مدت سے پہلے وصول کرلے اس میں اختلاف ہے، اور جو ربا بیع میں ہے اس کے بارہ میں علماء کا اتفاق ہے کہ اس کی بھی دو قسمیں ہیں ایک بیع بالنسیہ

تقرر فی الذمة من سلف
او غیره القول بحصر الربا فی البیع
فقط الاجرأة علی الله وشریعته و
عُلم من ذلك ان جریان الربا فی
النوعین ای القرض والبیع ثابت
عنه صلے الله علیه وسلم فبطل ما زعمه
المستفتی من عدم الثبوت الربا
فی القرض عنه صلے الله علیه وسلم
وسیأتی الکلام فیه بالبسط و
فیه دلیل ایضاً علی ان الربا
الذی یکون فیما تقرر بالذمة
من البیع لیس من ربا البیع بل
هو قسیمه وسیأتی تفصیل الکلام
فیه فانتظر فالفضل المشروط
فی القرض ربا منصوص محرم قطعا
قد اتفق العلماء علی کونه ربا
الجاهلیة فافهم ولا تکن من
الغافلین وقال فی المقدمات
الممهدات له الربا فی الصرف
وفی جمیع البیوع وفیما تقرر فی
الذمة من الدیون حرام محرم
بالکتاب والسنة واجماع الامة
اه (ص ۲ ج ۳) وتفسیر الدیون
بالاثمان الواجبة فی البیوع لا
یصح فی کلامه لفصله الدیون عن

اور ایک بیع بالتفاضل اور علماء ان دونوں
قسموں میں ربا کے اس لئے قائل ہیں کہ رسول
اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت ہو چکا
ہے اھ میں کہتا ہوں کہ علماء کے اس اجماع کے
بعد بھی اس امر کا قائل ہونا کہ ربا صرف بیع میں
منحصر ہے بجز جرأت علی اللہ کے اور کیا ہے پس
سمجھنا چاہیے کہ علامہ ابن رشد کے اس قول
سے امور ذیل پر کافی روشنی پڑتی ہے (۱) ربا کا
قرض و بیع دونوں میں متحقق ہونا رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم سے ثابت ہے اس سے مستفتی کا یہ قول
باطل ہو گیا کہ قرض میں ربا کا تحقق ہونا رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں (۲) جو
رقم بیع کی وجہ سے واجب فی الذمہ ہو جب
اس میں ربا کا تحقق ہو تو وہ ربا البیع میں داخل
نہ ہوگا بلکہ اس کی قسم مقابل ربا الدین میں داخل
ہوگا۔ اس سے بھی مستفتی کی ایک غلطی ظاہر ہوتی
ہے کہ اس نے ربا جاہلیت کو ربا البیع میں داخل
کرنے کی ناکام کوشش کی ہے جیسا عنقریب
بیان کیا جائے گا،

پس قرض میں شرط کے ساتھ زیادہ رقم وصول
کرنا قطعاً حرام اور صریح ربا ہے جس کے ربا جاہلی
ہونے پر علماء کا اتفاق اور اجماع ہو چکا ہے
خوب سمجھ لو، نیز علامہ ابن رشد نے مقدمات
مدونہ میں فرمایا ہے کہ ربا بیع صرف اور
تمام بیوع میں اور ان دیون میں جو واجب

البیوع ولقوله فی بدایة المجتهد وفیما تقرر فی الذمة من بیع او سلف او غیر ذلک اھ فعلم ان المراد بالدین کل ما تقرر فی الذمة سواء کان بالبیع او بالقرض و نحوه والربا یجری فیهما جمیعا وان کل ذلک محرم بالکتاب والسنة وبالاجماع والعجب من المستفتی کیف لم یفتح عینیه ولم ینظر الی هذا الکلام الواضح وجعل ینقل من اقوال ابن رشد[1] ما لا یضرنا ولا ینفعه شیئا وایضا فتخصیص[2] الدین بالواجب فی الذمة بالبیوع باطل بل هو یعم القرض لغة وعرفا قال فی القاموس الدین ما له اجل وما لا اجل له فقرض والموت وکل ما لیس حاضرا وادنته اعطیته الی اجل او اقرضته وادان هو اخذه[3] رجل مدیان یقرض کثیرا ویستقرض

فی الذمہ ہوں حرام ہے قطعاً حرام ہے، قرآن سے بھی حدیث سے بھی اجماع امت سے بھی اھ (اس سے بھی معلوم ہوا کہ ربا بیع کیساتھ خاص نہیں بلکہ غیر بیع میں بھی اس کا تحقق ہوتا ہے ۱۲) اور مستفتی کا یہ قول کہ دین سے مراد وہ ثمن ہے جو بیع میں واجب ہوتا ہے علامہ ابن رشد کے کلام کی تفسیر میں صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ علامہ نے دیون کو بیوع سے علحدہ کرکے ذکر کیا ہے دوسرے بدایۃ المجتہد میں انھوں نے صراحۃً دین کی تعلیم کردی ہے کہ خواہ بیع سے ذمہ پر واجب ہوا ہو یا قرض سے واجب ہوا ہو پس اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا دین ہر واجب فی الذمہ کو عام ہے خواہ بیع سے ہو یا قرض سے اور ربا دونوں میں جاری ہوتا ہے اور اس کی حرمت کتاب اللہ اور حدیث اور اجماع سے ثابت ہے۔ پس مستفتی پر تعجب ہے کہ اس نے اس واضح کلام سے تو آنکھیں بند کرلی اور خواہ مخواہ علامہ ابن رشد کے وہ اقوال نقل کردیئے جو اس کو خاک مفید نہیں، اور ہم کو ذرہ برابر مضر نہیں

---

[1] اشارة الی ما ذکره فی صفحہ ۱۶ من قول ابن رشد فی تفسیر قول ابن عمرؓ سلف سلفا فلا یشترط افضل منه وان کان قبضة من علف فهو ربا اھ ای انه مقیس علی الربا المحرم بالقرآن ربا الجاهلیة اھ وسیاتی الکلام فیه بالبسط ۱۲ منه

[2] قال المستفتی فی صفحہ ۲۳ وص ۲۴ ان القرض غیر الدین والقرض لا یندرج فی الدین المؤجل وبنی علیه ان الآثار الواردة فی تغیر ربا الجاهلیة لا تتناول القرض قلت وهذا کله بناء الفاسد کما ستعلم ۱۲ منه

[3] سیاتی جواز التاجیل فی القرض عند مالکؒ وشافعیؒ فقوله ما له اجل یعم الدین المؤجل والقرض المؤجل جمیعا ۱۲ منه

کثیراً ضد و دانیته اقرضته واقرضنی اھ (ص ۴۰۷) واما ذکرہ المستفتی عن الفخر الرازی ان القرض لایجوز فیہ الاجل والدین یجوز فیہ الاجل وکذا اما نقلہ عن الکلیات لابی البقاء (ص ۴۰) فلاحجۃ فیہ لکونہما لیسا فی معرفۃ اللغۃ کصاحب القاموس وایضاً فبحثہما عن جواز الاجل فی القرض وعدم جوازہ فیہ مشعربا نہما لیسا بصدد بیان اللغۃ علی طریقۃ اللغویین بل بصدد بیان الحکم الشرعی لہما عند الفقہاء۔

اور مستفتی کا یہ دعویٰ بالکل باطل ہے کہ دین صرف اسی واجب فی الذمہ کے ساتھ خاص ہے جو بیع سے لازم ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ لفظ دین لغۃً وعرفاً قرض کو بھی شامل ہے جیسا قاموس سے واضح ہے کہ دَین اس چیز کو کہتے ہیں جو حاضر نہ ہو، اور ادنۃ کے معنی یہ ہیں کہ ایک مدت کیلئے کوئی چیز دی یا قرض دیا اور مدیان وہ شخص ہو جو قرض بہت دیتا ہو یا لیتا ہو اور مداینۃ باہم قرض کا لین دین کرنے کو کہتے ہیں اھ اور مستفتی نے جو علامہ فخرازی اور ابوالبقاء وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ قرض میں مدت کی تعیین جائز نہیں اور دَین میں جائز ہے (جس سے دَین اور قرض میں مغائرت معلوم ہوتی ہے) اول تو یہ قول حجت نہیں کیونکہ علمِ لغت میں یہ لوگ صاحب قاموس کے برابر نہیں دوسرے جواز و عدم جواز سے ان کا بحث کرنا صاف بتلا رہا ہے کہ وہ لغت نہیں بیان کررہے بلکہ حکم شرعی فقہی بیان کررہے ہیں،

واما قول صاحب المغرب القرض مال یقطعہ الرجل من اموالہ فیعطیہ عینا فاما الحق الذی یثبت لہ دینا فلیس بقرض اھ فلادلالۃ فیہ علی ان الدین لایطلق علی القرض بل معناہ ان القرض لایطلق علی کل دین فان من الدین ماھو حق یثبت للدائن علی المدیون من غیران یعطیہ عینا کدین المھر،

اور صاحب مغرب نے جو کہا ہے کہ قرض تو حصۂ مال ہے جس کو انسان اپنے مال سے جدا کرکے کسی کو نقد دے اور جو حق کسی کے ذمہ واجب ہوجائے وہ قرض نہیں (بلکہ دین ہے) تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرض پر دَین کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر دَین کو قرض نہیں کہتے کیونکہ دین کی ایک قسم وہ بھی ہے جس میں

للزوجة ولا یصح اطلاق القرض علیہ فبینہما عموم وخصوص مطلقا فکل قرض دین ولا عکس فان المدیون اذا استھلک العین التی استقرضھا صار حقا واجبا فی ذمتہ فھو دین علیہ واما من قال ان القرض لا یجوز فیہ الاجل فان اراد عدم جوازہ فی مذہبہ فمسلم وان زعم جوازہ لغۃ فھو محجوج بقول الشافعیؒ ومالکؒ فانھما قائلان بجواز الاجل فی القرض و لزومہ قال فی حاشیۃ الھدایۃ نقلا عن الکفایۃ واعلم ان القرض مال یقطعہ من اموالہ فیعطیہ وما ثبت علیہ دینا فلیس بقرض والدین یشتمل کل ما وجب فی ذمتہ بعقد او استھلاک وما صار فی ذمتہ دینا باستقراضہ فھو اعم من القرض و قال مالک التاجیل فی القرض لازم لانہ صار دینا فی ذمتہ بالقبض فیصح التاجیل فیہ کسائر الدیون اھ (ص ۲۰ ج ۳) وفی احکام القرآن للجصاص واجاز الشافعی التاجیل فی القرض (ص ۶۹۴ ج ۱) ومالکؒ والشافعیؒ اعلم الناس باللغۃ فی عصرھما واعرف بہا من تأخر

مدیون کے ذمہ ایک حق مالی واجب ہوجاتا ہے، حالانکہ اس کو نقد مال کچھ نہیں دیا جاتا جیسے زوجہ کا دَین مہر کہ اس پر قرض کا اطلاق نہیں ہوتا، خلاصہ یہ کہ دین وقرض میں عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے کہ ہر قرض تو دین ہے مگر ہر دین قرض نہیں۔ اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ دَین میں تعیین مدت جائز ہے اور قرض میں جائز نہیں اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ ان کے مذہب میں جائز نہیں تو مسلّم، اور اگر یہ مطلب ہے کہ لغۃً جائز نہیں (جس کا نتیجہ یہ ہو کہ دَین مؤجل کو لغۃً قرض نہ کہہ سکیں) تو یہ غلط ہے، کیونکہ امام شافعی اور امام مالک قرض میں تعیین مدت کو جائز کہتے ہیں (تو ان کے نزدیک دین مؤجل کو قرض کہہ سکتے ہیں) کفایہ میں ہے کہ قرض وہ مال ہے جس کو اپنے مال سے جدا کرکے کسی کو دیا جائے اور جو حق مالی کسی کے ذمہ واجب ہوجائے وہ قرض نہیں (بلکہ دین ہے) اور دین ہر واجب فی الذمہ کو شامل ہے خواہ عقد سے واجب ہو یا دوسرے کی چیز تلف کردینے سے یا قرض لینے سے، پس دَین قرض سے عام ہے اور امام مالک کا قول ہے کہ اگر قرض میں مدت مقرر کی جائے تو وہ لازم ہوجاتی ہے

عنہما فبطل قول المستفتی ان شرط
الاجل مناف لحقیقۃ القرض
فالقرض لایندرج فی الدین المؤجل
فلا یجوز ان یراد بالدین القرض اذا
کان فیہ اجل الخ (ص ۴۰، ۴۱) بل
الحق ما ذکرہ الراغب الاصفہانی
وابن الاثیر والقاضی محمد علی
التھانوی[ا] انہ ای الدین یشمل القرض
وھو التحقیق الانیق وبالقبول حقیق
قال الجصاص فی احکام القرآن لہ
قولہ تعالٰی اذا تداینتم بدین
الی اجل مسمی ینتظم سائر عقود
المداینات التی یصح فیہا الآجال
ولا دلالۃ فیہ علی جواز التاجیل فی
سائر الدیون لان الآیۃ لیس فیہا
بیان جواز التاجیل فی سائر الدیون
وانما فیہا الامر بالاشہاد اذا کان دینا
مؤجلا ثم یحتاج ان یعلم بدلالۃ
اخری جواز التاجیل فی الدین و
امتناعہ وقد احتج بعضہم فی جواز
التاجیل فی القرض بہذہ الآیۃ اذ لم
تفرق بین القرض وسائر عقود المداینات
وقد علمنا ان القرض مما شملہ الاسم
ولیس ذلک عندنا کما ذکر لانہ لا
دلالۃ فیہا علی جواز کل دین ولا علی

کیونکہ قبضہ کے بعد قرض کی رقم بھی دین
ہو جاتی ہے، پس تعیین مدت اس میں بھی بقیہ
دیون کی طرح جائز ہے اھ اور احکام جصاص
میں ہے کہ امام شافعی کے نزدیک قرض میں
تعیین مدت جائز ہے اھ اور یقیناً امام مالک
وشافعی لغت کو متاخرین سے زیادہ جانتے
ہیں اگر لغۃً دین موجل پر قرض کا اطلاق
صحیح نہ ہوتا تو یہ دونوں امام قرض میں تعیین
مدت کے قائل نہ ہوتے، پس مستفتی کا یہ قول
باطل ہے کہ مدت کی شرط لگانا حقیقت
قرض کے منافی ہے اور دین مؤجل کو قرض
نہیں کہہ سکتے اور لفظ دین سے قرض کو مراد
نہیں لے سکتے (اور اس دعوے پر مستفتی نے
بڑی عمارت قائم کی ہے کہ جن آثار میں
ربا جاہلی کی تفسیر میں دین کا لفظ آیا ہو سب
کو ثمن بیع پر محمول کر کے یہ کہا ہے کہ اس میں
قرض داخل نہیں یہ ساری عمارت ان اقوال
علماء مذکورہ نے منہدم کر دی) بلکہ حق
یہ ہے کہ لفظ دین قرض کو بھی شامل ہے جیسا
امام راغب اصفہانی اور حافظ ابن اثیر اور قاضی
محمد علی تھانوی نے فرمایا ہے، اور یہی تحقیق لائق
قبول ہے، امام جصاص رازی نے بھی
آیت مداینہ کی تفسیر میں اس کی تصریح
کی ہے کہ لفظ دین قرض کو بھی شامل
ہے اور قرض میں تعیین مدت کا جائز نہ ہونا

[ا] مصنف کشاف اصطلاحات الفنون وہو کتاب یدل علی تبحر مؤلفہ وعلی جودۃ معرفتہ بالفنون وسعۃ نظرہ فیہا رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ وقد یدل المستفتی اسمہ بوجیہ الدین وانما ہو اسم مصحح الکتاب ۱۲ منہ

جواز التاجیل فی جمیعها و انما فیها
الامر بالاشهاد علی دین قد ثبت
فیه التاجیل فی القرض مغفل فی
استدلاله ومما یدل علی ان القرض
لم یدخل فیه ان قوله تعالیٰ اذا
تداینتم بدین قد اقتضی عقد
المداینة ولیس القرض بعقد مداینة
اذ لا یصیر دینا بالعقد دون القبض
اھ (ص ۴۸۳ ج ۱) وفیه تصریح بان القرض
شمله اسم الدین لغةً وانه یصیر دیناً
بعد القبض وان عدم جواز التاجیل
فیه وانما هو لدلیل اٰخر فتدبر افاده شرعا
قال المستفتی وذهب البعض الی ان
اللام فی الربوا للعهد والمراد به ربا الجاهلیة
فالمال علی هذا التفسیر ان القراٰن
حرم ربا الجاهلیة وکان لم یثبت صورة
ربا الجاهلیة من حدیث مرفوع متصل
الی الاٰن لم یلتفت الائمة والجمهور
الیه وقالوا ان ربا القراٰن مجمل و
الحدیث مفسر له اھ (ص ۲)
قلت کبرت کلمة تخرج من افواههم
ان یقولون الا کذبا وهل یقدر
المستفتی علی ان یرینا نصا من واحد
من العلماء یفید ان علة قولهم بالاجمال
فی اٰیة الربا عدم ثبوت ربا الجاهلیة

دوسرے دلائل شرعیہ سے ثابت ہوا اھ
(قول مستفتی) اور بعض علما اس طرف گئے ہیں
کہ قرآن میں الربا کا لام عہد کے لئے ہے اور اس
سے زمانہ جاہلیت کی ربا مراد ہے، مگر چونکہ اب
تک کسی حدیث مرفوع متصل سے ربا جاہلی کی
صورت (اور اس کی حقیقت) ثابت نہیں ہوئی
اس لئے ائمہ نے اور جمہور نے اس بات کی
طرف التفات نہیں کیا بلکہ وہ سب اس کے
قائل ہیں کہ قرآن میں لفظ ربا مجمل ہے اور حدیث
اس کی تفسیر کر رہی ہے اھ

جواب میں کہتا ہوں یہ بہت بڑی بات
ہے جو اس مستفتی کی زبان سے نکلی ہے
اور یقیناً غلط ہے، اگر مستفتی سے ہو سکے
تو ہم کو علما میں سے کسی کا صریح قول اس
مضمون کا دکھلائے کہ وہ آیت ربا میں اجمال
کے قائل اس لئے ہوئے ہیں کہ ان کے نزدیک
ربا جاہلی کی صورت ثابت نہیں ہوئی۔ اور
وہ اس بات کے کیونکر قائل ہو سکتے ہیں کہ
قرآن میں لفظ ربا بالکل مجمل ہے جس کے معنی
معلوم کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کی تفسیر معلوم کرنے کی ضرورت ہے
حالانکہ ربا کا لین دین اس آیت کے نزول
اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے
بیان سے پہلے ہی مشرکین عرب
اور اہل کتاب میں عام طور پر شائع

عندهم ولن لم يلتفتوا اليه وان لم
يفعل ولن يفعل ابدا فليتق النار
التى اعدت لاهل الربا، وكيف يجوز لهم
القول بان الربا مجمل رأساً يحتاج
الى بيان الرسول صلى الله عليه وسلم
من اصله وقد كان الربا فاشيا فى
مشركى العرب واهل الكتاب قبل
نزول الآية وبيان الرسول فحكى الله
عن المشركين ذلك بانهم قالوا انما البيع
مثل الربا واحل الله البيع وحرم
الربا وقال فى اهل الكتاب فبظلم
من الذين هادوا حرمنا عليهم طيبات
احلت لهم وبصدهم عن سبيل
الله كثيرا واخذهم الربا وقد
نهوا عنه واكلهم اموال الناس
بالباطل الآية فلو كان الربا لا يعرف
الا ببيان الرسول فكيف اخذه اهل
الكتاب وذموا لاجله وكيف فرّق
المشركون بين البيع والربا وقاسوا
احدهما بالآخر قبل علمهم ببيان
الرسول فان بيان الرسول متأخر [عہ]
عن نزول الآية قطعا فلابد من
القول بان الربا كان معلوما عند
العرب واهل الكتاب قبل نزول

تھا جیسا ذلک بانہم قالوا انما البیع مثل
الربوا، اور آیت وبصدہم عن سبیل اللہ
کثیرا واخذہم الربوا وقد نہوا عنہ سے معلوم
ہوتا ہے، پس اگر ربا کی حقیقت معلوم کرنا رسول
اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بیان پر موقوف ہے
تو حضور کے بیان سے پہلے اہل کتاب نے اس کا
لین دین کیسے کرلیا اور قرآن میں ان کی مذمت
کس طرح وارد ہوگئی اور مشرکین نے ربا اور
بیع میں فرق کیونکر کرلیا اور ایک کو دوسرے
پر قیاس کس طرح کرلیا، کیونکہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان یقیناً نزول آیت
سے مؤخر ہے (کیونکہ بیان کا مبین سے مؤخر
ہونا لازم ہے اور طحاوی نے بھی اس کی تصریح
کی ہے جیسا ابھی معلوم ہوگا) پس لامحالہ ماننا
پڑے گا کہ ربا کے معنی اس آیت کے نزول اور
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے پہلے
اہل عرب اور اہل کتاب کو معلوم تھے اور وہ
اس کا لین دین کرتے تھے جس کی خبر قرآن میں
دی گئی اور اسی کی وجہ سے ان کی مذمت
کی گئی ہے اور ائمہ وجمہور علماء نے ربا جاہلی
کی صورت بیان کرکے اس کی حرمت پر اجماع
واتفاق کرلیا ہے جیسا ابن رشد وامام
جصاص وفخر رازی کے اقوال سے اوپر
معلوم ہوچکا تو کیا اجماع کے بعد بھی

عہ ضرورة تاخر البيان عن المبين كما هو ظاهر وصرح بالطحاوى ايضا كما سيأتى ۱۲ منہ

الاٰیۃ وبیان الرسول وھو الذی تولاہ الله الی اھلہ وذمھم لاجلہ فی القراٰن واتفقت الامۃ واجمعت الائمۃ علی حرمۃ الربا الذی کان علیہ اھل الجاھلیۃ وبینوا صورتھا کما مر ذکرہ فی کلام ابن رشد والامام الحافظ الجصاص والفخر الرازیین وھل بعد الاجماع یحتاج احد الی السند المتصل ومن الذین بینوا صورۃ ربا الجاھلیۃ وذھبوا الی عدم الاجمال فی الاٰیۃ الامام العلامۃ الطحاوی حیث قال فی شرح الاٰثار لہ فی تاویل حدیث ابن عباس رضی الله عنھما عن اسامۃ رضی الله عنہ (انما الربوا فی النسئۃ) ان ذلک الربوا انما عنی بہ ربا القراٰن الذی کان اصلہ فی النسئۃ وذلک ان الرجل کان یکون لہ علی صاحبہ الدین فیقول لہ اجلنی منہ الی کذا وکذا بکذا وکذا درھما ازیدک

کسی کو سند متصل کی حاجت باقی رہ سکتی ہے؟ (ہرگز نہیں) اور امام علامہ طحاوی بھی (جو حافظ حدیث وصاحب تنقید وجرح وتعدیل اور مجتہد وحجت ورئیس الحنفیہ ہیں) انہی علماء میں سے ہیں جو ربا جاہلی کی صورت کو (جزم کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور آیت الربا کو مجمل نہیں مانتے (اور حافظ حدیث وناقد وحجت کا جزم خود ایک مستقل دلیل ہے، کیونکہ ایسا شخص بدون صحت وثبوت کے کسی بات کو جزماً بیان نہیں کرتا ۱۲) چنانچہ وہ شرح الآثار میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث انما الربوا فی النسئۃ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس ربا سے مراد وہ ربا ہے جو قرآن میں مذکور ہے جو در اصل قرض میں ہوتی تھی اور اس کی صورت یہ تھی کہ ایک شخص کا دوسرے کے ذمہ دَین ہوتا پھر مدیون دائن سے کہتا ہے کہ مجھے اتنی مدت کی مہلت دے دو میں تم کو دَین سے زیادہ اتنی رقم دوں گا اس صورت

عہ قلت فی جزم مثل الطحاوی الحافظ الناقد الحجۃ الامام المجتہد بذلک اکبر دلیل علی ثبوت تغیر ربا الجاھلیۃ عندہ فانہ جعل قول المستفتی ان تغیر ربا الجاھلیۃ لم یثبت الی الاٰن ۱۲ ظ عہ المراد بالدین القرض وکل ما ثبت فی الذمۃ بدلیل ما مر عن الجصاص والفخر الرازیین ان ربا الجاھلیۃ کان فی القرض وقد فرغنا من تحقیق معنی الدین فلا دلیل للمستفتی فی حملہ علی الثابت فی الذمۃ لاجل البیع وکذا حملہ النسئۃ علی البیع بالنسئۃ لغو باطل بل المراد بہ اعم من ذلک وقد ذکرنا عموم النسئۃ للقرض فتذکر ۱۲ منہ عہ ہم بتلا چکے ہیں کہ دین قرض کو بھی عام ہے پس مستفتی کا اس کو ثمن مبیع کے ساتھ خاص کرنا غلط ہے خصوصاً جبکہ امام جصاص اور فخر رازی نے صراحۃً بیان کیا ہے کہ ربا جاہلی قرض میں ہوتی تھی ۱۲ منہ

فی دینك فیکون مشتریا الاجل بمال فیہا ھم میں یہ شخص مدت کو مال کے بدلے خریدتا تھا

الله عزوجل عن ذلك بقولہ یا ایہا الذین امنوا اتقوا الله وذروا ما بقی من الربا ان کنتم مؤمنین ثم جاءت السنۃ بعد ذلك بتحریم الربا فی التفاضل فی الذهب بالذهب والفضۃ بالفضۃ وسائر الاشیاء المکیلات والموزونات فکان ذلك ربوا حرم بالسنۃ وتواترت بہ الآثار عن رسول الله صلی الله علیہ وسلم حتی قامت بہ الحجۃ والدلیل علی ان ذلك الربوا المحرم فی هذه الآثار هو غیر الربو الذی رواہ ابن عباس عن اسامۃ رضی الله عنہم عن رسول الله صلی الله علیہ وسلم رجوع ابن عباس رضی الله عنہما الی ما حدثہ بہ ابو سعید رضی الله عنہ عن رسول الله صلی الله علیہ وسلم فلو کان ما حدثہ بہ ابو سعید من ذلك فی المعنی الذی کان اسامۃ حدثہ بہ اذا ما کان حدیث ابی سعید عندہ باولی من حدیث اسامۃ ولکنہ لم یکن علم بتحریم رسول الله صلی الله علیہ وسلم هذا الربوا حتی

اللہ تعالیٰ نے آیت یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربا ان کنتم مومنین۔ میں اس سے لوگوں کو منع کیا پھر اس کے بعد حدیث وارد ہوئی جس نے ربا تفاضل کو بھی حرام کردیا جب کہ سونے کا سونے سے بدلا ہو اور چاندی کا چاندی سے اسی طرح تمام مکیلات وموزونات ہیں۔ پس یہ وہ ربا ہے جو حدیث سے حرام ہوئی اور اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ آثار وارد ہیں جن سے حجت قائم ہوگئی، اور اس کی دلیل کہ ان آثار میں جس ربا کو حرام کیا گیا ہے وہ اس ربوا کے علاوہ ہے جس کو ابن عباس رضؓ نے بواسطہ اسامہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا، یہ ہے کہ ابن عباس نے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث کی طرف رجوع فرمایا پس اگر حدیث ابو سعیدؓ کا وہی مطلب ہوتا جو حدیث اسامہ کا مطلب تھا تو اس صورت میں ابو سعید کی حدیث ابن عباس کے نزدیک حدیث اسامہ سے اولیٰ نہ ہوتی کہ اس سے

لہ لایقال حدیث ابی سعید متواتر بخلاف حدیث اسامۃ فکان اولی منہ لانا نقول ان تواترہ انما هو بالنسبۃ الینا لکونہا جمعا آثار الصحابۃ کلہا فی الباب واما بالنسبۃ الی ابن عباس فلا فانہ رجع عن الانکار بحدیث اسامۃ بمجرد قول ابی سعید ودرایۃ کما دلت علیہ الآثار فافہم منہا ما ذکرہ الحافظ فی الفتح عن ابی مجلز ان ابا سعید لقی ابن عباس فذکر الحدیث فقال ابن عباس استغفر الله واتوب الیہ فکان ینہی عنہ اشد النہی اھ ص ۳۱۹ ج ۴ ۱۲ مؤلف

حدثه به ابو سعید رضی
رضی الله عنه فعله ان
ما کان حدثه به اسامة
رضی الله تعالیٰ عنه عن
رسول الله صلی الله علیه
وسلم کان فی ربوا
غیر ذلك الربوا اھ
(ص ۲۳۲ ج ۲)

رجوع کریں اور حدیث ابوسعید کو اختیار کریں
کیونکہ جب دونوں حدیثوں کا مطلب ایک ہے
اور راوی بھی دونوں ثقہ ہیں پھر رجوع کے کیا
معنی ۱۲) بلکہ عبداللہ بن عباس کو اس ربا کی
حرمت کا علم تھا جس کو ابوسعید نے بیان فرمایا
اس کو سن کر وہ سمجھ گئے کہ اسامہ نے جو حدیث
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے
وہ دوسری ربا کے متعلق ہے جو اس ربا کے علاوہ
ہے جس کو ابوسعیدؓ نے بیان کیا) اھ

قلت واذا کان ربا الفضل الذی حدث
به ابوسعید غیر ربا القرآن الذی حدث
به اسامة لم یکن حدیث ابی سعید بیانا
للآیة ولا هی مجملة لکون البیان
عین المبین لا غیره کما تقرر فی الاصول
بل ربوا الفضل الذی جاءت بالسنة
ملحق بربا القرآن الذی کان علیه اهل
الجاهلیة ولا دلیل علی حرمته الا بالسنة
المتواترة دون القرآن فثبت ان
الفضل المشروط فی القرض حرام
محرم بآیة الربوا المفسرة
بربا الجاهلیة لا یقال ان معنی
حدیث اسامة انما الربوا فی النسیئة
ان لا تبیعوا غائبا بناجز فی المکیلات
والموزونات ولا دلیل فیه علی حرمة
الفضل المشروط فی القرض

میں کہتا ہوں کہ جب طحاوی کے نزدیک
ربا الفضل جس کا حدیث ابوسعید میں ذکر ہے
ربا قرآنی کی غیر ہے تو اب نہ حدیث ابوسعید
آیت قرآن کے لئے بیان ہے اور نہ آیت
قرآن ان کے نزدیک مجمل ہے کیوں کہ بیان
تو مبین کا عین ہوتا ہے نہ غیر جیسا اصول میں
ثابت ہو چکا ہے۔ بلکہ ربا الفضل جس کا حدیثوں
میں ذکر ہے ربا قرآنی کے ساتھ ملحق ہے۔
اور ربا قرآنی وہی ہے جو اہل جاہلیت میں
رائج تھی پس ثابت ہو گیا کہ قرض میں شرط
کے ساتھ زائد رقم وصول کرنا نص قرآن
سے حرام ہے۔

سوال، حدیث انما الربا فی النسیئة کے
معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مکیلات و موزونات
میں حاضر کو غائب کے بدلہ بیع نہ کرو (یعنی
ادھار نہ بیچو) اس صورت میں یہ حدیث قرض

لانا نقول قصرہ علی البیع بالنسئۃ
لا یصح لوجوہ الاول ما قدمنا عن
الجصاص وغیرہ ان لفظ النسئۃ
عام لغۃ وعرفا وشرعا للثمن المؤجل
فی البیع وللقرض جمیعا لکونہ بمعنی
الدین وعمومہ للقرض ظاہر کما
مر یقال النقد خیر من النسئۃ
والثانی ان حدیث اسامۃ رواہ
البعض بلفظ النسئۃ ورواہ
بعضھم بلفظ لا ربوا الا فی
الدین اخرجہ الطحاوی
بسند صحیح (ص ۲۳۲ ج ۲)
ولا یطلق الدین علی البیع
اصلا کما لا یخفی وعمومہ
للقرض ظاہر والاحادیث
یفسر بعضھا بعضا فالمراد بالنسئۃ
فی حدیث اسامۃ انما ہو الدین
لا غیر او اعم منہ ومن البیع
بالنسئۃ ومعنی حدیث اسامۃ
لا ربوا الا فی النسئۃ ای الربا
الاغلظ الشدید التحریم المتوعد
علیہ بالعقاب الشدید کما تقول العرب
لا عالم فی البلد الا زید مع ان فیہا علماء غیرہ۔

میں زائد رقم لینے کی حرمت پر دال نہ ہوگی
جواب، لفظ نسئہ کو ثمن مؤجل کے
ساتھ خاص کرنا چند وجوہ سے غلط ہے اول
اس لئے کہ ہم جصاص وغیرہ کے اقوال سے
اس کا ثبوت دے چکے ہیں کہ لفظ نسئہ لغۃً
وعرفاً وشرعاً ثمن مؤجل اور قرض دونوں کو
عام ہے کیونکہ نسئہ اور دَین کے ایک معنی ہیں
اور دین کا قرض کو شامل ہونا ظاہر ہے (محاورہ
میں بولا جاتا ہے۔ النقد خیر من النسئۃ (نقد
ادھار سے بہتر ہے) اور اس کو ثمن مؤجل کے
ساتھ کوئی خاص نہیں کرتا ۱۲) دوسرے یہ کہ
اس حدیث میں بعض نے تو لفظ نسئہ روایت
کیا ہے اور بعض نے لا ربوا الا فی الدین کہا ہے
اس کو طحاوی نے سند صحیح سے روایت کیا ہے اور
مبیع کو دَین نہیں کہا جاتا اور دین کا قرض کو
شامل ہونا ظاہر ہے اور ایک حدیث سے
دوسری کی تفسیر ہو جاتی ہے پس حدیث انما
الربا فی النسئۃ میں نسئہ سے مراد یا تو صرف دین
ہے یا معنی عام مراد ہیں جو قرض کو بھی اور ادھار
بیچنے کو بھی شامل ہے اور اس حدیث کے معنی
یہ ہیں کہ سخت ربا جس کی حرمت اعلیٰ درجہ کی
ہے جس پر سخت عذاب کی دھمکی ہے صرف
دَین میں ہے جیسے محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ

مہ فان الدین ضد العین فالعین عند العرب ما کان حاضرا والدین ما کان غائبا قال الشاعر ۔ وعدتنا ببدرتین طلا رکز
وشوا رمعجلا غیر دین ۔ ولا یطلق الدین علی البیع اصلا وانما یطلق علی الثمن المؤجل انہ دین فلا یصح اطلاقہ علی البیع اصلا
وانما یطلق علی الثمن المؤجل انہ دین والنسئۃ بمعنی الدین فلا یصح اطلاقہ علی البیع وانما یقال لہ نسئۃ وہذا البیع بالنسئۃ ...

اس شہر میں زید کے سوا کوئی عالم نہیں حالانکہ اس میں اور بھی علما رہوتے ہیں۔

وانما القصد نفی الاکمل لا نفی الاصل قال الحافظ فی الفتح (ص ۳۱۹ ج ۴) وفیه ایضاً یحمل حدیث اسامة علی الربا الاکبر والله اعلم۔ قلت ولا یستقیم هذا المعنی لو حملناه علی البیع بالنسیئة فی المکیل والموزون فان بیع الذهب بالذهب مثلا بمثل نسیئة لیس باشد من بیعهما متفاضلا بل البیع متفاضلا اشد لتحقق معنی الربا فیه صریحا وحقیقة بخلاف البیع بالنسیئة متماثلا فان تحقق معنی الربا فیه لیس الا شرعا فلا یجترئ عاقل علی حمل قول النبی صلی الله علیه وسلم لاربوا الا فی النسیئة وانما الربوا فی النسیئة علی الربا الاصغر الذی لا یتحقق فیه معنی الربا حقیقة فلا بد من حمله علی الربا الاکبر ولیس هو بیع المکیل بالمکیل والموزون بالموزون متفاضلا لعدم اطلاق النسیئة علیه ولکون ابن عباس کان ینکره اولا ولا یحرمه فلم یبق الا الربا الذی کان علیه اهل الجاهلیة وهو زیادة فی الدیون والقروض وبالجملة فلا یصح قصر قوله صلی الله علیه وسلم لاربوا الا فی النسیئة علی البیع بالنسیئة بل المراد به الربا فی الدین لاغیر او اعم منه ومن البیع بالنسیئة

مگر مقصود اکمل کی نفی ہوتی ہے کہ پورا عالم زید کے سوا کوئی نہیں یہ تفسیر حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں بیان فرمائی ہے نیز حافظ نے یہ بھی کہا ہے کہ حدیث اُسامہ میں ربا کا اعلیٰ درجہ مذکور ہے، واللہ اعلم۔

میں کہتا ہوں کہ یہ معنی اسی وقت درست ہو سکتے ہیں جبکہ حدیث انما الربا فی النسیئة کو ربا جاہلی پر محمول کیا جائے جو قرض و دین میں ہوا کرتی تھی ربا البیع پر محمول کر کے یہ معنی درست نہیں ہو سکتے کیونکہ ربا البیع کی دو صورتیں ہیں ایک ربا الفضل کہ سونے کو سونے کے عوض یا چاندی کو چاندی کے عوض کمی بیشی کے ساتھ بیع کیا جائے دوسرے ربا النسیئة کہ سونے چاندی کو برابر سرابر بیع کیا جائے مگر نقد نہ ہو بلکہ ادھار ہو اور ظاہر ہے کہ دوسری صورت میں ربا کے معنی متحقق نہیں کیونکہ ظاہر میں یہاں کوئی زیادت نہیں پس اس کو ربا کا اعلیٰ درجہ نہیں کہہ سکتے اور پہلی صورت گو اس سے اشد ہے مگر حدیث کو اس پر بھی محمول نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اول تو اس پر نسیئہ کا اطلاق ہی نہیں ہوتا دوسرے عبداللہ بن عباس رضی جو اس حدیث کے راوی ہیں ربا الفضل کو اولاً حرام ہی نہ کہتے تھے پس اعلیٰ درجہ کی ربا جس پر حدیث کو محمول کر سکتے

كما قلنا اولاً فافهم ولا تكن من الغافلين
فظهر مما ذكرنا ان الربا المذكور فی
القرآن ليس بمجمل رأسا بل كان معلوم
المعنی واضح المراد عند العرب وانما
حدث الاجمال فيه عند من قائل
بالاجمال فی آية الربا بعد ما دخلت
السنة فيه اشياء لم يكن العرب يعرفها
بالربا ودليل ذلك اتفاق القائلين
بالاجمال وغيرهم على بيان ربا الجاهلية
فی تفسير الآية وعلى حرمته قطعا
منهم الجصاص والفخر الرازی
وابن الهمام حيث فسر قوله تعالى
يا ايها الذين آمنوا لا تاكلوا الربا
بقوله ای الزائد فی القرض والسلف
على القدر المدفوع والزائد فی بيع
الاموال الربوية عند بيع بعضها
بجنسه وتبعه فی ذلك الشيخ ثناء الله
فی تفسيره المظهری قاله المستفتی
ص ۲۴ فهؤلاء مع كونهم
قائلين بالاجمال فی الآية
متفقون على تفسير الربا فی
الآية بالزائد فی القرض
والسلف ومجمعون على انه
هو الربا الذی كان عليه
اهل الجاهلية كما تقدم

ہیں۔ صرف وہی ربا ہے جس پر اہل جاہلیت
کا عمل تھا۔ اور وہ قرض و دین ہی میں آتی
تھی۔ اس تقریر سے یہ بات ظاہر ہوگئی
کہ لفظ ربا جو قرآن میں ہے وہ بالکلیہ مجمل
نہیں، بلکہ جو لوگ اس کو مجمل کہتے ہیں ان
کا مطلب یہ ہے کہ اہل عرب کے نزدیک
تو اس کے معنی واضح اور مراد معلوم
تھی، مگر جب حدیث نے اس کے تحت
میں بعض ایسی صورتیں بھی داخل کردیں
جن کو اہل عرب ربا نہ کہتے تھے اس وقت
اس میں اجمال پیدا ہوگیا۔ اور اس کی
دلیل یہ ہے کہ جو علماء اس آیت میں اجمال
کے قائل ہیں وہ بھی سب کے سب ربا
جاہلیت کے ساتھ آیت کی تفسیر کرتے
اور اس کی حرمت کو قطعی جانتے ہیں،
منجملہ ان کے امام جصاص اور فخر رازی
اور ابن الہمام ہیں، چنانچہ ابن الہمام
نے آیت یا ایہا الذین آمنوا لا تاکلوا الربا
کی یوں تفسیر کی ہے کہ قرض اور سلف میں
اس رقم سے زیادہ نہ لو جو تم نے دی ہے،
اسی طرح اموال ربویہ کو جب ہم جنس کے عوض
بیع کرو تو زیادہ نہ لو، اور قاضی ثناء اللہ
صاحب نے بھی تفسیر مظہری میں اسی کے
موافق تفسیر کی ہے۔ پس یہ علماء اگرچہ
آیت الربا میں اجمال کے قائل ہیں مگر

ذکرہ عن ابن رشد وغیرہ فلو کان الربا مجملا غیر معلوم المراد عند العرب لم یذکروا ربا الجاهلیة فی تفسیرہ بل اقتصروا علی تفسیرہ بالسنة فقط

سب کے سب بالاتفاق ربا کی تفسیر میں یوں کہہ رہے ہیں کہ قرض میں اصل رقم سے زیادہ لینا بھی اس میں داخل ہے اور تمام علماء کا اس پر اجماع ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی ربا یہی تھی (کہ قرض پر کچھ زائد وصول کرتے تھے ۱۲) جیسا ابن رشد وغیرہ کے حوالہ سے اجماع کا بیان اوپر گذر چکا ہے پس اگر ان کے نزدیک لفظ ربا ایسا مجمل تھا کہ عرب کو بھی اس کے معنی معلوم نہ تھے تو یہ حضرات ربا جاہلی کو اس کی تفسیر میں بیان نہ کرتے، بلکہ صرف حدیث کو اس کی تفسیر میں ذکر کرتے۔

والمستفتی حیث لم یعرف مراد هم فقال مورداً علی ابن الهمام فی تفسیر الاٰیة هذا اخلاف ما قال اولاً من ان الربا بیع وایضاً هو صرح بنفسه فی التحریر ان الاٰیة مجملة والحدیث یفسرها فکیف یصح منه هذا القول اھ (ص ۲۴) ولم یدر المسکین ان الفقهاء والمصنفین اذا ذکروا الربا فی باب البیوع یریدون به ربا البیع دون المعنی العام الشامل لربا الدین ایضاً ولذا یقولون فی باب البیوع هو ای الربا من البیوع المنهیة قطعاً ویعرفونه بما یشعر بکون الربا بیعاً فظن المستفتی ان الربا لا یتحقق الا بالبیع وهذا باطل قطعاً فان الربا الذی هو فرد من افراد البیع یسمی بربا البیع

اور مستفتی نے ان حضرات کی مراد تو سمجھی نہیں خواہ مخواہ ان پر اعتراض کرنے لگا، چنانچہ ابن الہمام کی اس تفسیر پر اُس نے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ تفسیر ان کے اس قول کے خلاف ہے جو پہلے گذر چکا کہ ربا بیع ہے، نیز ابن الہمام نے تحریر میں خود تصریح کی ہے کہ یہ آیت مجمل ہے اور حدیث اس کی مفسر ہے۔ پھر یہ بات کیونکر صحیح ہو سکتی ہے کہ قرض کی رقم سے زائد وصول کرنا بھی ربا میں داخل ہے (کیونکہ حدیث میں اس کا ذکر نہیں ۱۲) میں کہتا ہوں کہ اس مسکین کو اتنی بھی خبر نہیں کہ فقہاء و مصنفین باب البیوع میں جب ربا کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ربا کی ایک قسم یعنی ربا البیع مراد ہوتی ہے عام معنی مراد نہیں ہوتے جو ربا الدین کو بھی شامل ہے اسی لئے کتاب البیوع میں وہ یوں کہہ دیتے ہیں کہ ربا بھی ان بیوع میں سے ہے جو قطعاً

ویقال له ربا السنة ایضا و اما ربا الدین ویقال له ربا القرآن و ربا الجاهلیة ایضا فلیس من افراد البیع وھذا ھو معنی قول الفقھاء ان الربوا خص من قوله تعالیٰ واحل الله البیع بقوله وحرم الربا ای خص ربا البیوع من قوله واحل الله البیع ولا یلزم من کون قسم من اقسام الربا داخلا فی البیع ان یکون جمیع اقسامه من افراد البیع داخلا فیه کما زعمه المستفتی والمراد بکون الآیة مجملة ما ذکرناه مرارا فلا نعیده فتذکر۔

ویرشد الی ما قلنا قول الشاہ ولی الله حکیم الامة فی الحجة البالغة وکذلك الربا وھو القرض علی ان یؤدی الیه اکثر وافضل مما اخذ سُحتٌ باطل الی ان قال واعلم ان الربا علی وجھین حقیقی ومحمول علیه اما الحقیقی فھو فی الدیون والثانی ربا الفضل والاصل فیه الحدیث المستفیض الذھب بالذھب الحدیث وھو سمی ربواً

ممنوع ہیں اور اس کی تعریف بھی ایسے الفاظ سے کرتے ہیں جن میں ربا کا بیع ہونا مفہوم ہوتا ہے۔ مستفتی نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ ربا کا تحقق ہی بدون بیع کے نہیں ہو سکتا حالانکہ یہ سراسر غلط ہے، کیونکہ جو ربا بیع کی فرد ہے اس کا نام ربا البیع ہے اور اس کو ربا حدیثی بھی کہتے ہیں، رہی دوسری قسم کی جو دین و قرض میں ہوتی ہے جس کو ربا قرآنی اور ربا جاہلی بھی کہتے ہیں وہ بیع کی فرد ہرگز نہیں اور یہی مطلب ہے فقہاء کے اس قول کا کہ احلّ الله البیع سے ربا مستثنیٰ ہے بدلیل وحرم الربا کے یعنی احل البیع سے ربا البیع مستثنیٰ ہے۔ (کیونکہ وہ حلال نہیں اور ربا البیع کے مستثنیٰ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ربا مطلقاً بیع ہی ہے ۱۲) اور ربا کی ایک قسم اگر بیع میں داخل ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی تمام اقسام بیع میں داخل ہوں (حتیٰ کہ ربا کا تحقق ہی بدون بیع کے نہ ہو سکے) جیسا مستفتی نے سمجھا ہے، اور آیت کے مجمل ہونے (اور حدیث کے مفسر ہونے) کا مطلب ہم بار بار بیان کر چکے ہیں اس کے اعادہ کی کچھ ضرورت نہیں اور ہماری اس تحقیق کی تائید حکیم الامت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے قول سے

ع۵ ذکر الاقوال کلھا المستفتی فی ص۲۳ و ۲۴ و ۲۵۔ مؤلف

تغليظا وتشبيها بربا الحقيقي وبه يفهم معنى قوله صلى الله عليه وسلم لا ربا الا في النسئة،

بھی ہوتی ہے، جو حجۃ اللہ البالغہ میں مذکور ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ربا بھی حرام و باطل ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ قرض اس شرط سے دیا جائے کہ اصل سے زائد وصول کیا جائے گا، اس کے بعد فرماتے ہیں، کہ جاننا چاہئے کہ ربا کی دو قسمیں ہیں، ایک حقیقی دوسرے الحاقی، ربا حقیقی تو وہ ہے جو دین (وقرض) میں ہو، اور الحاقی وہ ہے جو (بیع میں) کمی بیشی کی وجہ سے ہو اور اس کی اصل حدیث مشہور الذہب ہے، اور اس کو زجر و تنبیہ کے طور پر ربا حقیقی کی مشابہت کی وجہ سے رکھدیا گیا ہے، اور اسی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لا ربا الا فی النسیۂ کا مطلب سمجھ میں آگیا ہوگا (کہ اصل ربا وہی ہے جو دَین و قرض میں ہو)

ثم كثر في الشرع استعمال الربا في هذا المعنى حتى صار حقيقة شرعية فيه ايضا اه وقال ابن الهمام في الفتح باب الصرف ان اسم الربا تضمن الزيادة من الاموال الخاصة في احد العوضين في قرض او بيع اه و في الملتقى الربا فضل مال خال عن عوض شرط لاحد المتعاقدين في معاوضة مال بمال وذكر العلامة شيخ زاده في شرحه العاقدين البائعين او المقترضين اه ومن فهم منه كون القرض بيعا كما ذكره المستفتي عنه وعده من الاعلام فقد سها سهوا[له]

پھر شریعت میں ربا کا استعمال ربا الفضل میں بھی بکثرت ہونے لگا یہاں تک کہ شرعاً اس کو بھی ربا کے معنی حقیقی میں شمار کیا جانے لگا اھ (اس سے صاف معلوم ہوا کہ ربا کی تمام صورتیں بیع میں منحصر نہیں بلکہ ربا حقیقی اور اصلی وہی ہے جو بیع کے علاوہ قرض و دین میں ہوتی ہے ۱۲) اور ابن الہمام نے فتح القدیر کے باب الصرف میں فرمایا ہے کہ ربا خاص اموال کے اندر ایک عوض کا دوسرے عوض سے زائد ہونے کو کہتے ہیں خواہ قرض میں ہو یا بیع اھ اور ملتقی میں ربا کی تعریف اس طرح ہے کہ ربا وہ زائد مال ہے جو معاوضہ مالی میں عاقدین میں

له فان القرض غير البيع حتما نعم ان اراده ان القرض المشروط بالفضل في حكم البيع فصحيح لكون شرط الفضل فيه مؤديا الى كونه معاوضة ابتداء وهو القرض ليس كذلك فيبطل العقد او يلغو الشرط صونا للعقد عن الانقلاب عن حقيقته ۱۲ منه

ظاهر ابل معناه ما حققناه ان الربا منه ما یکون فی البیع ومنہ ما یکون فی القرض کما قالہ الجصاص وابن رشد ونقل اتفاق الکل علیہ وذکرہ الطحاوی ایضا وصرح بہ الشاہ ولی اللہ وقبلہ ابن الھمام وغیرہ کابن القیم والفخر الرازی واورد علیہ المستفتی (فی حاشیۃ ص ۲) ان ھذا لیس بصحیح لان جمھور العلماء قالوا باجمال الاٰیۃ ویکون الحدیث مفسر اللاٰیۃ فھذا یکون ربا حقیقیا لانہ لیس فی القراٰن ربا سوی ما ثبت کونہ ربا بالسنۃ فلا نجترئ علی ان نقول ان ما ثبت کونہ ربا من القراٰن والحدیث ھو ربا غیر حقیقی والذی لم یرد فیہ حدیث لا اشوخال عن العلۃ یکون ربا حقیقیا الخ والجواب ان قولہ لیس فی القراٰن ربا سوی ما ثبت کونہ ربا بالسنۃ غلط ظاھر کما حققناہ قبل وذکرنا ان الطحاوی صرح بکون ربا القراٰن غیر الربا الذی ورد بہ السنۃ و ھذا ھو الحق والا لزم کون العرب واھل الکتاب غیر عارفین بمعنی الربا قبل علمھم بالسنۃ وھذا لا یقولہ من لہ ادنی معرفۃ باللسان

ہے کسی کے لئے بدون عوض کے مشروط ہو علامہ شیخ زادہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ لفظ عاقدین بائع ومشتری اور قرض دہندہ وقرض خواہ سب کو شامل ہے ۱۲ (اس سے معلوم ہوا کہ ربا جس طرح بیع میں ہوتا ہے قرض میں بھی ہوتا ہے ۱۲) اور ملتقی وغیرہ کی عبارت سے جو بعض لوگوں نے جن کو مستفتی نے علماء اعلام میں شمار کیا ہے یہ سمجھا ہے کہ قرض بھی بیع میں داخل ہے اس کا سہو ہونا ظاہر ہے بلکہ ان عبارات کا مطلب وہی ہے جو ہم اوپر ثابت کر چکے ہیں کہ ربا کی ایک قسم وہ ہے جو بیع میں ہو دوسری وہ جو قرض میں ہو جیسا امام جصاص اور ابن رشد نے بیان کیا ہے اور اس پر تمام علماء کا اتفاق نقل کیا گیا ہے امام طحاوی بھی اسی کے قائل ہیں، اور شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی اس کی تصریح کی ہے اور ان سے پہلے علامہ ابن الہمام اور ابن القیم اور فخر رازی بھی اس کی تصریح کر چکے ہیں مستفتی نے ان حضرات کی تحقیق پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ربا القرض کو ربا حقیقی کہنا صحیح نہیں کیونکہ جمہور علماء آیت ربا کو مجمل اور حدیث کو اس کا مفسر مانتے ہیں، پس ربا حقیقی وہی ہے۔ (جو حدیث میں مذکور ہے) کیونکہ قرآن میں صرف اسی ربا کا ذکر ہے جس کا ربا ہونا حدیث سے ثابت ہے، پس ہم اس قول پر جرأت نہیں کر سکتے کہ

والشرع واما قوله ان الربا الذی جعلوه ربا حقیقیا لم یرد به اثر خال عن العلة فباطل وبطلانه سنتکلم علیه فیما سیأتی وان سلمنا فقیام الاجماع علی کونه ربا الجاهلیة الذی نهی الله عنه فی القرآن اغنانا عن تحقیق سنده واورد علیه (فی حاشیة ص۲۳) ایضا بقوله والعجب ان ما یدعی انه ربا حقیقی فلا ذکر له علی لسان الشرع واما المحمول علیه والمشبه به فهو مروی عن جماعة من الصحابة وکذلک الفقهاء لا یذکرون الربا الحقیقی الا تبعا واستطرادا۔

جس صورت کا ربا ہونا قرآن وحدیث سے ثابت ہے اس کو تو ربا غیر حقیقی کہیں اور جس صورت کے متعلق کوئی حدیث یا اثر خالی عن العلت وارد نہیں اس کو ربا حقیقی کہیں اھ (جواب) میں کہتا ہوں کہ مستفتی کا یہ قول سراسر غلط ہے کہ قرآن میں صرف اسی ربا کا ذکر ہے جس کا ربا ہونا حدیث سے ثابت ہے کیونکہ ہم طحاوی کا قول اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ ان کے نزدیک ربا قرآنی اس ربا کے علاوہ ہے، جو حدیث میں مذکور ہے، اور یہی حق ہے ورنہ لازم آئے گا کہ اہل عرب اور اہل کتاب حدیث کے جاننے سے پہلے ربا کے معنی سے واقف ہی نہ تھے اور جس کو زبان عربی اور شریعت سے کچھ بھی واقفیت ہے وہ ایسی بات کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا، رہا یہ کہ جس ربا کو ربا حقیقی کہا جاتا ہے اس کے متعلق کوئی حدیث خالی عن العلت وارد نہیں ہوئی الخ یہ بھی بالکل باطل ہے اور ہم عنقریب اس پر بحث کریں گے، اور اگر تھوڑی دیر کو مستفتی کی بات مان لی جاوے تو جب علماء نے اس بات پر اجماع کر لیا ہے کہ ربا جاہلی وہی ہے جس سے قرآن میں منع کیا گیا ہے اور وہ قرض میں ہوتی تھی تو اس کے بعد ہم کو ان آثار کی سند سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں مستفتی نے تحقیق مذکور پر یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جس ربا کو ربا حقیقی کہا جاتا ہے اس کا تو شریعت کی زبان پر کچھ بھی ذکر نہیں اور جس کو ربا الحاقی اور مشابہ حقیقی کہا جاتا ہے صحابہ کی جماعت سے وہی منقول ہے نیز فقہا بھی

ویاتون بجمیع الفروع والتفاصیل فی باب الربا الغیر الحقیقی اھ والجواب عنه اولا ان الشرع لم یذکر من احکام البول والعذرة الا حکم النجاسة ولم یتعرض

ربا حقیقی کا ذکر محض تبعاً کر دیتے ہیں، اور تمام تر تفصیل اور تفریع ربا غیر حقیقی ہی میں بیان کرتے ہیں، اس کا جواب) اولاً یہ ہے کہ شریعت نے پاخانہ اور پیشاب کے متعلق صرف نجاست

لحرمة اکلهما وشربهما وکذلک الفقهاء لم یتعرضوا لها وانما ذکروا جمیع الفروع والتفاصیل فی باب النجاسة فقط فهل یجترئ احد من الجهلاء فضلا عن العقلاء علی القول بحل تناولهما اکلا وشربا؟ کلا لن یجترئ احد علی القول بمثل ذلک ابدا فکذا الربا فی القرض ان سلمنا قلة تعرض الشارع والفقهاء له فلیس ذلک لکونه جائزا او اقل من ربا البیع حرمة بل سببه عدم الحاجة الی التعرض به لکون الربا فی القرض والدین معلوما کونه ربا عن قابل هو الذی کانت العامة تعرفه بالربا وربا البیع کان خافیا علی الناس لم یکونوا یعدونه ربا فلذا التعرض له الشارع والفقهاء اکثر من الاول فافهم ولا تکن من المکابرین فان حرمة الربا لیست مختصة بالشریعة الاسلامیة بل هی محرمة فی الادیان والملل کلها فانشدک الله ان تسئل اهل الادیان والملل والجهلاء من المسلمین

کا حکم بیان کیا ہے کھانے پینے کی حرمت سے تعرض نہیں کیا اسی طرح فقہاء نے بھی تمامتر تفریع وتفصیل نجاست ہی کے بیان میں کی ہے کھانے پینے کی حرمت سے تعرض نہیں کیا، اب عقلاء کو تو رہنے دو میں تو پوچھتا ہوں کیا کوئی جاہل بھی یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ پیشاب پاخانہ کا کھانا پینا (اس لئے) جائز ہے (کہ شریعت نے اس سے تعرض نہیں کیا) یقیناً اس کی کوئی بھی جرأت نہیں کر سکتا، پس اگر ہم تسلیم کرلیں کہ شارع نے اور فقہاء نے ربا القرض سے تعرض کم کیا ہے تو اس کا یہ سبب نہیں کہ وہ جائز ہے یا ربا البیع سے حرمت میں کچھ کم ہے، بلکہ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس سے زیادہ تعرض کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ ربا القرض کا ربا ہونا سب کو بخوبی معلوم تھا، بلکہ عام لوگ صرف اسی کو ربا سمجھتے تھے، ربا البیع کو ربا شمار ہی نہ کرتے تھے، اس لئے شارع نے اور فقہاء نے ربا البیع سے زیادہ تعرض کیا خوب سمجھ لو، اور ہٹ دھرمی نہ کرو، کیونکہ ربا کی حرمت صرف شریعت اسلامیہ ہی میں نہیں ہے، بلکہ تمام ادیان وملل اس کی حرمت پر متفق ہیں، اب میں تم کو خدا کی قسم دیتا ہوں کہ تم تمام اہل مذاہب سے اور

عن الربا ما هو عندهم فلا تجد احداً ایشکون القرض المشروط بالزیادة ربا نعم ربا البیع لایعده کثیر منهم ربا واذا کان کذلك فالشارع الحکیم وکذا نوابه الفقهاء لایتعرضون الا لتفصیل ما کان ظاهرا بادیا وثانیا انا لانسلم قلة تعرض الشارع ونوابه الفقهاء لربا القرض الذی هو ربا حقیقی فقد صح عنه صلی الله علیه وسلم انه قال لا ربا الا فی النسیئة وهو حدیث صحیح اخرجه البخاری ومسلم وغیرهما عن ابن عباس عن اسامة وقد ذکرنا انه محمول علی الربا الاکبر وقال صلی الله علیه وسلم کل قرض جر منفعةً فهو ربا وهو حدیث حسن لغیره صرح به العزیزی فی شرح الجامع الصغیر للسیوطی (ص ۱۰۷ ج ۳)

جاہل مسلمانوں سے ربا کے معنی دریافت کرو تو یقیناً ربا القرض کے ربا ہونے سے کوئی بھی انکار نہ کرے گا ہاں ایسے بہت ملیں گے جو ربا البیع سے ناواقف ہوں گے جب حالت یہ ہے تو شارع حکیم اور اس کے نائبین فقہا، کو اسی چیز سے تعرض کی ضرورت تھی جو لوگوں سے مخفی ہو اور جو چیز ظاہر و بدیہی ہو اس سے تعرض کی کیا ضرورت تھی۔

(دوسرا جواب) ہم کو یہ بھی مسلم نہیں کہ شارع علیہ السلام اور فقہا، نے ربا حقیقی یعنی ربا القرض سے تعرض کم کیا ہے، کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ربا قرض و دین کے سوا کسی میں نہیں، یہ حدیث صحیح ہے اس کو بخاری و مسلم وغیرہما نے حضرت اسامہ سے روایت کیا ہے، اور ہم بتلا چکے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ربا کا بڑا درجہ قرض و دین میں ہے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو قرض کسی نفع کا سبب بنایا جائے وہ ربا ہے، اور یہ حدیث حسن لغیرہ ہے (ملاحظہ ہو عزیزی شرح جامع صغیر سیوطی ص ۱۰۷ ج ۳)

عہ (تنبیہ) قال المستفتی فی آخر الاستفتا بوجوب اعتبار العرف والعادة وحال الزمان فی الاحکام فنقول ان عرف اہل الاسلام یقتضی تخصیص آیة الربا بربا القرض لا غیر فانہم لایعرفون غیر ذلک بالربا وکذا حال الزمان تقتضی تحریم ربا القرض اشد تحریم لغشو الافلاس وکثرة الاعسار فی المسلمین واضطرارہم الی الاستقراض من ارباب الاموال وقلیل ما ہم وتجویز الاسترباح علی القرض لایزول افلاس المفالیس بل یقتضی ذلک الی استباحة بیضتہم وخروج الدیار والعقار من ایدیہم کما ہو مشاہد ففیہ ترک مصالح العامة لمراعاة الخاصة ولیس ذلک من العدل فی شیء وانما العدل ترجیح مصالح للاکثرین علی الاقلین فافہم ۱۲ منہ

والحسن لغيره حجة ايضا كما لا يخفى على من مارس الحديث والفقه وسيأتي ذكر الآثار فيما بعد ان شاء الله تعالى

واما الفقهاء فقد تعرضوا لكلا القسمين من الربا ولكنهم يبحثون عن ربا البيع في ابواب البيوع وعن ربا الدين في باب القرض ولما كان ربا البيع طويل الذيل دقيق المباحث كثر بحثهم عنه واشتغلوا بتفصيل احكامه وتفريع شعوبه بخلاف ربا الدين فلم يطولوا في ذكره لضبط احكامه وقلة فروعه وظهور حقيقته على الناس كلهم كما لا يخفى واكثر الفقهاء عرفوا الربا بما يعم كلا القسمين ربا المبايعة وربا الدين فقد قال في الهداية الربوا هو الفضل المستحق لاحد المتعاقدين في المعاوضة وفي الملتقى الربا فضل مال خال عن عوض شرط لاحد العاقدين في معاوضة مال بمال وفي العالمگيرية الربا في الشريعة عبارة عن فضل مال لا يقابله عوض في معاوضة مال بمال وفي النقاية الربوا هو فضل خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لاحد المتعاقدين في المعاوضة ذكر الاقوال

اور حدیث حسن لغیرہ بھی حجت ہے جیسا حدیث وفقہ پڑھنے پڑھانے والوں پر مخفی نہیں، اور بعد میں ہم دوسرے آثار بھی ذکر کریں گے،

اور فقہاء نے تو ربا کی دونوں قسموں سے تعرض کیا ہے مگر وہ کتاب البیوع میں ربا البیع سے بحث کرتے اور باب القرض میں ربا القرض سے گفتگو کرتے ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ ربا البیع کے مباحث چونکہ دقیق اور طویل الذیل ہیں اس لئے اس کی تفصیل وتفریع میں ان کو زیادہ مشغول ہونا پڑا بخلاف ربا القرض کے کہ وہاں ان کو تطویل کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی، کیونکہ اس کے احکام منضبط تھے اور فروع زیادہ نہ تھے اور اس کی حقیقت بھی سب پر آشکارا تھی اور اکثر فقہاء نے ربا کی تعریف ایسے لفظوں سے کی ہے جو ربا کی دونوں قسموں ربا البیع اور ربا القرض کو عام ہے چنانچہ ہدایہ میں ہے کہ ربا اس زائد شے کو کہتے ہیں جو معاوضہ کے کے وقت عاقدین میں سے ایک کے لئے ثابت کی جائے، اور ملتقی میں ہے کہ ربا وہ زائد مال ہے جو بلا عوض کے معاوضہ مالیہ میں عاقدین میں سے ایک کے لئے مشروط ہو، عالمگیری میں ہے کہ شریعت میں ربا وہ زائد مال ہے جس کے مقابلہ میں کوئی عوض نہ ہو معاوضہ مالیہ میں اور نقایہ میں ہے کہ ربا وہ زائد مال ہے جو

کلہا المستفتی نفسہ (ص ۱۰، ۲۵)
وفی تنویر الابصار ھو فضل خال
عن عوض بمعیار شرعی مشروط لاحد
المتعاقدین فی المعاوضۃ والمستفتی
حمل تلک التعریفات کلہا علی البیع
وحمل المتعاقدین علی البائع و
المشتری وزعم ان القرض لیس من
المعاوضۃ وھذا باطل قطعا فقد قال
فی ردالمحتار تحت تفسیر ص۱۶۵ ج۴ الس ر
للمتعاقدین بقولہ ای بائع ومشتر
ما نصہ ای مثلا فمثلہما المقرضان و
الراھنان قہستانی اھ (ص ۱۶۲ ج ۴)
وکذا فسر العلامۃ الشیخزادہ
لفظ المتعاقدین فی شرح الملتقی بالبائعین
او المقترضین کما ذکرہ المستفتی نفسہ (ص ۲۵)

قاعدہ شرعیہ کے مطابق عوض سے خالی ہو جو
معاوضہ مالیہ میں متعاقدین میں سے ایک کے
لئے مشروط ہو، ان سب اقوال کو خود مستفتی
نے ص ۱۰ و ص ۲۵ میں ذکر کیا ہے، اور تنویر میں ہے
کہ ربا وہ زائد مال ہے جو قاعدۂ شرعی کے
موافق عوض سے خالی ہو اور عقد معاوضہ میں
عاقدین میں سے ایک کے لئے مشروط ہو (یہ تمام
تعریفات ربا البیع اور ربا القرض دونوں کو
شامل ہیں) مگر مستفتی نے ان سب کو ربا البیع
کی ساتھ خاص کر کے عاقدین سے بائع و مشتری
مراد لئے ہیں اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرض عقد
معاوضہ نہیں ہے (اس لئے عقد معاوضہ کی
قید قرض کو اس تعریف سے نکال رہی ہے ۱۲)
اور یہ دعویٰ بالکل باطل ہے کیونکہ درمختار میں
جو عاقدین کی تفسیر بائع و مشتری سے مذکور تھی
علامہ شامی نے قہستانی کے حوالہ سے اس کی شرح میں فرمایا ہے کہ یہ تفسیر مثال کے طور پر ہے،
ورنہ بائع و مشتری کی مثل قرض دہندہ و قرضخواہ اور راہن و مرتہن بھی اس میں داخل ہیں،
اسی طرح علامہ شیخزادہ نے بھی شرح ملتقی میں عاقدین کی تفسیر بائع و مشتری و قرض دہندہ
و قرضخواہ سے کی ہے جیسا خود مستفتی کو اس کا اقرار ہے،

قلت نکل من ذکر لفظ البیع او البائع
والمشتری من الفقہاء فی حد الربا فہو
تمثیل ولیس مرادہ قصر الربا وحصرہ
فی البیع کما زعمہ المستفتی ووجہ ذکرہم
البیع او البایعین فی حد الربا تمثیلا لکثرۃ
بحث الفقہاء عن ربا الفضل لکثرۃ

اب میں کہتا ہوں کہ جن علماء نے ربا کی تعریف
میں لفظ بیع یا بائع و مشتری ذکر کیا ہے
وہ محض مثال کے طور پر ہے، اس کا مطلب
ہرگز نہیں کہ ربا بیع میں منحصر ہے جیسا مستفتی
نے سمجھ لیا، اور مثال کے طور پر انہوں
نے ربا کی تعریف میں لفظ بیع اور بائع

شعوبه ودقة احكامه يدل عليه
قول ابن عابدين موردا على حد
الربا الذى ذكره فى تنوير الابصار
بما نصه وهذا لا يدخل فيه ربا
النسيئة ولا البيع الفاسد الا اذا
كان فساده لعلة الربا ثم اجاب عن
هذا الايراد بقوله فالظاهر من
كلام المصنف تعريف ربا الفضل
لانه المتبادر عند الاطلاق اه (ج۴ ص۲۶۲)
اى فى كلام الفقهاء لكثرة بحثهم عنه
لما ذكرنا وبهذا ظهر لك صدق ما قلنا
انفا ان الحدود التى ذكرها الفقهاء
فى معنى الربا منها ما هو حد لاحد قسميه
اى ربا البيع ومنها ما هو حد حقيقى
لم يعمّ كلا القسمين لم وقد اغتر
المستفتى برؤيته لفظ البيع فى بعض
الحدود فزعم ان الربا مختص بالبيع
منحصر فيه لا غير واما قوله ان القرض
ليس من المعاوضات فباطل كيف و
قد صرح الفقهاء بكونه معاوضة
انتهاء فكيف لا يكون داخلا فى
المعاوضة المذكورة فى حد الربا الا
ان يقيم الدليل على ان المراد بالمعاوضة
فيه المعاوضة ابتداء وانتهاء فان
قدر على ذلك فليرنا نصا من واحد

و مشتری صرف اس لئے ذکر کر دیا ہے کہ
فقہا ربا الفضل سے زیادہ بحث کرتے ہیں،
کیونکہ اس کے فروع کثیرہ اور احکام دقیق ہیں
دلیل اس کی یہ ہے کہ علامہ شامی نے اولاً اس
تعریف ربا پر جو تنویر میں مذکور ہے یہ اعتراض
کیا ہے کہ یہ تعریف ربا النسیئہ اور بعض بیوع
فاسدہ کو شامل نہیں ہے پھر خود ہی یہ جواب
دیا کہ بظاہر اس عبارت میں مصنف نے صرف
ربا الفضل کی تعریف کی ہے کیونکہ اطلاق کے
وقت فقہاء کے کلام میں متبادر وہی ہے اھ
(کیونکہ وہ اس سے زیادہ بحث کرتے ہیں)
اس سے تم کو ہمارے اس دعوے کا سچا ہونا
واضح ہو گیا ہوگا کہ فقہاء نے ربا کی جس قدر
تعریفات کی ہیں ان میں بعض تو اس کی ایک
قسم کی یعنی ربا البیع کی تعریفات ہیں اور بعض
حقیقی تعریفات ہیں جو ربا کی دونوں قسموں کو
شامل ہیں، مگر مستفتی کو بعض تعریفات میں
بیع کا لفظ دیکھنے سے دھوکا ہو گیا وہ یہ سمجھ
گیا کہ ربا بیع ہی میں منحصر ہے، بیع کے سوا کسی
اور صورت میں ربا کا تحقق نہیں ہو سکتا، رہا
مستفتی کا یہ دعوی کہ قرض معاوضات میں
داخل نہیں سو یہ بھی غلط ہے، اور یہ دعوی کیونکر
صحیح ہو سکتا ہے جب کہ فقہاء تصریح کر رہے ہیں
کہ قرض انتہاءً معاوضہ ہے پھر تعریف ربا
میں جو لفظ معاوضہ مذکور ہے اس میں قرض

من الفقهاء المقتدى بهم في الدين
يفيد تخصيص المعاوضة بالمعنى
الذي ذكره واما نحن فقد ادعينا
ما يشعر صريحا بان ذكر البيع و
البايعين في حد الربا انما هو
للتمثيل لا للقصر فكون القرض
غير البيع لا يستلزم خروجه عن
المعاوضة ايضا لاسيما القرض المشروط
بالفضل فانه معاوضة ابتداءً و
انتهاءً فان الهبة لما تغيرت عن كونها
تبرعا محضا باشتراط العوض فيها
الى كونها معاوضة انتهاء في حكم
البيع بعد التقابض كما في الهندية
لا بد ان يتغير القرض عن كونه
معاوضة انتهاء الى كونه معاوضة
ابتداءً وانتهاء بشرط الفضل فيه
ومن ادعى غير ذلك فليأت ببرهان
من كلام الفقهاء ولا يقبل دعواه وحده
فقد بينا فساد قياسه وسياق
الاشارة الى كون القرض المشروط
بالفضل في حكم البيع في كلام الامام
مالك والشافعي واما ما نقله المستفتي
من تصريحات الفقهاء بكون القرض
تبرعا ابتداءً بخلاف البيع (ص ۲۲
ج ۲) نكلها في القرض الغير المشروط

کیوں داخل نہ ہوگا، ہاں اگر مستفتی اس
پر دلیل قائم کر سکے کہ یہاں معاوضہ سے مراد
وہ ہے جو ابتداءً وانتہاءً معاوضہ ہو، تو
فقہاء کے کلام سے وہ کوئی دلیل پیش کرے
ورنہ ہم اس کو فقہاء کی تصریحات دکھلا چکے
ہیں جن سے یہ امر واضح ہے کہ تعریف ربا میں بیع
اور بائع و مشتری کا ذکر محض تمثیل کیلئے ہے حصر
کے لئے نہیں، پس قرض کا بیع سے الگ ہونا
اس کو مستلزم نہیں کہ وہ معاوضات سے
بھی خارج ہو خصوصاً وہ قرض جس میں زیادہ
وصول کرنے کی شرط لگائی گئی ہو کیونکہ وہ تو
ابتداءً وانتہاءً ہر طرح معاوضہ ہے، دیکھو
ہبہ جو کہ تبرع محض ہے، اگر اس میں عوض کی
شرط کر لی جائے تو اب وہ تبرع محض نہ رہے گی
بلکہ انتہاءً معاوضہ بحکم بیع ہو جائے گی جیسا
عالمگیری میں مذکور ہے، پس ضروری ہے کہ
قرض جب کہ بدون شرط کے انتہاءً معاوضہ
ہے شرط زیادت کے بعد ابتداءً وانتہاءً
معاوضہ ہو جائے اور جس کو اس کے خلاف
کا دعویٰ ہو وہ کلام فقہاء سے اس پر دلیل
لائے تنہا اس کا دعویٰ مسموع نہ ہوگا، اور
عنقریب امام مالکؒ و شافعیؒ کے کلام سے
ہم اس بات کا ثبوت دیں گے کہ جب قرض
میں زیادت کی شرط لگا دی جائے تو وہ بیع
کے حکم میں ہوگا، اور مستفتی نے جو تصریحات

بالفضل والمنفعة وهو عند الجمهور
معاوضة انتهاءً ولا عبرة بقول من
جعله عارية وقال انه من باب
الارفاق لا من باب المعاوضات
مطلقا فغلطه بين لكونه خلاف
المشاهد وخلاف غرض العاقدين
ولكونه منافيا لحد القرض فان
العارية مردودة بعينها ولذلك
لا يصح عارية الاثمان والمكيل و
الموزون ضرورة استهلاك عينها ولا
كذلك القرض ولو لم يكن من
باب المعاوضات لم يستحق الدائن
المطالبة عن المديون اذا اعسر ولم
يبق عنده شيء كالعارية اذا اهلكت
بلا تعد واطلاق المنحة عليه في الحديث
للترغيب والتخصيص عليه كاطلاق
الصدقة فهل يستدل باطلاق
الصدقة عليه على عدم وجوب الرد
على المديون اصلا۔

فقہاء کی اس مضمون میں نقل کی ہیں کہ قرض
تبرع ہے بخلاف بیع کے تو یہ سب تصریحات
اس قرض کے متعلق ہیں جس میں زیادہ وصول
کرنے اور کوئی نفع حاصل کرنے کی شرط نہ ہو اور
وہ بھی جمہور کے نزدیک صرف ابتداءً تبرع
ہے اور انتہاءً معاوضہ ہے اور جن لوگوں نے
قرض کو عاریت قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے
کہ قرض معاوضات کی قسم سے مطلقاً نہیں
بلکہ احسان کی قسم سے ہے اس کی غلطی ظاہر
ہے، کیونکہ یہ مشاہدہ کے بھی خلاف اور قرض
دہندہ و قرضخواہ کی غرض کے بھی خلاف اور
تعریف قرض کے بھی خلاف ہے کیونکہ عاریت
تو بعینہ واپس کی جاتی ہے، اور اسی لئے
روپیہ پیسہ اور مکیل وموزون کی عاریت باطل
ہے، کیونکہ ان کو تو خرچ کرکے کام میں لایا جاتا
ہے بعینہ واپس نہیں کئے جاتے اور قرض کی
یہ شان نہیں اور اگر قرض معاوضات کی قسم سے
نہ ہو تو جس وقت مدیون تنگدست ہو جائے
اور اس کے پاس کچھ نہ رہے اس وقت دائن کو
مطالبہ کا حق باقی نہ رہنا چاہئے (بلکہ دین ساقط ہو جائے) جیسے عاریت بدون تعدی کے
ہلاک ہو جائے تو مالک کو مطالبہ کا حق باقی نہیں رہتا، اور حدیث میں جو قرض کو عطیہ کہا گیا ہے یہ
عنوان محض ترغیب کے لئے اختیار کیا گیا ہے، جیسا بعض روایات میں قرض پر صدقہ کا اطلاق
وارد ہے، تو کیا صدقہ کے اطلاق سے اس امر پر استدلال صحیح ہو سکتا ہے کہ مدیون پر قرض کا ادا
کرنا اصلاً واجب نہیں (کیونکہ وہ تو صدقہ تھا، یہ گفتگو تو اس قرض میں تھی جس میں زیادت اور
منفعت کی شرط نہ ہو ۱۲)

واما القرض المشروط بالفضل والمنفعة فلم يقل احد انه من باب الارفاق بل اتفقوا على كونه مثل البيع ثم اختلفوا فقال الشافعي ومالك ببطلان عقد القرض اما قول الشافعي فذكره العزيزي في شرح حديث كل قرض جر منفعة فهو ربا اي فهو حرام و عقد القرض باطل (ص ۲، ج ۳) وقول مالك ذكره في المدونة و سيأتي، وقال الحنفية يبطل الشرط لكونه منافيا للعقد ويبقى القرض صحيحا وقولهم ببطلان الشرط لكونه منافيا للعقد فيه تصريح بان القرض اذا كان مشروطا بالمنفعة يلزم منه انقلابه بيعا ولذا ابطلوا الشرط حفظا للعقد عن الانقلاب والا لم يكن لابطاله معنى ومرادهم بكون القرض صحيحا والشرط باطلا ان المستقرض اذا قبض الدراهم التي استقرضها بالشرط يصير دينا عليه ولا تكون امانة غير مضمونة واما ان الاقراض والاستقراض بالشرط جائز فكلا فقد صرح في الدر عن الخلاصة القرض بالشرط حرام والشرط لغو وفيه ايضا واعلم ان المقبوض

رہا وہ قرض جس میں زیادت اور منفعت حاصل کرنے کی شرط ہو تو اس کو باب احسان میں کسی نے داخل نہیں کیا بلکہ اتفاقاً سب نے اس کو مثل بیع کے قرار دیا ہے، اس کے بعد پھر اختلاف ہوا ہے کہ اس شرط سے عقد قرض باطل ہوگا یا نہیں، امام مالک و شافعی کے نزدیک تو عقد قرض ہی باطل ہو جائے گا اور حنفیہ کے نزدیک شرط باطل ہو جائے گی کیونکہ وہ عقد کے منافی ہے، اور عقد قرض صحیح رہے گا، مگر حنفیہ کا اس شرط کو منافی عقد سمجھ کر باطل کرنا صراحۃً اس امر کو تسلیم کرنا ہے کہ قرض میں منفعت و زیادت کی شرط لگانے سے اس کی حقیقت بدل جاتی ہے، اور بیع کی طرف منقلب ہو جاتی ہے ورنہ ابطال شرط کی ان کو کیا ضرورت تھی، اور اس صورت میں قرض کو صحیح اور شرط کو باطل کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ قرض خواہ جب اس رقم پر قبضہ کرلے جس کو شرط کے ساتھ قرض لے رہا ہے تو قبضہ کے بعد یہ رقم اس کے ذمہ واجب ہو جائے گی، محض امانت نہ ہوگی کہ اس کا ضمان لازم نہ ہو اور یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شرط نفع کے ساتھ قرض کا لین دین جائز ہے، کیونکہ درمختار میں بحوالہ خلاصہ اس کی تصریح موجود ہے کہ شرط کے ساتھ قرض کا معاملہ حرام ہے اور شرط باطل ہے، اور اسی میں

بقرض فاسد کمقبوض ببیع فاسد
سواء اھ (ص ۲۶۶ و ص ۲۷۰ ج ۴) فثبت
بذلک ان القرض المشروط بالنفع کالبیع
عندھم ولذا ابطل الشافعی ومالک
عقد القرض والحنفیۃ ابطلوا الشرط
صونا لہ عن معنی البیع فافھم فقول
المستفتی ان القرض من التبرعات دون
المعاوضات عند الفقھاء غلط بین ان
اراد بہ انہ من التبرعات المحضۃ و
لیس من المعاوضۃ فی شیٔ فانھم لما
عرفوا الربوا بفضل خال عن عوض لاحد
من المتعاقدین فی المعاوضۃ وفسروا
المتعاقدین فی المعاوضۃ وفسروا
المتعاقدین بالبائعین والمقترضین
وصرحوا بان ذکر بعضھم البائع و
المشتری فی تفسیر المتعاقدین انما
ھو مجرد تمثیل ظھر بذلک کون
القرض والاقتراض من المعاوضۃ و
الا کان قید المعاوضۃ منافیا لتعمیم
المتعاقدین للمقترضین ولا یلزم
من کونہ معاوضۃ کونہ بیعا فان الرھن
ایضا من المعاوضۃ ولیس من البیع
فافھم فقد ظھر بذلک بطلان ما
ارادہ المستفتی باثبات المغائرۃ
بین القرض والبیع (فی ط ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰)

یہ بھی مذکور ہے کہ جس شئے پر قرض فاسد
میں قبضہ کیا جائے اس کا وہی حکم ہے جو بیع
فاسد میں قبضہ کے بعد حکم ہے آھ، اس سے
معلوم ہوا کہ ائمہ کے نزدیک قرض مشروط
مثل بیع کے ہے، اسی لئے شافعیہ و مالکیہ نے
تو اس صورت میں قرض ہی کو باطل کہا ہے، اور
حنفیہ نے شرط کو باطل کہا تاکہ قرض کی حقیقت
انقلاب سے محفوظ رہے (اور اگر شرط کی پابندی
کے ساتھ قرض کی رقم پر قبضہ کیا گیا تو اس کا
حکم وہی ہوگا جو بیع فاسد میں قبضہ کا حکم ہے)
خوب سمجھ لو، پس مستفتی کا یہ قول کہ فقہاء کے نزدیک
قرض تبرعات میں سے ہے معاوضات
میں سے نہیں، اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ
کہ قرض خالص تبرع ہے، کسی درجہ میں بھی
معاوضہ نہیں تو یہ صراحۃً غلط ہے، کیونکہ
فقہاء نے ربا کی تعریف اس طرح کی ہے کہ
ربا وہ زائد مال ہے جو عوض سے خالی ہو
اور معاوضہ مالیہ میں متعاقدین میں سے ایک
کے لئے ثابت ہو، اور متعاقدین کی تفسیر بائع
و مشتری و قرض خواہ و قرض دہندہ سے
کی ہے اور اس کی تصریح کر دی ہے کہ جس نے
متعاقدین کی تفسیر بائع و مشتری سے کی ہے
اس نے حصر کا قصد نہیں کیا، بلکہ محض تمثیل
کے طور پر بائع و مشتری کا ذکر کیا ہے، اس
سے صاف ظاہر ہے کہ قرض بھی معاوضہ کی

وحاصله ان الربا مختص بالبیع والقرض لیس منہ وھذا کلہ بناء الفاسد علی الفاسد، فقد بینا ان الربوا لا یختص فی البیع بل یجری فی المعاوضات باسرھا والقرض من المعاوضات لاسیما القرض المشروط بالنفع فانہ مثل البیع و اکبر ما استدل بہ المستفتی علی عدم جریان الربا فی القرض وقصرہ علی البیع ان تحقق الربا لا یتوقف علی الشرط بل الزیادۃ بلا شرط ربا ایضا کما صرح بہ ابن عابدین فی شرح الدر، (ص ۴۲۷، جلد ۴)

قسم سے ہے ورنہ ربا کی تعریف میں لفظ معاوضہ بیان کرنے کے بعد متعاقدین کے تحت میں قرض دہندہ و قرض خواہ کا داخل کرنا صحیح نہ ہوتا، اور قرض کا معاوضہ میں داخل ہونا اس بات کو مستلزم نہیں کہ وہ بیع میں بھی داخل ہو جائے، دیکھو رہن عقد معاوضہ ہے، مگر بیع نہیں ہے، خوب سمجھ لو پس مستفتی نے جو بیع و قرض میں منافات ثابت کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ربا بیع کے ساتھ خاص ہے، اور قرض بیع نہیں، اس لئے قرض میں ربا کا تحقق نہیں ہوتا؛ اس کا باطل ولغو اور بناء الفاسد علی الفاسد ہونا واضح ہو گیا، کیونکہ ہم تبلا چکے کہ ربا بیع میں منحصر نہیں، بلکہ تمام معاوضات میں اس کا تحقق ہوتا ہے اور قرض بھی معاوضہ میں داخل ہے، خصوصاً وہ قرض جس میں زیادت اور نفع کی شرط ہو کہ وہ تو مثل بیع کے ہے۔

اب ہم مستفتی کی ایک بڑی دلیل کا جواب دینا چاہتے ہیں جس پر اس کو بہت کچھ ناز ہے اس نے ربا کو بیع میں منحصر کرنے اور قرض سے الگ کرنے پر استدلال کرتے ہوئے یہ مقدمہ بیان کیا ہے کہ ”ربا کا تحقق شرط پر موقوف نہیں، بلکہ بدون شرط کے بھی ربا حرام ہے، علامہ ابن عابدین شامی نے اس کی تصریح کی ہے،

قال ودلیلہ ما فی المدونۃ ان ابا بکر الصدیق رضی اللہ عنہ راطل ابا رافع الحدیث (ص) قال المستفتی فیہ دلالۃ علی ان الزیادۃ فی القرض لیست ربا لانہ لو کانت ربا لحرمت بدون شرط ایضا ولم یقل بہ الفقہاء علی

اور مدونہ کی ایک روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ابو رافع رضؓ سے چاندی کے خلخال چاندی کے عوض خریدے تو خلخال چاندی سے کچھ جھکتے رہے، حضرت صدیق رضؓ نے خلخال کو کاٹ کر چاندی کے برابر کرنا چاہا،

انہ ثبت بالاحادیث الصحیحۃ ان
النبی صلی اللہ علیہ وسلم زاد وقت
الاداء فی القرض اھ (ص)

اقول اما استدلالہ باثر
الصدیق علی ان الربا لا یتوقف
تحققہ مطلقاً علی الشرط فغیر تام
لوجوہ الاول ضعف الاثر وشدتہ
وھنہ فان فی سندہ محمد بن
السائب الکلبی متروک بالمرۃ متھم
بالکذب ورمی بالرفض کما فی
التقریب (ص ۱۰۲) وتھذیب التھذیب
(ص ۱۷۸، ج ۹) وھو یروی عن اخیہ
سلمۃ بن السائب وھو مجھول لا
یعرف لہ راو غیر اخیہ محمد بن السائب
الکلبی ولو یثبت سماع سلمۃ بن السائب
عن ابی رافع والعجب من الذی یضعف
حجۃ الجمھور بحدیث کل قرض جر
منفعۃ فھو ربا کیف یؤسس بنیان
دعواہ علی مثل ھذا الاثر الواھی
فلم یبق لہ دلیل فی عدم توقف
تحقق الربا علی الشرط سوی قول ابن
عابدین فی ذلک حجۃ لہ فلیکن قولہ
فی تفسیر المتعاقدین مثل المقرضین
والراھنین حجۃ علیہا ایضاً وھو
یقین بجریان الربا فی القرض وکونہ

تو ابو رافع رضؓ نے کہا آپ ایسا نہ کریں میں
زیادت کو آپ کے لئے حلال کرتا ہوں، حضرت
صدیق رضؓ نے جواب دیا کہ تم نے حلال کر دیا
تو اللہ و رسول نے تو اس کو حلال نہیں کیا
غرض آپ نے خلخال کو کاٹ کر چاندی کے
برابر کر دیا الخ مستفتی کہتا ہے کہ اس سے
معلوم ہوا کہ قرض سے زائد وصول کرنا ربا
نہیں، کیونکہ اگر ربا ہوتا تو بدون شرط کے
بھی حرام ہوتا، حالانکہ فقہاء بدون شرط
کے قرض میں زیادت کو جائز کہتے ہیں،
علاوہ ازیں یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ
وسلم سے صحیح احادیث میں یہ ثابت ہے کہ آپنے
ادائے قرض کے وقت (اصل قرض سے)
زائد ادا فرمایا اھ۔

جواب، حضرت صدیق کے اثر سے اس
دعوی پر استدلال کرنا کہ "ربا کا تحقق مطلقاً
شرط پر موقوف نہیں" چند وجوہ سے ناتمام
ہے، اول اس لئے کہ یہ اثر ضعیف اور بہت
کم زور ہے، کیونکہ اس کی سند میں محمد بن
السائب کلبی (راوی) ہے جو بالکل متروک
اور کذب و رفض سے متہم ہے، پھر وہ اپنے
بھائی سلمہ یا ابو سلمہ سے روایت کر رہا ہے
اور وہ مجہول ہے جس سے بجز محمد بن سائب
کے کسی نے روایت نہیں کی پھر سلمہ بن السائب
(یا ابو سلمہ) کا سماع ابو رافع سے ثابت نہیں۔

من المعاوضة خلاف مازعمہ المستفتی
وثانیا ان سلمنا صحة الاثر
فغایة ما فیہ ان تحقق الربا فی
المراطلة (ای بیع الذہب بالذہب
والورق بالورق) لا یتوقف علی
الشرط فان الاثر انما ورد فی ربا
البیع وربا الفضل ولا یلزم منہ
عدم توقف تحققہ علی الشرط فی
ربا الدین ایضاً وثالثا انا لا نسلم
ان تحقق الربا فی القرض موقوف
علی الشرط عند الفقہاء مطلقا بل
فیہ تفصیل عندہم حاصلہ ان
المنفعة الحاصلة من المقترض
لا تخلو اما ان تکون قبل اداء الدین
او بعدہ ۔

مستفتی کو شرم کرنا چاہئے کہ وہ حدیث
کل قرض جر نفعاً فہو ربا کو تو ضعیف کہتا ہے
جس سے اس کے نزدیک بھی جمہور علماء نے
احتجاج کیا ہے، اور خود ایسی کمزور سند پر
اپنے دعویٰ کی بنیاد قائم کر رہا ہے (جو
کسی درجہ میں حجت بننے کے قابل نہیں)
پس اب سوائے علامہ شامی کے قول کے
اس کے دعوے کی دلیل کچھ نہ رہی لیکن
اگر علامہ شامی کا یہ قول حجت ہے تو ان کا یہ
قول بھی حجت ہونا چاہئے کہ ربا کی تعریف
میں لفظ متعاقدین قرض دہندہ و قرض
خواہ کو بھی عام ہے جس سے مستفتی کے خلاف
یہ ثابت ہوتا ہے کہ ربا قرض میں بھی متحقق ہوتی
ہے اور قرض معاوضات کی قسم سے ہے، دوسرے
اگر ہم اثر صدیق کو صحیح مان لیں تو اس سے
صرف اتنا ثابت ہوگا کہ جب چاندی کو چاندی کے یا سونے کو سونے کے بدلے بیع کیا جائے
تو اس وقت ربا کا تحقق شرط پر موقوف نہیں کیونکہ یہ اثر ربا البیع ہی کے متعلق ہے، اس
سے یہ کیونکر لازم آگیا کہ ربا کا تحقق مطلقاً شرط پر موقوف نہیں، کیونکہ ربا کی ایک
قسم کے شرط پر موقوف نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا، کہ دوسری قسم (یعنی ربا القرض)
بھی شرط پر موقوف نہ ہو تیسرے ہم یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ قرض میں ربا کا تحقق فقہاء کے نزدیک
ہر حالت میں شرط پر موقوف ہے بلکہ ان کے نزدیک اس میں تفصیل ہے، جس کا خلاصہ یہ
ہے کہ مدیون سے جو منفعت حاصل ہوتی ہے اس کی دو قسمیں ہیں، ایک یہ کہ ادائے
قرض سے پہلے یا بعد میں حاصل ہو۔

کان یہدی الغریم الی الدائن او
یطعمہ الطعام ونحوہ او تکون

مثلاً مدیون ادائے قرض سے پہلے یا بعد
قرض دہندہ کو ہدیہ دے یا اس کی دعوت

وقت الاداء وهذا الاخير على وجهين اما ان تكون المنفعة الحاصلةعه من جنس الجودة او من جنس الزيادة فى الوزن والكيل فهذه صور ثلث والاولان عـه تتوقف حرمتهما على الشرط عند البعض والثالث حرام مطلقا سواء كان مشروطا اولا الا ان تكون زيادة قليلة لا تظهر فى موازين الوزانين كزيادة دانق فى مائة درهم ونحوها او تكون الزيادة بطريق الهبة والعطيةعه النائلة ويعتبر فيه شروط الهبة من صحتها فى المشاع فيما لا يقسم وعدم صحتها فى مشاع يقسم وصرح مالك باشتراط ان تكون هبة الزيادة فى غير مجلس قضاء الدين ولا تجوز لم تبدل المجلس قال الشامى فى رد المحتار تحت قول الدر فلو استقرض الدراهم المكسورة على ان يؤدى صحيحا كان باطلا وكذا لو اقرضه طعاما بشرط رده فى مكان اخر و

کردے، دوسرے یہ کہ ادائے قرض کے وقت منفعت حاصل ہو، اور اس کی پھر دو قسمیں ہیں، ایک یہ کہ وہ منفعت اوصاف کی قسم سے ہو۔ مثلاً قرض دینے والے کے روپے کھوٹے تھے، مدیون نے کھرے ادا کئے، دوسرے یہ کہ وہ منفعت وزن اور مقدار کی زیادتی کی صورت میں ہو، یہ کل تین قسمیں ہوئیں، جن میں سے پہلی دو قسموں کا حرام ہونا تو بعض فقہاء کے نزدیک شرط پر موقوف ہے، اور تیسری صورت مطلقاً حرام ہے، خواہ شرط ہو، یا نہ ہو، البتہ اگر زیادت قلیل مقدار میں ہو جو کسی وزن میں ظاہر ہوتی ہو اور کسی میں ظاہر نہ ہوتی ہو جیسے سو درہم پر ایک دانگ زیادہ ہو جائے یا یہ زیادت بطریق ہبہ وعطا کے ہو تو جائز ہے مگر اس صورت میں شرط ہبہ کی رعایت لازم ہوگی، مثلاً مشاع غیر قابل قسمت ہو تو یہ زیادتی جائز ہوگی اور مشاع قابل تقسیم میں جائز نہ ہوگی اور امام مالکؒ کے نزدیک یہ شرط بھی ہے کہ اس زیادت کو مجلس ادا میں ہبہ نہ کیا جائے بلکہ دوسری مجلس میں ہبہ

عـه اى المنفعة الحاصلة قبل الاداء او بعده والحاصلة وقت الاداء من جنس الجودة ۱۲ منه عـه وهذا هو معنى قول الشافعى فى الام ان اسلفه شيئاً ثم اقتضى منه اقل فلا باس لانه متطوع له بهبة الفضل وكذلك ان تطوع له القاضى اكثر من فذلك بهبة فلا باس لى ان قال فلا باس اذا كان هذا استطوعا وان كان هذا عن شرط فلا خير فيه لان هذا حينئذ ذهب بمذهب اكثر منفعة ص ۲۸ و ۳۰ ج ۳ وفيه دلالة على ان القرض ينقلب بيعا بالاشتراط فافهم ۱۲ منه

کان علیہ مثل ما قبض فان قضاہ
اجود بلا شرط جاز ویجبر الدائن
علی قبول الاجود وقیل لا بحر اھ مانصہ
وذکر الشارح اعطاء الاجود ولم یذکر
الزیادۃ وفی الخانیۃ وان اعطاہ
المدیون اکثر مما علیہ وزنا فان کانت
الزیادۃ تجری بین الوزنین ای بان
کانت تظہر فی میزان دون میزان
جاز واجمعوا علی ان الدانق فی المائۃ
یسیر یجری بین الوزنین وقدر الدرہم
والدرہمین کثیر لا یجوز واختلفوا
فی نصف الدرہم قال الدبوسی
انہ فی المائۃ کثیر یرد علی صاحبہ
فان کانت کثیرۃ لا تجری بین الوزنین
ان لم یعلم المدیون بہا ترد علی
صاحبہا وان علم واعطاہا اختیارا
ان کانت الدراہم المدفوعۃ مکسرۃ
او صحاحا لا یضرہا التبعیض
لا یجوز اذا علم الدافع
والقابض وتکون ہبۃ المشاع
فیما یحتمل القسمۃ و
ان کان یضرہ التبعیض
وعلما جاز وتکون ہبۃ
المشاع فیما لا یحتمل القسمۃ
اھ (ص ۲۷۰، ج ۴)

کیا جائے ورنہ یہ زیادت جائز نہ ہوگی،
درمختار میں ہے کہ اگر کسی نے ٹوٹے ہوئے
دراہم اس شرط کے ساتھ قرض لئے کہ ادا
کے وقت سالم درہم دے گا تو یہ صورت
باطل ہے، اسی طرح اگر کسی کو غلہ اس
شرط پر قرض دیا گیا کہ دوسرے مقام پر
ادا کرنا لازم ہوگا یہ بھی جائز نہیں، کیونکہ
یہ شخص قرض کے ذریعہ باربرداری کے
مصارف سے بچنا چاہتا ہے ۱۲) اور مدیون
کے ذمہ ویسی ہی چیز ادا کرنا واجب ہے
جیسی اس نے لی ہے، ہاں اگر بدون شرط
کے اس سے عمدہ ادا کردے تو جائز ہے
اور قرض دہندہ کو (اس صورت میں) عمدہ
ہی کے لینے پر مجبور کیا جائے گا اور ایک
روایت یہ ہے کہ مجبور نہ کیا جائے گا (بحر) علامہ
شامی اس کے تحت فرماتے ہیں کہ شارح نے
عمدگی ادا کا تو ذکر کیا مگر زیادہ ادا کرنے کا
ذکر نہیں کیا سو اس کا حکم خانیہ میں اس
طرح ہے کہ اگر مدیون ادا کے وقت وزن
میں زیادتی کردے تو اگر یہ زیادتی مقدار قلیل
میں ہو جو کسی ترازو میں ظاہر نہ ہو تو جائز
ہے اور اس پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ سو
درہم میں ایک دانگ کی زیادتی بہت
کم ہے، جو ہر وزن میں ظاہر نہیں ہوسکتی
ہے اور ایک درہم دو درہم کی زیادتی کثیر

وہ جائز نہیں، اور نصف درہم میں اختلاف ہے، ابوزید دبوسی کا قول یہ ہے کہ سو درہم میں نصف درہم کی زیادتی بہت ہے، اس کو مالک کے حوالہ کر دینا چاہئے اور زیادت کثیرہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر مدیون کو اس کی خبر نہ ہو کہ میں زیادہ دے رہا ہوں جب تو اس کا واپس کرنا واجب ہے، اور اگر وہ جان بوجھ کر اپنے اختیار سے زیادہ دے رہا ہے تو اگر یہ دراہم ٹوٹے ہوئے ہوں یا سالم ہوں مگر ان کے توڑنے میں نقصان نہ ہو تو یہ زیادت جائز نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں مشاع قابل تقسیم کا ہبہ لازم آئیگا (اور وہ درست نہیں) ہاں اگر ان دراہم کا توڑنا مضر ہو اور قرض دہندہ و قرض خواہ دونوں کو زیادت کا علم ہو تو جائز ہے، کیونکہ اس صورت میں مشاع غیر قابل تقسیم کا ہبہ ہوگا (جو درست ہے) آہ،

ومثلہ فی الخلاصہ (ص ۱۰۲ ج ۳) وفی العالمگیریۃ فی قبول ھدیۃ الغریم واجابۃ دعوتہ بعد ذکر الاختلاف بین الکرخی وشمس الائمۃ الحلوائی فقال الاول لا بأس بہ اذا لم یکن مشروطا فی القرض وقال الثانی انہ حرام مانصہ قال شمس الائمۃ ماذکر محمد رح فی کتاب الصرف انہ لا بأس بہ محمول علی ما اذا کان یدعوہ قبل الاقراض اما اذا کان لا یدعوہ او یدعوہ[عہ] قبلہ فی کل عشرین یوما وبعد الاقراض جعل یدعوہ فی کل عشرۃ ایام او زاد فی الباجات[علم] فانہ لا یحل ویکون خبیثا واذا رجع فی بدل القرض ولم یکن الرجحان مشروطا فی القرض[عہ]

خلاصہ میں بھی اسی کے مثل ہے، اور عالمگیری میں اول مدیون کا ہدیہ اور دعوت قبول کرنے کا حکم بیان کرتے ہوئے کرخی اور شمس الائمہ حلوائی کا اختلاف ذکر کیا ہے، کہ کرخی کے نزدیک مدیون کا ہدیہ اور دعوت قبول کرنا جائز ہے جب کہ شرط نہ کی گئی ہو، اور شمس الائمہ نے بدون شرط کے بھی اس کو حرام کہا ہے، وہ کہتے ہیں کہ امام محمدؒ نے جو اس کو جائز فرمایا ہے ان کا قول اس صورت پر محمول ہے جب کہ مدیون معاملہ قرض سے پہلے بھی دعوت کیا کرتا ہو اور اگر اس سے پہلے دعوت نہ کرتا ہو یا کرتا ہو مگر پہلے بیس دن میں ایک دفعہ کرتا تھا اور قرض کے بعد ہر دس دن میں دعوت کرنے لگا، یا

عہ المراد الرجحان القلیل وما یکون ہبۃ بدلیل ما یاتی ۱۲ منہ

فلا بأس به كذا في المحيط وان
اعطاه المديون اكثر مما عليه وزنا فان
كانت الزيادة تجري بين الوزنين
جازوا جمعوا على ان الدانق في المائة
يسير يجري بين الوزنين وقدر الدرهم
والدرهمين كثير لا يجوز واختلفوا
في نصف الدرهم قال الدبوسي نصف
الدرهم في المائة كثير يرد على صاحبه
فان كانت الزيادة كثيرة لا تجري بين
الوزنين ان لم يعلم المديون بالزيادة
يرد على صاحبها وان علم المديون بالزيادة
فاعطاه الزيادة اختيارا هل يحل الزيادة
للقابض ان كانت الدراهم المدفوعة
مكسرة او صحاحا لا يضره التبعيض
لا يجوز اذا علم الدافع والقابض واما
اذا كانت الدراهم صحاحا يضرها
الكسر فان كان الرجحان
زيادة يمكن تمييزها بدون
الكسر بان كان يوجد فيها
درهم خفيف يكون مقدار
الزيادة لا يجوز وان كان الرجحان
زيادة لا يمكن تمييزها بدون الكسر
يجوز بطريق الهبة كذا في المحيط اھ
(ص ۱۱۱، ج ۳) وبهذا التفصيل تندفع
ما عسى ان يتوهم۔

الوان طعام زیادہ کرنے لگا تو یہ دعوت زیادہ حلال نہیں بلکہ
خبیث ہے، اسکے بعد زیادت کا حکم اس طرح بیان کیا ہے کہ اگر
ادائے قرض کے وقت مدیون نے کچھ مقدار
بڑھا کر رقم دی اور یہ زیادت قرض میں
مشروط نہ تھی، تو اس کا مضائقہ نہیں، سابق محیط،
(مراد زیادت بقدر قلیل ہے یا وہ زیادت
جو بطریق ہبہ کے ہو جیسا آئندہ معلوم ہوگا
اور اگر مدیون نے قرض کی رقم سے کچھ زیادہ
دیا جس سے وزن بڑھ گیا تو اگر یہ زیادت
ہر وزن میں ظاہر نہ ہوتی ہو تو جائز ہے اور
فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ سو درہم میں
ایک دانگ کی زیادتی معمولی ہے، جو ہر
وزن میں ظاہر نہیں ہوتی، اور ایک درہم
دو درہم بہت ہے، اتنی زیادتی جائز
نہیں، اور نصف درہم کے بارہ میں
اختلاف ہے، امام دبوسی فرماتے ہیں کہ
یہ بھی زیادہ ہے جس کا مالک کو واپس کرنا
لازم ہے، اور جو زیادت کثیر ہو کہ ہر وزن
میں ظاہر ہوتی ہو اس کے حکم میں یہ تفصیل
ہے کہ اگر مدیون کو (ادائے قرض کے وقت)
اس زیادت کا علم نہ ہو تو اس کا واپس
کرنا لازم ہے، اور اگر وہ جان بوجھ کر اپنے
اختیار سے زیادہ دے رہا ہے تو کیا اس کا
لینا قرض دہندہ کو جائز ہے، اس میں
تفصیل ہے وہ یہ کہ اگر یہ دراہم جو

قرض میں ادا کئے گئے ہیں ٹوٹے ہوئے ہوں یا سالم ہوں مگر ان کے توڑنے میں نقصان نہ ہو تو زیادت جائز نہیں، جب کہ دائن و مدیون دونوں کو زیادت کا علم ہے، اور اگر یہ دراہم سالم ہوں اور ان کے توڑنے میں نقصان ہو تو اگر یہ زیادت بغیر دراہم کے توڑنے کے ممتاز اور جدا ہو سکے مثلاً ان دراہم کے اندر کوئی درہم ہلکا موجود ہو جو اس زیادت کے برابر ہے۔ تب بھی یہ زیادت جائز نہیں، اور اگر بدون دراہم کے توڑنے کے اس زیادت کو ممتاز نہ کر سکیں اس صورت میں یہ زیادت بطریق ہبہ کے جائز ہے، محیط میں اسی طرح ہے، آہ، میں کہتا ہوں کہ اس تفصیل سے یہ وہم دفع ہو گیا کہ:-

ان مدار جواز الرجحان فی الوزن فی بدل القرض علی اشتراط الرجحان وعدمہ اشتراطہ کلا بل الرجحان ان کان مشروطا لا یجوز مطلقاً لا قلیلا ولا کثیرا وانما الکلام فی الغیر المشروط فیجوز بطریق الھبۃ اذا کان مشاعا فیما لا یقسم ولا یجوز فیما یقسم الا مفرزا متمیزا فلو کان مدار الجواز علی عدم الاشتراط لم یحتاجوا الی مثل ھذا والتفصیل فیما یقسم ولا یقسم وفیما یجری بین الوزنین وفیما لا یجری بینھما فافھم وصرح ابن القاسم فی المدونۃ عن مالک فی الرجل یتسلف الدراھم فیقضیہ اوزن او اکثر قال لا یعجبنی ان یقضیہ فضل عدد لا فی ذھب ولا فی طعام عند ما یقضیہ ولو کان ذلک بعد ذلک لم ار بذلک بأسا اذا لم یکن فی ذلک عادۃ[1] ولا موعد ومعنی

اس زیادت کے جائز اور نا جائز ہونے کا مدار شرط کرنے یا شرط نہ کرنے پر ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ زیادت اگر مشروط ہو وہ تو کسی حال میں جائز نہ ہوگی، خواہ قلیل ہو یا کثیر، یہ تمام تر گفتگو تو زیادت غیر مشروطہ ہی میں ہے، کہ مشاع قابل تقسیم میں بطریق ہبہ کے جائز ہے، اور اگر اس کے جواز و عدم جواز کا مدار شرط کرنے یا نہ کرنے پر ہوتا تو فقہاء کو اس تفصیل کی کیا ضرورت تھی کہ وہ زیادت ہر وزن میں ظاہر ہوتی ہے یا نہیں اور مشاع قابل تقسیم میں ہے یا غیر قابل تقسیم میں وغیرہ وغیرہ (بلکہ صرف اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ مشروطہ نہ ہو تو جائز ہے ۱۲) خوب سمجھ لو۔

---

[1] ای عرف متعارف ولا بد من ہذا القید عندنا ایضا فان المعروف کالمشروط کما صرح بہ فقہاءنا فی (بقیہ بر ص ۲۳۱)

قولہ بعد ذلک ای بعد مجلس القضاء الذی یقضیہ فیہ یزیدہ بعد ذلک واما حین یقضیہ فلا یزیدہ فی ذلک المجلس اھ (ص ۱۰۷ ج ۳) قلت و الزیادۃ بطریق الھبۃ یجوز فی بیع الصرف ایضا کما ستذکرہ وعلی ھذا فاثر ابی بکر الصدیق الذی نقلہ المستفتی عن المدونۃ محمول عندنا علی التورع والتنزہ علی تقدیر صحتہ لان ابا رافع کان قد احل لہ الزیادۃ ای وھبھا لہ ولو الخلخال مما یتضرر بالکسر و ینتقص بہ وھبۃ المشاع فیما لا یقسم جائزۃ ومع ذلک لم یرض بھا الصدیق وردھا علیہ فذلک من ورعہ رضی اللہ عنہ وتقواہ قال فی الدر فلیس الفضل فی الھبۃ بربا فلو شری عشرۃ دراھم فضۃ بعشرۃ دراھم وزادہ دانقا

اور ابن القاسم نے مدونہ میں امام مالک سے صراحۃً یہ مسئلہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص کچھ دراہم قرض کرے پھر اس سے زیادہ ادا کرے، خواہ وزن میں یا شمار میں، تو اس کا کیا حکم ہے؟ فرمایا کہ مجھ کو یہ بات پسند نہیں کہ ادائے قرض کے وقت شمار میں زیادتی کی جائے، نہ سونے (چاندی) میں نہ غلہ میں، ہاں اگر اس کے بعد کچھ زیادہ دیدے تو اس کا مضائقہ نہیں، بشرطیکہ بعد میں بھی یہ زیادتی (عرف یا وعدہ (اور شرط) کی وجہ سے نہ ہو، اور بعد میں دینے کے معنی یہ ہیں کہ جس مجلس میں قرض ادا کر رہا ہے اس میں کچھ زیادہ نہ دے بلکہ اس مجلس کے بعد دوسری مجلس میں دے، آھ، میں کہتا ہوں کہ ہبہ کے طور پر زیادہ دینا بیع صرف میں بھی جائز ہے جیسا عنقریب معلوم ہوگا، پس اب اگر حضرت صدیق کا وہ اثر جو مستفتی نے مدونہ سے نقل کیا ہے، صحیح بھی مان لیا جائے تو ہمارے نزدیک

(بقیہ حاشیہ ص ۲۳۰) غیر ما موضع واما ما ذکرہ الحموی تحت قول الاشباہ لو جرت عادۃ المقترض برد ازید مما اقترض ھل یحرم اقراضہ تنزیلا لعادتہ بمنزلۃ الشرط آھ ما نصہ قیل الذی یؤدی الیہ نظر الفقیہ انہ لا یحرم لانہ یحمل علی المکافات علی المعروف وھو مندوب الیہ شرعا حیث دفع المقرض قرضا محضا فجازاہ علیہ ولم یشترط ودفعہ المستقرض لا علی وجہ الربوا اھ (ص ۸۲) ففیہ انہ لا یحل الافتاء من القواعد والضوابط وانما علی المفتی حکایۃ النقل الصریح کما صرح بہ الحموی بعد ذلک بقلیل فالقول الذی حکاہ بقیل لا حجۃ فیہ مع کونہ خلاف القاعدۃ المشہورۃ المشروط عرفا کالمشروط شرعا وان سلم فلا راحۃ فیہ للمستفتی لاتفاق ھذا القائل علی حرمتہ اذا کان مشروطا واللہ اعلم ۱۲ منہ لہ قال الشافعی فی مسئلۃ مراطلۃ الذھب ای بیعھا بالوزن مانصہ وان رجحت احدی الذھبین فلا باس ان یترک صاحب الفضل فضلہ لصاحبہ لان ھذا غیر الصفقۃ الاولی اھ (ص ۲۹ ج ۳) ای لکونہ ھبۃ والھبۃ صفقۃ اخری غیر البیع واللہ اعلم ۱۲ منہ عہ اس سے جواز مع الکراہۃ پر استدلال نہیں ہو سکتا، کیونکہ فقہاء سلف ایسے الفاظ ناجائز اور حرام کے لئے بھی اطلاق کرتے ہیں چنانچہ اہل علم پر مخفی نہیں ۱۲ منہ

ان وھبہ منہ انعدم الربا ولم یفسد الشراء وھذا ان ضرھا الکسر لانہ ھبۃ مشاع لا یقسم کما فی المنح عن الذخیرۃ عن محمد وفی الخلاصۃ لو باع درھما بدرھم واحدھما اکثر وزنا فحللہ زیادتہ جاز لانہ ھبۃ مشاع لا یقسم اھ قال ابن عابدین تحت قولہ وزادہ دانقا ای ولم یکن مشروطا فی الشراء کما ھو فی عبارۃ الذخیرۃ المنقول عنھا الی ان قال فلو مشروطۃ دتم العقد علی الکل ووجب نقض العقد۔

وہ تقویٰ اور ورع واحتیاط پر مبنی ہے کیونکہ ابورافع نے زیادت کو حضرت صدیق کے لئے حلال اور (ہبہ) کر دیا تھا اور خلخال کا توڑنا موجب ضرر اور سبب نقصان قیمت ہے، اور مشاع غیر قابل تقسیم کی ہبہ جائز ہے باوجود اس کے بھی حضرت صدیق کا اس زیادت کو قبول نہ کرنا محض احتیاط کی وجہ سے تھا، درمختار میں ہے جو زیادت ہبہ کی صورت میں ہو وہ ربا نہیں ہے، پس اگر کسی نے دس درہم بھر چاندی دس درہم کے بدلے بیچی، اور بقدر ایک دانگ کے زیادہ دیدی تو اگر یہ ایک دانگ بطور ہبہ کے دیا تو ربا نہ ہوگا، اور نہ عقد فاسد ہوگا، بشرطیکہ ان دراہم کا توڑنا نقصان کا موجب ہو، کیونکہ اس صورت میں مشاع غیر قابل تقسیم کی ہبہ ہوگی (اور وہ درست ہے ۱۲) منح میں ذخیرہ سے امام محمدؒ سے اسی طرح نقل کیا ہے، خلاصہ میں ہے کہ اگر کسی نے ایک درہم ایک درہم کے عوض بیع کیا اور ان میں سے ایک زیادہ وزنی ہے۔ اور اس کے مالک نے زیادت کو دوسرے کے لئے حلال کر دیا تو جائز ہے، کیونکہ یہ مشاع غیر قابل تقسیم کی ہبہ ہے اھ علامہ شامی اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ زیادت اس وقت جائز ہے کہ پہلے سے مشروط نہ ہو، اور اگر مشروط ہو تو عقد مجموعہ پر واقع ہوگا اور اس صورت میں حق شرع کی وجہ سے عقد کا توڑنا واجب ہوگا۔

حقا للشرع ثم قال دان الزیادۃ انما تصح اذا صرح بکونھا ھبۃ فتکون ھبۃ بشروطھا ومع عدم التصریح فھی باطلۃ وھو الذی فی المجمع اھ (ص ۲۸۵ ج ۴ و ۲۸۶ ج ۴) قلت وبعد ذلک ظھر لک البطلان

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ زیادت اسی وقت صحیح ہے جب کہ اس کے ہبہ کی تصریح کر دی جائے پھر اس میں شرائط ہبہ کی رعایت کی جائیگی اور اگر ہبہ کی تصریح نہ کی گئی تو یہ زیادت باطل ہے اھ، میں کہتا ہوں کہ ان تصریحات سے

قول المستفتی ان الفضل فی البیع ای
بیع الصرف ونحوها ربا مطلقا لادخل
فیه لتراضی العاقدین الخ (ص۲) وکذا
تفرقته بین ربا البیع وربا الدین بان
الاول لایتوقف تحققه علی الشرط و
الثانی یتوقف تحققه علیه بل الحق
ان الزیادة التی لا تجوز فی البیع الربوی
مطلقا لاتجوز فی الدین کذلک والتی
تجوز فی الدین بلاشرط کقبول الهدیة
واجابة الدعوة قبل ادائه او بعده
لامع الاداء تجوز فی بیع الصرف کذلک
ایضا وکذا المنفعة الحاصلة من جهة
الجودة والوصف تجوز بلاشرط فی
الصورتین وکل ما استدل به المستفتی
من الآثار علی جواز الزیادة علی القرض
(فی ص۱۹) لاحجة له فیه اما حدیث
جابر انه صلی اللہ علیہ وسلم قال لبلال
زن فارجح فی المیزان فاعطانی اوقیة
من ذهب وزادنی قیراطا ففیه انها
زیادة قلیلة لا تظهر فی الوزنین
فان القیراط هو نصف عشر الدینار
فی اکثر البلاد وعند اهل الشام
جزء من اربعة وعشرین منه کذا
فی مجمع البحار (ص ۱۳۲ ج ۲) و
الاوقیة وزن اربعین درهما کما فیه

مستفتی کے اس دعویٰ کا غلط ہونا واضح
ہوگیا کہ بیع صرف میں زیادت مطلقاً ربا ہے
تراضی عاقدین کو اس میں کچھ دخل نہیں۔
(کیونکہ ہم نے ثابت کردیا کہ زیادت بطریق ہبہ
یہاں بھی جائز ہے ۱۲) نیز مستفتی کا ربا البیع
اور ربا القرض میں یہ فرق ظاہر کرنا بھی غلط
ہوگیا کہ ربا البیع کا تحقق تو شرط پر موقوف نہیں
اور ربا القرض کا تحقق شرط پر موقوف ہے
بلکہ حق یہ ہے کہ جو صورت بیع صرف میں مطلقاً
جائز نہیں وہ دَین و قرض میں بھی جائز نہیں
اور جو زیادت قرض میں بدون شرط کے جائز
ہے جیسے ہدیہ و دعوت وغیرہ کا قبول کرنا وہ
بیع صرف میں بھی اسی طرح جائز ہے نیز جو زیادت
اوصاف کی قسم سے ہو مثلاً کھوٹے کے بدلے
کھرا دینا وہ بھی بدون شرط کے دونوں میں جائز
ہے (بیع میں بھی اور قرض میں بھی) اور جن آثار
سے مستفتی نے اس مدعا پر استدلال کیا ہے کہ قرض
میں اصل سے زائد لینا مطلقاً جائز ہے ان سے
اس کا مدعا حاصل نہیں ہو سکتا، چنانچہ اول
اس نے حضرت جابرؓ کی یہ حدیث پیش کی ہے کہ
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایک اوقیہ
میں اونٹ خریدا اور مدینہ پہنچ کر ثمن ادا کیا اور
بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ان کے لئے ایک اوقیہ
سونا تول دو اور جھکتا ہوا تولو پس بلالؓ نے
ایک قیراط زیادہ دیا الخ اس کا جواب یہ ہے کہ

ایضا (ص ۳۵۹ ج ۱) قلت هذا اوقیة الفضة واما اوقیة الذهب فهی قد تساوی مائتی درهم المساویة لعشرین دینارا کما ورد فی روایة عند البخاری عن ابی نضرة عن جابر اشتراه بعشرین دینارا (ص ۳۷۵ ج ۱) فنسبة القیراط الی الاوقیة اقل من نسبة نصف درهم الی مأة درهم ومثل هذه الزیادة جائزة وانما اختلفوا فی نصف الدرهم وایضا فان تلك الزیادة انما کانت فی ثمن الابل و هی ملحقة بالعقد اذا کان المبیع قائما وجائزة بالاتفاق فی غیر الصرف لاسیما فی ما نحن فیه لعدم جریان الربا بین الاوقیة والحیوان فافهم و اما روی ابو هریرة ان رجلا اتی النبی صلی الله علیه وسلم یتقاضاه قد قد استسلف منه شطر وسق فاعطاه وسقا فقال نصف وسق لك ونصف وسق من عندی الخ وفی روایة جاء صاحب الوسق یتقاضاه فاعطاه وسقین فقال وسق لك ووسق نائل من عندی الخ ونحوه من الآثار ففیه تصریح من النبی صلی الله علیه وسلم یکون الزیادة هبة

اول تو یہ معمولی زیادتی ہے، جو ہر وزن میں ظاہر نہیں ہو سکتی، کیونکہ قیراط دینار کا بیسواں حصہ یا چوبیسواں حصہ ہے اور اوقیہ چاندی کا چالیس درہم کی برابر ہوتا ہے اور سونے کا اوقیہ بیس دینار کی برابر بھی ہوتا ہے، (اور یہاں وہی مراد ہے) جیسا بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جابرؓ کا اونٹ بیس دینار میں خریدا تھا آھ اور جب اوقیہ بیس دینار کا ہوا، اور قیراط ایک دینار کا بیسواں یا چوبیسواں حصہ ہوا تو قیراط اوقیہ کا $\frac{1}{400}$ یا $\frac{1}{480}$ حصہ ہوا تو اس) کی نسبت اس سے بھی کم ہوئی جو نصف درہم کو سو درہم سے حاصل ہے، اور اتنی زیادتی کا مضائقہ نہیں، ہاں نصف درہم پورا ہو تو اس میں اختلاف ہے، دوسرے اس زیادت کا حاصل یہ تھا کہ اونٹ کی قیمت میں اضافہ کر دیا گیا اور ثمن میں جو زیادت بحالت بقائے مبیع کی جائے وہ اصل عقد سے ملحق ہوتی ہے، اور بیع صرف کے سوا تمام بیوع میں اتفاقاً یہ صورت جائز ہے، خصوصاً صورت بحوث عنہا میں کیونکہ اوقیہ اور حیوان میں تو ربا کا تحقق ہو ہی نہیں سکتا خوب سمجھ لو، رہی یہ حدیث جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے آدھا

ونائلا من عنده وما تصریح فیه به یحمل علیه لکون الاحادیث بعضها یفسر بعضا وھو محمول علی انه صلے الله علیه وسلم وھبه زیادة مفرقة متمیزة عن حقه الذی قضاه ومالکؒ یزید فیه قیدا تبدل المجلس ایضا بان قضاه حقه اولا ثم لما قبضه استوفاه دار اداان یذھب به وھبه الزیادة بعده

وسق قرض لیا تھا وہ تقاضا کرنے لگا تو حضورؐ نے اس کو ایک وسق دیا اور فرمایا کہ آدھا وسق تو تیرا تھا اور آدھا وسق میری طرف سے ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے کسی سے ایک وسق قرض لیا تھا وہ تقاضا کرنے آیا تو آپ نے اس کو دو وسق دیئے اور فرمایا کہ ایک وسق تو تیرا ہے اور ایک وسق میری طرف سے عطیہ ہے الخ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں تو حضورؐ کی صاف تصریح موجود ہے کہ زیادت بطور ہبہ کے تھی (اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ہبہ کے طور سے زیادہ دینا قرض وبیع دونوں میں جائز ہے ۱۲) اور جس روایت میں یہ تصریح مذکور نہ ہو اس کو مصرح پر ہی محمول کیا جائے گا، کیونکہ احادیث ایک دوسرے کی مفسر ہوتی ہیں، اور جب یہ زیادتی بطور ہبہ کے تھی تو) اس میں یہ قید بھی لگائی جائے گی کہ حضورؐ نے اس زیادت کو مستقل اور ممتاز کر کے عطا فرمایا تھا، اور امام مالکؒ اس کی ساتھ یہ قید بھی زیادہ کریں گے کہ حضورؐ نے یہ زیادت اسی مجلس میں نہیں دی جس میں قرض ادا کیا گیا تھا بلکہ مجلس بدل کر دی گئی تھی،

فان قیل واین الدلالة فی الآثار علی مثل تلک القیود قلنا ومن این الدلالة فی ھذه الآثار علی کون تلک القضایا وقعت بعد نزول احکام الربا وتشریعھا؟ لم لا یجوز ان تکون قبله کما قالت الحنفیة فی استقراضه صلے الله علیه وسلم الابل ان ذلک

اس پر اگر یہ سوال کیا جائے کہ ان آثار میں یہ قیود کہاں ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان آثار میں یہی قید کہاں ہے، کہ یہ واقعات نزولِ احکام ربا اور اشاعت تحریم ربا کے بعد واقع ہوئے یہ احتمال کیوں نہیں ہو سکتا کہ یہ واقعات ربا سے پہلے کے ہوں، جیسا بعض روایتوں میں رسول

ع واما تاخر اسلام الراوی فلا ینافی ذلک لاحتمال ان یکون رواه بالارسال عن صحابی قدیم الاسلام کما قلنا مثل ذلک فی حدیث ابی ھریرة عن قصة الکلام فی الصلوٰة ۱۲ منه

كان قبل تحريم الربا ثم نهى صلى الله عليه وسلم عن الحيوان بالحيوان نسيئة قاله الطحاوي في معاني الآثار له (ص ۲۲۹ ج ۲) فان سلمنا كون تلك القضايا وقعت بعد تحريم الربا نقيدها بقيود عرفناها من نصوص اخر غيرها والا فلا لوم علينا ان قلنا بنسخها بآية الربا وبالاحاديث الواردة فيه فافهم واما ما نقله المستفتي عن العيني بلفظ وفيه ما يدل ان المقرض اذا اعطاه المستقرض افضل مما اقترض جنسا اوكيلا اووزنا ان ذلك معروف وانه يطيب له اخذه الخ الخ فهو محمول على الزيادة القليلة التي لاتجري بين الوزنين او على ما تكون بطريق الهبة والنائلة من المستقرض والا فنقول ان اطلاق هذا الحكم منسوخ بدليل نسخ استقراض الحيوان الوارد في هذا الحديث واذا كان جزء من الحديث منسوخا لا يصح الاستدلال بباقيه لحدوث احتمال النسخ فيه والعجب من المستفتي كيف يحتج

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض صحابہ سے اونٹ قرض لینا وارد ہے، اور حنفیہ نے اس میں یہی تاویل کی ہے کہ یہ واقعہ حرمت ربا سے پیشتر کا ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حیوان کو حیوان کے بدلے ادھار بیچنے سے منع فرما دیا (تو حیوان کا قرض لینا بھی ممنوع ہو گیا) پس اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ یہ واقعات حرمت ربا کے بعد کے ہیں تو ہم دوسرے دلائل کی وجہ سے قیود مذکورہ کے ساتھ ان کو مقید کریں گے۔ ورنہ اگر ہم یوں کہیں کہ یہ آثار آیت ربا اور احادیث ربا سے منسوخ ہیں جب بھی ہم پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا اور مستفتی نے علامہ عینی کا جو قول نقل کیا ہے کہ اس حدیث سے (جس کا ذکر عینی کے کلام میں ہے) معلوم ہوا کہ اگر مدیون قرض دہندہ کو اس چیز سے جو اس نے قرض لی تھی افضل شے ادا کرے خواہ وہ جنس میں افضل ہو یا مقدار میں یا وزن میں تو یہ ایک احسان ہے اور قرض دہندہ کو اس کا لینا حلال ہے الخ یہ اس زیادت پر محمول ہے جو بقدر قلیل ہو کہ دو وزنوں میں ظاہر نہ ہو سکتی ہو یا اس زیادت پر محمول ہے جو مدیون کی طرف سے بطور ہبہ کے (بلا شرط) ہو ورنہ ہم کہیں گے کہ یہ

باستدلال العینی هذا ولا حجۃ فیہ علی احد ولا یحتج بنقلہ الاجماع بقولہ وقد اجمع المسلمون نقلا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اشتراط الزیادۃ فی السلف ربا اھ مع کونہ حجۃ فی النقل لکونہ ثقۃ فیہ عارفا بمذاہب العلماء، بل قدح فیہ (فی حاشیۃ ص ۷۱) بان العلامۃ العینی شرح الھدایۃ بعد شرحہ للبخاری بکثیر من الزمان واعترف فیہ بانہ لم یثبت فی ھذا الباب النھی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو المعتبر لانہ اخر اقوالہ الخ ومنشاء القدح عدم ادراکہ بمراد العینی ولذا ظن قولیہ متعارضین فی التعارض بینھما فان کلامہ فی شرح الھدایۃ علی سند حدیث کل قرض جر نفعا معناہ بعد صحۃ النقل ان ھذا الحدیث لم یثبت بھذا الطریق،

قول اطلاق کی صورت میں منسوخ ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ حیوانات کا قرض لینا جس کا اس حدیث میں (جس سے علامہ عینی نے حکم مذکور مستنبط کیا ہے) ذکر ہے منسوخ ہو چکا ہے، اور جب حدیث کا ایک جزء منسوخ ہو تو اس کے باقی اجزاء سے بھی استدلال صحیح نہیں کیوں کہ ان میں بھی نسخ کا احتمال موجود ہے اور ہم کو مستفتی سے حیرت ہے کہ وہ علامہ عینی کے اس استدلال کو تو حجت بنا کر بیان کرتا ہے، حالانکہ یہ کسی پر بھی حجت نہیں، اور نقل اجماع میں ان کے قول کو حجت نہیں سمجھتا، حالانکہ وہ صاف لکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہوئے اس بات پر اتفاق کر لیا ہے کہ قرض میں زیادت کی شرط لگانا ربا ہے اھ: اور علامہ عینی کی نقل حجت ہے، کیونکہ وہ نقل میں ثقہ اور مذاہب علماء سے واقف ہیں، بلکہ مستفتی نے اس قول کو یہ اعتراض کر کے رد کر دیا ہے کہ علامہ عینی نے ہدایہ کی شرح بخاری کے شرح کے بہت زمانہ کے بعد لکھی ہے اور شرح ہدایہ میں اقرار کیا ہے کہ اس باب[ع] میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کوئی ممانعت ثابت نہیں ہوئی، اور چونکہ یہ آخری قول ہے اس لئے یہی معتبر ہے اھ، مگر اس اعتراض کا

[ع] یعنی قرض سے نفع حاصل کرنے کے بارے میں ۱۲ منہ

منشا صرف یہ ہے کہ مستفتی نے علامہ عینی کا مطلب نہیں سمجھا، اس لئے دونوں قولوں
میں اس کو تعارض نظر آنے لگا، حالانکہ دونوں میں کچھ بھی تعارض نہیں، کیونکہ شرح ہدایہ
میں تو انھوں نے حدیث کل قرض جر نفعا کی سند پر کلام کیا ہے، جس کا مطلب صحت
نقل مستفتی کے بعد یہ ہے۔

عن النبي صلی اللہ علیه وسلم علی
طریقة علم الاسناد ومعنی
کلامه في شرح البخاري ان النهي
ثبت عن النبي صلی اللہ علیه
وسلم بطریق اجماع المسلمین
علیه نقلاً عنه ولا یلزم من
عدم ثبوت النقل بطریق
الاسناد عدم ثبوته بطریق
الاجماع والتلقي فقد مر في
الاصل الرابع ان مدار الصحة
لیس علی الاسناد فقط بل قد
یصح بالتلقي واستدلال المجتهد
به وان لم یکن له سند یعول علیه
فیا للکبیس هذا المستفتي کیف
یحرف الکلم عن مواضعه ویخدع
الجهلاء بتناقض هذا الکلام و
قد افعم مع انه بریٔ من کل ذلك
وابعد عنه بمراحل اوقول حاصل
کلامه في شرح الهدایة عدم ثبوت
النهي عن کل منفعة مشروطة کانت
اوغیر مشروطة وفي شرح البخاري

کہ یہ حدیث علم اسناد کے طریقہ پر رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں،
اور شرح بخاری میں جو قول مذکور ہے
اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم سے بطریق نقل اجماعی وتلقی کے اس
صورت کا ربا ہونا ثابت ہے، اور بطریق
اسناد کے اگر کوئی نقل ثابت نہ ہو تو اس سے
یہ لازم نہیں آتا کہ بطریق تلقی کے بھی ثابت
نہ ہو، کیونکہ اصل چہارم میں ہم ثابت کر چکے ہیں
کہ صحت حدیث کا مدار لفظ پر نہیں، بلکہ تلقی
واستدلال مجتہد سے بھی حدیث صحیح ہو جاتی
ہے، یا یوں کہا جائے کہ شرح ہدایہ کے قول کا
مطلب یہ ہے کہ ہر منفعت سے مطلقاً خواہ وہ
مشروط ہو یا غیر مشروط ہو ممانعت ثابت
نہیں، اور شرح بخاری کے قول کا حاصل یہ ہے
کہ قرض میں زیادت مشروطہ کا ربا ہونا اجماع
مسلمین سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
نقل کرتے ہوئے ثابت ہے پس سمجھ سے کام
لو، اور ایک کلام کو دوسرے کا متعارض
قرار دے کر دھوکہ نہ کرو۔ اور آیت ربا کو
مجمل اور احادیث کو اس کا بیان قرار

ثبوت النهی عن اشتراط الزیادة فی القرض وکونه ربا باجماع المسلمین نقلاً عن النبی صلی الله علیه وسلم فافهم ولا تعجل فی رد بعض الکلام ببعض ونقضه به، واما استدلال المستفتی بکون اٰیة الربوا مجملة والاحادیث بیاناً لها فقد فرغنا عن الجواب عنه فان قیل حاصله ان الربوا کان معلوم المراد عند العرب ثم صار مجملاً حین ادخل الشارع فیه اشیاء لم یکن العرب یعرفه بالربوا ومقتضاه حدوث الاجمال فی الاٰیة بسبب الاحادیث مع ان الفقهاء جعلوا السنة بیاناً لها ولا یجوز کون البیان سبباً للاجمال قلنا سبب الاجمال من الاحادیث بعضها وهی التی تدل علی ان للربوا معنی شرعیاً اعم من العرفی کحدیث ان الربوا بضع وسبعون شعبة والبیان منها بعضها کحدیث ابی سعید وعبادة ومثل ذلک جائز حتما وحاصله کون الاٰیة مجملة فی الربوا الشرعی ظاهرة فی العرفی الذی کان اهل الجاهلیة یتعارفونه ویتعاملون به وهو الذی نعاه الله الیهم ثم نقول لو سلمنا الاجمال فی ربا القراٰن مطلقا فلا نسلم کون ربا البیع ربا منصوصا وربا الدین ربا قیاسیا بل نقول

دے کر جو دلیل مستفتی نے بیان کی ہے اس کے جواب سے ہم فارغ ہو چکے ہیں سوال، اس جواب کا حاصل یہ تھا کہ ربا کے معنی اہل عرب کو معلوم تھے، مگر اس میں اجمال اس وقت پیدا ہوا جب کہ شارع نے ربا کے تحت میں ایسی صورتیں بھی داخل کر دیں جن کو اہل عرب ربا نہ سمجھتے تھے، اور اس کا مقتضی یہ ہے کہ آیت ربا میں احادیث سے اجمال آیا، حالانکہ فقہاء نے تو احادیث کو آیت کا بیان قرار دیا ہے۔ اور بیان کا سبب اجمال بن جانا جائز نہیں، جواب سبب اجمال تو وہ احادیث ہیں جن سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ربا کے شرعی معنی عرفی معنی سے عام ہیں، جیسے یہ حدیث کہ ربا کے ستر سے کچھ اوپر شعبے ہیں اور بیان وہ احادیث ہیں جن میں ربا شرعی کی صورتیں مذکور ہیں جیسے ابو سعیدؓ وعبادہؓ وغیرہ اور اس میں کچھ اشکال نہیں اگر بعض احادیث سے آیت میں اجمال آجائے اور دوسری حدیث سے اجمال کی تفسیر ہو جائے اور حاصل جواب کا یہ ہے کہ یہ آیت ربا معنی شرعی میں تو مجمل ہے اور ربا عرفی میں مجمل نہیں، بلکہ ظاہر ہے، کیونکہ وہ تو اہل جاہلیت میں مشہور اور معمول بہ تھی اور اسی کی نسبت سے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر وعید از فرمائی

بان کلاهما منصوص اما الاول فبیان السنة المشهورة والثانی بدلالة النص وبالاجماع وبالاثار الواردة فی تفسیر ربا الجاهلیة وبحدیث کل قرض جر نفعا فهو ربا اما دلالة النص فبیانها ان الامة والائمة قد اجمعت علی کون حرمة الربا معللة سوی من شذ من اهل الظاهر فلا عبرة بقوله ولا یقدح به الاجماع لکون مذهبهم فی انکار القیاس وتعلیل النصوص باطلا بالکتاب والسنة واجماع الصحابة ومن بعدهم ولتفصیل هذا البحث موضع اخر وعلة حرمة الربوا انما هو کونه ظلما خلاف العدل کما تقرر فی الاصل السابع واذا کانت الزیادة

ہے، اور اگر ہم یہ بھی تسلیم کرلیں کہ آیتِ ربا مجمل ہے تو ہمکو یہ مسلم نہیں ہے کہ ربا البیع کی حرمت منصوص ہے اور ربا القرض کی حرمت قیاسی ہی، بلکہ ہمارے نزدیک دونوں منصوص ہیں قسم اول تو سنۃ مشہورہ کے بیان سے ثابت ہے اور قسم ثانی دلالۃ النص اور اجماع اور ان آثار سے ثابت ہے جو ربا جاہلی کی تفسیر میں وارد ہیں، نیز حدیث کل قرض جر نفعا فهو ربا سے بھی اس کا ثبوت ہو رہا ہے دلالۃ النص کی تقریر تو یہ ہے کہ تمام امت اور جملہ ائمہ کا اس پر اجماع ہے کہ ربا کی حرمت معلل ہے (یعنی اس کی کوئی علت ضرور ہے) اس میں بجز اہلِ ظاہر کے کسی کا اختلاف نہیں، مگر ان کا اختلاف معتبر نہیں، نہ اُن کے خلاف کا اجماع پر کوئی اثر کیونکہ قیاس اور تعلیل کا انکار جو ان کے مذہب کی بنیاد ہے کتاب اللہ اور سنت اور اجماع صحابہ و تابعین سے باطل ہو چکا ہے، چنانچہ دوسرے مواقع میں اس کی تفصیل موجود ہے، اور حرمت ربا کی علت یہ ہے کہ وہ ظلم ہے اور عدل کے خلاف ہے، جیسا اصل ہفتم میں ثابت ہو چکا ہے،

مع الحلول فی بیع مد جید بمدین ردیین او بیع درهم مضروب بدرهمین مکسورین وبیع حلی من الفضة باکثر من وزنها ان کان نسیئا او یدا فی المعنی حیث تکون الزیادة فی مقابلة جودة او صفة او سکة ونحوها ربا محرما فتکون الزیادة المشروط فی القرض

اور جب ایک عمدہ مُد کی بیع دو خراب مد کے عوض یا ایک سالم منقوش درہم کی بیع دو ٹوٹے ہوئے درہموں کے بدلے میں یا چاندی کے زیور کی بیع اس سے زیادہ چاندی کے عوض نقد کی صورت میں بھی ربا ہے، حالانکہ ایک اعتبار سے ان صورتوں میں مساوات موجود ہے، کیونکہ جس جانب میں وزن کی زیادتی ہے اس

حيث لا مقابل لها الا مجرد الاجل اولى
بكونها ربا محرما ممنوعا وكذا اذا كانت
زيادة الاجل في بيع الدراهم بالدراهم
مثلا نسيئة ربا محرما فالزيادة الحقيقية
على دراهم القرض بان ياخذ المقرض
مكان المائة مائة وعشرين اولى بكونها ربا
محرما لكون الزيادة ليست الا لاجل
الزمان والاجل لا قيمة له شرعا كما
تقرر في الاصل السادس، وهذا مما
لا ينكره الا مكابر معاند فان كون
ذلك ربا وظلما مما لا يخفى على آحاد من
المسلمين بل ولا على احد من اهل
الملل بل هذا هو الربا عند الناس كلهم
دون الزيادة عند الحلول ودون بيع
الدراهم بالدراهم نسيئة
فالعامة لا تعده من الربوا ولا
تتهم من يفعل ذلك باكل الربا
قال العلامة الحافظ ابن
القيم في الاعلام انه اى
الشارع حرم التفرق في الصرف و
بيع الربوي بمثله قبل القبض
لئلا يتخذ ذريعة الى التاجيل
الذي هو اصل باب الربا فحماهم
من قربانه باشتراط التقابض
في الحال ثم اوجب عليهم فيه

طرف اوصاف میں نقصان ہے تو اس
زیادتی کو دوسرے کی عمدگی اور کھرے پن
یا سکہ کے مقابل کہہ سکتے ہیں تو قرض یا
جس زیادت کی شرط لگائی جاتی ہے اس کا
ربا میں داخل ہونا بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے
کیونکہ اس صورت میں اس زیادت کا
عوض سوائے اجل اور مدت کے کچھ بھی
نہیں۔ اور اصل ششم میں معلوم ہو چکا ہے
کہ اجل اور مدت کی شریعت میں کچھ قیمت
نہیں ۱۲) اور اس اولویت کا انکار بجز
ہٹ دھرم کے کوئی نہیں کر سکتا، کیونکہ
اس کا ربا ہونا کسی جاہل مسلمان بلکہ کسی
مذہب کے پیرو پر بھی مخفی نہیں، بلکہ عام
طور پر لوگ اسی کو ربا سمجھتے ہیں، اور نقد
بیع کی صورت میں ایک ہم جنس کا دوسرے
ہم جنس سے زیادہ ہونا یا ایک درہم کو ایک
درہم کے بدلہ میں اُدھار بیچنا عام لوگوں کے
نزدیک ربا نہیں، اور نہ ایسے شخص کو وہ
سود خوار سمجھیں، حافظ ابن القیم اعلام الموقعین
میں فرماتے ہیں کہ شارع نے بیع صرف میں اور
ہر مال ربوی کی بیع میں جبکہ اس کے مقابلہ میں
ہم جنس ہو قبضہ سے پہلے مجلس بیع سے جدا
ہونے کو حرام کر دیا ہے، تاکہ اس کو اجل و
مدت کی بیع کا ذریعہ نہ بنا لیا جائے جو کہ باب
ربا کی اصل بنیاد ہے، پس شارع نے نقد النقدی

التماثل وان لا يزيد احد العوضين على الآخر اذا كان من جنس واحد حتى لا يباع مد جيد بمدين رديين وان كان يساويانه سدًّا للذريعة ربا النسأ الذي هو حقيقة الربا وانه اذا منعهم من الزيادة مع الحلول حيث تكون الزيادة في مقابلة جودة او صفة او سكة او نحوها فمنعهم منها حيث لا مقابل لها الا مجرد الاجل اولى فهذه حكمة تحريم ربا الفضل التي خفيت على كثير من الناس حتى قال بعض المتأخرين لا يتبين لي حكمة تحريم ربا الفضل وقد ذكر الشارع هذه الحكمة بعينها فانه حرمه سدًّا للذريعة ربا النسأ فقال في تحريم ربا الفضل فاني اخاف عليكم الرما والرما هو الربا فتحريم الربا نوعان نوع حرم لما فيه من المفسدة وهو ربا النسيئة ونوع حرم تحريم الوسائل وسدًّا للذرائع آه (ص ۹۶، ۹۷، ج ۲) وهذا والله كلام في غاية القوة والعجب من المستفتي انه كيف قلب الامر فجعل ربا القرض الذي

قبضہ کی شرط لگا کر لوگوں کو ربا کے پاس پہنچنے سے بھی بچالیا پھر جس وقت عوضین ایک جنس کے ہوں تو یہ بھی واجب کر دیا کہ دونوں برابر سرابر ہوں ایک دوسرے سے زائد نہ ہوں یہاں تک کہ ایک عمدہ مد[عہ] کو دو خراب مدوں کے عوض بھی بیع کرنا جائز نہیں، اگرچہ قیمت کے لحاظ سے دونوں برابر ہوں تاکہ اس کو ربا النسئہ کا ذریعہ نہ بنالیا جائے جو کہ ربا کی حقیقت ہے اور جب شارع نے نقد کی صورت میں زیادتی سے منع کر دیا حالانکہ یہ زیادت کھرے پن کی صفت یا اور کسی صفت کے عوض میں ہوتی ہے تو جہاں اس زیادت کا عوض سوائے مدت اور اجل کے کچھ نہ ہو وہاں تو زیادت بدرجہ اولیٰ ممنوع وحرام ہوگی پس ربا الفضل کے حرام ہونے کی یہ حکمت ہے جو بہت لوگوں پر مخفی ہے، یہاں تک کہ بعض متاخرین نے کہا ہے کہ ربا الفضل کے حرام ہونے کی حکمت میری سمجھ میں کچھ نہیں آتی، آہ مگر خود شارع نے اس کی حکمت بعینہ وہی بیان کی ہے (جو ہم نے بتلائی) کہ اس کو اس واسطے حرام کیا گیا ہے، تاکہ اس کو ربا النسئہ کا ذریعہ بنالیا جائے، چنانچہ ربا الفضل کی حرمت بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ مجھ کو تم پر ربا کا اندیشہ ہے، آہ پس حرمت ربا

عہ مُد ایک پیمانہ ہے جو صاع کا ربع ہے ۱۲

ھو اصل الربا وظھرت حکمۃ حرمتہ للناس ربا قیاسیا وسعی لتحلیلہ اشد السعی وجعل ربا الفضل الذی خفیت حکمۃ تحریمہ علی بعض العلماء ربا حقیقیا منصوصا قطعیا مع کونہ مختلفا فیہ بین الصحابۃ اولاً وھل ھذا الا الضلال ،

دو قسم پر ہے، ایک قسم کو تو اس لئے حرام کیا گیا ہے کہ اس میں خود مفسدہ ہے، اور یہ ربا النسیہ ہے اور دوسری قسم کو اس لئے حرام کیا گیا ہے کہ وہ اصلی ربا کا ذریعہ بن جاتی ہے آہ اور بخدا یہ کلام بہت مضبوط ہے، ہم کو مستفتی پر حیرت ہے کہ اس نے حقیقت الامر کو کیسا بدل ڈالا، کہ ربا القرض کو تو جو کہ حقیقی ربا ہے جس کی حرمت کی حکمت سب پر ظاہر ہے ربا قیاسی قرار دیتا اور اس کے جائز کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے اور ربا الفضل کو ربا حقیقی قطعی منصوص کہتا ہے، جس کی حرمت کی حکمت بعض علماء پر مخفی ہے، اور صحابہ کے درمیان بھی اس میں ابتداءً اختلاف تھا (کہ ابن عباس اس کو حرام نہ کہتے تھے ۱۲) اور گمراہی اسی کا نام ہے،

فمن قال بتحریم ربا الفضل لزمہ القول بتحریم ربا الدین بالاولی لما فیہ من الظلم والعدوان وسفك دم العدل ما لیس فی ربا الفضل کما لا یخفی علی من شم رائحۃ من العقل والدین وایضا فالقول بجواز ربا الدین یقتضی ان لا یکون فی تحریم ربا الفضل حکمۃ سوی تضییع الزمان واتعاب النفوس بلا فائدۃ فانہ لا یشاء احد ان یبتاع ربویا باکثر منہ من جنسہ الا قال اقرضتك مأۃ درھم بمأۃ درھم وعشرین من الصبح الی العصر او الی الغد ونحوہ واذا کان ھذا جائز او بیع مأۃ درھم بمأۃ

پس جو شخص ربا الفضل کو حرام کہے اس پر ربا القرض کا حرام ماننا بدرجۂ اولیٰ لازم ہے کیونکہ اس میں ظلم و تعدی اور انصاف کا خون اس قدر ہے کہ ربا الفضل میں اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں جس شخص کو عقل و دین کا ایک شمہ حاصل ہے وہ اس کو بخوبی سمجھ سکتا ہے، دوسرے ربا القرض کو جائز کہنے کے معنی یہ ہیں کہ ربا الفضل کے حرام کرنے میں سوائے وقت ضائع کرنے اور مخلوق کو بلا فائدہ پریشان کرنے کے کچھ بھی حکمت نہ ہو کیونکہ جب سو درہم کو سوا سو درہم کے عوض قرض دینا جائز اور بیع کرنا حرام ہے تو اب کوئی احمق اور مجنون ہی ہوگا جو اس کے بعد بھی بیع کرے گا،

وعشرين حراما فهل يبتاع هذا البتة
الا احمق او مجنون واى حاجة له
الى البيع اذا كان يتخلص من الربا
بالاقراض والاستقراض فلا يعجز
احد عن استحلال ما حرمه الله قط
بادنى حيلة فيا سبحان الله ايعود
الربا الذى قد عظم الله شانه
فى القرآن واوجب محاربة
مستحله ولعن آكله وموكله و
شاهديه وكاتبه وجاء فيه
من الوعيد ما لم يجئ فى غيره الى ان
يستحل بادنى حيلة لا كلفة فيها اصلا
وكيف يستحسن ان ينسب نبى من
الانبياء فضلا عن سيد الانبياء بل
ان ينسب رب العلمين الى ان يحرم
هذه المحرمات العظيمة ويتوعد
باغلظ العقوبات وانواع الوعيد
على بيع درهم جيد بدرهمين رديين
حال كونهما يساويانه معنى ولا
ظلم فيه على احد ثم يبيح تلك
المحرمات والزيادات كلها
بحيلة الاقراض والاستقراض
مع وجود الفضل والزيادة
فى ذلك حقيقة وفيه من
الظلم ما لا يخفى فلا حول ولا

جب وہ قرض کے ذریعہ حرمتِ ربا سے
بچ سکتا ہے، تو اس کو بیع کی کیا حاجت
ہے بلکہ وہ جس چیز کے عوض اسی کا ہم جنس
زائد مقدار میں خریدنا چاہتا ہے اس کو
ایک ساعت یا ایک دن کے واسطے
قرض دے کر لے سکتا ہے، اور اس صورت
میں ہر شخص ربا حرام کو ایک ادنیٰ حیلہ سے
حلال کر سکے گا، تو سبحان اللہ! کیا وہ ربا
جس کو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے سخت خطرناک
بتلایا اور اس کے حلال سمجھنے والے کو اعلان
جنگ دیا ہے، اور اس کے کھانے والے
کھلانے والے گواہی دینے والے اور لکھنے والے
پر لعنت کی ہے، اور اس کے متعلق ایسی
سخت وعید وارد ہوئی ہے، ایک ادنیٰ حیلہ
سے جس میں کوئی مشقت نہیں حلال کی جا سکتی
ہے پھر یہ کیونکر زیبا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی طرف بلکہ رب العالمین کی طرف یہ
بات منسوب کی جائے کہ وہ ایک کھرے درہم
کو دو کھوٹے درہموں کے عوض بیع کرنے
پر تو اس قدر سخت وعیدیں اور شدید تر
حرمتیں بیان فرمائیں، حالاں کہ (قیمت
کے لحاظ سے) درحقیقت یہ دونوں مساوی
ہیں اور اس میں کسی پر کچھ بھی ظلم نہیں، پھر ان
تمام محرمات اور زیادات کو قرض کے حیلہ
سے جائز کر دیں حالانکہ اس میں حقیقۃً زیادتی

قوۃ الا باللہ العلی العظیم فاذا کانت آیۃ الربا محرمۃ لربا الفضل فی البیع فھی محرمۃ بدلالۃ النص لربا القرض والدین بالاولی کدلالۃ تحریم القول باف للوالدین علی تحریم ایلامھما بالضرب والشتم بالاولی ودلالۃ النص لیست من القیاس بل ھی فوقہ وانھا قطعیۃ کعبارۃ النص ونحوھا کما تقرر فی الاصل الثالث۔

اور ظلم صریح موجود ہے، فلا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم، غرض آیت ربا اگر بیع میں ربا الفضل کو حرام کرتی ہے تو بطریق دلالۃ النص کے ربا القرض کو بدرجہ اولیٰ حرام کرتی ہے، جیسے والدین کو اُف کہنے کی حرمت اس کو مستلزم ہے کہ ضرب وشتم سے ان کو ایذا دینا بدرجۂ اولیٰ حرام ہو، اور دلالۃ النص قیاس میں داخل نہیں، بلکہ اس سے بڑھ کر ہے، اور اس کی دلالت قطعی ہے جیسا اصل سوم میں گذر چکا۔

واما الاجماع فقد ذکرہ القاضی ابو الولید ابن رشد فی بدایۃ المجتہد لہ وقد ذکرناہ قبل، وحاصلہ ان العلماء قد اتفقوا علی ان الربا یوجد فی شیئین فی البیع وفیما تقرر فی الذمۃ من بیع او سلف او غیر ذلک فاما الربا فیما تقرر فی الذمۃ فھو صنفان صنف متفق علیہ وھو ربا الجاھلیۃ الذی نھی عنہ وذلک انھم کانوا یسلفون بالزیادۃ وینظرون وکانوا یقولون انظرنی ازدک الخ وذکرہ العلامۃ العینی ایضا فی شرح البخاری بقولہ وقد اجمع المسلمون نقلا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اشتراط الزیادۃ فی السلف ربا اھ، وقد ذکرناہ

اور اجماع کو قاضی ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں بیان کیا ہے، جیسا اوپر گذر چکا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ علماء نے اس پر اتفاق کرلیا ہے کہ ربا کا تحقق دو صورتوں میں ہوتا ہے، ایک بیع میں دوسری اس دین میں جو ذمہ پر واجب ہوتا ہے خواہ بیع سے واجب ہو یا قرض وغیرہ سے اور جو ربا دین واجب فی الذمہ ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں ایک قسم کا حرام ہونا اتفاقی ہے، اور وہ جاہلیت کی ربا، جس کی صورت یہ تھی کہ وہ لوگ زیادتی کی شرط پر قرض دیتے اور مہلت دیا کرتے اور (قرض لینے والے) یوں کہتے تھے کہ تم ہم کو مہلت دو ہم تم کو (اصل سے) زیادہ دیں گے الخ اور علامہ عینی نے بھی شرح بخاری میں اجماع کا

ایضا وقد صرح الطحاوی بکون ربا
الدین الذی کان متعارفا بین اھل
الجاھلیۃ ربا القرآن وکذا صرح الفخر
الرازی وابن حجر الھیثمی فی تقریر حجۃ
ابن عباس وسیأتی وکذا صرح الجصاص
الرازیؒ بکون الربوا نوعین منہ ماھو فی
القرض ومنہ ماھو فی البیع وکذا صرح
ابن القیم والشاہ ولی اللہ بکون ربا
الدین ربا حقیقیا اولی بالتحریم و
ربا البیع غیر حقیقی حرمہ الشارع
صلی اللہ علیہ وسلم سدا للذرائع وفی
کل ذلک دلیل علی اجماع الامۃ والائمۃ
کلھم علی تحریم ربا القرض قطعا لم
یقل احد منھم بجوازہ اصلا۔
واما الآثار الواردۃ فی تفسیر
الربا الجاھلیۃ الذی ھو ربا
القرآن فمنہ مارواہ مالک
فی المؤطا عن زید بن اسلم فی
تفسیر الآیۃ قال کان الربا فی
الجاھلیۃ ان یکون للرجل علی
الرجل حق الی اجل فاذا حل قال
أتقضی ام تربی فان قضاہ اخذ والا زادہ
فی حقہ وزادہ الآخر فی الاجل وروی
الطبری من طریق عطاء ومن طریق مجاھد
نحوہ کذا قالہ الحافظ فی فتح الباری (ص ۲۶۴ ج ۴)

ذکر ان الفاظ سے کیا ہے کہ تمام مسلمانوں
نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے
ہوئے اس امر پر اجماع کیا ہے کہ قرض میں
زیادہ (لینے) کی شرط کرنا ربا ہے، اور طحاوی
نے بھی اس کی تصریح کی ہے کہ جو ربا اہل جاہلیت
میں متعارف تھی قرآن میں اسی ربا کا ذکر ہے
اسی طرح امام فخر رازی اور علامہ ابن حجر ہیثمی
نے عبد اللہ بن عباس کی دلیل بیان کرتے
ہوئے اس کی تصریح کی ہے اور جصاص رازی
نے بھی بیان کیا ہے، کہ ربا کی دو قسمیں ہیں ایک
بیع میں ہوتی ہے ایک قرض میں اور حافظ ابن
القیم اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے صاف
فرمایا ہے کہ حقیقی ربا وہ ہے جو قرض میں ہو
اس کی حرمت اصلی ہے اور بیع میں جو ربا ہے
وہ غیر حقیقی ہے اس کو شارع صلی اللہ علیہ وسلم
نے سد باب کے طور پر حرام کیا ہے، ان تمام
اقوال سے ثابت ہو گیا کہ تمام امت اور جملہ
ائمہ ربا القرض کی حرمت قطعیہ پر متفق ہیں کسی
نے ہرگز اس کو جائز نہیں کہا اب تم وہ آثار
بھی دیکھو جو ربا جاہلی کی تفسیر میں وارد ہوئے
ہیں جس کا قرآن میں ذکر ہے، چنانچہ امام مالک
نے موطا میں زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے آیت
ربا کی تفسیر میں نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جاہلیت
میں ربا کی یہ صورت تھی کہ کسی کا دوسرے
شخص پر کچھ حق ہوتا جس کی ادا کے لئے

وقد التزم الصحة او الحسن فی الاحادیث المزیدۃ فی الشرح فھذہ الآثار کلھا صحاح او حسان ولفظ مجاھد عند الطبری قال الربا الذی نھی اللّٰہ عنہ کانوا فی الجاھلیۃ یکون للرجل علی الرجل الدین فیقول لک کذا وکذا وتؤخرعنی فیؤخرعنہ اھ (ص۶۴؍ ج۴) وروی عن قتادۃ ان ربا اھل الجاھلیۃ یبیع الرجل البیع الی اجل مسمی فاذا حل الاجل ولم یکن عند صاحبہ قضاء زادہ واخر عنہ اھ اسنادہ صحیح او حسن ایضا لکون الحافظ ذکرہ فی الفتح وقد تقدم فی الاصل الثامن ان اقوال التابعین فی تفسیر القرآن حجۃ لاسیما زید بن اسلم

مدت مقررہ ہوتی جب مدت پوری ہوجاتی صاحب حق دوسرے کہتا تم میرا حق ادا کرتے ہو یا (سود) بڑھاتے ہو اب اگر وہ حق ادا کر دیتا تو لے لیا جاتا، ورنہ (سود سے) اصل کو بڑھا دیا جاتا اور صاحب حق مدت کو بڑھا دیتا، طبری نے عطاء کے واسطہ سے اور مجاہد کے واسطہ سے بھی اسی کے مثل روایت کیا ہے جیسا کہ فتح الباری میں مذکور ہے، اور چونکہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس کا التزام کیا ہے کہ شرح میں جو احادیث بڑھائی جائیں وہ صحیح ہوں گی یا حسن اس لئے یہ سب آثار صحیح یا حسن ہیں اور طبری نے مجاہد سے اس مضمون کو ان لفظوں سے روایت کیا ہے کہ جس ربا سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں کسی کا دوسرے کے ذمہ دین (قرض) ہوتا تو مدیون کہتا کہ میں تم کو اتنا زیادہ دوں گا مجھے مہلت دیدو اس پر وہ مہلت دیدیتا، اور قتادہؒ سے اس طرح روایت کیا ہے کہ جاہلیت والوں کی ربا کا یہ طریقہ تھا کہ ایک شخص دوسرے کے ہاتھ کوئی چیز ادھار بیچتا مدت معینہ مقرر کر کے پھر جب وہ مدت پوری ہوجاتی اور خریدار قیمت ادا نہ کرسکتا تو وہ (رقم میں) کچھ اضافہ کر دیتا اور بائع اس کو مہلت دیدیتا اھ، اس کی سند بھی صحیح یا حسن ہے، کیوں کہ حافظ نے اس کو بھی فتح الباری میں ذکر کیا ہے، اور اصل ہشتم میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تفسیر قرآن کے بارے میں تابعین کے اقوال حجت ہیں، خصوصاً زید بن اسلم و مجاہد و عطاء و قتادہ کے اقوال کیوں کہ یہ حضرات اجلہ تابعین اور اپنے زمانہ میں علماء تفسیر کے امام تھے، نیز علماء نے

ومجاھد وعطاء وقتادۃ فھؤلاء اجلۃ التابعین رؤس علماء التفسیر فی زمانھم وقد صرح العلماء بان مراسیل موطا مالک

ومقاطیعہ وبلاغہ کلھا مستندۃ من غیر طریق مالک الا اربعۃ کما فی تزیین الممالک للسیوطی عن ابن عبد البر (ص۵) وھذا لیس منھا فاذن حض بذلک قدح المستفتی فی ھذہ الآثار بالانقطاع و عدم الاتصال، وقد اغرب المستفتی حیث قال ان ھذہ الآثار کلھا مختصۃ بربا البیع لما فی اثر قتادۃ من ذکر البیع (ص ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰) ولم یدر المسکین ان ذکر شئی لا یستلزم نفی غیرہ لاسیما اذا لم یکن بینھما مناقاۃ وھھنا کذلک فان اثر زید بن اسلم ومجاھد وغیرھما عام للبیع والقرض جمیعا واثر قتادۃ خاص بالبیع ولا تنافی بین العام والخاص بل یجری العام علی عمومہ ویحمل الخاص علی التمثیل[1] کیف وان سیاق القرآن یأبی قصر الربا المذکور فیہ علی ربا البیع لدلالۃ القول المحکی عن المشرکین فیہ انما البیع مثل الربا علی تفرقتھم

تصریح کی ہے کہ مؤطا مالک کے مراسیل ومقاطیع وبلاغات دوسرے طریق سے متصلاً ثابت ہیں، جیسا علامہ سیوطی نے حافظ ابن عبد البر کے حوالہ سے بیان کیا ہے، پس مستفتی کا ان آثار میں انقطاع وعدم اتصال سے اعتراض کرنا لغو وباطل ہے اس سے بڑھ کر عجیب بات مستفتی نے یہ کہی کہ وہ ان سب آثار کو ربا البیع کی ساتھ خاص کرتا ہے، محض اس لئے کہ قتادہ کے اثر میں لفظ بیع کا ذکر آگیا ہے مگر اس نے یہ نہ سمجھا کہ ایک شئے کا ذکر دوسری شئے کی نفی کو مستلزم نہیں، خصوصاً جبکہ دونوں میں کچھ منافات بھی نہ ہو، اور یہاں ایسا ہی ہے کیونکہ زید بن اسلم ومجاہد وغیرہ کے آثار تو بیع وقرض دونوں کو عام ہیں اور قتادہ کے اثر میں خاص بیع کا ذکر ہے، اور عام وخاص میں منافات نہیں، بلکہ عام اپنے عموم پر رہے گا اور خاص کو تمثیل وغیرہ پر محمول کیا جائے گا، اس کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ قرآن کا سیاق صاف طور سے ربا کے بیع میں منحصر ہونے کا انکار کر رہا ہے کیونکہ انما البیع مثل الربا سے بیع اور ربا کا الگ الگ ہونا معلوم ہو رہا ہے

---

[1] ذکر الزیلعی فی نصب الرایۃ عن السغناقی قاعدۃ محصلھا انہ اذا ورد حدیثان احدھما عام والآخر خاص فان علم تقدیم العام علی الخاص خص العام بالخاص وان علم تاخیر العام کان العام ناسخا للخاص ہذا اذا علم التاریخ اما اذا لم یعلم فان العام یجعل آخرا لما فیہ من الاحتیاط اھ (ص ۲۰۸ ج ۱) مولف

بین البیع والربا کما لایخفی و
ایضًا فالربا الذی ذکرہ قتادۃ
لیس بربا البیع الذی ورد بہ
السنۃ المشہورۃ الذہب بالذہب
والفضۃ بالفضۃ الحدیث
فان ربا البیع منحصر فی ما
یکون مع البیع فی وقت العقد
کما لایخفی علی من عرف حدہ
وانواعہ ولیس فی اثر قتادۃ
تقیید الربا بوقت البیع
بل فیہ تصریح بانہم انما کانوا
یربون اذا حل الاجل ولم یکن
عند المشتری قضاء ولایخفی ان
البیع یتم بالایجاب والقبول
وبتفرق العاقدین عن مجلس
العقد اجماعا فالربا الذی یوجد
بعد تمام البیع عند حلول الاجل
لیس من ربا البیع فی شئ وانما
ہو من ربا الدین الذی لم
یبینہ السنۃ المشہورۃ ولا
فرق بینہ وبین ربا
القرض اصلا بل کلاہما
غیر ربا البیع الذی ورد
بیانہ فی السنۃ فذکر لفظ البیع
فی اثر قتادۃ لایجدی

دوسرے جس ربا کا ذکر قتادہ کے اثر میں
ہے وہ بیع کا ربا نہیں جس کو حدیث
مشہور الذہب بالذہب والفضۃ
بالفضۃ الخ نے بیان کیا ہے، کیوں کہ
ربا البیع وہ ہے جو عقد بیع کے ساتھ بیع
کے وقت پایا جائے اور اثر قتادہ میں
جو ربا مذکور ہے، وہ بیع کے وقت
نہ ہوتا تھا، بلکہ اس میں تصریح ہے کہ اہل
جاہلیت ربا کا معاملہ اس وقت کرتے تھے
جب کہ مدت پوری ہو جاتی، اور خریدار
رقم کو ادا نہ کر سکتا، اور یہ بات ہر شخص
کو معلوم ہے کہ بیع کا معاملہ تو بالاتفاق
ایجاب وقبول اور تبدل مجلس سے تمام
ہو جاتا ہے، اب جو ربا بیع تمام ہونے کے
بعد مدت پوری ہو جانے کے وقت پایا
جائے گا، اس کو بیع سے کیا تعلق اور اس کو
ربا البیع کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے، بلکہ
وہ تو ربا القرض ہے جس کو سنت مشہورہ
نے بیان نہیں کیا، اور اس میں اور ربا
القرض میں اصلا کچھ فرق نہیں، پس قتادہ
کے اثر میں لفظ بیع کا ذکر آ جانا مستفتی کو تو
کچھ بھی مفید نہیں، اور امام جصاص نے
احکام القرآن میں تصریح کر دی ہے کہ
اہل عرب نقد بیع کے اندر ایک ہمجنس
کا دوسرے ہمجنس سے زیادہ ہونے کو

المستفتی شیئا وقد صرح الجصاص فی احکام القرآن بان العرب لم یکونوا یعرفون البیع بالنقد واذا کان متفاضلا من جنس واحد ربا الی ان قال ولم یکن تعاملهم بالربا الا علی الوجه الذی ذکرنا من قرض دراهم او دنانیر الی اجل مع شرط الزیادة اھ (ص ۴۶۵ ج ۱) و من ادعی خلافہ فعلیہ البیان والا فالجصاص ومثلہ من العلماء الذین قصروا ربا الجاہلیۃ علی ربا الدین حجۃ علی من ناواھم والعجب من المستفتی انہ کیف یفرح بتفسیر قتادة وبتفسیر سعید ابن جبیر و الشافعی وابن العربی المالکی وبتفسیر الواحدی وغیرہم من المفسرین ولا راحۃ لہ فی شئ من ذلک فان ھؤلاء جمیعا بل کل من ذکر لفظ البیع فی تفسیر ربا الجاہلیۃ متفقون علی ان العرب کانوا یقولون اذا حل الاجل اقتضی ام تربی فان لم یقض زادوا فی الثمن علی ان یؤخروا، وھذا لا یصدق علیہ حد الربا الذی ذکرہ المستفتی بقولہ الربا ھو الفضل الخالی عن العوض فی البیع (ص ۴۴) فان الزیادة

ربا نہیں سمجھتے تھے، ان کے یہاں معاملہ ربا کی صرف وہی صورت تھی جو ہم نے پہلے بیان کی ہے کہ وہ دراہم و دنانیر ایک مدت کیلئے قرض دیا کرتے اور زیادہ وصول کرنے کی شرط لگاتے تھے اھ جس کو اس کے خلاف کا دعوےٰ ہو وہ دلیل پیش کرے ورنہ امام جصاص نیز ان تمام علماء کا قول جنھوں نے ربا جاہلی کو قرض میں منحصر کیا ہے ہر مخالف پر حجت ہے، اور ہم کو مستفتی پر حیرت ہے کہ وہ قتادہ اور سعید بن جبیر اور امام شافعی اور ابن العربی اور واحدی وغیرہ مفسرین کی تفسیر سے بلا وجہ خوش ہوتا ہے حالانکہ ان کی تفسیروں میں اس کے لئے خوشی کا کوئی موقع نہیں، کیونکہ حضرات بلکہ وہ تمام علما جنھوں نے ربا جاہلی کی تفسیر میں لفظ بیع کا ذکر کیا ہے اس امر پر متفق ہیں کہ اہل عرب بیع کے بعد جب مدت مقررہ پوری ہو جاتی اس وقت کہتے تھے کہ تم رقم دوگے یا سود دوگے اس پر اگر وہ رقم نہ ادا کرتا تو ثمن میں زیادتی کر دیتے اور خریدار کو مہلت دیدیتے اور اس صورت پر ربا کی وہ تعریف ہرگز صادق نہیں آتی جو خود مستفتی نے بیان کی ہے، کہ ربا وہ زیادت ہے جو بیع میں عوض سے خالی ہو کیونکہ ثمن مؤجل میں مدت تمام ہونے کی بعد جو زیادت کی جائے گی اس کو فضل خالی

فی الثمن المؤجل عند حلول الاجل
لیس بالفضل الخالی عن العوض بعد
انقراض البیع وقد تقدم عن ابن
رشد فی بدایة المجتهد له اتفق
العلماء علی ان الربا یوجد فی شیئین
فی البیع وفیما تقرر فی الذمة من
بیع او سلف الخ وفیه تصریح بان الربا
الموجود فیما تقرر فی الذمة من بیع
لیس من ربا البیع الذی هو النوع
الاول بل هو من نوع الثانی الذی
یکون فیما تقرر فی الذمة فبطل ما
زعمه المستفتی من دخوله فی ربا البیع
فان قیل ان الزیادة فی الثمن و الحط
منه یلتحقان باصل العقد قلت ذلك[1]
مشروط بقیام المبیع وبغیر الصرف
وبان لا تکون الزیادة والحط فی
مقابلة الاجل واما بعد هلاك المبیع
ولو حکما وکذا ان کانت الزیادة و
الحط فی مقابلة الاجل فلا
یلتحق بالعقد کما لو قال
المشتری اخر عنی وازیدك
او قال البائع عجل واضع
عنك فکلاهما باطل کما صرح

عن العوض فی البیع نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ
یہ تو فضل خالی عن العوض بعد تمام بیع ہے
اور علامہ ابن رشد کا یہ قول اوپر گذر چکا
ہے کہ علماء نے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ ربا
دو چیزوں میں متحقق ہوتا ہے، ایک بیع میں
دوسرے اس دین میں جو ذمہ پر واجب ہو
خواہ بیع سے واجب ہوا ہو یا قرض سے الخ
اور اس میں صاف تصریح ہے کہ جو ربا اس
دَین میں متحقق ہو جو بیع سے واجب ہوا ہو
وہ قسم اول یعنی ربا البیع میں داخل نہیں
بلکہ قسم دوم یعنی ربا القرض میں داخل ہے
پس مستفتی کا اس کو ربا البیع میں داخل
سمجھنا غلط ہے، اور اگر یہ کہا جائے کہ ثمن
میں زیادت اور کمی کرنا تو اصل عقد سے
ملحق ہوتا ہے پس ثمن مؤجل میں مشتری کی
طرف سے جو زیادت ہوگی وہ عقد بیع سے
ملحق ہو کر ثمن بیع قرار پائے گی، اور اس میں
جو ربا ہوگا وہ ربا البیع ہوگا نہ ربا القرض)
تو اس کا جواب یہ ہے کہ زیادت فی الثمن کا
اصل عقد سے ملحق ہونا چند شرائط کے ساتھ
مشروط ہے، اول یہ کہ اس وقت تک مبیع
اپنے حال پر باقی ہو دوسرے یہ کہ یہ عقد
بیع صَرف نہ ہو، تیسرے یہ کہ یہ زیادت

---

[1] صرح بالاولین فی الدر ورد المحتار وغیرہ فی باب التصرف فی الثمن والثالث بطلان اخر عنی وازیدک وعجل واضع عنک ۱۲ منه

به غیر واحد من علمائنا و منهم الجصاص فی احکام القرآن له (ص ۴۷۴ ج ۱) فظهر بما ذکرنا ان الزیادة التی کانت العرب تزیدها عند حلول الاجل فی مقابلة التاخیر لم تکن ملحقة بالعقد اصلا والا لم تکن ربا بل کانت جائزة و المبیع قائم ولکن الآثار واقوال المفسرین کلها مطبقة علی کون هذه الزیادة التی کانت العرب تفعله ربا محرما فادخال هذه الزیادة فی الثمن و الحاقها بالعقد باطل قطعا بل انما هو من ربا الدین اذا کان کذلك وآیة الربا مجملة عند المستفتی لا بیان لها الا بالسنة المشهورة وهی واردة فی ربا البیع عنده لا غیر فمن این قال المستفتی بحرمة الذی ورد ذکره فی اثر قتادة وسعید بن جبیر وقول الشافعی وابن العربی و الواحدی وغیرهم من المفسرین فان قال قلت بحرمته لکونه داخلا فی ربا البیع الذی

اجل اور مدت کے مقابلہ میں نہ ہو، اور اگر ثمن میں زیادتی کمی بیع کے ہلاک ہو جانے کے بعد کی گئی یا اجل اور مدت کے مقابلہ میں ہوئی تو یہ عقد سے ملحق نہ ہوگی، مثلاً خریدار یوں کہے کہ مجھے مہلت دیدو میں ثمن زیادہ کر دوں گا یا بائع یوں کہے کہ تو مدت معینہ سے پہلے ثمن دیدے تو میں کچھ کم کر دوں گا یہ دونوں صورتیں باطل ہیں، جیسا جصاص نے احکام القرآن میں اس کی تصریح کی ہے، اس کے بعد بات ظاہر ہے کہ اہل عرب ثمن مؤجل کی میعاد پورا ہونے کے بعد جو زیادت ثمن میں بمعاوضہ تاخیر کے کرتے تھے، وہ ہرگز عقد سے ملحق نہ تھی، ورنہ ربا میں داخل نہ ہوتی، بلکہ بحالت قیام مبیع یہ زیادت مباح ہوتی، حالانکہ مفسرین کے اقوال اور صحابہ کے آثار سب بالاتفاق اس کو ربا حرام بتلا رہے ہیں، پس اس زیادت کو ثمن میں داخل کر کے عقد بیع سے ملحق کرنا قطعا غلط ہے، بلکہ وہ تو ربا القرض کی قسم سے ہے اور جب ایسا ہے اور مستفتی کے نزدیک آیت ربا مجمل ہے جس کا بیان سنت مشہورہ کے سوا کچھ نہیں، اور سنت مشہورہ میں اس کے نزدیک صرف ربا البیع کا ذکر ہے اس کے سوا کچھ نہیں تو اب مستفتی بتلائے کہ اس نے اس ربا کو جس کا اثر قتادہ و سعید بن جبیر اور

وردبیانہ فی السنۃ فقد ظہر بطلان
ذلک بما ذکرنا وان قال قلت بحرمتہ
ودخولہ فی الربا باثر قتادۃ وباقوال
المفسرین قلنا فیلزمک کون الاثر
الموقوف الغیر القطعی بیانا للآیۃ
وقد[1] انکرتہ فی (ص ۱۶) وایضا[2] یلزمہ
القول بحرمۃ الفضل المشروط،

امام شافعی وابن العربی اور واحدی
وغیرہ مفسرین کے اقوال میں موجود ہے
کس دلیل سے حرام کہا، اگر وہ یوں کہے
میں اس کو ربا البیع میں داخل سمجھ کر حرام
کہتا ہوں تو یہ سمجھنا تو صحیح نہیں جیسا تقریر
بالا سے واضح ہوا اور اگر یہ کہے کہ میں اس کو
اثر قتادہ واقوال مفسرین کی وجہ
سے ربا میں داخل سمجھتا ہوں تو ہم کہیں گے کہ اس صورت میں تم کو اثر موقوف ظنی کو آیت کا
بیان ماننا پڑے گا، اور تم اس کا انکار کرتے ہو:

فی القرض بالآثار الخالیۃ عن ذکر البیع
العامۃ للقرض وغیرہ وباقوال
العلماء الذین فسروا ربا الجاھلیۃ
بالزیادۃ فی القرض وایضا نطالبک
بالفرق بین الزیادۃ فی الثمن المؤجل
عند حلول الاجل بشرط التاخیر والزیادۃ
المشروطۃ فی القرض فان قلت بان
الزیادۃ فی الاول بمقابلۃ المبیع فقد
ظہر بطلانہ وان قلت بانھا
بعد حلول الاجل[3] لا فی ابتداء
العقد وفی الثانی تکون
الزیادۃ مشروطۃ من اول
العقد قلنا فالثانی اولی

نیز تم کو ان آثار عامہ کی وجہ سے جن میں بیع کا
ذکر نہیں اور ان علماء کے اقوال کی وجہ سے
جو ربا جاہلی کی تفسیر ربا القرض سے کرتے
ہیں، اس زیادت کی حرمت کا بھی قائل
ہونا پڑے گا جو قرض میں مشروط ہو، نیز ہم
تم سے اس زیادت میں جو ثمن موجل میں میعاد
گذرنے پر بعوض مہلت کی جاتی ہے، اور
اس زیادت میں جو قرض میں مشروط ہوتی
ہے، فرق دریافت کرنا چاہتے ہیں، اگر
تم دونوں میں یہ فرق بتلاؤ کہ پہلی صورت
میں مبیع کی عوض زیادت ہے، تو اس کا بطلان
تو ابھی ظاہر ہو چکا ہے، اور اگر یہ کہو کہ پہلی
صورت میں تو میعاد گذرنے کے بعد زیادتی

---

[1] ولا یصح القول بان المجمل لا یصیر مفسرا بالخبر الواحد فقد صرح فی التوضیح بجواز التفسیر للکتاب بخبر الواحد وکذا جعل فی نور الانوار اخبار الآحاد بیانا لمجمل الکتاب وقال الآمدی لا یمتنع ان یکون البیان اما بدلیل قاطع او ظنی اقترن بہ من القرائن ما اوجب العلم بمدلول کلامہ اھ (ص ۶۵، ج ۳) [3] ذکر المستفتی ہذا الفرق فی ص ۴۳، مؤلف

بالحرمة لان الجاهلية كانوا
يزيدون في الدين عوض الاجل
اذا لم يقضه المديون عند حلوله
وارتكب المطل الذي هو ظلم شرعًا
وعرفًا بخلاف المقرض اذا اشترط
الزيادة على القرض من اول الامر
من غير ان يوجد من المديون مطل
فان هذه الزيادة ليست الا في
مقابلة الاجل، وايضا فلو تبايع
الرجلان بثمن المؤجل و
اشترطا من اول العقد ان
المشتري اذا لم يقبض الثمن عند
حلول الاجل يزاد عليه درهم
في كل شهر فهل يقول المستفتي
بجواز ذلك لكون الزيادة
مشروطة من اول العقد
فان اجترأ على ذلك فقد
جعل نفسه سخرة للصبيان
حيث ادخل الزيادة في الثمن عند حلول
الاجل بعد انقراض البيع وانتهائه
في ربا البيع ولا يجعل الزيادة المشروطة في
العقد داخلا فيه وان قال بحرمته

ہے، ابتدائے عقد میں نہیں ہے، اور دوسری
صورت میں ابتداء عقد ہی سے زیادتی مشروط
ہے تو ہم کہیں گے کہ اس بناء پر دوسری
صورت کو بدرجۂ اولیٰ حرام کہنا چاہئے کیونکہ
جاہلیت والے تو دین کو اجل کے عوض اس
وقت بڑھاتے تھے، جب کہ مدیون وقت
پر ادا نہ کرتا اور ٹالنے لگتا ...... اور قرض
کا ٹالنا شرعًا وعرفًا ہر طرح مذموم ہے (اس
کی سزا میں اگر کچھ زیادتی کی جائے تو قرین
قیاس ہے) بخلاف اس کے کہ قرض دینے والا
ابتدا ہی سے قرض سے زائد وصول کرنے
کی شرط کرتا ہے، حالانکہ ہنوز مدیون کی
طرف سے کوتاہی اور ٹال بھی متحقق نہیں ہوئی
تو یہ زیادتی محض مہلت اور مدت کے بدلہ
میں ہے (اور اس کا ربا ہونا بدیہی ہے) پھر ہم
تم سے دریافت کرتے ہیں کہ اگر دو شخص باہم خرید
وفروخت ثمن موجل کے ساتھ کریں، اور
ابتدائے عقد ہی سے یہ شرط کرلیں کہ اگر خریدار
میعاد گذرنے پر ثمن ادا نہ کرے تو اس سے
ہر مہینہ ایک درہم زائد لیا جائے گا
تو کیا مستفتی اس صورت کو اس بناء پر جائز
کہدیگا کہ اس میں ابتدائے عقد سے زیادت

له حاصله ان ربا الجاهلية كان في مقابلة الاجل مع كونه عقوبة المطل والفضل المشروط في القرض ليس الا عوض
الاجل من غير عقوبة اصلا فحرمة الثاني اولى من الاول لا بالقياس بل بدلالة النص كما ان حرمة ايلام
الابوين بالضرب والشتم اولى من حرمة قول اف لهما فافهم ۱۲ منه

فقد ابطل الفرق الذی ابداہ فی ربا
الجاھلیۃ والفضل المشروط فی القرض
وایضا فلو استقرض رجل من اخر مأۃ
درھم الی شھر ولم یشترطا الزیادۃ من
اول الامر فاذا مضی الشھر قال المقرض
للمستقرض انقضی امد تربی هل یجوز
ذلک ام ھو ربا محرم فان قال بالاول
نطالبہ بالفرق بینہ وبین ربا الجاھلیۃ
فان ھذہ زیادۃ بعد حلول الاجل ایضا
لا فی ابتداء العقد وان قال بالثانی
فقد ابطل الفرق الذی ابداہ وبالجملۃ
فلو رأیت المستفتی فی رسالتہ الاباطیل
والاغلوطات التی یتعجب منھا کل عاقل
لبیب ادعاہم اریب ھذا ونقول ثانیا
فی جواب الاستدلال بالاجمال بانا
لو سلمنا اجمال الآیۃ فلا نسلم ان
بیانھا حدیث ابی سعید وعبادۃ
الذھب بالذھب والفضۃ
بالفضۃ الخ، فقط بل بیانھا
ھذا الحدیث مع حدیث کل
قرض جر نفعا فھو ربا ومع
حدیث انما الربا فی النسیئۃ
وغیرھما ولا یلزم من
ذکر اھل الاصول حدیث
ابی سعید وعبادۃ دجلھم

مشروط ہے، اگر وہ اس پر جرأت کرے
تو یقیناً اپنے کو بازیچۂ طفلاں بنائے گا،
کیوں کہ عقد بیع تمام ہو جانے اور ثمن
مؤجل کی میعاد گذر جانے کے بعد جو
زیادتی ثمن میں کی جائے، اس کو ربا البیع
میں داخل کرنا (اور حرام کہنا) اور عقد بیع
کے وقت جس زیادتی کی شرط کی جائے
اس کو ربا البیع سے خارج کرنا (اور حلال
کہنا) مستفتی ہی کی عقل میں آسکتا ہے، کوئی
جاہل سے جاہل بھی اس کا قائل نہیں ہوسکتا
اور اگر وہ اس کو بھی حرام (اور ربا البیع میں
داخل) سمجھتا ہے تو وہ فرق باطل ہوگیا جو اس
نے ربا جاہلیت اور ربا القرض میں پیدا کیا
تھا، نیز اگر کوئی شخص سو درہم ایک مہینہ
کے وعدہ پر دوسرے سے قرض لے اور
ابتداء میں زیادت کی شرط نہ کی جائے، بلکہ
مہینہ تمام ہونے کے بعد قرض دینے والا
قرض خواہ سے یوں کہے کہ تم رقم ادا کرتے
ہو یا کچھ زائد دینا چاہتے ہو، یہ صورت
جائز ہے یا نہیں، اگر جائز ہے تو ہم مستفتی
سے اس صورت میں اور ربا جاہلیت کی
صورت میں فرق دریافت کرنا چاہتے ہیں
کیونکہ یہاں بھی میعاد گذرنے کے بعد زیادتی
کی گئی ہے (ابتداء عقد میں نہیں کی گئی) اور
اگر حرام و ربا ہے تو وہ فرق باطل ہوگیا

ایاه بیانا للآیة ان لا
یکون غیره بیانا لها لان
ذکر شیء لا یستلزم نفی
ماعداه فیحمل ذکرهم
له علی التمثیل واما ان
خبر الواحد لا یصح
بیانا للقطعی کما زعمه المستفتی
فقد رددناه وبینا ان الحق جوازه
کیف واکثر ما ذکروه من امثلة
البیان من اخبار الآحاد فافهم

جو مستفتی نے بیان کیا تھا، (معلوم ہوا کہ
تحقق ربا کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ زیادتی
کی شرط عقد کے ساتھ نہ ہو بلکہ بعد میں ہو)
الغرض مستفتی نے اپنے رسالہ میں محض بیہودہ
اور لغویات بھری ہیں جن کو دیکھ کر ہر عاقل
وعالم کو تعجب ہوتا ہے، اور آیت کے اجمال
سے جو مستفتی نے استدلال کیا ہے، اس کا تیسرا
جواب یہ ہے کہ اگر ہم آیت کو مجمل مان لیں تو
ہم کو یہ تسلیم نہیں کہ اس کا بیان صرف
ابو سعیدؓ وعبادہؓ ہی کی حدیث الذہب
بالذہب والفضۃ بالفضۃ الخ ہے، بلکہ اس کا بیان یہ حدیث کل قرض جر نفعاً فہو ربا
بھی ہے، اور حدیث انما الربا فی النسیئۃ وغیرہ بھی، اور اصولیین نے جو حدیث ابو سعید
وعبادہ کو آیت کا بیان قرار دیا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسری احادیث
بیان نہ ہوں، کیونکہ ایک کا ذکر دوسرے کی نفی کو مستلزم نہیں، پس ان کا ایک حدیث کو
بیان کرنا صرف تمثیل پر محمول ہے، رہا یہ کہ خبر واحد آیت قطعی کا بیان نہیں ہوسکتی، جیسا
مستفتی نے دعویٰ کیا ہے تو ہم اس کو (حاشیۂ عربیہ میں) رد کرچکے اور بتلا چکے ہیں، کہ حق یہ ہے
کہ خبر واحد قطعی کا بیان ہوسکتی ہے، کیوں نہ ہو، حالانکہ فقہاء نے جس قدر مثالیں بیان کی ذکر
کی ہیں وہ سب اخبار آحاد ہی ہیں؛

واما حدیث کل قرض جر منفعة
فهو ربا فبیانه ان المنفعة فیه عامة لکل
منفعة سواء کانت من قبیل الوصف
کالجودة ونحوها او من قبیل الزیادة
کالارجاح فی الوزن او غیرهما کالهدیة
والدعوة ونحوهما اما المنفعة التی
هی من قبیل الوصف او من جنس

اب ہم حدیث کل قرض جر منفعۃ فہو ربا کی شرح
کرتے ہیں کہ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ جس قرض سے
نفع حاصل کیا جائے وہ ربا ہے اور اس میں
لفظ منفعت ہر نفع کو عام ہے خواہ وصف
کی قسم سے ہو جیسے کھرا پن یا وزن میں زیادتی
کی قسم سے ہو یا ان دونوں کے علاوہ ہو جیسے
ہدیہ و دعوت وغیرہ، رہی وہ منفعت جو وصف کی

الهدية والدعوة فاختلفت اقوال
العلماء فی حرمتها مع اتفاقهم علیها
اذا کانت مشروطة وذهب شمس الائمة
الحلوائی منا الی حرمة قبول الهدية
واجابة الدعوة من غیر شرط ایضا
اذا لم یجر بها عادة قبل الاقراض و
قامت قرینة علی کونها لاجله وهو الحق
عندنا لکونه مؤیدا بالآثار وقال
الکرخی لا بأس بها اذا لم تکن مشروطة
واما التی من جهة الارجاح فی الوزن
والعدد فاتفقوا علی حرمتها سواء
کانت مشروطة اولا الا ما قل
منها کدانق فی مأة دراهم او تکون
بلفظ الهبة او ما یجری مجراه
وقد مر تفصیل الاقوال فی
هذه المسئلة من قبل ووجه
الفرق فی احکام هذه الانواع
من المنفعة ظاهر علی کل من له
مسکة بالفقه فان الجودة
والرداءة ونحوهما من
الاوصاف هدر فی الاموال
الربوية فان الشارع
قد جعل الدرهم
الردی والجید سواء
ولکن الصاع الردی

قسم سے یا ہدیہ اور دعوت کی قسم سے ہو اس کے
حرام ہونے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، مگر
اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر ان منافع کی
شرط کرلی جائے تو حرام ہیں اور شمس الائمہ کا
قول یہ ہے کہ مدیون کا ہدیہ اور دعوت قبول
کرنا بدون شرط کے بھی حرام ہے، جب کہ
قرض سے پہلے ہدیہ و دعوت کی عادت نہ ہو
اور قرائن سے یہ ثابت ہو کہ یہ سب کچھ قرض
ہی کی وجہ سے ہو رہا ہے، اور ہمارے نزدیک
یہی حق ہے کیونکہ آثار سے اسی کی تائید
ہو رہی ہے

اور کرخی کا قول تھا کہ اگر شرط نہ
ہو تو ہدیہ و دعوت کا قبول کرنا
حلال ہے اور جو منفعت وزن یا
عدد میں زیادت کی قسم سے ہو اس
کی حرمت پر سب کو اتفاق
ہے خواہ اس کی شرط ہو یا نہ ہو
البتہ اگر زیادتی بمقدار قلیل ہو جیسے
سو درہم میں ایک دانگ یا وہ
زیادتی ہبہ کے طریق پر ہو تو مضائقہ
نہیں جیسا مفصل اوپر معلوم ہو چکا
ہے اور ان اقسام منفعت کے احکام
میں فرق ظاہر ہے کیونکہ اوصاف
جودت اور ردارت وغیرہ اموال
ربویہ میں قابل اعتبار نہیں کیونکہ شارع نے درہم

من التمر والجنيب منه
كلاهما سواء، فاذا قضى
المديون درهما جيدا مكان
درهم ردى من غير شرط لايصدق
عليه انها منفعة جرها القرض
لكون الوصف هدرا في الاموال
الربوية نعم اذا اشترطا المقترضان
الجودة مثلا صارت مقصودة
لهما فيصدق عليها انها منفعة
جرها القرض وهدية الغريم
ودعوته منفصلا كلاهما عن مجلس
القضاء ووقته اجنبي عن القرض
ظاهرا لكونه من غير جنس
الدين منفصلا عن قضائه۔
ووصل الاجنبي بالاجنبي لايكون
الا برابط فلا يقال في كل هدية ودعوة
ان القرض جرها الا اذا كانتا مشروطتين
عند الاقراض او قامت قرينة على جره
لهما بخلاف الزيادة والرجحان في دراهم
القرض عند قضائه فان جر القرض لها
ظاهر لكونها مقرونة بقضاءه ومن
جنسه فلا تجوز مطلقا الا اذا كانت
قليلة لا يعتد بها او كان قد صرح
المديون بكونها هبة فان القليل
يتعذر الاحتراز منه والتصريح

جید وردی نیز عمدہ خرما اور خراب خرما کو یکساں
قرار دیا ہے، تو اگر مدیون بدون شرط کے درہم
ردی کی جگہ عمدہ درہم ادا کر دے تو اس کو یہ نہیں
کہا جا سکتا کہ قرض سے منفعت حاصل کی گئی ہے
کیونکہ اموال ربویہ میں اوصاف کا اعتبار نہیں
ہے، ہاں اگر قرض دینے والا جودت کی شرط
کر لے تو اس وقت چونکہ یہ وصف مقصود ہو گیا
ہے اس لئے اس پر یہ بات صادق آتی ہے
کہ قرض سے منفعت حاصل کی گئی ہے اسی طرح
مدیون اگر قرض دینے والے کی دعوت کرے یا
اس کو ہدیہ دے جو ادائے قرض کے وقت اسی
مجلس میں پیش نہ کیا جائے تو چونکہ ظاہر میں
یہ قرض سے بالکل علیحدہ چیز ہے، کیونکہ اس کی
جنس سے بھی نہیں اور ادا کے ساتھ نہیں۔

اور اجنبی شئے کا تعلق اجنبی سے بدون
ربط کے نہیں ہو سکتا، اس لئے ہر ہدیہ اور دعوت
پر یہ بات صادق نہیں آ سکتی کہ قرض سے یہ منفعت
حاصل کی گئی ہے البتہ اگر قرض دینے کے وقت
ہی ہدیہ و دعوت کی شرط کر لی جائے یا کوئی
قرینہ قائم ہو جائے کہ یہ ہدیہ وغیرہ قرض کی
وجہ سے دیا گیا ہے تو اس وقت اس کو قرض
کا نفع کہا جا سکتا ہے، بخلاف اس کے کہ قرض
کی رقم ادا کرتے وقت کچھ زیادہ رقم دی جائے
یا وزن بڑھا دیا جائے تو اس کا منفعت قرض
ہونا اور قرض کی وجہ سے حاصل ہونا ظاہر ہے

بالہبۃ ینفی الربا لکونہا عقدا مستقلاً
اجنبیاً عن الاقراض الا اذا کانت الہبۃ
مشروطۃ فیصدق علیہا انہا منفعۃ قد جرہا
القرض فلا تجوز واذا علمت ذالک ظہر لک
بطلان قول المستفتی ان الفقہاء لم
یتمسکوا بہذا الحدیث والاثر من لدن
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی زماننا
ہذا ولم یفتوا بحرمۃ امثال ہذہ المنافع
بل اتفقوا علی انہ لا یکون ربا الا ان یکون
مشروطۃ فی العقد وہذا خلاف ما
دلت علیہ ہذہ الاثار والاحادیث الواردۃ
فی ہذا الباب علی ما فیہا لانہا تدل علی
حرمۃ کل منفعۃ سواء شرطت او لم
تشترط مع انہا بدون الشرط جائزۃ
بالاتفاق اھ ص۱۱۰۶ فہذہ واللہ فریۃ
مریۃ فان الفقہاء من الصحابۃ و
التابعین واتباعہم لم یزالوا یستندون
علی حرمۃ منافع القرض بہذا الحدیث
ومعناہ وصرح بعضہم کشمس الائمۃ
منا ومالک واحمد بحرمتہا مطلقا سواء
شرطت او لم تشترط والذین قیدوا الحرمۃ
بالاشتراط فانما قیدوہا بہ عملاً
بہذا الحدیث لا اعراضا عنہ لما
فیہ من لفظ الجر فقالوا ان القرض
لا یجر الی نفسہ منفعۃ اجنبیۃ

کیونکہ یہ زیادت ادائے قرض سے متصل بھی
ہے اور اس کی جنس سے بھی ہے، تو یہ کسی حال
میں جائز نہیں، ہاں اگر معمولی زیادتی ہو جو
ناقابل اعتبار ہے یا مدیون نے اس کو صراحۃً
ہبہ کے طریق سے دیا ہو تو جائز ہے، کیونکہ
قلیل سے احتراز دشوار ہے اور ہبہ کی تصریح
کے ساتھ ربا منتفی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ مستقل
معاملہ ہے، جو قرض سے جدا ہے، البتہ اگر قرض
کے ساتھ ہی ہبہ کی شرط کی جائے تو اس صورت
میں یہ بات صادق آئے گی کہ قرض کے ذریعہ سے
نفع حاصل کیا گیا، اور یہ جائز نہیں، جب
اس کو سمجھ گئے تو اس تقریر سے تم کو مستفتی
کے اس قول کا باطل ہونا معلوم ہو گیا ہو گا،
کہ فقہاء نے اس حدیث واثر سے رسول اللہ
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ سے اسوقت
تک تمسک نہیں کیا اور نہ اس قسم کے منافع
کی حرمت کا فتویٰ دیا بلکہ وہ سب اس بات
پر متفق ہیں کہ یہ منافع جب تک مشروط نہ ہوں
اس وقت تک ربا میں داخل نہ ہوں گے
اور یہ بات اس حدیث کے اور جملہ آثار کے
جو اس باب میں مروی ہیں خلاف ہے کیونکہ
وہ تو اطلاق کے ساتھ ہر منفعت کے حرام
ہونے پر دلالت کرتی ہے، خواہ مشروط ہو
یا نہ ہو حالانکہ بدون شرط کے یہ منافع بالاتفاق
جائز ہیں اھ، اور بخدا یہ صریح بہتان ہے،

كالهدية والدعوة او منفعة قد
هدرها الشارع كالجودة ونحوها الا
بالاشتراط فمن منشاء الاختلاف في
التقييد بالاشتراط النظر الى لفظ
الجر والى صدق مفهومه بدون
الاشتراط اوعدمه وقول المستفتي
مع انها بدون الشرط جائزة بالاتفاق
باطل منشاؤه قلة المراجعة الى مذهب
العلماء فقد ذكرنا عن رحمة الامة

کیوں کہ فقہاء وصحابہ وتابعین وتبع تابعین
ہمیشہ سے منافع قرض کے حرمت پر اس حدیث
یا اس کے ہم معنی آثار سے استدلال کرتے
آئے ہیں، اور بعض فقہاء نے ان منافع کی
حرمت کو اطلاق کے ساتھ بیان کیا ہے۔
خواہ مشروط ہوں یا نہ ہوں، جیسا شمس الائمہ
اور امام مالک واحمد سے منقول ہے، اور
جن لوگوں نے حرمت کو شرط کی قید سے مقید
کیا ہے وہ بھی اسی حدیث (کل قرض
جر نفعا الخ) پر عمل کرتے ہوئے یہ قید لگا رہے ہیں نہ کہ اس سے اعراض کرتے ہوئے کیونکہ
حدیث میں لفظ جر موجود ہے تو وہ کہتے ہیں کہ قرض اپنی طرف ایسی منفعت کو جو محض
اجنبی ہے، یا شرعاً قابل اعتبار نہیں ہے، بدون شرط کے کشش نہیں کر سکتا، پس شرط
کے ساتھ حرمت کے مقید کرنے میں جو اختلاف ہے، اس کا منشا لفظ جر ہے، کہ اس کا
مفہوم بدون شرط کے صادق آتا ہے یا نہیں، رہا مستفتی کا یہ قول کہ بدون شرط کے یہ منافع
بالاتفاق جائز ہیں آھ بالکل غلط ہے، جس کا منشاء مذاہب علماء سے ناواقفی ہے کیونکہ ہم رحمۃ
الامۃ کے حوالہ سے بتلا چکے ہیں۔

ان اباحنيفة ومالكا واحمد ذهبوا الى
حرمتها مطلقا الا اذا جرت العادة بها بين المقترضين
من قبل وهو قول شمس الائمة الحلوائي
وذهب الشافعي الى جوازها من غير شرط
وهو قول الكرخي منا ويشير اليه
كلام محمد في بعض كتبه وهذا
الاختلاف انما هو في المنافع
التي هي من جنس الجودة ونح
او الهدية والدعوة واما ما كان من جنس

کہ امام ابو حنیفہ اور مالک واحمد ان منافع
کو مطلقاً حرام فرماتے ہیں مگر جب کہ قرض کے
معاملہ سے پہلے بھی ان لوگوں میں ہدیہ دعوت
کی عادت جاری ہو تو مضائقہ نہیں شمس الائمہ
حلوائی کا یہی قول ہے، ہاں امام شافعی
بدون شرط کے ان منافع کو جائز کہتے ہیں
اور کرخی کا بھی یہی قول ہے۔ اور بعض
کتابوں میں محمد کا کلام بھی اسی طرف اشارہ
کرتا ہے اور یہ اختلاف انہی منافع میں ہے جو

الزیادۃ فی الوزن والعدد فلا
اختلاف فی حرمتہا [عہ] مطلقاً کما قد
مناہ ومن ادعی الاختلاف فیہ
فعلیہ البیان وظہر بذلک بطلان
قول المستفتی ان الفضل المشروط
فی القرض لیس ربا منصوصا لان
الفقہاء استدلوا علی حرمتہ بحدیث
کل قرض جر منفعۃ وجعلہ الفقیہ
ابو الولید مقیسا علی الربا المحرم
بالقرآن ربا الجاہلیۃ وکذا جعلہ
العلامۃ الکاسانی شبیہا
بالربا [عہ] واطلق محمد علیہ
الکراہۃ لا الحرمۃ فلوکان الفضل
المشروط فی القرض ربا منصوصا
لم یستدلوا علیہ بمثل ہذا الحدیث الغیر
المشہور الذی ضعفہ بعض المحدثین
ولم یجعلوہ مقیسا علی الربا وشبیہا لہ
ولصرحوا بحرمتہ اھ ملخصا بمعناہ
(ص ۱۲، ۱۳) فان استدلالہم بالحدیث
لیس علی حرمۃ الفضل الذی یکون
بالزیادۃ فی الوزن والعدد بل علی
حرمۃ الفضل بمعنی المنفعۃ التی تکون

وصف جودت یا ہدیہ ودعوت کی قسم سے
ہو اور جو منفعت زیادت وزن وعدد کی
قسم سے ہو اس کے مطلقاً حرام ہونے میں
کسی کا اختلاف نہیں، اور جو اس کے خلاف
کا دعویٰ کرے، وہ دلیل بیان کرے، نیز
اس تقریر سے مستفتی کے اس قول کا بطلان
بھی ظاہر ہوگیا کہ قرض میں جو زیادت مشروط
ہوتی ہے وہ صریح ربا نہیں کیونکہ فقہا نے
اس کی حرمت پر حدیث کل قرض الخ سے
استدلال کیا ہے، اور قاضی ابو الولید نے
اس کو ربا جاہلی پر مقیس کہا ہے، اور علامہ
کاسانی (صاحب بدائع) نے اس کو مشابہ
ربا فرمایا ہے اور محمد نے اس پر کراہت کا
اطلاق کیا ہے نہ حرمت کا، پس اگر وہ زیادت
جو قرض میں مشروط ہو، صریح ربا ہوتی تو فقہاء
اس کی حرمت پر اس غیر مشہور حدیث سے
استدلال نہ کرتے جس کو بعض محدثین نے ضعیف
بھی کہا ہے، نیز اس کو ربا پر قیاس نہ کرتے
اور اس کے مشابہ نہ کہتے بلکہ اس کی حرمت
کی صراحت کرتے اھ

وجہ بطلان کی یہ ہے کہ فقہا نے اس
حدیث سے اس زیادت کی حرمت پر استدلال

عہ ای الا اذا کانت قلیلۃ لا یعتد بہا او کانت بطریق العطاء والہبۃ کما مر ۱۲۔ عہ وفیہ ان ملک العلماء قد صرح بان الاحتراز عن شبہۃ الربا واجب ایضا فلا ندری کیف فرح المستفتی بنقل کلامہ وایضا صرح محمد بان الکراہۃ بمعنی الحرمۃ قال فی الہدایۃ والمروی عن محمد نصا ان کل مکروہ حرام اھ (ص ۴۳۶ ج ۴)

من جهة الوصف كالجودة او من جنس
الهدية والدعوة ونحوهما وهذا لاشكر
كونه شبيها بالربا الحقيقي، ومكروها مع
ان اطلاق الكراهة لا ينفي الحرمة
فان اطلاق المكروه على الحرام شائع
في كلام الفقهاء الاترى محمد بن
الحسن يقول في موطاه في بيع
المضامين والملاقيح وحبل الحبلة
هذه البيوع كلها مكروهة ولا ينبغي اه
وقد اجمع العلماء على حرمتها لثبوت
النهي عنها على لسان الشارع صلى الله
عليه وسلم ومثل ذلك في كلامه كثير
وكذا في كلام غيره من الفقهاء وفي
الدر كل قرض جر نفعا حرام وفيه ايضا
عن الخلاصة القرض بالشرط حرام اه
(ص ۲۷۰، ج ۴، باب القرض)

فمن اطلق عليه المكروه يريد به
الحرام لا سيما اذا كان هذا
الاطلاق في كلام الصحابة
فانهم كانوا لا يفرقون بين
المكروه والحرام والواجب
والفرض لكون الاصطلاح
حادثا بعدهم فاندحض
قول المستفتي ان الصحابة
اتفقوا على كراهته و

نہیں کیا جو وزن وعدد میں ہو بلکہ ان منافع
کی حرمت پر استدلال کیا ہے، جو وصف جودت
و ہدیہ و دعوت کی قسم سے ہوں اور اس کا
مشابہ ربا اور مکروہ ہونا ہم کو بھی مسلم ہے، اور
کراہت کے اطلاق سے حرمت کی نفی لازم
نہیں آتی کیونکہ فقہاء کے کلام میں حرام پر
مکروہ کا اطلاق بہت شائع ہے چنانچہ امام
محمدؒ نے مضامین و ملاقیح و حبل الحبلہ کی بیع پر مکروہ
کا اطلاق کیا ہے حالانکہ سب علماء ان بیوع
کی حرمت پر متفق ہیں کیونکہ شارع کی زبان سے
صراحۃً ان کی ممانعت ثابت ہے اور محمدؒ کے
اور دیگر فقہاء کے کلام میں اس کی بہت نظیریں
ہیں اور در مختار میں صاف موجود ہے کہ جو قرض
نفع کا سبب بنے وہ حرام ہے اور خلاصہ کے
حوالہ سے اسی میں یہ بھی ہے کہ شرط کے ساتھ
قرض دینا حرام ہے۔

پس جن حضرات نے اس منفعت کو مکروہ
کہا ہے ان کی مراد بھی حرمت ہی ہے، خصوصاً
اگر یہ اطلاق صحابہ کے کلام میں وارد ہو کیونکہ
وہ تو مکروہ و حرام میں اور فرض و واجب میں فرق
نہ کرتے تھے، یہ سب اصطلاحی فروق بعد
میں ظاہر ہوئے ہیں، پس مستفتی کا یہ قول
باطل ہو گیا کہ صحابہ نے اس منفعت کی کراہت
ہی پر اتفاق کیا ہے، اور یہ اس کے ربا نہ ہونے
کی دلیل ہے، ورنہ اس کو حرام کہتے اھ۔

هو دليل على عدم كونه ربا
والا كان حراما (مطلقا) فالفرق بين
المكروه والحرام في كلامهم
باطل لما قلنا واما الفضل المشروط
في القرض من جهة الوزن
والعدد فلم يستدلوا على حرمته
بحديث كل قرض جر نفعا
فقط بل استدلوا عليها بآية
الربا التي في القرآن وجعلوه
من ربا الجاهلية واحتجوا عليها
بالاجماع ايضاً كما مر كل ذلك
مفصلا فافهم ولا تكن من الغافلين
واذا عرفت ذلك فقد علمت
انا لا نحتاج الى تصحيح حديث كل
قرض جر نفعا في جواب هذا الاستفتاء
الذي ورد علينا لما بينا ان
حرمة الفضل المشروط
في القرض لا تتوقف عليه
ولكن نتكلم على ذلك تبرعا
فنقول قد مر نقلا عن
العزيزي شارح جامع
الصغير للسيوطي ان حديث
كل قرض جر منفعة فهو
حرام حسن لغيره فاندفع
بذلك قول المستفتي

یہ گفتگو تو ان منافع میں تھی جو
وصف جودت یا ہدیہ و دعوت
کی قسم سے ہوں رہی وہ منفعت
جو قرض کی رقم میں وزن یا عدد کی
زیادت کی صورت سے حاصل ہو تو
اس کی حرمت پر فقط حدیث کل
قرض جر نفعا الخ سے استدلال نہیں
کیا گیا، بلکہ اس کی حرمت پر آیت
ربا سے استدلال کیا گیا اور اس کو ربا
جاہلی میں داخل کیا گیا، اور اس کی حرمت
پر اجماع سے بھی استدلال
کیا گیا ہے جیسا مفصل گذر چکا ہے
خوب سمجھ لو، اور نادان نہ بنو، جب
یہ بات معلوم ہو گئی تو اب سمجھو کہ
ہم کو مستفتی کے استفتاء کے جواب
میں حدیث کل قرض جر نفعاً الخ کی
صحت ثابت کرنے کی کچھ حاجت نہیں
کیونکہ ہم بتلا چکے ہیں کہ قرض
سے زائد وصول کرنے کی حرمت کا
ثبوت اس حدیث پر موقوف
نہیں، لیکن ہم تبرعاً اس پر بھی
گفتگو کرنا چاہتے ہیں اور کہتے
ہیں کہ عزیزی شارح جامع صغیر
سیوطی کے حوالہ سے اوپر گذر چکا
ہے کہ یہ حدیث حسن لغیرہ ہے۔

انه غیر ثابت ولا اصل له قال ابن حجر فیه الحارث بن اسامة واسناده ساقط واعلّ عبد الحق بسوار بن مصعب وقال انه متروك الخ ص ۱۳ فان الكلام فی طریق طریق لا ینفی حسن الحدیث ولا صحته لغیره فان الحدیث بتعدد الطرق قد یصل الی رتبة الصحیح مرة والی درجة الحسن اخری وهذا الحدیث قد بلغ بتعدد طرقه وبشواهده الی درجة الحسن کما قاله السیوطی فالقول بانه غیر ثابت ولا اصل له لا یجترئ علیه الا من لا علم له ولا مساس بالحدیث بل نقول ان الحدیث قد بلغ الصحة والشهرة[۲]

اس سے مستفتی کا یہ قول کہ یہ حدیث باطل اور بے اصل ہے، ابن حجر کہتے ہیں کہ اس کی سند میں حارث بن اسامہ ہے، اس کی اسناد ساقط ہے، عبدالحق نے سوار بن مصعب کی وجہ سے اس کو معلل کہا ہے اور سوار کو متروک بتلایا ہے، آہ باطل ہوگیا، کیونکہ الگ الگ ہر سند میں کلام ہونا حدیث کے صحیح لغیرہ یا حسن لغیرہ ہونے کے منافی نہیں کیونکہ کثرت طرق سے حدیث کبھی صحیح کے درجہ پر پہونچ جاتی ہے، کبھی حسن کے درجہ پر اور یہ حدیث تعدد طرق و کثرت شواہد سے حسن کے درجہ پر پہونچ گئی ہے جیسا علامہ سیوطی نے فرمایا ہے، پس اس کو باطل اور بے اصل کہنے کی جراُت وہی کر سکتا ہے جس کو علم حدیث سے مس بھی نہ ہو، بلکہ ہم ترقی کرکے کہتے ہیں کہ یہ حدیث تلقی بالقبول،

---

[۱] قلت ولا یخفی ما فی ہذا النقل من التحریف فان الحافظ لم یقل فیہ الحارث بن اسامة لشهرة ضعف الحارث وانما قال رواه الحارث بن ابی اسامة وهو صاحب المسند کما فی کنز العمال فی ذکر الکتب التی استمد بها فی تالیف جمع الجوامع ص ۳ ج ۱ وثقه ابن حبان وابو حاتم وابراهیم والدارقطنی وغیرهم من ائمة الحدیث کما فی بستان المحدثین للمحدث الدهلوی، وانما قال الحافظ اسناده ساقط فیه سوار بن مصعب ومع ذلک لم یقل ان الحدیث غیر ثابت لا اصل له بل قال وله شاهد ضعیف عن فضالة بن عبید عند البیهقی وآخر موقوفا عن عبد الله بن سلام عند البخاری اه ای والاسناد الضعیف اذا تأید بالشواهد تقوی کما لا یخفی علی من مارس علم الاسناد ۱۲ منه

[۲] اس لفظ کا مفہوم یہ ہے کہ حارث ضعیف ہے، مگر حافظ نے یہ لفظ نہیں کہا، ورنہ حارث ضعیف ہی بلکہ وہ تو صاحب مسند حافظ حدیث ہیں ابن حبان، ابوحاتم وابراہیم و دارقطنی نے ان کو ثقہ کہا ہے، مستفتی نے عمداً یا سہواً حافظ ابن حجر کے الفاظ میں تحریف کی ہے ۱۲

له بالقبول ولما له من الشواهد والاحتجاج
الائمة المجتهدين به وذكر الفقهاء اياه فی
معرض الاستدلال اما شواهده فمنها
ما ذكره ابن تيمية فی المنتقى وعزاه
الى ابن ماجة عن انس وسئل الرجل
منا يقرض اخاه المال فيهدى اليه فقال
قال رسول الله صلى الله عليه وسلم
اذا اقرض احدكم قرضا فاهدى اليه
او حمله على الدابة فلا يركبها ولا يقبله
الا ان يكون جرى بينه وبينه قبل
ذلك اه واشار الشوكانی فی النيل الى
تضعيفه (ص ۹۹ ج ۵) واغتر بكلامه المستفتی
فقال والراوی عن انس مجهول وكذا
فيه عتبة بن حميد الضبی البصری قال
ابو طالب عن احمد هو ضعيف ليس بالقوی
وفيه اسمعيل بن عياش الحمصی وهو
مختلف فيه وضعيف بالاجماع اذا روی
عن غير اهل بلده اه ص ۲۰، ۲۱ والجواب
عنه ما ذكره ابن القيم فی الاعلام
صہ ج ۱۲ وهو اعرف بالفن من
الشوكانی ومن الف مثله بما
نصه قال شیخنا رضی الله عنه و
(يحيى) هذا (الراوی عن انس)
يحيى بن يزيد الهنائی من رجال
مسلم وعتبة بن حميد معروف

اور کثرت شواہد اور استدلال مجتہدین
کی وجہ سے کہ فقہا اس کو استدلال کے موقعہ
پر بیان کرتے ہیں، حدیث صحیح ومشہور کے درجہ
پر پہنچ گئی ہے چنانچہ اس کا ایک شاہد وہ ہے
جس کو منتقی میں ابن ماجہ کے حوالہ سے بروایت
انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت
انس رضؓ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے
اپنے مسلمان بھائی کو قرض دیا ہو پھر مقروض
اس کو ہدیہ دے تو اس ہدیہ کا کیا حکم ہے"،
کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے
کہ جب کوئی کسی کو قرض دے پھر وہ اس کو
ہدیہ دے یا اپنی سواری پر سوار کرے تو
اس کی سواری پر سوار نہ ہو اور نہ ہدیہ قبول
کرے، البتہ اگر قرض سے پہلے بھی یہ برتاؤ
ان کے آپس میں ہو تو مضائقہ نہیں) علامہ
شوکانی نے نیل الاوطار میں اس حدیث کے
ضعیف ہونے پر اشارہ کیا ہے اور مستفتی بھی
ان کے کلام کو دیکھ کر دھوکہ میں پڑ گیا
اور کہنے لگا کہ حضرت انس سے جس نے یہ
حدیث روایت کی ہے وہ ضعیف ہے اور
اس کی سند میں عتبہ بن حمید الضبی بصری
بھی ہے، جس کو احمد نے ابو طالب کی روایت
میں ضعیف کہا ہے، اور اس میں اسماعیل بن
عیاش حمصی بھی ہے جس کے ثقہ ہونے میں
اختلاف ہے اور جب وہ اہل شام کے

بالرواية عن الهنائي قال ابو حاتم مع تشدده
هو صالح الحديث واسمعيل بن عياش
ثقة في حديثه على الشاميين (فيه دلالة
على كون عتبة من اهل الشام ولكن صرح
الحافظ في التقريب والتهذيب بكونه
بصريا ۱۲) قلت وقد وثق بعضهم اسماعيل
بن عياش مطلقا وفصل اكثرهم ورد ابنه
عن اهل بلده عن روايته عن غيرهم
كما يظهر من تهذيب التهذيب وقال
السيوطي في اللآلي المصنوعة نقلا عن
القول المسدد للحافظ ابن حجر وقد وثقه
(اي اسمعيل بن عياش) بعضهم مطلقا
اهـ (ص ۵۶ ج ۱۲) فبطل الاجماع الذي
ذكره المستفتي وبالجملة فحديث انس
هذا ان لم يكن صحيحا فلا اقل من ان
يكون حسنا واما قول المستفتي ومع
هذا هو خلاف ما عليه الامة من
لدن رسول الله صلى الله عليه
وسلم الى يومنا هذا (ص ۲)
فجرأة شديدة وفرية بلا مرية
فقد ذكرنا عن رحمة الامة ان
قول ابي حنيفة ومالك و
احمد موافق ـ

علاوہ کسی سے روایت کرے تو بالاجماع
ضعیف ہے اھ اس اعتراض کا جواب
علامہ ابن القیم نے جو شوکانی جیسے ہزاروں
سے زیادہ فن حدیث کو جاننے والے ہیں اعلام
الموقعین میں اس طرح دیا ہے کہ ہمارے شیخ نے
فرمایا کہ حضرت انس سے جو شخص یحییٰ نامی روایت
کر رہا ہے وہ یحییٰ بن یزید ہنائی ہے، جو مسلم
کے رواۃ میں سے ہے۔ اور عتبہ بن حمید
ہنائی کے شاگردوں میں مشہور ہے، ابو حاتم
نے باوجود تشدد کے اس کو صالح الحدیث
کہا ہے، اور اسماعیل بن عیاش اہل شام سے
روایت کرنے میں ثقہ ہے اھ، میں کہتا ہوں
کہ علامہ سیوطی نے حافظ ابن حجر کے رسالہ القول
المسدد کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ بعض
محدثین نے اسمعیل بن عیاش کو مطلقاً ثقہ کہا
ہے، (خواہ اہل شام سے روایت کرے یا غیر
اہل شام سے ۱۲) پس مستفتی نے جو اجماع نقل
کیا ہے وہ باطل ہوگیا، الغرض یہ حدیث
اگر صحیح نہیں تو حسن سے تو کسی طرح کم نہیں،
رہا مستفتی کا یہ قول کہ یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے وقت سے لے کر اس وقت تک
عمل امت کے خلاف ہے اھ تو یہ سخت
بے باکی اور صریح بہتان ہے، کیونکہ ہم رحمۃ
الامۃ کے حوالہ سے بیان کر چکے ہیں کہ امام ابو حنیفہ اور مالک و احمد کا قول اس حدیث کے بالکل موافق ہے

---

۵ ذکرہ ابن حبان فی الثقات کما فی تہذیب التہذیب ۱۲

لما فی الحدیث انس هذا وهو مختار شمس
الائمة الحلوائی کما ذکرہ فی الهندیة
نعم ذهب الشافعی الی جواز قبول هدیة
الغریم ودعوته اذا کان من غیر شرط
والیه مال الکرخی منا وقال الشوکانی
فی النیل فی شرح حدیث ابی هریرة فی
استقراض النبی صلی اللہ علیہ وسلم سنا
من الابل وقضائه سنا فوقه ما نصه
وفیه جواز رد ما هو افضل من المقترض اذا
لم تقع شرطیة ذلك وبه قال الجمهور وعن
المالکیة ان کانت الزیادة بالعدد لم یجز
وان کانت بالوصف جازت و
یرد علیهم حدیث جابر المذکور
فی الباب فانه صرح بانه
صلی اللہ علیہ وسلم زادہ
قیراطا قلت لا یرد ذلك علیهم
فانهم انما منعوا الزیادة عددا
فی القرض وحدیث جابر
وارد فی الزیادة فی ثمن الابل ولا
خلاف فی جوازها والعجب من
المستفتی انه مع تفرقته بین القرض
والدین بجعل الاول من التبرعات
والثانی من مبادلة المال
بالمال کیف یستدل بحدیث
جابر هذا علی جواز الزیادة

اور عالمگیری سے معلوم ہوتا ہے کہ شمس
الائمہ حلوائی نے اسی کو اختیار کیا ہے، ہاں
امام شافعی نے مقروض کے ہدیہ و دعوت
قبول کرنے کو جائز فرمایا ہے، جب کہ شرط
نہ کی گئی ہو اور علامہ کرخی کا میلان بھی اسی
طرف ہے (اس سے معلوم ہوا کہ جمہور کا عمل
اس حدیث کے اطلاق ہی پر ہے) اور
علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں حضرت
ابوہریرہؓ کی اس حدیث کی شرح میں جس
میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک
شخص سے اونٹ قرض لینا اور اس کے
اونٹ سے عمدہ ادا کرنا مذکور ہے، فرمایا
ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو چیز
قرض لی گئی ہو اس سے افضل ادا کرنا جائز
ہے، جب کہ اس کی شرط نہ ہوئی ہو جمہور
اسی کے قائل ہیں، اور مالکیہ سے روایت
ہے کہ اگر عدد بڑھا کر ادا کیا جائے تو جائز
نہیں، اور ان پر حدیث جابر سے اشکال
وارد ہوگا، کیونکہ اس میں تصریح ہے
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے
دَین سے ایک قیراط زیادہ دیا (میں
کہتا ہوں اس سے مالکیہ پر اشکال
وارد نہیں ہوتا، کیونکہ مالکیہ نے قرض
میں زیادت عدد کو ممنوع قرار دیا ہے
اور جابر کی حدیث میں قرض کا معاملہ نہیں

فی اداء القرض ۱۲) قال الشوکانی
واما اذا کانت الزیادة مشروطة
فی العقد فتحرم اتفاقا (وفیه رد
صریح علی المستفتی حیث جوز
الفضل المشروط فی القرض وخالف
الاجماع ۱۲) قال والحاصل ان
الهدیة والعاریة ونحوهما
اذا کانت لاجل التنفیس فی
اجل الدین او لاجل رشوة
صاحب الدین او لاجل ان یکون
لصاحب الدین منفعة فی مقابل
دینه فذلك محرم لانه اما نوع
من الربوا او رشوة (فیه رد صریح
علی المستفتی فان الفضل
المشروط فی القرض لا یخلو من
احد هذه الاغراض ۱۲) وان کان
ذلك لاجل عادة جاریة بین
المقرض والمستقرض قبل التداین
فلا باس وان لم یکن ذلك لغرض
اصلا فالظاهر المنع لاطلاق النهی
عن ذلك (فیه دلیل علی کون حدیث
انس معمولا به خلاف ما ذکره المستفتی
جرأة علی دین الله وتقولا بالرائ ۱۲)
قال واما الزیادة علی مقدار
الدین عند القضاء بغیر شرط

بلکہ قیمت شتر میں زیادت کا ذکر ہے اور
اس کے جواز میں کسی کو اختلاف نہیں، کیونکہ
جب تک مبیع موجود ہو اس وقت تک
ثمن میں زیادتی کمی جو کچھ ہوگی اصل عقد سے
ملحق ہوگی اور ہم کو مستفتی پر تعجب ہے کہ
باوجودیکہ اس کے نزدیک قرض اور دین کا
حکم الگ الگ ہے، پھر بھی وہ حدیث
جابرؓ سے قرض پر زیادت کے جواز کو کیونکر
ثابت کرتا ہے کیونکہ اس میں قرض کا ذکر ہی
نہیں ۱۲) اس کے بعد علامہ شوکانی فرماتے ہیں
کہ اگر عقد قرض میں زیادت کی شرط کی جائے
تو پھر اتفاقاً حرام ہے (اس میں مستفتی کے قول کا
صاف اور صریح رد ہے، کیونکہ وہ شرط کے
ساتھ بھی قرض سے زائد لینے کو جائز کہتا
اور اجماع کا خلاف کرتا ہے ۱۲) اس کے
بعد علامہ شوکانی نے خلاصہ کے طور پر فرمایا ہے
کہ ہدیہ اور عاریت اگر اس غرض سے ہوتا کہ
دین کی میعاد میں کچھ توسیع ہو جائے یا قرض
دینے والے کو رشوت کے طور پر ہدیہ وغیرہ
دیا جائے یا یہ غرض ہو، کہ قرض دینے والے کو
قرض دینے والے کو قرض دینے کے بدلہ میں
کچھ نفع پہونچ جائے تو یہ سب صورتیں حرام
ہیں کیونکہ ان میں یا تو ربا کی کوئی نوع پائی جاتی
یا رشوت کی (اس میں بھی مستفتی کا صریح رد ہے
کیونکہ قرض میں جب زیادہ وصول کرنے کی

ولا اضمار۔ شرط ہوگی تو ان اغراض میں سے کوئی غرض ضرور پائی جائے گی ۱۲) اور اگر یہ ہدیہ وغیرہ اس عادت و معمول کے موافق ہو جو پہلے سے قرض خواہ اور قرض دینے والے کے درمیان جاری تھا تو اس کا مضائقہ نہیں، اور اگر ان میں سے کوئی بھی سبب و غرض نہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں بھی ہدیہ (وغیرہ دینا اور قبول کرنا) ممنوع ہے، کیونکہ حدیث میں ممانعت اطلاق کے ساتھ وارد ہے (اس سے معلوم ہوا کہ حدیث انس معمول بہ ہے متروک العمل نہیں ہے، جیسا مستفتی نے جرأت و بیباکی سے دعویٰ کیا ہے) شوکانی فرماتے ہیں کہ ادائے قرض کے وقت مقدار بڑھا کر ادا کرنا جب کہ شرط نہ کی گئی ہو اور دل میں بھی (زیادہ دینے لینے کا پہلے سے) ارادہ نہ ہو،

فالظاهر الجواز من غير فرق بين الزيادة فى الصفة والمقدار والقليل والكثير (قلت لم ينسب الشوكانى الى احد من الائمة بل ذكر من قبل خلاف المالكية فى الزيادة بالعدد والمقدار و قول الحنفية مثل قولهم كما ذكرناه قبل فلا حجة لاحد بقول الشوكانى وحده مالم يظهر موافقته لقول واحد من المجتهدين اللهم الا ان يحمل على الزيادة بطريق الهبة فتجوز والا فلا وان سلمناه بلا تاويل فلا راحة للمستفتى فيه لكونه قد قيد الجواز بان يكون من غير شرط (۱) ولا اضمار (۲) قال الشوكانى قال المحاملى وغيره من اصحابنا يستحب للمستقرض ان يرد اجود مما اخذ (قلت هذا من الزيادة

بظاہر جائز ہے، خواہ زیادت وصف میں ہو یا مقدار میں اور مقدار قلیل ہو یا کثیر (میں کہتا ہوں کہ شوکانی نے اس بات کو کسی مجتہد کی طرف منسوب نہیں کیا، بلکہ اس سے پہلے وہ خود مالکیہ کا خلاف عدد و مقدار زیادہ کرنے میں ذکر کر چکے ہیں، اور حنفیہ کا قول بھی مالکیہ کے موافق ہے، جیسا ہم مفصل بیان کر چکے ہیں، پس تنہا شوکانی کا قول کسی پر حجت نہیں جب تک کسی مجتہد کے قول سے اس کی موافقت معلوم نہ ہو، ہاں اگر اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ ہبہ کے طور پر زیادت ہو تو جائز ہے ورنہ نہیں تو مسلم ہو سکتا ہے، اور اگر ہم علامہ شوکانی کے قول کو بدون تاویل کے بھی تسلیم کر لیں جب بھی مستفتی کو اس سے کچھ فائدہ نہیں پہونچ سکتا، کیونکہ علامہ نے اس کو اس قید کے ساتھ جائز فرمایا ہے کہ قرض کے

فی الوصف ولا خلاف فی ذلک اذا کان من غیر شرط ۱۲) قال ومما یدل علی عدم حل القرض الذی یجر الی المقرض نفعا ما اخرجہ البیہقی فی المعرفۃ عن فضالۃ بن عبید موقوفا بلفظ کل قرض جر منفعۃ فہو وجہ من وجوہ الربا ورواہ فی السنن الکبری عن ابن مسعود وابی بن کعب وعبد اللہ بن سلام وابن عباس موقوفا علیہم اھ (ص ۹۹، ۱۰۰، ج ۵) قلت فی کلامہ دلالۃ علی صلاحیۃ الآثار کلہا للاحتجاج بہ وانہا باجمعہا بمعنی اثر فضالۃ بن عبید فبطل ما ذکرہ المستفتی من الکلام فی بعض ہذہ الآثار وان بعضہا خال عن ذکر الربا، ص ۲۱، ۲۲ فان جمیع ہذہ الآثار مشتمل علی المنع من منفعۃ جرہا القرض والنہی اصلہ التحریم ولما ورد فی بعضہا مفسرا ان علۃ المنع کونہا ربا والاحادیث یفسر بعضہا بعضا یحمل الکل علی ذلک حتما قال المستفتی اما اثر ابی ابن کعب انہ قال لزر بن جُبیش انک بارض الربا فیہا کبیر فاش فاذا اقرضت رجلا فاہدی الیک ہدیۃ فخذ قرضک

وقت شرط بھی نہ ہوا ور دل میں ارادہ بھی نہ ہو ۱۲) علامہ شوکانی اس کے بعد فرماتے ہیں کہ محاملی وغیرہ شافعیہ کا قول ہے کہ قرضخواہ کو مستحب یہ ہے کہ اس نے جو قرض لیا ہے اس سے عمدہ اور بہتر ادا کرے، (میں کہتا ہوں کہ یہ تو وصف میں زیادتی ہوئی اور ایسا بدون شرط کے ہو تو اس کے جواز میں کسی کا خلاف نہیں ۱۲) اس کے بعد فرمایا ہے کہ جو قرض نفع حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا جائے اس کے حرام ہونے کی وہ دلیل ہے جو بیہقی نے فضالہؓ بن عبید سے موقوفاً روایت کی ہے، کہ جو قرض نفع کا ذریعہ بنایا جائے وہ بھی ربا کی ایک قسم میں داخل ہے، اور سنن کبریٰ میں بیہقی نے ابن مسعود وابی ابن کعب وعبداللہ بن سلام وابن عباس سے بھی موقوفاً اس کو روایت کیا ہے، آھ میں کہتا ہوں کہ شوکانی کے کلام سے معلوم ہوا کہ یہ تمام آثار احتجاج کے قابل ہیں اور یہ سب کے سب فضالہ بن عبید کی حدیث کے ہم معنی ہیں، پس مستفتی کا ان آثار میں سے بعض کی سند پر کلام کرنا اور یہ کہنا کہ بعض میں ربا کا ذکر نہیں ہے لغو وباطل ہے کیونکہ ان سب آثار میں اس نفع سے منع کیا گیا ہے جو قرض سے حاصل کیا جائے، اور ممانعت دراصل تحریم کے لئے ہوتی ہے، اور جب

وارد هدیته ففیه کلثوم بن الاقمر مجهول اھ ص ۲۱ قلت کلا بل هو معروف ذکره ابن حبان فی الثقات وقال روی عن جماعة من الصحابة روی عنه اهل الکوفة وهو اخو علی بن الاقمر کذا فی اللسان (ص ۴۸۹) وکذا جزم عمران بن محمد بن عمران الهمدانی فی طبقات رجال همدان بانه اخوه وتبع فی ذلک ابن سعد کما فی التهذیب (ص ۲۸۴ ج ۷) وعلی بن اقمر من الرجال الجماعة معروف،

بعض آثار میں ممانعت کی علت یہ بتلائی گئی کہ یہ نفع ربا میں داخل ہے تو سب کو اسی علت پر محمول کیا جائے گا کیونکہ ایک حدیث سے دوسری کی تفسیر ہو جاتی ہے، مستفتی نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے اس اثر میں کہ انھوں نے زر بن جبیش سے فرمایا کہ تم ایسی زمین میں رہتے ہو جہاں ربا بہت شائع ہے، تو جب تم کسی کو قرض دو اور وہ تم کو کچھ ہدیہ دے تو اپنا قرض تو وصول کر لو، اور اس کا ہدیہ واپس کر دو یہ کلام کیا ہے کہ اس کی سند میں کلثوم بن اقمر مجہول ہے آہ میں کہتا ہوں ہرگز نہیں، بلکہ وہ معروف ہے، ابن حبان نے اس کو ثقات میں شمار کیا ہے، اور کہا ہے کہ اس نے صحابہ کی جماعت سے روایت کی ہے، اور اس سے اہل کوفہ روایت کرتے ہیں، اور وہ علی ابن اقمر کے بھائی ہیں، عمران بن محمد بن عمران نے بھی طبقات ہمدان میں ابن سعد کی موافقت کرتے ہوئے جزم کے ساتھ ان کو علی بن اقمر کا بھائی بتلایا ہے، اور علی بن اقمر اصحاب صحاح کے راویوں میں مشہور ہیں، پس یہ اثر بھی حسن سے کم نہیں،

قال وکذلک ماروی ابن سیرین ان ابی بن کعب اهدی الی عمر بن الخطاب من تمر ارضه فردها فقال ابی لم رددت علی هدیتی وقد علمت انی من اطیب اهل المدینة ثمرة فخذ عنی ماترد علی هدیتی وکان عمر اسلفه عشرة الاف درهم قال البیهقی هذا منقطع اھ ص ۲۱ قلت وما

اسی طرح مستفتی نے ابن سیرین کے اس اثر میں کہ ابی بن کعب نے حضرت عمر کو اپنے باغ کے چھوارے ہدیہ میں دیئے تو حضرت عمرؓ نے ہدیہ کو رد کر دیا ابی ابن کعب نے فرمایا کہ آپ نے میرا ہدیہ کیوں واپس کر دیا حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ تمام اہل مدینہ سے میرے چھوارے زیادہ پاکیزہ (اور حلال) ہیں آپ مجھ سے وہ چیز لیجیے جس کی وجہ سے آپ نے میرا ہدیہ

فان مراسیل ابن سیرین صحاح عندهم
صرح به ابن عبد البر فی اوائل التمهید
كما فی الجوهر النقی (ص ۳۴۳) قال وكذلك
مارواه ابو صالح عن ابن عباس قال فی
رجل كان له علی رجل عشرون درهما
فجعل یهدی الیه فجعل كلما یهدی
الیه هدیة باعها حتی اذا بلغ ثمنها ثلثة
عشر درهما فقال ابن عباس لا تاخذ منه
الا سبعة دراهم لان ابا صالح لم یسمع
عن ابن عباس وكذلك مارواه سالم
بن ابی الجعد كان لنا جار سماك علیه
لرجل خمسون درهما فكان یهدی الیه
السمك فاتی ابن عباس فقال قاصه
بما اهدی الیك اه ص ۲۱ قلت اما
قوله ان ابا صالح لم یسمع ابن عباس
فان كان ابو صالح هذا اسم میزان
البصری فقد صحح ابن حبان حدیثه
عن ابن عباس فی زیارة النساء للقبور
واورده فی صحیحه كما فی التهذیب
(ص ۳۰۵ ج ۱) والمنقطع لیس بصحیح عندهم
فقیه دلیل علی سماع ابی صالح عن
ابن عباس وان كان هو باذام او باذان
مولی ام هانی بنت ابی طالب
فعدم سماعه عن ابن
عباس لیس بمجمع علیه وانما

واپس کیا ہے (یعنی اپنا قرض وصول کر لیجئے)
اور حضرت عمرؓ نے ان کو دس ہزار درہم قرض
دے رکھے تھے، یہ کلام کیا ہے کہ بیہقی نے اسکو
منقطع تبلایا ہے، میں کہتا ہوں پھر کیا ہوا
ابن سیرین کے مراسیل تو محدثین کے نزدیک
صحیح ہیں، چنانچہ جوہر نقی میں حافظ ابن عبد البر
کے حوالہ سے اس کی تصریح موجود ہے مستفتی
کہتا ہے کہ اسی طرح وہ حدیث بھی منقطع ہے
جو ابو صالح نے ابن عباس سے روایت کی ہے
کہ عبد اللہ بن عباس نے ایک شخص کے متعلق
جس کے بیس درہم دوسرے کے ذمہ قرض
تھے اور وہ اس کو ہدیہ دیتا تھا یہ اس کے
ہر ہدیہ کو بیچتا رہا، یہاں تک کہ اس کی قیمت
تیرہ ۱۳ درہم کو پہنچ گئی یہ فرمایا کہ تم اس سے
صرف سات درہم لے لو (زیادہ نہ لو) کیونکہ
ابو صالح کا سماع حضرت ابن عباس سے ثابت
نہیں ایسے ہی سالم ابن ابی الجعد کی یہ روایت
بھی (منقطع ہے) کہ ہمارا پڑوسی ایک مچھیرا تھا
اس کے اوپر کسی کے پچاس درہم قرض تھے
یہ اس کو مچھلی ہدیہ میں دیا کرتا تھا، تو وہ
قرض دینے والا حضرت ابن عباس کے پاس
(مسئلہ پوچھنے) آیا عبد اللہ بن عباس نے فرمایا
کہ اس کے ہدیہ کو بھی اپنے قرض میں محسوب
کر لو، میں کہتا ہوں کہ مستفتی کے اس قول
میں کہ ابو صالح کا سماع ابن عباس سے

وانما هو قول البعض قال الشوكاني في النيل
قد قيل انه لم يسمع ابن عباس اه
(ص ۳۳۳، ج ۳) وقد تابعه سالم بن
ابي الجعد على رواية مثل تلك القصة
عن ابن عباس وعدم سماع سالم
منه لم نرا حدا قاله غير المستفتي
كيف وقد صح سماعه عن ابن عمر
وعند البخاري وعبد الله بن عمرو
اقدم موتا عن ابن عباس كما في
دول الاسلام للذهبي وسمع عن
جابر بن عبد الله عنهما كما في كتاب
الجمع بين رجال الصحيحين (ص۱۶۵)
وهواي سالم اقدم موتا من عكرمة
مولى ابن عباس كما يظهر من التقريب
فكيف لا يسمع ابن عباس وايضا
فان المرسل اذا تأيد بمرسل
آخر هو حجة عند الكل كما
في تدريب الراوي وغيره،

ثابت نہیں ہم کو یہ کلام ہے کہ اگر یہ ابو صالح وہ
ہے جس کا نام میزان بصری ہے تو اس کی حدیث تو
ابن عباس سے عورتوں کی زیارت قبور کے مسئلہ میں
ابن حبان نے اپنی کتاب صحیح میں داخل کی ہے، اور وہ
منقطع محدثین کے نزدیک صحیح نہیں اس سے معلوم ہوا
کہ ابو صالح کا سماع ابن عباس سے ثابت ہے
اور اگر اس کا نام باذام یا باذان مولی
ام ہانی ہے تو ابن عباس سے اس کا سماع نہ ہونا
متفق علیہ نہیں، بلکہ بعض کا قول ہے جیسا
علامہ شوکانی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے
پھر سالم بن ابی الجعد نے بھی ایسا ہی قصہ ابن
عباس سے روایت کیا ہے، جیسا ابو صالح نے
بیان کیا ہے اور سالم بن ابی الجعد کا ابن عباس
سے سماع نہ ہونا مستفتی کے کلام میں نہیں دیکھا
گیا۔ اور مستفتی کا یہ دعوی کیونکر چل سکتا ہے،
حالانکہ سالم بن ابی الجعد کا سماع عبد اللہ بن عمرو
سے بخاری کے نزدیک ثابت ہے، اور عبد اللہ
بن عمرو کی وفات عبد اللہ بن عباس سے پہلے ہوئی
ہے، اور سالم نے جابر بن عبد اللہ صحابی سے سنا ہے، اور سالم کی وفات عکرمہ مولی
ابن عباس سے پہلے ہوئی، پھر عبد اللہ ابن عباس سے اس کا سماع کیوں نہ ہوگا، علاوہ
ازیں یہ کہ ایک مرسل کی تائید جب دوسرے مرسل سے ہوجائے تو وہ بالاتفاق حجت ہے،

قال المستفتي واثر فضالة بن عبيد
مع ضعفه ايضا ليس فيه لفظ الربا بل
لفظه كل قرض جر منفعة فهو وجه
من وجوه الربا فظاهره يدل على

اس کے بعد مستفتی کہتا ہے کہ فضالہ بن عبید کے
اثر میں علاوہ ضعف کے یہ بات بھی ہے کہ
اس میں ربا کا لفظ نہیں ہے، بلکہ اس کے
الفاظ یہ ہیں کہ جو قرض نفع حاصل کرنے کا ذریعہ

انه ليس بربا بل له شبه من الربا
اھ وقال فی الحاشیة اخرجه البیهقی
بسند ابراھیم بن سعد عن ادریس
بن یحیی عن عبد الله بن عیاش عبد الله
بن عیاش منکر الحدیث وابراھیم
لم یعرف حاله وکذا حال ادریس
ویمکن ان یکون ادریس بن یحیی الخولانی
ذکره ابن حبان فی ثقاته اھ ملخصاً، قلت
عبد الله بن عیاش روی له مسلم
استشهادا وقال ابو حاتم لیس
بالمتین صدوق یکتب حدیثه وذکره
ابن حبان فی الثقات کما فی التهذیب
(ص ۳۵۱، ج ۵) ومنکر الحدیث لیس
بجرح فی کلام غیر البخاری ما لم یعرف
ان النکرة منه او ممن هو فوقه او دونه
وما لم یعرف قلتها من کثرتها
فعبد الله هذا احسن الحدیث البتة
لاسیما وقد استشهد به مسلم فی صحیحه
وابراھیم بن سعد وادریس بن
یحیی لم یضعفهما الذهبی فی المیزان
مع التزامه ان لا یحذف اسم احد
ممن له بتلیین ما فی کتب الائمة فهما
ثقتان ومن هذا قال الهیثمی فی

ہے وہ بھی ربا کی صورتوں میں سے ایک صورت
ہے، اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ربا
نہیں بلکہ ربا کے مشابہ ہے اور مستفتی نے حاشیہ
کتاب میں لکھا ہے کہ اس کی سند میں عبداللہ
بن عیاش منکر الحدیث ہے، اور ابراہیم بن
سعد وادریس بن یحیی کا حال معلوم نہیں
میں کہتا ہوں کہ عبداللہ بن عیاش سے مسلم
نے اپنی صحیح میں بطور استشہاد کے روایت
کی ہے، اور ابن حبان نے اس کو ثقات میں
شمار کیا ہے، ابو حاتم نے اس کو سچا بتلایا ہے
اور لفظ منکر الحدیث اگر بخاری کے سوا
کسی دوسرے کے کلام میں وارد ہو تو اس
سے جرح لازم نہیں آتی جب تک یہ نہ معلوم
ہو کہ نکارت اس کی طرف سے ہے یا اس کے
مشائخ وتلامذہ کی طرف سے ہے، اور
نکارت قلیل ہے یا زیادہ ہے، پس عبداللہ
بن عیاش کی حدیث یقیناً حسن ہے، خصوصاً
جبکہ مسلم نے اس سے استشہاد کیا ہے، اور
ابراہیم وادریس کو امام ذہبی نے میزان میں
ضعیف نہیں بتلایا حالانکہ انہوں نے اس کا
التزام کیا ہے کہ جس راوی میں کچھ بھی کلام ہو گا
اس کو میزان میں ضرور بیان کریں گے، اسی
التزام کی بنا پر حافظ ہیثمی نے مجمع الزوائد

ملے فان قلت فلم ضعف الحافظ ابن حجر اثر فضالۃ فی بلوغ المرام قلت لعل الراجح قول من ضعف عبداللہ بن عیاش ہذا ولکنہ لایمشی علی اصلنا فان التعدیل مقدم عندنا علی الجرح اذا کان غیر مفسر وان کان عدد المضعفین اکثر ۱۲ منہ

مجمع الزوائد (ص ۳ ، ج ۱) ان شیوخ
الطبرانی الذین لم یضعفوا فی المیزان
ثقات اھ فالحدیث حسن اما قولہ فظاہرہ
یدل علی انہ لیس بربا بل لہ شبہ من
الربا ففیہ ان ھذا الظاہر خفی عندنا
بل الظاہر ان المراد بوجہ الربا ما رواہ
عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ عن
النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الربا
ثلاث وسبعون بابا ایسرھا مثل
ان ینکح الرجل امہ رواہ الحاکم
وقال صحیح علی شرطھما کذا فی الترغیب
للمنذری وروی بمعناہ آثار عدیدۃ
(ص ۳۳۱) فالمعنی ان کل قرض جر منفعۃ
فھو باب من ابواب الربا التی ادناھا
ان یزنی الرجل بامہ وایضا فان
الاحتراز عن شبہۃ الربا واجب ایضا
وھذا اذا لم تکن المنفعۃ مشروطۃ
والا فھی اشد الربا واعظمہ لکونہ من
ربا الجاھلیۃ التی نھی عنہ القرآن ومن
شواھدہ ما رواہ مالک فی الموطا انہ
بلغہ ان رجلا اتی عبد اللہ بن عمر
فقال یا ابا عبد الرحمن انی اسلفت
رجلا سلفا واشترطت علیہ افضل
مما اسلفتہ فقال عبد اللہ بن عمر
فذلک الربا وقال مالک انہ بلغہ ان

میں تصریح کی ہے، کہ طبرانی کے جن شیوخ
کو میزان میں ضعیف نہیں کہا گیا وہ سب
ثقات ہیں، پس فضالہ بن عبید کا یہ اثر حسن
ہے، رہا یہ کہ بظاہر اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے
کہ یہ ربا نہیں بلکہ ربا کے مشابہ ہے اس کا جواب
یہ ہے کہ یہ ظاہر ہمارے نزدیک خفی ہے
بلکہ ہمارے نزدیک بظاہر اس کے معنی
وہ ہیں جو عبد اللہ بن مسعود کی اس حدیث
کے معنی ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا ہے کہ ربا کے تہتر شعبے ہیں جن میں ادنیٰ
شعبہ کا گناہ ایسا ہے جیسے کوئی اپنی ماں سے
زنا کرے، اس کو حاکم نے روایت کرکے شیخین
کی شرط پر صحیح بتلایا ہے ترغیب میں اسی طرح
مذکور ہے اور اسی معنی میں اور بھی بہت روایتیں
ہیں، پس مطلب یہ ہوا کہ جو قرض نفع کا سبب
ہے وہ بھی ربا کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے
جس کا ادنیٰ درجہ گناہ میں ایسا ہے جیسا ماں
سے زنا کرنا، علاوہ ازیں یہ کہ شبہ ربا رہنے
سے اس کا جائز ہونا کیونکر معلوم ہوا،
بلکہ شبہ ربا سے بھی بچنا واجب ہے، اور یہ گفتگو
اس وقت ہے جبکہ قرض میں نفع کی شرط نہ کی
گئی ہو اور اگر نفع مشروط ہو وہ تو ربا کا سنگین
درجہ ہے، کیونکہ وہ تو ربا جاہلی کی قسم سے ہی جس کو
قرآن نے حرام کیا ہے، اور حدیث کل قرض جر نفعا
الخ کا ایک شاہد وہ ہے جو مالک نے موطا میں

عمر رضی بن الخطاب قال فی رجل سلف
رجلا طعاما علی ان یعطیہ ایاہ فی بلد اٰخر
فکرہ ذلک عمر وقال فاین الحمل یعنی
حملانہ قال المحشی نقلا عن المحلی ای
اجرۃ الطعام وصار ذلک قرضا جر منفعۃ
وھو ربا بالنص اھ قال مالک انہ بلغہ
ان ابن مسعود کان یقول من اسلف
سلفا فلا یشترط افضل منہ وان
کان قبضۃ من علف فھو ربا اھ (ص۲۹۳)
قلت وبلاغات مالک کلہا مسندۃ
صحاح سوی اربعۃ لیست ھذہ منہا
کما تقدم۔

بیان کیا ہے، کہ ان کو یہ خبر پہنچی ہے کہ ایک شخص
نے عبد اللہ بن عمرؓ کے پاس حاضر ہو کر عرض کیا کہ
میں نے ایک شخص کو قرض دیا ہے اور اس سے
یہ شرط کرلی ہے کہ اپنے قرض سے افضل وصول
کروں گا، عبد اللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ یہ تو ربا (سود)
ہے، امام مالک فرماتے ہیں کہ ان کو یہ بھی خبر
پہنچی ہے کہ حضرت عمرؓ سے سوال کیا گیا کہ ایک
شخص نے دوسرے کو غلہ اس شرط سے دیا کہ
دوسرے شہر میں مجھے دیدینا، تو حضرت عمرؓ نے
اس سے کراہت ظاہر کی اور فرمایا کہ باربرداری
کہاں گئی آہ محشی نے محلی کے حوالہ سے اس کی
شرح میں کہا ہے کہ مراد باربرداری کی مزدوری
ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ تو اس قرض میں داخل ہو گیا جو نفع کا سبب بنایا جائے (کیونکہ قرض
دینے والا قرض دے کر باربرداری کی اجرت سے بچنا چاہتا ہے) امام مالک
فرماتے ہیں کہ ان کو خبر پہنچی ہے کہ عبد اللہ بن مسعود فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص کسی کو کچھ قرض دے
اس سے افضل وصول کرنے کی شرط نہ کرے، اگر ایک مٹھی چارہ بھی زائد لے گا تو وہ ربا
ہو گا، آہ میں کہتا ہوں کہ مالک کے بلاغات سب کے سب صحیح فیصل ہیں بجز چار کے اور
یہ ان میں سے نہیں ہیں۔

ومن شواھدہ ایضا ما اخرجہ البخاری
عن عبد اللہ بن سلام انہ قال لابی بردۃ
بن ابی موسیٰ انک بارض فیہا الربا فاش
فاذا کان لک علی رجل حق فاھدی
الیک حمل تبن او حمل شعیر او حمل قت
فلا تأخذہ فانہ ربا کذا فی النیل
(ص ۹۹، ج ۵) وقول المستفتی انہ

نیز حدیث کل قرض جر نفعاً کا ایک شاہد
وہ ہے جس کو امام بخاری نے عبد اللہ بن سلام
رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں
نے ابو بردہ ابن ابی موسیٰ سے فرمایا کہ تم ایسی
زمین میں رہتے ہو جہاں ربا بہت شائع ہے
تو جب تمھارا کسی پر کچھ حق ہو پھر وہ تم کو ہدیہ
میں بھوسے کی ایک جالی یا جو اور چارہ کی

متروك العمل باتفاق الامة ص ۱۵۱، باطل قطعاً وفرية بلامرية حتماً كما ذكرناه غيرمرة وقوله انه مضطرب كما في ص۳۴ فدعوى بلابينة منشأها الغفلة عن معنى الاضطراب ومن شواهده ايضاً مارواه حماد بن سلمة في جامعه (عن ابي هريرة مرفوعاً) بلفظ اذا ارتهن شاة شرب المرتهن من لبنها بقدر علفها فان استفضل من اللبن بعد ثمن العلف فهو ربا كذا في نيل الاوطار (ص ۱۰۲ ج ۵) ومعناه اذا اذن الراهن للمرتهن في شرب لبنها بالنفقة والاقوال للشافعي وابوحنيفة ومالك وجمهور العلماء لا ينتفع المرتهن من الرهن بشيء بل الفوائد للراهن والمؤن عليه كما في النيل ايضاً واذا كان ما استفضل من اللبن بعد ثمن العلف ربا مع كونه في مقابلة العلف ويصح مقابلة اللبن الكثير بالعلف القليل في البيع وانما منع عنه في الرهن لكون الراهن لا يرضى بذلك

ایک گھڑی دے تو مت لینا کیونکہ یہ ربا ہے، اور مستفتی کا اس کو باتفاق امت متروک العمل کہنا قطعاً باطل اور صریح بہتان ہے، جیسا بارہا ہم نے بیان کیا ہے، اور اس اثر کو مضطرب کہنا دعویٰ بلا دلیل ہے جس کا منشاء اضطراب کے معنی سے ناواقفی ہے نیز اس حدیث کا ایک شاہد وہ ہے جس کو حماد بن سلمہ نے اپنی جامع میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بایں الفاظ روایت کیا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کی بکری رہن رکھے تو مرتہن بقدر چارہ کی قیمت کے اس کا دودھ پی سکتا ہے، اور چارہ کی قیمت وصول کرنے کے بعد جو دودھ فاضل رہے وہ ربا ہے (نیل الاوطار) مراد یہ ہے کہ جب راہن مرتہن کو اجازت دیدے کہ چارہ کے بدلے دودھ پی لیا کرے اس وقت یہ حکم ہو ورنہ امام شافعی وابوحنیفہ ومالک وجمہور علماء کے نزدیک مرتہن کو رہن سے کسی قسم کا نفع حاصل کرنا جائز نہیں بلکہ منافع بھی راہن کے ہیں اور جانور کے مصارف بھی اسی کے ذمہ ہیں، اب سمجھ لو کہ جب چارہ کی قیمت سے فاضل دودھ کو بھی

لہ وما ذكر في بعض كتب الفتاوى من جواز الانتفاع بالمرهون باذن الراهن فلا يصح اصلاً وانما هو قول بعض المتاخرين ولا عبرة به اذا كان خلاف المنقول عن الامام ومعارضاً للحديث وان سلم فلا راحة للمستفتي فيه لاتفاقهم على حرمة الانتفاع به اذا كان مشروطاً قال الطحطاوي والغالب من احوال الناس انهم انما يريدون عند الدفع الانتفاع ولولاه لما اعطاه الدراهم وهذا بمنزلة الشرط فان المعروف كالمشروط وهو مما يعين المنع والله تعالى اعلم كذا في رد المحتار ص ۴۸۲ ج ۵، فقط

الا لما علیہ من نقل الدین وضلع القرض کان الفضل المشروط فی القرض ربا حتما لکونہ لیس فی مقابلۃ شئ غیر الاجل فافہم، واما تلقی الامۃ لہذا الحدیث بالقبول فدلیل ذلک اتفاق فتاوی المجتہدین علی حرمۃ المنفعۃ التی جرھا القرض وعدھم ایاھا من الربا قال محمد فی الآثار اخبرنا ابو حنیفۃ عن حماد عن ابراھیم،

حضور نے ربا فرمایا حالانکہ اس دودھ کو چارہ کے عوض میں لے لیا جاتا ہے اور بیع کی صورت میں تھوڑے سے چارہ کو بہت سے دودھ کا عوض بنا لینا جائز ہے مگر رہن کی صورت میں اس واسطے جائز نہیں کیا گیا کہ راہن قرض کے دباؤ سے اس پر راضی ہوگا خوشی سے راضی نہ ہوگا، تو اگر قرض میں زیادہ رقم وصول کرنے کی شرط ہوگی وہ کیونکر ربا نہ ہوگا، کیونکہ یہ زیادت تو سوائے مدت اور اجل کے کسی چیز کے بھی مقابلہ میں نہیں، خوب سمجھ لو، اب رہی یہ بات کہ امت نے اس حدیث کی قبول کے ساتھ تلقی کی ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ تمام مجتہدین کے فتاوی اس منفعت کی حرمت پر متفق ہیں، جو قرض سے حاصل کی جائے، اور سب نے اس کو ربا میں شمار کیا ہے، امام محمد کتاب الآثار میں ابراہیم نخعی سے روایت کرتے ہیں کہ۔

قال کل قرض جر منفعۃ فلا خیر فیہ وبہ ناخذ وھو قول ابی حنیفۃ اھ (ص۱۱۱) و قولہ لا خیر فیہ لاینافی الحرمۃ لما مران الفقہاء ربما اطلقوا المکروہ و لاخیر فیہ علی الحرام واصحاب المتون والشروح من العلماء اعرف بمراد صاحب المذھب من غیرھم وقد صرح فی الدر والخلاصۃ بحرمتہ کما مر فھی المرادۃ وقال فی المدونۃ الکبری لمالک وقد سئل عن رجل لہ علی رجل دین ایصلح لہ ان یقبل منہ ھدیۃ قال مالک لایصلح ان یقبل منہ ھدیۃ الا ان یکون رجلا کان ذلک بینھما معروفا

جو قرض منفعت حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا جائے اس میں خیر نہیں، محمد فرماتے ہیں کہ ہم بھی اسی کے قائل ہیں اور امام ابو حنیفہ کا بھی یہی قول ہے اور ابراہیم نخعی کا یہ کہنا کہ اس میں خیر نہیں حرمت کے منافی نہیں، کیونکہ فقہاء بعض دفعہ ایسے الفاظ حرام پر بھی اطلاق کر دیتے ہیں، اور صاحب مذہب کی مراد کو اصحاب متون و شروح دوسروں سے زیادہ سمجھتے ہیں اور درمختار و خلاصہ وغیرہ میں اس کی حرمت کی تصریح موجود ہے، پس لاخیر فیہ سے حرمت ہی مراد ہے، اور مدونہ کبری مالکیہ میں ہے کہ ابن قاسم سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص کا دوسرے کے ذمہ قرض ہے تو کیا

وهو يعلم ان هديته ليس لمكان دينه فلا باس بذلك قال ابن وهب عن محمد بن عمرو عن ابن جريج ان عطاء بن ابی رباح قال له رجل انی اسلفت رجلا فاهدی لی قال لا تاخذه قال قد كان يهدی الی قبل سلفی قال فخذ منه قال عطاء الا ان يكون رجلا من خاصة اهلك او خاصتك لا يهدی لك لما تظن فخذ منه وعن يحيی بن سعيد انه قال اما من كان يتهادی هو وصاحبه وانكان عليه دين او سلف فان ذلك لا يتقابحه احد ثم ذكر اثر ابی بن كعب فی اهدائه الی عمر هدية فردها اليه وقد مراه (ص ۱۹۹ ج ۳) وقال فی باب السلف الذی يجر منفعة وكذلك ان اقرضه دنانير او دراهم طلب المقرض المنفعة بذلك لنفسه ولم يعلم بذلك صاحبه الا انه كره ان يكون فی بيته وابادان يحرزها فی ضمان غيره فاقرضها رجلا قال مالك لا يجوز هذا قلت ارأيت ان قال المقرض انما اردت بذلك منفعة نفسی ايصدق فی قول مالك ويا خذ حقه قبل الاجل قال لا يصدق ولكنه قد جرح فيما بينه وبين خالقه قلت ان كان امرا معروفا ظاهرا يعلم انه انما اراد

اس کو اس کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے، کہا امام مالک نے فرمایا ہے کہ اس کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں، البتہ اگر ان دونوں کے درمیان پہلے سے اس کا معمول ہو اور یہ جانتا ہو کہ قرض کی وجہ سے ہدیہ نہیں دیا گیا تو کچھ مضائقہ نہیں ابن وہب محمد بن عمرو سے وہ ابن جریج سے روایت کرتے ہیں کہ عطاء بن ابی رباح سے ایک شخص نے عرض کیا کہ میں نے ایک شخص کو قرض دیا ہے وہ مجھ کو ہدیہ دیتا ہے فرمایا مت لو کہا وہ مجھے قرض سے پہلے بھی ہدیہ دیتا تھا، فرمایا تو لے لو، عطاءؒ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص تمہارا خاص عزیز یا خاص دوست ہو جس کے ہدیہ پر تم کو یہ گمان نہ ہو کہ قرض کی وجہ سے دیتا ہے اس سے لیلو، اور یحییٰ بن سعید سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کے درمیان باہم ہدیہ کا لین دین ہو ان میں اگر کسی پر دوسرے کا قرض بھی ہو تو اس کے ہدیہ کو کوئی برا نہیں سمجھتا، پھر ابی بن کعب کا اثر بیان کیا کہ انھوں نے حضرت عمر کو ہدیہ دیا تھا اور انھوں نے واپس کر دیا، آہ، پھر مدونہ کے دوسرے باب میں جو قرض سے نفع حاصل کرنے کے بارہ میں یہ کہا ہے کہ اگر کسی کو دراہم و دنانیر قرض دیئے جائیں اور قرض دینے والا اپنے لئے نفع کا طالب ہو مگر قرضخواہ کو اس کی خبر نہیں کرتا، بلکہ اس کے دل میں یہ بات ہے کہ اپنے گھر میں

المنفعۃ لنفسہ اخذ حقہ حالاً ویبطل الاجل فی قول مالک قال نعم لانہ لیس بسلف والتمام الی الاجل الحرام وانما مثل ذلک الذی یبیع البیع الحرام الی اجل فیہ الاجل ویکون علیہ قیمتہ نقداً فیہ الاجل اذا فاتت السلعۃ ولا یؤخر القیمۃ الی الاجل قال وسمعت مالکا یحدث ان رجلا

روپیہ رکھنا پسند نہیں کرتا، قرض دے کر دوسرے کی ذمہ داری میں رقم کو محفوظ کر دینا چاہتا ہے، امام مالک نے فرمایا کہ یہ صورت جائز نہیں، ابن قاسم سے کہا گیا کہ اگر قرض دینے والا (بعد میں) یہ دعویٰ کرے کہ میں نے تو قرض دیتے ہوئے اپنے نفع کا قصد کیا تھا (کہ میری رقم محفوظ رہے گی) تو کیا مالک کے نزدیک اس کے قول کی تصدیق کی جائے گی، اور وہ اپنے حق کو (فساد عقد کی وجہ سے) مدت معینہ سے پہلے لے سکے گا، کہا اس کے قول کی تصدیق نہ کی جائے گی مگر باطناً خدا کے نزدیک وہ گنہگار رہا، ابن قاسم سے کہا گیا، کہ اگر قرض دینے والے کی حالت سے صاف طور سے یہ معلوم ہو رہا ہو کہ اس نے اپنے ذاتی نفع کے لئے قرض دیا ہے تو کیا اس صورت میں وہ اسی وقت اپنا حق لے سکے گا اور مدت کی تعیین مالک کے نزدیک باطل ہو جائے گی، فرمایا ہاں، کیونکہ یہ قرض نہیں اور اس کی مدت کا پورا کرنا حرام ہے (بلکہ اسی وقت معاملہ کا توڑ دینا لازم ہے) اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص حرام طریقہ پر ایک مدت مقرر کر کے بیع کرے تو مدت کو فسخ کیا جائے گا، اور مبیع ہلاک ہو گئی ہو تو اسی وقت نقد قیمت ادا کرنا خریدار کے ذمہ واجب ہے مدت معینہ تک مہلت نہ دی جائے گی، ابن قاسم نے فرمایا کہ میں نے امام مالک سے سنا ہے وہ حدیث بیان کرتے تھے کہ ایک شخص

اتی عبد اللہ بن عمر فقال یا ابا عبد الرحمٰن انی اسلفت رجلا سلفا واشترطت علیہ افضل مما اسلفتہ فقال عبد اللہ ذلک الربا، فقال کیف تامرنی یا ابا عبد الرحمٰن

عبد اللہ بن عمر کے پاس حاضر ہوا، اور کہا اے ابو عبد الرحمان میں نے ایک شخص کو قرض دیا ہے اور اس سے شرط کر لی ہے کہ قرض سے افضل لوں گا، فرمایا یہ تو ربا ہے، اس نے عرض کیا کہ پھر آپ مجھ کو کیا حکم دیتے ہیں فرمایا قرض

لہ فیہ دلیل علی ان القرض اذا ارید بہ المنفعۃ فلیس ہو بقرض وانما ہو کالبیع ۱۲ منہ

قال السلف على ثلاثة وجوه سلف
تريد به وجه الله فلك وجه الله
وسلف تريد[1] به وجه صاحبك
فلك ليس لك الا وجه صاحبك
وسلف تسلفه لتاخذ خبيثا بطيب
فذلك الربا قال فكيف تامرني
يا ابا عبد الرحمن فقال ارى ان تشق
الصحيفة فان اعطاك مثل الذي
اسلفته قبلته وان اعطاك دون
ما اسلفته فاخذته أُجرت الحديث
قال ابن عمر انما القرض منحة وقال
القاسم وسالم انه لا بأس به اذا
كان يستسلف بافريقية دينارا
جرجيريا ويرده بمصر منقوشا مالم يكن
بينهما شرط وقال ابن عمر من اقرض قرضا
فلا يشترط الا قضاءه وقال ابن
وهب عن رجال من اهل العلم عن
ابن شهاب وابي الزناد وغير واحد
من اهل العلم ان السلف معروف
اجره على الله فلا ينبغي لك ان تاخذ
من صاحبك في سلف اسلفته شيئا
ولا تشترط الا الاداء قال عبد الله
بن مسعود لمن سلف سلفا واشترط
افضل منه وان كان قبضة من
علف فانه ربا ذكره عند مالك

کی تین قسمیں ہیں، ایک وہ جس سے خدا کی ذات
مطلوب ہو (یعنی خدا کو راضی کرنا) تو اس سے
تم کو خدا کی رضا حاصل ہوگی، ایک قرض وہ
ہے جس سے اپنے دوست کا راضی کرنا مقصود
ہو، اس سے تم کو بجز دوست کی رضا کے کچھ
حاصل نہ ہوگا (یعنی ثواب نہ ملے گا) اور ایک
قرض یہ ہے کہ اپنا پاکیزہ مال دیکر خبیث مال
لینا چاہو (یعنی قرض دے کر نفع حاصل کرنا چاہو)
تو یہ ربا ہے، کہا پھر آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں
فرمایا میری رائے یہ ہے کہ تم اس کاغذ کو (جس میں
قرض کی مقدار اور شرط وغیرہ لکھی ہے) چاک کردو
اور قرض خواہ کو بھی اس کی اطلاع کردو کہ ہم نے
اس شرط سے رجوع کرلیا ہے) پھر اگر وہ تم کو قرض
کے برابر دے قبول کرلو۔ اور اگر قرض سے کم دے
اور تم منظور کرلو تو ثواب ملے گا الخ ابن عمر نے
فرمایا کہ قرض ایک عطیہ ہے، اور قاسم وسالم کا
قول ہے کہ اگر کوئی افریقہ میں کسی سے صاف دینار
قرض لے اور مصر میں نقشین دینار ادا کرے تو
اس کا کچھ مضائقہ نہیں، جب کہ اس کی شرط نہ
کی گئی ہو، اور ابن عمر کا ارشاد ہے کہ جو کسی کو قرض
دے تو اس سے ادائے قرض کے سوا اور کسی بات
کی شرط نہ کرے، ابن وہب نے بہت سی علماء
کے واسطے سے ابن شہاب اور ابو الزناد اور
بہت سے اہل علم کا قول بیان کیا ہے کہ قرض
ایک احسان ہے جس کا ثواب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے

[1] ای تریدُ رضاءہ لمصالح دنیویۃ لا لکونہ اخاک فی الاسلام ۱۲ منہ

بن انس قلت ارأیت ان اقرضتك
حنطة بالفسطاط علی ان توفیها
بالاسکندریة قال قال مالك ذلك
حرام قال مالك نهی عنه عمر بن الخطاب
اه (ص ۱۹۴، ۱۹۵ ج ۳) وقال عطاء کانوا
(ای الصحابة) یکرهون کل قرض جر منفعة
اخرجه ابن ابی شیبة بسند صحیح عنه کما
ذکره المستفتی وقد مر وقال المستفتی
ان جمهور الفقهاء یستدلون علی حرمة
منافع القرض بحدیث کل قرض جر منفعة
فهو ربا اه (ص ۳۱) قلت فقد اعترف بان
الائمة والامة تلقوه بالقبول وقد ذکرنا
فی الاصل الرابع ان مدار تصحیح
الحدیث لیس علی الاسناد فقط بل
قد یکون صحیحا اذا تأید بما یدل
علی صحته من القرائن او تلقاه الناس
بالقبول اما بالقول واما بالعمل
علیه والافتاء به وای قرینة اقوی
من موافقة اجلة الصحابة لہ۔

پس تم کو قرض دے کر کسی زائد چیز کا لینا جائز
نہیں، اور بجز ادائے قرض کے اور کچھ شرط نہ کرو
ابن مسعود نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی کو قرض
دے اور اس سے زائد وصول کرنے کی شرط کرے
اگرچہ ایک مٹھی چارہ ہی ہو تو وہ بھی ربا ہے، اس کو
مالک بن انس نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے
ابن قاسم سے کہا گیا کہ اگر میں آپ کو فسطاط مصر
میں اس شرط پر غلہ قرض دوں کہ آپ مجھے
اسکندریہ میں ادا کریں تو یہ شرط کیسی ہے فرمایا کہ
امام مالک نے اس کو حرام کہا ہے، اور کہا کہ
حضرت عمر نے اس سے منع فرمایا ہے، آہ اور
عطا نے فرمایا ہے کہ صحابہ قرض کو کراہت کرتے
تھے جس سے نفع حاصل کیا جائے، اس کو ابن
ابی شیبہ نے بسند صحیح روایت کیا ہے، (کراہت
سے مراد حرمت ہے کیونکہ حضرت عمر نے اس سے
کراہت ظاہر کی تھی، جس کی تفسیر امام مالک
نے حرام کی ہے ۱۲) اور مستفتی نے خود کہا ہے
کہ جمہور فقہا، منافع قرض کی حرمت پر حدیث
کل قرض جر منفعة الخ سے استدلال کرتے ہیں

تو اس نے خود اقرار کر لیا کہ تمام ائمہ نے اور امت نے قبول کے ساتھ اس حدیث کی تلقی
کی ہے، اور اصل چہارم میں ہم بتلا چکے ہیں کہ صحت حدیث کا مدار فقط سند پر نہیں، بلکہ کبھی
قرائن سے بھی حدیث صحیح ہو جاتی ہے، اور تلقی بالقبول سے بھی خواہ تلقی قولاً ہو یا عملاً، اور
اس حدیث کی صحت کے لئے اس سے بڑھ کر کیا قرینہ ہو گا کہ،

عه قلت فيه دلالة على ارادة الحرام بلفظ الكراهة فان الرواية عن عمر انما هي بلفظ الكراهة كما تقدم عن الموطا ۱۲ منه

ومطابقة فتاوى الفقهاء اياه واتفاق
الصحابة ومن بعدهم على كون اشتراط
الزيادة والمنفعة فى القرض ربا كما قاله
عطاء والعلامة العينى وابن رشد المالكى
وغيرهم من العلماء واذا تقرر ذلك فقول
امام الحرمين والغزالى انه اى حديث
كل قرض جر منفعة فهو ربا ۱۲ صح كما ذكره
الحافظ فى التلخيص ولم يرده عليهما
(۲۴۵ ج ۲) صحيح لاغبار عليه واما قول
الشوكانى فى النيل لاخبرة لهما بالفن
منشأه عدم الفهم لوجه قولهما فانهما
لم يصححاه على طريقة علم الاسناد بل
صححاه لتلقى الناس له بالقبول واتفاق
عملهم وفتاواهم عليه فافهم ولاتكن
من الغافلين والحديث اذا تلقاه الامة
بالقبول يصير بذلك مشهورا فوق
الآحاد حتى يجوز به الزيادة على الكتاب
كما صرح به الاصوليون فى غير ما
موضع هذا ومما يدل على كون
الربا غير البيع خلاف ما روى
الاوزاعى عن النبى صلى الله
عليه وسلم انه قال يأتى
على الناس زمان يستحلون
الربا بالبيع قال ابن القيم
والحديث وان كان مرسلا فانه

اجلہ صحابہ نے اس کی موافقت کی ہے، اور
فقہاء کے فتاوی اس کے مطابق ہیں، و صحابہ و
تابعین وغیرہ سب نے اس پر اجماع کر لیا ہے، کہ
قرض میں زیادتی یا نفع کی شرط لگانا ربا ہے جیسا
کہ عطاء، اور علامہ عینی اور ابن رشد مالکی اور ان کے
سوا دیگر علماء کے اقوال سے ثابت ہو چکا، اب
سمجھو کہ امام الحرمین اور غزالی نے جو حدیث
کل قرض جر نفعا الخ کو صحیح کہا ہے جیسا حافظ
ابن حجر نے تلخیص حبیر میں بلا تردید کے ذکر کیا ہے
ان کا قول بلا غبار صحیح ہے، اور علامہ شوکانی
نے جو اس قول کو یہ کہہ کر رد کیا ہے کہ ان دونوں
کو فن حدیث سے واقفیت نہیں، اس کا
منشا یہ ہے کہ شوکانی نے ان کی قول کی وجہ
نہیں سمجھی کیونکہ امام الحرمین و غزالی نے علم
اسناد کے طریقہ پر اس کی تصحیح نہیں کی، بلکہ
امت کی تلقی بالقبول اور فقہاء کے فتاوی
اور عمل کی موافقت کی وجہ سے اس حدیث
کو صحیح کہا ہے خوب سمجھ لو اور نادان نہ بنو،
اور جب امت کسی حدیث کو قبول کے ساتھ
تلقی کرے تو اس سے وہ حدیث درجہ آحاد سے
بڑھ کر مشہور ہو جاتی ہے یہاں تک کہ کتاب
اللہ پر اس سے زیادت جائز ہو جاتی ہے،
جیسا اصولیین نے مختلف مواقع میں اس کی
تصریح کی ہے، اور منجملہ ان دلائل کے
جن سے ربا اور بیع کا الگ الگ ہونا

صالح الاعتضاد به بالاتفاق وله من المسندات ما يشهد له كما في النيل (ص-۲۰ ج ۵) فلو كان الربا بيعا لم يكن لاستحلالهم بالبيع معنى فان الشئ انما يستحل باسم غيره من المباحات كما في الحديث عن ابي مالك الاشعري رضي الله عنه انه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول تشرب ناس من امتي الخمر يسمونها بغير اسمها يخسف الله بهم الارض ويجعل الله منهم القردة والخنازير رواه ابن ماجه وابن حبان في صحيحه. كما في الترغيب (ص ۳۱۴) فعلم بذلك ان الربا الحقيقي هو غير البيع واما البيوع التي عدها الشارع عليه السلام من الربا فهي ربا غير حقيقي الحقت بالحقيقي سد الذرائع وهذا هو الذي يدل عليه لفظ القرآن ذلك بانهم قالوا انما البيع مثل الربا واحل الله البيع وحرم الربا فانه مشعر بالتفرقة بينهما خلاف ما زعمه المستفتي من كون الربا من البيع ومعنى الاية واحل الله البيع لذاته الا ما حرم لعارض سد الذريعة الى الربا ۱۲ وحرم الربا لذاته (وهو ما تعارفه اهل الجاهلية ۱۲) فالربا والبيع شيئان مفترقان

معلوم ہوتا ہے وہ حدیث ہے جس کو اوزاعی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا جس میں وہ ربا کو بیع (کے نام) سے حلال کرلیں گے، ابن القیم کہتے ہیں کہ یہ حدیث اگرچہ مرسل ہی، مگر تائید کے لئے بالاتفاق قابل ہے اور اس کے معنی میں احادیث متصلہ بھی موجود ہیں آھ اس حدیث سے مستفتی کا یہ دعوی کہ ربا بیع میں منحصر ہے باطل ہوگیا، کیونکہ اگر ربا ہوتی تو بیع کے نام سے ربا کو حلال کرنے کے کیا معنی؟ قاعدہ تو یہ ہے کہ حرام شے کو دوسری مباح شے کے نام سے حلال کیا کرتے ہیں (خود اسی کے نام سے حلال نہیں کیا کرتے، کیونکہ اس کی حرمت تو معلوم ہے)، چنانچہ ابو مالک اشعری کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں بعض لوگ شراب پئیں گے اور اس کا نام کچھ اور رکھ لیں گے اللہ تعالی ان کو زمین میں دھنسا دیں گے اور ان میں سے بعض کو بندر اور سور کی شکل میں مسخ کردیں گے، الحدیث اس کو ابن ماجہ نے صحیح میں روایت کیا ہے یہی مطلب اس حدیث کا ہے کہ ربا کو بیع کے نام سے حلال کریں گے یعنی اسکا نام بدل دیں گے) اس سے معلوم ہوا کہ حقیقی ربا بیع سے الگ ہے

عہ منہ ما مر فی قول ابن القیم فی ص ۲ من ہذا الکتاب لفظ وقد ذکر الشارع ہذہ الحکمۃ بعینہا فانہ حرم سد الذریعۃ ربا النساء فقال فی تحریم ربا الفضل فانی اخاف علیکم الرماء والرماء ہو الربا آہ واللفظ رواہ مالک فی موطاہ عن عمر فیہ انی اخاف علیکم الرماء بالربا ص ۲۶ وہو

هذا حرام لذاته وهذا حلال لذاته فافهم فان الحق لایتجاوزعنه وهوالذی صرح به غیر واحد من العلماء کما تقدم،

اور جن بیوع کو شارع نے ربا میں شمار کیا ہے وہ حقیقی ربا نہیں بلکہ ان کو انتظام و سدباب کے لئے رباکے ساتھ لحق کیا گیا ہے الفاظ قرآن سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کفار کو یہ سزا اس لئے ملے گی کہ انھوں نے یوں کہا کہ بیع بھی تو ربا کے مشابہ ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال اور ربا کو حرام قرار دیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بیع اور ربا دونوں الگ الگ ہیں، اور مطلب یہ ہے کہ خدا نے بیع کو لذاتہ حلال کیا ہے (کسی عارض سے ممنوع ہو جائے تو اور بات ہے) اور ربا کو لذاتہ حرام کیا ہے، پس ربا اور بیع دونوں جدا جدا ہیں، یہ اپنی ذات سے حرام ہے اور وہ اپنی ذات سے حلال ہے خوب سمجھ لو کہ حق یہی ہے، اور اسی کو بہت سے علماء نے صاف صاف بیان کیا ہے، جیسا پہلے مفصل معلوم ہو چکا،

قال المستفتی اخراً اذاکان القرض عبادة وصدقة فحکم الاستیجار والاستنفاع علیه کحکم الاستیجار علی الصدقات والعبادات کالاستیجار علی تعلیم القران وتعلیم الفقه والحدیث والاستیجار[ع] علی قران للتراویح وسائر امور الدین من الوعظ والتذکیر والافتاء الخ[1] والجواب ان البحاث بارضنا لایستنسر وهذا کله من الاغلوطات والاباطیل التی لایلتفت الیها مسلم فی قلبه حب الله ورسوله ابدا فان القرض فی الاصل من المعاوضات ولذا ذکره الفقهاء فی المعاوضات والمعاملات لافی العبادات والطاعات وانما هو تبرع ابتداء فقط کما مر مفصلا وایضا

مستفتی نے اخیر بات یہ کہی ہے کہ جب قرض صدقہ اور عبادت ہے تو قرض کا کرایہ اور نفع لینا ایسا ہوا جیسا اور عبادات پر اجرت لینا، مثلاً تعلیم قرآن و تعلیم فقہ و حدیث اور تراویح[1] میں قرآن سنانے اور وعظ و نصیحت، فتویٰ دینے پر اجرت اور تنخواہ لینا (جائز ہے تو اسی طرح قرض پر کرایہ اور نفع لینا جائز ہو)، اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایسی کمزور بات نہیں چل سکتی یہ بیہودہ باتیں کسی اور کو سنانا جس مسلمان کے دل میں اللہ و رسول کی کچھ بھی محبت ہے وہ ان پر کان نہیں دھر سکتا، کیونکہ قرض در اصل عقود معاوضہ ہے اسی لئے فقہاء اس کو باب معاوضات و معاملات میں بیان کرتے ہیں، عبادات و طاعات کے باب میں بیان نہیں کرتے، ہاں صرف ابتداءً

ع لایخفی ما فیه فان الاستیجار علی قرآن التراویح لم یجوزه الحنفیة اصلا ۱۲ منه

[1] تراویح میں قرآن سنانے پر اجرت لینا حنفیہ متاخرین کے نزدیک بھی جائز نہیں اس کا ذکر مستفتی نے فضول کیا ۱۲ منه

فان حرمة الاستیجار علی الطاعات لیس
بمتفق علیہا بین الامة والائمة ولم یرد
فی حرمتہ نص قاطع بل النصوص فیہا مختلفة
بعضہا یقتضی حلہ وبعضہا حرمتہ قال النبی
صلی اللہ علیہ وسلم ان احق ما اخذتم علیہ
اجرا کتاب اللہ اخرجہ البخاری فی صحیحہ
عن ابن عباس مرفوعا وبہ احتج الائمة
الثلاثة علی جواز الاستیجار علی الطاعات
وحملوا ما یعارضہ ان ثبت علی من
تعین علیہ التعلیم ولذا افتی المتاخرون
من الحنفیة بقول الائمة الثلاثة فی مثل
ذلک لتعذر حفظ الدین والاحکام بدونہ
بخلاف الاستیجار والاستنفاع علی القرض
فحرمتہ متفق علیہا قد اجمعت الامة
والائمة علیہا کما قدمناہ مفصلا
فقیاس الحرمة المجمع علیہا علی
الحرمة المختلف فیہا قیاس مع الفارق
باطل لا محالة وانما افتی المتاخرون
من الحنفیة بجوازہ لضرورة دینیة
لما شاہدوا فی الناس من التکاسل
والتقاعد فی امور الدین وتعذر بقاء
الدین وحفظہ بدون الافتاء بمذہب
الغیر ولا ضرورة للدائن الی اجازة
الاستیجار علی القرض والاستنفاع
منہ بل فیہ توہین الاسلام وتحقیرہ

اس کو تبرع مانا گیا ہے جیسا اوپر مفصلا گذر
چکا، پس اس کو طاعات وعبادات پر قیاس کرنا
غلط ہے (۱) دوسرے یہ کہ طاعات مذکورہ پر
اجرت لینا تو ائمہ کے نزدیک بالاتفاق حرام
نہیں اور نہ اس کی حرمت میں کوئی نص قطعی وارد
ہوئی، بلکہ اس میں مختلف نصوص ہیں، بعض سے
اس کا جواز معلوم ہوتا ہے، اور بعض سے
حرمت، چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا ہے، کہ جن چیزوں پر تم اجرت لیتے ہو ان
میں سب سے زیادہ مستحق اجرت کا قرآن ہے اس کو
بخاری نے اپنی صحیح میں ابن عباس سے روایت
کیا ہے اور اسی سے ائمہ ثلاثہ (مالک وشافعی
واحمد) نے طاعات پر اجرت لینے کا جواز ثابت
کیا ہے، اور اس کے معارض روایات کو
بشرط ثبوت اس صورت پر محمول کیا ہے،
جبکہ وہ کام کسی خاص شخص پر منحصر ہوگیا ہو اور
اس کے سوا کوئی کرنے والا اس کام کا نہ ہو تو
اس کو اجرت لینا حرام ہے) تو چونکہ یہ حرمت
اتفاقی نہ تھی، اسی لئے حنفیہ نے اس مسئلہ
میں (ضرورت کے موقع پر) ائمہ ثلثہ کے قول
پر فتوی دیدیا ہے، کیونکہ بدون اس کے دین
اور احکام کی حفاظت دشوار ہوگئی تھی بخلاف
قرض پر کرایہ اور نفع لینے کے کہ اس کی حرمت
پر تمام ائمہ کا اور ساری امت کا اجماع ہو چکا
ہے. پس ایسی حرمت کو جو اجماعی ہے اس حرمت پر

فی عیون المخالفین وجعله اضحوکة بین
الانام فان حرمة هذا الاستیجار استقباحاً
مما جبلت علیه اهل الادیان کلها والناس
کلهم یعدونه ظلماً وعدواناً وینسبون
فاعله الی البخل الذی لاداء ادوء منه
ولا یرضی به الا طائفة قلیلة من الاغنیاء
الذین جمعوا المال وعددوه وقلیل
ماهم واما المعسرون والمفالیس وهم
اکثر الناس عدداً والموسرون الذین
لا یجمعون المال فلا یرضون بربا القرض
ابداً والواجب علی واضع القانون مراعاة
الاکثرین دون الاقلین فتحریم الربا
من محاسن الشریعة الاسلامیة و
مناقبها التی جذبت القلوب الیها
فالضرورة الدینیة داعیة الی تحریم
ذلک حرمة ابدیة والعجب
من المستفتی ومن جرأته علی الاجتهاد
من غیر علم کیف یرضی بجعل الاسلام
اضحوکة بین الانام وبدلته فی عیون
العقلاء اولی الافهام بتجویز الظلم الصریح
الذی لا یجوزه الا طائفة من اللئام
الطغام الذین قالوا انما البیع مثل
الربوا وذهلوا ان الله احل البیع
وحرم الربوا هذا ولنجیب بعد
ذلک عن الاسئلة التی عرضها

قیاس کرنا جو اختلافی ہے بیہودہ قیاس ہے
پھر حنفیہ متاخرین نے بعض طاعات پر اجرت
لینے کو محض دینی ضرورت سے جائز کیا ہے،
جب کہ انھوں نے مسلمانوں کے اندر دین کے
کاموں میں سستی اور کاہلی دیکھی، اور دین کا
بقاء اور اس کی حفاظت دشوار ہوگئی، اس لئے
اپنے مذہب کے خلاف دوسرے اماموں کے
مذہب پر فتویٰ دیدیا گیا اور قرض پر کرایہ
اور نفع لینے کو جائز کرنے میں دینی ضرورت
کچھ بھی نہیں، بلکہ اس کو جائز کرنے میں تو
مخالفین کی نظروں میں اسلام کی توہین و
تذلیل ہے، اور اسلام کو غیر قوموں کے
استہزاء کا تختۂ مشق بنانا ہے، کیونکہ قرض
پر کرایہ اور نفع لینا عام طور پر تمام اہل
ادیان کے نزدیک قبیح ہے، سب لوگ اس کو
ظلم و تعدی سمجھتے ہیں، اور ایسا کرنے والے کو
بخل سے بدنام کرتے ہیں، جس سے بڑھ کر
کوئی عیب نہیں اور اس فعل سے بجز سرمایہ داروں
کے جن کے پاس بہت مال و دولت جمع ہے
اور کوئی خوش نہیں ہوتا اور سرمایہ داروں
کی شمار دنیا میں بہت کم ہے، رہ گئے مفلس
اور تنگدست اور زیادہ شمار انہی کی ہے
نیز وہ اغنیاء جو مال کو جمع نہیں کرتے وہ اس
سے ہرگز خوش نہیں ہوتے (کہ قرض پر کرایہ
اور نفع لیا جائے) اور واضع قانون پر

علینا المستفتی فی خاتمۃ الکتاب مع الجواب والی اللہ المشتکی من تخلیطہ ولبسہ الحق بالباطل والخطاء بالصواب۔

لازم یہ ہے کہ رعایا کے زیادہ افراد (کے نقصان) کی رعایت کرے نہ کہ اقل کی، پس ربا کا حرام کرنا شریعت اسلامیہ کے ان محاسن میں سے ہے جس نے قلوب کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔

پس ضرورت دینیہ کا تقاضا تو یہ ہے کہ ربا القرض کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام کردیا جائے ہم کو مستفتی کی اس جرأت اور بیباکانہ اجتہاد پر حیرت ہے کہ وہ اسلام کو دنیا کے تمسخر کا تختۂ مشق بنانے اور عقلاء کی نظروں میں اسے ذلیل کرنے پر کیونکر راضی ہوگیا کہ ایسے صریح ظلم کو جائز کرنا چاہتا ہے جس کو بجز ایک کمینہ جماعت کے جس کا خیال یہ ہے کہ بیع بھی تو ربا کے مثل ہے اور کسی نے جائز نہیں سمجھا، مگر یہ لوگ اس بات کو بھول گئے کہ خدا تعالےٰ نے بیع کو تو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام، خوب سمجھ لو۔

اس کے بعد ہم مستفتی کے اُن سوالات کا نمبروار جواب دینا چاہتے ہیں جو اس نے خاتمہ کتاب میں مع جواب کے لکھے ہیں، اور اس میں اس نے جس قدر تلبیس و تخلیط سے کام لیا ہے اور صواب کو خطا کے ساتھ مشتبہ کردیا ہے، اس کی فریاد ہم صرف خدا ہی سے کرتے ہیں۔

۱۔ فنقول لفظ الربا فی اٰیۃ احل اللہ البیع وحرم الربوا لیس بمجمل عم قابل کانت العرب تعرفہ وتفعلہ قبل نزول الاٰیۃ وکذلک اھل الکتاب فان اللہ تعالیٰ قد ذم المشرکین واھل الکتاب بأکلھم الربوا وقد نھوا عنہ ولم یکونوا یعرفون حدیث عبادۃ ولا غیرہ کما ھو مصرح فی قولہ فان تبتم فلکم رؤس اموالکم وھو یقتضی وقوع الربا قبل نزول الاٰیۃ حتماً والسنۃ متاخرۃ عن الاٰیۃ قطعاً فلو کانت لفظۃ الربا فی القراٰن مجملۃ لا بیان لھا الا بالسنۃ لکان اکلھم

(۱) پہلا سوال یہ ہے کہ آیت احل اللہ البیع وحرم الربوا میں لفظ ربا مجمل ہے یا نہیں خصوصاً حنفیہ کے نزدیک اور مجمل ہے تو اس کی تفسیر قرآن وحدیث میں کیا بیان ہوئی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ ربا عرفِ عرب میں مجمل نہیں، بلکہ اہل عرب واہل کتاب سب کے سب اس آیت کے نزول سے پہلے ربا کو جانتے اور اس کا لین دین کرتے تھے، حالانکہ وہ حدیث ابوسعید وعبادہ کو جانتے بھی نہ تھے، چنانچہ اہل کتاب کی مذمت آیت لاکلھم الربا وقد نھوا عنہ میں موجود ہے (کہ اہل کتاب سود کھاتے ہیں حالانکہ ان کو اس سے منع کیا گیا ہے)

الربوا قبل نزول الآية وقبل معرفتهم
بالسنة مستحيلا ولا يقول بذلك
ولا يحمل كلام العلماء عليه الا من
اعمى الله قلبه وجعل على بصره غشاوة
بل مراد من قال بالاجمال فيها ان
لفظ الربوا معروف المعنى وظاهر
المراد عند اهل العرب ولكنه صار
مجملا لما الحق الشارع به بعض
مالم يكن العرب يعرفه بالربا قال
صلى الله عليه وسلم الربا ثلث وسبعون
بابا كما تقدم وقد ذهب الطحاوي
من الحنفية وهو اعرف الناس
بمذهبهم ومذاهب العلماء الى
ان ربا القرآن غير ربا السنة كما
قدمناه فالقول بان الربا المذكور
مجمل عند الاحناف وغيره من
الائمة حتى يصح ان يقال اتفقت
عليه الامة كما قاله المستفتي من
باطل قطعا كيف وقد صحح ابن العربي
المالكي في احكام القرآن له كونه غير
مجمل كما مر مفصلا ولو سلمنا
كونه مجملا لا نسلم ان بيانه حديث
الذهب بالذهب والفضة بالفضة
الخ فقط بل بيانه هذا وحديث كل
قرض جر منفعة الخ وانما الربا في النسيئة - ايضا

اور فان تبتم فلکم رؤس اموالکم سے بھی معلوم
ہوتا ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے مشرکین
میں ربا کا لین دین تھا، اور یقیناً حدیث ابو
سعید و عبادہ اس آیت کے بعد ارشاد ہوئی
ہے، تو اگر قرآن میں لفظ ربا مجمل ہوتا کہ اس کے
معنی بدون حدیث کے سمجھ میں نہیں آسکتے تو
اہل کتاب و مشرکین میں نزول آیت سے پہلے
ربا کا لین دین بدون جانے بوجھے کیونکر ہوتا،
اور جن لوگوں نے آیتِ ربا کو مجمل کہا ہے ان کا
مطلب یہ ہے کہ لفظ ربا کے معنی عرف عرب میں
تو ظاہر تھے، مگر جب شارع نے اس کے ساتھ
معاملات کی بعض وہ صورتیں بھی لاحق کر دیں
جن کو اہل عرب ربا نہ سمجھتے تھے۔ جیسا کہ حضور
کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ ربا
کے تہتر شعبے ہیں، اس وقت اس لفظ میں
معنی شرعی کے لحاظ سے اجمال آگیا، اور
امام طحاوی جو حنفیہ کے مذہب اور دیگر
علماء کے مذاہب سب سے زیادہ جانتے
ہیں۔ اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن میں
جس ربا کا ذکر ہے وہ اس ربا کے علاوہ
ہے جس کا حدیث میں بیان ہے (اس سے
صاف معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک ربا قرآنی
مجمل اور حدیث اس کا بیان نہیں، ورنہ
دونوں متحد ہوتے ۱۲) پس مستفتی کا یہ قول کہ
ربا مذکور در قرآن احناف اور ان کے

سواد دیگر ائمہ کے نزدیک بھی مجمل ہے، حتیٰ کہ یہ کہنا صحیح ہے کہ امت نے اس پر اتفاق کر لیا ہے آہ باکل باطل ہے اور کیونکر نہ ہو جب کہ علامہ ابن العربی مالکی نے صاف کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ قرآن میں لفظ ربا مجمل نہیں، اور اگر ہم اس کو مجمل بھی مان لیں تو ہم کو یہ مسلم نہیں کہ اس کا بیان صرف ابو سعید و عبادہ ہی کی حدیث ہے (جو بیع کے متعلق ہے) بلکہ اس کے ساتھ حدیث کل قرض جر منفعۃ فہو ربا اور حدیث انما الربا فی النسیئہ بھی اس کا بیان ہے (اور سب کے ملانے سے حاصل یہ ہوا کہ ربا بیع میں بھی ہوتی ہے، اور قرض میں بھی جس سے مستفتی کا یہ دعویٰ باطل ہو گیا، کہ ربا صرف بیع میں منحصر ہے ۱۲)

۲۔ الربا ان یؤخذ للاجل عوض، هذا هو الربا الحقیقی الذی کان العرب یعرفه بالربا صرح به الجصاص فی احکام القرآن له ص۴۶۴ والطحاوی فی معانی الآثار ص۲۳۳ ج ۲ بلفظ فیکون مشتریا للاجل بمال اه واتفقت الآثار علی کونه ربا اهل الجاهلیة الذی نهی الله عنه کما ذکره مالک فی المؤطا وابن جریر فی تفسیره و اتفق العلماء علی ذلک ایضا کما حکاه ابن رشد المالکی فی بدایة المجتهد له واما ما ذکره الفقهاء ان الربا هو الفضل الخالی عن العوض فی البیع فهو حد لربا البیع الذی هو ربا السنة اویقال ان زیادة لفظ البیع فیه تمثیل ولیس للحصر کما تقدم بیان ذلک عن ابن عابدین وغیره۔

۲۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ ربا کی حقیقت قرآن اور صحیح احادیث سے بتلاؤ، اس کا جواب یہ ہے کہ ربا کی حقیقت یہ ہے کہ اجل اور مدت کا معاوضہ لیا جائے حقیقی ربا جس کو اہل عرب ربا سمجھتے تھے یہی ہے، جصاص نے احکام القرآن میں اور طحاوی نے معانی الآثار میں اس کی تصریح کی ہے، اور آثار سب اس پر متفق ہیں کہ اہل جاہلیت کی ربا جس سے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں منع فرمایا ہے یہی ہے جیسا مؤطا، مالک و تفسیر ابن جریر طبری کی روایات سے واضح ہے، اور علماء نے بھی اسی پر اجماع کیا ہے، جیسا ابن رشد مالکی نے بدایۃ المجتہد میں بیان کیا ہے، اور فقہاء نے جو ربا کی تعریف ان لفظوں سے بیان کی ہے کہ ربا وہ زیادت ہے جو بیع میں عوض سے خالی ہو یہ ربا غیر حقیقی کی تعریف ہے، یعنی ربا البیع کی، یا یوں کہا جائے کہ اس میں بیع کا لفظ تمثیل کے طور پر ہے حصر کے لئے نہیں جیسا علامہ شامی وغیرہ کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ الفضل المشروط فی القرض

۳۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ قرض میں خاص

ربا منصوص وهو الربا الحقيقي الذي
كانت العرب تعرفه بالربا ونهى عنه
القرآن دون ربا البيع الذي ورد بيانه
في السنة فان العرب لم يكن تعرفه
ربا صرح به الجصاص وغيره من
العلماء كالطحاوي وابن الهمام
وابن رشد والفخر الرازي وغيرهم
ودل عليه الآثار الواردة في
تفسير ربا الجاهلية،

۴۔ الدليل على حرمة الفضل المشروط
في القرض اجماع العلماء على ان ربا الجاهلية
الذي نهى الله عنه في القرآن بقوله واحل
الله البيع وحرم الربا هو هذا الفضل
المشروط في القرض والدين كما تقدم تفصيله
مستوفيً وقال الهيتمي في الزواجر (ص ۱۰۰
ج ۱) وهو اي الربا ثلثة انواع ربا الفضل
وهو البيع مع زيادة احد العوضين المتفق
الجنس على الآخر وربا اليد وهو البيع مع تاخير
قبضهما او قبض احدهما عن المجلس
بشرط اتحادهما علة وان اختلف الجنس
وربا النساء وهو البيع للمطعومين وللنقدين
المتفقي الجنس او المختلفيه لاجل وزاد
المتولي نوعا رابعا وهو ربا القرض ولكنه في
الحقيقة يرجع الى ربا الفضل لانه الذي فيه
شرط يجر نفعا للمقرض فكانه اقرضه هذا الشيء

مقدار نفع کی مشروط ہو تو یہ ربا منصوص ہے، یا
غیر منصوص، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ربا منصوص
وقطعی ہے بلکہ حقیقی ربا جس کو اہل عرب ربا جانتے
تھے، یہی ہے، اور ربا البیع جس کا ذکر حدیث میں
ہے ان کے نزدیک ربا نہ تھی، جیسا امام جصاص
وعلامہ طحاوی وابن الہمام وابن رشد وفخر رازی
وغیرہم کی تصریح سے اوپر معلوم ہو چکا ہے،
اور ربا جاہلیت کی تفسیر میں جو آثار وارد
ہیں وہ بھی یہی بتلاتے ہیں۔

۴۔ چوتھا سوال یہ ہے کہ قرض میں
نفع کی شرط لگانا اگر ربا ہے تو فقہاء کے نزدیک
اس کے ربا ہونے کی دلیل معتبر کیا ہے اس کا جواب
یہ ہے کہ اس کے ربا ہونے کی دلیل علماء کا اس بات
پر اجماع کرنا ہے کہ جس ربا جاہلی کو اللہ تعالیٰ نے
اپنے ارشاد واحل اللہ البیع وحرم الربا میں حرام
کیا ہے وہ یہی ہے کہ قرض ودین میں نفع کی اور
زیادہ وصول کرنے کی شرط کی جائے، جیسا اوپر
تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا، علامہ ابن حجر ہیتمی
نے کتاب الزواجر میں ربا کی چار قسمیں، ربا الفضل
ربا الید، ربا النساء، ربا القرض بیان کرکے
فرمایا ہے، کہ یہ چاروں قسمیں بالاجماع آیات
مذکورہ واحادیث آئندہ کی نصوص سے حرام
ہو چکی ہیں، اور جتنی وعیدیں ربا کے متعلق وارد
ہوئی ہیں، وہ ان چاروں قسموں کو شامل ہیں،
اور زمانہ جاہلیت میں ربا الفضل ہی مشہور تھی،

بمثله مع زیادة النفع الذی عاد الیه فکل من
هذه الانواع الاربعة حرام بالاجماع بنص
الاٰیات المذکورة والاحادیث الاٰتیة وکل
ما جاء من الوعید شامل للانواع
الاربعة وربا النسیئة
هو الذی کان مشهورا فی الجاهلیة
لان الواحد منهم کان یدفع ماله لغیره
الی اجل علی ان یاخذ منه کل شهر قدرا
معینا ورأس المال باق بحاله فاذا حل
طالبه برأس ماله فان تعذر علیه الاداء
زاد فی الحق والاجل وهذا النوع مشهور
الاٰن بین الناس وواقع کثیرا وکان ابن
عباس رض لا یحرم الا ربا النسیئة
محتجا بانه بینهم فینصرف النص الیه لکن
صحت الاحادیث بتحریم الانواع الاربعة
السابقة من غیر طعن ولا نزاع لاحد
فیها ومن ثم اجمعوا علی خلاف قول
ابن عباس علی انه رجع عنه اھ. قال المستفتی
النفع المشروط فی القرض لما لم یثبت کونه
ربا بالقراٰن وبالحدیث استدل علی کونه
ربا تارة بالقیاس وتارة بحدیث کل قرض
جر نفعا الخ ۱۲ قلت ان اراد بالنفع المشروط
اشتراط الجودة والسمعة ونحوها او اشتراط
الاداء ببلد المقرض ونحوه فاستدلال
الفقهاء علی حرمته بهذا الحدیث مسلم

جس کی صورت یہ تھی کہ ایک شخص اپنا مال دوسرے
کو مدت معینہ کے لئے اس شرط پر قرض دیتا
تھا کہ ہر مہینہ کچھ رقم معین اس سے لیتا رہیگا
اور اصل مال بدستور اپنے حال پر قائم رہے گا،
پھر جب مدت پوری ہو جاتی اس سے رأس المال
کا مطالبہ کرتا، اگر وہ ادا نہ کر سکتا تو رأس المال
کو بڑھا کر مدت میں توسیع کر دی جاتی اور یہ صورت
آجکل بھی بہت مشہور اور کثیر الوقوع ہے، اور
ابن عباس رضی اللہ عنہ صرف (اسی صورت کو
یعنی) ربا النسیۂ کو حرام کہتے تھے، اور دلیل بیان
کرتے تھے کہ اہل عرب میں متعارف یہی ہے اس لئے
نص اسی کی طرف راجع ہوگی، مگر چونکہ صحیح احادیث
مذکورہ بالا چاروں قسموں کی حرمت ثابت ہو چکی
ہے، جن میں نہ کسی کو (سند پر) طعن ہے اور نہ
(معنی میں) کچھ نزاع ہے، اسی لئے علماء نے ابن
عباس کے قول کے خلاف (سب کی حرمت)
پر اجماع کر لیا ہے، علاوہ ازیں یہ کہ ابن عباس
نے بھی اپنے قول سے رجوع کر لیا ہے (وہ بھی
چاروں کی حرمت کے قائل ہو گئے) اس سے
معلوم ہوا کہ قرض میں جو نفع اور زیادتی مشروط
ہو وہ بھی ربا منصوص ہے اس کی حرمت پر بھی
اجماع ہے، اور اس کلام سے ہمارے اس دعویٰ کی
بھی تائید ہوگئی کہ لفظ ربا عرفاً مجمل نہیں البتہ
شرعاً جب اس کو انواع اربعہ کے لئے عام کیا
گیا تو اس میں اجمال پیدا ہو گیا، پس جو صورت

وقد قدمنا انہ حدیث تلتقی الامۃ لہ بالقبول وان کان حسنا لغیرہ من حیث الاسناد ولا حاجۃ الی القیاس بعد وجود النص وربما یذکر الفقہاء العلۃ القیاسیۃ مع وجود النص تائیدا لہ لا احتجاجہ کما ھو داب صاحب الھدایۃ والبدائع والطحاوی وغیرھم فمن فہم من ذلک کون الحکم قیاسا فقد خلع ربقۃ الفقہ عن عنقہ،

ربا کی اس آیت کے نزول سے پہلے متعارف تھی اس کی حرمت پر یہ آیت سب سے پہلے دال ہے، اور دوسری صورتوں کی حرمت پر بعد میں یا ان کی حرمت صرف احادیث واجماع ہی سے ثابت ہے، اس کے بعد مستفتی کہتا ہے کہ قرض کے نفع مشروط کا ربا ہونا چونکہ قرآن وحدیث سے ثابت نہیں اس لئے اس کی حرمت کو کبھی تو قیاس سے ثابت کیا گیا۔ اور کبھی حدیث کل قرض جر نفعاً سے میں کہتا ہوں کہ اگر نفع مشروط سے اسکی مراد وصف جودت وسکہ وغیرہ کی شرط ہے

جب تو یہ مسلم ہے کہ فقہاء نے اس کی حرمت کو حدیث کل قرض جر نفعا سے ثابت کیا ہے اور ہم بتلا چکے ہیں کہ یہ حدیث تلقی بالقبول کی وجہ سے صحیح ہے گو سند کے لحاظ سے حسن لغیرہ ہے اور نص کے ہوتے ہوئے قیاس کی کچھ ضرورت نہ تھی، مگر فقہاء کی عادت ہے کہ وہ نص کے ہوتے ہوئے بھی تائید کے طور پر قیاسی علت بیان کر دیتے ہیں، جیسا کہ صاحب ہدایہ وصاحب بدائع وامام طحاوی کا طرز ہے اس سے حکم کو قیاسی سمجھ لینا فقہ سے نابلد ہونے کی دلیل ہے۔

لکون ذلک مفضیا الی ان لا یوجد حکم منصوص فی الشرع اصلا فانھم کلا یذکرون النص فی مسئلۃ الا ویذکرون معہ علۃ قیاسیۃ ایضا وان اراد بالنفع المشروط الفضل والزیادۃ المشروطۃ فیہ وزنا او عددا فقولہ انھم یستدلون علی کونہ ربا تارۃ بالقیاس وتارۃ بحدیث کل قرض جر منفعۃ غیر مسلم بل باطل قطعا فان دلیلہ عندھم الاجماع علی حرمتہ وکونہ من ربا الجاھلیۃ

کیونکہ اس سے تو یہ لازم آئیگا کہ شریعت میں حکم منصوص ایک بھی نہ ہو، کیونکہ صاحب ہدایہ تو ہر مسئلہ میں نص بیان کرنے کے بعد علت قیاسیہ بھی ضرور بیان کرتے ہیں، اور اگر نفع مشروط سے مراد وہ زیادتی ہے جو وزن اور عدد میں قرض سے زائد ہے جائے تو اس کے متعلق یہ مسلم نہیں کہ فقہاء اس کی حرمت کو کبھی قیاس سے ثابت کرتے ہیں کبھی حدیث کل قرض جر نفعاً الخ سے بلکہ یہ قول قطعاً باطل ہے، کیونکہ اس کی حرمت کی بڑی

الذی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مع
الآثار الواردة فی تفسیر ربا
الجاهلية كما تقدم و انما ذكرون
هذا الحديث والقياس تائیدا
قال المستفتی ولو سلم صحة
القياس ففيه ان الاحكام
القياسية تقبل التغير بتغير الازمان اھ
(۲۵) قلت هذا كله بناء الفاسد على
الفاسد فقد بينا ان حرمة الفضل
المشروط فی القرض ليست بقياسية
بل هی منصوصة و مجمع عليها بين
الامة والائمة كلهم وايضا نقول ان
الاحكام القياسية تقبل التغير بتغير
الازمان على الاطلاق باطل بل اذا
تغيرت العلة بتغير الزمان ومثل ذلك
يقبله الحكم المنصوص ايضا كما فی خروج
النساء الى الاعياد والجمعات والجماعات
فكان جائزا فی الصدر الاول ای زمان
النبی صلى الله عليه وسلم لعلة الامن
من الفساد الا نادرا ثم تغير الحكم
بتغير الزمان لتغير العلة وكوقوع
الطلقة الواحدة بقول الرجل لمدخول
بها انت طالق، طالق، طالق، فی الصدر
الاول لعلة سلامة الصدر وصدق
اللسان وقلة الافتراق اذ ذاك فاذا

دلیل تو امت کا اس کی حرمت پر اجماع ہے
اور اس امر پر اتفاق کرنا کہ جاہلی ربا جس سے
اللہ تعالیٰ نے قرآن میں منع فرمایا ہے یہی ہے (کہ
قرض میں نفع اور زیادت کی شرط کی جائے)
نیز وہ آثار بھی جن میں ربا جاہلی کی تفسیر وارد
ہے اس کی حرمت پر دال ہیں اور اس حدیث
اور قیاس کا ذکر تو محض تائید کے درجہ میں کیا
جاتا ہے، اس کے بعد مستفتی نے علت قیاسیہ
ذکر کر کے اس پر اعتراض کیا، پھر کہا کہ اگر اس
قیاس کو صحیح بھی مان لیا جائے تو احکام قیاسیہ
تغیر زمانہ سے تغیر پذیر ہو سکتے ہیں، میں کہتا ہوں
یہ تمام تر گفتگو بناء الفاسد علی الفاسد ہے کیونکہ
ہم بتلا چکے ہیں کہ قرض میں نفع اور زیادتی لینا نص
سے حرام ہے ائمہ نے اور امت نے اس کی حرمت پر اتفاق
کر لیا ہے، قیاس پر اس کی حرمت کا مدار نہیں پھر
مستفتی کا علی الاطلاق یہ دعویٰ کرنا کہ احکام
قیاسیہ تغیر زمانہ سے تغیر پذیر ہو سکتے ہیں، بالکل
غلط ہے بلکہ احکام قیاسیہ میں تبدل زمانہ سے تغیر
اس وقت ہوتا ہے جبکہ تغیر زمانہ سے علت حکم بدل جائے
اور ایسا تغیر تو احکام منصوصہ میں بھی ہو جاتا ہے
دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں
عورتوں کو جمعہ اور جماعات اور عیدین کی نماز
کے لئے گھر سے نکلنا جائز تھا، کیونکہ اس وقت
فساد کا اندیشہ غالب نہ تھا، پھر جب تغیر زمانہ سے
یہ علت بدل گئی (اور فساد کا اندیشہ غالب ہو گیا)

قال الرجل ما اردت به الا واحدة
قبل قوله قضاء ودیانة ثم لما تتابع
الرجال فی الطلاق ولم یبق فیهم سلامة
الصدر وصدق اللسان کما کان قبل
قضی عمر بایقاع الثلث قضاءً وان لا
یقبل نیته الواحدة الا دیانة،

توحکم بھی بدل گیا، اسی طرح صدر اول میں منکوحہ
مدخول بہا کو انت طالق طالق طالق کہنے سے
ایک ہی طلاق پڑتی تھی جب کہ مرد یہ دعویٰ
کرے کہ میں نے ایک طلاق کی نیت کی تھی کیونکہ
اس وقت قلوب میں سلامتی تھی، زبان میں سچائی
تھی، اور طلاق کے واقعات کم ہوتے تھے
اس لئے مرد کا قول قضاءً بھی قبول تھا، اور دیانۃً بھی، پھر جب طلاق کی کثرت ہونے لگی اور
قلوب میں سلامتی اور زبان میں سچائی پہلے سے کم ہوگئی تو حضرت عمرؓ نے اس صورت میں تین طلاق
ہونے کا فیصلہ فرمایا، اور اب مرد کا یہ دعویٰ کہ میں نے تو ایک طلاق کی نیت کی تھی صرف دیانۃً
معتبر ہے قضاءً معتبر نہیں،

ومن زعم ان الاحکام القیاسیة تتغیر
بتغیر الزمان مع بقاء العلة فقد افتریٰ
علی الائمة کذبا ولیس منه الافتاء بمذهب
غیر امامه فی مسئلة للحاجة فبذلك لم یتغیر
مذهب الامام بتغیر الزمان بل هو علی حاله
وانما غایته ترك تقلید الامام فی
المسئلة واختیار قول الاخرین من المجتهدین
فیها لکون اختلاف الامة رحمة فلم یتغیر
الحکم وانما تغیر التقلید واما ما نقله المستفتی
هنالك فی الحاشیة عن بعض الفقهاء من اعتبار
العرف والزمان واختلاف الاحکام باختلافه
فانه لم یدرك مرادهم ولم یفهم حق
الفهم وحاصل ما ذکروه ان ما کان من
الاحکام مبنیا علی الالفاظ المتعارفة کالیمین
والطلاق فلا بد فیه من اعتبار عرف کل قوم فی کل

اور جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ احکام قیاسیہ باوجود
بقاء علت کے بھی تغیر زمانہ سے تغیر پذیر ہو جاتے
ہیں، وہ ائمہ پر افترا کرتا ہے اور کسی مسئلہ میں ضرورت
کے وقت اپنے امام کے مذہب کو چھوڑ دینا دوسری
بات ہے، اس کو تغیر حکم بتغیر زمان میں داخل نہیں
کر سکتے، کیونکہ اس صورت میں امام کا مذہب
تو تغیر زمانہ سے متغیر نہیں ہوا، بلکہ وہ تو اپنے حال
پر بدستور باقی ہے، ہاں یوں کہو کہ تم نے اختلاف
علماء کو رحمت سمجھ کر اس مسئلہ میں اپنے امام کا قول
چھوڑ کر دوسروں کا قول اختیار کر لیا ہے ایسے
حکم میں تغیر نہیں ہوا، بلکہ تمہاری تقلید میں ہوا،
مستفتی نے اس مقام پر حاشیۂ کتاب میں کچھ
اقوال فقہاء کے اس باب میں نقل کئے ہیں کہ احکام
میں عرف وزمان کا لحاظ بھی ہوتا ہے، اور عرف
وزمان کے تغیر سے احکام بدل جاتے ہیں، مگر وہ

زمان فلو قال لا اضع قدمی فی دار فلان و
المتعارف عندهم به الدخول یحکم بالحنث
بالدخول لا بوضع القدم من غیر الدخول وقس
علی ذلک الفاظ الطلاق وغیرہ فلو تعارف
قوم بلفظ الطلقة البتة الثلثة المغلظة یفتی
بوقوع الثلث حتما وما کان منها لا یبتنی علی
الالفاظ المتعارفة بل علی الدلائل الفقهیة
فاختلفوا فی کون العرف دلیلا لها او لا فزعم
بعضهم ان تعارف المسلمین عملا فی دیارهم
من زمان من غیر نکیر دلیل ایضا علی جوازہ
شرعا لکونه داخلا فیما راہ المسلمون حسنا
ولکونه نوعا من انواع الاجماع العملی ولا
شک فی ان تعامل الصحابة وتعارفهم
عملا من غیر نکیر حجة لکونهم عدولا خیارا
لا یخالفون النص فی عملهم عملا اصلا و
اما تعامل غیرهم لا سیما تعامل من بعد
القرون الثلثة المشهودة لها بالخیر ففی
اعتبارہ تفصیل ذکرہ ابن عابدین فی رسالته
نشر العرف والعجب من المستفتی انه ذکر
منه شیئا یسیرا وترک منه ما یخالفه وهل
هذا الا اتباع الهوی الذی من اتبعه
فقد غوی وهل هذا الا لبس الحق بالباطل
وبیع العاجل بالآجل اعاذنا الله منه قال
ابن عابدین رح قد صرحوا بان الروایة
اذا کانت فی کتب ظاهر الروایة

ان کا مطلب نہیں سمجھا، فقہاء کے اقوال کا حاصل
تو صرف اس قدر ہے کہ احکام کی دو قسمیں ہیں، بعض
وہ ہیں جو الفاظ متعارفہ پر مبنی ہوتے ہیں، جیسے
یمین وطلاق وغیرہ ان میں تو ہر قوم کا عرف
ہر زمانہ میں قابل اعتبار ہے، مثلاً اگر کوئی یوں
کہے کہ فلاں شخص کے گھر میں قدم نہ رکھوں گا
اور عرفاً اس کے معنی یہ ہیں کہ گھر میں داخل ہونگا
تو اگر وہ بدون قدم رکھے گھر میں داخل ہو جائے
(مثلاً کسی آدمی یا جانور پر سوار ہو کر جائے)
تو قسم ٹوٹ جائے گی، اور اگر قدم رکھدے مگر
دخول نہ پایا جائے (مثلاً ایک پیر باہر رہے)
تو قسم نہ ٹوٹے گی، اسی طرح اگر کسی قوم کے عرف
میں لفظ البتہ سے تین مغلظ طلاق مفہوم ہونے
لگیں تو اس سے تین طلاق واقع ہو جانے کا فتویٰ
دیا جائے گا، اور بعض احکام وہ ہیں جو الفاظ متعارفہ
پر مبنی نہیں، بلکہ دلائل فقہیہ پر مبنی ہیں، ان کے
بارے میں فقہاء کے درمیان گفتگو ہوئی ہے، کہ جیسے
کتاب وسنت واجماع وقیاس ان احکام کیلئے
دلائل ہیں اسی طرح عرف اہل اسلام بھی ان احکام
کی دلیل بن سکتا ہے، یا نہیں تو بعض کا قول یہ ہے
کہ اہل اسلام کے درمیان کسی عمل کا ایک زمانہ سے
بلا خلاف متعارف ہو جانا بھی اس عمل کے جائز
ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ وہ ما رآہ المسلمون
حسنا میں داخل ہے، دوسرے یہ تعارف بھی اجماع
عملی کی ایک قسم ہے، اور اس میں تو شک نہیں

لا یعدل عنہا الا اذا صحح المشائخ غیرہا کما اوضحت ذلک فی شرح الارجوزۃ فکیف یعمل بالعرف المخالف لظاہر الروایۃ وایضا فان ظاہر الروایۃ قد یکون مبنیا علی صریح۔

کہ کسی عمل پر حضرات صحابہ کا بلا نکیر تعامل و تعارف ہونا تو واقعی حجت ہے کیونکہ یہ حضرات سب نیک عادل و متقی تھے، وہ عمداً نص کے خلاف تعامل نہیں کر سکتے تھے، اور صحابہ کے سوا دوسروں کا تعامل خصوصاً ان لوگوں کا تعامل جو تابعین و تبع تابعین کے بھی بعد ہوئے ہیں اس کے معتبر وغیر معتبر ہونے میں تفصیل ہے، جس کو علامہ شامی نے اپنے رسالہ نشر العرف میں بیان کیا ہے، ہم کو مستفتی پر تعجب ہے کہ اس نے اس رسالہ کی مختصر سی عبارت نقل کر کے اپنے خلاف مطلب مضمون کو چھوڑ دیا تو کیا اسی کا نام اتباع ہوی نہیں جس کا انجام گمراہی ہے، اور کیا اس کو تلبیس بالباطل نہ کہا جائے گا جو اس مثل کا مصداق ہے، کہ "از بہر دنیا دہد دین بباد" نعوذ باللہ منہ علامہ ابن عابدین (اپنے اس رسالہ میں) فرماتے ہیں کہ فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے کہ جب کوئی مسئلہ ظاہر روایت میں موجود ہو اس کو ترک نہیں کیا جا سکتا، مگر جب تک مشائخ نے اس کے خلاف کو صحیح کہا ہو، پھر جو عرف ظاہر روایت کے خلاف ہو اس پر کیونکر عمل کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ظاہر روایت کبھی نص صریح پر مبنی ہوتی ہے۔

من الکتاب او السنۃ او الاجماع ولا اعتبار للعرف المخالف للنص لان العرف قد یکون علی باطل بخلاف النص کما قالہ ابن الہمام وقد قال فی الاشباہ العرف غیر معتبر فی المنصوص علیہ قال فی الظہیریۃ من الصلوۃ وکان محمد بن الفضل یقول السرۃ الی موضع نبات الشعر من العانۃ لیست بعورۃ لتعامل العمال فی الابداء عن ذلک الموضع عند الاتزار وفی النزع عن العادۃ الظاہرۃ نوع حرج وھذا ضعیف وبعید لان

خواہ قرآن کی آیت ہو یا حدیث ہو یا اجماع اور جو عرف نص کے خلاف ہو وہ ہرگز معتبر نہیں کیونکہ عرف بعض دفعہ ناحق بھی ہوتا ہے، اور نص حق کے خلاف نہیں ہو سکتی، جیسا ابن ہمام نے فرمایا ہے، اور اشباہ میں ہے کہ مسئلہ منصوصہ میں عرف کا کچھ اعتبار نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ ظہیریہ میں علامہ محمد بن فضل کا یہ قول کہ ناف اور بیڑو کا درمیانی حصہ جو موئے زہار[1] سے خالی ہے ستر میں داخل نہیں، کیونکہ مزدوری کرنے والے مسلمانوں کا تعامل یہ ہے کہ وہ لنگی باندھتے ہوئے اس جگہ کو نہیں چھپاتے، اور لوگوں کو ان کی عادت سے

[1] موئے زہار زیر ناف بال ۱۲ س

التعامل بخلاف النص لا یعتبر و فی الاشباہ ایضا الفائدۃ الثالثۃ المشقۃ والحرج انما یعتبران فی موضع لا نص فیہ واما مع النص بخلافہ فلا الی ان قال ننقول ان العرف نوعان خاص وعام وکل منہما اما ان یوافق الدلیل الشرعی و المنصوص علیہ فی کتب ظاہر الروایۃ اولا فان وافقہما فلا کلام والا فاما ان یخالف الدلیل الشرعی او المنصوص علیہ فی المذہب فنذکر ذلک فی مابین الباب الاول اذا خالف العرف الدلیل الشرعی فان خالفہ من کل وجہ بان لزم منہ ترک النص فلا شک فی ردہ کتعارف الناس کثیراً من المحرمات من الربوا وشرب الخمر ولبس الحریر والذہب وغیر ذلک مما ورد تحریمہ نصا وان لم یخالفہ من کل وجہ بان ورد الدلیل عاما والعرف خالفہ فی بعض افرادہ او کان الدلیل قیاسا فان العرف[1] معتبر ان کان عاما فان العرف العام یصلح مخصصا و یترک بہ القیاس کما صرحوا بہ فی مسئلۃ

ہٹانے میں تنگی ضرور ہے، ذکر کرکے کہا ہے کہ یہ قول ضعیف اور حق سے دور ہے، کیونکہ نص کے خلاف جو تعامل ہو اس کا اعتبار نہیں ہو سکتا، نیز اشباہ میں فائدہ ثالثہ کے تحت میں لکھا ہے کہ مشقت اور تنگی کا اسی موقع پر لحاظ کیا جاتا ہے، جہاں نص موجود نہ ہو، اور جہاں نص موجود ہو وہاں اس کا اعتبار نہ کیا جائیگا، اس کے بعد فرمایا ہے کہ عرف کی دو قسمیں ہیں، عرف خاص و عرف عام اور دونوں کی دو قسمیں ہیں، یا تو وہ دلیل شرعی اور ظاہر روایت کی تصریح کے موافق ہوگا یا مخالف اگر ان کے موافق ہو، جب تو اس کے معتبر ہونے میں) کچھ کلام ہی نہیں، اور اگر دلیل شرعی یا ظاہر روایت کی تصریح کے خلاف ہو، تو اس کو ہم دو بابوں میں بیان کرنا چاہتے ہیں، پہلا باب اس صورت کے متعلق ہے کہ عرف دلیل شرعی کے خلاف ہو تو اگر ہر جہت سے خلاف ہو کہ اس سے نص کا ابطال لازم آئے جب تو عرف کے مردود ہونے میں کچھ شبہ نہیں، جیسے بہت لوگوں میں آجکل بہت سے حرام کام متعرف ہیں، مثلاً سود لینا، شراب پینا، ریشم

---

[1] انظر الی ہذا القید فیما اذا کان الدلیل قیاسا انہ لابد من کون العرف عاما من غیر نکیر وحرمۃ الفضل المشروط فی القرض لیس بالقیاس بل بالنص والاجماع ولیس فی التعامل بہ عرف من المسلمین بل انما یرتکبہ بعض الفساق والجہال من العوام الذین جمعوا مالا وعددوہ وہو لا الشرذمۃ قلیلون واما المفالیس وکثیر ما ہم وکذا الاغنیاء الذین لا یجمعون المال فلا یرضون بہ ابدا ولا یتعلمون الا مضطرین ومنکرین الصلحاء والعلماء من المسلمین الا من کان من العلماء قد باع دینہ بالدنیا ووقع حمارہ فی الطین ۱۲ منہ

الاستصناع ودخول الحمام والشرب من السقاء، وان كان العرف خاصًا فانه لا يعتبر وهو المذهب كما ذكره في الاشباه قال هل المعتبر في بناء الاحكام العرف العام او مطلق العرف ولو كان خاصًا المذهب الاول انتهى ويتفرع على ذلك لو استقرض الفا واستاجر المقرض،

اور سونا پہننا وغیرہ جن کی حرمت نص میں صراحۃً وارد ہے، اور اگر ہر حیثیت سے خلاف نہ ہو، بلکہ صورت یہ ہو کہ دلیل شرعی تو عام ہے اور عرف بعض خاص صورتوں میں اس کے خلاف ہے، یا دلیل قیاسی ہے (منصوص نہیں) اس وقت عرف کا اعتبار کیا جائے گا بشرطیکہ عرف عام ہو (خاص نہ ہو) کیونکہ عرف عام سے نص میں تخصیص ہو سکتی ہے، اور قیاس کو ترک کیا جا سکتا ہے،

جیسا مسئلہ استصناع ودخول حمام اور سقاوہ سے پانی پینے کے مسئلہ میں فقہا نے تصریح کی ہے۔ اور اگر عرف خاص ہو تو اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، مذہب یہی ہے، جیسا اشباہ میں مذکور ہے کہ بنا احکام میں عرف عام معتبر ہے یا ہر عرف گو خاص ہی ہو؟ مذہب یہ ہے کہ شق اول معتبر ہے (یعنی عرف عام) اور اس پر یہ مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سے ایک ہزار روپے قرض لے اور

لحفظ مرآة او ملعقة كل شهر بعشرة وقيمتها لا تزيد على الاجر ففيها ثلاثة اقوال (۱) صحة الاجارة بلا كراهة اعتبارًا لعرف خواص بخارى (۲) والصحة مع الكراهة للاختلاف (۳) والفساد لان صحة الاجارة بالتعارف العام ولم يوجد وقد افتى الاكابر بفسادها الى ان قال

قرض دینے والے کو اپنے ایک آئینہ یا چمچہ کی حفاظت کے لئے دس درہم ماہوار پر نوکر رکھ لے (تاکہ اس حیلہ سے اس کو قرض کا کچھ نفع ملتا رہے) تو اس میں تین اقوال ہیں۔ (۱) یہ کہ یہ اجارہ بلا کراہت صحیح ہے اہل بخاری کے عرف خاص کی بنا پر (۲) یہ کہ مع الکراہت صحیح ہے کیونکہ عرف مختلف ہے (۳) یہ کہ اجارہ فاسد ہے، کیونکہ صحت اجارہ کی بنا عرف عام پر ہے

لہ اس میں صاف تصریح ہے کہ قیاس کو عرف عام ہی سے ترک کیا جا سکتا ہے نہ عرف خاص سے اور قرض پر نفع لینا مسلمانوں میں عام طور سے متعارف نہیں بلکہ سرمایہ داروں میں متعارف ہے، علماء وصلحاء اور فقراء اور وہ اغنیاء جو سرمایہ دار نہیں سب کے سب اس سے ناراض ہیں اور مجبور ہو کر سود دینے پر آمادہ ہوتے ہیں، پس اگر اس مسئلہ کا مدار قیاس پر ہوتا جب بھی ایسے عرف سے اس کا ترک جائز نہ تھا مگر ہم بتلا چکے ہیں کہ اس کا مدار قیاس پر نہیں بلکہ اس کی حرمت منصوص اور اجماعی ہے اور نص کے خلاف نہ عرف عام معتبر ہے نہ عرف خاص خوب سمجھ لو ۱۲ منہ

وحاصله ان ما ذکروا فی حیلة اخذ المقرض ربحا من المستقرض ملعقة مثلاً یستاجره علی حفظها فی کل شهر بکذا غیر صحیح لان الاجارة مشروعة علی خلاف القیاس لانها بیع المنافع المعدومة وقت العقد وانما جازت بالتعارف العام وقد تعارفوها سلفا وخلفا ولا یخفی انه لا ضرورة الی الاستیجار[سه] علی حفظ ما لا یحتاج الی حفظه باضعاف قیمته فانه لیس مما یقصده العقلاء ولذا لم یجز استیجار دابة لیجنبها او دراهم لیزین بها دکانه کما صرحوا به ایضا فتبقی علی اصل القیاس ولا یثبت جوازه بالعرف الخاص فان العرف الخاص لا یترک به القیاس فی الصحیح علی ان هذا العرف لم یشتهر فی بلدة بل تعارفه بعض اهل بخاری دون عامتهم ولا یثبت التعارف بذلك اهـ (ص ۱۱۶ تا ۱۱۸ ج۳)

اور وہ یہاں موجود نہیں، اس کے بعد فرمایا ہے کہ خلاصہ یہ ہے کہ بعض علماء نے جو قرض دینے والے کے لئے قرض خواہ سے نفع حاصل کرنے کا یہ حیلہ نکالا ہے کہ قرض خواہ قرض دینے والے کو مثلاً ایک چمچہ کرایہ پر دیدے کہ تم اس کی حفاظت کرو اور اس حفاظت کا معاوضہ ماہوار تم کو اس قدر ملے گا یہ حیلہ صحیح نہیں، کیونکہ اجارہ کا جواز دراصل خلاف قیاس ہے، کیونکہ اس میں منافع معدومہ کی بیع ہوتی ہے مگر عرف عام کی وجہ سے جائز ہو گیا ہے کہ سلف سے خلف تک سب میں عقد اجارہ کا رواج رہا ہے، اور ظاہر ہے کہ جس چیز کی حفاظت کی کچھ بھی ضرورت نہیں اس کی حفاظت کیلئے کسی کو مزدوری پر رکھنا محض فضول ہے کیونکہ عقلاء ایسا کبھی نہیں کرتے اسی لئے گھوڑے کو کوتل ساتھ رکھنے کے لئے اجارہ پر لینا یا دکان سجانے کے لئے دراہم کرایہ پر لینا جائز نہیں جیسا کہ فقہاء نے تصریح کی ہے تو یہ اجارہ (یعنی قرض دینے والے کو چمچہ یا آئینہ کی حفاظت کے لئے کرایہ اور مزدوری پر رکھنا) اصل قیاس پر (فاسد و باطل) ہوگا، اور عرف خاص سے قیاس متروک نہیں ہو سکتا، صحیح قول یہی ہے، دوسرے یہ عرف تو کسی ایک شہر میں بھی رائج نہیں ہوا بلکہ

مه قلت ولو کان الاستیجار والاسترباح علی القرض جائزا ولو عند احد من المجتهدین لم یحتاجوا الی مثل تلک الحیلة ولو بی کل الوبی لاہل الربا ان تلک الحیلة ایضاً لا تجوز فی المذہب فیا لجرأة ہذا المستفتی کیف اغمض عینیه عن کل ذلک قال بجواز الاسترباح والاستیجار علی القرض نفسه مخالفا للاجماع ولم یخش اللہ تعالیٰ فی تحلیل الربا المحرم نعوذ باللہ من الخذلان ۱۲ منه

سه وکذا لا ضرورة الی استیجار الدراہم بل ولا یتحقق فیه معنی الاجارة اصلا لضرورة بقاء المستاجر بالفتح والانتفاع بمنافعه واما الاجارة علی استہلاک العین فباطلة قطعا ۱۲ منه

بلکہ بخاری کے بعض خاص لوگوں میں پایا گیا ہے، عام طور پر وہاں بھی نہیں ہے، اور اتنی بات سے تعارف ثابت نہیں ہو سکتا اھ (ص ۱۶۷ تا ۱۸۱ ج ۲)

هذا آخر ما اردنا ایراده في جواب هذا الاستفتاء الذي وصل صاحبه في تحريف الاحكام وتبديل الشرع غاية الانتهاء ولعمري ان الذين كانوا يجوزون الربوا في الهند مع الكفار لكونها دار الحرب هم احسن حالا من هذا المستفتي وخير مآلا لكونهم اخذين بقول امام من الائمة ولو ضعيفا لا يجوز الافتاء به عندنا الا لضرورة شديدة واما هذا المستفتي فقد اتى بالعجب العجاب من تحليل الحرام والى الله المشتكى مما احدثه المنتسبون الى العلم في الاحكام وغيروا من شرع الله وشرع رسوله افضل الانام عليه صلوة الله وسلامه الى يوم القيام وعلى آله و اصحابه البررة الكرام والحمد لله رب العلمين، اللهم توفنا مسلمين والحقنا بالصالحين واذا اردت بقوم فتنة فتوفني غير مفتون۔

اب ہم استفتاء کے جواب کو اسی جگہ پر ختم کر دینا چاہتے ہیں، صرف اتنا اور کہنا چاہتے ہیں کہ مولف استفتاء نے احکام کی تحریف اور شریعت کی تبدیلی میں نمبر اول پایا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہندوستان میں کفار کی ساتھ دار الحرب کی آڑ لے کر سودی معاملات کو جائز کہتے ہیں وہ اس مستفتی سے موجودہ حالت کے اعتبار سے بھی اچھے اور انجام کے لحاظ سے بھی بہتر ہیں کیونکہ وہ کسی امام مجتہد کے قول کو تو لئے ہوئے ہیں گو ہمارے نزدیک وہ قول بھی ضعیف ہے جس پر بدون ضرورت شدیدہ کے عمل جائز نہیں، مگر اس مستفتی نے تو حرام کو حلال کرنے میں غضب ڈھا دیا، بس ہم خدا ہی سے اس فتنہ کی فریاد کرتے ہیں جو علم کی طرف نسبت رکھنے والوں نے احکام شرعیہ میں آجکل برپا کیا ہے کہ خدا اور رسول کی شریعت کو جس طرح چاہتے ہیں بدل دیتے ہیں، رسول خدا افضل الخلق صلی اللہ علیہ وسلم پر قیامت تک درود و سلام نازل ہوتا رہے اور آپ کے تمام خاندان و اصحاب پر بھی جو کہ نیک اور کریم تھے، والحمد للہ رب العالمین اللھم توفنا مسلمین والحقنا بالصالحین و اذا اردت بقوم فتنۃ فتوفنی غیر مفتون، آمین۔

حررہ المفتقر الی رحمۃ ربہ الصمد عبدہ المذنب ظفر احمد النزیل بالخانقاہ الامدادیۃ

بتھانہ بھون ـــــ ۲۴؍ ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ

تتمة الکلام

قد اورد المستفتی فی آخر رسالته علی قول الشیخ ثناء الله ونصه ان المراد بالربوا معناه اللغوی وهو الزیادة وهی عبارة عن فضل یعلو علی المماثلة والمساوات فاوجب تعالیٰ فی المبایعة والمعارضة المماثلة والمساواة فالمعتبر فیها المماثلة بالاجزاء کیلا اووزنا ان اتحد جنس البدلین وکانا من ذوات الامثال وعند اختلاف الجنس تکتفی المماثلة المعنویة وهی القیمة وجعلت القیمة مماثلا للبدل لان مالکی البدلین رضیا عند علیه المبادلة فیصیر کل من البدلین مثلا لمجموع البدل الآخر باصطلاحهما انتهی بان المماثلة لا یوجد فی القرض لانه لیس فیه وجود الطرفین وبان القرض لیس فیه المبادلة عند الشرع وهذا الشیخ ایضاً اقام علیه الادلة ثم قال اعطی الشرع لمثله حکم عینه وبانه علی هذا لا یجوز للمشتری ان یبیع ما اشتراه باکثر من الثمن الذی اشتراه به لانه الفضل لغة مع انه جائز باتفاق الامة وعند الشیخ ایضاً اه (ص ۴۷) والجواب عن الاول و الثانی بان القرض معاوضة انتهاءً فکیف لا یوجد فیه المبادلة والمماثلة من هذه الجهة وهذا هو مراد الشیخ قدس الله سره نعم لا مبادلة ولا مماثلة فی القرض ابتداءً لکونه تبرعاً من هذه الجهة فلا یصح القول بنفی المماثلة والمبادلة عن القرض مطلقاً بل لابد من تقییده بالابتداء وهذا لا یضر الشیخ ولا ینفع المستفتی علی ان القرض کالبیع عند محمد کما صرح به ملک العلماء فی البدائع ونصه اما رکنه فهو الایجاب والقبول وهذا قول محمد واحدی الروایتین عن ابی یوسف وروی عن ابی یوسف اخری ان الرکن فیه الایجاب والقبول لیس برکن وجه قول محمد ان الواجب فی ذمة المستقرض مثل المستقرض فلهذا اختص جوازه بما له مثل فاشبه البیع فکان القبول رکنا فیه کما فی البیع اه (ص ۳۹۴ ج ۷) ویؤیده قول الهیثمی فی الزواجر بان ربا القرض یرجع فی الحقیقة الی ربا الفضل الخ کما مر ذکره وعلی هذا انما حکاه المستفتی عن بعض الاعلام ان القرض یرجع فی الحقیقة الی ربا الفضل الخ کما مر ذکره وعلی هذا انما حکاه المستفتی عن بعض الاعلام ان القرض لیس غیر البیع ومباینا له بل داخل فیه (الصواب ان یقال بل هو مثله ۱۲) لان القرض مبادلة انتهاء فهو قسم من اقسام البیع لا غیر (الاصوب القول بانه فی حکم البیع ۱۲ مصحح)

عہ اس مضمون کے ترجمہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کیونکہ دقیق ہے عوام کی فہم سے باہر ہے ۱۲

علی قول محمد ومن افقه فانه قاسه علی البیع لاجل المبادلة التی فیه وجعل الایجاب والقبول رکنین له کالبیع فافهم۔

وعن ثالث بان المماثلة المعنویة وهی القیمة عند اختلاف جنس البدلین لما کان مدارها علی اصطلاح العاقدین ورضاهما لابد وان تختلف باختلاف العاقدین والعقد فالثمن الذی اصطلح علیه العاقد ان هو مثل بدله فی هذا العقد والثمن الذی تراضی علیه الآخر ان هو مثل هذا الشیٔ فی ذلك العقد فیجوز للمشتری ان یبیع ما اشتراه باکثر من الثمن الذی اشتراه به لغیر البائع الاول ولهذا البائع ایضا بعد اداء الثمن فی العقد الاول لاختلاف العقد والعاقدین لسکون البائع مشتریا والمشتری بائعا فی العقد الثانی ولیس ذلك من الفضل لغةً ولا عرفاً فان الفضل والزیادة لا یظهر لغة وعرفا الا فی المتحد الاجناس فلا یقال ان مأة درهم ازید من الثوب ولا ان الدینار ازید من الفلوس فاذا ترضی العاقدان فی المختلفة الاجناس علی ثمن کان مثل بدله مماثلة معنویة فافهم وکن من الشاکرین هذا جوابنا عن ایراد المستفتی علی کلام الشیخ ثناء الله دامادعوته بان الشیخ انما قال ذلك ای ان المراد بالربا معناه اللغوی بعد ما تنبه علی ان نفع القرض المشروط لا یدخل فی الربا المحرم بالنص علی المسکین الخ ندعوی بلابینة فان کلام الشیخ رحمه الله فی تفسیر آیة الربا صریح فی کون ربا القرض داخلا فی ربا القرآن محرما بالنص کما تقدم ذکره واعترف المستفتی بذلك نفسه ولکنه نسی ما قدمت یداه فذکرنا نیا خلاف ما اولا ابداه وذلك من دیدن المخلطین الملبسین یخبطون دائما خبط عشواء ولا یستقیمون لحظةً علی منهج سواء والله تعالیٰ اعلم (النور ص۳ محرم ۱۳۴۸ھ)

قرض دادن کسے راکہ ازیں روپیہ سود حاصل می کند

سوال (ایک شخص ہندو کو روپیہ قرض دیتا ہے، اس امید پر کہ جب گڑ پیدا ہوگا تو اس روپیہ کا گڑ اس وقت کے نرخ سے ہم لیں گے مگر وہ ہندو مدیون دوسرے ہندو کو سود لیکر اس روپیہ کو تقسیم کرتا ہے اور ان لوگوں سے گڑ خرید کر اصل دائن کو دیتا ہے، اور دائن کو یہ بات معلوم ہے کہ مدیون سودی روپیہ تقسیم کریگا۔ آیا اصل دائن اعانت علی المعصیۃ کے جرم میں شرعاً ماخوذ ہوگا یا نہیں ؟

الجواب ، چونکہ قرض دینے سے وہ روپیہ اس مقرض کی ملک سے نکل گیا، اور وہ روپیہ

بالخصوص موضوع بھی نہیں اقامت معصیت کے لئے، بلکہ وجوہ جائزہ سے بھی منتفع ہو سکتا ہے پھر اثمان معاملات مبادلات میں متعین بھی نہیں ہوتے اس لئے ظاہراً یہ اعانت علی المعصیۃ نہیں اور صحابہ کی دادوستد یہود آکلین سحت کے ساتھ بلا نکیر متعارف و شائع تھی، واللہ اعلم، ۱۶ شعبان ۱۳۲۲ھ

سوال متعلق سوال مذکور:- چونکہ صفائی معاملات کی عبارت دیکھی گئی ہے، مگر سود لینے والے کی اعانت قرض سے کی، اور اعانت گناہ کی گناہ ہے" اس وجہ سے صورت مسئولہ میں شبہ پیدا ہو گیا کہ یہاں بھی بذریعہ قرض کے اعانت علی المعصیۃ لازم آتی ہے، اور باوجود غور و فکر کے دونوں قرضوں میں مجھے کچھ فرق نہیں معلوم ہوا، اس سبب سے میں نے وہ سوال پیش کیا ہے اور پوری عبارت صفائی معاملات کی یہ ہے ص۱۲ "بعض لوگ سودی بنکوں میں روپیہ امانۃً جمع کرتے ہیں اور اس کا نفع نہیں لیتے، سو چونکہ بالیقین بنک میں روپیہ بعینہ محفوظ نہیں رہتا، کاروبار میں لگا رہتا ہے، اس لئے وہ امانت نہیں رہتا، بلکہ قرض ہو جاتا ہے، اور گو اس شخص نے سود نہیں لیا مگر سود لینے والے کی اعانت قرض سے کی، اور اعانت گناہ کی گناہ ہے، اس لئے روپیہ داخل کرنا ہی درست نہیں"۔

الجواب:- تامل سے یہ فرق معلوم ہوتا ہے کہ بنک میں تو روپیہ موضوع اسی واسطے ہے بخلاف صورت مسئول عنہا کے، اور جس قدر تیقن لزوم اور ضرورت میں ہوتا ہے دوام اتفاقی میں نہیں ہوتا، لیکن احتیاط صورت عنہا میں بھی بہتر ہے، بعد تامل ایسے بنک میں ایک اور وجہ منع کی خیال میں آئی، وہ یہ کہ یہ خلط بالاذن ہے تو موجب شرکت ہو گیا، اور شرکت مزیل ملک نہیں تو روپیہ والے کی ملک پر اس میں تصرف غیر مشروع ہوا۔ ۱۳ ذیقعدہ ۱۳۲۲ھ

(امداد جلد دوم ص ۱۶۲)

متحد القدر مختلف الجنس میں تشبیہ نہ ہونے پر شبہ

السوال (۴۴۴) بحوالہ صفائی معاملات مطبوعہ مطبع مجیدی کانپور زیر عنوان سود کا بیان صفحہ ۱۰، ۱۱ "جو چیزیں متحد القدر غیر متحد الجنس ہوں ان میں کمی بیشی تو جائز ہے مگر ادھار جائز نہیں" اس سے معلوم ہوا کہ روپے پیسے کا اگر اناج و غلہ خریدنا چاہیں تو ادھار جائز نہ ہوگا،

الجواب، ہاں سرسری نظر میں یہ شبہ ہو سکتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں کے وزن کرنے کے باٹ مختلف ہیں، اس لئے شریعت میں اس کا حکم ویسا ہی ہے جیسے غیر متحد القدر کا یعنی اختلاف نوع قدر بجائے اختلاف قدر کے ہے کذا فی الہدایہ باب الربوا تحت متن و اذا

عدم الوصفان فی قولہ الا اذا اسلم النقود فی الزعفران ونحوہ یجوز الخ ایک وزنی ہو دوسرا غیر وزنی۔

۹ رمضان ۱۳۵۱ھ (النور رجب ۱۳۵۲ھ ص)

حکم آب نل کہ از سود تیار کردہ شدہ باشد

سوال (۱۴۵) سرکار قدسیہ بیگم مرحومہ نے کچھ روپیہ گورنمنٹ انگریزی کو دیا تھا جس کے سود میں تمام پانی شہر میں آتا ہے مسجدوں میں حوض میں بڑے بڑے قاضی مفتی پیتے ہیں وضو کرتے ہیں۔ آیا ایسا پانی جائز ہے یا نہیں ہم لوگ سب مبتلا ہیں، مگر اس میں شک نہیں ہے کہ اس کے سود ہی سے یہ پانی کے نل جاری کئے گئے ہیں، یا عموم بلویٰ کے لئے جائز ہوگا، غرض کہ اس مسئلہ کے جواز وعدم جواز سے ضرور مطلع فرمایئے؟

الجواب۔ جس شے میں خبث ہو اس کا استعمال حرام ہے نہ کہ اس سے مس کی ہوئی چیزوں کا بھی کیونکہ مس بالخبیث اسباب خبث سے شرع میں نہیں ہے، ورنہ مس بالکافر سے تلوث لازم ہونا چاہئے، پس نل میں اگرچہ خبث ہو مگر وہ رعایا کے استعمال میں نہیں ہے کیونکہ وہ اہل حکم کے تصرف میں ہے، پس وہی اس کے مستعمل ہیں، اور جو پانی استعمال میں ہے وہ مباح ہے گو نل سے مس کئے ہوئے ہو اور مس بالخبیث کا اسباب خبث میں سے نہ ہونا اوپر ثابت ہو چکا، واللہ اعلم

حوادث ص ۵۰ ۲۰ جمادی الاخریٰ ۱۳۲۱ھ (امداد ص ۱۵۳ ج ۲)

بنام سود گرفتن از کاشتکار ہوشی

سوال (۱۴۶) جہاں میں ملازم ہوں اس ریاست میں لین دین سود کا ہوتا ہے، اور مجھ کو بھی حسابات سود کے مرتب کرتے ہوتے ہیں، اور بسا اوقات وصول کرنا بھی ہوتا ہے، اس وجہ سے غالباً یہ ملازمت میرے واسطے جائز نہیں ہوسکتی، سوال یہ ہے کہ اگر محض کاشتکاران دخیلکاران ہی سے زائد رقم بقدر گنجائش وصول کی جاوے تو جواز کی صورت نکل سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب، ایک طرح درست ہے وہ یہ کہ ان دخیل کاروں سے قبل تخم ریزی زبانی ہی یہ کہدیا جاوے کہ آج سے ہم اپنی زمین کا کرایہ اتنا لیں گے، اگر منظور نہ ہو چھوڑ دو مثلاً وہ زمین اس وقت پچاس روپے لگان پر ہے ہم اس سے یوں کہیں کہ آپ سے سو روپیہ لگان لیں گے، بس اس کے بعد اگر اس نے کاشت کیا تو شرعاً اس پر سو روپے واجب ہوگئے، اب یہ سو روپے جس نام سے بھی ہم وصول کر سکیں حلال ہے،

(حوادث اول ص ۹۹)

حکم استبدال نقد بہ غلہ نسیہ از کاشتکار

سوال (۲۴۷) ایک کاشتکار کے ذمہ کسی کا روپیہ چاہتا تھا اس کاشتکار نے یہ کہا کہ میں بعوض روپے کے فصل میں اس نرخ سے غلہ دیدوں گا جس کی مقدار دس من پختہ ہوئی، جب فصل آئی تو اس نے نو من غلہ دیا، باقی کو کہدیا کہ فصل آئندہ میں دوں گا تو یہ درست ہے یا نہیں اور بعوض اس غلہ کے دوسرا غلہ دیدے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب۔ بیع الکالی حدیث و فقہ میں منہی عنہ ہے، اس لئے وہ عقد اول ہی جائز نہیں ہوا کہ میں بعوض روپے کے فصل میں اس نرخ سے غلہ دیدوں گا، بلکہ اس مبادلہ کے جواز کی صورت صرف ایک ہو سکتی ہے، کہ جتنے روپے کے عوض میں جس قدر غلہ ٹھہرا ہے وہ اسی مجلس میں تسلیم کر دیا جاوے ورنہ ناجائز ہے جب عقد اول ہی صحیح نہیں تو عقد ثانی تو اسی پر مبنی ہے وہ کیسے جائز ہوگا (تتمہ ثالثہ ص ۶۳)

ربا کا معاملہ بیع فاسد ہے یا باطل

سوال (۲۴۸) بیع باطل و فاسد میں جو حدود کے اندر فروق بیان کئے گئے ہیں، اس سے بظاہر مال ربوا فاسد معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ جانبین سے مال متقوم ہے۔ ایک روپیہ کے عوض دو روپے وزن چاندی خریدی تو دونوں طرف مال ہے جس پر بظاہر بیع فاسد کی تعریف صادق آتی ہے نہ بیع باطل کی، اس صورت میں مشتری کی ملک ہو جانا چاہئے۔ بلکہ بائع کی بھی ملک خبیث ہونا چاہئے، اور بیوع فاسدہ میں تبدیل ملک سے دوسرے کے حق میں حکم حلت ہے، ربوا میں یہ حکم جاری ہو سکتا ہے یا نہیں، اور قرض میں بھی یہی حکم ہوگا یا نہیں، یعنی قرض بشرط سود دیا گیا، اور بعد وصول اصل و سود کے ملک خبیث مثل بیع فاسد کے ہوگی یا نہیں، خلاصہ سوال یہ ہے کہ سود خوار جس کا اکثر مال سود کا ہے ہدیۃً خواہ صدقۃً اجارۃً بیعاً ضیافۃً اس سے کچھ روپیہ وغیرہ لینا جائز ہے یا نہیں، اگر نہیں جائز ہے تو شبہ مذکورہ کا جواب کیا ہے، عالمگیریہ میں ایک جزئی نظر آئی کہ سود خوار جس کا اکثر مال حرام کا ہے اس کی دعوت و ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں، اگر یہ صحیح ہے تو شبہ سے تشفی عطا فرماویں؟

الجواب، شبہ کی بناء ہی ضعیف ہے، کیونکہ بیع فاسد میں دو چیز کا باہم معاوضہ ہوتا ہے اور ربا نام ہے زیادت بلا عوض کا، پس وہاں معاوضہ ہی نہیں، لہٰذا وہ بیع باطل میں داخل ہے، امید ہے کہ تمام شبہات جو اس پر متفرع تھے دفع ہو گئے ہوں گے، اور اگر اب بھی باقی ہوں تو مکرر لکھئے، ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۲۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۵۳)

عقد ربوا سے جو مال حاصل ہو اس کی دو صورتیں

سوال (۲۴۹) ایک بار بندہ نے حضور کی خدمت میں لکھا کہ مال ربوی حسب تعریف فقہا بیع فاسد معلوم ہوتا ہے کہ بعد القبض موجب ملک ہے، لہذا تبدل ملک موجب حلت ہونا چاہئے، یعنی مال ربوی سے دوسرے شخص کی ملک میں آوے تو حسب قاعدہ فقہا حلال ہونا چاہئے، اس کے جواب میں حضرت نے تحریر فرمایا تھا کہ مال ربوی چونکہ بلا عوض ہے، لہذا بیع فاسد نہیں، بلکہ باطل ہے، در مختار میں مضمون ذیل نظر آیا جس سے شبہ پیدا ہوا قال فی الدر المختار فیجب رد عین الربوی لو قائما لا رد ضمانہ لانہ لا یملك بالقبض قنیہ وبحر و شامی سے بزدوی کا یہ قول نقل کیا ہے من جملۃ صور البیع الفاسدۃ جملۃ العقود الربویۃ یملك العوض فیہا بالقبض، اور ہدایہ کی بعض عبارات سے بھی یہ مضمون مفہوم ہوتا ہے، لہذا اس امر میں جو تحقیق ہو تحریر فرمادیں، ایک بار حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بیع فاسد ارشاد فرمایا تھا زبانی دریافت کیا تھا۔

الجواب، کتاب دیکھنے کی تو فرصت نہیں، قواعد سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ مبادلہ میں بدل اور زیادت مجتمعاً ہاتھ آوے اور دوسرے یہ کہ مثلاً قرض کسی سے لیا اور بقدر اصل پہنچنے کے بعد حساب سود میں کچھ دے رہا ہے، پس مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ اور فقہا کا قول صورت اول کے متعلق ہے اور میرا قول صورت ثانیہ کے فلا تعارض،

۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۹ھ (تتمہ اولیٰ ص۱۵۹)

سیونگ بنک وغیرہ کے سود کا حکم

سوال (۲۵۰) کچھ روپیہ ڈاکخانہ میں جمع کیا، ظاہر ہے کہ سرکار سود دیتی ہے۔۔۔۔ آیا وہ سود ڈاکخانہ پر چھوڑا جاوے یا لے کر غربا کو دیدیا جاوے کونسی صورت بہتر ہے، اور ڈاکخانہ پر چھوڑ دینے سے سود لینے کا گناہ تو لازم نہیں ہوتا، کیونکہ ڈاکخانہ تو اپنی طرف سے دے چکا پھر کیوں نہ لیکر غربا کو دیدیا جاوے۔

الجواب، اول تو جمع نہ کرنا چاہئے اور اگر جمع کر دیا واپس کر لینا چاہئے، اور جو چڑھ چکا ہے وہ لیکر غربا کو دیدے، ۳ شعبان ۱۳۲۵ھ (حوادث اولیٰ ص ۳۵ دتتمہ اولیٰ ص۱)

سوال (۲۵۱) زید عمرو میں ڈاک خانہ میں روپیہ جمع کرنے کی نسبت گفتگو ہے زید کہتا ہے کہ محض بغرض حفاظت ڈاکخانہ میں جمع کر دینا جائز ہے، عمرو کہتا ہے کہ یہ روپیہ سودی تجارتوں میں لگایا جاتا ہے، اور اس جمع کرنے میں سودی تجارت کی اعانت ہے، لہذا

عہ دیکھئے سوال ۲۴۵ ص ۱۳

ناجائز ہے، زید کہتا ہے کہ سب کا روپیہ تجارت میں نہیں لگایا جاتا، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص اپنا روپیہ برآمد کرنا چاہے روپیہ برآمد ہو جائے گا، البتہ بعض کا روپیہ تجارت میں لگایا جاتا ہوگا یا تھوڑا تھوڑا سب کا لگایا جاتا ہو، بہرحال یہ معلوم ہونا مشکل ہے بلکہ عادۃً ناممکن ہے کہ کس کا روپیہ تجارت میں لگایا گیا، کس کا نہیں لگایا گیا یا کس نسبت سے روپیہ لگایا گیا، کیونکہ سب کا روپیہ بلا کے رکھا جاتا ہے، اور بالفرض اگر سب روپیہ تجارت میں لگایا جاتا ہے، جب بھی اعانت علی المعصیت کا الزام نہیں، کیونکہ اس قسم کی اعانت علی المعصیت کو اعانت علی المعصیت ہی نہیں خیال کیا گیا، مثلاً ولایت کی ہزاروں چیزیں، کپڑے، برتن، گھڑیاں، دیاسلائی وغیرہ ہندوستان میں فروخت ہوتی ہیں اور ہم کو یقیناً معلوم ہے کہ ان کے بنانے والے انگریز ہیں جو سودی لین دین اور سودی تجارت کے عادی ہیں، اور بمبئی، کلکتہ وغیرہ میں جو مال لیا گیا ہے وہ بھی ناجائز طریقہ تجارت سے لیا گیا ہے، پھر ہم تمام مسلمان کیا عوام کیا علماء و صلحاء سب ہی ان چیزوں کو خریدتے اور کام میں لاتے ہیں، مسلمانوں کا خرید کرنا سودی تجارت کو ترویج دینا ہے یا نہیں، اگر پوری ترویج نہیں تو مسلمان تھوڑی ترویج تو ضرور ہی دیتے ہیں، مگر سودی تجارت کی تھوڑی ترویج بھی تو آخر حرام ہی ہوگی، اور اعانت علی المعصیت کے تحت میں داخل ہوگی، جس طرح ڈاک خانہ میں روپیہ جمع کرنے سے اعانت علی المعصیت ہے، اسی طرح بلکہ غور سے دیکھو تو اس سے کہیں زائد ولایتی چیزوں کے خرید کرنے میں اعانت علی المعصیت ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ عمرو اس کو جائز کہے اور اُس کو ناجائز، اس کے علاوہ ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر چادر کا ایک کونہ ناپاک ہو گیا ہو اور یاد نہ آتا ہو کہ کونسا کونہ ناپاک ہو گیا تھا تو جس کونہ کو دھوڈالے گا چادر پاک ہو جائیگی اس جزئی کو یاد رکھو اور دیکھو کہ چادر کیوں پاک ہو جائے گی بظاہر چادر کو پاک نہ ہونا چاہئے کیونکہ ممکن ہے اس نے وہ کونہ دھویا ہو جو ناپاک تھا، بلکہ وہ کونہ دھویا ہو جو پہلے سے پاک تھا، مگر پھر بھی شریعت نے چادر کو پاک کہا اس پاک کہنے کی دو وجہ ہو سکتی ہیں۔ ایک تو دفع حرج دوسرے یہ کہ جب شبہ ہو گیا کہ معلوم نہیں وہ کونہ ناپاک ہے معلوم نہیں یہ کونہ ناپاک ہے تو صرف شبہ سے ہر کونہ کو ناپاک نہیں کہتے، اس کی ایک نظیر کتب فقہ میں اور بھی موجود ہے، وہ یہ ہے کہ جب غلہ کی بالوں کو بیلوں سے پامال کراتے ہیں تو بیل ان پر بول و براز کرتے ہیں اس غلہ کو پاک ہونے کو فقہاء نے لکھا ہے کہ کچھ غلہ محتاجوں کو دیدیا جاوے، یا حصہ داروں میں تقسیم کر دیا جاوے تو کل غلہ پاک ہو جائے گا۔ اور وجہ یہ لکھتے ہیں کہ شبہ ہو گیا

کہ شاید ناپاک غلہ دوسرے کے حصہ میں چلا گیا ہو، ہمارے حصہ میں نہ رہا ہو اس میں شک نہیں کہ یہ وجہ یا اس کے مثل جو اور وجوہات ہوں سب کمزور ہیں، اور سب کا حاصل یہ ہے کہ عموم بلویٰ دفع حرج، تعامل علماء صلحاء یا تعامل خلائق کی وجہ سے یہ چیزیں حلال اور پاک اور جائز ہیں، انھیں دونوں صورتوں پر ڈاک خانہ میں روپیہ جمع کرنے کو خیال کرو، جس طرح کہ شبہوں سے ناپاک چادر اور ناپاک غلہ پاک اور حلال ہو جاتا ہے اسی طرح کے شبہوں سے یہاں ڈاکخانہ کا حرام اور ناپاک روپیہ بھی حلال اور پاک ہو جاوے گا (حرام اور ناپاک علی سبیل الفرض کہا گیا ورنہ وہ ایسا نہیں ہے) اور اگر اس قسم کے شبہوں سے قطع نظر کر کے وہاں عموم بلویٰ و دفع حرج تعامل علماء صلحاء سے حرام و ناپاک کو حلال و پاک بنایا جاتا ہے تو یہاں بھی ایسا ہی ہونا چاہیے، دونوں میں فرق کرنے کی کوئی وجہ نہیں اگر یہ کہا جائے کہ جب ڈاکخانے نہ تھے تو صرف حفاظت کی غرض سے لوگ روپیہ کہاں رکھتے تھے جہاں پہلے رکھتے ہوں وہیں اب بھی رکھا کریں، کہا جائیگا جب ڈاکخانے نہ تھے اور منی آرڈر کے ذریعہ روپیہ نہیں بھیجا جاتا تھا، تو لوگ کس طرح روپے بھیجتے تھے، جس طرح پہلے بھیجتے تھے اسی طرح اب بھی بھیجیں، اگر وہ جائز تو یہ کیوں ناجائز دونوں میں کیا فرق ہے، اگر وہاں کوئی وجہ جواز کی ہے تو یہاں بھی کوئی وجہ جواز کی ہے۔

الجواب ۔ قاعدہ کلیہ ہے کہ امانت اگر مالک کی اجازت سے دوسرے اموال میں مخلوط کر دی جائے تو مجموعہ مشترک ہو جاتا ہے، فی الدر المختار کتاب الایداع وان باذنہ اشترکا شرکۃ املاک کما لو اختلطت بغیر صنعۃ کان انشق الکیس لعدم التعدی، پس جب حسب بیان سائل وہ روپیہ ملا کر رکھا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ خلط بالاذن ہے، تو جس قدر روپیہ تجارت ناجائزہ میں لگیگا اس میں سب کا تھوڑا تھوڑا روپیہ ضرور ہوگا، پس ہر شخص بقدر اسی حصہ مشترک کے معین اس تجارت کا ہوگا، اور معصیت کی اعانت ضرور معصیت ہے، اور خرید اشیاء کو سودی تجارت کی اعانت نہیں کہہ سکتے، کیونکہ ہم نے جب کوئی شئے خرید کر اس کی قیمت ادا کر دی تو وہ قیمت اس تاجر کی ملک ہو گئی، ہمارا روپیہ معصیت میں صرف نہیں ہوا، اور یہاں تو خود ہمارا ہی روپیہ تجارت حرام میں لگایا گیا ہے، اور جو نظائر فقہیہ سوال میں مذکور ہیں ان سب کا جواب یہ ہے کہ ان نظائر میں بعض اجزاء واقع میں اجزاء نجسہ سے متمیز و منفرد ہیں تو دفع حرج کے لئے اس کا اعتبار کر لیا گیا اور یہاں بالیقین ہر جزو میں بوجہ اشتراک اعانت علی المعصیۃ ہو رہی ہے اور عموم بلویٰ کا جواب مسئلہ منی آرڈر میں مذکور ہو چکا ہے، اور منی آرڈر اور اس

جو فرق دریافت کیا ہے اول تو فرق نہ ہونا مضر نہیں، کیوں کہ اس کو بھی منع کیا جاتا ہے جیسا مفصلاً مذکور ہوا، پھر تاویل اخیر کے اعتبار سے فرق بھی ہو سکتا ہے، کہ اس میں ایسی تاویل اب تک نہیں نکلی، فافترقا، البتہ اگر یقیناً تحقیق ہو جاوے کہ اس روپے سے ناجائز کام نہیں ہوتا تو بدون سود لینے کے جمع کرنا جائز ہوگا، واللہ اعلم ۱۸ ذیقعدہ ۱۳۳۲ھ (امداد ص ۲۹ ج ۳ و حوادث اول ص ۱۳)

جہاز کے بیمہ کرنے کی صورتیں اور ان کا جواز یا عدم جواز

سوال (۲۵۲) نمبر ۱، جو مال بیمہ کرا کر جہاز میں روانہ کیا جاتا ہے یعنی جب جہاز روانگی کے واسطے تیار ہوتا ہے تو ایک شخص اس مال کی ذمہ داری لیتا ہے کہ اگر یہ مال فلاں مقام پر خیریت سے نہیں پہنچا اور راہ میں کچھ یا کل کا نقصان ہو گیا تو میں اس نقصان کو پورا کروں گا، اور مالک مال سے بیمہ کرنے والا ع ر ہزار کے حساب سے پیشگی روپیہ لے کر جہاز ران کو لنگر اٹھانے کا حکم دیتا ہے یہ معاملہ شریعت میں جائز ہے یا نہیں۔

نمبر (۲) اگر یہ بیمہ مالکِ جہاز کرے اس صورت سے کہ معمولی کرایہ سے دو چند یا سہ چند کرایہ لے کر مال بھرے اور نقصان کا ذمہ دار رہے تو جائز ہے یا نہیں۔ اگر ناجائز ہے تو جو بیمہ پارسل ڈاک خانہ میں کرایا جاتا ہے، اس میں اور اس میں کیا فرق ہے نقصان اور ضائع ہونے کے احتمالات ہر دو جگہ موجود ہیں۔

نمبر (۳) جو مال بیمہ کرا کے جہاز میں روانہ کیا جاتا ہے اس مال میں تو کوئی نقص و خرابی نہیں آتی اور اس کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں۔

الجواب، نمبر (۱ و ۲) اول چند مسئلے معلوم کرنے جاویں، پھر جواب سوال کا سمجھنا سہل ہوگا۔ ۱ کفالۃ خاص ہے حق مضمون کی ساتھ فی الدر المختار کتاب الکفالۃ واما کفالۃ المال فتصح بہ ولو المال مجھولا اذا کان ذلک المال دینا صحیحا ھو مالا یسقط الا بالاداء او بالابراء:

۲ فی الدر المختار کتاب الایداع وھی امانۃ فلا تضمن بالھلاک الا اذا کانت الودیعۃ باجر الخ، اس روایت سے معلوم ہوا کہ جس امانت کی حفاظت پر اجرت لی جاوے تلف سے اس کا ضمان لازم ہوتا ہے۔

۳ فی الدر المختار باب ضمان الاجیر ولا یضمن (ای الاجیر المشترک) ما ھلک فی یدہ وان شرط علیہ الضمان لان شرط الضمان فی الامانۃ باطل کالمودع الیٰ قولہ خلافا للاشباہ فی رد المحتار ای من ان ما ان شرط ضمانہ ضمن اجماعاً الخ وھو منقول عن الخلاصۃ وعزاہ

ابن الملک للجامع وفی رد المحتار قولہ ولا یضمن الخ اعلم ان الھلاک اما بالفعل الاجیر او لا والاول اما بالتعدی او لا والثانی اما ان یمکن الاحتراز عنہ او لا ففی الاول بقسمیہ یضمن اتفاقاً وفی ثانی الثانی لایضمن اتفاقاً وفی اولہ لایضمن عند الامام مطلقاً و یضمن عندھما مطلقاً۔ اس سے معلوم ہوا کہ اجیر مشترک کے ہاتھ میں ہلاک ہونے کی چند صورتیں ہیں، جن میں اصل مذہب کے اعتبار سے تفصیل ہے، لیکن اشباہ میں اشتراط ضمان سے ضمان کا فتویٰ دیا ہے، اب جواب سوال کا لکھا جاتا ہے، وہ یہ کہ جہاز والا اجیر مشترک ہے، اصل مذہب کے اعتبار سے دو صورتوں میں وہ ضامن ہے، ایک وہ جہاں ہلاک بفعل اجیر ہو، خواہ بتعدی یا بلا تعدی، اور ایک صورت میں ضمان نہیں ہے یعنی جہاں ہلاک بدون فعل اجیر ہو اور اس سے احتراز بھی نہ ہو سکے، جیسے غرق وغیرہ، اور ایک صورت میں اختلاف ہے، جہاں ہلاک بدون فعل اجیر ہو اور احتراز ہو سکے، پس اگر جہاز والے نے یہ شرط نہیں ٹھہرائی کہ ہم تمہارے اسباب تلف شدہ کے ذمہ دار وضامن ہیں، تب تو بعض صورتوں میں وہ ضامن ہے بعض میں نہیں، اور بعض میں اختلاف ہے جس میں گنجائش ضمان کے قول پر عمل کرنے کی ہے اور اگر جہاز والے نے ذمہ داری کر لی ہے تو بقول اشباہ وہ ہر صورت میں ضامن ہے، اس تفصیل سے تو تعیین ہو گئی اور صورتوں کی جن میں جہاز والے کے ذمہ ضمان ہے، اور جن میں اس کے ذمہ ضمان نہیں ہے۔ اور اس کا ماخذ مسئلہ ۳ ہے، پس اگر بیمہ والی کمپنی نے ان مذکورہ صورتوں میں سے کسی ایسی صورت میں بیمہ جس کی حقیقت ضمانت ہے کیا ہے، جس میں جہاز والے کے ذمہ ضمان ہے تب تو یہ بیمہ جائز ہے، اور اگر ایسی صورت میں بیمہ کیا ہی جس میں جہاز والے کے ذمہ ضمان نہیں ہے تو بیمہ جائز نہیں جیسا مسئلہ ۱ میں مذکور ہے کہ صحت کفالت کے لئے اس حق کا مضمون ہونا شرط ہے، یہ جو کچھ لکھا گیا جب ہے کہ دوسری کمپنی بیمہ کرے اور اگر جہاز والے خود بیمہ کریں، تو اس کی حقیقت یہ ہوگی کہ اجیر مشترک پر ضمان کی شرط ہوئی، یہ بقول اشباہ ہر حال میں جائز ہوگا، اور ڈاک خانہ کا بیمہ اسی میں داخل ہے کہ خود عامل شرط ضمان قبول کرتا ہے اور اگر ایسی صورت کی جاوے کہ مال پہونچانے کا معاوضہ تو جہاز والوں کو دیا جاوے اور انتظام حفاظت مال کا معاوضہ بیمہ کی کمپنی کو دیا جاوے کہ وہ اپنا آدمی خاص حفاظت و نگرانی کے لئے جہاز میں رکھیں تو اس صورت میں کمپنی کا بیمہ کرنا ہر حال میں جائز ہے خواہ جہاز والوں پر شرعاً ضمان ہو یا نہ ہو جیسا مسئلہ ۲ میں مذکور ہے، خلاصہ یہ کہ خود جہاز والے کا بیمہ اور کمپنی جب اپنا آدمی حفاظت کے لئے جہاز میں رکھے اس وقت کمپنی کا بیمہ یہ دو صورتیں تو مطلقاً جائز ہیں، اور اگر جہاز والے

بیمہ نہ کریں اور نہ کمپنی اپنا آدمی جہاز میں رکھے تو جن صورتوں میں جہاز والوں پر شرعاً ضمان ہے ان میں بیمہ کمپنی کا جائز ہے اور جن صورتوں میں جہاز والوں پر ضمان نہیں ہے ان میں بیمہ کمپنی کا جائز نہیں اور ان صورتوں کی تفصیل اوپر لکھی جا چکی ہے

جواب نمبر ۳ - کسی بیمہ کے ناجائز ہونے سے مال میں خبث نہیں آتا، واللہ اعلم،

۱۵ صفر ۱۳۳۳ھ (تتمہ اولیٰ ص ۳۰ وحوادث اولیٰ ص ۳)

سود سے نجات کے لئے سودے کی قیمت بڑھا دینا جائز ہے

سوال (۲۵۳) میں کپڑے کی تجارت کرتا ہوں اور اس میں سود بھی دینا پڑتا ہے، اور صورت اس کی یہ ہے کہ وقت معینہ پر جب مہاجن کا روپیہ ادا نہیں ہو سکتا تو وہ سود لگاتا ہے بارہا اس کام کو چھوڑ دینے کو جی چاہتا ہے، مگر بظاہر اور کوئی صورت معاش متصور نہیں ہوتی، بڑا پریشان اور مجبور ہوں دعا فرمایئے اللہ تعالیٰ اس تہلکہ سے نجات بخشے۔ اور نیز عرض ہے کہ اگر مہاجن سے اس بات کا فیصلہ کر لیا جاوے کہ ہم اس کو پانچ پیسے روپے کے حساب سے نفع دیتے ہیں اگر چھ پیسے روپے کے حساب سے نفع دینے لگیں اور وہ اس بات پر راضی ہو جاوے تو یہ صورت جواز کی ہے یا نہیں اگرچہ وقت معینہ پر اس کا روپیہ نہ ادا ہو کیونکہ اس ایک پیسہ کی زیادتی کی وجہ سے جو فی روپیہ بڑھا دی گئی ہے وہ مہاجن تاجر ادائے رقم کو بلا سود منظور کر لے گا۔

الجواب - ہاں یہ صورت جائز اور مستحسن ہے کہ اس کا نفع بڑھا دیا جاوے، اور سود نہ دینا پڑے، اگرچہ وقت معین سے اس کے ادا کرنے میں کتنی ہی دیر ہو جائے،

یکم ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ (تتمہ رابعہ ص ۶۵)

سود دادن بحربیان الخ

سوال (۲۵۴) - سود دادن بحربیان درست یا نہ؟

الجواب - عبارات کتب فقہیہ عام واقع شدہ اند دادن و گرفتن را شامل اند مثل لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب و قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی در رسالہ توجیہ دادن سود نیز نوشتہ اند ایں وقت فقیر را یاد نیست لیکن ایں قدر ظاہر است کہ گرفتن سود از حربیان باین وجہ حلال است کہ مال حربی مباح است اگر در ضمن آن نقض عہد نباشد و حربی چوں خود بخود بدہد بلا شبہ حلال خواہد بود و دادن سود بحربیان بایں وجہ حلال است کہ خورانیدن حرام بمسلمان درست نیست و آنہا حرام خوارند اگر چیزے بطریق سود دادہ خواہد شد بیش ازیں نیست کہ حرام خواہد خورد۔

کتابُ الوکالۃ

جواز واپسی روپیہ از وکیل قبل صرف

سوال (۲۵۵) ایک قطعہ زمین میں چند حجرے طلبہ کے لئے بنانے کی تجویز ہوئی جس میں تخمیناً دو ہزار روپیہ خرچ ہوگا، اور ظاہر ادہ ہو نہیں سکتا، اس کے لئے چندہ فراہم کیا، اس قدر رقم فراہم نہیں ہوئی، کہ جس میں دو حجرے تیار ہو جائیں بلکہ فراہم کنندہ تساہل بھی کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جو رقم فراہم ہوگئی اور جو ہوگی حسب تجویز مقررہ حجروں میں صرف کریں گے، اسی قطعہ میں مسجد بھی تیار ہو رہی ہے، مگر اس کا بانی اور شخص ہے، حجروں کے چندہ دہندوں میں سے ایک شخص اپنی رقم واپس لینا چاہتا ہے اور اس رقم کو مسجد میں خرچ کرنا چاہتا ہے، اور کہتا ہے کہ چونکہ تم تعمیر حجروں میں تساہل کرتے ہو تو میں اپنی رقم کو کیوں معطل کروں بلکہ تعمیر مسجد میں خرچ کردوں، ساعیان تعمیر حجرہ کہتے ہیں کہ تم نے حجروں کی تعمیر کے لئے یہ رقم دی ہے تم کو واپس لینا اور دوسری تعمیر میں خرچ کرنے کا اختیار نہیں، پس صورت مذکورہ میں وہ اپنی رقم واپس لے سکتا ہے یا نہیں اگر اس کو حق رجوع حاصل نہیں اور اس نے باصرار تحویلدار سے لے لی تو دونوں گنہگار ہوں گے یا نہیں اور تحویلدار ضامن ہوگا یا نہیں،

الجواب، کسی شخص کو کسی خاص جگہ صرف کرنے کے لئے روپیہ دینے سے وہ روپیہ اس دینے والے کی ملک سے خارج نہیں ہوتا، لہذا یہ شخص اپنی رقم واپس کرسکتا ہے اور واپس کرکے اختیار ہے خواہ مسجد میں دے یا جہاں چاہے صرف کرے، کیونکہ جس شخص کو روپیہ دیا ہے وہ وکیل ہے، اور ید وکیل مثل ید مؤکل ہے پس جس طرح اپنے پاس ہونے سے خارج عن الملک نہیں ہوتا، اسیطرح وکیل کے پاس جانے سے بھی اور یہ روپیہ وقف نہیں ہوتا کہ گنجائش شبہ ہو۔

۱۵ شعبان ۱۳۳۲ھ (امداد صفحہ ۴ ج ۳)

فضولی فی البیع را نفع درمیان داشتن

سوال (۲۵۶) زید عمرو کے کتب خانہ کا مہتمم اور عمرو کا دوست ہے زید کو گمان غالب ہے کہ اگر میں کتب خانہ میں کوئی جزئی تصرف کروں گا تو عمرو کے خلاف نہ ہوگا: اس گمان پر زید کتب خانہ کی بعض کتابیں خالد کو اس وعدہ پر دیدیتا ہے کہ خالد ان کتابوں کو فروخت کرکے اپنا کام چلائے اور پھر جب خالد کے پاس وہ کتابیں

موجود ہوں تو زید کو دیدے، اور زید بدستور وہ کتابیں کتب خانہ میں داخل کردے، اس طرح کرنے سے عمرو کے کتب خانہ کا کچھ نقصان نہیں اور خالد کا کام بھی چل جاتا ہے اور چونکہ زید کو گمان غالب ہے کہ عمرو اس جزئی تصرف جو بغرض نفع رسانی خالد ہے (کہ خالد بھی عمرو کا دوست ہے) جائز رکھے گا، اس لئے تصریحاً اجازت تصرف نہیں لیتا تو کیا زید و خالد کو ایسا تصرف جائز ہے، بصورت مذکورہ بالا زید نے اصلاح الرسوم و تعلیم الدین (جو ایک ہی جلد میں مجلد تھیں) خالد کو دیں، خالد کے ایجنٹ نے ان کو فروخت کر ڈالا۔ اصلاح الرسوم کی قیمت ۳ ہے اور تعلیم الدین کی ۶ جلد کی قیمت ا رکھی گئی اور خالد کے ذمہ کل ۱۰ لگائے گئے، جو اصلی قیمت اُن کتابوں کی ہے، پھر خالد کے ایجنٹ نے خالد کی طرف سے زید کو اصلاح الرسوم اور جلد کی قیمت ۴ دیدی اور تعلیم الدین کی قیمت نہیں دی، بلکہ خالد کی کتابوں میں تعلیم الدین کے نسخے موجود تھے انہی میں سے ایک نسخہ تعلیم الدین کا زید کو دیدیا یہ نسخہ زید نے ۸ کو فروخت کر ڈالا، (۱) اب اگر ۶ کو تعلیم الدین اور ۳ کو اصلاح الرسوم خرید کرکے اور ایک آنہ جلد بندی کا دے کر دونوں کتابیں ایک میں مجلد کرا کے کتب خانہ میں بدستور رکھدے اور ۲ جو تعلیم الدین کے فروخت ہونے میں نفع ہوا یہ خود لے لے، یہ جائز ہے یا نہیں۔

(۲) یا یہ ۸ جو تعلیم الدین فروخت کرنے سے زید کو ملے ہیں، اگر یہ ۸ زید خالد کو دیدے اور خالد پھر دوسری تعلیم الدین جس کی عام قیمت ۶ ہے لیکر مجلد کرا کر بطریقہ مذکورہ بالا کتب خانہ میں رکھدے تو جائز ہے یا نہیں تعلیم الدین کی عام اور اصلی قیمت ۶ ہے لیکن خالد کم یاب ہونے کی وجہ سے اپنے یہاں ۸ کو دیتا ہے اسی بنا پر ۸ کو فروخت کیا ورنہ لیا ۶ کو تھا،

الجواب، اول دو امر سمجھنا چاہئے، اول یہ کہ یہ تصرف فضولی کا ہے اور تصرف فضولی کا بعد اذن مالک کے مثل تصرف وکیل کے ہے، دوسرا امر یہ کہ حقیقت اس تصرف کی اقراض و استقراض نہیں، کیونکہ کتاب ذوات القیم سے ہے ذوات الامثال سے نہیں ان دونوں امروں سے معلوم ہو گیا کہ زید وکیل عمرو کا ہے، اور خالد وکیل زید کا اور ایجنٹ وکیل خالد کا پس ایجنٹ کا فروخت کرنا بواسطہ مثل بیع اصل مالک کے ہے اور زید نے جو خالد کے ذمہ ۱۰ لگائے، چونکہ زید مشتری نہیں بلکہ ماذون فی البیع ہے. اس لئے یہ ۱۰ لگانا ایسا ہے جیسے مؤکل وکیل سے کہدے کہ یہ چیز ۱۰ کو فروخت کرنا تو اس سے یہ ۱۰ اس کے ذمہ نہیں ہوئے اور اگر اس سے زیادہ کو فروخت کرے تو وہ ملک مؤکل کی ہے اس کا رکھنا وکیل کو جائز نہیں، اب اصلاح الرسوم اور جلد کی

قیمت جو ۸ رد ی گئی یہ تو فروخت ہوگئی اور تعلیم الدین بدستور ملک عمرو کی ہے، اور دوسرا نسخہ تعلیم الدین کا جو مبادلہ میں لیا اور یہ نسخہ جدیدہ مثل اصل نسخہ مبدل بہ ملک عمرو کی ہوگی اب جو زید نے ۸ رکو فروخت کیا یہ ۸ ربھی ملک عمرو کی ہیں، لہذا ۲ ر زید کو رکھنا حرام ہیں (جواب سوال دوم متعلق سوال اول) جب یہ ۸ ر عمرو کی ملک ہیں تو بشرط رضائے متیقن عمرو کے اگر زید نے اس کی تعلیم الدین خرید لی تو بیع صحیح ہوجاوے گی۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ زید ان سب تصرفات میں غیر اصل ہے نہ خود اس کو کوئی انتفاع جائز اور نہ کوئی ایسا تصرف جائز جس میں شک ہو کہ عمرو راضی ہے یا نہیں،

۱۲ رجب ۱۳۲۳ھ (امداد ص ۱۷۱ ج ۳)

ادائے قرض کے واسطے نابالغ جس کا کوئی ولی نہیں، مال کے فروخت کرنے کی توکیل

سوال (۲۵۷) کا فر نابالغ مقروض ہے اور اس کا کوئی ولی نہیں، اب نابالغ اگر اپنا کچھ مال فروخت کرنے کیلئے بنا برادائے قرض کسی کو وکیل مقرر کرکے دے تو یہ وکالت ٹھیک ہوگی۔

الجواب۔ ایسے شخص کا ولی حاکم اسلام ہے اور جب یہ نہ ہو تو عامہ مسلمین اسی کے حکم میں ہیں، پس اگر دو چار خیر خواہ وذی اثر مسلمان اس توکیل کو جائز رکھیں تو جائز ہے (تتمہ اولیٰ ص ۲۱۳)

توکیل مذکور میں وکیل کو کمی بیشی ثمن کا اختیار ہے یا نہیں

سوال (۲۵۸) اور اسی مال کی قیمت میں اگر کمی بیشی کرنے کا اختیار بھی دے تو آیا یہ اختیار بھی حاصل ہوجاوے گا یا نہیں؟

الجواب، غبن یسیر کا اذن ہے یعنی جو عرف کے خلاف نہ ہو، (تتمہ اولیٰ ص ۲۱۴)

مہتمم مدرسہ معطین چندہ کی طرف سے وکیل ہے اور زکوٰۃ کا روپیہ تنخواہ مدرسین میں صرف نہیں کرسکتا اور اسکے لئے حیلہ متعارفہ ناجائز ہے

سوال (۲۵۹) مہتمم مدرسہ کا طلبہ کی جانب سے نائب ہے یا معطی چندہ کی طرف سے وکیل ہے، اگر نائب ہے تو قبضہ مہتمم کا خود قبضہ طلبہ کا ہے، اس صورت میں ہر ایک طرح کا مال زکوٰۃ وغیر زکوٰۃ مخلوط کرنا اور مدرسہ کی ہر ایک ضرورت تنخواہ مدرسین وخرید کتب میں صرف کرنا جائز ہونا چاہئے اور کسی حیلہ حوالہ کی ضرورت نہیں مثل ولی صغیر کے ہوگا، اور اگر مہتمم معطی کا وکیل ہے تو بیچارے مہتمم کو بڑی تکلیف کا سامنا ہوگا، اس لئے کہ مدارس میں اکثر مال زکوٰۃ اور صدقہ واجبہ کا آتا ہے اور مدرسہ میں زیادہ خرچ تنخواہ وغیرہ کا ہوتا ہے، اور خاص خوراک طلبہ میں بہت کم صرف ہوتا ہے اور ہر ایک مال کو علٰحدہ رکھنا اور کسی طرح مخلوط نہ کرنا نہایت مشکل ہے، اس سے برأت کی کیا شکل ہے، بعض جگہ جو یہ حیلہ کیا جاتا ہے کہ کسی ایک طالب علم کو دو سو یا پانچسو روپیہ دیدیا، اور

پھر وہ اس کو مدرسہ میں داخل کر دیتا ہو، کیا یہ حیلہ کافی ہے، اور اس سے ہر ایک طرح کے مال کو مخلوط کرنا اور مدرسہ کی ہر ایک ضرورت میں صرف کرنا جائز ہوگا، یا مہتمم بعض وجوہ میں نائب ہو اور بعض وجوہ میں وکیل (جیسا کہ تذکرۃ الرشید کے ص۱۶۲ میں حضرت مولانا قدس سرہٗ کے جواب سے مفہوم ہوتا ہے) تو وجوہ نیابت و وکالت کی تعیین فرمادیں کہ کس صورت میں مہتمم نائب ہے اور کس صورت میں وکیل ہے، بینوا توجروا۔

الجواب، ظاہراً مہتمم وکیل معطی کا ہے اس لئے اس کو مال زکوٰۃ تنخواہ وغیرہ میں صرف کرنا جائز نہ ہوگا، رہا مخلوط کرنا تو باذن مالکین جائز ہے اور جہاں مہتمم معتمد امین سمجھا جاتا ہے وہاں غالب عادت ناس سے یہی ہے کہ ایسے امور کا اذن ہوتا ہے، البتہ احتیاط یہ ہے کہ رقوم واجبۃ التملیک وغیر واجبۃ التملیک کو باہم مخلوط نہ کرے اور اگر وکیل طلبہ کا بھی فرض کیا جاوے تو اس کے قبضہ کو مثل قبضہ طلبہ کے سمجھا جاوے گا، لیکن اگر طلبہ کے قبضہ میں یہ مال جاتا تو کیا وہ تنخواہوں وغیرہ میں صرف کرتے اسی طرح مہتمم کو بھی بجز طلبہ کی خاص حوائج کے دوسری جگہ صرف نہ کرنا چاہئے، جس طرح امیر المسلمین نائب فقراء کا ہے مگر بیت المال سے رقم زکوٰۃ کو دوسری مدات میں خرچ نہیں کر سکتا ہے اور یہ حیلہ متعارفہ لاشے ہے فقط؛

۲۷ رمضان ۱۳۲۵ھ (تتمہ اولیٰ ص ۲۱۴، حوادث اول ص ۹۴)

عدم ضمان وکیل بصرف بلا اذن بعد موت مؤکل و عدم جواز صرف وکیل باقی بعد موت مؤکل را

سوال (۲۶۰) زید نے اپنی زندگی میں عمرو کو مبلغ سو روپے واسطے کسی کار خیر کے دیا، اور تاکید فلاں سے خط تحریر کیا کہ یہ روپیہ جس کار خیر میں مناسب ہو خرچ کرے اگر کمی ہوگی تو اور دونگا ایک چاہ پختہ کا انتظام کیا گیا، کنکر کھودنے اور دیگر اسباب کے مہیا کرنے میں تخمیناً نصف روپیہ خرچ ہو گیا، چاہ کا انتظام جو اتفاقاً رہ گیا، اسی اثناء میں زید مع اپنی بیوی کے حج کو خرچ وافر لیکر گیا واپسی میں جہاز پر زید کا انتقال ہو گیا۔ زوجہ زید نے ایک شخص سے راہ میں اپنا خطبہ کرلیا، بعد کو جب مکان پر آئی زوجۂ زید و صاحب خطبہ بیان کرتے ہیں کہ زید سو روپیہ قرض لیکر مرا ہے اور کہہ گیا ہے کہ جو روپیہ عمرو کے یہاں ہے اُسے لیکر قرض ادا کرنا باوجودیکہ زید نے علاوہ اُس روپے کے اور ترکہ بھی مثل مکان وغیرہ چھوڑا ہے اور جو حجاج ہمراہ تھے ان کا بیان ہے کہ زید نے قرضہ نہیں لیا اب ایسی صورت میں عمرو روپیہ کہاں خرچ کرے، آیا زوجہ کو واپس دے یا کہ کار خیر میں خرچ کرے یا اس کے ایک لڑکا نابالغ ہے، اس کے لئے امانت رکھے اور جو خرچ ہو چکا ہے اس کا تاوان

دے جو جواب شرعی ہو ارشاد فرمادیں،

الجواب، جو روپیہ خرچ ہو چکا ہے اس کا تاوان عمرو کے ذمہ نہیں، کیونکہ حیات مالک میں اس کے اذن سے خرچ ہوا ہے اور جو باقی ہے اس میں زوجۂ زید اور اس کے خاطب کا دعویٰ بلا دلیل شرعاً معتبر نہیں لیکن زید کے مرتے ہی وہ روپیہ امانت ہو گیا اور اذن خرچ کرنے کا جاتا رہا، اس لئے یہ باقی روپیہ زید کی ملک ہوگا اور شرعاً اس میں اس کے ورثہ کی میراث جاری ہوگی یعنی تقدیم حقوق متقدمہ علی المیراث مثل قرض وغیرہ کے ⅛ زوجۂ زید کو اور باقی ⅞ اس کے نابالغ بچہ کی ملک ہے اور اگر اور کوئی وارث بھی ہو تو ظاہر کر کے سوال کرنا چاہئے۔ (تتمہ ثانیہ ص ۲۸)

استیفائے دَین از وکیل بقبض آن،

سوال (۲۶۱) کسی شخص کو اپنا قرض وصول کرنے کو ایک شخص کو وکیل بنایا اور اطمینان کے واسطے اول اس سے روپیہ لے لیا بعد وصول ہونے کے وہ مجرا دیا، یہ جائز ہے یا نہیں۔

الجواب۔ بایں تاویل جائز ہے، کہ اس وکیل سے اس نے قرض لے لیا پھر اُس نے وصول کر کے محسوب کر دیا، ۲ شعبان ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ ص ۶۰)

رعایت مہتمم مدرس را

سوال (۲۶۲) جو مدرس مدرسہ باوجود تقرر اوقات تعلیم و تعلّم میں وقت پورا نہ کرے یا بانی یا مہتمم یا سرپرست مدرسہ چشم پوشی کرے تو شرعاً کتنا گناہ ہے؟

الجواب، متعارف چشم پوشی جائز ہے زیادہ ناجائز۔

۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ص ۲۰)

حکم ملبۂ زمینداران و نمبرداران

سوال، (۲۶۳) ایک رقم ہوتی ہے وصولی کے وقت نمبردار اپنے زمینداروں سے فی روپیہ کچھ رقم یعنی پیسہ یا اُدھنا جمع سے زیادہ وصول کرتے ہیں اور اس کے وصول کرنے کی تمام زمینداران سے اور سرکار سے اجازت ہے، وہ ملبہ نمبردار حسب مرضی زمینداران مفصل ذیل کاموں پر خرچ کر سکتا ہے،

۱۔ کوئی مولوی صاحب وعظ کے لئے آئیں اُن کو نذرانہ دیا۔

۲۔ کوئی فقیر سادھو آیا اس کو دیدیا،

۳۔ کوئی سرکاری سپاہیوں کا خرچ اٹھا وہ ملبہ میں سے پورا ہوا،

۴۔ کوئی سرکاری چپراسی آیا اس کو خوراک دیدی،

۵۔ کوئی ناگہانی خرچ گاؤں میں درپیش ہوا اس میں دیدیا،

۶۔ نمبر دار تحصیل میں جمع سمجھنے گئے وہاں سرائے میں روٹیوں پر اور آمد و رفت میں جو خرچ ہوا اس میں ملبہ میں سے رقم دیدی سو جناب من اس ملبہ سے فدوی کو نمبر دار دیتا ہے، کہ یہ رقم ہم تم کو دیتے ہیں دراصل ایک لکڑی میں نے خریدی ہے اس کی قیمت مجھے نہیں دلانا چاہتے، وہ نمبر دار وغیرہ کہتے ہیں کہ یا تو ملبہ سے یہ رقم دیدیں یا ہم خود اپنے پاس سے دیدیں، تو یہ فرمادیں کہ ملبہ کو لینا جائز ہے یا کیا؟

الجواب۔ بالغوں سے جبکہ وہ برضامندی دیں اور برضامندی خرچ کی اجازت دیں، اس کا لینا جائز ہے۔ اور نابالغوں کی رقم سے جائز نہیں، اور اگر لکڑی کی قیمت کوئی زمیندار اپنے پاس سے دے تو اس میں بھی اسی شرط سے اجازت ہے کہ وہ رقم بالغ دے اور رضامندی کر دے۔

۱۷ جمادی الاخری ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ص ۲۳)

تحقیق صرف کردن خرچ متفرق اسکول

سوال (۲۰۴) ہم جس اسکول میں رہتے ہیں گورنمنٹ اسکول ہے اس کے بعض اخراجات کے لئے مبلغ ۶ ماہوار سالانہ ساٹھ روپے سرکار سے ملتا ہے اور اس کے لئے بعض مد مقرر ہے اس سے زائد اس بارہ میں جو مقرر ہے نہیں ملے گا مثلاً جھاڑو کش کیلئے ۸ مقرر ہے مگر آٹھ آنے میں جھاڑو کشی کا کام مہینہ بھر ہونا دشوار ہے اور نوکر نہیں مل سکتا ہے اور وہ ۸ خرچ نہ ہوں تو پھر گورنمنٹ سے وہ بھی ملنا موقوف ہو جائے گا اور جھاڑو کش کا رہنا ضروری ہے تو ایسی مجبوری کے وقت میں جھاڑو کش کا کام کسی طرح انجام دیا جاتا ہے اور وہ ۸ پیسہ بچ جاتا ہے ایسی ہی اور بھی مدیں ہیں جس کا پیسہ کچھ بچتا ہے اگرچہ پانچ روپے تک خرچ کرنے سے اور اس کا حساب دینے سے چاہے غلط ہو یا کچھ سرکار ہوئے گی تو نہیں مگر حساب نہ دینے سے کیفیت طلب کرتی ہے، اور حساب ماہ بماہ بھیجا جاتا ہے تو ایسے وقت میں وہ زائد پیسہ جو بچتا ہے اپنی ذات میں خرچ کرنا کیسا ہے، ایسی ہی کل آفس میں خود لے لیتے ہیں، چنانچہ پہلے ہمارے عہدہ میں یہاں جو تھے وہ بھی اسی طرح اپنی ذات خاص میں خرچ کرتے تھے، اور دیگر مدرسین کو دیتے تھے تو دوسرے کو بھی دینا کیسا ہے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، آپ نے لکھا ہے کہ جھاڑو کش کا کام کسی طرح انجام دیا جا سکتا ہے، تو وہ ۸ اسی شخص کو کیوں نہ دیدیے جاویں، اسی طرح دوسرے کاموں میں اور خود رکھنا کسی طرح جائز نہیں، کیونکہ یہ شخص سرکار کا وکیل ہے، اور وکیل مالک نہیں ہوتا امین ہوتا ہے، امین کو انتفاع امانت سے بدون اذن مؤکل حرام ہے،

۲۸ محرم الحرام ۱۳۳۲ھ (حوادث اولیٰ ص ۱۳۱)

عدم جواز مخالفت مؤکل برائے وکیل وعدم جواز خریدن چیزیکہ برائے فروخت از وکیل باشد — برائے نفس خود،

سوال (۲۶۵) اگر سامان مذکورہ کا افسر متعلقہ جس کے ذریعہ سے سامان نیلام ہوتا ہے وہ کسی مستری سے اس سامان کی قیمت دریافت کرکے کہ موجودہ صورت میں اس سامان کی کیا قیمت ہوسکتی ہے، اور پھر وہی قیمت وہ افسر داخل سرکاری خزانہ کرکے وہ سامان لیلیوے تو یہ بیع جائز ہے یا ناجائز جب کسی قسم کی بولی وغیرہ نہ دیوے۔

الجواب، اگر قانوناً اس افسر کو ایسی کارروائی کی اجازت ہو تو جائز ہے، ورنہ شرعاً بھی جائز نہیں، لان الوکیل لا یجوز لہ المخالفۃ ولا ان یشتری لنفسہ،

۱۱ جمادی الثانی ۱۳۳۲ھ (حوادث اولی ص ۱۴۱)

رفع شبہ بر عدم جواز آمدنی وکالت،

سوال (۲۶۶) ہدایہ میں تصریح ہے کہ ان طاعات پر اجرت جائز نہیں جو مسلمان کے ساتھ مختص ہوں، نصرت مظلوم اگرچہ طاعت ہے لیکن مسلم کے ساتھ مختص نہیں پس وکالت کی آمدنی کیوں ناجائز ہے جیسے کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا تھا،

جواب، یوں تو تعلیم مذہب بھی مخصوص بامسلم نہیں، یہ قید اختصاص بامسلم کی غیر واجب میں معلوم ہوتی ہے، جیسا نکاح وذبح، بخلاف نصرت مظلوم یا تعلیم دین کے کہ امور واجبہ سے ہیں گو اختصاص نہ ہو واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم، ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ (امداد ثالث ص ۶۳)

توجیہ وشرائط جواز پیشہ وکالت

سوال (۲۶۷) حضور نے دربارۂ وکالت احقر کے استفتاء پر تحریر فرمایا تھا کہ اگر مؤکل سچا ہے تو مظلوم ہے مظلوم کی نصرت واجب ہے، واجب پر اجرت لینا ناجائز ہے، اور اگر جھوٹا ہے تو ظالم ہے، ظالم کی نصرت حرام ہے اور حرام پر اجرت لینا بھی حرام ہے، لیکن اگر وکالت کی فیس کو واجب یا حرام کی اجرت نہ کہا جاوے بلکہ مثل نفقہ قاضی یا حاکم کے اس کو بھی نفقہ کہا جاوے تو جواز کی گنجائش ہوسکتی ہے یا نہیں، اور اگر یہ تاویل نہ چل سکے تو پھر یہ تاویل ہوسکتی ہے کہ وکیل نصرت کی اجرت نہیں لیتا ہے بلکہ ایک خاص وقت اور خاص دن میں محبوس رہنے کی اُجرت لیتا ہے، کیونکہ غایت مافی الباب وکیل پر مؤکل کو قانونی مشورہ دیدینا واجب ہوگا، اب مؤکل کو چاہئے کہ اس کے مشورہ کے موافق عمل کرے، اگر خود عمل کرنے پر قادر نہیں ہے تو وکیل اس کا ذمہ دار نہیں ہوسکتا باوجود اس کے وکیل کو عدالت میں لے جانا اور اپنے کام کے لئے محبوس رکھنا یہ غالباً متقوم عند الشرع ہوسکتا ہے، اس سے بھی کسی قدر اس کی تائید ہوسکتی ہے، کہ بسا اوقات ایک مقدمہ میں کئی کئی وکیل کرتے ہیں جن میں سے

بعض گفتگو کرتے ہیں اور بعض خاموش بیٹھے رہتے ہیں، جب عدالت کا وقت ختم ہو جاتا ہے چلے جاتے ہیں، اب ان وکیلوں نے جنھوں نے خاموشی کی حالت میں عدالت کے وقت کو پورا کر دیا، باوجودیکہ مقدمہ میں نصرت نہیں کی مگر فیس لے لی، اس سے معلوم ہوا کہ محض حبس کی فیس لی ہے، ورنہ ان کو کچھ نہیں ملنا چاہیے تھا، کیونکہ مقدمہ میں نصرت نہیں کی، آیا اس تاویل سے وکالت جائز ہوسکتی ہے یا نہیں، فقط بینوا توجروا،

الجواب، سائل نے جو توجیہات اس کے جواز کی لکھی ہیں وہ کافی ہیں، اور ان سب سے سہل تر توجیہ یہ ہے کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ حرمت استیجار مخصوص ہے طاعۃ مختصہ بالمسلم کے ساتھ اور نصرتِ مظلوم منجملہ طاعات عامّہ کے ہے، پس اس میں اس حرمت کا حکم نہ کیا جاوے گا، حاصل یہ کہ پیشۂ وکالت فی نفسہ جائز ٹھہرا، مگر شرط یہ ہے کہ سچے مقدمات لیتا ہو۔[1]

۲۷ رمضان المبارک ۱۳۳۲ھ (حوادث اولیٰ ص ۱۵۳)

کتاب الکفالۃ

دعویٰ مہر بکفیل

سوال (۲۶۸) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کا نکاح ہندہ سے بمہر مبلغ اڑھائی ہزار روپے کے قرار پایا اور خالد والد زید ضامن ادائے مہر از طرف زید ہوا بعد عرصہ چھ سات سال کے خالد نے اپنی جائیداد منقولہ اپنے تین لڑکوں عمرو بکر و زید اور اپنی ایک زوجہ میں زبانی تقسیم کر کے اپنے قبضہ میں رکھی اس کے چند یوم بعد زید کا انتقال ہو گیا، بعد ازاں خالد بھی مر گیا، اس حالت میں عمرو بکر اس کی جائداد کے وارث ہوئے، اور جو حصے عمرو بکر کو جائداد خالد سے ملے ہیں وہ بہت کم قیمت ہیں، اب زوجۂ زید دعویٰ اپنے مہر کا اپنے بھائی اور ماموں کی معرفت سے عمرو بکر پر کرتی ہے، اور بگواہی زبانی گواہان نکاح و قاضی نکاح پڑھانے والی کی ضمانت خالد ادائے مہر حسب منشا خود ثابت کرتی ہے، اور کوئی ثبوت تحریری اس بارہ میں نہیں رکھتی اور عمرو

---

[1] اور یہ شبہ نہ ہو کہ جب یہ نصرتِ مظلوم ہے اور واجب ہے گو مختص بالمسلم نہ ہو تو اس پر اجرت لینا کب جائز ہوگا، جواب یہ ہے کہ یہ عدم جواز بوقت تعین ہے اور یہاں تعین نہیں پس جائز ہوگا، نظیرہ ما فی الدر المختار والافضل ان یغسل المیت مجانا فان ابتغی الغاسل الاجر جاز ان کان ثمہ غیرہ والا لا لتعینہ علیہ الخ کذا فی باب الجنازۃ ۱۲ منہ

بکر بیان کرتے ہیں کہ ہم سے کبھی خالد نے اپنا ضامن ہونا مہر کا بیان نہیں کیا تو کیا از روئے شرع شریف عمرو بکر مستحق ادائے مہر مذکور ہو سکتے ہیں، اور اگر ہو سکتے ہیں تو جس قدر ارث پائی ہے اس کے موافق عمرو بکر دیں گے یا اور زیادہ بھی دینے کے مستحق ہیں، بینوا توجروا۔

الجواب۔ درحالیکہ کفالت کے گواہ موجود ہیں کفالت ثابت ہو جائے گی، اور کفالہ بالمال موت کفیل سے باطل نہیں ہوتی، پس ادائے زر کفالہ میراث پر مقدم ہے پس ہندہ جائداد خالد کی جو کہ عمرو بکر کے قبضہ میں ہے زر مہر وصول کر سکتی ہے، اگر جائداد کفایت نہ کر سکے زائد کا مطالبہ عمرو بکر سے نہیں ہو سکتا، اور عمرو بکر زید کے ترکہ سے بقدر اپنے حق کے وصول کر سکتے ہیں بشرطیکہ کفالہ بامر زید ہوئی ہے ورنہ زید کے ترکہ سے عمرو بکر کچھ تعرض نہیں کر سکتے۔ اما الکفیل بالمال فلا تبطل لان حکمها بعد موته فیوفی من ماله ثم ترجع الورثة علی المکفول عنه ان کانت بامره، شامی جلد ۳ صفحہ ۲۵۷۔

۱۵ ربیع الاول (امداد ثالث ص ۲۲)

ریلوے کمپنی سے ضمان لینا

سوال (۲۶۹) اگر بریگ سے قفل توڑ کر کسی بکس سے ریل والوں نے مال چرالیا ہو تو عدالت کمپنی سے وصول درست ہے یا نہیں؟

الجواب ریلوے کمپنی ضامن ہوتی ہے، حفاظت اموال بریگ کی اس لئے اس سے وصول کرنا درست ہے، ۲۹ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۷۳)

کتاب الحوالۃ

اشتراط رضا محیل و محتال علیہ در حوالہ

سوال (۲۷۰) ایک شخص نے کسی کی واجب الادا رقم روک لی دوسرے نے اپنے نام سے وصول کرنے کے حیلہ سے دیدی یعنی جس کی واجب الادا رقم تھی جو اصل قرضخواہ تھا اس کو دیدی اور وصول کئے ہوئے شخص کو کہدیا کہ تمہارے روپے ہم نے اس کو دیدیئے اس نے جواب نہ دیا تو یہ معتبر ہوا یا نہیں؟

جواب، جائز و معتبر نہیں یدل علیہ اشتراط رضا المحیل والمحتال علیہ والمحتال فی الحوالۃ

۲۷ ربیع الاول ۱۳۲۵ھ (امداد ثالث ص ۱۲۲)

حوالہ دین کے بر دیگرے

سوال (۲۷۱) روپیہ پیسہ یا کوئی چیز ایچ لینے کا معاملہ درست ہے

ع ایچ لینا ذمہ دار ہونا ۱۲ س

یا نہیں، صورت اس کی اس طرح پر ہے میں نے ایک رسالہ ۲/ پر عبد الحفیظ کے ہاتھ فروخت کیا اس نے ہم کو ایک چونی دی اور کہا کہ ۱/۷ واپس کرو میں نے محمد یحییٰ سے اس کے سامنے کہدیا کہ ۱/۷ جو تمہارے ذمہ کتاب کے دام باقی ہیں عبد الحفیظ کو دیدینا، محمد یحییٰ نے منظور کرلیا اور عبد الحفیظ نے بھی کہا کہ میں محمد یحییٰ سے لے لوں گا اب تم سے کچھ واسطہ نہیں ہے پس یہ لینا دینا کیسا ہے۔

الجواب ، یہ حوالہ ہے اور حوالہ درست ہے، مگر اس صورت خاص میں اس قدر اور ضرورت ہے کہ آپ عبد الحفیظ سے ۱/۷ بقیہ کے نسبت اتنا اور کہدیجئے کہ یہ ہم کو بالفعل قرض دیدو اور وہ منظور کرلے۔ پھر یہ معاملہ حوالہ کا کیجئے، ۲۶ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ ص۲۴)

مبادلۂ حوالۂ اقل نقد باکثر نسیہ

سوال (۲۷۲) زید نے بعوض کچھ اپنے گذشتہ حساب کتاب کے مثلاً چار سو پچاس روپے نقد کے دلاپانے کی ڈگری ایک انگریز پر باقاعدہ حاصل کرلی ہے، انگریز چند ماہ میں بالاقساط مبلغان مذکور ادا کرے گا زید چونکہ کسی دور دراز جگہ کا باشندہ ہے، یہاں مقیم نہیں رہ سکتا لہذا وہ کسی دوسرے شخص مثلاً خالد کو جو یہاں کا مقیم ہے وہ ڈگری مذکور بدیں شرط حوالہ کرتا ہے کہ خالد اس کو مثلاً دو صد روپیہ نقد یکمشت ابھی ادا کردے اور بعد میں دو صد پنجاہ روپیہ بالاقساط وصول کرکے اپنے قبضہ و تصرف میں لاوے، زید کو اس رقم سے کوئی واسطہ نہ ہوگا، آیا خالد جو یہاں کا مقیم ہے زید کی شرط مذکورہ بالا کو شرعاً کرلینے کا مجاز ہے یا نہیں اس داد و ستد کارروائی میں کوئی امر خلاف شریعت تو نہیں ہے؟

الجواب ، یہ تو جائز نہیں مگر یوں کرے کہ خالد کو وکیل بنادے کہ تم اس انگریز سے تقاضا کرکے وصول کرو، اور اڑھائی سو روپے اس کام پر تمہاری اجرت ہے، اور دو سو روپیہ تم ہم کو قرض دیدو، وہ بھی وصول کرکے اپنے قرضہ میں رکھ لینا[1]،

۸ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ص۱۶)

دوسرے پر دین کا حوالہ کرنا

سوال (۲۷۳) زید کا قرض دس روپیہ عمرو کے ذمہ ہے۔ خالد نے زید سے کہا کہ دس روپیہ تم مجھ سے لیلو میں اپنا یہ روپیہ عمرو سے وصول کرلوں گا،

الجواب ، اگر تینوں راضی ہوں تو جائز ہے

---

[1] لیکن اگر خالد کو اس انگریز سے وصول نہ ہوا تو وہ اپنا روپیہ زید سے واپس کرے گا ۱۲

کتاب الودیعت

جواز گرفتن مال تلف شدہ از مودع بالاجر بحیلہ

سوال (۴۷۴) زید کا ایک بکس مودع بالاجر کے ذریعے سے آیا جس میں تنو روپے کا مال تھا، مگر اس میں سے پچاس روپے کا مال راستہ میں چوری ہوگیا، زید نے ہر چند کوشش کی کہ جو مال تلف ہوگیا ہے اس کا معاوضہ مل جاوے مگر مودع بالاجر نے کچھ نہیں دیا، اب تھوڑے عرصہ کے بعد زید کا ایک بکس مال کا جس میں پچاس روپے کا مال تھا اسی مودع بالاجر کے پاس گم ہوگیا ہے، اب مودع بالاجر نے اس گم شدہ کی بابت فہرست طلب کی ہے، اب زید اپنے پچاس روپے سابق کے اس میں اس طرح وصول کر سکتا ہے کہ بجائے پچاس روپے کے لکھدے کہ میرا مال اس میں سو روپے کا تھا تو مودع بالاجر دیدیگا یہ صورت جائز ہوگی۔

الجواب۔ جائز ہے۔ ۱۷ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ (حوادث خامس ۲۶)

توکیل مودع مودَع را

سوال (۴۷۵) زید عمرو کے پاس وقتاً فوقتاً امانت رکھتا تھا اور بوقت ضرورت لیتا دیتا رہا۔ گو یہ معاملہ مدت تک رہا مگر جانبین نے کچھ لکھا یا نہیں ایک مرتبہ زید نے عمرو سے مبلغ ؏ہ جو اس کا امانت تھا طلب کیا، عمرو نے کہا کہ مجھے تو یاد ہے کہ صرف ۱۰ رہیں زید نے زبانی یاد دلایا۔ آخرش عمرو نے لاکر پورے ؏ہ حوالہ کئے، اب زید نے دوبارہ عمرو کو ۵؎ روپے دئے کہ فلاں ماہ میں فلاں شئے خرید کر ہمارے پاس روانہ کرنا، عمرو نے نہ بھیجا اس وقت روپیہ لیکر وعدہ تو کیا جب زید بذریعہ تحریر متقاضی ہوا تو عمرو نے لکھا کہ میرے ذمہ تمہارا کچھ نہیں پھر تو اس کی حیص بیص ایک مدت تک رہی زید نے رفع دفع کرنے کی غرض سے یہ لکھا کہ تم یہ مبلغات خمسہ کسی مدرسہ یا یتیم خانہ میں دیدو، بایں نیت کہ یا اللہ اگر زید کا روپیہ ہے تو اسکو ورنہ مجھ کو ثواب ملے، عمرو نے جھلا کے صرف زید کے نام روپیہ داخل کیا اور لکھا کہ تم نے جبراً دلوایا ہے، تو ایسی مشتبہ صورت میں جب کہ زید کی تحریر کے خلاف روپیہ عمرو نے صدقہ کیا تو آیا زید کو مبلغ ۵؎ روپے عمرو کو دینا چاہئے یا نہیں، فقط۔

الجواب، جب اول بار میں زید کی یاد دہانی پر عمرو نے ؏ہ روپے ادا کئے تو بدلالت حال اس کے وجوب کا اقرار کرلیا، جو اس پر حجت ہے، اب دوبارہ جو زید نے عمرو کو ۵؎ دیئے، وہ امانت ہیں اس کا رکھنا عمرو کو جائز نہ تھا، اس لئے یہ کہنا کہ جبراً دلوایا گیا غلط ہے، اور یہ صدقہ زید کی طرف سے

ہوگیا اور یہ عدد فرو دینا خلاف تحریر زید نہیں ہے، زید کا اصل مقصود تو یہی تھا کہ میری طرف سے دیا جائے دوسری بات محض رفع نزاع کے لئے کہدی تھی، پس خلاف مقصود نہیں ہوا، اس لئے یہ عدد نہ زید سے عمرو لے سکتا ہے اور نہ عمرو سے زید، واللہ اعلم ۶ ذی الحجہ ۱۳۲۱ھ (امداد جلد سوم ص ۴۳)

نزع امانت نابالغ از دست خائن

سوال (۲۷۶) اگر عم در مال ایتام برادر اعیانی خود خیانت می کند و مال اوشان بے فائدہ مصروف می سازد درین صورت مال ایتام مذکور برائے حفاظت و تصرف بر آنان حوالہ شخص دیگر امین معتبر کردہ شود جائز است یا نہ، ونیز جد فاسد مادر می دارند اگر باشان حوالہ کردہ شود درست است یا نہ، بینوا توجروا،

الجواب، فی الدر المختار باب الحضانۃ ولو الاب مبذرا یدفع کسب الابن الی امین کما فی سائر الاملاک اھ ازیں روایت ثابت شد کہ ہرگاہ پدر کہ علی الاطلاق ولایت می دارد بتبذیر و اتلاف ممنوع التصرف و مسلوب الولایت می شود پس تا بعم چہ رسد و درایں تخصیص مادر نیست ہرکس کہ اہلیت امانت و حفاظت داشتہ باشد احق و مقدم تر است، واللہ اعلم۔

۱۵ رمضان المبارک ۱۳۲۳ھ (امداد جلد سوم ص ۴۴)

تصرف متولی در رقم چندہ خلاف رضائے اہل چندہ

سوال (۲۷۷) ایک قصبہ میں جامع مسجد و عیدگاہ کی ترمیم کی وقتاً فوقتاً ضرورت واقع ہوئی اور بنظر آسانی ایک آمدنی دوامی کی حاجت محسوس ہوئی لہٰذا تمام باشندگان نے جمع ہوکر یہ صورت نکالی، اور اس امر پر اتفاق کیا کہ تمام لوگ بوقت فروختگی مال بحساب فی روپیہ ایک چہدام دیا کریں، تاکہ رفتہ رفتہ رقم معتدبہ ہوجائے، اور بوقت ضرورت خاص ان ہی مسجدوں میں کام آئے اور صرف کی جائے، چنانچہ اس پر عملدرآمد شروع ہوا، اور اہتمام و انتظام کے لئے امام جامع مسجد کو متولی مقرر کیا، اور یہ آمدنی ہمیشہ بطور امانت خریداران قصبہ کے پاس جمع ہوتی رہی، اور بوقت ضرورت متولی نے خریداران سے وصول کر کے مصارف مخصوصہ و مقررشدہ میں صرف کیا، اور کبھی کسی خریدار نے علاوہ مصارف مقررہ کے اور مصارف یا کسی دوسری مسجد میں صرف کیا تو اہالیان قصبہ و متولی نے ان سے دام وصول کیا اور ہمیشہ زمانہ دراز تک امور مذکورہ بالا پر عملدرآمد ہوتا رہا، اب کچھ زمانہ سے چند خریداران جو محض بحیثیت امین اس رقم امانت پر قابض ہیں دینے سے انکار کرتے ہیں تو آیا ان حضرات کو شرعاً رقم مذکور کو روک لینا اور علاوہ اس مسجد کے جس کے لئے تخصیص کی گئی جس مسجد اور کار خیر میں چاہیں صرف کر سکتے ہیں یا نہیں، اور متولی مساجد مخصوصہ کو استحقاق وصول کرنے رقم مسطور کا ہے یا نہیں، بینوا بالکتاب،

الجواب، جس شخص کے پاس یہ رقم جمع ہوئی ہے اس میں اگر خود اس شخص کی بھی کسی قدر رقم ہے تو اس قدر میں اس امین کو اختیار ہے کہ جو چاہے تصرف کرے اور جس قدر دوسروں کی رقم ہے اس میں اگر کوئی صاحب رقم اس امین کو اختیار و اجازت دوسرے تصرف کی دیدے اسی طرح اس میں بھی اس کو تصرف جائز ہے، اور ان دونوں رقموں میں متولی کو یا کسی اور کو کوئی حق مطالبہ و مزاحمت کا نہیں ہے، اور جس قدر دوسروں کی رقم ہے اور ان اصحاب رقوم کی طرف سے اس امین کو تصرف کی اجازت بھی نہیں ہے، اس میں کوئی تصرف جائز نہیں، بلکہ اُن اصحاب رقوم کو یا جس شخص کو وہ اختیار دیدیں خواہ متولی ہو یا اور کوئی ہو وہ اختیار حاصل ہے اور اگر مجموعی رقم سے کچھ خرچ ہو چکا ہو اور اس کے بعد یہ نزاع ہوا ہو تو احکام مذکورہ مفصلہ سابقہ ہر قسم کی رقوم میں حصہ رسد جاری ہونگے البتہ اگر کوئی رقم مختلط نہ ہوئی ہو تو اس جدا رکھی ہوئی رقم میں اس کا حکم خاص مستقلاً جاری رہیگا،

یہ تو سوال مذکور کا جواب تھا، اور ایک مستقل کلام سوال مذکور کے متعلق اس پر ہے کہ آیا ایسا قانون آمدنی کا مقرر کرنا جائز ہے، یا نا جائز، چونکہ اس کو پوچھا نہیں گیا اس لئے جواب سے تعرض نہیں کیا گیا، لیکن چونکہ اکثر لوگوں کو اس طرف التفات کم ہے اس لئے اس قدر اجمالاً تنبیہ کردی گئی، اور جن قواعد شرعیہ پر یہ تقریر مبنی ہے، چونکہ وہ نہایت معروف ہیں اس لئے نقل عبارات کتب کی حاجت نہیں سمجھی، واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم،

۱۲ ذیقعدہ ۱۳۲۷ھ (امداد جلد سوم، ص۱۴۴)

ضمان مودع المودع

سوال (۲۷۸) ایک مسماۃ نے زید کو چھا کلی وجگنو واسطے بنوانے کے دی، چونکہ وہ معتکف تھا اس نے عمرو کو دیدی، اس کا بیان ہے کہ میں طاقچہ پر رو برو رکھ کر پاجامہ پہننے لگا اور بھول کر چلا گیا اب مسماۃ زید سے دعوی کر سکتی ہے یا نہیں اور زید عمرو سے دعوے کر سکتا ہے یا نہیں،

الجواب، صورت مذکورہ میں مسماۃ موکلہ حکم مودِعہ اور زید وکیل حکم مودَع اور عمرو وکیل الوکیل حکم مودع المودع میں ہے، کما ہو ظاہر اور مودع المودع مثل مودع کے ہلاکت ودیعت سے ضامن نہیں ہوتا، استہلاک سے ہوتا ہے، اور نسیان استہلاک ہی ہے پس صورت مسئولہ میں عمرو ضامن ہے، اب مسماۃ کو اختیار ہے خواہ زید سے دعویدار ہو اور وہ عمرو سے دعوے کرے اور خواہ ابتداءً عمرو ہی سے دعویٰ کرے اور زید سے کچھ تعرض نہ کرے نہ زید عمرو سے کچھ مواخذہ کرے، فرع ولو قال وضعتہا بین یدی وقمت ونسیتہا فضاعت یضمن، شامی ج ۳ ص ۵۰۰، وفیہا

امانۃ فلا تضمن بالہلاک مطلقا سواء امکن التحرز عنہ ام لا در مختار قولہ سواء امکن التحرز عنہ ام لا ولیس منہ النسیان کما لو قال وضعت عندی فنسیت وقمت بل یکون مفرطاً بخلاف ما اذا قال ضاعت ولا ادری کیف ذہبت فان القول قولہ مع یمینہ ولا یضمن لانہ امین حموی بتصرف طحطاوی جلد ۳ صفحہ ۳۷۶ ولو استہلک الثانی الودیعۃ ضمن بالاتفاق ولصاحب الودیعۃ ان یضمن الاول ویرجع علی الثانی وان یضمن الثانی ولا یرجع طحطاوی جلد ۳ صفحہ ۳۸۲، واللہ اعلم،

۹ شوال روز جمعہ ۱۳۰۷ھ (امداد جلد ۳ ص ۹۹)

حکم دستیابی قطعات اسٹامپ

سوال (۲۷۹) انگریزی قانون کے موافق کرایہ نامہ اسٹامپ پر لکھا جاتا ہے ہر کا ہویا ہر کا اور یہاں یہ قاعدہ رواج پکڑ رہا ہے کہ جب کوئی مکان کرایہ پر دیا جاتا ہو تو کرایہ پر لینے والے اسٹامپ خرید کر مالک کو دیدیتا ہے کہ لکھوا لینا یہاں وقت انتخاب میں بہت سے اسٹامپ ایسے نکلے کہ جواب تک سادہ ہیں ان کا پتہ چلے گا مالکان کو واپس کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے لیکن جو اشخاص بیرونی ہیں یا مر گئے ہیں یا اُن کا پتہ نہیں ان کی بابت کیا کرنا چاہئے ان اشخاص میں اہل اسلام اور ہنود دونوں ہیں۔

الجواب: جن مالکان اسٹامپ کا کچھ پتہ نہ چلے اُن اسٹاموں کو فروخت کرکے وہ دام من جانب مالکوں کے مصارف خیر میں صرف کر دئے جائیں،

کتابُ الضّمان

تلف ودیعت مع مال مودع یا بغیر آن

سوال (۲۸۰) زر ومال امانت خواہ کسی بالغ کا ہو یا نابالغ کا امین یا اس کے ملازم یا عزیز و آشنا کے پاس سے جس کو امین نے معتمد سمجھ کر رکھوا دیا ہو سرقہ یا تلف یا گم ہو جاوے یا لُٹ جاوے، اور امین کی جانب سے یا جس کے پاس امین نے رکھوا دیا تھا بددیانتی و بے احتیاطی ظہور میں نہ آئی ہو تو وہ زر ومال امین وغیرہ پر ادا کرنا لازم ہوگا یا شرعاً اس تاوان سے وہ محفوظ رکھے جائیں گے، اور اگر امین کا زر ومال بھی شامل زر ومال امانت کے تلف ہوا ہے اور کچھ حصہ زر کا سرقہ واتلاف ولوٹ سے بچ رہا ہے اور دونوں کے زر کی تعداد مساوی نہیں کم وبیش ہے، تو وہ دونوں کس حساب سے بقیہ زر تقسیم کریں گے، بحصہ رسد یا کیونکر

اور اگر ایک مکان و ایک بکس و صندوق وغیرہ میں امین کا ذاتی روپیہ اور نیز زر امانت رکھا ہوا ہے، مگر تھیلیاں یا ظروف جن میں روپیہ ہے دونوں کے جُدی جُدی ہیں، اور اتفاقیہ بلا ظہور بددیانتی امین کے زر امانت چوری ہوگیا، اور امین کا ذاتی روپیہ بچ رہا، تو امین زر امانت کا ذمہ دار ہوگا یا نہیں؟

الجواب، اگر امانت جدا رکھی ہے اور باوجود نگہداشت کے تلف ہوگئی امین ضامن نہ ہوگا، اور اگر شامل رکھی ہے سو اگر ایسی چیز اس کے ساتھ شامل ہے کہ جدا ہوسکتی ہے تو بھی امین ضامن نہیں، تلف شدہ و باقی ماندہ مالک کی ہے، اور اگر ایسی چیز کے ساتھ مخلوط ہے کہ تمیز دشوار ہے سو اگر بدون شامل کئے ہوئے شامل ہوگئی تب دونوں شریک ہیں تلف شدہ و باقی ماندہ دونوں پر حصہ رسد تقسیم ہوگا، اور اگر دانستہ شامل کی ہے تو اگر مالک کی اجازت سے کی ہے تب بھی دونوں مثل سابق کے شریک ہیں اور متلف اور باقی دونوں کا حصہ رسد ہے اور اگر بلا اجازت خلط کردیا تو محض خلط سے ضامن ہوجائے گا جو کچھ تلف ہوگا امین کا ہوگا، اور اس کی امانت کی قیمت ادا کرنا واجب ہوگا وکذا لو خلطہا المودع بمالہ بغیر اذن بحیث لا تمیز الا بکلفۃ کحنطۃ بشعیر ودراہم جیاد بزیوف مجتبیٰ ضمنہا لاستہلاکہ بالخلط (قولہ لا تمیز فلو کان یمکن الوصول الیہ علی وجہ التیسیر کخلط الجوز باللوز والدراہم السود بالبیض فانہ لا ینقطع حق المالک اجماعاً شامی) وان باذنہ اشترکا شرکۃ املاک کما لو اختلطت بغیر صنعہ ۱۲ قولہ بغیر صنعہ فان ہلک ہلک من مالہما جمیعاً ویقسم الباقی بینہما علی قدر ما کان لکل واحد منہما کالمال المشترک بحر شامی) اور اگر امانت جاتی رہی اور امین کی ذاتی چیز بچ گئی باوجود حفظ کے ضامن نہیں وہی امانۃ فلا تضمن بالہلاک مطلقاً سواء امکن التحرز عنہ ام لا ہلک معہا شئی ام لا ۱۲ واللہ اعلم، (امداد ج ۳، ص ۷۴)

ضمان امین بہ ارسال امانت بدست اجنبی

سوال (۲۸۱) زید کے دو پارچے کرتا عمرو خیاط نے بکر کو جو زید کے ملازم کا لڑکا عاقل بالغ ہے یہ کہہ کر دیئے کہ ان کو زید کے پاس پہونچادے اور بکر نے بخوشی خاطر ان کو اپنی تفویض میں لے لیا، اور بسواری رتھ سوار ہو کر روانہ ہوا، راستہ میں بکر کی غفلت سے ایک کرتا گم ہوگیا، اب زید کو اس کرتے گم شدہ کی قیمت بکر سے لینا جائز ہے یا نہیں، بینوا توجروا،

الجواب، فی الہدایۃ ومن استعار دابۃ فردہا مع عبدہ او اجیرہ لم یضمن وکذا اذا ردہا مع عبد رب الدابۃ او اجیرہ وان کان ردہا مع اجنبی ضمن اھ ج ۲ ص ۲۶۶، اس سے معلوم ہوا کہ عمرو خیاط کو یہ کپڑے بکر کو سپرد کرنا جائز نہ تھا اس لئے اس کا تاوان عمرو سے لے سکتا ہے،

۱۰ ربیع الثانی ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۲۸)

ضمان نوٹ گم شدہ بعد دستیابی آن برکسے کہ بعد فقدان اول دستخط او باشد

سوال (۲۸۲) کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص زید کا نوٹ گم ہو گیا تھا، مالک نوٹ نے جابجا بنکوں میں نوٹ کا نمبر بھیجکر سب کو اپنے گم شدہ نوٹ کی خبر دیدی اور اس کا پتہ چلانے کیلئے لکھدیا، بعد سال ڈیڑھ سال کے اس نوٹ کا پتہ چل گیا اور وہ نوٹ ایک شخص عمرو کے پاس مل گیا پولیس نے ان تمام اشخاص سے جنھوں نے گم شدگی کے زمانہ میں نوٹ چلا کر اپنے دستخط نوٹ پر ثبت کئے تھے (مثلاً بکر و خالد و بشیر کہ عمرو نے بکر سے خریدا تھا اور بکر نے خالد سے اور خالد نے بشیر سے اور بشیر کا حال معلوم نہیں کہ اس کو کس طرح وہ نوٹ حاصل ہوا) اقرار لیکر نوٹ کے دست بدست مستعمل ہونے کا ثبوت حاصل کیا، لیکن آخری نام کا مسمیٰ مثلاً بشیر مر گیا ہے، اس سے بذریعہ اقرار ثبوت نہیں پہونچا سکتے ہیں، لیکن بذریعہ بینہ اس کے دستخط اور اس کے روپے پانے کا ثبوت ہو سکتا ہے، لیکن بعد ثبوت دریافت طلب یہ امر ہے کہ وہ بشیر اس نوٹ کو چرانے والا یا بطور لقطہ کے پانے والا قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں، صرف اسی دلیل سے کہ نوٹوں کے چلانے میں لوگوں کا معمول اسی طرح جاری ہے کہ نوٹ دوسرے شخص کو دے کر اس سے روپیہ مندرجہ نوٹ وصول کر لیتے ہیں، اور اس نوٹ پر اپنے دستخط ثبت کر دیتے ہیں، اب علمائے دین کیا فرماتے ہیں کہ یہ تعامل لوگوں کا دلیل شرعاً اس امر کی ہو سکتا ہے یا نہیں، کہ آخری دستخط والا شخص یعنی بشیر وہی چور یا بطور لقطہ پانے والا ہے اگرچہ عقلاً جائز ہے، کہ آخر شخص چور یا بطور لقطہ پانیوالا نہ ہو، بلکہ اس نے دوسرے شخص جو فی الواقع چور یا بطور لقطہ پانے والا ہے اور وہ شخص ناواقف ہے دھوکہ دے کر بقیمت ارزاں لے لیا ہو، یا اور کسی طرح سے مفت یا بقیمت ارزاں لے لیا ہو، اور بوجہ ناواقفی کے اس نے دستخط نہ کئے ہوں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں بھی واقف کار آدمی کو جس نے ناواقف سے نوٹ لے لیا ہے یہ ضرور ثابت ہو جائے گا کہ یہ نوٹ اس نے کہیں سے پایا ہے، یا چرا کر لایا ہے، بہر حال وہ واقف کار پانے والا نوٹ کا تب بھی مجرم قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ ایسا مال لینا بھی ناجائز ہے، الغرض جب ایسی صورت واقع ہو جائے اور وہ آخری شخص یعنی بشیر مر جائے تو اس شخص کو شرعاً مجرم قرار دے کر اس کے مال سے روپیہ وصول کر سکتے ہیں یا نہیں؟

تتمہ سوال، سرکاری قانون کے بموجب مالک نوٹ کا روپیہ آخری شخص کے مال سے دلایا جاوے گا، اور یہاں روپیہ سوائے مالک کے اور کسی کا نہیں ضائع ہوتا ہے، کیونکہ صورت مفروضہ یہ ہے کہ مثلاً زید مالک سے نوٹ گم ہو گیا، فرض کیجئے کہ بشیر نے وہ نوٹ زمین پر پڑا ہوا

پایا، یا بشیر نے مالک کے پاس سے چرالیا بعدہ بشیر نے خالد کے ہاتھ نوٹ چلایا، یعنی خالد کو نوٹ اپنے دستخط کرنے کے بعد دیدیا، اور اس سے مندرجۂ نوٹ روپیہ وصول کرلیا، بعدہٗ خالد نے بکر کے ہاتھ نوٹ چلایا، بعدہ بکر نے عمرو کے ہاتھ نوٹ چلایا، بعدہ عمرو نے بینک گھر میں نوٹ چلایا، بینک گھر سے روپیہ تو عمرو کو مل گیا لیکن عمرو کا نام ونشان ملازمان بینک نے اپنی کتاب میں لکھ کر مالکِ نوٹ کو یعنی زید کو نوٹ کے مِل جانے کی خبر دیدی، اور پھر بموجب حکم گورنمنٹ کے ملازمان پولیس نے عمرو سے شروع کرکے بشیر تک اس نوٹ کے چلانے والے کا پتہ اور نشان بذریعہ اقرار ثابت کیا، بشیر چونکہ مرچکا تھا، اس لئے اس کے دستخط اور اس کے نوٹ چلانے کا ثبوت بذریعہ شہادت معتبرہ حاصل کیا گیا، اب بموجب حکم قانون کے وہ آخری شخص یعنی بشیر ہی مجرم قرار پاتا ہے، اور سرکار اس کے مال سے مالکِ نوٹ کو روپیہ دینا چاہتی ہے لیکن مالک بغیر اجازت شرع شریف کے اس روپے کو لینا نہیں چاہتا ہے، اب جیسا کچھ شرع شریف کا حکم ہو آنجناب مطلع فرمادیں، تاکہ اس پر عمل کیا جاوے، میں اس قصہ کو کچھ تفصیل کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ عرصہ دو ڈیڑھ سال کا ہوا جب یک نوٹ قیمتی پانصد روپے مالک یعنی محمد ابوبکر خاں صاحب رئیس داد ون ضلع علی گڈھ کے ایک معتمد ملازم کے پاس سے گم ہوگیا نہ معلوم کہ اس کے پاس سے کسی نے چرالیا، یا اس کے پاس سے کسی جگہ گر پڑا، ہرچند تلاش کیا گیا نہیں ملا، پھر خانصاحب موصوف نے ممالک ہند کے بینک گھروں میں جابجا اطلاع دیدی کہ ہمارا ایک نوٹ فلاں نمبر کا فلاں تاریخ کو گم ہوگیا ہے، اس کا پتہ چلانا چاہئے، پھر آگے قصہ وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا امید کہ جواب بہت جلد عنایت ہووے، اور سرکار ہی قانون میں جو آخری شخص کو مجرم قرار دیا ہے، تو صرف اس وجہ سے کہ اس کے دستخط کے بعد مالک یا کسی اور شخص کے دستخط پھر نوٹ پر نہیں ہیں، اور قانوناً بغیر دستخط کئے ہوئے چلانا ناجائز ہے، لہٰذا اس کو مجرم قرار دیا ہے اب آنجناب شرع شریف سے اس تعامل کے سند ہونے کی دلیل پیش کریں؛

الجواب، نوٹ خود معقود علیہ مقصود نہیں ہوتا، چنانچہ نوٹ جل جانے کے بعد اگر نمبر محفوظ ہو تو مالک کو خزانہ سے روپیہ مل جاتا ہے، اگر وہ خود معقود علیہ ہوتا تو ہلاک المبیع بعد التسلیم میں بائع پر رجوع بالثمن کا حق نہیں ہوتا، پس معلوم ہوا کہ وہ معقود علیہ نہیں ہے، بلکہ معقود علیہ روپیہ ہوتا ہے، اور عقد حوالہ اور نوٹ اس کی سند، اور صحت حوالہ میں محیل یعنی مدیون اور محتال یعنی دائن اور محتال علیہ یعنی قبول کنندہ حوالہ (ولو لم یکن علیہ للمحیل دین)

سب کی رضا شرط ہے کما صرحوا، پس حقیقت معاملۂ مذکورہ فی السوال کی شرعاً یہ ہے کہ جس شخص نے سب سے اول یہ نوٹ خزانۂ سرکار سے خریدا خزانہ اس کا مدیون ہے، اور وہ شخص دائن اور اس مدیون نے اپنے قانون نفاذ نوٹ میں گویا اپنی رضا ظاہر کردی، کہ اگر تم کسی کے ہاتھ اس نوٹ کو بیع کردوگے، یعنی تم اس سے روپیہ قرض لے کر یہ سند حوالہ اس کے سپرد کردوگے، تو ہم یہ روپیہ اس کو دیدیں گے، پھر جب اس مشتری من الخزانہ نے کسی کے ہاتھ فروخت کیا، اور اس نے خریدا جس کی حقیقت بھی وہی ہے کہ اس بائع نے اس مشتری سے قرض لے کر خزانہ پر حوالہ کرکے سند دیدی تو یہ مشتری من الخزانہ کہ دائن تھا اور وہ مشتری من ہذا المشتری کہ قبول کنندہ حوالہ ہے نیز رضامند ہوگئے، اسی طرح یہ سلسلہ لاتعقف عند حد برضامندی چلا جاتا ہے اور عقد صحیح ہوتا رہتا ہے یہ تو بیع نوٹ کی حقیقت ہے، اور اگر مثلاً اس مشتری من الخزانہ نے کسی کو یہ نوٹ ہبہ کیا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ خزانہ کے ذمہ جو میرا قرض ہے اس پر قبضہ کرکے تم مالک ہوجاؤ، پھر اگر اس موہوب لہٗ نے کسی کے ہاتھ بیع کیا تو وہ مشتری اس موہوب لہٗ کو قرض دیتا ہے، اور یہ موہوب لہٗ اس مقرض کو خزانۂ سرکاری پر حوالہ کرتا ہے اور اس کو سب قبول کرتے ہیں، اور گو اس موہوب لہٗ کا کوئی قرض بذمہ خزانہ نہیں ہے، لیکن محیل (یعنی مدیون) کا (کہ یہاں یہ موہوب لہٗ ہے) کچھ قرض بذمہ محتال علیہ (یعنی قبول کنندہ حوالہ کہ یہاں خزانہ ہے) ہونا کچھ ضروری نہیں، اس لئے یہ معاملہ بھی صحیح ہوجاوے گا، جب اس کا حوالہ ہونا اور حوالہ میں سب کی رضا کا شرط ہونا ثابت ہوگیا تو اب سمجھنا چاہئے کہ جب زید یعنی ابوبکر خاں صاحب کا نوٹ گم ہوگیا تو جس شخص کے بھی وہ ہاتھ لگا اس نے جو کسی کے ہاتھ فروخت کیا جس کی حقیقت مشتری سے قرض لے کر حوالہ کرنا ہے خواہ وہ بشیر ہو یا غیر بشیر، چونکہ اس میں بیع صورۃً اور حوالہ معنیً کا وقوع بلا اذن زید یعنی ابوبکر خاں صاحب ہوا اس لئے یہ عقد صحیح نہیں ہوا، مثلاً غیر بشیر نے بشیر کے ہاتھ بیچا تو بنا بر تقریر بالا یہ معاملہ درست نہیں ہوا تو بشیر کا روپیہ اس غیر بشیر کے ذمہ رہا۔ اسی طرح بشیر نے جو خالد کے ہاتھ بیچا وہ بھی حوالہ ہے، اور خالد کی رضا معلق ہے، اس نوٹ کے غیر مسروق ہونے کے ساتھ اور وہ شرط مفقود ہے، اس لئے خالد بھی راضی نہیں اس کا روپیہ بشیر کے ذمہ رہا اسی طرح بکر کا خالد کے ذمہ رہا، اور اسی طرح عمرو کا بکر کے ذمہ رہا۔ اور اسی طرح بینک کا عمرو کے ذمہ رہا، اور زید کا بینک کے ذمہ رہا، کیونکہ حوالہ میں اگرچہ محیل یعنی مدیون بری ہوجاتا ہے لیکن جب دائن کا حق سالم نہ رہے تو پھر وہ مدیون پر رجوع کرتا ہے، کما صرحوا بہ اور یہاں ظاہر ہے

کہ حق سالم نہیں رہا، اس لئے ہر مدیون مشغول الذمہ ہوگیا، جیسا اوپر مذکور ہوا، پس اس کا مقتضی یہ تھا کہ بینک (بروئے قوانین مجوزہ دمسلمہ وکیل وکفیل خزانہ ہے) وہ روپیہ زید کو دیتا، اور اپنا دیا ہوا عمرو سے لیتا، اور وہ بکر سے لیتا اور وہ خالد سے لیتا، اور وہ بشیر سے لیتا، اگر بشیر زندہ نہیں تو اس کے مال سے لے سکتا تھا، اور اگر بشیر کو بھی دھوکہ ہوا ہے تو وہ اس غیر بشیر سے لیتا، مگر جب وہ غیر معلوم ہے تو کالمعدوم ہے، پس اخیر ضمان بشیر اور اس کے مال پر آتا ہے اور ابوبکر خاں صاحب کا ملازم چونکہ امین ہے اور اس کا کسی سے روپیہ لیتا اور نوٹ دینا ثابت نہیں، اور امین پر ضمان نہیں ہوتا (صرف مالک امانت کے شبہ کے وقت اس سے حلف لیا جا سکتا ہے) اس لئے وہ بری ہے، لیکن چونکہ قانون سرکاری اس طرح ہے جیسا سوال میں مذکور ہے، اور نوٹ کا معاملہ کرنے والے بوجہ التزام کے اس قانون پر راضی ہیں اس لئے یہ کہا جاوے گا کہ یہاں حوالہ کے ساتھ کفالت بھی ہے، مثلاً بشیر نے نوٹ جب رضامندی سے بیچا تو اس نے گویا یہ کفالت بھی کرلی ہے کہ اگر ابوبکر خاں صاحب کا روپیہ مثلاً بینک سے وصول نہ ہو تو میں کفیل ہوں میں دوں گا۔ اس لئے بشیر سے یا اس کے مال سے اس بنا پر ابوبکر خاں صاحب کو لینا بشرط جواز جائز ہوگا، اور وہ جواز کی شرط یہ ہے کہ بشیر کا نوٹ بیچنا حجت شرعیہ سے ثابت ہو، مثلاً دو شاہدوں کا معائنہ ہو یا دو شاہد یہ گواہی دیں کہ بشیر نے ہمارے روبرو اس بیع کا اقرار کیا تھا، یا بشیر کے ورثہ جو کہ مال موروث کے مالک ہیں اقرار کریں کہ بشیر نے بیچا تھا۔ اور اگر بعض اقرار کریں اور بعض نہ کریں یا بعض بالغ ہوں اور بعض نابالغ ہوں (اور نابالغ کا اقرار بھی صحیح نہیں) تو صرف مقرین بالغین کے حق میں حصہ رسد اقرار صحیح ہوگا، مثلاً مقرین بالغین کے حصہ میں دو ثلث جائیداد ہو تو اس رقم نوٹ کا دو ثلث اس جائیداد سے لے لیا جاوے گا، باقی میں کچھ اثر نہ ہوگا، اور اگر کوئی اقرار نہ کرے تو محض دستخط حجت شرعیہ نہیں، کیونکہ الخط یشبہ الخط مقرر عند الفقہاء ہے اور الا ما استثنیٰ وہذا لیس منہ کما لایخفی علی اہل العلم،

خلاصہ یہ ہے کہ اگر دو شاہد بشیر کی بیع یا اقرار بالبیع کی شہادت دیں یا ورثہ بالغین اقرار کریں تو ابوبکر خاں صاحب بتفصیل بالا لے سکتے، ورنہ شرعاً خزانہ سے لے سکتے ہیں، مگر قانوناً کسی سے بھی نہیں لے سکتے، واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم،

اوائل رجب ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ص ۱۰۲)

واجب بودن ضمان الخ | **سوال** (۴۸۲۳) کیا فرماتے ہیں علمائے اسلام اس صورت میں کہ مثلاً زید کی گائے چوری ہو گئی اور دریا عبور کراتے ہوئے وہ گائے کیچڑ میں پھنس گئی۔ اور جب چوروں سے نہ نکل سکی تو وہ ویسی ہی کیچڑ میں پھنسی ہوئی چھوڑ کر چلے گئے۔ ملاحوں نے اس گائے کو پھنسا ہوا پاکر نکال لی اور وہ گائے ملاحوں کے پاس ان کے مویشیوں میں جنگل میں چرتی پھرتی رہی بیس دن یا مہینے تک جس مدت میں ان کے پاس وہ گائے رہی انھوں نے نہ تو تھانہ میں اطلاع دی اور نہ اس قصبہ کے باشندوں کو اطلاع دی کہ جس قصبہ کا داغ اور نشان گائے پر تھا باوجودیکہ یہ ملاح بوجہ قریب المسکن ہونے کے خوب سمجھتے تھے کہ یہ فلاں قصبہ کی گائے ہے، جب تلاش کرتے کرتے مالک کو گائے کے کیچڑ میں پھنس جانے اور ملاحوں کے نکالنے کا حال معلوم ہوا اور اس نے ملاحوں سے اپنی گائے طلب کی تو وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم سے گم ہو گئی ہے مگر معلوم نہیں کہ فی الواقع ملاحوں سے گائے گم ہوئی یا انہوں نے خود ہضم کرلی۔ اب سوال یہ ہے کہ ملاحوں پر ضمان ہے یا نہیں۔

الجواب: فی الدرالمختار فی اللقطۃ فان اشھد علیہ بانہ اخذہ لیردہ علی ربہ ویکفیہ ان یقول من سمعتموہ ینشد لقطۃ فدلوہ علی وعرف الی ان علم ان صاحبھا لایطلبھا او انھا تفسد ان لقیت کانت امانۃ لم تضمن بلا تعد فلولم یشھد مع التمکن منہ اولم یعرفھا ضمن ان انکر ربھا اخذہ للرد وقبل الثانی قولہ بیمینہ وبہ ناخذ حاوی اھ ملخصا۔ وفی ردالمحتار قولہ فان اشھد علیہ ظاھر المبسوط اشتراط العدلین فتح۔ قولہ مع التمکن منہ ای من الاشھاد امالولم یجد من یشھد عند الرفع اوخاف انہ لواشھد عندہ یاخذہ منہ الظالم فترکہ لایضمن قولہ ان انکر ربھا اما لوصدقہ فلاضمان اجماعا بحر قولہ وبہ ناخذ الخ وکذا ذکر الطحاوی کمافی النھر عن الاتقان قال فی البحر وفی الولوالجیۃ محل الاختلاف فیما اذا اتفقا علی کونھا لقطۃ لکن اختلفا ھل التقطھا للمالک اولا اما اذا اختلفا فی کونھا لقطۃ فقال المالک اخذتھا غصبا وقال الملتقط لقطۃ وقد اخذتھا لک فالملتقط ضامن بالاجماع۔ ج ۳ ص ۴۹۳، ۴۹۴۔ یہ گائے ملاحوں کے ہاتھ میں لقطہ ہے جس کی اطلاع نہ دینے کا اگر کوئی عذر معقول نہ ہوا اور مالک گائے بھی اس کو قبول نہ کرے کہ تو نے مالک کو واپس کرنے کے لئے رکھی تھی تو اگر ملاح قسم کھالیں کہ ہم نے واپسی

کی نیت سے رکھی تھی تو ضمان نہیں ہے ورنہ ضمان لازم ہے۔ یہ امام ابو یوسفؒ کے قول کے موافق حکم ہے اور یہی قول ماخوذ بہ ہے متاخرین کا۔ ۲۰ ربیع الثانی

کتاب العاریۃ

بطلان عاریت بموت
وضمان عاریت بتعدی

سوال (۳۲۸) خسر یا خوشدامن نے بہو سے کچھ ظروف مسی وچینی استعمال کیواسطے لئے، اور تصریح ہبہ یا عاریت کی نہیں ہوئی، وہ لوگ ان کو استعمال کرتے رہے، پھر وہ بہو مرگئی اور شوہر اور والدین اور اطفال خرد سال بعض ہشیار بعض محض لایعقل وارث چھوڑے اور ان میں سے بعض ظروف قبل موت وبعد موت مرحومہ شکستہ بھی ہوگئے، اب تین امر دریافت طلب ہیں، اول تو یہ کہ یہ ہبہ کہا جاوے گا یا عاریت دوسرے یہ کہ برتقدیر عاریت ہونے کے بعد موت مالک بھی خواہ باذن ورثہ یا بحکم اذن سابق مورثہ استعمال ظروف جائز ہے یا نہیں، تیسرے یہ کہ ظروف شکستہ کا ضمان بھی لازم ہے یا نہیں؟

الجواب، صورت مذکورہ ہرگاہ متردد ہے درمیان ہبہ وعاریت کے اور ہبہ کا کوئی قرینہ قوی موجود نہیں ضرورۃً عاریت پر محمول ہوگی، کیونکہ وہ ادنیٰ متیقن ہے، جیسا وقت تعارض ہبہ وودیعت کے ودیعت پر حمل کیا جاتا ہے، لان الاعطاء یحتمل الھبۃ لکن الودیعۃ ادنی وھو متیقن، درمختار مع الشامی ج ۴ ص ۳۹۴، جب عاریت ہونا ثابت ہوگیا تو عاریت موت معیر یا مستعیر سے باطل ہو جاتی ہے، اذا مات المعیر او المستعیر تبطل الاعارۃ خانیہ ۱۲ شامی، ج ۴ ص ۵۰۷، پس ورثہ سے دوبارہ عاریت لینا ضرور ہوا، ان میں سے شوہر اور والدین بنفس خود و طفل عاقل باذن پدر مختار عاریت دینے کے ہیں قولہ وفی حکم العبد الماذون یملک الاعارۃ وکذا الصبی الماذون شامی رج ۴، ص ۵۰۶، پس ان کی اجازت تو ممکن ہے، البتہ طفل غیر ممیز نہ تو خود اجازت کا مجاز، نہ باپ کو اس کے مال کا عاریت دینا جائز، ولیس للاب اعارۃ مال طفلہ لعدم البدل وکذا القاضی والوصی درمختار مع الشامی ج ۴ ص ۵۰۶، اور بوجہ مشترک ہونے کے بدون تقسیم اپنے حصہ کے مقدار میں بھی کسی کی اجازت صحیح نہیں، پس قبل از تقسیم رد کرنا اس کا واجب ہے، اور جو ظروف بعد موت معیرہ شکستہ ہوئے ان کا ضمان تو قطعاً آویگا، کیونکہ بعد بطلان استعارہ کے اس کا حکم مثل غصب کے ہوا، کہ تلف سے ضمان واجب ہے، اور قبل موت حالت بقاء اعارہ میں جو تعدی اور غفلت سے ضائع ہوا

اس کا ضمان لازم ہے ورنہ نہیں۔ ولا تضمن بالہلاک من غیر تعد درمختار مع الشامی کتاب العاریۃ ج ۴ ص ۵۰۳
واللہ اعلم ، یکم رمضان روز شنبہ ۱۳۳۳ھ (امداد الفتاویٰ ص ۱۴۲ جلد سوم)

کتابُ الاجارہ

اجرت برطاعات

سوال (۲۸۵) مذہب قدما میں عبادات پر اجرت لینا دینا حرام ہے، ان حضرات کی دلیل کیا ہے، متاخرین نے کن کن عبادات پر اجرت جائز فرمائی ہے، اور مصلحت مجوزہ کیا تھی اور وہ مصلحت مجوزہ شاملہ ہے یا غیر شامل، اگر شاملہ ہے تو اختصاص بعض دون البعض کیوں، اور اگر غیر شاملہ ہے تو وہ کونسی ہے، یہاں زیارت قبور و صلوٰۃ جنازہ و تہلیل خوانی و قرآن خوانی برقبور فاتحہ، ذبح، فتویٰ نویسی، فرائض نویسی، دستخط بر فتویٰ، فرائض شہادت و عقد وغیرہا عبادات پر اجرت لیتے ہیں، اور اجرت لینا دینا مشہور ہے، اس طرح پر اگر کسی جانب سے اجرت کا ذکر بھی نہ ہوتا، ہم اجرت دیتے ہیں، اگر نہ دیں تو خفا ہوتے ہیں کیسا ہے؟

الجواب، اصل مذہب یہ ہے کہ کسی طاعت مقصودہ پر اجرت لینا جائز نہیں، مگر جس طاعت میں دوام یا پابندی کی ضرورت ہے اور وہ شعار دین میں سے ہے کہ ان کے بند ہونے سے اخلال دین لازم آوے گا، اور ویسے کسی کو مہلت نہیں، ایسے امور کو اس کلیہ سے مستثنیٰ کردیا ہے، اور ظاہر ہے کہ زیارۃ قبور و تہلیل خوانی۔ قرآن خوانی برقبور فاتحہ کے متروک ہونے سے نظم دین میں کوئی خلل لازم نہیں آتا، اس لئے یہ اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا، علیٰ ہذا القیاس گواہی نہ دینے سے دین میں بے رونقی نہیں ہوتی، خود کاتم گنہگار رہوگا، دستخط میں کوئی مشقت نہیں، نہ شعار دین سے ہے، ذبح و عقد و فرائض نویسی ہیں البتہ بایں وجہ کہ عبادت مقصودہ میں سے نہیں گنجائش معلوم ہوتی منصف طالب کے لئے اتنا کافی ہے، مگر علماء مجادلین کے لئے بادشتر سے بھی سکوت و قبول کی امید نہیں، اس لئے اس پر بس کیا گیا، فقط واللہ اعلم، اشرف علی عفی عنہ (امداد ص ۸۸ ج ۳)

السوال (۲۸۶) صاحبم کس بکسے چیزے بدہد و بگوید کہ برائے من دعا بکنید جائز است یا نہ؟

الجواب، اگر عوض دعا دادہ است رشوت ست و اگر مستقلاً درخواست دعا نمود حتیٰ کہ اگر معلوم شود کہ دعا نخواہد کرد تا ہم بدہد مضائقہ نیست و اگر عوض دعا ردادن مقصود نیست بلکہ

عوض وظیفہ است اگرچہ عقبش دعا ہم باشد جائز است و دعا تبعاً خواہد بود۔

۲۵ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ (النور ص ۲۳ ذیقعدہ ۱۳۵۱ھ)

تحقیق مسئلہ مستفسرہ کھجور | یہ معاملہ کہ نصف تاڑی ٹھیکہ دار لے لیوے، اور نصف مالک کو دیدے خود معاملہ باطل ہے، خواہ وہ تاڑی یا اس کا گڑ حلال ہو یا حرام، وجہ یہ کہ یہ معاملہ بیع ہے یا اجارہ اگر بیع ہے تو اول تو مجہول، ثانیاً موضع غرر میں مثل لبن فی الضرع ثالثاً چونکہ دونوں بدل ایک شخص کی ملک ہیں اس لئے یہ بیع بیع الشئی بملک نفسہ ہے وہو باطل، کیونکہ بیع کی ماہیت مقتضی اس کی ہے کہ ایک بدل ملک بائع میں ہو اور دوسرا ملک مشتری میں، اور اگر اجارہ ہے جیسا کہ ظاہر یہی ہے، سو یہ داخل قفیز الطحان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جس اجرت کی تحصیل عامل کے عمل پر موقوف ہو اس کا اجرت مقرر کرنا بمقابلہ عمل اس عامل کے حرام ہے، اور یہاں ایسا ہی ہے، کیونکہ تحصیل اجرت یعنی نصف تاڑی کا موقوف اوپر استخراج اس شخص کے ہے اور یہ نصاً ممنوع ہے، ثانیاً اجرت کا معلوم ہونا واجب ہے، اور یہاں مجہول المقدار ہے، غرض یہ معاملہ کسی عقد صحیح میں داخل نہیں اس لئے باطل ہے، اب رہی تحقیق حلت و حرمت اس کی اور اس کے گڑ کی سو یہ امر تو ظاہر ہے کہ قبل سُکر وہ حلال ہے اور بعد سکر حرام و نجس، اور انقلاب ماہیت و زوال سُکر سبب حلت، پس اگر گڑ پکا کر بنایا جائے بدون اس کے کہ اس میں کوئی شئے مخلوط ہو جیسے نیشکر کا بنتا ہے وہ حلال ہو جاوے گا، اور حکم اس کا مثل مثلث کے ہے اور اگر کسی چیز نجس کے مخلوط کر کے بناتے ہوں سو چونکہ خلط بالنجس موجب نجاست ہے وہ مرکب نجس و حرام رہے گا، اور اس صورت میں قلب ماہیت مفید نہیں جیسے دقیق معجون بالخمر حرام ہے، خواہ اس کی روٹی مسکرہ ہو بوجہ نجس کے فکذا ہذا، فتأمل، حاصل یہ کہ اگر گڑ حلال بھی ہو تب بھی یہ عقد باطل و حرام ہے، اور وجہ حرمت کی منحصر سکر میں نہیں جو رفع اس کا مستلزم رفع حرمت کو ہو بلکہ وجوہ حرمت متعدد ہیں، اور یہاں وہ حرمت موجود ہے کما مر سابقاً فقط،

(امداد ص ۴۹ ج ۳)

تحقیق معصیت بودن اجارہ فاسدہ | **سوال** (۲۸۷) آجکل اجارہ فاسدہ بہ کثرت رائج ہیں، مثلاً مطابع میں تصحیح و کتابت وغیرہ کا ایک خاص دستور ہے اس کے موافق اجرت مل جاتی ہے اور کچھ طے نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات اجیر کو بوجہ ناواقفیت کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا، اس خیال پر کہ جو کچھ دیدیں گے لے لوں گا، کام کیا کرتا ہے، اس کے علاوہ اور اجارات رائجہ زمان، ان کے متعلق دریافت طلب یہ ہے کہ اجارہ فاسدہ کا اثر صرف دنیوی ہے یعنی اجر مثل کا ملنا اور دو صورت

اجر مسمی کا نہ ملنا یا کچھ اخروی اثر بھی ہے یعنی استحقاق عقوبت وگناہ وخبث اجرت وغیرہ،

الجواب، تصریحاً نظر سے نہیں گذرا مگر غالباً معصیت سے خالی نہیں لارتکاب المنہی عنہ اور اجرت میں خبث نہیں آتا لمشروعیتہ باصلہ وان کان غیر مشروع بوصفہ واللہ اعلم

۱۸ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ (امداد ص ۵۰ ج ۳)

تحقیق اجرت زانیہ

سوال (۷۰۸) شامی ص ۲۰ ج خامس میں ہے وفی غرر الافکار عن المحیط ما اخذتہ الزانیۃ ان کان بعقد الاجارۃ فحلال عند ابی حنیفۃ لان اجر المثل فی الاجارۃ الفاسدۃ طیب وان کان الکسب حراما وحراما عندہما وان کان بغیر عقد فحرام اتفاقاً لانہا اخذتہ بغیر حق اھ، تعجب ہے زانیہ جو روپیہ بعد اجارہ کسب کرے وہ طیب ہو حالانکہ صریح لفظ حدیث مہر البغی حرام کہہ رہا ہے، اس سے بڑھکر اور یہ بات ہے کہ در مختار ۳۴۲ ونیز دیگر متون وشروح میں ہے لا تصح الاجارۃ بعسب التیس ولا لاجل المعاصی مثل الغناء والنوح والملاہی الخ علامہ شامی اسی کے قریب نقل کرتے ہیں، وفی المنتقی امرأۃ نائحۃ او صاحبۃ طبل او زمر اکتسبت مالا ردتہ علی وہ آن علموا والا یتصدق بہ وان من غیر شرط فہولہا قال الامام الاستاذ لا یطیب والمعروف کالمشروط اہ قلت وہذا مما یتعین الاخذ بہ فی زماننا لعلمہم انہم لا یذہبون الا باجر البتۃ اھ زمارہ وغیرہ کا مال تو طیب نہ ہوا اور زنا کا کسب طیب ہو، اس میں کیا توجیہ ہو سکتی ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے، اور روایت مذکورہ کو دیکھ کر بڑی حیرت ہے، ادھر تو اتنی سختی ادھر اتنی مساہلت کہ حلال طیب اور مخالفت حدیث مزید برآں حضور اس مسئلہ کے متعلق شافی جواب اور قول فیصل تحریر فرما دیں کہ تسکین ہو،

الجواب، حلت ما اخذتہ الزانیۃ کی علت فساد اجارہ کو ٹھہرایا ہے، اور ظاہر ہے کہ فاسد کہتے ہیں مشروع باصلہ وغیر مشروع بوصفہ کو اور یہ بھی ظاہر ہے کہ زنا فعل محرم ہے اس کا اجارہ بوجہ حرمت معقود علیہ کے مشروع باصلہ نہیں ہو سکتا، پس یہ یقینی دلیل ہے اس پر کہ مراد اس سے وہ صورت ہے کہ اجارہ ہوا ہے فعل مباح پر مثل خبز وطبخ وغیرہما اور اس میں یہ شرط ٹھہرائی کہ تجھ سے زنا بھی کیا کریں گے، چونکہ یہ مشروع باصلہ وغیر مشروع بوصفہ یعنی بشرطہ ہے یہ اجارہ فاسدہ ہوگا، اس صورت میں جو اجرت ملے گی وہ حلال ہے، صاحبین یا تو خبث طریق کو خبث مال میں مؤثر سمجھتے ہوں گے، انھوں نے شرط کو شطر قرار دیا ہے اور امام صاحب نے تصحیح عقد کے واسطے اس کو شرط کہا ہے، کہ عاقل بالغ کے تصرف کو

مہما امکن صحیح کرنا اولیٰ ہے۔ اس وجہ سے اختلاف ہوگیا۔ اور بغیر عقد میں وہی عقد مباح مراد ہے۔
یعنی اگر عقد مباح ہوا ہی نہیں صرف زنا ہوتا رہا تو جو ماخوذ ہوگا وہ ماخوذ بالزنا ہوگا اس لئے وہ
حرام ہے، اگرچہ زنا کو معقود علیہ بھی نہ ٹھہرایا ہو، لان المعروف کالمشروط اور حاشا وکلا کہ خود زنا کو
معقود علیہ بنا کر کوئی مسلمان اس کو اجارہ فاسدہ اور اس کی آمدنی کو طیب کہے یقیناً وہ اجارہ
باطل اور آمدنی اس کی حرام وخبیث ہے اور امام صاحب کی تو بڑی شان ہے فقط واللہ اعلم

۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۲ھ

مستفتی کا اس جواب پر شبہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، تاویل مسئلہ بہت خوب ہے مگر ذرا یہ شبہ ہے کہ بحر الرائق جلد
ہشتم صفحہ ۲۰ میں ہے وفی المحیط ومھر البغی فی الحدیث ھو ان یواجرامتہ علی الزنا وما
اخذہ من المھر حرام عندھما وعند الامام ان اخذہ بغیر عقد بان زنی بامۃ ثم اعطاھا شیئا
فھو حرام لانہ اخذتہ بغیر حق وان استاجرھا لیزنی بھا ثم اعطاھا مھرھا او ما شرط لھا
لاباس باخذہ لانہ فی اجارۃ فاسدۃ فیطیب لہ وان کان السبب حراما اھ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص زنا کے لئے اگر اجارہ واقع ہو تو اس میں اجر طیب ہے کیونکہ یہ بات
صاف ہے جیسا ارشاد ہو۔

الجواب۔ سرسری نظر میں واقعی شبہ قوی ہے، مگر ذرا غور کیا جاوے تو خود تعلیل حکم کی لانہ
فی اجارۃ فاسدۃ اس کی توجیہ بتلا رہی ہے۔ اس لئے کہ یہ دونوں مقدمے اجماعاً مسلّم ہیں کہ (۱) زنا حرام
لعینہ ہے اور (۲) جو معقود علیہ حرام لعینہ ہو وہ اجارہ باطلہ ہے، نہ فاسدہ پس جب اجارہ کو فاسد
کہا ہے اس سے معلوم ہوا کہ معقود علیہ زنا کو نہیں ٹھہرایا پس لامحالہ لیزنی بہا کو زنا کے معقود علیہ بنانے
پر محمول کرنا صحیح نہ ہوگا، ورنہ کلام کے اول و آخر باہم متعارض ہوں گے جو ادنیٰ عاقل کے کلام میں
بھی محتمل نہیں نہ کہ افاضل و اکابر فقہاء کے کلام میں ایسا واقع ہو بلکہ یہ لام غایت و غرض کا ہے، اور
غرض کا غرض ہونا تصریح غرضیت پر موقوف نہیں ہوتا بلکہ تعلق قصد کافی ہے مثلاً اسلمت لادخل الجنۃ
کی صحت میں یہ ضرور نہیں کہ اسلام کے وقت اس کا اشتراط بھی زبان سے کرے بلکہ محض قصد مراد ہے
پس معنی اس کلام کے یہ ہوں گے کہ استیجار ہوا ہے مطلقاً جیسے اجیر خاص ہوتا ہے کہ تسلیم نفس
معقود علیہ ہوتا ہے، حتیٰ کہ اگر آقا کوئی کام نہ لے مگر اجیر کی جانب سے تسلیم نفس پایا جاوے تو اجرت

واجب ہوجاتی ہے، پس اسی طرح کسی نے اَمَۃ کو مثلاً اجیر خاص کے طور پر نوکر رکھا اور غرض ومقصود دل میں یہ رکھا کہ اس سے بدکاری کریں گے تو چونکہ معقود علیہ تسلیم نفس ہے لہذا اجارہ باطل نہ ہوگا، اور چونکہ بہ قرائن مقامیہ یا مقالیہ اس اجارہ میں یہ شرط بھی معلوم ہوا اور المعروف کالمشروط قاعدہ متقررہ ہے، پس جیسا صراحۃً معقود علیہ تسلیم نفس ہو اور اس میں ایسی شرط ہو تو بوجہ مشروع باصلہ وغیر مشروع بوصفہ ہونے کے اجارہ فاسد ہوتا ہے، اسی طرح یہاں بھی ہوگا بلکہ اگر ہم اس غرض کو مصرح قولاً بھی مان لیں تب بھی یہ توجیہ مذکور دافع اشکال ہے یعنی معقود علیہ مطلق تسلیم نفس کو کہا جاوے اور اس میں اس غرض کی بھی تصریح کردی تب بھی حسب تقریر مذکور یہ اجارہ فاسدہ ہوگا ہاں اگر خاص معقود علیہ اسی فعل خبیث کو بناوے تو مال کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں، رہا یہ کہ بغیر عقد کے کیوں حرام ہے تو وجہ اس کی یہ ہے کہ المعروف کالمشروط جب اس نے کچھ عقد نہیں کیا اور پھر دیا، تو دلالتِ حال سے ظاہر ہے کہ اسی کے مقابلہ میں ہے بخلاف عقد مباح کے کہ تنصیص علی المباح پر دلالت اعطاء علی الحرام کو ترجیح نہیں ہوسکتی لان الدلالۃ لا یفوق الصریح اور اگر یہ توجیہ خلاف ظاہر معلوم ہو تب بھی بوجہ حدیث وقواعد مسلمہ فقہیہ اس کا ارتکاب لازم ہے ورنہ ہم کو ایک عبارت کا بمقابلہ حدیث وقواعد فقہیہ صحیحہ رد کردینا سہل ہوگا، والسلام

یکم جمادی الاخریٰ ۱۳۲۱ھ (امداد ص ۶ ج ۳)

السِرّ المکنون

سرمکنون متعلق مسئلہ مذکورہ | وفی المقام سر دقیق عمیق ھو مبنی لقول الامام فیجب یذکرہ للخواص ولا ناذن لھم باذاعتہ للعوام اومن کان مثلھم وانہ یقتضی سبق مقدمات الاولٰی فی الفتح وذکر انہ فی الخلافیات للبیہقی عن علیؓ وھو فی مسند ابی حنیفۃؒ عن مقسم عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادرؤا الحدود بالشبہات وفیہ ایضاً فی اجماع فقہاء الامصار علی ان الحدود تدرء بالشبہات کفایۃ الثانیۃ ان الشبہۃ کما فی الھدایۃ حقیقتھا ما یشبہ الثابت لا نفس الثابت الثالثۃ ان الاجارۃ کما قال الفقہاء عقد ترد علی ملک المنافع الرابعۃ فی سنن الترمذی قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایما امرأۃ نکحت بغیر اذن ولیھا فنکاحھا باطل فان دخل بھا فلھا المھر بما استحل من فرجھا دل الحدیث علی ان وجوب المھر لا ینافی بطلان العقد.

اذا وجد شبهة ومن ثم قال علماءنا ان الوطی فی دار الاسلام لا یخلو عن حد او مهر
الخامسة ان ما وجب اعطاءه لاحد لا یکون حراما علیه والا لزم کون اعطاء الحرام
واجبا وهو باطل کیف واعطاء الحرام لیس بجائز فضلا عن ان یکون واجبا اذا
تمهدت تلك المقدمات فاعلم ان من استاجر امرأة لیزنی بها وجد ههنا صورة
الاجارة وان لم توجد حقیقتها لکون المعقود علیه حراما العینه کما فی نکاح المحارم
وجد صورة النکاح وان لم یوجد حقیقتها فتحقق شبهة الاجارة وترتب علیها
شبهة ملك المنافع بالمقدمة الثانیة والثالثة فاندرء الحد بالمقدمة الاولی
فوجب العقر بالمقدمة الرابعة ولا یکون هذا العقر خبیثا للمرءة وکذا من اعطته
للمقدمة الخامسة فالحکم بکونه حلالا لیس من حیث کونه اجرة بل من حیث
کونه عقرا یجب اداؤه علی العاقد والعقر وان فسر علی بعض الاقوال بمهر المثل
لکن مهر المثل فی العقد الفاسد علی ما فی الهدایة لا یزاد علی المسمّٰی عندنا خلافا
لزفر فلذا لم یجب فی الاستیجار الا ما سمیاه ومن ثم عبروا عنه بقولهم ما اخذته
او المهر اد ما شرط لها ولم یسموه اجرة هذا اذا عقد الاجارة اما اذا لم یستاجر یجب
العقر فلا یکون الماخوذ حلالا لکون الحل مبنیا علی العقریة فلما انتفی المبنی
انتفی المبنی فیبقی بدلا محضا عن الزناء اما الحدیث الحاکم بکونه خبیثا فجوابه
انه لما ثبت کونه مبنیا ایضا علی الحدیث الامر بدرء الحدود بالشبهات وجب
الجمع بین الحدیثین بحمل حرمة مهر البغی علی ما اذا لم یوجد التعقد ولا
یبعد مثل هذا التخصیص اذا اضطر الی الجمع بین الاحادیث کما لا یخفی
علی ذوی العلم ولما لم یعتبر الصاحبان شبهة اوجبا فیه الحد فلم یوجب العقر
فیکون الحکم فی العقد وغیره عندهما سواء کما اعتبر الامام رح نکاح المحارم شبهة
فی سقوط الحد ولم یعتبراه ویؤید هذا کله ما فی الفتح ومن شبهة العقد ما اذا
استاجرها لیزنی بها ففعل لا حد علیه ویعزر وقالا هما والشافعی ومالک واحمد
یحد لان عقد الاجارة لا یستباح به البضع فصار کما لو استاجرها للطبخ ونحوه من
الاعمال ثم زنی بها فانه یحد اتفاقا وله ان المستوفی بالزنا المنفعة وهی المعقود
علیه فی الاجارة لکنه فی حکم العین فبالنظر الی الحقیقة یکون محلا لعقد الاجارة

فاورث شبہۃ بخلاف الاستیجار للطبخ ونحوہ لان العقد لم یضف الی المستوفی بالوطی والعقد المضاف الی محل یورث الشبہۃ فیہ لا فی محل آخر وفی الکافی لو قال امہرتک کذا لازنی بک لم یجب الحد وھکذا لو قال استاجرتک او خذی ھذہ الدراھم لاطأبک والحق فی ھذا کلہ وجوب الحد اذ المذکور معنی یعارضہ کتاب اللہ الزانیۃ والزانی فاجلدوا فالمعنی الذی یفید ان فعل الزنا مع قولہ ازنی بک لا یجد معہ للفظۃ المھر معارض لہ ام وقد بان لک بقول الفتح والحق الخ ان القول بعدم وجوب الحد مرجوح فکذا القول بکون المال حلالا الذی کالزناء علیہ، وبالجملۃ لا یسع الاخذ بکون المال حلالا لکن لا مساغ للطعن علی الامام لانہ قال ما قال بالحدیث لا بالرای وقد تأید ما قال بحدیث الترمذی المذکور فیما قبل حیث حکم بالبطلان واوجب المھر وھو مسقط للحد بلا تفلت ھذا واللہ اعلم بالصواب فی کل باب۔ غرۃ جمادی الاخری سنہ ۱۳۲۱ھ (امداد ص ۵۳ ج ۳)

جواز اجرت تاذین وامامت وغیرہ وتحقیق ثواب درین حالت

سوال (۲۸۹) مجھے گوپال پیٹھ کی مسجد کی خدمت جاروب کشی آب کشی اہتمام روشنی، اذان دہی اور مسجد کی دیکھ بھال کے لئے ماہ ماہوار دے کر مامور ہونے کے لئے یہاں کے ساکنان فرما رہے ہیں، اس بارے میں جیسا ارشاد ہو حسبہ عمل کیا جاوے گا، صاف صاف ارشاد ہو کہ ماہوار لیکر مؤذنی یا پیش امامی کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں، اگر جائز ہو تو روپیہ لینے کے باعث آخرت میں ان کاموں کا ثواب ملے گا، یا بوجہ ماہوار لینے کے ثواب زائل ہو جاوے گا؟

الجواب: جائز ہے اور اگر یہ نیت ہے کہ اگر مجھ کو اس سے زیادہ کہیں روپیہ ملا تو میں اس کو چھوڑ کر اس کو اختیار کر لوں گا، تب تو ثواب نہ ملے گا، اور اس کو اجرت محضہ کہا جاوے گا اور اگر یہ نیت رہے کہ زیادہ کے لئے بھی اس کو نہ چھوڑوں گا تو ثواب ضائع نہ ہوگا اور اس کو اجرت نہ کہا جاوے گا، بلکہ نفقۂ حبس وکفایت مثل رزق قاضی کہا جائے گا۔

۴ ذیقعدہ ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۹۷)

حکم عدم تعین اجرت وقت تیقن رضا

سوال (۲۹۰) ہمارا کام جو سلائی کا ہے اگر کپڑا بغیر سلائی ٹھہرائے سی دیں اور جو کچھ سلائی وہ دے اس پر خوش ہو جائیں، وہ جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب، جائز ہے وقد ذکر الفقہاء نظیرہ عقد البیع بعد استہلاک المبیع والتاویل التاویل

۱۴ جمادی الثانی ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۱۴۰)

نقص اجرت پزاوہ گر کہ ناتمام گذاشتہ بود

سوال (۲۹۱) ہمارے یہاں مسجد کے واسطے پزاوہ لگوایا تھا اور پزاوہ گر سے یہ معاملہ طے ہوا تھا کہ فی ہزار خشت کا ایک روپیہ اجرت دی جاوے گی اور ایندھن وغیرہ ہمارا ہوگا، اور ان کی تھپوائی اور پختگی کا جو کچھ تردد ہوگا وہ تمہارے ذمہ، یعنی پزاوہ گر کے، سو اب جس وقت اینٹیں پزاوہ میں لگا چکا اور لگا کر آگ دے چکا، آگ دے کر اس کی دبائی میں کوتاہی کر کے اپنے گھر چلا گیا، بعد میں اس نے کچھ خبر نہ لی بس بوجہ دبائی نہ ہونے کے اس میں ہوا نکل گئی جب ہوا نکل گئی پزاوہ بالکل خراب ہو گیا، اور ہم سے ~~لله~~ روپے لے گیا اس کے پچاس روپے چاہتے تھے، سو اب ہم اگر اس کے باقی ماندہ روپے کو اور اس کے اسباب کو جو ہمارے یہاں چھوڑ گیا ہے ضبط کر لیں تو یہ جائز ہے یا نہیں کیونکہ وہ تو دھوکہ دے کر ہمارے پزاوہ کو خراب کر گیا، ادھورا چھوڑا اور ادھورا چھوڑ کر پھر بھی خبر نہ لی، اب شرع شریف کا جو حکم ہو اس سے اطلاع بخشیں،

الجواب، جتنا کام اجیر ہونے کی حیثیت سے اس کے ذمہ تھا پچاس روپے اس مجموعی کام کی اجرت تھی، جب عمل پورا نہیں ہوا اجرت پوری واجب نہ ہوگی مگر اس نے جتنا کام کیا ہے اس کی کوئی خاص اجرت نہ ٹھہری تھی کہ اگر دبائی کم ہوگی تو اتنی اجرت دیں گے اور ایسی صورت میں شرعاً اجر مثل واجب ہوتا ہے، پس دو متدین تجربہ کاروں سے پوچھنا چاہیے کہ اگر مقرر کئے ہوئے کام میں اتنی کمی رہ جاوے تو کتنی اجرت کم ہو جانا چاہیے، اگر وہ چھ روپے یا زیادہ بتلاویں تو پھر اس بقیہ کا ضبط کر لینا جائز ہے اور یہ رقم اس کمی کے لئے کافی نہ ہو تو اسباب کا محبوس کر لینا جائز ہے، جب تک کہ اس سے وہ رقم وصول نہ ہو اس کا مالک ہو جانا اصل مذہب میں درست نہیں،

۲۱ رمضان ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۱۵۱)

اجرت بر شفاعت

سوال (۲۹۲) رسالہ الامداد میں و نیز پارسال رمضان میں میرے سامنے یہ امر قرار پایا تھا کہ اصل وکالت جائز ہے کہ وہ طاعت مختص بالمسلم نہیں اور اجرت لینا فقہاء نے طاعت مختص بالمسلم پر حرام لکھا ہے اس لئے وکالت کی اجرت حلال ہے، اس بنا پر تو شفاعت وغیرہ پر اجرت لینا بھی حلال معلوم ہوتا ہے، کیونکہ وہ بھی مختص بالمسلم نہیں، کیونکہ وکالت جس طرح طاعت لغیرہ ہے اسی طرح شفاعت بھی تو طاعت لغیرہ ہے۔

الجواب، وجہ منع صرف اجرت علی الطاعۃ میں منحصر نہیں یہ بھی احد الوجوہ ہے، دوسری وجہ منع کی اس عمل کا غیر متقوم عند الشرع ہونا ہے، جیسا فقہار نے اجارۂ اشجار لتجفیف الثیاب کو منع کہا ہے، پس شفاعت بھی شرعاً غیر متقوم ہے، لانہ لم ینقل تقومہ وتقوم المنافع ثبت بغیر القیاس فما لم ینقل لا یجوز القول بتقومہ وایضا فلا تعب فی الشفاعۃ ولا یعطون الاجر علیہا من حیث انہ عمل فیہ مشقۃ بل من انہا مؤثرۃ بالوجاہۃ والوجاہۃ وصف غیر متقوم فجعلوا اخذ الاجر علیہا رشوۃً وسحتاً واللہ اعلم،

۱۷ شوال ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۱۵۵)

حکم لائی متعارف | **سوال** (۲۹۳) کھیتی کٹوانے میں آجکل یہی عرف ہے کہ کاٹنے والے کو اسی کھیت کٹے ہوئے سے کچھ دیدیتے ہیں۔ پس یہ اجارہ بسبب جہالت اور اجرت ہونا اس چیز جو اُجرت لینے والے کے ہاتھ سے تیار ہوئی ہے فاسد ہونا چاہئے۔ پس اس کے متعلق امور ذیل کا جواب ارشاد فرماویں۔ ۱۔ یہ اجارہ فاسد ہے یا نہیں اگر نہیں تو دلیل کیا ہے ۲۔ بنا بر فاسد ہونے اجارہ مسطورہ کے وہ اجرت کرنے والا اس اجرت کا بعد القبض مالک ہو جاتا ہے یا نہیں۔
۳۔ بنا بر فاسد ہونے اجارہ مذکورہ کے کوئی حیلہ جواز کا ہے یا نہیں، اس میں جو عموم بلویٰ ہے اس کا کچھ اعتبار ہوگا یا نہ،

الجواب، جہالت کی نسبت تو یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ مجہول محض نہیں ہوتا ایک انداز ہوتا ہے اور جہالت یسیر کو فقہائے نے مواضع کثیرہ میں عفو کیا ہے اور قفیز طحان کے شبہ کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے بلکہ واقع بھی ہے کہ خواہ عملاً اسی محصود میں سے دیتے ہوں مگر اس کی شرط نہیں ہوتی حتیٰ کہ اگر یوم سابق کے محصود میں سے کوئی اسی اندازے دینے لگے کوئی انکار نہیں کرتا اس لئے میں اس عمل کو جائز سمجھتا ہوں۔ ۸ رجمادی الاخریٰ ۱۳۳۶ھ (تتمہ رابعہ ص ۱۴)

دفع بقرہ برنصف نما، | **سوال** (۲۹۴) زید نے اپنا بچھڑا بکر کو دیا کہ تو اس کو پرورش کر بعد جوان ہونے کے اس کی قیمت کرکے ہم دونوں میں سے جو چاہے گا نصف قیمت دوسرے کو دے کر اسے رکھ لے گا، یا زید نے خالد کو ریوڑ سونپا اور معاہدہ کر لیا کہ اس کو بعد ختم سال پھر پڑتال لیں گے، جو اس میں اضافہ ہو گا وہ باہم تقسیم کر لیں گے، یہ دونوں عقد شرعاً جائز ہیں یا قفیز طحان کے تحت میں ہیں جیسا کہ عالمگیری جلد پنجم ص ۱۰۷ مطبوعہ احمدی میں ہے۔ دفع بقرۃ الی رجل علی ان یعلفہا دما یکون من اللبن والثمن بینہما انصافاً فالاجارۃ فاسدۃ۔

الجواب، کتب الی بعض الاصحاب من فتاوی ابن تیمیہ کتاب الاختیارات مانصہ، ولو دفع دابتہ اونخلتہ الی من یقوم لہ ولہ جزء من نمائہ صح وھو روایۃ عن احمد جہم صــ۳ س ۱۴، پس حنفیہ کے قواعد پر تو یہ عقد ناجائز ہے، کما نقل فی السوال عن عالمگیریہ لیکن بنا بر نقل بعض اصحاب امام احمدؒ کے نزدیک اس میں جواز کی گنجائش ہے، پس تحرز احوط ہے، اور جہاں ابتلا شدید ہو توسع کیا جا سکتا ہے،

۲۵ جمادی الاخری ۱۳۳۲ھ (تتمہ رابعہ ص ۴۵)

دادن بعض پرندگان برائے پرورش کردن بر شرط شرکت در منافع

سوال (۲۹۵) ہمارے ملک سندھ میں لوگ دریائی سفید پرند پالتے ہیں، اس کی پشت کے پر تیس روپے فی تولہ بکتے ہیں، جو لاکھوں روپے کی تجارت ہوتی ہے، اور اُن پرندوں میں اس طرح شرکت کرتے ہیں کہ کسی نے دو سو روپے کے پرند خرید کر کے کسی کو اس شرط پر دیئے کہ ان کا پالنا تیرے ذمہ یعنی فقط خدمت گذاری باقی خورش اُن کی پیدائش (آمدنی) سے اول نکال کر جو باقی پیداوار رہے گی، اس سے پہلے میرے دو سو ادا کئے جائیں گے، بعدہٗ جو ہوگا وہ دونو کا نصفا نصف ہوگا، باقی پرند روپے والے ہی کی ملک رہیں گے، ۲ یا بعد ادا دو سو کے خود پرندوں پر مع پیدائش (آمدنی) کے نصفا نصف مالک کر دے تو جائز ہے یا نہیں، اگر ناجائز ہے تو کوئی صورت اس کے جواز کی بن سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب، یہ دونوں صورتیں نہ اجارہ ہیں نہ شرکت، لفقدان شروطہما اور دوسرے عقود کا احتمال ہی نہیں اس لئے ناجائز ہیں، البتہ اس طرح جواز ہو سکتا ہے کہ مالک ان پرندوں کا نصف یا کم و بیش اس عامل کے ہاتھ فروخت کر دے، اور جو منافع پیدا ہوں گے وہ دونوں میں مشترک ہوں گے، اس عامل کے حصہ کی قیمت یہ مالک اپنے ثمن میں لے لیا کرے، اور جب سب ثمن ادا ہو جاوے پھر منافع باہم تقسیم ہو جایا کرے۔ لیکن اس صورت میں عامل پر جبر نہ ہوگا، کہ وہی خدمت کرے، وہ ہر وقت انکار کر سکتا ہے، اور اپنی خوشی سے کرتا رہے تو جائز ہے، ۲۸ رمضان ۱۳۳۱ھ (حوادث ۱، ۲، ص ۱۲۰)

تردید در اجرت ٹھیکہ داران تالاب وغیرہ

سوال (۲۹۶) ہمارے یہاں قحط سالی کی وجہ سے سرکار نے تالابوں و نہروں کے کام جاری کئے اور قاعدہ یہ نکلا ہے کہ کام ٹھیکہ داران کے سپرد کئے جائیں تاکہ وہ بکوشش تمام مزدوروں سے کام لیں اس لئے کہ قحط سالی

والے مزدور سرکاری کام سمجھ کر پورا کام نہیں کرتے ہیں، سرکار نے ٹھیکہ داران کو اندازہ بتلا دیا ہے کہ یہ کام اس نرخ سے ہونا چاہئے اگر اس سے کم ہوگا تو ہم تم سے پیسہ کاٹ لیں گے، تم اپنے پاس سے مزدوروں کو پیسہ دے کر کام لو۔ جس قدر تمہارا پیسہ خرچ ہوگا ہم تم کو دیدیں گے، اور دس روپیہ فی صدی کمیشن بعوض تمہاری محنت کے اور دیں گے بشرط مذکورۂ بالا کہ اگر نرخ مقررہ سے کام ہوا، مزدوروں سے کام لینے میں غلطی کی تو ہم اس کا پیسہ تم سے کاٹ لیں گے، صورت مسئولہ میں کسی قسم کا ربوا تو نہیں ایسا ٹھیکہ لینا درست ہے یا نہیں، بینوا توجروا۔

الجواب بعد تامل کے یہ ٹھیکہ دار اجیر مشترک معلوم ہوتے ہیں اس لئے کام کی تعیین تردید کے ساتھ جائز ہے کہ اگر اتنی مقدار سے کام ہوا تو یہ دیں گے اور اگر اتنی مقدار سے ہوا تو یہ دیں گے جیسا کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر قمیص سیے گا تو اتنی اجرت اور اگر قبا سیے گا تو اتنی اجرت اور دس روپیہ فیصدی جو کمیشن ہے اس کو بھی اجرت کا جزو کہا جاوے گا اس بنا پر اس کے عدم جواز کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ ۳۰ محرم ۱۳۳۴ھ (تتمہ رابعہ ص ۶۲)

تحقیق محسوب شدن یا نہ شدن وقت تامل دربعض مقامات سبق در اوقات مدرسہ

سوال (۲۹۷) جو سبق بندہ کو پڑھانے ہوتے ہیں اس میں سب کو خارج اوقات میں دیکھ کر پڑھانا ضروری ہے یا جو دشوار ہوتے ہیں صرف انہی کو دیکھنا کافی ہے، ثانیاً یہ عرض ہے کہ اگر بڑی دیکھے آسان کتاب کو پڑھاتا ہوں تو بعض دن اس میں بھی بعض مضمون غور طلب آجاتا ہے، جسے تامل کرنے کی حاجت ہوتی ہے، نیز یہ بھی عرض ہے کہ میں اب تک یہ کرتا تھا کہ جو کتابیں بلا دیکھے پڑھائی نہ جاتیں ان کو دیکھتا تھا اور جو بلا دیکھے پڑھا لیتا تھا گو تامل سے انھیں مطالعہ نہیں کرتا تھا، اس میں یہ بھی عرض ہے کہ اگر دیکھ کر پڑھاتا تو پڑھانے میں وقت کم صرف ہوتا بہ نسبت بلا دیکھے پڑھانے کے تو اس صورت میں میرے ذمہ مدرسہ کا حق باقی رہا یا نہیں، اور اس کی کس طرح تلافی ہوسکتی ہے اور اس بارہ میں کیا معمول رکھنا لازم ہے؟

الجواب میرے نزدیک اس باب میں اس قاعدہ کو حکم قرار دیا جائے گا المعروف کالمشروط اور اس میں معروف وہی ہے جس کو آپ نے اس جملہ سے شروع کیا ہے کہ میں اب تک یہ کرتا تھا الخ پس ایسا کرنے میں مدرسہ کا کوئی حق آپ کے ذمہ نہیں ہے اور آئندہ بھی یہی معمول کافی ہے۔

۱۴ شعبان ۱۳۳۵ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۴)

حاشیہ کیلئے اہل علم	تفصیل اور توضیح اس کی کہ جو کتابیں مدرس بتامل قلیل مدرسہ میں بغیر مطالعہ

سابق پڑھاتا ہو اس طرح کہ اگر مطالعہ کرلیتا تو مدرسہ کا وقت کم صرف ہوتا اب زیادہ صرف ہوتا ہے تو یہ نقصان مدرسہ کا صرف اس حد تک قابل اعتبار نہیں اور عفو ہے جہاں تک کہ عرف اس کو گوارا کرے، نہ مطلقاً مثلاً چھ گھنٹے کے ایسے ہی چھ سبق ہوں اور اس میں تین گھنٹہ تامل میں گذریں تو یقیناً عرف اس کو گوارا نہ کرے گا، اور کہے گا کہ مکان پر مطالعہ کرو، لہذا اس کی تعیین ضروری ہے کہ کس قدر وقت عرفاً صورت مسئولہ میں عفو ہے، میرے نزدیک فی گھنٹہ دس بارہ منٹ معلوم ہوتا ہے۔

حکم نذرانہ بمقابلہ مہلت دادن در اداۓ محصول زمین

سوال (۲۹۸) میں نے ایک عریضہ میں عرض کیا تھا کہ کاشتکاروں سے نذرانہ وغیرہ لے کر ان کو لگان ادا کردینے میں مہلت دیدینا بغیر کسی قسم نقصان مالک کے کیسا ہے، اور اس قسم کا نذرانہ لینا جائز ہے یا نہیں جناب نے اس کا کوئی جواب نہیں تحریر فرمایا تھا، اب مطلع فرمایئے گا،

جواب، شاید نظر سے چوک گیا ہوگا اب لکھتا ہوں کہ گو مالک کا نقصان نہ ہو مگر دیکھنا یہ ہے کہ آخر یہ رقم کس چیز کا معاوضہ ہے اور جس چیز کا معاوضہ ہے آیا وہ معاوضہ کے قابل ہے یا نہیں اس بارہ میں اپنی معلومات ظاہر کئے جاویں تو منقح جواب دیا جاوے،

جواب استفسار در سوال بالا، کاشتکاروں سے لگان وصول کرنے کے واسطے گورنمنٹ نے خریف کی قسط میں ۱۰ اپریل اور ۱۱ مئی اور ربیع کی قسط میں ۲۵ اکتوبر اور ۲۶ نومبر مقرر کررکھی ہیں ان مقررہ تاریخوں کے گذرنے کے بعد زمیندار کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر کاشتکار ان مقررہ تاریخوں پر روپیہ لگان کا کل ادا نہ کرے تو زمیندار عدالت میں نالش کرسکتا ہے، بعض آدمی تو فوراً تاریخ گذرتے ہی نالش کردیتے ہیں اور بعضے نہیں کرتے۔ صاحب اکتوبر کے مہینے میں اپنے مواضعات کا حساب مجھ سے سمجھتے ہیں اور سال بھر میں جو کچھ روپیہ جس کاشتکار سے وصول ہوتا ہے وہ میرے ہی پاس امانت میں رہتا ہے، خواہ تاریخ مقررہ پر وصول ہووے یا بعد میں ان کو اس سے کچھ سروکار نہیں ہے، جو کاشتکار وقت پر یعنی تاریخ مقررہ پر روپیہ ادا نہیں کرتے ہیں تو وہ کاشتکار اپنے کارندے کو نالش کے خرچ سے بچنے کی غرض سے کچھ نذرانہ جو تخمیناً نالش کے عدالتی خرچ سے کم ہوتا ہے دیدیتے ہیں، اور خریف کا واجب الاداء روپیہ ربیع میں دینے کے واسطے یا ربیع کا خریف میں دینے کے واسطے مہلت لیلیتے ہیں، کیونکہ کاشتکار یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر کارندہ نالش کردے گا تو عدالت میں ہم زیادہ خرچ کے زیر بار ہوں گے، اور کارندہ بھی ناخوش رہے گا، اور کارندہ کو دینے کی

حالت میں نالش کے خرچ میں بچت یقینی ہوجاتی ہے اور کارندہ بھی خوش رہتا ہے، تو اس قسم کا نذرانہ لینا جائز ہے یا نہیں ؟

جواب ۔ جائز نہیں، یہ رقم بمقابلہ مہلت کے ہے، جو کہ حرام ہے اور نہ کارندہ کے ذمہ ہو کہ آقا کو اپنے پاس سے بیباق کرے خواہ وصول ہو یا نہ ہو، اگر کارندہ اس ذمہ داری سے سبکدوش ہوجاوے تو پھر نذرانہ کی طرف اس کو التفات نہ رہے، ۱۳۳۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۵۴)

دادن عمامہ ونقد خطیب را

سوال (۲۹۹) عید کے خطبہ میں ایک عمامہ مع کچھ نقد منجانب تحصیل اور ایک منجانب پولیس قاضی صاحب کو دیا جایا کرتا ہے، ان میں سے ایک عمامہ قاضی صاحب مجھ کو دیا کرتے ہیں میں نے اس عمامہ کو آج تک سر پر باندھا نہیں ہے، دو عمامے کسی قدر قیمتی ہیں ان کے استعمال کی شرعاً گنجائش ہو تو عید کو باندھوں ورنہ خیر ؟

الجواب ۔ اس میں چند اسباب اشتباہ کے ہوسکتے ہیں ہر ایک کے متعلق کلام کرتا ہوں اول بظاہر یہ اجرت طاعت پر معلوم ہوتی ہے لیکن عند التامل یہ اجرت نہیں ہر بلکہ اکرام ہے پس واقع میں یہ وجہ مانع نہیں ہوسکتی،

دوم جو دینے والے ہیں بوجہ اس کے کہ رسم سمجھ کر دیتے ہیں اور نہ دینے میں بدنامی کا اندیشہ کرتے ہیں اس لئے طیب قلب سے دینے میں شبہ قوی ہے اور ظاہر انتفا ہے، اور حلت مال کے شرائط میں سے طیب قلب معطی بھی ہے، واذا فات الشرط فات المشروط یہ وجہ مانع قوی ہوسکتی ہے اور یہ وجہ خود پولیس اور تحصیل والوں کے دینے میں اور خود ایک امام کے دوسرے امام کو دینے میں مشترک اور عام ہے ؛

سوم دینے والے جس مال سے دیں وہ رقم جائز ہو مثل رشوت وغیرہ کے اس کا حکم یہ ہے کہ اگر معطی کا مال حلال غالب ہے تو یہ اشتباہ مانع نہیں، اور حلال غالب نہیں تو یہ اختلاط مانع ہی خلاصہ یہ ہے کہ فی نفسہ یہ دینا لینا جائز ہے اور وجہ اول منع موثر نہیں، اور وجہ سوم کا انتفار اگر یقینی یا مظنون ہو تو بھی مؤثر فی المنع نہیں، البتہ وجہ دوم قوی اور غالب الوقوع ہے، اس لئے یہ لینا دینا ممنوع لغیرہ اور مکروہ ہے اور خود لینا ہی برا ہے، خواہ استعمال بھی نہ کیا جائے واللہ اعلم

۰ ذی الحجہ ۱۳۲۴ھ (امداد ج ۲ ص ۱۷۷)

طیب بودن بچہ گاؤ در حق مالک اگر خرید کردہ باشد از پس دادن گاؤ بر حصہ

سوال (۳۰۰) اصلاح الرسوم کے آخری صفحہ پر گائے بھینس کا بچہ حصہ پر دینے کے معاملہ کو حرام لکھا ہے، اور اگر خدمت کنندہ کو دہ

جانور ملکیت ہو جاوے تو وہ ملکیت خبیث اور اس کی قربانی مردود لکھی ہی، اب اس کے متعلق یہ سوال ہے کہ اگر وہ حصہ پر دیا ہوا جانور خدمت کنندہ کے پاس نہ رہے، بلکہ اصل مالک خدمت کنندہ کا وہ حصہ خود خریدلے تو کیا پھر بھی وہ جانور ملک خبیث قرار دیا جا کر قابل قربانی نہ ہوگا،

جواب، اس صورت میں اس اخیر مشتری کے حق میں خبث نہ ہوگا، نہ فعل کا نہ ملک کا

۵ ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۷۶)

حکم فیس بہی شاگردی گرفتن و تقسیم کردن

سوال (۳۰۱) ہمارے یہاں جتنے بینے والے ہیں سب نے یہ مقرر کر رکھا ہے کہ جو کوئی شاگرد کرے اس شاگرد سے دس روپیہ کی مٹھائی لے کر سب بینے والوں کو تقسیم کرے چاہے وہ خوشی سے دے یا ناراضی سے دے مگر ضرور لینا چاہئے یہ روپیہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، اس طرح جائز نہیں البتہ اگر یہ ٹھہر جاوے کہ اتنے روز تک اور اتنے وقت تک سکھانے کی اجرت ہم دس روپے یا دس روپے کی چیز لیں گے اس طرح جائز ہے پھر اتنے دنوں سکھلانا پڑے گا، مگر پھر یہ روپیہ یا چیز اس شخص کی ملک ہوگی تقسیم کرنا واجب نہیں بلکہ چونکہ دوسروں کا مانگنا ظلم ہے اور تقسیم اس ظلم کی اعانت ہے اس لئے تقسیم کے جواز میں بھی شبہ ہے، قریب ۱۳۳۵ھ (تتمہ خامسہ ۷۸)

حکم تنخواہ مدرسین و وظیفہ طلبا بابت ایام بیماری

سوال (۳۰۲) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ جو طلبہ اور مدرس مدرسہ اسلامیہ کے بیمار ہو جاویں ان کو ایام بیماری کی تنخواہ یا وظیفہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، ظاہراً یہ سوال متعلق چندہ کے ہے، سو اصل یہ ہے کہ ایسے اموال میں کسی تصرف کا جواز و عدم جواز معطین اموال کی اذن و رضا پر موقوف ہے، اور مہتمم مدرسہ ان معطین کا وکیل ہوتا ہے، پس وکیل کو جس تصرف کا اذن دیا گیا ہے وہ تصرف اس وکیل کو جائز ہے، سو جس مہتمم نے مدرسین کو مقرر کیا ہے اگر اس مہتمم کو معطین نے اس صورت کے متعلق کچھ اختیارات دیئے ہیں، اور مہتمم نے ان مدرسین سے اس اختیار کے موافق کچھ شرائط کر لئے ہیں تب تو ان شرائط کے موافق تنخواہ لینا جائز ہے، اسی طرح جو اختیارات وظیفہ کے متعلق مہتمم کو دیئے گئے ہیں ان کے موافق اس کا دینا لینا بھی جائز ہوگا، اور اگر تصریحاً اختیارات و شرائط نہیں ہوئے، لیکن مدرسہ کے قواعد مدون و معروف ہیں تو وہ بھی مثل مشروط کے ہوں گے، اور اگر نہ مصرح ہیں اور نہ معروف ہیں

تو دوسرے مدارس اسلامیہ میں جو معروف ہیں ان کا اتباع کیا جاوے گا اور اگر یہ آمدنی کسی وقف جائداد کی ہے تو اس کا حکم دوسرا ہے فقط، ۱۹ صفر ۱۳۳۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۸۲)

تحقیق استحقاق تنخواہ در ایام مرض

سوال (۳۰۳) مدرس بیمار ہو گیا ایام مرض کی تنخواہ کا مستحق ہو گا یا نہیں، اگر ہے اور اس نے نہیں لی تو لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب، اگر قالاً یا حالاً اہل چندہ کی رضا سمجھی جاوے تو یہ شرط ٹھہرانا درست ہے کہ ایام مرض کی تنخواہ دی جاوے گی ورنہ درست نہیں، پھر اگر شرط نہ ٹھہری تب تو استحقاق نہیں ہے اور اگر شرط ٹھہر گئی تھی تو وہ مستحق ہے، پھر اگر اہل چندہ کی رضا معلوم ہو تو چندہ سے دینا درست ہے ورنہ جس نے مدرس کو رکھا ہے وہ اپنے گھر سے دے۔ ۱۵ شعبان ۱۳۳۲ھ (حوادث اولیٰ ص ۹۱)

حکم تنخواہ ایام تعطیل و وضع تنخواہ ایام رخصت

سوال (۳۰۴) عربی مدارس میں رمضان شریف کی تعطیل ہوتی ہے تو اس کی تنخواہ کا بلا معاوضہ کام ہونا تو ظاہر ہے باقی وقت بھی مدرس اپنا وقت مدرسہ میں محبوس نہیں رکھتا کہ اس کی وجہ سے لے سکے اب لینا اس کو کیسے درست ہے اگر مدرسہ کے مہتمم کسی مدرس کو شعبان کی ۲۹ تاریخ کو مدرسہ کی ملازمت سے علیحدہ کر دے تو یہ مدرس رمضان کی تنخواہ کا مستحق ہے یا نہیں؟

مدرس مدرسہ میں بحال رہتے ہوئے رمضان کی تعطیل میں رمضان کی تنخواہ کا کب مستحق ہو گا جب سب رمضان ختم ہو جائے یا ختم شعبان پر؟

الجواب، تنخواہ تو ایام عمل ہی کی ہے مگر تعطیل کا زمانہ تبعاً ایام عمل کے ساتھ ملحق ہے تاکہ استراحت کر کے ایام عمل میں عمل کر سکے، اس سے سب اجزاء کا جواب نکل آیا، اول کا یہ حکماً بلا معاوضہ کام کے نہیں، دوسرے کا یہ کہ شعبان کے ختم پر معزول ہو جانے سے تنخواہ نہ ملے گی اور عدم عزل میں رمضان کے ختم پر تنخواہ ملے گی بشرطیکہ شوال میں بھی کام کیا ہو۔ ۱۵ رمضان ۱۳۳۷ھ (تتمہ خامسہ ص ۹۲)

سوال (۳۰۵) اواخر شعبان و اوائل شوال و تمام ماہ رمضان و دیگر ایام عید الضحیٰ وغیرہ میں تعطیل ہوتی ہے، ان ایام کی تنخواہ کا مدرس مستحق ہے یا نہیں؟

الجواب، برضاء اہل چندہ، چندہ سے دے سکتے ہیں ورنہ عدم اشتراط میں استحقاق نہیں، اور اشتراط میں بذمہ موجر واجب ہے جیسا کہ اوپر کے دو جوابوں میں مذکور ہوا۔

۱۵ شعبان ۱۳۳۲ھ (حوادث اول ص ۹۲)

سوال (۳۰۶) اور طلباء کو تعطیل کا شاہرہ لینا یا مہتمم سے لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، المعروف کالمشروط کے قاعدہ سے جائز ہے۔ ۴ ذیقعدہ ۱۳۳۳ھ (حوادث ثانیہ ص ۱۸)

وضع تنخواہ ایام رخصت | **سوال** (۳۰۷) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید کو عمرو نے بمشاہرہ بیس روپے ماہوار پر ملازم رکھا لیکن زید ملازم کو اپنی ضروریات کی وجہ کر رخصت کی ضرورت ہوئی، تو زید اپنے آقا عمرو سے اجازت حاصل کر کے گیا، جب مہینہ ختم ہوا اور تنخواہ ملنے کا وقت ہوا تو عمرو آقا نے زید ملازم کی تنخواہ سے ان ایام کی تنخواہ کہ جن ایام میں وہ اجازت حاصل کر کے گیا تھا، وضع کر لی، جب زید نے اس بارہ میں کچھ کہنا چاہا تو عمرو نے یہ جواب دیا کہ ہمارے یہاں سال میں ایک ماہ کی رخصت ملتی ہے خواہ بیماری ہو یا شادی ہو یا غمی یا دیگر خانہ داری کی ضرورت ہو اس سے زیادہ رخصت نہیں مل سکتی اور زید نے عمرو کو ملازم رکھتے وقت کوئی قاعدہ طے نہیں کیا، اور چند سال تک کسی قسم کی کوئی بات ظہور میں بھی نہ آئی لیکن چند سال کے بعد عمرو نے اسی زید کے ساتھ متذکرہ بالا قواعد کی پابندی شروع کر دی، جب زید نے عمرو آقا کو یہ عذر پیش کیا کہ سالہائے گذشتہ میں اس قاعدہ کا آپ نے کیوں نہیں برتاؤ کیا تو عمرو نے یہ جواب دیا کہ ہم کو اختیار ہے اب ہم رعایت نہیں کرتے، جب ہم رعایت کرتے تھے یہ صورت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، جائز ہے، اور رخصت کی تنخواہ دینا جب کہ کوئی شرط نہ ٹھہری ہو تبرع اور احسان ہے، البتہ اگر کچھ شرط ٹھہر جاوے یا ایسا عرف عام ہو کہ سب اس میں متفق ہوں کہ وہ بھی بمنزلہ شرط کے ہے، تو اس وقت اس شرط پر عمل کرنا واجب ہے فقط۔

۲۹ رجب ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ص ۱۰۸)

تحقیق استحقاق اجرت زمانہ رخصت رعایتی مدرسین | **سوال** (۳۰۸) اگر مدارس اسلامیہ میں مدرسین کے لئے ایک ماہ کی رعایتی رخصت کا قانون ہے جس ماہ میں تعلیم نہیں ہوتی کس طرح وہ تنخواہ کے مستحق ہو سکتے ہیں، مہتمم یا اہل شوریٰ ایسے قوائد مقرر کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب، مہتمم و اہل شوریٰ وکیل ہیں اہل چندہ کے، پس اگر بتصریح یا بقرائن اس قانون پر اہل چندہ کو اطلاع اور ان کی رضا ثابت ہو تو چندہ سے تنخواہ دینا جائز ہے ورنہ ناجائز، اگر رضا نہ ہو اور شرط ہو تو جس نے مدرس کو نوکر رکھا ہے وہ اپنے پاس سے دے۔

۱۵ شعبان ۱۳۳۲ھ (امداد جلد سوم ص ۴ ۵ و حوادث اول ص ۹۱)

حکم زمین موروثی کفار | **سوال** (۳۰۹) اگر موروثی دار ہنود ہوں تو ان سے فیس اور کھانا بلا تقیید کسی طریقہ کی لے لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب۔ مجھ کو تو مسلمان ہی کا سا حکم معلوم ہوتا ہے، کیونکہ یہ عقود فاسدہ بالتراضی ہے نہیں جو تفاوت ہو، یہ تو غصب ہے جو سب کے لئے حرام ہے۔ ۴ جمادی الثانی ۱۳۳۳ھ (تتمہ خامسہ ص)

حکم زمین موروثی ومنافع آں

سوال (۳۱۰) جس زمین کو کوئی کاشتکار بارہ سال تک کاشت کرے تو قانون سرکاری سے اس کو ایک حق حاصل ہو جاتا ہے، کہ اس اراضی سے بے دخل وغیرہ بعض نہیں ہو سکتا، پس کاشتکار کا اس زمین کو اپنے قبضہ میں رکھنا اور اس سے منتفع ہونا جائز ہے یا نہیں اور للہ خیرات کرنا اور امید ثواب کی رکھنا یا کسی کو ہدیہ دینا اس آمدنی سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب۔ فی کتاب الغصب من الهداية ومن غصب عبدا فاستغله فنقصت الغلة فعليه النقصان ويتصدق بالغلة اھ اس سے معلوم ہوا کہ شے مغصوب سے جتنا نفع ہوتا ہے اس سے انتفاع اس غاصب کو درست نہیں، اور جب یہ غاصب ہے تو اس لئے جس قدر اس کا خرچ ہوا ہے اس قدر تو پیداوار میں سے رکھ سکتا ہے، اور جو زائد نفع ہوا ہے اس کا نہ تو خود استعمال درست ہے، نہ کسی کو ہدیہ وغیرہ دینا اس میں سے جائز ہے، بلکہ مالکِ زمین کی طرف سے غریب محتاجوں کو دیدے، اور خود امید ثواب کی نہ رکھے، یہ تو پیداوار کا حکم ہوا، اور زمین کے لئے یہ حکم ہے کہ آئندہ کے لئے اس کو چھوڑ دے، ورنہ ظلم وغصب کے گناہ میں مبتلا رہے گا، واللہ اعلم، ۱۴ ربیع الاول ۱۳۲۵ھ (امداد ج ۳ ص ۸۵)

موروثی کاشتکار غاصب ہے اس کا مرتہن بھی حکم میں غاصب کے ہے

سوال (۳۱۱) بکر زید کا موروثی کاشتکار ہے، بکر نے موروثی کھیت کو عمرو کے یہاں مبلغ چالیس روپے پر رہن رکھا ہے اب عمرو خود موروثی کھیت مرہونہ کو کاشت کرنے لگا، زرلگان کھیت کا اصلی مالک زید کو دیتا ہے جیسا کہ بکر زید کو دیا کرتا تھا،

(۱) تو عمرو کو رہن رکھ لینا جائز ہوگا یا نہیں (۲) اگر عمرو اللہ تعالیٰ کے خوف سے چالیس روپیہ تک نفع حاصل کرنے کے بعد بکر کو کھیت واپس کردے تب بھی عند اللہ ماخوذ ہوگا یا نہیں (۳) اگر عمرو نے چالیس روپیہ سے زیادہ نفع حاصل کرلیا ہے تو یہ زائد کس کو دینا چاہئے، زید کو یا بکر کو کہ عند اللہ ماخوذ نہ ہو یا اس زائد کی معافی کرانا چاہئے، تو کس سے کراوے زید سے یا بکر سے (۴) اب عمرو معاملہ رہن کے ختم ہو جانے کے بعد پھر اس کھیت کو کاشت کرنا چاہتا ہے، اور بکر رضامند ہے، اب عمرو کو اس قسم کی کاشت شکمی کرنا درست ہوگا یا نہیں (جب کہ زرلگان اصل مالک زید کو دے اور کچھ منافع بکر کو) اگر درست ہوگا تو کس طرح آیا اصل مالک کو

راضی کرنے کی ضرورت ہوگی، یا صرف بکر کی رضامندی کافی ہے؟

الجواب۔ بکر دو وجہ سے غاصب ہے، اول دعویٰ موروثیت کی وجہ سے، دوسرے اس زمین کو رہن رکھدینے کی وجہ سے جس کا اس کو شرعاً اختیار نہیں، اور غاصب سے عاریت یا اجارہ یا رہن لینے والا الحکم میں غاصب کے ہے، اور غاصب کا حکم یہ ہے کہ بقدر اپنے راس المال کے شئے مغصوب سے نفع حاصل کرسکتا ہے زیادہ نہیں، اس سے سب سوالوں کا جواب نکل آیا جزئی طور پر بھی نقل کئے دیتا ہوں (۱) جائز نہیں (۲) اصل معاملہ میں مستحق مواخذہ ہوا اور راس المال سے چونکہ زائد وصول نہیں کیا، اس حیثیت سے قابل مواخذہ نہیں (۳) اگر توقع ہو کہ بکر زائد از اصل کو زید کی طرف واپس کردے گا تو عمرو یہ زیادت بکر کو دیدے ورنہ زید کو دینا چاہئے، اور معافی بھی زید سے چاہئے، (۴) چونکہ بکر غاصب ہے اس لئے اس سے کوئی معاملہ درست نہیں اگر اصل مالک راضی ہوجاوے تو پھر کل زرلگان اصل مالک ہی کو دینا چاہئے۔ واللہ اعلم

۱۷ جمادی الاولی ۳۲۶ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۸۸) (حوادث اول ص ۱۴۱)

حکم حق موروثی

سوال (۳۱۲) انگریزی قانون کے مطابق جو زمین بارہ برس تک کسی کاشتکار کے قبضہ میں رہے تو اس زمین پر کاشتکار کا حق مقابضت ثابت ہوجاتا ہے یعنی زمیندار کو نہ اس زمین کے بیچنے کا مجاز ہے نہ مالگذاری معینہ کے بڑھانے کا بلکہ بیچنے کا مجاز کاشتکار کو حاصل ہوتا ہے یہ حق شرعاً کاشتکار کو حاصل ہے یا نہیں، بعد بیع مبیع مشتری کی ملک ہوگی یا نہیں؟

الجواب۔ اس کاشتکار کو کوئی حق شرعی حاصل نہیں ہوتا ہے، اگر ایسے کاشتکار سے کوئی خریدے گا تو وہ مشتری بھی مالک نہ ہوگا، ۱۸ ربیع الثانی ۳۳۱ھ (حوادث اول و دوم ص ۱۸)

برہن قبول کردن زمین خود از کاشتکار موروثی

سوال (۳۱۳) بعض کاشتکار موروثی اپنی کاشت کو بضرورت خود کسی مہاجن وغیرہ سے روپیہ لیکر کاشت موروثی کو رہن کردیتے ہیں اور مرتہن منافع کاشت موروثی کا لیتا ہے، ایسی صورت میں اگر بجائے اس کے کہ کاشتکار موروثی غیر شخص کے پاس روپیہ لیکر کاشت کو رہن کرے، اگر زمیندار اپنے پاس سے روپیہ دے کر اس کاشت کو خود رہن کرلے، تو ایسی حالت میں زمیندار مرتہن کو منافع کاشت کاشتکار موروثی مباح ہوگا یا مثل دیگر رہن کے یہ منافع لینا بھی اس کے حق میں حرام ہے، اور زمیندار عموماً جو کاشت موروثی اپنے پاس رہن رکھتے ہیں اس کی چار صورتیں ہیں۔

(۱) کبھی کل کاشت کا خود تردد کرتے ہیں (۲) کبھی خود جزو کاشت کرتے ہیں، اور جزو

اسی کاشتکار یا دوسرے کاشتکار کو دیتے ہیں (۲) کل کاشت مرہونہ دوسرے کاشتکار کو دیتے ہیں اور لگان خود وصول کرتے ہیں (۴) کبھی جملہ کاشت راہن کے حوالہ کرتے ہیں اور لگان زائد وصول کرتے ہیں۔

الجواب : یہ موروثی جو بلا رضائے مالک حق کاشت کا دعویٰ کرتا ہے، غاصب ہے، اور مالک کو ہر حیلہ سے اس سے اپنی زمین کا استرداد اور اس زمین سے انتفاع جو مشروع ہو جائز ہے پس گو یہ رہن اس لئے باطل ہے کہ اول تو حقِ کاشت کوئی حق مالی نہیں، اور مرہون کا حق مالی ہونا شرط ہے، دوسرے اس لئے کہ مرتہن خود ہی مالک ہے، اور مرتہن کا غیر مالک ہونا شرط ہے، وقد علّلوا بطلان بیع المرتھن من الراھن بانہ ملکہ باق کذا فی رد المحتار ج ۵ ص۵۰۰ لیکن اس باطل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ کالعدم ہے، نہ یہ کہ گناہ ہو، بہرحال اگر بہ بہانۂ رہن اس سے اپنی زمین لے لی، تب بھی درست ہوا، اور جو جو انتفاع اپنی زمین سے شرعاً مباح ہے اس صورت میں بھی مباح ہوگا، چنانچہ سوال میں جو چار صورتیں لکھی ہیں، وہ سب درست ہیں، البتہ اس رہن رکھنے میں جو مالک زمین نے اس کاشتکار کو بعنوانِ زرِ رہن روپیہ دیا ہے وہ شرعاً رشوت ہے، جس کا بلا ضرورت دینا حرام تھا، لیکن اس نے اپنے استخلاص حق کے لئے بمجبوری دیا ہے، اس لئے اس کا بھی گناہ نہیں ہوا،

۱۲ صفر ۱۳۳۳ھ (حوادث ثالث ص ۱۳۱)

جواز و اپسی کا حیلہ رقمے کہ کاشتکار موروثی برائے استخلاص حق خود داد

سوال (۳۱۴) اگر کوئی شخص موروثی زمین نکلنے کی وجہ سے مجبوراً کاشتکار کو روپیہ دے کر اپنی زمین کو اس سے علیحدہ کرے تو اس شخص کو حق ہے کہ اتنا روپیہ کسی ذریعہ سے وصول کرلے یا نہیں، آیا اس روپیہ دینے کو ہبہ بالاکراہ میں داخل کرکے مثل بیع صحیح کہا جاوے گا یا نہیں ؟

الجواب : یہ رشوت میں داخل ہے اور درمختار میں ہے الرشوۃ لاتملک بالقبض اس لئے اس روپیہ کا استرداد کسی حیلہ سے جائز ہے، اشرف علی ۲۸ شعبان ۱۳۳۳ھ (حوادث ثالث ص ۱۳۵)

دعویٰ موروثیت در زمین مملوکہ سرکار بعد بیع کردن بدست زمیندار

سوال (۳۱۵) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سرکار انگریزی ایک اراضی کی مالک تھی، کاشتکار اس میں زراعت کرتے تھے، اور لگان سرکار کو ادا کرتے تھے، بعد کو سرکار نے اس اراضی کو اسی لگان کی حیثیت پر بحالت موروثیت کاشتکاران زمینداروں کو فروخت کردی، پس اس وقت تک ان کاشتکاران کی موروثیت کاشت چلی آتی ہے، مگر لگان موروثیت میں ۵ اور

۲ کی نسبت ہو، اس صورت میں عند الشرع بھی حق کاشتکاری بہ لگان قدیمی ان کاشتکاروں کا ہے یا نہیں؟ اور مالک زمین کو ان کو بے دخل کردینے کا اختیار ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب، جب سرکار نے وہ زمین زمینداروں کے ہاتھ فروخت کردی اب بدون رضامندی زمیندار جدید کے کاشتکار کو اس زمین کا استعمال کرنا بنا بر استحقاق قدیم کو جائز نہیں۔ ۲۵ محرم ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۱۲۶)

حکم کاشت زمین موروثی بعد اجازت مالک

سوال (۳۱۶) ایک اراضی قانون انگریزی سے موروثی ہوگئی ہے، اس میں تین بھائی شریک ہیں، ایک شخص مستعفی ہونا چاہتا ہے لیکن قانوناً جب تک تینوں اشخاص کے دستخط نہ ہوں استعفا نہیں ہوسکتا، اور تینوں رضامند نہیں ہیں، تو ایک شخص کو اگر مالک زمین کچھ اضافہ پر یا اسی دین پر دیویں تو اس شخص کو اس زمین کی کاشت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب، جواب مسئلہ کا یہ ہے کہ جائز ہے لیکن ضروری ہے کہ ایک استعفے کا مضمون لکھ کر مالک کو دیدے، کہ اس شخص کی قدرت میں اتنا ہی ہے، ممکن ہے کسی وقت کسی طریق پر وہی سادہ تحریر کام دیدے۔ فقط۔ رجب ۱۳۳۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۶۳)

وصول حق واجب خود از کاشتکار موروثیت

سوال (۳۱۷) بعد سلام مسنون، والانامہ ارسال خدمت ہے، اور اس کے جواب میں التماس ہے کہ (سوال) مالک زمین اپنا حق جس کو انھوں نے غصب کر رکھا ہے الخ (جواب) حق مالک زمین جس کو کاشتکار موروثی نے غصب کر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ موروثی کاشتکار کے پاس مثلاً جو زمین ایک روپیہ فی بیگھہ کرایہ پر ہے واقع میں وہ زمین اگر اس کے پاس موروثی نہ ہوتی تو چار روپیہ فی بیگھہ اس سے وصول ہوتا، تو صورت مذکورہ میں مالک زمین کے تین روپیہ فی بیگھہ کا حق کاشتکار موروثی نے غصب کر رکھا ہے (سوال) اور وہ وصول کس طرح ہو جاوے گا؟

(جواب) صورت وصول یہ ہے کہ مثلاً اگر کسی کاشتکار موروثی نے تین سال تک روپیہ لگان ادا نہیں کیا تو مالک زمین کو یہ جائز ہے یا نہیں کہ وہ تین سال کا اس قدر روپیہ کہ درصورت سود ہوتا، بعنوان سود خود یا بذریعہ عدالت وصول کرلے، اور سود مقصود نہ ہو، بلکہ اپنے اس حق کا وصول کرنا مقصود ہو جو کہ کاشتکار مذکور نے غصب کر رکھا ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے، بینوا توجروا؟

الجواب: اس طرح سے وصول کرنا درست نہیں، کیونکہ کوئی عقد نہیں پایا گیا، جس سے تعیین ہو جاوے کہ اس قدر حق واجب ہے، البتہ اس کی ایک صورت ہے وہ یہ کہ صورت مذکورہ میں مالک اس کاشتکار سے ایک دفعہ یہ کہدے کہ میں ایک روپیہ فی بیگھہ کرایہ کو زمین پر راضی نہیں ہوں بلکہ چار روپے فی بیگھہ لوں گا یا تو چھوڑ دے اور نہیں تو چار روپیہ بیگہ لوں گا۔ اس کے بعد اگر وہ نہ چھوڑے گا تو اس کے ذمہ یہ کرایہ واجب ہو جاویگا پھر بطریق مذکورۂ سوال اس سے وصول کرنا جائز ہے۔

۲۰ ربیع الاول ۱۳۳۳ھ (حوادث اول ص ۱۳۳)

گورنمنٹ کا قانون ہے الخ

سوال (۳۱۸) گورنمنٹ کا قانون ہے کہ جس زمیندار کی زمین جو شخص ایک دفعہ بھی بولیوے وہ اس کی موروثی ہو جاتی ہے زمیندار کو حق نہیں رہتا کہ وہ کسی دوسرے شخص کو کاشت کے لئے دیدے اور کاشتکار کو حق ہوتا ہے کہ وہ حاکم کے یہاں درخواست دیکر اگر لگان غلہ ہے تو روپیہ کرلے اس طرح فی من ایک روپیہ ہو جاتا ہے مثلاً اگر کسی زمین کا لگان ۱۰؎ ہے تو اس کے ۱۰؎ روپے ہو جاویں گے اس میں زمیندار کو بہت زیادہ نقصان ہوتا ہے لیکن اس کاشتکار کے درخواست دینے سے غلہ کے روپیہ اس وقت ہوں گے جبکہ اس کے ذمہ کچھ بقایا نہ ہو ورنہ زمیندار کا جب جی چاہے لگان کا دعویٰ کردے جس کی ادائیگی کی ایک میعاد مقرر ہو جایا کرتی ہے اور اُس میعاد میں لگان ادا نہ کرنے سے کاشتکار زمین سے بیدخل ہو جاتا ہے اور زمیندار کو کلی تصرفات کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ زمیندار اگر اس نقصان سے محفوظ رہنے کے لئے صورت ذیل اختیار کرلے تو اس کے لئے شرعاً جائز ہے یا نہیں۔

چونکہ کاشتکار کا درخواست دے کر غلہ سے روپیہ کرانا اس کے ساتھ مشروط ہے کہ اس کے ذمہ بقایا نہ ہو اس لئے زید نے اس کی یہ تدبیر سوچی ہے کہ کاشتکار سے لگان تو وصول کرلیا کرے اور اس کو رسید نہ دیا کرے اور جب کاشتکار قانون ناجائز مذکورہ بالا کو استعمال کرنا چاہے تو اس کی تین برس کی نالش اور اپنا قرض کاشتکار کے ذمہ ثابت کردے کیونکہ وقت تحصیل لگان اس کو رسید نہیں دی تھی اور بغیر وصول رسید ادائیگی لگان قانوناً غیر معتبر ہے۔

؎ تین برس کی تقیید اس لئے ہے کہ گورنمنٹ کا قانون ہے کہ اگر کسی شخص کا لگان کسی کے ذمہ ہو تو وہ اس کو صرف تین سال وصول کرسکتا ہے اس سے زیادہ دنوں کا نہیں اس کی میعاد نکل جاتی ہے ۱۲ منہ محمد احمد غفرلہٗ

لہٰذا جب کاشتکار کے ذمہ تین سال کا لگان ثابت ہو جاوے گا اور وہ اس کو ایک دم قلیل مدت میں ادا نہ کر سکے گا تو زمین سے بے دخل ہو جاوے گا، چونکہ اس صورت میں جھوٹ بولنا پڑتا ہے اور جھوٹا وعدہ کاشتکار کے ذمہ کیا جاتا ہے اس لئے اس کے جواز میں شک ہے اور عموماً اس صورت میں جھوٹے دعوے وغیرہ کی نوبت بہت ہی کم آتی ہے کیونکہ کاشتکار پر دباؤ رہتا ہے رسید نہ ہونے کی وجہ سے اور وہ کچھ نہیں کرتا۔ والسلام

الجواب، جائز ہے مگر اس کا فتویٰ ایسے شخص کو نہ دیا جاوے جو کاشتکار سے مکرر وصول کرلے یا وصول ہونے کے بعد اس کو واپس نہ کرے۔ اور شبہ کا جواب یہ ہے کہ زمیندار کاشتکار کے اس دعوے استحقاق میں مظلوم ہے اور ظلم کے دفع کے لئے ایسا کرتا ہے۔

۲۷ رجب ۱۳۴۹ھ

وجوب تحقیق اراضی در صورت اعتماد کاشتکار بر بیان مالک و عدم وجوب آں در صورت رضامندی آں بر کمی و بیشی اراضی

سوال (۳۱۹) ایک کاشتکار کو ایک قطعہ اراضی کا پٹہ بقید نمبر و رقبہ و لگان بہ شرح مبلغ پانچ روپے بیگہ دیا گیا، پٹہ میں جو زمیندار کی طرف سے کاشتکار کو دیا جاتا ہے، یہ شرط بھی منجملہ اور شرائط کے درج ہے کہ کمی بیشی اراضی کی صورت میں لگان بحساب مبلغ پانچ روپے بیگہ کم و بیش کیا جاوےگا چونکہ محال کچھار ہے، اراضی کی کمی و بیشی کا احتمال رہتا ہے، اس وجہ سے یہ شرط لکھدی جاتی ہے، اب ادائے لگان کے وقت کاشتکار نے لگان طے شدہ بلا کسی عذر و دباؤ کے ادا کیا، یعنی اراضی کی کمی بیشی کا کوئی عذر نہیں کیا، بلکہ جو لگان باخود طے ہو چکا تھا وہ ادا کیا، اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ آیا زمیندار کو محض اپنے اس شبہ پر کہ ممکن ہے اراضی موقع پر کم و بیش ہو تو شرعاً اس کے ذمہ اس اراضی کی جانچ یعنی صحیح رقبہ کیا ہے، ضروری ہے یا نہیں، اور اگر رضامندی کاشتکار لگان وصول ہو گیا، اور اراضی کے متعلق کوئی جانچ کمی بیشی کی نہیں کی گئی تو وہ رقم لگان حلال ہے یا نہیں، اور اس کو اپنے صرف میں لانا جائز ہے یا نہیں،

الجواب، اگر کاشتکار نے رضامندی سے دیا ہے اور قرائن سے معلوم ہو گیا کہ زمیندار پر اعتماد نہیں کیا بلکہ کمی بیشی پر بھی راضی ہے تب تو درست ہے، اور اگر قرائن سے معلوم ہوا کہ زمیندار کے بیان پر اعتماد کیا ہے تو اس صورت میں جانچ ضروری ہے، ۴ شوال ۱۳۳۸ھ (تتمہ خامسہ ص ۱۰۰)

عدم جواز خطوط نویسی در وقت کار دفتر

سوال (۳۲۰) دفتر کے وقت میں ذاتی خط وغیرہ لکھنا چاہیے یا نہیں؟

الجواب، نہیں، (تتمہ خامسہ ص ۲۳۴)

حکم کار خود کردن در وقت ملازمت

سوال (۳۲۱) مدرسہ کے وقت میں مدرس کو کوئی اپنا کام پیش آیا، اور اس نے اپنا کام کیا اور خارج از وقت مدرسہ اس نے اس کے عوض تعلیم دی تو اس صورت میں وہ مستحق کل تنخواہ کا ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب، مدرسی عقد اجارہ ہے اگر باہم معاہدہ اجارہ کے وقت وقت کی تخصیص ہوئی ہو کہ فلاں وقت میں کام کرنا ہوگا تو دوسرے وقت کام کرنے سے مستحق اجر کا نہیں ہے، اور اگر صرف مقدار معین ہوئی ہے اور تخصیص نہیں ہوئی تو مستحق اجر ہے، فقط،

۱۵ شعبان ۱۳۲۰ھ (امداد جلد ۳ ص ۵۴، حوادث اول ۲ ص ۹۱)

ملازم کو علاوہ کار ملازمت کے دوسرا کام کرنا اور اس کی اجرت لینا

سوال (۳۲۲) ۱ ایک ملازم جو اپنی ملازمت کے علاوہ دوسرا کام خواہ اپنے متعلق یا غیر متعلق علاوہ فرائض منصبی کے کرے اس کا وہ معاوضہ یا حق المحنت لینے کا مجاز ہے یا نہیں؟

نمبر ۲ کوئی ملازم اپنے آقا کے بلا علم یا اس کی مرضی کے خلاف دوسرا کام اپنے مفاد کا ان اوقات میں جو اس کی نوکری کے علاوہ ہیں کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب، اگر نوکری کے اوقات معین ہیں تو دوسرے اوقات میں ملازم کو اپنا کام کرنا جائز ہے بشرطیکہ وہ کام آقا کے کام میں مخل نہ ہو، اور اگر نوکری کے اوقات متعین نہیں ہیں تو بلا اجازت آقا کے اپنا کام یا دوسرے کا کام کرنا جائز نہیں،

۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۹ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۷۸)

عدم جواز عمل باجرت برائے اجیر خاص

سوال (۳۲۳) السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مولانا .... انبہٹوی نے مولانا ..... صاحب صدر المدرسین مدرسہ ہذا سے زبانی کہا تھا کہ میرے ایک شاگرد اسلام نگر کے رہنے والے نے جو معزز عہدہ پر حیدرآباد دکن میں ملازم ہیں کہا تھا کہ میں تمہارے لئے ۲۵ روپے ماہوار کچھ اپنے پاس سے اور کچھ چندہ کرکے بھیجتا رہوں گا آپ کسی جگہ تشریف نہ لے جاویں، ایک جگہ رہ کر تعلیم دیں اور یہ روپیہ ماہوار کسی امین کے پاس جمع ہوتا رہے گا، آپ کو اختیار ہوگا کہ جس قدر مناسب ہوگا آپ اس میں سے ماہوار خرچ لیتے رہیں چنانچہ شاگرد صاحب یہ رقم قصبہ انبہٹہ میں امین کے پاس جمع کرانے لگے ہیں، اور میں اس میں سے موافق ضرورت کے خرچ لیتا رہتا ہوں، اگر مدرسہ کے سرپرستاں کی رائے ہووے تو میں اس رقم کو مدرسہ میں منتقل کردوں، اور یہیں رہ کر تعلیم دوں، اور بچوں کی نگرانی کردوں، اس کے

بارہ میں مولانا...... صاحب نے زبانی حضرت مولانا صاحب سے کہا تھا، زبانی شاہ صاحب نے منظور فرمالیا تھا، پھر ایک عریضہ بھیجا گیا، اس پر مولانا صاحب نے یہ تحریر فرمائی ہے جو خدمت والا میں ارسال ہے، مولانا صاحب کو ابتدائی تعلیم کا انتظام اچھا آتا ہے، اور اس کے ساتھ بہت دلچسپی ہے، اگر مناسب ہو تو مقرر فرمائے جاویں، اور علاوہ رقم موصولہ کے مدرسہ سے صرف دس روپیہ ماہوار ملتے رہیں، اور رقم کے اندر ان کو اختیار خرچ کا رہے گا جس طرح چاہیں گے خرچ کریں، جیسے ارشاد ہو تعمیل کی جاوے۔

الجواب، مخدومی السلام علیکم ورحمۃ اللہ، مجھ کو اس میں ایک شبہ ہے اگر وہ رفع ہو جاوے تو یہ صورت بہت مستحسن ہے، پھر مکرر مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں اس میں احتمال غالب یہ ہے کہ یہ خدمت بمقابلہ تعلیم کے کرنا مقصود ہے، محض تبرع نہیں تو یہ صورت اجیر خاص کی ہوگی اور اجیر خاص کو دوسرے کا عمل کرنا اور اس عمل کی اس سے اجرت لینا جائز نہیں اگر مدرسہ کی جانب سے تبرعاً دیا جاوے تو یہ مدرسہ والوں کو جائز نہیں، اس کی اصلاح ہو سکتی ہے ان صاحب کو اس تمام تر تجویز کی اطلاع کردی جاوے اور لکھدیا جاوے کہ تعلیم کا کام مثلاً اس مدرسہ میں کروں گا، اور نگرانی کا کام مثلاً مدرسہ کی جانب سے کروں گا، اور اس کا عوض مدرسہ سے لوں گا، اور وہ صاحب بھی شرکا چندہ کو اس کی اطلاع کردیں، یا ان کی طرف سے وہ وکیل مطلق کردئے جاویں، اور میرے نزدیک قطع نظر اس شبہہ فقہیہ کے ان کو اطلاع کرنے میں یہ بھی مصلحت ہو کہ اگر اور کسی ذریعہ سے ان صاحب کو خبر پہنچی کہ اس کے علاوہ مدرسہ سے بھی لیتے ہیں، تو خواہ مخواہ بزرگوں پر گمان حرص کا ہوگا جس کا اثر اور ثمرہ سب کے لئے برا ہے، والسلام، ۴ صفر ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۲۳)

فیس گرفتن بر نظارہ جانور عجیب	**سوال** (۳۲۴) کسی نادر الوجود جانور کو پردے میں رکھ کر لوگوں کو ایک دو پیسہ لیکر دکھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، فی الدر المختار لا تصح اجارۃ لدابۃ لیجنبها ولا یرکبها ولا لاجل ان یربطها علی باب دارہ لیراها الناس فیقال لہ فرس الی قولہ لما قلنا ان ھذہ منفعۃ غیر مقصودۃ من العین واذا فسدت فلا اجر لہ ج ۵ ص ۲۲۱، باب ما یجوز من الاجارۃ اس روایت کی بناء پر صورت مسئولہ میں پیسے لینا جائز نہیں الا ان یقصد اجارۃ ذات البیت لتلک الساعۃ لدخولها وھو بعید کما تریٰ۔ ۱۲ شعبان ۱۳۳۵ھ (حوادث خامسہ ص ۹)

عدم جواز نشاندن در ریل کسے را باین حیلہ کہ ملازم او ست

سوال (۳۲۵) ایک شخص کے پاس جو ریلوے کا ملازم ہے دو آدمیوں کا پاس ملا ہوا ہے کیا ہر شخص جس کو وہ لیجانا چاہے جا سکتا ہے شرعاً کوئی جرم تو نہیں ہے؟ جبکہ وہ یہ کہدیگا کہ یہ میرا آدمی ہے، خواہ اسکا آدمی ہو یا نہو، افسر ریلوے اسکو نہیں پکڑ سکتا ہے نہ کوئی جرم ہے، شبہ اس وجہ سے ہے کہ جب اس کا خاص آدمی نہیں ہے محض دوست یا رشتہ دار ہے تو شاید شرعاً اس آدمی کو جانا جائز نہ ہو؟

الجواب، واقعی جائز نہیں، (حوادث خامسہ ص ۱۷)

حلال بودن زر تنخواہ کہ بحکم مالک مال از مال مسروقہ او ادا کردہ شود

سوال (۳۲۶) بعد القاب و آداب، عرض ہے کہ ہم ایک انگریز کے گھر میں نوکری کرتے ہیں، اور ایک خانساماں ہے جو کہ بازار کرتا ہے اور بازار کے پیسہ میں چوری کرتا ہے، اور وہی پیسہ ہم کو دیتا ہے، اور یہ چوری کی بات صاحب جانتا ہے تو کیا یہ پیسہ ہمارے لئے جائز ہے یا نہیں، اور خود انگریز حکم دیتا ہے کہ دو (وہی چوری کا پیسہ) تو اس میں کونسی بات پر عمل کیا جاوے؟

یہاں سے یہ تنقیح کی گئی

جب تم انگریز کے نوکر ہو تو تنخواہ انگریز کے پیسہ سے ملنا چاہئے، خانساماں کے پیسہ کیسی ملتی ہے، یہ بات سمجھ میں نہیں آئی، اس کو صاف لکھو تو جواب دیا جاوے،

تنقیح کا یہ جواب آیا!

پیسہ صاحب کا ہے، فقط صاحب پیسہ بازار کرنے کو دیتا ہے، اور خانساماں اس میں سے چوری کرتا ہے اور صاحب ہم لوگوں کو تنخواہ جدا دیتا ہے۔

یہاں سے اسکا یہ جواب دیا گیا

مطلب اب بھی صاف نہیں ہوا، شاید یہ مطلب ہے کہ انگریز سب کام بذریعہ خانساماں کے لیتا ہے، یعنی سودا بھی خانساماں ہی سے منگاتا ہے اور جو دام وہ بتلادیتا ہے، انگریز دیدیتا ہے اور اسی طرح تمہاری تنخواہ دینے کو بھی اسی خانساماں سے کہدیتا ہے، پھر حساب معلوم ہونے کے بعد وہ تنخواہ بھی اس کو بیباق کر دیتا ہے، تو وہ خانساماں جو تنخواہ دیتا ہے وہ اس چوری کے پیسے سے دیتا ہے جس کو روزمرہ کے سودے میں سے چراتا ہے، سو اگر یہی مطلب ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ وہ پیسہ اسی انگریز کا ہے تو تنخواہ انگریز ہی کے پیسہ سے ملی اس لئے تم کو حلال ہے، کیونکہ وہ پیسہ خانساماں کے حق میں حرام ہے نہ کہ اس انگریز کے حق میں اور اسیطرح وہ انگریز جس کو

دلائے اس کے حق میں بھی حرام نہیں، اور اگر کچھ اور مطلب ہے تو صاف لکھو۔

۲۸ شوال ۱۳۳۶ھ (حوادث خامسہ ص ۱۸)

حکم عہدۂ قضائے نکاح

سوال (۳۲۷) حضور عالی درین روزگار عہدۂ قضائے عالمگیر مت
ومولویان بخواہش تمام اختیار می کنند ایں عہدہ جائز ست یا نہ ونیز گورنمنٹ قانون نافذ ساختہ
کہ در ہر تحصیل نکاح یا طلاق یک روپیہ فیس گرفتہ شود لیکن قاضیان زائد از مقدار معین می گیرند
بعض قاضی می گویند کہ قانون سرکاری در حلت وحرمت مؤثر نیست چہ حلت شرعی است نہ سرکاری
ونیز می گویند کہ ملایان در خواندن نکاح دو سہ روپیہ جبراً می گیرند ایں باتفاق علماء درست است
ورجسٹری نکاح نیز از ہمیں قبیل است پس چرا جائز نخواہد شد، امید کہ جواب مرحمت فرمایند بینوا توجروا

الجواب من مولانا محمد اسحاق، اجرت نکاح خوانی مثل اجرت دیگر امور
مباح است نہ ایں استیجار علی الطاعۃ است ونہ استیجار علی المعصیت کہ ناجائز باشد پس اگر بتراضی
طرفین اجرتے مقرر شود بشرطیکہ دران جبر واثر وجاہت وغیرہ نباشد جائز است لیکن نکاح خوانان
طریقہ جبر وتعدی وتاذی اختیار نمودند لہذا مفسدہا برپا می شوند وغریب رعایا بجاں می آیند لہذا
حکام وقت نکاح خوانی را تحت ضابطہ آوردہ بشخصیکہ بزعم ایشان معتبر می دانند، چند دیہات یا محلات
متعلق می کنند کہ ساکنان آنجا خواہند کہ از بے ضابطگی فلاں فلاں کسان رستگاری می خواہند پس فلاں
شخص را طلبیدہ رجسٹری نکاح کنند وباضابطہ رسید وغیرہ گیرند کہ اگر نوبت بخصومت رسد یا واقعہ
پیش آید بذریعہ بہی سرکاری اثباتش معتبر نباشد یا قاضی معتمد مددش کنندہ ہرگاہ مقصود رفاہ عام
است، واز عدم تحدید اجرت سلوک طریق جبر وتعدی ممکن بود لہذا فیس نکاح مقرر شدہ کہ عام رعایا آگاہ
شدہ بسہولت بانجام دہی امر قادر شوند وتحدید فیس از روئے فقہ نیز درست است چنانکہ در قسمت
اموال فی الہدایۃ ص ۳۹۵ کتاب القسمۃ وینبغی للقاضی ان ینصب قاسما یرزقہ من بیت
المال یقسم بین الناس بغیر اجر لان القسمۃ من جنس عمل القضاء من حیث یتم بہ قطع
المنازعۃ فاشبہ رزق القاضی فان لم یفعل نصب قاسما یقسم بالاجر معناہ باجر
علی المتقاسمین لان النفع لہم علی الخصوص ویقدر اجر مثلہ کیلا یتحکم بالزیادۃ الخ
پس غرضے را کہ مد نظر داشتہ احداث ایں عہدہ شدہ یعنی از اثر وجاہت خویش قضاۃ اجرت زائد
نگیرند بلکہ از یں ممنوع اند پس قضاۃ زمانہ برخلاف آں روند پس علاوہ قلب موضوع وخلاف رزی
حکام مخالف روایت فقہی نیز ہست پس آناں کہ از فیس مقرر زائد می گیرند اگر آں را بطیب نفس اہل نکاح

می دہند روایں تقریباً مفقود است) جائز شدن میتواند واگر بغیر طیب نفس از اثر وجاہت خود زر را از اجرت مقررہ زائد می گیرند ہمانا کہ رشوت است پس اگر ایں عہدۂ قضا را کہ حسب قانون ایجادش شدہ قضاۃ زمانہ جائز می پندارند پس آثارش کہ مترتب بر آن ست چرا منکر اند حالیکہ عہدۂ دفیس ہر دو از قانون سرکاری مستفاد شدہ پس قانون در جواز ایں عہدۂ مؤثر باشد ور نکمش کہ ثمرہ آنست مؤثر نباشد چہ معنی دارد بہر حال قبول عہدۂ قضا درست است و بر فیس معینہ کہ یک روپیہ است زیادہ گرفتن بغیر طیب نفس رشوت است۔ قال اللہ تعالیٰ یا ایہا الذین اٰمنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم واللہ اعلم۔

تصحیح از صاحب فتویٰ

جواب صحیح است آرے بعض اجزائے جواب قابل توضیح است۔

قولہ ۱؎ فی الجواب اگر بتراضی طرفین الخ فی الحال مشاہد ست کہ عاقد ایں اجارہ بقاضی ولی دختر می باشد واجرت از زوج یا ولی او بجبر می دہانند۔

قولہ ۲؎ فی الجواب ساکنان آنجا اگر خواہند الخ فی الحال مشاہد ست کہ اگر اہل معاملہ نخواہند تاہم قضاۃ یا نائبان ایشاں بر آناں جبر می کنند ودرج رجسٹر کردہ بزور اجرت می گیرند وایں حرام است وہمچنیں اگر دیگرے نکاح خواند ہم میگیرند خواہ نائب او باشد یا اجنبی وہمچنیں از نائب خود باوجود عدم عمل روپیہ میگیرند محض بربنائے انابت وایں صریح رشوت است۔

قولہ ۳؎ فی الجواب وعدم تحدید اجرت سلوک طریق الخ فی الحال ایں تحدید موجب تعدی شدہ کہ اگر اہل معاملہ بر آں مقدار راضی نباشند قضاۃ بجبر می گیرند ومثل آں دیگر مفاسد نیز ہست پس اسلم واسد للباب ہمیں ست کہ از قبول ایں عہدہ منع کردہ شود۔ ۹ ذیقعدہ ۱۳۳۵ھ (حوادث خامس ص ۱۹)

عدم جواز نذرانہ در ترک کردن بیدخلی کاشتکاران بصورت جواز

سوال (۴۲۸) میں نے تین کاشتکار کو آراضی سے بیدخل کرنے کیلئے نالش تیار کی، کہ باضابطہ بے دخل کردیا جاوے، ورنہ دو تین سال میں موروثی ہوجاتی ہے، اور اس زمینداری میں چند شرکار بھی ہیں جب اُن میں سے ایک کاشتکار کو خبر ہوئی تو اس نے مجھے دس روپے نذرانہ دیئے ہیں کہ مجھ کو بیدخل نہ کرو، چنانچہ میں نے دس روپے لے لئے اور نالش نہیں کی، اور یہ سوچ لیا ہے کہ اگر آئندہ اس پر نالش کروں گا تو اس کا روپیہ واپس کردوں گا ورنہ نہیں اس میں مجھے شبہ ہے کہ جائز ہے یا ناجائز اگر ناجائز ہے تو ابھی واپس کردوں گا۔

الجواب، یہ ناجائز ہے مگر ایک تاویل سے جواز ہوسکتا ہے، وہ یہ کہ اس سے جو اجرت زمین

کی ٹھیری ہوئی ہے اس اجرت میں اتنی زیادت کردے خواہ ایک ہی سال کے لئے ۔

قرب ۱۳۳۷ھ (حوادث خامسہ ص ۲۳)

ترجیح صورتِ ملازمت مدرسہ کہ جزو آمدنی آں محکمہ شراب است بر آں کہ کل آمدنی آں از سود است

سوال (۳۲۹) سود لینے اور سود دینے دونوں کی سخت ممانعت آئی ہے بمسئلہ ذیل میں مقابلۃً کونسی صورت روزگار کے اعتبار سے اختیار کی جاسکتی ہے ؟

۱۔ ایک شخص مدرسہ میں کسی ریاست کے ملازم ہے، والی ریاست نے ایک رقم کثیر سرکاری بنک میں جمع کردی، کہ اس کے سود سے اس مدرسہ کے اخراجات نکلتے ہیں، گو دوسری مدت امداد آجاوے مگر مستقل آمدنی سود والی ہے ۔

۲۔ ایک دوسرا مدرسہ دوسری ریاست کا ہے، جس میں کوئی خاص آمدنی وقف نہیں کی گئی اور تنخواہ ریاست کی سرکاری خزانہ سے دی جاتی ہے، جس میں محکمہ شراب کی بھی آمدنی شامل ہے لیکن آخر الذکر ریاست کے سکہ کا تبادلہ اگر سکۂ انگریزی سے کرنا ضروری پڑے (مثلاً وطن کو روپیہ روانہ کرنا ہے اور وہ انگریزی علاقہ میں ہے) اور اس کو اپنی تنخواہ کا قلیل حصہ کٹوادینا پڑے، جس کو والی ریاست اس کو پنشن دیتے وقت مع کچھ اضافہ کے واپس کرے جس کی نسبت یہ تصریح نہیں ہے کہ وہ بنک میں جمع کیا جاتا ہے یا تجارت میں لگایا جاتا ہے، بدرجہ مجبوری اور روزگار نہ ہونے کی حالت میں کون صورت قابل اختیار ہے ؟

الجواب : دوسری ، ۲۸ شعبان ۱۳۳۶ھ (حوادث خامسہ ص ۲۷)

تحقیق استحقاق اجرت وقت غیر حاضری یا کمی طلبہ

سوال (۳۳۰) مدرس مدرسہ میں آیا طلبہ بیمار رہیں یا بوجہ قلت اسباق تمام وقت مقررہ مدرسہ تعلیم میں مشغول نہیں تو اس صورت کل تنخواہ کا مستحق ہوگا یا نہیں ؟

الجواب : یہ اجیر خاص ہے تسلیم نفس سے استحقاق اجر کا ہوجاوے گا، پس اگر یہ اس وقت میں حاضر رہا تو مستحق ہے ورنہ نہیں، ۱۵ شعبان ۱۳۳۲ھ (حوادث اول ص ۹۱ وامداد ج ۳ ص ۱۳۷)

تحقیق استحقاق تنخواہ سعی چندہ درحالت عدم سعی

سوال (۳۳۱) مہتمم نے ایک ساعی چندہ کے لئے مقرر کیا، اور اس کی تنخواہ مقرر کی، اس کی سعی سے چندہ مقرر ہوا، اب وہ سعی جیسا کہ پہلے کرتا تھا کہ سفر یا شہر میں جدید چندے مقرر کرائے، نہیں کرتا، بلکہ محرر وغیرہ کی نگرانی وغیرہ کرتے ہیں، اور جس وقت نگرانی کرتے ہیں اس وقت کی تنخواہ تعلیم وغیرہ ہی کی وہ لیتے ہیں۔ پس اس صورت میں وہ

سعی چندے کی تنخواہ کے مستحق ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: جب عمل نہیں استحقاق اجرت نہیں جیسا ظاہر ہے۔

۵ اشعبان ۱۳۳۲ھ (حوادث اول ص ۹۰ و امداد جلد ۳ ص ۵۵)

جواز اخذ اجرت اراضی زائد از تعیین سرکاری | **سوال** (۳۳۲) کاشتکار سے سرکاری معینہ رقم سے زیادہ وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اس سوال کے معنی جو میں سمجھا ہوں وہ یہ ہیں کہ زمیندار یعنی مالک زمین کو سرکار نے کسی قانون سے یہ حکم کر دیا ہے کہ تم اپنی زمین کے کاشتکار سے اس قدر مقدار سے زیادہ لگان نہیں لے سکتے ہو، اگر یہی معنی ہیں تو جواب یہ ہے کہ اجرت ٹھیرانے کا استحقاق مالک کے ہوتے ہوئے غیر مالک کو نہیں ہے، اس لئے یہ حکم شرعاً غیر معتبر ہے، اور زمیندار کو بلا شبہ یہ حق حاصل ہے کہ کاشتکار کو مجبور کرے کہ ہم کو اس قدر لگان دینا ہوگا ورنہ ہم تم کو کاشت کی اجازت نہیں دیتے، اگر اس کے بعد وہ بڑھا دے گا تو زمیندار کے لئے حلال طیب ہے اور اگر اس نے نہ بڑھایا تو ایسی زمین کی کاشت سے وہ گنہگار ہوگا اور اگر سوال کا کچھ اور مطلب ہو تو اس کی توضیح کے بعد جواب ممکن ہے

۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۲ھ (امداد جلد سوم ص ۵۷)

تحقیق بعض احکام دلال | **سوال** (۳۳۳) (۱) دلال اجیر مشترک ہے یا خاص (۲) بیع و شراء میں دلالی کا اجورہ کس قسم کا جائز ہے (۳) تیل اور چینی اور کپڑے کے تجار مال آڑھت والے کے پاس بھیجدیتے ہیں آڑھت والا مال حفاظت سے اپنے مکان میں رکھتا ہے جب خریدار آجاتا ہے اس کو فروخت کر کے ۲ یا ۱ فی صدی رقم آڑھت کی جو مقرر ہے لیتا ہے آیا اس قسم کی اجرت درست ہو سکتی ہے (۴) کپڑے کی آڑھت والے کے پاس خریدار فرمائش لکھ کر بھیجدیتے ہیں، آڑھت والا فرمائش کے مطابق کپڑا خرید کر بھیجدیتا ہے اور حق آڑھت کا ۲ فی صدی جو مقرر ہے لیتا ہے، آیا یہ درست ہے (۵) بعض جگہ دلالوں کی دلالی فی روپیہ ایک پیسہ مقرر ہے یعنی جتنے روپے کا کپڑا فروخت کر دیں فی روپیہ ایک پیسہ دلالی لے لیتے ہیں ایسی دلالی جائز ہے یا نہیں (۶) چینی کے دلال ہر بیل میں ۲ ر دلالی پاتے ہیں یہ درست ہے یا نہیں۔ (۷) بعض جگہ یہ رسم ہے کہ وہاں کی قوم متفق ہو کر بعض شخص کو دلال مقرر کرتے ہیں، اور ان کے خیال میں وہ خاندانی دلال متصور ہوتا ہے، اور جتنی اولاد اس کے خاندان میں ہوتی ہے سب دلال کہی جاتی ہے، اور حق دلالی کا رکھتی ہے، کیا دلالی ایسی شے ہے کہ اس میں

توریث جاری ہو سکتی ہے، (۸) نکاح کی دلالی میں بعض لوگ اجرت دیتے لیتے ہیں یہ درست ہے یا نہیں۔

جواب : (۱) اجیر مشترک ہے (۲) یہ سوال سمجھ میں نہیں آیا (۳) فی شرح الطریقۃ المحمدیۃ للخادمی الجزء الرابع منہ عن لب الاحیاء واما اعانتہ علی عمل معین الی قولہ او مباح فیہ تعب بحیث یجوز الاستیجار علیہ حل اخذہ وھو جعل اھ فی رد المحتار عن جامع الفصولین للقاضی ان یاخذ ما یجوز لغیرہ الی قولہ جواز اخذ الاجرۃ الزائدۃ وان کان العمل مشقۃ قلیلۃ ونظرھم لمنفعۃ المکتوب لہ اھ قلت ولا یخرج ذلک عن اجرۃ مثلہ فان من تفرغ لھذا العمل کثقاب اللآلی مثلا لا یاخذ الاجر علی قدر مشقتہ فانہ لا یقوم بمؤنتہ ولو الزمناہ ذلک لزم ضیاع ھذہ الصنعۃ فکان ذلک اجر مثلہ اھ جلد خامس ص ۸۶ ، اس روایت سے معلوم ہوا کہ چونکہ آڑھت میں عمل اور مشقت موجود ہے اس لئے اجرت درست ہے (۴) جیسے اوپر کی صورت میں بیع میں مشقت تھی، اس صورت میں اشتراء میں مشقت ہے لہذا اس میں بھی اجرت درست ہو (۵) جب اس اجرت کا جواز ثابت ہوگیا، اور اس کے شرائط میں سے تعیین اجر ہے، اور تعیین کی یہ بھی ایک صورت ہے اس لئے جائز معلوم ہوتا ہے (۶) اس میں بھی مثل نمبر ۴ کے تعیین ہے لہذا درست معلوم ہوتا ہے (۷) دلالی عقد اجارہ ہے، اور اجارہ محل توریث نہیں چنانچہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر موجر یا مستاجر مر جاوے اجارہ فسخ ہو جاتا ہے، اس کے ورثہ قائم مقام نہیں ہوتے، البتہ اگر اپنی خوشی سے پھر اسی شخص کی اولاد سے معاملہ رکھے یہ اور بات ہے لیکن جبر نہیں ہو سکتا، نہ موجر کی طرف سے نہ مستاجر کی طرف سے (۸) فی شرح الطریقۃ المحمدیۃ بعد العبارۃ المذکورۃ فی نمبر ۲ ما نصہ او لا تعب فیہ ککلمۃ او فعلۃ من ذی الجاہ حرم اخذہ اذ لم یثبت فی الشرع تعویض عن الجاہ، اس سے معلوم ہوا کہ جہاں اجرت بمقابلہ جاہ کے ہو وہ حرام ہے اور نکاح میں یقیناً قبول قول ساعی موقوف ہے اس کی جاہ پر چنانچہ اگر کوئی غیر ذی جاہ اس سے زیادہ سعی کرے اور کامیابی نہ ہو ہرگز اس کو اس قدر عوض نہ دیا جائے گا اور جاہ شرع میں کوئی چیز قابل اجارہ نہیں، اس لئے یہ دلالی حرام ہے، ۱۶ شعبان ۱۳۲۲ھ۔

سوالات متعلقہ سوالات بالا

بندہ نے ماہ شعبان میں چند سوالات بھیجے تھے اس کا جواب آیا مگر شکوک نہیں زائل ہوئے دلالی کے مسئلہ میں یہاں رائیں مختلف ہیں، عبارتیں کتابوں کی اور شک پیدا کرتی ہیں اس وجہ سے

میں کتابوں کی عبارت نقل کر کے بالتفصیل اپنے شکوک عرض کرتا ہوں، امید کہ جواب شافی سے سرفراز فرمایا جاؤں (توضیح سوال نمبر ۲) چونکہ عبارات منقولہ نمبر ۱، ۲، ۵ و ۶ سے صاف ثابت ہے کہ بلا تعیین مدت بیع و شراء کی دلالی ہمارے مذہب میں درست نہیں، اور جب تعیین وقت ہوگی تو دلال اجیر مشترک نہیں رہ سکتا، بلکہ وہ اجیر خاص ہوگیا، اسی وجہ سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ دلال جب اجیر مشترک ہے تو بیع و شراء میں کس قسم کی دلالی اس کی جائز ہے، (توضیح سوال سوم) آڑھت دار اگرچہ مال اپنے مکان میں رکھتا ہے مگر اس کے لئے کوئی مدت معین نہیں بلکہ مجہول ہے اگر دو ماہ تک مال فروخت نہ ہو تب بھی ۱۰/ سیکڑہ حق آڑھت لیتا ہے اور اگر ایک روز میں فروخت ہو بلکہ اسٹیشن پر قبل پہونچنے مکان آڑھت کے مال فروخت ہو جائے تب بھی اسی قدر آڑھت کی رقم لیتا ہے، اور اگر کہا جائے کہ وہ اجورہ مکان نہیں بلکہ دلالی ہے تو دلالی اس قسم کی بمذہب حنفیہ نادرست ٹھیرتی ہے جیسا کہ عبارت منقولہ سے واضح ہے، اس وجہ سے مجھے تامل ہوتا ہے کہ آڑھت کی رقم کو جائز کہوں یا ناجائز (توضیح نمبر ۴، ۵، ۶) چونکہ اس صورت میں تعیین وقت نہیں ہے، بمذہب امام نادرست ہونا چاہئے چنانچہ عبارات منقولہ شاہد ہیں،

عباراتِ کتب معتبرہ

(۱) فتاوی قاضی خاں ج ۳ ص ۵۳ میں ہے رجل امر سمساراً لیشتری له الکرابیس او دلالا لیبیع له هذه الاثواب بدرهم لا یجوز هذه الاجارة لان البیع لا یتم بالدلال وانما یتم به و بالمشتری ولا یدری متی یجیئ المشتری فان ذکر لذلک وقتا ان ذکر الوقت اولا ثم الاجرة بان قال استاجرتک الیوم بدرهم الیوم علی ان تبیع لی کذا جاز وان ذکر الاجرة اولا ثم الوقت بان قال استاجرتک الیوم بدرهم الیوم علی ان تبیع لی کذا او تشتری لا یجوز و هذه ومسئلة قدرية الکرس سواء واذا فسدت الاجارة والعمل واتم العمل کان له اجر مثله علی ما هو العرف فی اهل ذلک العمل وذکر محمد الحیلة فی استیجار السمسار وقال یامره ان یشتری شیئا معلوما او یبیع ولا یذکر له اجرا ثم یواسیه بشیئ اما هبة او جزاء عمله فیجوز ذلک لمساس الحاجة کما جاز دخول الحمام باجرة غیر مقدرة ثم یعطی الاجر عند الخروج فکذا الرجل شرب الماء من السقاء ثم یعطی له فلسا او شیئا وکذا الختان والحجام واذا اخذ السمسار اجر مثله هل یطیب له ذلک اختلفوا فیه قال الشیخ الامام المعروف بخواهر زادہ

یطیب لہ ذلک وھکذا عن غیرہ والیہ اشار محمد فی الکتاب وھو نظیر ما لو اشتری شیئاً شراءً فاسداً فھلک المبیع عندہ واخذ البائع قیمتہ طابت القیمۃ للبائع وقال بعضھم لا یطیب للدلال والسمسار اجر مثلہ لانہ مال استفادہ بعقد فاسد ھذا اذا امر السمسار بالبیع والدلال بالشراء ولم یذکر لہ وقتا اما اذا ذکر لہ وقتا بان قال استأجرتک الیوم بدرھم علی ان تبیع لی ھذہ الاثواب او تشتری لی کذا حتی جازت الاجارۃ کان لہ المسمی فیطیب لہ عند الکل اھ (۲) اور فتاوی عالمگیری جلد ۳ صفحہ ۶۲۲ میں ہے اذا استاجر رجلا یبیع لہ بکذا او یشتری لہ بکذا فھی فاسدۃ فان باع وقبض الثمن فھو امانۃ کذا فی الغیاثیۃ وان ذکر لذلک وقتا فان ذکر الوقت اولا ثم الاجر بان قال لہ استاجرتک الیوم بدرھم علی ان تبیع لی وتشتری لا یجوز الخ الی ان قال ھکذا فی فتاوی قاضی خان (۳) رد المختار جلد ۵ صـ۴۹ میں ہے قال فی البزازیۃ اجارۃ السمسار والمنادی والحمامی والصکاک وما لا یقدر فیہ الوقت ولا العمل تجوز لما کان للناس بہ الحاجۃ ویطیب الاجر الماخوذ لو قدر اجر المثل اھ ایضاً فیہ صـ۳۹ (۴) قال فی التتارخانیۃ وفی الدلال والسمسار یجب اجر المثل وما تواضعوا علیہ ان فی کل عشرۃ دنانیر کذا فذاک حرام علیھم وفی الحاوی سئل محمد بن سلمۃ عن اجرۃ السمسار فقال ارجو ان لا باس بہ وان کان فی الاصل فاسد لکثرۃ التعامل وکثیر من ھذا غیر جائز فجوزوہ لحاجۃ الناس الیہ کدخول الحمام اھ بخاری شریف جزء ۹ میں ہے باب اجرۃ السمسرۃ ولم یر ابن سیرین وعطاء وابراھیم والحسن باجر السمسار باسا، فتح الباری جزء تاسع صـ۳۵۱ میں ہے کان المصنف اشار الی الرد علی من کرھھا وقد نقلہ ابن المنذر عن الکوفیین وایضاً فیہ صـ۳۴۵ (۵) ثم اورد المصنف حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ الماضی فی البیوع والمراد منہ قولہ فی تفسیر المنع لبیع الحاضر للبادی ان لا یکون لہ سمسارا فان مفھومہ انہ یجوز ان یکون سمسارا فی بیع الحاضر للحاضر ولکن شرط الجمھور ان تکون الاجرۃ معلومۃ وعن ابی حنیفۃ ان دفع لہ الف علی ان یشتری بھا بزا باجرۃ عشرۃ فھو فاسد فان اشتری فلہ اجرۃ المثل ولا یجوز ما سمی من الاجرۃ وعن ابی ثور اذا جعل لہ فی کل الف شیئاً معلوماً لم یجز لان ذلک غیر معلوم فان عمل فلہ اجر مثلہ وحجۃ من منع انھا اجارۃ فی امر لا یدل غیر معلوم وحجۃ من اجازہ انہ اذا عین لہ الاجرۃ کفی ویکون من باب الجعالۃ واللہ اعلم اھ اور عمدۃ القاری شرح بخاری ج ۵ صـ۲۶۵ میں ہے (۶) وھذا الباب فیہ

اختلاف العلماء فقال مالک یجوز ان یستاجرہ علی بیع سلعتہ اذا بین لذلک قال وکذلک اذا قال لہ بع ہذا الثوب ولک درھم انہ جائز وان لم یوقت لہ ثمنا وکذلک ان جعل لہ فی کل مائۃ دینار شیئا وھو جعل وقال احمد لا باس ان یعطیہ من الالف شیئا معلوما وذکر ابن المنذر عن حماد والثوری انہما کرھما اجرہ وقال ابوحنیفۃ ان دفع لہ الف درھم یشتری بہا بزا عشرۃ دراھم فہو فاسد وکذلک لو قال اشتر مائۃ ثوب فہو فاسد فان اشتری فلہ اجر مثلہ ولا یجاوز ما سمی من الاجر وقال ابوثور اذا جعل لہ فی کل الف شیئا معلوما لم یجز لان ذلک غیر معلوم فان عمل علی ذلک فلہ اجرہ وان اکتراہ شہرا علی ان یشتری لہ ویبیع فذلک جائز، اور مسئلہ دلالی کے متعلق ایک شبہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جب وہ اجارہ فاسد ہے تو اجرت مثل دلائی جاوے گی اور اجرت مثل کا موازنہ اور تخمینہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ کوئی فرد اسکا جائز ثابت ہو، مگر کتابوں کی عبارت سے نہیں ثابت ہوتا ہے کہ بیع وشرا میں کسی قسم کی دلالی جائز ہو

الجوابات

(جواب توضیح سوال نمبر ۲) فی الواقع ان عبارات کا یہی مقتضا ہے لیکن بوجہ حاجت عامہ روایت بزازیہ مندرجہ ۳ ھ روایت حاوی مندرجہ ۴ پر فتویٰ دینا ارفق بالناس ہے، ہذا ما رأیت واللہ اعلم اور (جواب توضیح سوال ۳) عبارت سوال ۳ صریح ہے اس میں کہ یہ آڑہت والا دلال ہی ہے وقد علم حکمہ آنفا (جواب توضیح سوال نمبر ۴، ۵، ۶) یہ بھی اوپر کی تحقیق پر متفرع ومبنی ہیں، فحکمہ حکمہ واللہ اعلم، اور اخیر کا شبہ بعد ثبوت جواز خود دفع ہو جاوے گا، واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم،

۱۴ ذیقعدہ ۱۳۲۲ھ (امداد ج ۳ ص ۵۷)

اجرت بر سماع قرآن بغرض تصحیح

سوال (۳۴۴) سماعتِ قرآن کی اجرت اور قرأت قرآن کی اجرت میں کیا فرق ہے کہ ثانی حرام ہے اور اول حلال؟

جواب، سماعتِ قرآن سے غرض یہ ہے کہ جہاں بھولے گا بتلا دے گا، پس یہ تعلیم ہوا اور تعلیم پر اجرت لینے کے جواز پر فتویٰ ہے بخلاف قرأت کے کہ اس میں تعلیم مقصود نہیں اس لئے کلیہ حرمت اجر علی الطاعت میں داخل رہے گا، فقط واللہ اعلم ۱۱ رمضان ۱۳۲۶ھ (امداد جلد ۳ ص ۶۱)

حکم حیلہ اور اجرت بر تعلیم قرآن یا تبلیغ احکام

سوال (۳۴۵) جو شخص کہ جواز اجرت تعلیم قرآن کا قائل نہ ہو اور کسی کو تعلیم قرآن شریف دے کر تنخواہ لینی محض ناجائز سمجھتا ہو مطابق رائے متقدمین کے اس کو اگر ان بچوں کے سرپرستوں سے جسے وہ قرآن شریف پڑھاتا ہو، اوقات مخصوصہ میں

یعنی جس وقت وہ زکوٰۃ نکالتے ہوں یا صدقہ دیتے ہوں کچھ روپیہ مل جایا کرے اور وہ معلم ان روپیوں کے لینے والوں میں اپنے کو زیادہ مستحق سمجھتا ہو اور ان بچوں کے سرپرستوں کا بھی ایسا ہی خیال ہو، بسبب تعلیم و تعلم کے چنانچہ اگر اس شخص کو اسی قدر روپے دیئے جاویں جس قدر اوروں کو بھی دیئے گئے ہیں، تو ان کی خفگی کا باعث ہو، اور دینے والے بھی ان کی خفگی بجا سمجھتے ہوں پس ایسے شخص کو اس کے اعتقاد کے مطابق ایسی صورت میں وہ روپے جائز ہوں گے یا ناجائز اور اگر باعث خفگی نہ ہو بلکہ لینا اور نہ لینا اور دینا نہ دینا مساوی سمجھا جاتا ہو تو کیسا ہے فی زمانہ جیسا کہ مرض پھیلا ہوا ہے کہ لوگ مرید کیا کرتے ہیں، اور کسی خاص وقت میں یا جس وقت بھی وہ مریدوں کے یہاں پہونچ جائیں انھیں کچھ روپے مل جایا کرتے ہیں اور اگر وہ روپے نہ ملیں تو گو وہ اپنی زبانوں سے برا بھلا نہیں کہیں گے مگر اس کا ملال انھیں ضرور ہوگا ایسے روپیہ کا دینا اور لینا کیسا ہے اور اگر ایسی بات نہیں ہے بلکہ وجود و عدم یعنی دینا اور نہ دینا مساوی سمجھا جاتا ہے پھر کیسا ہے،

حاصل کلام یہ کہ اگر تعلیم مذکور عبادت قرار دیا جاوے بریں تقدیر ورثہ صبیان کو بطور خاطرداری داد و دہش کرنا جائز ہے یا نہ اگرچہ اس داد و دہش کو مزدوری قرار نہ دیا جائے وحال پیران و مرشدان کیا ہے، اس صورت میں کہ ان کو بھی بطریق خاطرداری بوجہ تلقین و تذکیر روپیہ وغیرہ دیا جاوے، برتقدیر عبادت یہ روپیہ پیران مذکور کو لینا جائز ہے یا نہ اور مریدان کو دینا ان جملہ صورتوں میں یہ داد و دہش اجرت قرار نہیں دی گئی ہے۔

الجواب ، اگر ایسا لینا دینا عام طور سے متعارف ہو جاوے کہ لینے دینے کو ضروری سمجھا جانے لگے تب تو بقاعدۂ المعروف کالمشروط یہ صریح عوض اور اجر ہے، اور مرشد کے لئے اتفاقاً ناجائز اور معلم کے لئے مختلف فیہ مگر دینے والے کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اور اگر معروف کے درجہ میں نہیں پہونچا تو نہ دینے سے دل میں رنج و شکایت ہونا دلیل ہے فساد نیت و حرص و قصد عوض کی اس سے معلم کو ثواب تعلیم اور مرشد کو ثواب تلقین نہ ملے گا اور حرص کی ظلمت و وبال میں ابتلا ہوگا لقولہ علیہ السلام انما الاعمال بالنیات لیکن زکوٰۃ ادا ہو جاوے گی، رہا اس روپیہ کا حلال یا غیر حلال ہونا سو اگر دینے والا بطیب خاطر دیتا ہے، تب تو روپیہ حلال ہے، اور اگر تنگ اور گراں خاطر ہو کر دیتا ہے تو روپیہ بھی حلال نہیں لقولہ علیہ السلام الا لا یحل مال امرء مسلم الا بطیب نفسہ، البتہ اگر محض محبت سے دیتا ہو گو وہ

محبت بوجہ معلم اور مرشد ہونے کے ہو وہ ہدیہ مسنونہ ہے جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ وہ محبت نبوت کی وجہ سے تھی، مگر اس کو تبلیغ احکام کا عوض نہ کہا جاوے گا، اور یہ سب امور بہت ظاہر ہیں، ۲۶ رمضان ۱۳۲۲ھ (امداد جلد ۳ ص ۶۱)

حکم گرفتن از کاشتکار درابواب زمینداری

سوال (۲۳۳) کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید بکر کا ملازم باختیار مختار عام ہے، اور بکر کی طرف سے اس کے گاؤں زمینداری کو روپیہ کی تحصیل کے واسطے جاتا ہے، دو چار دن یا ہفتہ عشرہ موضع مذکور میں رہ کر تحصیل کرتا ہے، اور جنس خوردنی کا انتظام تو بطور خود کرتا ہے، لیکن دودھ دہی کاشتکاروں کی گھر سے بقدر ضرورت باری باری سے منگاتا ہے، کوئی کاشتکار خوشی سے کوئی ناخوشی سے دیتا ہے، لیکن جبر و تعدی ناخوشی سے دینے والے پر بھی نہیں کیا جاتا دودھ دہی دیہات میں فروخت ہونے کا دستور نہیں ہے، زمیندار و کارندہ عموماً دودھ دہی کاشتکاروں سے بلا قیمت حسب ضرورت لیتے ہیں، کاشتکاروں سے کوئی معاوضہ گاؤں میں رہنے اور مویشی کے گھاس چرانے کا نہیں لیا جاتا، یہ بھی لحاظ فرمایا جاوے کہ کھانا روزمرہ کا زید کا بکر کے ذمہ ہے، سفر و حضر میں اسی کے ذمہ کھاتا ہے تو ایسی حالت میں یہ دودھ دہی اس کو حلال و مباح ہے یا نہیں۔

الجواب، قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ حقوق واجبہ کے سوا جو آمدنی بواسطہ حکومت کے ہو وہ اقسام رشوت میں کی ایک قسم ہے اور زمیندار و کاشتکار کا علاقہ شرعاً حاکم و محکوم کا نہیں، بلکہ موجر و متاجر کا ہے، پس جو کچھ کاشتکار سے لیا جاتا ہے، اس کو سکنائی یا زرعی صحرائی زمین کے معاوضہ کا یعنی اجرت کا ایک جزء ٹھیرا سکتے ہیں، البتہ اجرت کے شرائط میں سے اجرت کا معین و معلوم ہونا بھی ہے، پس صورت مسئولہ میں بقاعدہ المعروف کالمشروط یہ دودھ دہی بھی داخل اجرت زمین ہے، اس لئے اصل میں جائز ہے لیکن اس میں شرعاً اتنا فساد ہے کہ اس کی مقدار معین نہیں، پس اس کی اصلاح اس طرح واجب ہے کہ معاہدہ اجارہ یا اضافہ کے وقت ہر کاشتکار سے تصریحاً کہدیا جاوے کہ تم کو سال بھر یا ششماہی میں اس قدر دودھ دہی بھی دینا ہوگا، پھر اس کا حساب ذہن میں یا لکھ کر یاد رکھے کہ سال بھر میں فلاں فلاں کاشتکار سے اس قدر آیا تاکہ اس مقدار سے زائد دودھ دہی نہ آنے پاوے اگر کم آئے تو مضائقہ نہیں، اس طرح مقرر کر لینے میں اگر اس سے ناخوشی کے ساتھ بھی وصول ہوگا تو حلال ہے اور اگر اس طرح مقرر نہ کیا تو اجارہ فاسدہ کی وجہ سے اس کا لینا اور کھانا درست نہیں خواہ اپنے ذمہ کھاتا ہو، یا اپنے آقا کے ذمہ کھائے اور اگر تھوڑی توجہ کی جائے تو شرط جواز کا اہتمام کچھ دشوار نہیں، فقط ۱۶ ربیع الاول ۱۳۱۳ھ (امداد ج ۳ ص ۶۲)

الصراح فی اجرۃ النکاح

رسالہ در تحقیق حکم اجرت نکاح خوانی

بعد الحمد والصلوٰۃ والسلام للہ تعالیٰ وعلی رسولہ وآلہ واصحابہ الکرام، بہت روز سے میرے دل میں خیال تھا کہ اس نکاح خوانی کی اجرت متعارفہ کے متعلق کچھ تحقیق کیا جاوے لیکن اتفاق سے آج کل خاص طور پر اس کا ایک استفتاء آگیا چونکہ اس کا جواب قدرے مفصل لکھا گیا جس سے وہ ایک چھوٹے رسالہ کی برابر ہوگیا۔ اس لئے بمناسبت مضمون الحق الصراح فی اجرۃ النکاح اس کا نام رکھدینا مناسب معلوم ہوا، وجہ استفتاء کی یہ ہوئی تھی کہ احقر نے ایک جلہ ایک حافظ صاحب کو نیابت سے منع کردیا تھا، اس لئے منیب کے صاحبزادہ نے بغرض اپنے والد ماجد کو کہ ان کا قیام دوسری جگہ ہے۔ حکم شرعی سے اطلاع دینے کے اس کی تحقیق کی۔ فبارک اللہ تعالیٰ فیہم، العبد محمد اشرف علی عفی عنہ

سوال (۳۳۷) حضرت اقدس جناب مولوی صاحب مدظلہ العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ حافظ صاحب نے رجسٹر نکاح یہ فرما کر واپس کردیا ہے کہ مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ اول تو یہ آمدنی ناجائز ہے اور اگر طوعاً دکرہاً جائز ہوتی بھی ہے تو اس طرح ناجائز ہوجاتی ہے کہ تم اس میں سے کچھ جزو قاضی صاحب کو دیتے ہو جو مقدمہ رشوت ہے رشوت جبریہ تو جائز ہے بھی مگر یہ رشوت طبعی ہے بلا کسی دباؤ کے محض بغرض انتفاع اس لئے ناجائز ہے جناب والد صاحب یہاں تشریف نہیں رکھتے جو اس کام کو خود انجام دیتے یا کوئی اور انتظام فرماتے، لہذا میری غرض یہ ہے کہ ان کی خدمت میں بذریعہ عریضہ کل احکام متعلقہ جواز و عدم جواز عرض کردوں تاکہ انتظام میں سہولت ہو ورنہ خدا جانے کیا انتظام ہوا در ناحق بھی مبتلائے گناہ ہونا پڑے۔

پس گذارش ہے کہ جناب ضروری احکام متعلقہ سے مطلع فرما کر سرفراز فرما دیں گے اور نیز اس سے بھی مطلع فرما دیں گے کہ آیا بطور تنخواہ دار کے کسی شخص سے یہ کام لیا جاوے تو جائز بھی ہے یا نہیں اطلاعاً یہ بھی گذارش ہے کہ لوگ نکاح خواں کا حق صرف چار ہی آنہ خیال کرتے ہیں، باقی ایک روپیہ قاضی صاحب کے نام کا ہوتا ہے، جس کو عطیہ یا نذرانہ جو کچھ بھی ہو کہنا چاہئے اور اکثر ایسا ہوا بھی ہے کہ قاضی صاحب کے نام کا روپیہ انہوں نے نکاح خواں کو نہیں دیا خود لاکے آپ آکر دی گئے ہیں مگر یہ ہے کہ اگر حافظ صاحب نے یہ کام نہ کیا تو اور لوگوں سے یہ امید نہیں کہ وہ مسائل کی تحقیق کریں گے، پس بہت سے نکاح خلاف شرع ہوا کریں گے،

جواب، اس کا مجمل جواب تو یہ ہے کہ مولانا محمد اسحاق دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ نے مسائل اربعین میں ایک ایسے سوال کے جواب میں خزانۃ الروایات سے استدلال کر کے اس کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا ہے، چنانچہ وہ سوال وجواب مع روایات نقل ہوتا ہے،

مسئلہ، بعد نکاح بقاضی ووکیل وشاہدان کہ از طرف عروس می آیند بخوشی خود بدون مطالبہ شان چیزے دادن جائز است یا نہ؟

جواب، دادن ایں مردمان بدون مطالبہ وجبر از طرف ایشان مباح است واگر جبر کنند وخواہ مخواہ بکد واصرار طلب نمایند وبگیرند، پس مباح نیست چنانچہ در کتاب خزانۃ الروایات مرقوم است، ومما سن القضاۃ فی دار الاسلام ظلم صریح وھو ان یاخذ وامن الا نکحۃ شیئاً ثم یجیزون اولیاء الزوج والزوجۃ بالمناکحۃ فانھم لم یرضوا بشئ من اولیاءھما لو یجیزوا بذلک فانہ حرام للقاضی والحاکم انتھی الجواب المذکور قلت فکما ان الاجازۃ غیر متقومۃ لایحل لعوض عنہا کذلک الجاہ والعقود الفاسدۃ التی ھی المنشاء فی الاکثر لھذا الاخذ کما سیأتی غیر متقومۃ لایحل العوض عنہا،

اور مفصل جواب یہ ہے کہ جو چیز کسی کو دی جاتی ہے اس کی دو حالتیں ہیں، یا تو بعوض دیا جاتا ہے یا بلا عوض، اور جو بعوض دیا جاتا ہے دو حال سے خالی نہیں، یا تو ایسی شے کا عوض ہے جو شرعاً متقوم وقابل عوض ہے اور یا ایسی شے کا عوض ہے جو شرعاً متقوم وقابل عوض نہیں، خواہ حقیقۃً جیسا عقود باطلہ میں ہوتا ہے یا حکماً جیسا عقود فاسدہ میں ہوتا ہے، اور جو بلا عوض دیا جاتا ہو وہ بھی دو حال سے خالی نہیں یا تو محض طیب خاطر اور آزادی سے دیا جاتا ہے یا تنگی خاطر وکراہت تلب سے دیا جاتا ہے، خواہ وہ تنگی اور کراہت زیادہ ہو یا کم ہو، یہ کل چار قسمیں ہوئیں۔

قسمِ اول جو متقوم شے کے عوض میں حاصل ہو، قسمِ دوم جو غیر متقوم شے کے عوض میں حاصل ہو، قسمِ سوم جو بلا عوض بطیب خاطر حاصل ہو، قسمِ چہارم جو بلا عوض بکراہت حاصل ہو۔

قسم اول بوجہ اجرت یا ثمن ہونے کے اور قسم سوم بوجہ ہدیہ وعطیہ ہونے کے حلال ہے اور قسم دوم بوجہ رشوت یا ربو حقیقی یا حکمی ہونے کے، اور قسم چہارم بوجہ ظلم یا جبر فی التبرع ہونے کے حرام ہے، اب دیکھنا چاہئے کہ نکاح خوانی کی آمدنی کون قسم میں داخل ہے تاکہ اس کا ویسا ہی حکم ہو، اگر قسم اول میں داخل کہا جائے جیسا خود نکاح پڑھنے والے کی نسبت اس کا ظاہراً احتمال ہو سکتا ہے کیونکہ جو خود نکاح پڑھنے نہ جائے وہاں تو اس کا احتمال ہی نہیں، البتہ نکاح خواں کے اعتبار سے

ظاہراً اس کا شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ نکاح خواں کے اس عمل کی اجرت ہے، مگر غور کرنے کے بعد یہ احتمال صحیح نہیں رہتا، کیونکہ صحت اجارہ کے لئے شرعاً چند امور لازم ہیں، وہ یہ کہ کام لینے والے کو پورا اختیار ہو جس سے چاہے کام لے، اور کام کرنے والے کو پورا اختیار ہو کہ کام کرے یا نہ کرے، اور اسی طرح مقدار اجرت ٹھیرانے میں کام لینے والے کو پورا اختیار ہو کہ جس قدر چاہے کم کہہ سکے، اور زیادہ پر راضی نہ ہو اور کام کرنے والے کو بھی پورا اختیار ہو کہ جتنا چاہے زیادہ مانگے، ان امور میں اپنی آزادی واختیار سے منتفع ہونے میں ایک پر دوسرے کی طرف سے کوئی طعن یا ملامت مانع نہ ہو، اور یہ سب امور مسئلہ مبحوث عنہا میں مفقود ہیں، کیونکہ گو کام لینے والے کو اس میں تو آزادی حاصل ہے، کہ کسی سے مفت نکاح پڑھوالے لیکن اگر وہ اجرت پر کسی شخص سے نکاح پڑھوالے، مثلاً مجمع حاضرین میں سے کیفما اتفق کسی کو کہہ دے کہ تم پڑھ دو اور وہ اجرت تم کو دیں گے یا اسی مقرر نکاح خواں سے کہے کہ تم دوسری جگہ اتنا لیتے ہو ہم تو اس سے نصف دیں گے، اور نہیں پڑھتے تو ہم کسی دوسرے کو بلالیں گے، یا اسی طرح اگر کام دینے والا نہ تو خود جاوے اور نہ اپنی طرف سے کسی کے بھیجنے کا اہتمام کرے، بلکہ صاف جواب دیدے کہ کچھ ہمارے ذمہ نہیں یا یوں کہے کہ گو اور جگہ سے ایک روپیہ لیتا ہوں مگر تم سے دس لوں گا چاہے لے چلو چاہے نہ چلو تو ضرور ان چاروں صورتوں میں ایک دوسرے کی طرف سے بھی اور عام سننے دیکھنے والوں کی طرف سے سخت ملامت ہوگی کہ لو صاحب ہمیشہ سے تو اس طرح چلا آرہا ہے، انھوں نے یہ نئی بات نکالی، اور سب قائل معقول کرکے اسی رسم قدیم پر اس کو مجبور کریں گے، پس جب صحت اجارہ کے شرائط مفقود ہیں تو اجارہ مشروع نہ رہا، پھر اجرت کہنے کی گنجائش کہاں ہے پھر غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نکاح خواں بلانے والے کا اجیر نہیں سمجھا جاتا بلکہ خود اصل قاضی کے خیال میں بھی اور دوسرے عوام کے خیال میں بھی اصل قاضی کا نوکر سمجھا جاتا ہے چنانچہ وہ قاضی اس کو جب چاہے معزول کردیتا ہے، اور اس صورت میں اس کا غیر مشروع ہونا اور زیادہ ظاہر ہے، کیونکہ نوکر کسی کا اور اجرت کسی کے ذمہ یہ خود باطل ہے اور شرع میں اس کی کوئی نظیر نہیں، اور اگر قسم سوم میں داخل کیا جاوے جیسا خود نکاح نہ پڑھنے والے کی نسبت اس کا ظاہراً احتمال ہوسکتا ہے کیونکہ جو شخص نکاح پڑھانے گیا ہے وہاں تو مفت ملنے کا احتمال ہی نہیں البتہ غیر نکاح خواں کے اعتبار سے ظاہراً علیٰ عکس القسم الاول اس کا شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ اس کو عطیہ وہدیہ کے طور پر دیا گیا ہے، جیسا سوال میں اس سے تعرض بھی ہے، مگر غور کرنے کے

بعد یہ احتمال بھی صحیح نہیں رہتا، کیونکہ مشروعیت ہدیہ کے لئے بھی چند امور لازم ہیں، وہ یہ کہ نہ تو دینے والا اس کو لینے والے کا اور نہ خود لینے والا اس کو اپنا حق سمجھے اور دینا بھی ضروری نہ سمجھا جاوے، اور اسی طرح مقدار ہدیہ میں دینے والے کو اختیار ہو کہ خواہ کم دے یا زیادہ دے غرضکہ نہ دینے میں بھی ملامت نہ ہو اور کم دینے پر بھی ملامت نہ ہو اور مسئلہ مبحوث عنہا میں یہ امور بھی مفقود ہیں، کیونکہ گو بعضے لوگوں کو اس میں آزادی حاصل ہے، کہ بالکل نہ دیں، چنانچہ جو لوگ اس سے پورے واقف ہیں کہ ان کا کوئی حق نہیں وہ بالکل نہیں دیتے، اور ان پر ملامت بھی نہیں کی جاتی، لیکن عوام میں سے جو لوگ دیتے ہیں وہ بیشک یہی سمجھ کر دیتے ہیں کہ ان کا حق ہے، خواہ بوجہ قدامت کے کہ ان کے بڑوں سے یہ بات چلی آرہی ہے، خواہ اس خیال سے کہ ان کو اس کام پر سرکار نے مقرر کر دیا ہے، خواہ بوجہ زمینداری کے کہ ہم ان کی رعایا ہیں، جیسا مختلف مقامات پر مختلف عادات و خیالات ہیں، غرض دینے والے بھی حق سمجھتے ہیں اور لینے والے بھی، بعضے تو ویسے بھی حق سمجھتے، چنانچہ بعض اُن میں قرضخواہوں کی طرح مانگ کر بھیجتے ہیں، اور بعضے تدبیرات و تقریرات سے اس کی کوشش کرتے ہیں کہ عوام میں یہ خیالات جاگزیں رہیں کہ یہ اُن کا حق ہے حتی کہ اگر دوسرا ان ہی کی طرح اس کام کو کرنا شروع کر دے تو اس سے آزردہ اور اس کے درپے ہوتے ہیں کہ یہ ہمارے حق میں خلل ڈالتا ہے، اسی طرح اگر کوئی بجائے روپیہ کے آنہ دو آنہ دینا چاہے تو خود لینے والا بھی اور دوسرے لوگ بھی اس کو طریقہ مقررہ کے خلاف سمجھ کر موجب ملامت قرار دیں گے جب مشروعیۃ ہدیہ کے شرائط مفقود ہوئے، پھر ہدیہ کہنے کی گنجائش کہاں رہی، جب اس آمدنی کا قسم اول و سوم میں داخل نہ ہونا ثابت ہوگیا، پس لامحالہ قسم دوم یا چہارم میں داخل ہوگی، جس کی وجہ قسمین منفیین کی تقریر نفی سے خود ظاہر ہو چکی ہے اور تنبہ مکرر کے لئے اس کا خلاصہ پھر عرض کئے دیتا ہوں، کہ بدون نکاح پڑھے جیسا کہ اکثر منیب کو ملتا ہے، یا تو ان کے جاہ و قدامت و زمینداری کے عوض میں ہے، اور یہ سب غیر متقوم ہیں، تب تو یہ دینا رشوت ہوگا، اور یا پابندی رسم کے سبب حق سمجھنے کی وجہ سے ہے، تو یہ جبر فی التبرع ہوگا اور نکاح پڑھوا کر دینا جیسا اکثر نائب کو اور کہیں منیب کو ملتا ہے، یہ اجارہ فاسدہ پر مبنی ہے اور خصوصاً جبکہ نائب نوکر قاضی کا سمجھا جاوے تو یہ آمدنی اجارہ غیر مشروع کی حکماً ربوا ہوگی، جب اس کا قسم دوم یا چہارم میں داخل ہونا ثابت ہوگیا تو ان دونوں قسموں کا جو حکم تھا یعنی عدم جواز وہ بھی ثابت ہوگیا اور یہ تقریر تو اس عمل کی نفس حقیقت کے اعتبار سے تھی، اور اگر اس کے ساتھ ایک امر خارجی کو بھی ملاحظہ فرمایا جاوے جو کہ

وقوع میں اس کا مقترن ہے، وہ یہ کہ اکثر جگہ عادت ہے کہ نکاح خوانی کے لئے بلانے والا تو دولہن والا ہوتا ہے اور نکاح خوانی دلواتے ہیں دولہا والے سے، اور وہ بوجہ پابندی رسم کے خوامخواہ دیتا ہے جو کہ شرعاً محض ناجائز ہے، کہ بلا وجوب شرعی کسی سے کوئی رقم اس کو ضروری ولازم قرار دے کر وصول کیجاوے تو اس عارض کی وجہ سے اس کا عدم جواز اور مؤکد ہو جاوے گا، غرض باعتبار نفس عمل کے بھی اور باعتبار اس عارض کے بھی یہ رقم ناجائز ٹھہری اور تمام کلام خود لینے والے کے اعتبار سے ہے اور دوسرے کو دینا جیسا نائب کے ذمہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک بڑا حصہ اس رقم کا اپنے منیب کو دے، سو یہ دینا محض اس بنا پر ہوتا ہے کہ اس نے مجھ کو اس کام کے لئے اجازت دی ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ اجازت دینا شریعت میں امر غیر متقوم کے عوض میں دینا رشوت ہے، اور رشوت بلاضرورت دفع ظلم دینا حرام ہے پس اس دینے والے کو ایک گناہ رشوت دینے کا اور زائد ہوا، غرض جو صورتیں اس کے متعارف ہیں اس میں کسی کو نہ لینا جائز ہے، اور نہ دینا جائز ہے، اور اس میں نائب و منیب اور شادی والے سب آگئے، جیسا بوجہ اکمل وابسط اس کی تفصیل گذر چکی،

اب ان متعارف صورتوں کے علاوہ دو صورتیں اور رہ گئیں، جن میں ظاہراً جواز کا احتمال معلوم ہوتا ہے، ایک یہ کہ بطور اجارہ کے قاضی کسی کو نوکر رکھ کر اس کی تنخواہ مقرر کر دیں، اور اس سے کام لیں، جس سے سوال میں بھی تعرض ہے، دوسرے یہ کہ بطور شرکت تقبل کے قاضی ہیں اور کسی دوسرے شخص کے باہم قرارداد ہو جاوے کہ دونوں نکاح پڑھا کریں، اور جو کچھ دونوں کی آمدنی ہو وہ فلاں نسبت سے باہم تقسیم کر لیا کریں، سو تامل کرنے کے بعد ان میں بھی جواز نہیں معلوم ہوتا، مثلاً اول صورت میں اگر اس کو اجیر خاص کہا جاوے تو اس میں دوسری نوکری نہیں کر سکتا، حالانکہ اس میں نائب کو اس کی ممانعت نہیں ہوتی، اور اگر اجیر مشترک کہا جاوے تو اجیر مشترک ہر شخص کا جو کام چاہے کر سکتا ہے، حالانکہ یقینی بات ہے کہ اگر قاضی کو معلوم ہو جاوے کہ یہ نائب کچھ نکاح میری طرف سے پڑھتا ہے، اور کچھ دوسرے کی طرف سے جو انتفاقاً مثل قاضی کے وہ بھی یہی کام کرتا ہے، تو یقیناً اس نائب کو معزول کر دے گا، پھر دونوں شقوں میں محذور مشترک یہ ہے کہ خود قاضی ہیں اور اہل تقریب میں باہم کوئی عقد اجارہ نہیں ٹھہرتا پھر اس قاضی کو اجرت لینا کس طرح جائز ہوگا، اور اگر کہا جاوے یہی نائب وکالۃً اہل تقریب سے عقد اجارہ ٹھہرالے جو مشمول قبول قاضی کے ہوگا، اس کا جواب ایک تو اُن پر دونوں شقوں کے جدا جدا محذور سے معلوم ہو گیا، کیونکہ جواز اور عدم جواز کے مقتضیات جمع ہونے سے عدم جواز کا مقتضی مؤثر ہوگا، دوسرا جواب آگے شرکت تقبل کے محذور رسوم میں آتا ہے، یہ تحقیق تو اول صورت کی ہوئی، اور دوسری صورت یعنی شرکت تقبل

اولاً تو ایسا واقع نہیں کیونکہ قاضی کو جو ملتا ہے اس میں سے نائب کو کچھ نہیں دیا جاتا، دوسرے ہدایہ کتاب القسمۃ میں مصرح ہے کہ جو لوگ تقسیم کا کام اجرت پر کرتے ہیں، حاکم اسلام کو چاہئے کہ اُن کو باہم شریک نہ ہونے دے، کہ عمل تقسیم کی اجرت گراں نہ ہو جاوے، یہی حال ہے نکاح خوانی کا کہ ضرورت اس کی دنیا اور دین دونوں اعتبار سے ہر شخص کو پڑتی ہے، اور اکثر نکاح خواں لوگ باوجاہت ہوتے ہیں، اگر سب جدا جدا رہیں گے، ہر شخص ارزاں ملے گا، اور اگر سب شریک ہو گئے تو گراں ہو جاویں گے تیسری خرابی وہی ہے جو قسم سوم کی نفی میں مذکور ہوئی ہے، کہ عرفاً یہ قاضی کا حق مختص سمجھا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اختصاص کا کوئی استحقاق نہیں، اور جو شخص قاضی یا نائب قاضی کو بلاتا ہے اسی استحقاق و اختصاص کی بناء پر بلاتا ہے، پس قاضی کا اجیر بنانا جب اس بناء فاسد پر مبنی ہے تو خواہ وہ بالانفراد اجیر ہو جیسا ابھی صورت اولیٰ میں مذکور ہوا جس میں حوالہ اسی محذور سوم کا دیا گیا ہے، اور خواہ بالاشتراک اجیر ہو جیسا اس صورت دوم میں فرض کیا گیا ہے، ہر حالت میں بناء الفاسد علی الفاسد کے سبب ناجائز ہوگا، پس سابقہ متعارف صورتیں اور اخیر کی غیر متعارف صورتیں سب ناجائز قرار پائیں البتہ اگر مثل دیگر معمولی اجارات تعلیم اطفال و فرائض نویسی اور دوسری صنعتوں اور حرفتوں کے اس کی بھی حالت رکھی جاوے کہ جس کا دل چاہے جس کو چاہے بلاوے، اور کسی کی خصوصیت نہ سمجھی جائے، اور جس اجرت پر چاہیں جانبین رضامند ہو جاویں، نہ کوئی اپنے کو اصل مستحق قرار دے نہ دوسروں کے ذہن میں اس کو پیدا کیا جائے، اور اگر اتفاق سے کوئی دوسرا یہ کام کرنے لگے نہ اس سے رنج و آزردگی ہو، اگر نائب نیابت کو دست بردار ہو کر خود مستقل طور پر یہ کام شروع کر دے نہ اس کی شکایت ہو، اور شہر میں جتنے چاہیں اس کام کو کریں ان سب کو آزاد سمجھا جاوے، ہاں جو اس کا اہل نہ ہو اسکو خود ہی جائز نہ ہوگا، وہ ایک عارض کی وجہ سے روکا جاوے گا، جیسا کوئی امام اگر قرآن صحیح نہ پڑھتا ہو امامت سے روکا جاوے، لیکن جو بہت سے آدمی اس کے اہل ہوں تو ان میں مختلف و متعدد آدمی اس کام کو کرنے کے مختار سمجھے جاتے ہیں، اسی طرح اس نکاح کے ساتھ معاملہ کیا جاوے، اور نیز بلانے والا اپنے پاس سے اجرت دے، دو محلہ والوں کی تخصیص نہ ہو اس طرح البتہ جائز اور درست ہے، غرض دوسرے اجرت کے کاموں میں اور اس میں کوئی فرق نہ کیا جاوے، یہ تحقیق ہوا اس اجرت نکاح خوانی کے متعلق اور جو مضمون اخیر میں مکرر کے عنوان سے لکھا ہے، اس کا جواب بہت واضح ہے، کہ دوسرے شخص کے دین سنوارنے کے لئے اپنا دین بگاڑنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا جبکہ اس کا دوسرا طریقہ بھی ممکن ہو جیسا کہ احقر نے ابھی عرض کیا تھا کہ اس پیشہ کو عام رکھا جاوے مگر نااہل کو نہ بلایا جاوے اس کو تو کام

لینے والے خود یا کسی ذی علم سے دریافت کر کے انتظام کر سکتے ہیں، دوسرے یہ کہ اس انتظام متعارف میں بھی مشاہدہ کیا جاتا ہے، کہ بہت جگہ نااہل اس کام کو کر رہے ہیں، پھر اس انتظام کی پابندی سے شرعاً کون نفع خاص ہوا اور پابندی نہ کرنے سے کون ضرر خاص ہوا، پھر یہ کہ قاعدہ شرعی ہے کہ جب کسی امر میں مفسدہ و مصلحت جمع ہو جاویں مفسدہ مؤثر ہوتا ہے، مصلحت مؤثر نہیں ہوتی، پس اگر اس مصلحت کو تسلیم بھی کیا جائے تو اس قاعدہ کی بنا پر اس عمل کی اجازت نہ دیجاوے گی واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم، ۲۱ محرم ۱۳۲۲ھ (امداد جلد سوم صفحہ ۶۳)

احکام اجارۂ ارض برائے بنا۔ **سوال** (۴۳۸) علمائے دین و مفتیان شرع متین ابقاہم اللہ الی یوم الدین اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے زمین افتادہ ایک دو سال کو کرایہ لیکر اجازت سے چھپر ڈال لیا، بعد چندروز چھپر اتار کر کے بغیر اجازت مالک زمین کے مکان خام بنا لیا، جب مالک زمین کو اطلاع ہوئی تو کہا کہ کیوں بغیر اجازت میری مکان بنا لیا: کرایہ والے نے کہا کہ اپنے آرام کو بنایا ہے، یہ مالک زمین اپنی زمین کا ہر سال کرایہ لیتا رہا، اب پندرہ برس کے بعد مالک زمین کہتا ہے کہ میری زمین مع ملبہ خالی کر دو تو اب وہ ملبہ مالک زمین کا ہے یا کرایہ والے کا۔ اور جس وقت زمین کرایہ کو لی گئی تھی اس وقت کوئی وعدہ مقرر نہیں کیا گیا تھا، کہ ہم دس برس یا پندرہ برس تک کرایہ کو لیتے ہیں، جب سال گذرا کرایہ دیدیا، اول جب زمین کرایہ کو لی تب سال بھر کا وعدہ کیا تھا اور سال گذرا کرایہ دیدیا، اسی واسطے اس قدر عرصہ گذر گیا۔

الجواب، فی الھدایۃ، ویجوز ان یستاجر الساحۃ لیبنی فیھا او لیغرس فیھا نخلا او شجرا ثم اذا انقضت مدۃ الاجارۃ لزمہ ان یقلع البناء والغرس ویسلمھا فارغۃ الا ان یختار صاحب الارض ان یغرم لہ قیمۃ ذلک مقلوعا ویتملکہ فلہ ذلک وھذا برضاء صاحب الغرس والشجر الا ان ینقص الارض بقلعھا حینئذ یتملکھا بغیر رضاہ اھ، وفیھا ومن استاجر دارا کل شھر بدرھم فالعقد صحیح فی شھر واحد فاسد فی بقیۃ الشھور الا ان یسمی جملۃ الشھور معلومۃ فان سکن ساعۃ من الشھر الثانی صح العقد فیہ ولیس للمؤجر ان یخرجہ الی ان ینقضی وکذلک کل شھر سکن فی اولہ اھ،

اس عبارت سے چند امور ثابت ہوئے (۱) بدون اجازت مالک زمین کے مکان بنانا جائز تھا (۲) بعد بنانے کے بھی اگر اجازت نہیں دی تو مالک زمین کو اختیار ہے جب چاہے مکان کو اکھڑوادے (۳) اور اگر بعد بنانے کے اجازت دیدی ہے تو اس میں یہ حکم ہے کہ جس روز یہ سال کرایہ کا ختم ہوتا ہے جب

وہ روز آوے اس روز تو زمین خالی کرالینے کا اختیار ہے، اور اگر درمیان سال کے خالی کرانا چاہے تو اس کرایہ دار کی رضامندی پر خالی ہو سکتا ہے، البتہ اگر درمیان سال کے مالک زمین یوں کہدے کہ دیکھئے یہ سال ختم ہو کر پھر میں کرایہ پر زمین دینے پر رضامند نہیں ہوں، کرایہ کو توڑے دیتا ہوں تو سال ختم ہونے کے بعد خواہ عین ختم کے دن خواہ اس کے کتنے دن بعد مالک زمین کو زمین خالی کرالینے کا اختیار ہوگا۔ ؎ مالک زمین کو بہ تفصیل بالا جس وقت زمین خالی کرانے کا اختیار شرعاً حاصل ہو کرایہ دار کو انکار جائز نہیں، ؎ جس وقت زمین خالی کرانے کا وقت آجائے اس وقت اگر مالک زمین و مالک مکان دونوں اس بات پر رضامند ہوں کہ ملبہ کی جو قیمت بحالت اُکھڑے ہوئے ہونے کے ہو وہ قیمت مالک زمین اس مالک مکان کو دیکر مکان کو کھڑا رہنے دے، اور زمین مع مکان لے لے، تو بھی جائز ہے، اور اگر دونوں اس پر اتفاق نہ کریں تو مکان والا اپنا ملبہ اکھاڑ کے لے جاوے اور زمین والا اپنی زمین لے لے، ملبہ زمین والے کا نہیں ہو، واللہ اعلم بالصواب فقط۔

۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۵ھ (امداد جلد سوم ص ۷۰)

استیجار بر محصل چندہ بر نصف حاصل

سوال (۳۳۹) اگر کسی محصل چندہ کو اہل مدرسہ تحصیل چندہ کے لئے اس شرط پر مقرر کریں کہ جو آمدنی ہووے اس کا چہارم یا سوم یا پنجم یا نصف یا دو تہائی حصہ دیں گے تو ایسا اس زمانہ کی موجودہ حالت اور ضرورتوں کے لحاظ سے شرعاً مباح ہے یا نہیں؟

الجواب حنفیہ کے اصول پر یہ اجارہ فاسدہ ہے اور دوسرے مذاہب کی تحقیق نہیں فقط

۱۲ ذیقعدہ ۱۳۲۵ھ (امداد جلد سوم ص ۱، وحوادث اولیٰ ص ۹۲)

استیجار بر اخذ سمک

سوال (۳۴۰) اگر کسی شخص کو کچھ اجرت دے کر مچھلی پکڑوائی تو کھانا درست ہے یا نہیں؟

الجواب یہ ملک ہوئی پکڑنے والے کی اس سے بزور لینا جائز نہ ہوگا، بخوشی دیدے تو درست ہے، اور یہ اجارہ باطل ہے۔ ۵ ذی الحجہ ۱۳۲۵ھ (امداد جلد سوم ص ۱۷)

ایضاً

سوال (۳۴۱) اگر کوئی شخص دو آدمی خواہ تین آدمی مقرر کر دیوے کہ تم لوگ مچھلی تالاب سے پکڑا کرو، ہم تم لوگوں کو اس قدر مزدوری دیویں گے درست ہے کہ نہیں، اور ان مچھلیوں کا کھانا درست ہے کہ نہیں؟

الجواب اجارہ باطل ہے مچھلی آخذ کی ملک ہے اگر بخوشی دیدے کھانا جائز ہے، والدلیل علیہ ما فی الدر المختار استاجرہ لیصید لہ او یحتطب لہ فان وقت لذلک وقتاً جاز والا لا

فی رد المحتار قولہ جاز لانہ اجیر وحد وشرطہ بیان الوقت قولہ والا ای والحطب للعامل ط ج ۵ ص ۵۹ ، وفیہ فلو لم یوقت وعین الحطب فسد والحطب للمستاجر وعلیہ اجر مثلہ

۵ ذی الحجہ ۱۳۲۵ھ (امداد، ج ۳، ص ۷۱)

نوکر داشتن ماہی گیر

سوال (۳۴۲) مثل معمار وغیرہ کے اگر ملاح اپنا جال لے کر اجرت معلوم پر پانی میں جال ڈالے اور مچھلی ملے یا نہ ملے اتنی دیر تک جال ڈالکر مزدوری لے لے تو جائز ہے یا نہیں

الجواب، جائز ہے، ۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ ص ۲۶)

نوکری کردن کا سبان حرام یا چیزے فروختن بدست ایشان

سوال (۳۴۳) کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ کسی شخص نے ایک کسبی یا سود خور یا مے فروش کی نوکری کی، اور تینوں کی آمدنی محض حرام ہے تو اب اس کو اس مال حرام سے جو تنخواہ ملی حلال ہے یا نہیں یا کسی شخص نے اپنے گیہوں یا کوئی اور چیز کسی مے فروش کے ہاتھ فروخت کی، اور اس نے اس آمدنی ناجائز سے قیمت دی تو اب اس کو وہ حلال ہے یا نہیں، اس مسئلہ کی اچھی طرح تشریح فرمایئے۔

الجواب جن کی آمدنی بالکل حرام خالص ہے جیسے کسبی یا مے فروش یا سود خوار وغیرہم ان کی نوکری کرنا ناجائز ہے، اور جو تنخواہ اس میں سے ملتی ہو وہ حلال نہیں، اور اسی طرح اپنی چیز اس کے ہاتھ فروخت کر کے اسی مال حرام میں سے قیمت لینی بھی حلال نہیں، قال اللہ تعالیٰ ولا تتبدلوا الخبیث بالطیب تو اپنی پاکیزہ مزدوری یا پاکیزہ چیز کو اس ناپاک مال سے بدلنا ناجائز ٹھیرا، وقال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لا یحل ثمن الکلب ولا حلوان الکاھن ولا مھر البغی ص ۱۳۶ وقال ان اللہ حرم الخمر وثمنہا ص ۱۳۷ وعن ابن عباس رض قال رأیت رسول اللہ علیہ وسلم جالسا عند الرکن قال فرفع بصرہ الی السماء فضحک فقال لعن اللہ الیھود ثلاثا ان اللہ تعالیٰ حرم الشحوم فباعوھا واکلوا اثمانھا وان اللہ تعالیٰ اذا حرم علی قوم اکل شیٔ حرم علیہ ثمنہ ص ۱۳۷ ، لعن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اکل الربوا وموکلہ ص ۱۳۷ سنن ابی داؤد جلد ثانی وغیر ذلک من الآیات والاحادیث ہاں جن لوگوں کی آمدنی مشتبہ او مختلط الحلال والحرام غالب الحلال ہو، مثلاً یہی لوگ کسبی وے فروش وسود خوار وغیرہم کوئی دوسرا پیشہ مباح مثل تجارت حلال یا اور کچھ بھی کرتے ہوں اس وقت ان کی نوکری اور اپنی چیز ان کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے، بشرطیکہ تنخواہ یا قیمت حلال مال میں سے دیں یا غیر مشتبہ غالب الحلال سے دیں، ھانا صلعم عن کسب الامۃ الا

ماعملت بیدہا وقال ہکذا باصابعہ نحو الخبز والغزل والنقش، ابو داؤد ج ۲ ص ۱۳

وجہ یہ کہ مشتبہ سے تحرز متعذر اور دشوار ہے پس بضرورت جائز ہے لان الضرورات تبیح المحظورات ولا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا اگرچہ خلاف تقویٰ ہے کہ دع ما یریبک الی ما لا یریبک وھو الموفق، ۱۳ محرم ۱۳۳۱ھ (امداد ج ۳ ص ۲)

اخذ اجرت از مال حرام ومس کردن زن دندان سازرا۔

سوال (۳۴۴) ایک شخص کا دندان سازی پیشہ ہے اس سے اجنبی عورت دندان بنوانا چاہتی ہے، اور اس عورت کا فحش وحرام پیشہ ہے، غالباً اجرت بھی اسی حرام کمائی سے دے گی، اس حالت میں دندان بنانے کی ضرورت سے غیر عورت کے بدن کو مس کرنا اور حرام کمائی سے اجرت لینا اس شخص کو درست ہے یا نہیں؟

الجواب، اس میں دو سوال ہیں مس کرنا اور ایسی اجرت لینا، سو مس اجنبیہ کو بضرورت جائز رکھا گیا ہے، جیسے مداواتِ مرض میں، پس اگر دانت بضرورت بنوائے جاتے ہیں تو یہ ایک قسم کی مداواۃ ہے، دندان ساز کو مس جائز ہے، اور اگر بلا ضرورت بنوائے جاتے ہیں تو مس جائز نہیں جیسا اختتان ضرورت میں جائز رکھا گیا، اور بعض منفعت بلا ضرورت کے لئے حرام کیا کذا فی الشامیہ الجزء الخامس ص ۲۶۵ اور اجرت لینا مال حرام سے حرام ہے، البتہ اگر وہ قرض لے کر دیوے اور اس کو یقین ہو جائے تو درست ہے، واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم۔

۲ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ (امداد ج ۲ ص ۱۶۰)

حلت یا حرمت تنخواہ مرتشی

سوال (۳۴۵) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید بکر کا ملازم ہے اور رشوت لیتا ہے، ایسی حالت میں وہ تنخواہ معینہ اپنی بکر سے حاصل کرتا ہے وہ حلال ہے یا حرام؟

الجواب، قال اللہ تعالیٰ ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الآیۃ یعنی لوگوں کے مال باطل طریق سے مت کھاؤ، پس رشوت چونکہ اکل بالباطل ہے اس لئے حرام ہے اور جو تنخواہ معینہ بمقابلہ نوکری ملتی ہے اگر وہ نوکری خلاف شرع نہیں تو چونکہ وہ اکل بالباطل نہیں اس لئے حلال ہے اور اگر خلاف شرع ہے تو وہ نوکری بھی حرام ہے اس کی تنخواہ بھی حرام ہے، ۱۵ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ (امداد ج ۳ ص ۵)

نوکری آبکاری

سوال (۳۴۶) سررشتہ مسکرات مثل آبکاری وافیون وغیرہ میں اہل اسلام کو نوکری کرنا کیسا ہے، اور ایسے ملازم قابل امامت ہیں یا نہیں؟

الجواب، نوکری کرنا ایسے کارخانوں میں جائز نہیں، کہ اعانت علی المعصیت ہے،

قال اللہ تعالیٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان وعن انس قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الخمر عشرۃ عاصرھا ومعتصرھا وشاربھا وحاملھا والمحمولۃ الیہ وساقیھا وبایعھا واٰکل ثمنھا والمشتری لھا والمشتری لہ رواہ الترمذی وابن ماجہ خیر المواعظ۔ اور افیون کا استعمال جس صورت میں ناجائز ہے اس کے اعتبار سے تو اس کا حکم مثل خمر کے ہے، فالمعین فی ذالک کالمعین فی ھذا القولہ علیہ السلام الا ان کل مسکر حرام وکل مفتر حرام وکل مخدر حرام رواہ ابو نعیم خیر المواعظ، اور جس صورت میں استعمال جائز ہے اس کے اعتبار سے اس کی بیع سے روکنا دوسروں کو ظلم ہے اور ظلم کی اعانت بھی حرام ہے، غرض ہر حال میں یہ شخص بھی معین ہے فعل ناجائز کا، اور یہ لوگ بھی فاسق ہیں لہٰذا ان کی امامت بھی مکروہ ہے، لما مر ؎

اے قدم برداشتہ از راہ دیں | از چہ شد ماکول و ملبوست چنیں
چند نال شبہ ناک آری بکف | چند جاکٹ پوش باشی خوش علف
عاقبت سازد ترا از دیں بری | ایں تن آرائی و ایں تن پروری

کتبہ محمد اشرف علی عفی عنہ (امداد ج ۳ ص ۷۳)

حقوق زمینداری عطا سرکار برکاشتکار

سوال (۳۴۷) برہما کے علاقہ کے دیہات میں ہر پچاس یا زائد گھروں کے اوپر ایک شخص سرکار گورنمنٹ کی طرف سے مقرر ہے جس کو رُوا سوگری کہتے ہیں، رُوا محلہ، سو شخص گری بڑا یعنی محلہ کا بڑا آدمی، ایسے لوگوں کو اس قدر اقتدار حکومت دی گئی ہے کہ مختصر چند دفعات فوجداری کے مقدمات کا فیصلہ کریں فقط پانچ روپے تک جرمانہ کریں، اور ایک شبانہ روز تک قید کریں، اور بعض سیاست بھی کریں فریادی سے، فقط ایک روپیہ فیس کا رُوا سوگری اپنے نفس کے لئے وصول کرے، خواہ آئندہ وہ مقدمہ میں کامیاب ہو یا ہار جائے، مگر درصورت کامیابی یعنی جب فریادی جیتتا ہے تو وہ علاوہ جرمانہ یا تعزیرات کے ایک روپیہ فیس کا مدعا علیہ سے وصول کرکے فریادی کو دلاتے ہیں، بجز ایک روپیہ فیس کے اور کوئی تنخواہ گورنمنٹ کی طرف سے نہیں ہے، اس ایک روپیہ کا نام کوا ٹمبو دیہ ہے یعنی پان خرچ کا روپیہ یعنی پان کھاکر یہ کام کوئی انجام کرے، اور یہ ایک روپیہ جبکہ مقدمہ دائر ہوگا، روا سوگریوں کو ملتا رہے گا، خواہ بعد میں صلح ہی ہو جاوے، اس کے متعلق سرکار سے چند رجسٹر بھی (دفتر) دیئے جاتے ہیں، جرمانہ سرکار کو ملتا ہے، ایک روپیہ فی مقدمہ روا سوگری کو ملتا ہے، گویا یہ روپیہ اس کی تنخواہ ہے، چنانچہ کچہری میں کورٹ فیس اسٹامپ لگا کر درخواست

کرنا ہوتا ہے، وہ سرکار میں جمع ہوتا ہے، تنخواہ حکام کی علیحدہ دیتے ہیں اور یہاں فقط دفتر میں مرقوم ہوتا ہے روا سوگری سب لے لیتے ہیں،

سوال یہ ہے (۱) یہ کہ ایک روپیہ فیس کا فریادی سے وصول کرنا بطور تنخواہ رواشوگری کے لئے حلال ہوگا یا نہیں (نمبر ۲) اور یہ جرمانہ اور قید کرنا درست ہے یا نہیں، ان کے لئے عنداللہ ماخوذ ہوگا یا نہیں (نمبر ۳) اگر کوئی فیس نہ لے اور حکومت جاری رکھے، مواخذہ سے بچ سکتا ہے یا نہیں (نمبر ۴) اگر فیس لے لے اور آپس میں صلح کرادے جواز کی گنجائش ہے یا نہیں (نمبر ۵) یہ عہدہ کیسا ہے (نمبر ۶) اسی طرح اگر طرفین کے جھگڑے چکانے کے واسطے مثلاً ایک روپیہ محنتانہ ظاہر و باہر دے کر کسی کو ثالث مقرر کریں حکم بنادیں (بلا اجازت سرکاری) اور وہ حسب شرع حکم کرے وہ ایک روپیہ محنتانہ مثلاً لے سکتا ہے یا نہیں، اب بیت المال نہیں ہے، مفت کام کرنے والے کم ہیں اس کے ترک میں مفاسد کی زیادتی بیشک ہوگی۔

(السائل منشی احمد ضلع اکیاب پوسٹ راسید نگ موضع چاڑگانہ)

الجواب، یہ نوکری اور فیس جس حد تک کہ سوال میں لکھی ہے ایک تاویل سے جائز ہے بشرطیکہ اس کو کسی اور مفسدے کا ذریعہ نہ بنالیا جائے باقی تقویٰ یہ ہے کہ اس سے بچے، واللہ اعلم بالصواب،

۱۰ رجب المرجب ۱۳۳۲ھ (حوادث اول ۲ ص ۷)

بعض حقوق زمینداری مقررہ زمینداری	**سوال** (۳۴۸) دستور دہی بھوسہ، لکڑی، کنڈے، بہٹان، مکی کی گدی گندم کی کیاری، ساگ کیاری، گاجر، تمباکو، خربوزہ دخیرہ وغیرہ

بھیٹ بیگار علاوہ لگان اراضی کے اس نواح میں رعایا سے لیتے ہیں،

الجواب، اگر یہ سب پٹہ سے لکھا جاوے یا زبانی معاہدہ ہوجاوے تو جائز ہے، بیگار میں بھی مقدار مقرر ہونا شرط ہے (حوادث اول ۲ ص ۹)

سوال (۳۴۹) جب کسی رعایا کی بیٹی یا بیٹے کی شادی ہوتی ہے تو مبلغ ہر نقد اور کچھ آٹا یا کھانا جو اس کے یہاں ہوتا ہے لیتے ہیں؟

الجواب، یہ چونکہ گاہے ہوتا ہے اور گاہے نہیں ہوتا ہے، اس لئے درست نہیں، البتہ اگر یہ معاہدہ ہوجاوے کہ ہر سال ہر اور اتنا آٹا بھی لیں گے، اور پھر یوں کریں کہ اگر شادی ہولے ورنہ معاف کردے، یہ درست ہے، (حوادث ۱، ۲ ص ۹)

سوال، (۳۵۰) اور جب کوئی رانڈ عورت اپنا دوسرا نکاح جس کو ان کی اصطلاح میں

کراؤ کہتے ہیں کرتی ہے تو مبلغ عہ نقد زمیندار لیتے ہیں اسی کو دستور دہی کہتے ہیں،

الجواب، اس میں بھی مثل بالا تفصیل ہے (حوادث اول ص ۹)

سوال (۳۵۱) اس نواح میں اور نیز جس موضع میں نیاز مند رہتا ہے ایک اراضی ہے جس میں پولہ خس جس سے چھپر وغیرہ بندھتے ہیں پیدا ہوتا ہے، اس کی حفاظت منجانب زمیندار ہوتی ہے، جب تیار ہوتا ہے تو فروخت کردیا جاتا ہے،

الجواب، جائز ہے، (حوادث اول ص ۹)

سوال (۳۵۲) یا قبل تیاری مویشی چرانے کی اجازت دی جاتی ہے تو فی مویشی عہ یا ۸ر لیتے ہیں، اس میں تخم ریزی یا آب پاشی وغیرہ کا اہتمام نہیں ہوتا ہے خود رو ہے۔

الجواب، جائز نہیں، (حوادث اول ص ۹)

سوال (۳۵۳) اس مسئلہ میں علمائے دین کیا فرماتے ہیں کہ زید مثلاً عمرو سے ایک اراضی خریدنا چاہتا ہے اور عمرو بائع اراضی کو ان شروط پر بیع کرنا چاہتا ہے کہ فی بیگہ قیمت مبلغ ایک سو روپے لوں گا اور ہر سال کے بعد ہمیشہ کے واسطے بمقابل فی بیگہ آراضی کے مبلغ عہ حق مالکانہ لیتا رہونگا، تا حال حیات زید مشتری کے میرا قبہ اراضی سے کوئی تعلق نہ ہوگا لیکن زید مشتری کو اراضی کے بیع کرنے کا اختیار نہ ہوگا، البتہ عقد رہن کا اختیار ہوگا، بعد مرنے زید مشتری کے اگر اولاد ذکور ہوگی تو وہ اراضی پر قابض مثل زید کے سمجھی جاوے گی، اور اگر اولاد اناث ہوگی تو وقت عقد نکاح تک اراضی ان کے پاس بدستور رہے گی، بعد نکاح ہو جانے کے میں قابض ہوں گا، اگر اولاد نہ ہوگی تو زید مشتری کی زوجہ تاحیات قابض رہے گی، اگر نہ اولاد ہو نہ زوجہ تو بھی میں اراضی کا مالک سمجھا جاؤں گا، عمرو بائع اس عقد کو بیع موروثی نام رکھتا ہے، اور کہتا ہے کہ ہماری گورنمنٹ کا یہ قانون ہے، میں اس کے خلاف نہ کروں گا۔ فی الحال بیع کے وقت اگرچہ عمرو بائع یہ شروط مفصل ذکر نہیں کرتا صرف اس عبارت کے ساتھ بیع کرتا ہے کہ میں فلاں اراضی اتنی قیمت سے بیع موروثی کرتا ہوں، اور علاوہ قیمت اراضی کے اتنا مال تمام حق مالکانہ لیتا رہوں گا جس کی تفصیل بالا مذکور ہے، مگر سرکاری قانون میں شروط مذکورہ لفظ بیع موروثی میں ملحوظ ہوتے ہیں، اس واسطے بیع کے وقت ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہوتی، شروط مذکورہ کے ساتھ بیع شرعاً جائز ہے یا نہیں، اور اگر شروط مذکورہ صلب عقد میں نہ ہوں، قبل عقد یا بعد عقد ہوں تو جائز ہوگا یا نہیں، اگر جائز ہوگا تو باوجود تسلیم کرلینے زید مشتری کے شروط مذکورہ کو عمرو بائع شروط مذکورہ کا

مستحق ہوگا، شرعاً یا نہیں، اور زید مشتری پر ایفا، واجب ہوگا یا نہیں؟ جواب مفصل سے مسرور فرمایئے، چونکہ زید مشتری کے علاقہ میں بغیر ان شروط کے جوکہ اوپر مذکور ہیں، اراضی کی بیع نہیں ہوتی، اور زید کو اراضی کی ضرورت ہے تو اس صورت میں بوجہ ضرورت بیع جائز ہوگی یا نہیں؟

الجواب، ۱ جائز نہیں، ۲ المعروف کالمشروط کے قاعدہ سے قبل اور بعد بھی مثل صلب عقد کے ہوگا اور ناجائز ہوگا، ۳ ہوس کی ضرورت شرعاً معتبر نہیں کیا بدون زمین کے مالک ہوئے کوئی ضروری حاجت بند ہے، ۶ شعبان ۳۳ھ (حوادث ۱، ۲ ص ۹)

معاف کردن پیداوار زمین تا مدت معلومہ بعوض مبلغ

سوال (۳۵۴) ایک شخص کی زمین بیس بیگہ ہے، اس کو اکتالیس روپے اس اقرار پر دیئے کہ عرصہ دس برس تک اس کی پیداوار ہم لیتے رہیں اور جو محصول سرکاری پٹہ کا ہے اصل مالک ادا کرے گا، مگر روپے اکتالیس بعد دس برس کے مالک زمین سے کھانے والا پیداوار زمین کا واپس نہ لیگا، اور بعد دس برس کے مالک زمین اپنی زمین پر قابض ہوجائیگا، اس طرح کا کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب، معلوم نہیں کہ اس زمین میں کوئی چیز پیداواری کی موجود ہے، یا یہ کہ بطور کرایہ کی زمین لی ہے کہ اس میں جس طرح چاہے جوتے بوئے اور پیداوار لے، پس اگر دوسری صورت ہے تو یہ عقد اجارہ ہے، دس برس کی میعاد تک وہ زمین بمقابلہ اکتالیس روپے کے اجارہ لی ہے، یہ جائز ہے، کچھ حرج نہیں اختیار ہے جو چاہے بوئے اور حاصل کرے، مگر اس میں شرط یہ ہے کہ یہ اجارہ بدون دباؤ قرض کے ہو اور اگر مقصد اکتالیس روپے کا قرض لینا تھا، اور قرض دینے والا قرض پر نفع حاصل کرنے کی غرض سے یہ حیلہ کرے کہ یہ زمین جس میں منفعت زیادہ ہے، بمقابلہ اس اکتالیس روپے کے دیدو تو بوجہ اس کے کہ یہ رعایت قرض کے دباؤ میں ہوئی ہے حرام اور سود ہے، اور اگر اس زمین میں کوئی چیز آمدنی کی مثل باغ وغیرہ موجود ہے، تو یہ عقد جائز نہیں کیونکہ اجارہ تو ہو نہیں سکتا، کہ اجارہ میں تملیک منافع کی ہوتی ہے اور یہ تملیک عین ہے، نہ رہن مجری ہوسکے، کیونکہ رہن مجری میں بعد حصول پیداوار اس کی قیمت لگاتے ہیں اور یہاں پہلے طے ہوچکی، دوسرے اس میں کوئی مدت نہیں ہوتی، بلکہ جب تک مجرا نہ ہولے وصول کئے جائے پھر چھوڑ دے، یہاں مدت ٹھہری ہے نہ بیع پیداوار کی ہوسکی، کیونکہ وہ معدوم ومجہول ہے اور بیع موجود و معلوم ہونی چاہئے، پھر زمین پر قبضہ بے معنی ہے پس جب عقود صحیحہ میں سے کچھ نہیں ہوسکتا تو معاملہ باطل ٹھہرا: حاصل یہ کہ اگر اس زمین میں کوئی چیز پیداواری کی موجود نہیں، اور روپیہ والا دس برس تک بطور اجارہ کے رکھ کر

اس سے منفعت حاصل کرے جائز ہے، مگر اس میں وہی شرط ہے جو اوپر مذکور ہوئی، اور اگر کوئی چیز موجود ہے تو یہ معاملہ باطل ہے، اور اگر کچھ زمین بطور اجارہ ہے، اور کسی قدر میں کوئی چیز موجود ہے، پس اگر ہر ایک کا جدا معاملہ کریں تو معاملہ اجارہ کا جائز ہوگا اور دوسرا معاملہ باطل اور دونوں کا ایک معاملہ کریں تو بسبب شیوع فساد کے سب باطل ہوگا، واللہ اعلم فقط،

۲ صفر ۱۳۰۱ھ (امداد ج ۳، ص ۷۴)

ترک کردن نوکری خلافِ شرع

سوال (۳۵۵) کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ جس شخص کا دل نوکری کو بسبب قواعد کے کہ اس میں نماز فرضی قضا ہوتی ہے اور انگریزی زبان سیکھنی اور بولنی پڑے، اور اصل مقصود اس قواعد وغیرہ سے یہ ہے کہ جب کہیں لڑائی درپیش ہو تو قواعد داں بھیجے جاویں نہ چاہتا ہو اور والدین واسطے چھوڑنے کے از بس ناراض ہیں اور نوکری کرنے میں خوش ہیں، اس کے جواب سے سائل کو معزز فرماویں،

الجواب، یہ نوکری بوجہ اس کے کہ نماز فرض فوت ہوتی ہے، اور وقت مقابلہ کفار و مسلمین کے تائید کفار کی کرنی پڑتی ہے اور وقت پر انکار ہو نہیں سکتا، ناجائز ہے، اس کو چھوڑ دینا چاہیے، اگرچہ والدین ناراض ہوں، خدا تعالیٰ کے سامنے کسی کی طاعت نہیں ہے۔ قال اللہ تعالیٰ ان الحکم الا للہ الآیۃ وایضا قال جل شانہ وان جاھداك علی ان تشرك بی مالیس لك بہ علم فلا تطعھما الآیہ وقال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق الحدیث واللہ اعلم فقط ۷ محرم ۱۳۰۲ھ (امداد ج ۳، ص ۷۵)

ٹھیکہ دادن زمین ڈھاکہ دار

سوال (۳۵۶) حضرات علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے مثلاً اپنی زمین جس میں درخت ڈھاک کے تھے کسی کو دو سال پر ٹھیکہ پر دیدیئے، اور جس کو دیدیئے اس سے یہ کہا کہ اتنی مدت تک یہ زمین تیرے قبضہ میں ہے، تجھ کو اختیار ہے کہ تو ان درختوں کو کاٹ یا رکھ، بعد انقضاء مدت معہودہ یہ زمین میں تجھ سے لیلوں گا تو آیا یہ معاملہ اس کو کرنا جائز ہے یا نہیں، اور وجہ عدم جواز کی کیا ہے (مولوی عبدالرحمن مرادآبادی)

الجواب، یہ معاملہ صحیح نہیں، کیونکہ معنی کلام کے یہ ہوئے کہ دو سال تک جتنے درخت تو کاٹ لیگا وہ تیرے ہاتھ بیع ہیں، اور تعداد ان درختوں کی معلوم نہیں کہ دو سال میں کتنے کٹیں گے، تو بیع مجہول کی ہوئی اور یہ جائز نہیں، سلخ محرم ۱۳۰۲ھ (امداد ج ۳، ص ۷۵)

مدرس کو بجائے کھانے کے اگر نقد روپیہ دیا جائے تو ایام رخصت میں بھی یہ روپیہ دیا جائیگا یا نہیں

سوال (۳۵۷) ایک

مدرس عربی کی دس روپے تنخواہ ہے، اور کھانا بھی مدرسہ کے ذمہ ہے، کھانے کی بدنظمی کی وجہ سے مدرس مذکور نے یہ درخواست کی کہ مجھ کو کھانے کی عوض نقد دیا کرو، اس کو اہل مدرسہ نے قبول کر کے تین روپے ماہوار مثلاً بغرض طعام معین کر دیا، اب بجائے دس کے تیرہ روپے مدرسہ دیتا ہے، اب مقصود سوال سے یہ ہے کہ جیسا قاعدہ مقررہ مدارس کا ہے کہ ماہ رمضان کی تعطیل میں مدرسین مکان کو چلے جاتے ہیں ان کو تنخواہ ماہ رمضان المبارک کی مدرسہ سے دی جاتی ہے، اب مدرس مذکور کو یہ تین روپے تنخواہ میں متصور ہوں گے یا نہیں، اور رمضان المبارک کی تنخواہ دس دیئے جائیں گے یا تیرہ؟

الجواب: اس کا مدار عرف پر ہے جبکہ کوئی خاص تصریح نہ ہو، اور میرے نزدیک عرف یہ ہے کہ جب بجائے کھانے کے نقد اس طرح معین ہو جائے کہ وہی مستقل ہو جاوے اس طور پر کہ پھر عود طعام کا احتمال بعید ہو جائے تو وہ نقد مثل دوسرے جزو تنخواہ کے ہو جاوے گا، اور ایام تعطیل میں بھی تیرہ۱۳ روپے دیئے جاویں گے، البتہ اگر کسی شخص کو اس کے خلاف عرف محقق ہو جاوے تو اس کے موافق حکم ہوگا، ۱۸ رجب ۱۳۲۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۷۴، و حوادث اول ص ۳۶)

گائے چرانے پر ایک دن کے دودھ کے عوض اجیر رکھنا

سوال (۳۵۸) ایک شخص نے دودھ دیتی ہوئی گائے خریدی ایک روز اپنا کھلا کر اس روز کا دودھ ایک شخص کو اس وعدہ پر دیا کہ دو روز تک اس گائے کو چرائے گھاس کھلائے، غرض کل خدمت اس کی کرے، اور دونوں روز کا دودھ مالک کو دے، پھر آخر روز کے دودھ سے اسی طرح عہد کیا تو یہ جائز ہے کہ نہیں؟

الجواب: چونکہ اجر و عمل معلوم ہیں لہذا جائز ہے، کیونکہ تعجیل اجرت خود جائز ہے، البتہ یہ شرط ہے کہ صرف چرانے کی شرط ٹھیری، گھاس کاٹ کر یا خرید کر کھلانے کی شرط نہ ٹھیری، کیونکہ اجارہ استہلاک عین پر جائز نہیں ہے، (تتمہ اولیٰ ص ۱۷۵)

اجیر کو اجرت کام سے پہلے دے دینا

سوال (۳۵۹) مثلاً کھجور کی تاڑی ایک روز کسی نے اپنی مزدوری دیکر اتروایا اور نصف تاڑی دے کر اس سے وعدہ لیا کہ کل کُل تاڑی مجھ کو دینا، کل کی مزدوری ہم آج دیتے ہیں، اسی طرح چند بار کیا تو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: یہ بھی جائز ہے، مگر دونوں مسئلوں میں ہر بار کا دینا جدا اجارہ ہے، لہذا انکار کرنے پر حق جبر نہیں، ۱۸ شعبان ۱۳۲۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۷۵)

ایک روز کے دودھ کے عوض گائے چرانے اور گھاس کاٹنے اور کھلانے پر اجیر رکھنا اور دودھ کو قیمت گھاس کی اور اجر قرار دینا

سوال (۳۶۰) زید نے دودھ دیتی ہوئی گائے خریدی ایک روز اپنا

کھلا کر دودھ اس روز کا بکر کو اس وعدے پر دیا کہ تمہوئے اور بچہ کو دو روز چرائے اور اپنے گھر باندھو کھولے اور دونوں روز کا دودھ دوہ کر مالک کے پاس پہنچائے پھر دوسرا وعدہ ہوا کہ دوسرے روز کا دودھ تم لیکر پھر دو روز اس کی جمیع خدمت کرنا، علیٰ ہذا القیاس، لیکن گھاس کاٹ کر یا خرید کر یا اپنے پاس سے بھوسا کھلانے کا بھی وعدہ ہوا، اور اپنے گھر باندھنے کا اس طریق پر کہ نصف دودھ مذکور گھاس بھوسہ کی قیمت ہے، اور نصف حق خدمت، یا اس طرح پر کہ دودھ حق خدمت ہو اور نصف بچہ ایک سال کی گھاس بھوسہ کی قیمت یا بکری نے دودھ حق خدمت لیا، اور گھاس بھوسہ تبرعاً دینا کیا، یا گھاس بھوسہ کی بطریق ٹھیکہ کے تخمینی بالمقطع قیمت ایک سال مثلاً دس روپے طے ہوئے، یا ایک سیر دودھ روزانہ یا دوسرے روز گھاس بھوسہ کی قیمت دی جائے اور نصف بچہ حق خدمت ایک سال کے تو کون صورت جائز ہے،

الجواب، سب صورتیں ناجائز ہیں، والوجہ عدم وجدان شرائط الاجارۃ والبیع کما ھو ظاھر واللہ اعلم، ۳ رمضان ۱۳۲۶ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۷۵)

ایصال ثواب کرنے قرآن خوانی پر اجرت لینا

سوال (۱۶۳) بعد تعظیم و تکریم کے معروض یہ ہے، جناب مخالفین پہلے بغیر تاویلات کے اور کوئی دلیل معتبر کتب سے نہیں دے سکتے تھے، فی الحال ایک کتاب حقیقت الاسلام ہے، اس کتاب سے دلیل دیتے ہیں، اور وہ کتاب قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی تصنیف ہے، اور وہ دلیل یہ ہے:-

صورت سوم آں کہ شخصے حسبۃً للہ ثواب خواندہ خود را بکسے بخشد، بقصد ثواب و خواندن آغاز کند و ہرگز خیال معاوضہ در خاطر او خطور نکند و آں کس بطریق مکافات بعد ازاں یا در اثنائے خواندن آں بوے چیزے بدہد یا احسانے نماید شخصے باشد کہ از سالہا بر شخصے انعام و احسان می کند و آں کس در مکافات آں قرآن و کلمہ تہلیل و امثال آں برائے او می خواند و ثوابش بوے بخشد، ایں صورت جائز است بلاشبہ، بلکہ مستحب زیرا کہ مکافات احسان احسان و مناسب و موافق است، چنانچہ کہ بحدیث قدسی آمدہ است من صنع الیکم معروفاً فکافؤہ غورے می باید اگر نیت در خواندن احسان (مکافات) اوست جائز و مستحب است، اما اجازہ نشد واگر خیال معاوضہ باشد جائز نیست، پس بوقت خواندگی تامل درکار است،

جناب حدیث شریف کے نیچے سے جو عبارت ہے اس سے جواز ہونے کا زیادہ زور کرتے ہیں ورنہ اور کوئی دلیل قوی نہیں، جناب ابھی بندہ کی معروض یہ ہے کہ عبارت کا جو مضمون ہے صحیح ہے یا نہ اور جو مکافات اور معاوضہ کا فرق بیان کیا، یہ بھی صحیح ہے یا نہ اور جو لکھا کہ احسان کا خیال کر کے پڑھنے سے درست ہوگا

ف صورت ثالثہ میں عدم جواز کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی چنانچہ مسئلہ ۳۵۹ میں بعینہ اسی صورت کا جواز تحریر ہے ۱۲ رشید احمد عفی عنہ

معاوضہ کے خیال سے درست نہیں ہوگا، یہ بھی صحیح ہے یا نہ احسان کے کیا معنی اور کیا تعریف ہے؟ اور حدیث شریف کے اوپر سے جو عبارت ہے اس کے معنی کسی صورت میں مطابق ہوگا کیونکہ ہمارے یہاں معاوضہ کا خیال نہ ہوتا یہ ہرگز نہیں، جناب ان سب باتوں کی تحقیق فرما کر اطلاع فرمادیں،

الجواب، حدیث شریف کے نیچے جو عبارت ہے اس سے صورت متعارفہ کے جواز پر استدلال کرنا محض بے معنی ہے کیونکہ اس میں تصریح ہے کہ اگر خیال معاوضہ باشد جائز نیست اور ظاہر و متیقن ہے کہ جہاں اس کی عادت ہے وہاں دینے والے لینے والے دونوں کا خیال معاوضہ ہوتا ہے، اگر کوئی بات بنا کر خلق کے سامنے بری ہوگئے مگر حق تعالیٰ تو نیت کو دیکھتے ہیں تو فیما بینہ وبین اللہ کیسے برأت ہوگی؟

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام   در غلط اندازی تا ہر خاص وعام
کارہا با خلق آری جملہ راست   با خدا تزویر وحیلہ کے رواست
کار با او راست باید داشتن   رایت اخلاص وصدق افراشتن

اور جو فرق مکافات ومعاوضہ کا بیان کیا ہے، مقصود فرق کے آثار وامارات کا بیان کرنا ہے عاقل اس سے اور دوسرے آثار وقرائن سے بھی دونوں کے فرق کو سمجھ سکتا ہے، اور آپ کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ ہمارے یہاں معاوضہ کا خیال نہ ہونا ہرگز نہیں پس جواز کی گنجائش نہ ہوئی، والسلام

۲۹ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۷۶)

شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتوی سے ایصال ثواب کیلئے قرآن خوانی پر اجرت لینے کے جواز پر استدلال کا جواب

سوال (۳۶۲): در فتاویٰ شاہ عبدالعزیز صاحب می نویسند شخصے قرآن را نہ بروجہ طاعت بلکہ بنا بر قصد مباحے می خواند وبران اجر می گیرد مثل رقیہ وتعویذ ختم بعض سور قرآن برائے حصول بعض مطالب دنیوی ویا برائے استخلاص از عذاب گور یا برائے انس زندہ یا مردہ بصورت خوش وایں قسم نیز جائز است بلا کراہت وہمین است مورد ایں حدیث ان احق ما اتخذتم علیہ اجرا، کتاب اللہ پس اگر نیت طاعت وثواب نباشد استخلاص از عذاب گور وانس مردہ چہ معنی دارد، وایں عبارت را طاعت فروشان ایں دیار سند می کنند وشنیدہ ام کہ در رسالہ حقیقت الاسلام قاضی ثناء اللہ صاحب نیز نوشتہ اند کہ برائے استخلاص از عذاب گور قرآن براجرت خواندن جائز ودرست،

الجواب، اولاً انتساب ایں فتوی بشاہ صاحب[عہ] محتاج سند درست ودونہ خرط القتاد، ثانیاً اصل قاعدہ کہ ممہد کردہ شدہ است وہماں مقصود ست صحیح است کہ شخصے قرآن را لا لتہ البتہ استخلاص از عذاب گور ودر امثلہ اش داخل کردن بالیقین صحیح نیست خواہ از کسے جواد باشد یا از تحریف

عہ فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۹ صورت پنجم

نستا خان ومتفق علیہ است کہ اگر مثالے برقاعدہ منطق نیا شد آں مثال قابل طرح یباشد پس ہرگاہ ثابت است کہ استخلاص از عذاب گور بدون ثواب نمیشود قرآن خواندن بایں غرض داخل طاعت گشت و آں قابل استیجار نیست و عبارت قاضی صاحب ؎ تا وقتیکہ دیدہ نشود براں کلام نتواں شد از ناقلان مطالبہ تصحیح نقل می باید کرد فقط ، ۲۹ ذیحجہ ۱۳۲۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۷۷)

| تاڑی نکالنے کے لئے کھجوروں کا اجارہ پر لینا |

سوال (۳۶۳) اکثر بلاد میں مثل سورت وغیرہ کے درختہائے کھجور خود بخود پیدا ہوتے ہیں مثل اور نباتات کے اور بعض اس کو بوتے بھی ہیں، اور پھر اس کو اجارہ پر دیتے ہیں اور اجارہ دار اس درختہائے کھجور سے تاڑی نکالتا ہے، سوائے تاڑی کے اور کوئی نفع مقصود نہیں ہوتا ، اور تاڑی مسکر ہے، تو اب عند الشرع شریف ان درختوں کو اجارہ پر دینا درست ہے یا نہیں ، بینوا توجروا ، بحوالہ کتب معتبرہ وعبارات واضحہ ،

الجواب ، قطع نظر اس سے کہ یہ اعانت علی المعصیۃ ہے یا نہیں خود یہ معاملہ اس لئے ناجائز ہے کہ یہ اجارہ تو اس لئے نہیں کہ اجارہ استہلاک منافع پر ہوتا ہے ، اور یہاں استہلاک عین پر ہوا ہے اور بیع اس لئے نہیں کہ مبیع مقدور التسلیم بلکہ بعض صورتوں میں موجود بھی نہیں ،

۲۸ ذیحجہ ۱۳۲۶ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۷۸)

| کھجور ناریل تاڑ کے درختوں کو اجارہ پر دینا |

سوال (۳۶۴) کھجور یا ناریل یا تاڑ کے درخت سیندھی کے اجارہ میں کسی نقد معین پر دینا جیسا کہ اس ملک ہند میں مروج ہے جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب ، جائز نہیں ۔ (تتمہ اولیٰ ص ۱۸۳)

| کرایہ دار اگر میعاد مشروط سے پہلے مکان خالی کردے تو کرایہ کل پڑے گا یا بعض |

سوال (۳۶۵) کرایہ دار جو بنگلہ جات یا دوکانات یا مکانات کا کسی مالک مکان سے بشرط ایک سال یا چھ ماہ وعدہ کے کرایہ معینہ ماہوار شرح مقرر کرکے لیوے اور اندر میعاد معینہ کے مکان خالی کردے ، تو مالک مکان کو حق پہونچتا ہے کہ کرایہ میعاد مشروط اس سے وصول کرے ، ؟

الجواب ، یہ خالی کرنا اگر کسی عذر سے ہے تو کل کرایہ وصول نہ کیا جاوے گا ، ورنہ وصول کیا جاوے گا ، اس عذر کو بیان کرنا چاہیے ، ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۸۳)

| کار دیگرے کردن اجیر خاص را |

سوال (۳۶۶) کوئی ملازم کارخانہ یا مدرسہ وغیرہ کا خارج اوقات ملازمت یعنی بعد عصر یا شب میں دوسرے کارخانہ میں ملازمت کر سکتا ہے یا نہیں ؟

؎ یعنی علاوہ عبارت مذکورہ سوال سابق کے کہ اس سے استدلال نہ ہو سکنا اس سوال کے جواب میں مذکور ہو چکا ۱۲ منہ

الجواب، جو اجیر خاص ہو اس کو جتنا وقت اس عمل کے لئے معین ہو سکتا ہے، اس میں دوسرا کام کرنا بلا اذن جائز نہیں۔ اور اذن بھی صاحب عطا، یا وکیل مطلق صاحب عطار کا معتبر ہے،

۸ محرم ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۱۲)

اجیر کا موجر کو دھوکہ دے کر زیادہ روپیہ وصول کرنا

سوال (۳۶۷) گورنمنٹ کے چھاپہ خانہ میں کسی شخص کی تنخواہ مقرر نہیں ہے، سب لوگ ٹھیکہ پر کام کرتے ہیں، اور گورنمنٹ نے ایک طریقہ ترقی کا سب لوگوں کے واسطے یہ مقرر کیا ہے کہ ہر سال میں جنوری، فروری، مارچ ان تین مہینوں کا حساب دیکھا جاتا ہے، اگر کسی شخص کو ان تین مہینوں میں برابر چالیس روپیہ ملا ہوگا تو اس کو ترقی ہو گی، اور اس کا ۳۰ گھنٹہ مقرر ہوگا، اگر ان تینوں مہینوں میں چالیس روپیہ سے کم ملا ہوگا تو ترقی نہ ہو گی، بس ایسا کوئی نہیں جو اکیلا چالیس روپیہ کا کام برابر تین مہینہ کر سکے، جب چالیس روپے تین مہینے برابر نہ کر سکیں گے تو ترقی بھی نہ ہو گی، اب چند لوگ یہ کارروائی کرتے ہیں کہ دو آدمی صلاح کر کے خلافِ حکم گورنمنٹ شرکت میں کام کرتے ہیں، جب ان دو آدمیوں نے مل کر ایک مہینہ میں ساٹھ روپے کا کام کیا، اب جس وقت حساب کے واسطے ان کا کام گورنمنٹ میں بھیجا جاوےگا تو ایک آدمی اپنے نام چالیس روپے کا کام لکھے گا اور ایک آدمی بیس کا کام لکھے گا، مگر تنخواہ ملنے پر دونوں آدمی پورا پورا حصہ تقسیم کریں گے، جس نے چالیس روپے کا کام اپنے نام لکھا ہے محض اسی غرض سے کہ میری ترقی ہو، جب سال تمام ہوگا اس وقت ان کی ترقی ضرور ہو جاتی ہے، یہ گورنمنٹ کو دھوکہ دے کر ترقی کرائی گئی، اور گورنمنٹ نے تو یہ سمجھ کر ترقی دی کہ اس نے اکیلے برابر تین مہینے چالیس روپے کا کام کیا ہے اور گورنمنٹ کا حکم ہے کہ کوئی آدمی آپس میں شرکت سے کام نہ کرے سب الگ الگ کریں۔ اگر گورنمنٹ کو معلوم ہو جائے کہ چند لوگ شرکت میں کام کرتے ہیں تو ان لوگوں کو جرمانہ ہو جائے، یا نکالدیئے جائیں تو اس طرح سے کام کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں اور یہ روپیہ شرعاً حلال ہے یا حرام

الجواب، یہ عقد اجارہ ہے، اور اجیر کی خاص صفت پر اجرت زیادہ دینے پر گورنمنٹ کی رضامندی ہے جب وہ صفت اجیر میں نہیں تو وہ زیادت اجرت خداع وفریب سے کرائی گئی ہے لہذا یہ جائز نہیں، اور جس قدر دھوکہ سے ترقی کی ہے اُس قدر روپیہ خبیث ہے،

۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۹ھ (تتمہ اولیٰ ص ۳۱ و حوادث اول ص ۳۷)

امامت اور وعظ پر اجرت لینا

سوال، (۳۶۸) امامت اور وعظ پر اجرت لینی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب ۔ استیجار علی الطاعات جو ناجائز ہے اس میں سے امامت مستثنیٰ ہے، اور وعظ کو بھی بعض نے مستثنیٰ کہا ہے، اور بعض نے عدم جواز میں داخل رکھا ہے تطبیق یہ ہے کہ اگر وعظ کی نوکری کرلی مثل امامت کے تو اجرت لینا جائز ہے، اور اگر نوکری نہیں ہے عین وقت پر وعظ پر اجرت کی شرط کرے تو جائز نہیں جیسے عین وقت پر امامت پر اجرت مانگنے لگے فقط

۱۱ شعبان ۱۳۲۹ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۷۹)

جائیداد صحرائی یا سکنی کسی شخص کو ٹھیکہ پر دینا اور زر ٹھیکہ پیشگی وصول کرنا

سوال (۷۶۹) کیا فرماتے ہیں اس مسئلہ میں کہ کوئی شخص اپنی جائداد صحرائی جو بذریعہ ٹھیکہ نامہ جات مزارعان کے پاس بشرح نقدی معینہ پر ہو، یا سکنی جو بذریعہ کرایہ نامہ جات کرایہ داروں کے پاس کرایہ معینہ پر ہو کہ جس میں کمی بیشی نہ ہو سکے جزو یا کل کو بحیثیت مستاجری کسی شخص کو ٹھیکہ پر مدت کم از کم بارہ سال یا زائد بارہ سال کے لئے دی، اور اس آمدنی کا زر چہارم یا کم و بیش معین جو کرایہ داروں یا ٹھیکہ داروں سے یعنی کاشتکاران دیہی داران سے وصول ہوتا ہو اس کو چھوڑ کر ٹھیکہ پر دیدے اور نفع نقصان کا ذمہ دار ٹھیکہ دار ہو، خواہ اس کا کرایہ وغیرہ وصول ہو یا نہ ہو خواہ بآسانی ہو یا بذریعہ عدالت اس کو وصول کرنا پڑے، اور معاہدہ مالک کا کرایہ داروں یا پٹہ داروں سے ہے اس کا پابند رہے، اور زر ٹھیکہ کُل یا جزو مدت کا بغرض اطمینان یا بغرض ضرورت مالک اراضی پیشگی وصول کرے، ایسی حالت میں یہ ٹھیکہ جس کو مستاجری کہتے ہیں جائز ہے یا نہیں، بینوا توجروا ۔

الجواب ۔ یہ مستاجری باطل ہے، کیونکہ معقود علیہ اگر منافع ارض ہیں تو وہ منافع بوجہ عقد اجارہ حق مزارعین یا سکانِ مکانات ہیں بدون انقضائے مدت اجارہ یا فسخ عقد بالتراضی ان میں تصرف کرنیکا مالک کو اختیار حاصل نہیں، اور اگر معقود علیہ منافع اس مستاجر کے نفس کے ہیں، یعنی انتظام و سعی وغیرہ اور وہ ربع عوض ان منافع کا ہے تو بشرط اجتماع شرائط صحت اجارہ صحیح ہو سکتا ہے، مگر اس صورت میں اس مستاجر سے پیشگی روپیہ لینا بلا حق ہے، بلکہ جب کاشتکاران سے وصول ہو اس وقت لینے کا حق ہے، اور اگر اس پیشگی روپیہ میں قرض کی تاویل کی جاوے تو اول تو شرط قرض باطل ہے دوسرے اس کا مقتضا یہ ہے کہ اگر مستاجر کو وصول نہ ہو تو مالک اس کی رقم اس کو واپس کردے اور یہ نہیں ہوتا لہٰذا ناجائز ہے۔ ۳ رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۷۹)

موروثی کاشتکار سے زمین ٹھیکہ پر لینا اور موروثی کاشتکار کا مالکِ زمین کو ٹھیکہ پر زمین دینا

سوال (الف ۷۶۹) زید کاشتکار اپنا موروثی کھاتہ عمرو کو پانچ سال کے ٹھیکہ پر دیتا ہے، اور دو سو روپے

عمرو سے قرض لیکر اپنا قرضہ ادا کرتا ہے، موروثی کھاتہ کا لگان زید فی بیگہ عہ زمیندار کو دیتا ہے عمرو کے ٹھیکہ میں جب یہ کھاتہ موروثی آجاوے گا، تو وہ یعنی عمرو اس آراضی کو کسی کاشتکار کو فی بیگہ شہ پر دیوے گا، کیونکہ ٹھیکہ میں آنے سے وہ پانچ سال تک غیر موروثی تصور ہوگا، اور غیر موروثی کا لگان فی بیگہ پانچ روپے ہے، پانچ سال تک عمرو اس پیداوار سے زمیندار کا جو لگان موروثی مقرر ہے وہ ادا کرکے مابقی اپنے خرچ میں لائے گا، اور پانچ سال کے بعد ٹھیکہ فسخ ہوتے پر عمرو زید کی اراضی کو چھوڑ دے گا، اور مبلغ دو سو روپے اپنے واپس لے لے گا، یہ صورت شرع شریف سے جائز ہے یا نہیں اگر یہ صورت جائز نہ ہو تو اور جو صورت مطابق شرع شریف کے ہوسکے تحریر فرمایئے گا،

دوسری صورت یہ کہ زید کا شتکار اپنے زمیندار عمرو کو اس صورت سے ٹھیکہ دے تو زمیندار کو جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب، اس میں ایک قباحت تو یہ ہے کہ زید بوجہ دعوے موروثیت غاصب ہے اور غاصب سے ٹھیکہ لینا حرام ہے، دوسرے اگر زید اس زمین کا مالک بھی ہوتا تب بھی یہ ٹھیکہ قرض کے دباؤ میں دیا گیا ہے، اور بقاعدہ کل قرض جر نفعاً فھو ربا یہ سود اور حرام ہوا، اس لئے یہ ٹھیکہ لینا جائز نہیں، گو زید کا یہ ظلم ہے اس لئے وہ مرتکب حرام کا ہوگا، اور زمیندار چونکہ مظلوم ہے اور مالک زمین کا ہے، اس لئے وہ بوجہ اس کے کہ اپنی زمین سے منتفع ہوا ہے، اور اپنے استخلاص حق کے لئے سعی کی ہے اس کو گناہ نہ ہوگا، ۱۳ صفر ۱۳۳۸ھ (تتمہ اولیٰ ۲ ۱۴۲، حوادث ا ۲ ص ۳۹)

ہنود کی زمین کو اجارہ پر لینا **سوال** (۳۷۰) کسی مندر کے لئے چھوڑی گئی زمین کو کسی مسلمان کا حصہ پر یا کسی معین اجارہ پر لے کر زراعت کرنا اور اس سے نفع اٹھانا جائز ہے یا نہیں، اپنی فائدہ کے لحاظ سے اس زمین کو درست کرکے ترقی پیداوار کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب، جائز ہے، (تتمہ اولیٰ ص ۱۴۳)

ٹھیکہ کھجور و تاڑ **سوال** (۳۷۱) کھجور اور تاڑ کے درختوں کا ٹھیکہ دینا جائز ہے یا نہیں، بر تقدیر عدم جواز بایں حیلہ کہ ان درختوں کے ساتھ وہ زمین جس میں یہ درخت واقع ہیں، ٹھیکہ میں (وہ زمین) دی جائے ایسی حالت میں یہ آمدنی شرعاً جائز ہوگی یا نہیں ؟

جواب۔ اس حیلہ سے بھی جائز نہیں، کیونکہ یہ حیلہ کسی قاعدہ شرعیہ پر منطبق نہیں،

۱۸ ربیع الثانی ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ۲ ص ۱۸)

کام اور وقت دونوں معین کرکے اجیر رکھنا درست ہے یا نہیں **سوال** (۳۷۲) کام اور وقت دونوں متعین

کرکے مز دور کرنا درست ہے یا نہیں، مثلاً یوں کہا کہ ایک دن میں چار عدد اس قسم کے ٹوکرے بنا دیتا آٹھ آنہ روزانہ دیں گے یہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب، اگر مقصود صرف کام ہو اور وقت کا ذکر تعجیل کے لئے ہو تو جائز ہے ورنہ نہیں

(تتمہ اولیٰ ص ۱۰۳)

کسی کا دین وصول کرنا اس شرط سے کہ جو وصول ہوگا اس کا ثلث تم کو ملیگا

سوال (۳۷۳) ایک عورت کا لوگوں پر کچھ روپیہ آتا ہے اور اس کی دستاویز بھی ہے گواہ بھی موجود ہیں، مگر وہ مدیون روپیہ ادا نہیں کرتا، اور وہ عورت نالش کرنے سے قاصر ہے، لہذا ایک معتمد علیہ سے ایسا بندوبست کیا گیا کہ تمہارا حق لوگوں سے بذریعہ نالش یا کسی اور تدبیر سے وصول کر دو تو تم کو اس کا ثلث روپیہ بطور محنتانہ دیا جائیگا بلکہ میرے پاس نالش کا پورا خرچ نہیں ہے، اپنی طرف سے ثلث خرچ بھی دینا تو خرچ وضع کرکے جو بچے گا وہ آپس میں تقسیم ہو جائے گا، یہ معاملہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب، یہ شخص اجیر ہے، لہذا تنخواہ معین ہونا چاہئے، خواہ ماہانہ خواہ یکمشت کہ بعد کامیابی کے وہ تنا دیں گے، اور یہ شخص جو خرچ کرے گا وہ ہر حال میں عورت پر قرض ہوگا، خواہ کامیابی ہو یا نہ ہو؛ ۴ شعبان ۱۳۳۰ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۰۳)

نوکر داشتن بندوقچی

سوال، (۳۷۴) جو شخص بندوق کا نشانہ اچھا لگاتا ہو اس کو بغرض شکار اجیر یا ملازم رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، جائز ہے، ۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ

تحقیق وضع تنخواہ محرر سرائے موقوفہ از کرایہ

سوال (۳۷۵) کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مراد آباد کے اسٹیشن پر ایک مسجد ہے، اس کے متعلق ایک سرائے وقف ہے اس کے متولی حافظ عبد الواحد صاحب ہیں، انھوں نے سرائے مذکور کو بمیعاد ۳ سال حاجی نبی احمد صاحب کو ٹھیکہ مبلغ ۳۵ ماہوار کو دیدیا، حاجی نبی احمد صاحب نے اپنی طرف سے بمیعاد ۳ سال بنام کفایت اللہ دیدیا، ہر دو ٹھیکہ دار سے یہ شرائط تحریر تھی کہ صفائی سرائے ذمہ ٹھیکہ دار اور شکست و ریخت ذمہ متولی کے ہے، جس زمانہ میں سرائے ٹھیکہ پر لی تھی اس زمانہ میں منجانب سرکار یہ حکم ہوا تھا کہ ایک محرر شب کو مسافروں کے نام اور حلیہ اور پتہ سب رجسٹر میں لکھ کر لیجایا کرتا تھا، اس کے دس پندرہ یوم بعد منجانب سرکار یہ حکم ہوا کہ ہمارا محرر اب نہیں آوے گا، بلکہ جو شخص سرائے میں رہے وہ رجسٹر کا کام کیا کرے، سرکاری حکم مجبوری ماننا پڑا، ٹھیکہ دار دوم نے ٹھیکہ دار اول سے کہا کہ مجھ کو منشی رکھنا پڑیگا

میں اس کا متحمل نہیں ہو سکتا، ٹھیکہ دار اول نے متولی صاحب سے کہا کہ کیا کیا جاوے انھوں نے کہا کہ جو حکم شرع ہو اس کی پابندی کرو، غرض اسی لیت ولعل میں تیرہ مہینے گذر گئے، ٹھیکہ دار دویم نے مجبور ہو کر چار ماہ کا کرایہ روک لیا، اور یہ کہا کہ ہم کو منشی کی تحریر کی اجرت جو روزنامچہ رجسٹر مسافران کا لکھتا ہے، دو تو ہم کرایہ دیں، ٹھیکہ دار اول نے مجبوراً اس معاملہ کی صفائی کے لئے ایک ثالث واسطے فیصلے کے مقرر کیا اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ٹھیکہ دار اول تو ٹھیکہ دار دوم کو تین روپے ماہوار حق اجرت منشی کا کرایہ میں وضع کرے، اور ٹھیکہ ٹھیکہ دار دویم کا فسخ کر دیا جاوے، اب ٹھیکہ دار اول نے ایک ماہ خالی پڑی رہنے پر ٹھیکہ دار سوئم کو بمبلغ ۱۲ روپے کو ٹھیکہ دے دیا، ٹھیکہ دار اول متولی صاحب سے کہتا ہے کہ چونکہ یہ سرکار نے جو حق منشی کی ذمہ سرائے کے لگا دی ہے اس واسطے اس کا کرایہ گھٹ گیا، جو کچھ مصارف منشی وغیرہ کے اور نقصان ٹھیکہ دار کو ہے وہ متولی سے مانگتا ہے، اب علمائے دین فرمائیں کہ متولی کو کیا کرنا چاہئے

الجواب : فی الدر المختار وعمارۃ الدار المستاجرۃ وتطیینہا واصلاح المیزاب وما کان من البناء علی رب الدار وکذا کل ما یخل بالسکنی فان ابی صاحبہا ان یفعل کان للمستاجر ان یخرج منہا الخ فی رد المحتار تحت قولہ واصلاح بئر الماء عن الولوالجیۃ لان المعقود علیہ منفعۃ السکنی وشغل باطن الارض لا یمنع الانتفاع بظاہرہا من حیث السکنی ولہذا لو سکنہ مشغولا لزمہ کل الاجر وانما للمستاجر ولایۃ الفسخ لانہ تعیب المعقود علیہ ج ۵ ص ۵۵ اس روایت سے چند امور مستفاد ہوئے، ۱؎ چونکہ یہ تحریر کا کام از قبیل بنا نہیں جس کا عدم مخل سکنی ہو، اس لئے یہ بذمہ متولی نہ ہوگا اسی طرح دوسرے ٹھیکہ کے بعد بذمہ ٹھیکہ دار اول نہ ہوگا، ۲؎ اور بالفرض اگر کوئی ایسا امر بھی ہوتا جو از قبیل بنا ہو، اور موقوف علیہ انتفاع سکنی کا ہو تب بھی ٹھیکہ داروں کو مکان سرائے چھوڑ دینے کا تو حق حاصل ہوتا، لیکن یہ حق حاصل نہیں ہے کہ خود خرچ کر کے متولی وغیرہ سے وضع کریں، ۳؎ متولی کو جائز نہیں کہ ٹھیکہ دار اول کو اس نقصان کا عوض دے، ۶ رجب ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ ص ۵۰)

حکم خواندن تراویح خلف کسیکہ برخواندن قرآن اجرت طلب کند

سوال (۳۰۶) ہمارے محلہ میں کوئی حافظ قرآن نہیں، اور ختم قرآن تراویح میں سننا بھی سنت ہے، ایسی حالت میں ہم کوئی دوسرے ملکی حافظ کو ختم قرآن فی التراویح کے لئے بالاجرۃ یا بلا اجرۃ رکھ سکتے ہیں یا نہیں، اگر بلا اجرت مقررہ رکھیں تب بھی دونوں طرف سے جانتے ہیں کہ کم سے کم اتنے روپے لینا دینا ہیں، مولانا رشید احمد صاحب مرحوم اپنے فتوی میں ناجائز کہتے ہیں مگر ہم کو یہ خدشہ پڑ گیا کہ جس سنت کے ترک پر حاکم کو

تشدد کرنا ہوتا ہے، اس کے لئے کیوں مثل امامت پنجگانہ کے امام بالاجرت سوا ارکان معروفاً او مشروطاً نہیں رکھ سکتے؟

الجواب : یہ سنت کون سی ہے، تراویح یا ختم قرآن، اگر تراویح ہے تو تراویح بدون اجرت کے قائم ہوسکتی ہے۔ اگر ختم قرآن ہے تو اس پر تشدد کس نے لکھا ہے؟

۴ ذیقعدہ ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ ص ۹۲)

اجرت گرفتن برسعی تقرر رشتہ

سوال (۳۷۷) رشتہ کرانے کی اجرت لینا جیسے حجام پیام وسلام لڑکی ولڑکے کا کرا کے کچھ لیا کرتے ہیں، یا پہلے کچھ مقرر کرلیتے ہیں، کہ اس قدر نقد اور ایک جوڑا توشرعاً تو اس لین دین میں کچھ حرج نہیں ہے؟

الجواب : اگر اس ساعی کو کوئی وجاہت حاصل نہ ہو اور جہاں اس نے سعی کی ہو وہاں کوئی دھوکہ نہ دے تو اس اجرت کو جانے آنے کی اجرت سمجھ کر جائز کہا جاوے گا، والا فلا لجواز اخذ الاجر علی الشفاعۃ ولا علی الخداع۔ ۱۲ ذی قعدہ ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثالثہ ص ۱۶۲)

ٹھیکہ مواشی خانہ

سوال (۳۷۸) حضور ہمارے ملک میں رواج ہے، کہ سال کے پہلے از جانب سرکار ایک جگہ مقرر کی جاتی ہے، اس لئے کہ بیل وغیرہ جو رعایا کی زراعت کا نقصان کرتا ہو وہاں لیکر بند کرتے ہیں اور پیسہ دو روپیہ علی تفاوت النوع لیکر چھوڑ دیتے ہیں، وگرنہ اس بیل وغیرہ کو بعد پندرہ سولہ دن کے نیلام کرتے ہیں اور یہ پیسہ لینا اور نیلام کرنا از جانب سرکار ہوتا ہے اس کو کھوڑ کہتے ہیں، اسی کو سرکار بیچا دیتے ہیں کہ اس کھوڑ کو ایک برس کے لئے ہم اتنے روپیہ میں بیچتا ہوں جو کوئی لے گا بیل وغیرہ کی قیمت وہ لیں گے، پس یہ صورت کیسی ہے، اور اس کو خریدنا درست ہے یا نہیں اور بیچنا کیسا ہے؟

الجواب : اس صورت میں مبیع وہ روپیہ ہے جو سال بھر میں جرمانہ یا قیمت مواشی کا وصول ہوگا، سو اول تو وہ روپیہ معین نہیں، دوسرے موجود نہیں، تیسرے ابھی حق سرکار بھی نہیں ہوا، اس لئے وہ روپیہ مبیع ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس لئے یہ بیع حرام اور باطل ہے، اور قمار و سود میں داخل ہے۔ فقط ۹ محرم ۱۳۲۲ھ (امداد ج ۳ ص ۱۰)

سوال (۳۷۹) ٹھیکہ مویشی خانہ جیسا کہ جلد سوم امدادالفتاوی[عہ] کے صفحہ دہم میں لکھا گیا ہے وہ بعینہٖ ضلع چاٹگام میں مروج ہے، اس کا حکم تو امدادالفتاوی میں مذکور ہے، کہ بیع حرام اور باطل اور سود اور قمار میں داخل ہے لیکن ضلع اکیاب میں اس کی صورت دیگر ہے، وہ یہ ہے کہ گاؤں

عہ یعنی مذکورہ بالا فتوی ۱۲

کے بڑے آدمی جس کو ہیڈ مین روا سوگری کہتے ہیں، پانچ روپے جرمانہ اور چوبیس گھنٹہ کی قید کرنیکا
اختیار رکھتا ہے بعض ایسے شخص کو سرکار کی طرف سے یہ پروانہ دیا جاتا ہے کہ تم کو کھڑ دیا گیا، پس
تم کو چاہئے کہ جو شخص کسی مویشی کو اس کی زراعت کا نقصان کرنے سے تمہارے پاس لاوے، تم اس کو
بند رکھو، سات دن تک اگر وہ چھڑا لے جاوے اس کی رپورٹ کر کے نیلام کر دو، فیس حسب ذیل
وصول کرنا (۱) ہاتھی کا جرمانہ دو روپے، گھوڑے کا ایک روپیہ، بھینس کے آٹھ آنے، گائے کے
چار آنے، بکری کا ایک آنہ، گائے کے بچے کے دو آنے (۲) پہلے روز سے جب تک بند رہے گا فی روز
بمقدار جرمانہ چرائی بھی وصول کرو، جرمانہ تو فقط وہی مقدار مقرر ہے، اور چرائی ہر روز کی جدا گانہ ہے
حکم سرکار یہ ہے کہ (۱) چرائی کی بابت جس قدر وصول ہو وہ تو صاحب کھڑ کا حق ہے، وہ خود چرا دے
یا دوسرے سے جس طرح چاہے چروائے (۲) جرمانہ کی بابت جس قدر وصول ہو وہ اگر پانچ روپے تک
ایک ماہ میں نہ پہونچے، بلکہ پانچ روپے سے کم رہے، وہ صاحب کھڑ کھالیوے، اس میں سرکار کا کوئی
حق نہیں، ہاں البتہ اگر ایک مہینہ کے اندر پانچ روپے یا زیادہ جرمانہ میں آمدنی ہو وہ مقدار زر
سرکار میں داخل کردے، پس بیع کی صورت بالکل نہیں ہے، فقط سرکاری آمدنی وصول کرنے کا
گویا یہ تحصیلدار ہے، اُس تحصیلدار کی تنخواہ یا فیس حسب مرقوم بالا تحصیلدار کو ملتا ہے، اپنی طرف سے کچھ
نقد پیشگی یا بعد میں بہ تعیین قسط دینا نہیں ہوتا ہے، نیلام کرنے کی وجہ سے جو قیمت جمع ہوتی ہے یعنی ہر مویشی
جانور کی قیمت علیحدہ ہوتی ہے، کھڑ کے مجوزہ حق پورے ہو کر اگر کچھ مقدار بچت میں جمع رہے وہ صاحب
جانور کو بوقت طلب واپس دیا جاتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ (۱) اس کھڑ کی آمدنی جائز ہے یا نہیں
اگر تفصیل ہو تو تفصیل وار جواب عنایت ہو (۲) اس نیلام میں جانور فروخت ہونے سے مالک
جانور کا حق منقطع ہو گیا یا نہیں، خریدار مالک ہو گیا یا نہیں؟

الجواب، جو کچھ ان مدات میں وصول ہوتا ہے وہ استیلاء سے سرکار کی ملک ہو جاتا
ہے، اگرچہ وہ استیلاء بواسطۂ نائب کے ہو، پس سرکار اپنے مملوک روپیہ سے اس تحصیلدار کو دیتی
ہے جو کہ بوجہ رضا کے مباح ہے، اور بعینہ اسی دلیل سے نیلام ہونے سے حق مالک کا اس سے منقطع
ہو جاتا ہے، ۲۵ ذی قعدہ ۱۳۳۰ھ (حوادث اول ۲ ص ۱۰)

حکم فیس مدارس | **سوال** (۳۸۰) در مدارس ایں دیار از طالبان فیس گرفتہ می شود آیا از طفلان
نابالغ کہ یتیماں نیز درآں موجود اند بشرط اجازت ولی فیس گرفتن جائز ست یا نہ؟

الجواب، فیس اجرت ست اجرت عمل کہ نفعش بہ نابالغ عائد باشد از مال او گرفتن جائز

است باذن ولی، (حوادث اول ص ۱۷)

زیادت مقدار آڑھت بجائے سود

سوال (۳۸۰ الف) ایک مہاجن ادھار مال دیتا ہے، حق آڑھت ایک روپیہ فی سیکڑہ مقرر ہے، اگر دوسرے ماہ میں روپیہ ادا نہ ہو تو اصل پر سود لگاتا ہے مسلمان سود نہیں دینا چاہتا اور یہ کہتا ہے کہ بجائے سود کے حق آڑھت بڑھالو، بجائے ایک روپے کے دو یا تین روپیہ سیکڑہ لو یہ جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب، جائز ہے ، ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ص ۱۹)

تلبیس بغلط نویسانیدن مال در ریل

سوال (۳۸۱) جو مالِ تجارت بمبئی یا کلکتہ سے ریل کے اندر آتا ہے، ریلوے مالک نے ہر ایک مال کی الگ الگ کلاس اپنے ہاں رکھی ہے کسی مال کی کلاس چار روپے من کی ہے، اور کسی مال کی دو روپے من کی، کسی کی ایک روپے من کی اور کسی کی گیارہ آنہ من کی ہے، مگر مال سب کلاس کا ایک ہی گاڑی کے اندر آتا ہے، کوئی خاص درجہ کسی مال کا نہیں ہے، چاہے چار روپے من کا مال ہے چاہے گیارہ آنے من کا مال، ایک ہی گاڑی میں آتا ہے، اب سوداگروں نے یہ کفایت نکالی ہے کہ مال چار روپے من کا ہے اس مال کو گیارہ آنہ من کی چیز لکھوا کر منگاتے ہیں، اور کچھ تو بمبئی میں خرچ کرتے ہیں اور کچھ دہلی میں، غرض لے دے کر مال اپنا لے آتے ہیں، ریلوے مالک نے اپنے ہاں یہ قانون مقرر کر رکھا ہے، کہ جو اس قسم کی کارروائی کیے یعنی چار روپے من کی چیز کو گیارہ آنہ من کی لکھوا دے، تو ہم اس سے آٹھ روپے من کا بھاڑا لیویں گے اگر ہم کو خبر مل گئی، اب یہ صورت ہے کہ جو ریلوے نے ہندوستان میں سب سے بڑا افسر مقرر کیا بلکہ اسکو تمام باتوں کا اختیار دیا ہے، وہ خود روپیہ کھا کر اور مال کم کی کلاس میں بھیجدیتے ہے، اس کو سب خبر ہی کہ یہ مال چار روپے من کا ہے اور گیارہ آنہ من میں جارہا ہے، اب آپ فرمادیں کہ اگر چار روپے من کا مال ۱۱ من میں منگادیں تو ٹھیک ہے یا نہیں، سب دوکاندار ایسا ہی کرتے ہیں، اگر ہم چار روپے من کا بھاڑا دیتے ہیں، تو نقصان ہوتا ہے،

الجواب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ، زیادہ محصول کا مال کم محصول میں اس طرح لیجانا جس طرح سوال میں مذکور ہے حرام ہے، اور بڑے افسر کی رضا یا اذن اس لئے معتبر نہیں کہ وہ ریلوے کا مالک نہیں، والسلام، ۳ جمادی الاولیٰ (حوادث اول ص ۲۲)

ملازمت چنگی

سوال (۳۸۲) اس محکمہ میں افسر سکرٹری وماتحت افسران سپرنٹنڈنٹ و محرران وچپراسیان ہوتے ہیں، کام اس محکمہ کا یہ ہے کہ جو مال باہر سے تجارت پیشہ لوگ لاتے ہیں

ان پر وہ محصول جو کہ گورنمنٹ کی طرف سے لگایا گیا ہے لگا کر وصول کیا جاوے۔ محرر تخمینہ کر کے محصول لگا کر وصول کرتے ہیں، سپرنٹنڈنٹ جانچتا ہے، سکریٹری بعض وقت جانچتا بھی ہے، اور احکامات جاری کرتا ہے، چپراسیان تجار وغیرہ کو محصول کے لئے روکتے ہیں، وہ اسباب تولتے ہیں جن پر محصول لگایا جائیگا، محصول کا روپیہ صدر کو لیجاتے ہیں، غرض اس محکمہ کے سب لوگ محصول کی متعلق کوئی نہ کوئی کام کرتے ہیں، آیا اس محکمہ میں کسی قسم کی ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، جو قواعد شریعت نے اموال پر محصول لینے کے مقرر فرمائے ہیں جن کو فقہاء نے باب بالعاشر میں ضبط کیا ہے، چونکہ محکمہ مذکور کے قواعد ان پر منطبق نہیں ہیں، اس لئے بوجہ خلاف ما انزل اللہ ہونے کے غیر مشروع ہوئے ہیں، اور حسب ارشاد الٰہی لا تعاونوا علی الاثم والعدوان، اسکی اعانت بھی معصیت ہوئی، لہذا محکمہ مذکور کی ملازمت ناجائز ہے، مگر جو تنخواہ ملتی ہے وہ بوجہ اس کے کہ حاکم غیر مومن کا استیلاء اموال پر موجب تملیک ہو جاتا ہے، اور حاکم غیر مومن جو مال برضائے خود کسی مومن کو دیں خواہ کسی عنوان سے ہو وہ مباح ہے، اس لئے وہ تنخواہ حلال ہے، غرض خدمت غیر مشروع اور من وجہ ممتنع ہی پس عامل کو صرف عمل کا گناہ ہوگا، اور غیر عامل جو اس تنخواہ سے منتفع ہو مثلاً اس کے اہل وعیال یا اضیاف واحباب ان کو کوئی گناہ نہ ہوگا (حوادث اول ۲، ص ۷)

استحقاق تنخواہ معلم بسبب یاد نکردن سبق طلبہ

سوال (۳۰۳) طلبہ کو بوجہ سرزنش کسی روز سبق نہیں پڑھایا اس روز کی تنخواہ کا مستحق ہوگا یا نہیں؟

الجواب، برضائے اہل چندہ، چندہ سے دے سکتے ہیں ورنہ عدم اشتراط میں استحقاق نہیں اور اشتراط میں بذمہ موجر واجب ہے، ۱۵ شعبان ۱۳۳۲ھ (حوادث اول ص ۹۲)

اجارہ مشین بر نصف مکسوب

سوال (۳۰۴) زید نے عمرو کو بیس روپے اس اقرار پر دیئے کہ عمرو بیس روپے اپنے پاس سے لگا کر مبلغ چالیس روپے کو کپڑا سینے کی مشین خرید کر کے اس مشین کے ذریعہ سلائی کا کام کرے، اور جو کچھ کرے اس کا نصف زید کو دیا کرے، تو کیا یہ صورت شرکت جائز ہے یا نہیں، اگر جائز ہے تو شرکت کے چار اقسام میں سے کس قسم میں داخل ہے؟

الجواب، مشین جب مشترک روپیہ سے خریدی گئی وہ مشترک ہوگئی، اب جیسا ایک شریک نے دوسرے شریک کو اجازت اس کے استعمال کی اس شرط پر دی کہ نصف آمدنی مجھ کو دی تو اس کی حقیقت یہ ہوئی کہ یہ شریک دوسرے شریک کو اپنا نصف حصہ مشین کا کرایہ پر دیتا ہے اور کرایہ نصف آمدنی ٹھیراتا ہے، سو یہ صورت اجارہ کی شرعاً جائز نہیں، بلکہ کرایہ معین کرنا چاہئے، پھر خواہ

آمدنی کم ہو یا زیادہ ہو، اور جتنی مدت اس شرط مذکور پر کام کیا گیا ہے، اس کا کرایہ بقاعدہ اجرِ مثل دیا جاوے گا، مگر یہ اجرِ مثل آمدنی واقعی کے نصف سے زائد نہ ہو فقط

۲۵ صفر ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ص ۱۰۰)

تحقیق عدم تعیینِ عمل و اجرت در استیجاب عمال مزارعین

سوال (۳۰۵) کیا فرماتے ہیں علمائے دین متین اس مسئلہ میں کہ ہمارے علاقہ میں رواج ہے کہ نجار یا حداد زراعت کاروں سے یہ عقد کر لیتے ہیں کہ مثلاً جو کام زراعت کے متعلق لکڑی یا لوہے کا ہوگا بلاتعیین کرتے رہیں گے اور زراعت سے جو کچھ کہ پیدا ہوگا ایک من ہو بیس من مثلاً اس سے چالیسواں حصہ لیں گے تو اول تو اس میں تعیینِ کام نہیں ہے، اور اسی طرح تعیینِ اجرت بھی نہیں، کسی موقع پر کام کثرت سے ہو جاتا ہے اور بوجہ آفات کے زراعت سے کچھ پیدا نہیں ہوتا، اور کبھی بحیثیت اجرت کام سے دوگنی بلکہ دس گنی زیادہ ہو جاتی ہے، غرض اس عقد میں نہ تعیین ماجور علیہا کی ہوتی ہے نہ اجرت کی، اور نہ تعیین مدت کی، تو لہٰذا یہ عقد فاسد ہوگا، اور یہ اجرت بوجہ شبہ ربو کے حرام ہوگی یا نہیں؟

الجواب، بوجہ ابتلائے عام کے اس عقد کو اس تاویل سے جائز کہا جاوے گا کہ ابتدائے گفتگو کو عقد نہ کہیں گے، او روعدہ کہیں گے، اور اجرت دینے کے وقت چونکہ عمل معقود علیہ حیّزِ وجود میں آنے سے متعین ہو گیا، اجرت کو اس کے مقابلہ میں کہہ کر اس وقت عقد کو منعقد مانا جاویگا[1]، اب اس میں کوئی محذور نہیں رہا، نظیرہ فی رد المحتار عن الولوالجیۃ دفع دراھم الی خباز الی قولہ ولو اعطاہ الدراھم وجعل یاخذ منہ کل یوم خمسۃ امناء ولم یقل فی الابتداء اشتریت منک یجوز وھذا حلال وان کان نیتہ وقت الدفع الشراء لانہ بمجرد النیۃ لاینعقد البیع وانما ینعقد البیع الاٰن بالتعاطی والاٰن المبیع معلوم فینعقد البیع صحیحا، الخ قال الشامی قلت وجھہ ان ثمن الخبز معلوم فاذا انعقد بیعا بالتعاطی وقت الاخذ مع دفع ثمن الشمن قبلہ فکذا اذا تاخر دفع الثمن لاولیٰ ج ۴ ص ۱۸ قلت فیقاس المنافع علی الاعیان باشتراک العلۃ، ۱ شعبان ۱۳۳۱ھ (حوادث اول و دوم ص ۱۱۳)

اشتراط اجرین بر شرطین مختلفین

سوال (۳۰۶) میں وہاں سے آن کر اس انتظار میں رہا کہ جانے کا انتظام ٹھیک ہو جاوے، تو عریضہ تحریر کروں، اب بفضلہ تعالیٰ سب بندوبست ہو گیا ہے

[1] البتہ اگر زراعت بالکل پیدا نہ ہو تب بھی کچھ دیدینا ضروری ہوگا تاکہ یہ تاویل باطل نہ ہو ۱۲ منہ

اور یکم نومبر تک ملنے کا وعدہ ہے، میں نے کہدیا ہے کہ یکم نومبر کو نہ ملے گی تو ایک روپیہ بارہ آنے کے حساب سے دام دوں گا، اور اگر مل گئی تو عہ کے حساب سے دوں گا۔

الجواب، ابھی ہدایہ منگاکر دیکھا تو امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک جائز ہے گو امام صاحب کا دوسرا قول ہے، مگر اس پر بھی عمل درست ہے، خصوص جبکہ کاریگر پر اس کا اثر ہو، اور بدون اس کے احتمال سستی کا ہو، مگر یہ اس وقت ہے کہ سوت اپنے پاس سے دیا جاوے، ورنہ یہ شرط فاسد ہے کہ اگر یکم نومبر کو نہ ملے الخ اگر یہ شق واقع ہو تو بطیب خاطر از سر نو ایجاب و قبول ضروری ہے۔

۲۳ ذیقعدہ ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ص ۱۲۳)

کرایہ سواری کہ بتعین وقت کرایہ کردہ شود وقبل از وقت واپس شود

سوال (۳۸۷) بندہ نے ایک دوکان بائیسکل کی کھولی ہے یعنی بائیسکلیں کرایہ پر چلتی ہیں اور لوگ ۴ر فی گھنٹہ کے حساب سے بائیسکل بندہ سے لیجاتے ہیں، سو اگر کوئی شخص ۱۵ منٹ میں مثلاً بائیسکل واپس لاوے تو اس سے ۴ر بندہ کو لینا جائز ہے یا ایک آنہ مفصل ارشاد ہو؟

الجواب، یا تو جو رواج ہو اس کے موافق کیا جاوے، یا اگر رواج معین نہ ہو تو وقت دینے کے کہدیا جاوے کہ گھنٹہ اور جزو گھنٹہ کا کرایہ مساوی ہے۔ ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ص ۱۲۵)

راہ داری مقرر کردن زمیندار

سوال (۳۸۸) از زمین وراہ کدام زمین دار و مقطعہ دار گلہ گاواں و گوسفنداں وگاڑیاں باردار عبور می کنند از ایشاں راہ داری مقرر کردہ خواہ مخواہ میگیرند ہر سال ہیں راہ داری را باجارہ میدہند مثلاً از ہر گلہ گوسفند خواہ کلاں باشد یا خرد ۲ر واز گلہ گاوان فی۔ ر واز بندگی ۲ر کہ دراں از خریجات غلہ درچوب وآہک وغیرہ اسباب بارکردہ بیارند در شرع چہ حکم دارد؟

الجواب. اگر آن زمین مملوک آن زمیندار است بطریق مشروعی، پس کرایہ اش گرفتن از گزرندگان یا اورا بر کرایہ سالانہ دادن ہر دو امر جائز ست فی الدر المختار باب مایجوز من الاجارۃ وتصح اجارۃ الارض للبناء والغرس وسائر الانتفاعات واگر طریق حق عام است پس محصول گرفتن بر آں حرام است، آرے اگر ایں محصول گیرندہ عابراں را بچیزے مدد کند چنانکہ در بعضے معابر کشتی مملوک می باشد و بر آں کشتی سوار کردہ می گزرانند، کرایہ کشتی گرفتن ہم جائز ست لیکن ہر کہ بدون کشتی گذر کردن خواہد بروجبر کردن حرام باشد۔ (تتمہ اولیٰ ص ۳۱۴)

تحقیق جواز و عدم جواز طبع کردن نسخہائے زائدہ برنگہداشتن کاپی بلا رضائے فرمائش

سوال (۳۸۹) کیا حکم ہے شریعت مطہرہ کا اس میں کہ ایک شخص کا مطبع ہے اور وہ دوسرے کتاب فروشوں کی کتابیں چھپائی کی اجرت لیکر چھاپتا ہے

بعد پوری کتاب طبع کرنے کے بغیر اجازت کے بھی صاحب کتاب کے موجودہ پتھروں پر اپنی حسب ضرورت پانچ سو اور ایک ہزار چھاپ کر فروخت کر ڈالتا ہے، ایسی کتابوں کا خریدنا تاجر کتب کو واقفیت کی حالت میں کیسا ہے، عدم واقفیت کی حالت میں کیسا ہے، چھاپنے والا کہاں تک مجرم ہے؟

الجواب: قواعد سے اس میں تفصیل معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ اگر معاملہ کی یہ صورت ہوئی ہو کہ صاحب مطبع نے کہا ہم اتنے روپے میں اتنی کتابیں چھپی ہوئی تم کو دیں گے، تو یہ استصناع ہے، اور فرمائش کے مطابق جتنی کتابیں صاحب فرمائش کو دے گا وہی اس کی ملک ہوں گی، اور باقی سب سامان مالک مطبع کی ملک ہے، اس میں جو چاہے تصرف کرے، اس تصرف میں یہ بھی داخل ہے کہ بغیر اجازت صاحب فرمائش کے ان پتھروں پر جتنی کتابیں چاہے چھاپ لے، بلکہ یہ شرط ٹھہرانا کہ اور کتابیں نہ چھاپی جاویں، قاعدہ سے مفسد عقد ہے، البتہ اگر اس فعل سے صاحب فرمائش کا غالب ضرر یا خسارہ ہو تو اس صورت میں دوسرے قاعدہ کی بنا پر کہ اپنی ملک میں بھی ایسا تصرف درست نہیں جس سے دوسرے کا ضرر ہو، یہ چھاپنا درست نہ ہوگا، جیسا اپنی دیوار میں دریچہ کھولنا جس سے ہمسایہ کی زیادتی ہو فقہاء نے منع لکھا ہے، اور اگر معاملہ کی یہ صورت ہو کہ جتنا اخیر تک صرف ہوگا اس کا نفع حساب کے مطابق کیا جاوے گا تو اس صورت میں کاپی کی روشنائی جس قدر پتھر پر لگی ہے وہ صاحب فرمائش کی ملک ہے، اس سے انتفاع بلا اس کی اجازت کے درست نہیں، اگر اس صورت میں چھاپے گا تو گنہگار ہوگا، مگر چونکہ اس پتھر پر برملین پھیرا جاتا ہے، اس لئے صرف انتفاع کا گناہ ہوگا، لیکن ان کتابوں میں کوئی خبث نہ آوے گا، اس میں اس کی ملک بھی طیب ہے اور دوسرے خریدار کو بھی خریدنا اس کا درست ہے، البتہ چونکہ یہ خریدنا ایک بعید درجہ میں اعانت کا سبب ہے اس صاحب مطبع کی، اس لئے نہ خریدنا اولیٰ ہے، واللہ اعلم۔ ۲۷ محرم ۱۳۳۲ھ (حوادث اول ۲ ص ۱۲۸)

حکم اجارہ نقل نویسی | **سوال (۳۹۰)**: بعد سلام مسنون کے عرض ہے کہ کچہری کے ملازم جو کہ نقلیں کرنے پر مامور ہیں، ان کی وہ ملازمت جائز ہے یا ناجائز ہے، اتنی بات ضرور قابل تحریر ہے کہ بعض

لہ اس کی نظیر یہ ہے کہ ایک شخص کا کپڑا دوسرے کے رنگ میں بلا اجازت رنگ گیا، تو کپڑے والے کو بدون اس کی اجازت کے اس کا استعمال درست نہیں، کیونکہ رنگ اس کی ملک ہے، اگر ایسا کیا تو رنگ کی قیمت صاحب رنگ کو دینا پڑے گی، اسی طرح یہاں بھی اس کاپی کی قیمت عرفیہ صاحب مطبع کے ذمہ ہوگی اور طریقہ اس کی قیمت معلوم کرنے کا یہ ہے کہ پتھر کی قیمت جبکہ وہ کاپی سے خالی ہوگی جاوے، پھر اس کی قیمت جبکہ کاپی جمی ہوگی جاوے، پھر دونوں قیمتوں میں دیکھا جاوے کہ کیا تفاوت ہے، بس وہی تفاوت کاپی کی قیمت ہے ۱۲ منہ

نقل میں سود کا ذکر ہوتا ہے، اور بعض میں نہیں، جبکہ تمام نقلیں سود کی اور بغیر سود کی سائلوں کو دینا ہوتا ہے، اگر یہ ملازمت جائز نہیں ہو تو کوئی شرعی طریقہ جائز ہونے کا تحریر فرمائیے کہ جس میں تنخواہ نقل نویسی کی جائز اور درست ہو جاوے؟

الجواب. نقل کرنا سود کے مضمون کا سائل کے دینے کو یہ اعانت ہے سود کی، یہ تو ناجائز ہے الا لمن لم یکن مخاطبا بحرمتہ، لیکن تنخواہ اس کام کی ایک قاعدہ فقہیہ کی بناء پر حلال ہے، وہی اباحۃ مال غیر المسلم والذمی برضاہ فی غیر دار الاسلام، یکم ربیع الاول ۱۳۳۲ھ (حوادث ا ص ۲۱، تتمہ ث ص ۱۲۲)

حرام بودن اجرت کار حرام

سوال (۱۰۳۹) ملک آسام ایک مقام ہے جہاں چائے کی کاشتکاری ہوتی ہے، وہاں ہزارہا مزدور کام کرتے ہیں، اور وہاں کی آب وہوا بعض کو موافق آتی ہے اور بعض کو نہیں، اور مزدوری بھی بعض باغوں میں کام کرنے والوں کو کافی ہوتی ہے، اور بعض کو نہیں، یہ لوگ وہاں پہونچکر آرام وراحت کا نام تک نہیں جانتے، ان سے کام لینے میں وہ درشتی برتی جاتی ہے جس کے وہ متحمل نہیں ہوسکتے، ان تکالیف سے مجبور آکر اپنے شہر واپس جانا چاہیں تو بلا افسر کی اجازت کے جانے نہیں دیتے چونکہ ان سے پانچ برس کام لینے کی تمسک لکھوالی جاتی ہے، مزدوروں کو وہاں بھیجنے کیواسطے آدمی مقرر ہے، یہ لوگ کوشش کر کے مزدوروں کو بڑی بڑی امیدیں دلوا کر گندہ معاش کا اچھا و بہتر طریق ذہن نشین کرواکر بلکہ مزدوروں کو سمجھا کر کہ چند دن تم اچھی طرح کام کرو تو بہت سا روپیہ اپنے اخراجات ضروریہ سے بچا کر پس انداز بھی کرلوگے وہاں روانہ کردیتے ہیں، روزی کے مارے ان کی باتوں میں آکر چلے جاتے ہیں، وہاں جاکر پچھتاتے ہیں، چونکہ اول تو وہاں کی آب وہوا ہر شہری کے موافق نہیں آتی، دوسرے روزانہ جتنا ان سے کہا گیا اتنا نہیں ملتا، بلکہ ضروری اخراجات بھی نہیں چلتے، تیسرے کام کی سختی حد سے زائد، چوتھے پانچ سال کے اندر اپنے شہر کو واپس نہیں آسکتا، ان مصائب سے اکثر لوگ مرجاتے ہیں زندہ کوئی واپس نہیں آیا، اگر کوئی آیا بھی تو وہی جس کے ساتھ آب وہوا نے اچھا سلوک کیا، یہ بھی دیگر تکالیف مذکورہ کے باعث جاں بلب ہوجاتا ہے، وہ لوگ جو مزدوروں کو بھیجتے ہیں ان کو وہاں کی اصلی حالت سے بالکل واقف نہیں کرتے، اگر ایسا کرتے تو ایک شخص بھی نہ جاتا، اور بھیجنے والوں کو پوری کیفیت معلوم ہے، تاہم اپنا کام چلانے کے لئے اس پر پردہ ڈالتے ہیں، مزدوروں کو ہرے بھرے باغ دکھا کر یوں جان لیتے ہیں، اور مزدور بھیجے کچھ روپیہ مقررہ بھیجنے والے اپنے مساعی کے معاوضہ میں لیتے ہیں، گویا انھوں نے اس کو اپنا کسب مقرر کر رکھا ہے، اس قسم کی روزی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، بالکل حرام ہے مسلمان کو بلکہ غیر مسلمان کو بھی دھوکہ دینا حرام ہے، اور ایسے کام کی تنخواہ بھی حرام ہے، ۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۲ھ (حوادث اول ۲ ص ۴۰)

حکم ملازمت رجسٹری نکاح وغیرہ | **سوال** (۲۹۲) ماقول العلماء رحمہم اللہ تعالیٰ اندریں مسئلہ کہ مسلمان رجسٹرار یعنی قاضی کہ برائے رجسٹری نکاح وطلاق از جانب گورنمنٹ مقرر است زمام اختیار انصرام کار رجسٹری بدست ایشان تفویض است لیکن ایشان را از وظیفہ سرکار گورنمنٹ نصیبے نیست، و نیز چیکہ از بہی دکاغذات رجسٹری گورنمنٹ مسلمان رجسٹرار تا یند نماید آں ہم بقیمت است مفت نیست و اجرت مسلمان رجسٹرار بذمہ آن کسان است کہ متدعی رجسٹری بلینہ نکاح یا طلاق باشند لیکن اختیار تقرر مقدار اجرت گورنمنٹ بدست مسلمان رجسٹرار و مستاجر یعنی متدعی رجسٹری نہ سپردند بلکہ قانونے نہادہ اند کہ اگر رجسٹری بافیس قاضی شود رجسٹری فی زائد از یک روپیہ نیست، اگر بیروں آفس بحسب استدعا متدعیان رجسٹری شود علاوہ رجسٹری فی سہ روپیہ کمیشن فی و بر تقدیر بعد مسافت فی میل سہ آنہ را خرچ مستحق باشد پس ہمدریں صورت اولاً اختیار ایں عہدہ جائز باشد یا نہ، و بر تقدیر جواز مسلمان رجسٹرار بتقرر مقدار اجرت بمقابل قانون گورنمنٹ مختار است و زائد از معینہ گورنمنٹ گرفتن تواند یا نہ و نیز مسلمان رجسٹرار اگر بحسب درخواست بخانہ داعی آمدہ بجہت پیش آمدن امرے کہ مخالف قانون باشد بانصرام رجسٹری قاصر آید پس دریں صورت مسلمان رجسٹرار را خرچ و کمیشن وفی گرفتن، بینوا توجروا۔

الجواب، فی الدر المختار وینصب قاسما یرزق من بیت المال الی قولہ وان نصب باجر المثل یصح لانہا لیست بقضاء حقیقۃ فجاز لہ اخذ الاجرۃ علیہا وان لم یجز علی القضاء ثم قال ولا یتعین واحد لہا لئلا یتحکم بالزیادۃ ولا یشترک الناس تواطئہم کلام دریں مسئلہ در چند جا ست اول خود ایں عمل رجسٹری جائز است یا نہ، جواب آں کہ رجسٹری توثیق است عقد را پس در جواز و عدم جواز تابع عقد است اگر عقد جائز است رجسٹری اش جائز است، دوم آنکہ اجرت گرفتن برآں جائز است، یا نہ، جواب آنکہ حقیقتش کتابت شہادت ست، پس شہادت اگرچہ طاعت واجب است، لکن کتابتش واجب نیست، اجرت برآں جائز است وصرح الفقہاء بجواز اخذ الاجرۃ علی الکتابۃ، سوم آں کہ ایں اجرت گرفتن از اہل معاملہ یعنی ہر کہ رجسٹری خواہد جائز ست یا نہ، جواب آں کہ جائز ست، نظیر آں اجرت

گرفتن تا کم است از طالب ان قسمت و روایت صدر برائے اثبات ہمیں نظیر نقل کردہ شد چہارم آں کہ برائے
ایں غرض یک کس را معین کردن جائز ست یا نہ، جوابش آنکہ اگرچہ ظاہراً و قیاساً علی القاسم ایں ممنوع می
نماید لکن چوں علت منع یعنی لئلا یتحکم بالزیادۃ دریں یافتہ نمی شد لیس لا باس بہ است، پنجم آنکہ اجرت از گور نمنٹ
معین شدن جائز ست یا نہ جوابش آں کہ ایں ہم ظاہراً جائز نباشد لما فیہ من التسعیر المنھی عنہ لکن بنظر
غائر چوں مقصود ازاں نہی از زائد گرفتن ست نہ کہ نہی از کم کردن زیرا کہ اختیاری ست، لہٰذا ایں ہم لاباس
بہ است ششم آنکہ اگر بعارض رجسٹری نشود اجرت گرفتن جائز ست یا نہ، جوابش آنکہ ایں فیس چنانچہ بمقابلہ
کتابت است نیز در حالت سفر بمقابلہ مشقت سفر است، پس ہرگاہ کہ سفر کرد و مانع از رجسٹر از طاہر نشد فیس
گرفتن جائز باشد، ہفتم آں کہ زائد از فیس مقرری تواں گرفت، یا نہ جوابش آں کہ نے لانہ تحکم بالزیادۃ
بغیر رضا العاقد وھو حرام بخلاف المعروف لانہ کالمشروط وقد رضی بحیث دعا فافھم واللہ اعلم

۲۴ جمادی الثانیہ ۱۳۳۲ھ (حوادث اول ص ۱۴۲)

اجرت پٹواریاں بر نقل کھاتہ

سوال (۳۹۳) پٹواریوں کو سرکار سے حکم ہے کہ نقل جمعبندی جو زمیندار
لیتے ہیں اس کی اجرت فی کھاتہ ۲ر آٹھ کھاتہ تک، اگر اس سے زیادہ ہوں تو دو پیسہ فی کھاتہ کے
حساب سے لی جاوے، پٹواریوں کا یہ طریقہ ہے کہ جس کو ایک کھاتہ کی نقل دی جاوے اس سے بھی ایک
روپیہ اور جس کے زیادہ ہوں مثلاً بیس ہوں تب بھی ایک روپیہ لیتے ہیں، اسی طرح اپنی کمی بیشی پوری
کر لیتے ہیں کیا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں اور اقوام سکھ (کافر مشرک) سے اگر زیادہ اجرت جس قدر
چاہیں لی جاوے تو کیا حکم ہے؟

الجواب: دونوں صورت میں نقل لینے والا اگر اس اجرت پر رضامند ہو جاوے اس کا
لینا جائز ہے لان الامر الی المتعاقدین ولا یلزم التسعیر،

۲۹ رمضان ۱۳۳۲ھ (حوادث ا، ۲، ص ۱۵۱)

توجیہ و شرائط جواز پیشہ وکالت

یہ مسئلہ بایں عنوان کتاب الوکالۃ میں درج ہے

فیس داخلہ و خارجہ و تنخواہ کامل باوجود ناقص بودن مدت

سوال (۳۹۴) ملک بنگال میں دستور ہے جب طالب علم داخل
مدرسہ ہوتے ہیں تو اس سے فیس داخلہ علاوہ اس ماہ کے مشاہرہ کے
لیا جاتا ہے، اور مشاہرہ بھی اس ماہ کا اگر ایک دن بھی باقی ہے تو پورا لیا جاتا ہے اگر کسی
دوسری جگہ کوئی طالب علم جانا چاہے تو اگر ماہ کا ایک دن بھی گذر چکا ہو، تو پورا مشاہرہ لیا جاتا ہے
اور اس کے علاوہ فیس خارجہ بھی لیا جاتا ہے، اب یہ دونوں مشاہرہ اور دونوں قسم کی فیس لینا

جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب، اس تاویل سے یہ سب جائز ہے کہ معنی عقد کے یہ کہے جاویں گے کہ اگر اتنا کام کریں گے تب بھی اسی قدر اجرت لیں گے، اور اگر اس سے کم کریں گے تب بھی اسی قدر اجرت لینگے

۹ شوال ۱۳۳۲ھ (حوادث اول ۲ ص ۱۵۵)

استیفاء حق خود بابت عدم واپسی قیمت ٹکٹ زائد از مالک جہاز

سوال (۳۹۵) دخانی جہاز میں ایک شخص سوار ہوا جو کہ کسی کمپنی کا ہے (سرکار کا نہیں) ٹکٹ ماسٹر سے دو آدمیوں کا ٹکٹ مانگا کہ ایک شخص میرا رفیق ہے، وہ آتا ہے، دو ٹکٹ کی فیس (کرایہ) ادا کرنے کے بعد رفیق آیا، اس نے بھی بلا اطلاع اس کے اپنا ٹکٹ لیا، اس لئے ایک ٹکٹ دوہرا ہو گیا، ماسٹر سے کہا گیا کہ ایک ٹکٹ واپس لو کہ زیادہ ہوا، ماسٹر نے انکار کیا اور واپس نہیں لیا، اس لئے یہ شخص چاہتا ہے کہ کسی طرح اپنا حق (ایک ٹکٹ زائد کا محصول) کمپنی سے وصول کرے، وصول کر سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب، کر سکتا ہے۔ (حوادث اول ۲ ص ۱۶۱)

درصورت بالا صاحب حق را کرایہ واجب جہاز دادن

سوال (۳۹۶) دوسرے شخص سے اسی جہاز میں بھول سے محصول نہیں لیا گیا تھا، وہ شخص بخوف مواخذہ آخرت چاہتا ہے، کہ ٹکٹ خرید کرکے نہ جائے، اسی طرح سے مالک تک اس کا حق محصول پہنچائے، اس ماجرے کو مسئلہ اولیٰ والے نے سنا اور کہنے لگا کہ بھائی وہ محصول مجھ کو دو کہ کمپنی پر میرا آتا ہے، اور مسئلہ اولیٰ کی تفصیل بیان کر دی، اب یہ شخص پوچھتا ہے کہ یہ اپنے سوار ہونے کا محصول کمپنی تک نہ پہونچا کر اس مانگنے والے کو اگر دیدے بری الذمہ ہو سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب، نہیں، ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ (حوادث ص ۱۶۲)

اجرت بر رقیہ خصوص مقتدایاں را

سوال (۳۹۷) میرے پاس بعض لوگ تعویذ کرانے آتے ہیں تو میں ان کی حاجت کو سنکر اس حاجت کے مناسب حال کوئی اسم اسماء الٰہیہ سے لکھ کر یا کوئی آیت مناسب لکھ کر یا بالعموم سورہ فاتحہ لکھ کر دیدیتا ہوں کہ اس کو دھو کر پلاؤ، اکثر اکیس روز کے لئے دیتا ہوں، اور ایک روپیہ چار آنہ یا جو مناسب نفع ہو لیتا ہوں، یہ درست ہے یا نہیں میں یہ دیکھتا ہوں کہ اکثر شفا ہوتی ہے۔

الجواب، قبل شفا کے لینے میں تو بدنامی ہے جو مضر دین عوام ہے، اور شفا کے بعد لینے میں یہ محذور تو نہیں لیکن مقتداؤں کے لئے کچھ نامناسب معلوم ہوتا ہے، پس جبتک

حاجت شدیدہ نہ ہو تحرز اولیٰ ہے ۱۲ شعبان ۱۳۳۲ھ تتمہ ثالثہ ص ۶۳)

حکم منی آرڈر در رفع بعض شبہات | یہ مسئلہ باین عنوان کتاب الربوا میں گذر چکا ہے،

جواز ضیافت خاطبین | **سوال** (۳۹۸) جو لوگ دور دراز مقام سے لڑکی کی منگنی کے لئے آویں، بعد گفتگو شرعی طے ہونے کے اور منگنی مشروع ہونے کے اس خیال سے کہ یہ لوگ دور سے آئے ہیں مہمانی کے طور پر اُن کو ایک آدھ بار دعوت دی جائے تو ہمدردی انسانی اور مروت سے بعید نہیں، دعوت دی جاوے تو کچھ شرعی قباحت تو نہ ہوگی، اور اگر بعد منگنی دعوت دینا شرعاً درست ہو تو قبل از منگنی دی جاوے تو جائز ہوگا کہ نہیں، جیسا ارشاد ہو عمل ہوگا،

الجواب، بہ نیت مذکورہ دونوں حالت میں درست ہے قبل منگنی بھی اور بعد منگنی بھی ۳ جمادی الثانیہ ۱۳۳۳ھ (تتمہ رابعہ ص ۳۹)

حق کارندہ | **سوال** (۳۹۹) بوقت تبادلۂ اراضیات یا وصول تحصیل کارندہ کی جو نذرانہ منجانب کاشتکاران بعلم آقا یعنی زمیندار مثل حقوق کے ملتا ہے یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، جائز ہے، (حوادث ا، ۲ ص ۹۹)

سوال (۴۰۰) آقا کے ساتھ کارندہ کو بھی ملتا ہے، یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، برضامندی مالک جائز ہے (حوادث ا و ۲ ص ۹۹)

کرایہ از رعایا | **سوال** (۴۰۱) اپنی اراضی میں اگر کسی شخص کو سکونت کا حق دیا جاوے تو اس کا معاوضہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب جائز ہے جو چیز کہ شرعاً کرایہ قرار پا سکے، (حوادث ا و ۲ ص ۹۹)

اشیاء متفرقہ معینہ گرفتن زمینداران از کاشتکاران در اجارہ | **سوال** (۴۰۲) یہ بھی دستور ہے کہ علاوہ لگان نقد کے فی ہل ایک من بختہ بھوسہ اور ایک جھیر ۱۲ اُپلے اور ایک گھڑا رس اور ایک بھیلی فصل پر لیں، یہ سب حقوق زمینداری کے نام سے موسوم ہیں؛

الجواب، یہ سب جائز ہیں بوجہ معین ہونے کے، ۲۶ شوال ۱۳۳۲ھ (حوادث ثالث ص ۱۰۱)

بعض حقوق زمینداری و اشتراط وقف نفع دوتف برائے خود | **سوال** (۴۰۳) زید نے اپنی جائداد کا عمرو کو بمبادلہ مبلغ سو روپے لگان ٹھیکہ دیا، اور یہ بھی طے پایا کہ اس روپے کے ساتھ ہی ایک گاڑی اُپلے اور ایک جھیرا بھوسہ بھی دیتے ہوں گے، اور جب مال نیشکر ہوگی تو اس سال

ایک بھیلی گڑ کی، اور راب ہو تو پانچ سیر راب پختہ اور ایک گھڑا رس کا، اور جیسے پیسے گئے اور دینے ہوں گے، علاوہ نقد کے، جس قدر اشیاء متذکرہ بالا ٹھہری ہیں ان کا نام حقوق زمینداری ہے تو یہ ٹھیکہ جائز ہے یا نہیں، دیگر یہ کہ زید نے اب اس جائداد کو بحق مدرسہ اس طرح وقف کر دیا ہے کہ اس کا لگان نقد ہمیشہ مدرسہ میں صرف ہوا کرے، اور علاوہ لگان نقد کے دیگر اشیاء مذکورہ بدستور میں لیتا رہوں گا، تو یہ جائز ہے یا نہیں، اس ہی کی ایک صورت یہ ہے کہ واقف خود متولی جائداد بھی ہے بوقت وقف اس نے یہ متعین کر دیا ہے کہ اس جائداد سے جو آمدنی نقد ہے وہ بحق مدرسہ صرف ہو، اور علاوہ ازیں جو دیگر حقوق زمینداری متذکرہ معین ہیں وہ بصرف متولی رہیں تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب، فی الهداية واذا قال للخياط ان خطت هذا الثوب فارسيا فبدرهم وان خطته روميا فبدرهمين جاز واي عمل من هذين العملين فعل استحق الاجر به الخ ج ۲ ص ۲۹۵ اسی قیاس پر اس شرط کے کہ جس سال نیشکر ہوگی الخ یہ معنی ہوں گے کہ اس خاص صورت میں اجرت کی اور مقدار ہے اور اس خاص صورت کے غیر میں اجرت کی اور مقدار ہے، سو یہ جائز ہوگا، اور باقی شرائط بلا تکلف جائز ہیں اور چونکہ واقف کو اپنے لئے کل منافع وقف کی شرط حیات تک ٹھیرا لینا بھی جائز ہے تو بعض منافع کی بدرجہ اولیٰ جائز ہے،

۲۴ ربیع الاول ۱۳۳۳ھ (تتمہ رابعہ ص ۲۰)

حقوق زمینداری بذمہ کاشتکار

سوال (۴۰۵) ابواب وحقوق زمینداری و کاشتکار سے غلہ خرید کرتے ہیں، وہ بازار کے نرخ سے ایک سیر زیادہ لیتے ہیں، اور اگر دانہ بندی کر کے اپنے حق کے غلہ کے ان سے دام لیتے ہیں وہ بازار کے نرخ سے ایک سیر کم کر کے اُن سے قیمت لیتے ہیں، یا بابت کاہ چرائی بکرا لیا جاتا ہے، یا روغن زرد بذمہ کاشتکاران مقرر ہیں، یا اور حقوق ہیں وہ جائز ہیں یا ناجائز؟

الجواب، جو کچھ حقوق زمینداروں نے کاشتکاروں پر مقرر کر رکھے ہیں اگر علاوہ اجرت زمین کے ہیں مثلاً چرائی کا بکرا لیتے ہیں ان کے ممنوع ہونے میں تو کچھ شک نہیں، قال الله تعالیٰ ولا تاكلوا اموالكم بينكم بالباطل الآیہ وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم الناس شركاء في ثلاث في الماء والكلاء والنار الحديث، وتحقيقه في موضعه، اور اگر یہ حقوق اجرت زمین میں داخل ہیں تو اجرت کا معلوم و متعین ہونا، اور وقت عقد تصریح کرنا ضروری ہے، ولا يصح الا ای

الاجرۃ) حتی تکون المنافع معلومۃ والاجرۃ معلومۃ ہدایہ، پس ان حقوق میں سے جو غیر معین ہیں یا قابلیت اجرت ہونے کی نہیں رکھتے جیسے کاشتکار سے ایک سیر غلہ زیادہ لینا یا اپنا کم کرکے دینا وعلیٰ ہذا القیاس، یہ بھی جائز نہیں، اگرچہ شرط کرے، بلکہ شرط کرنے سے اجارہ بھی فاسد ہو جاویگا اور جو حقوق متعین ہوں مثلاً ہم روغن زرد اس قدر لیں گے، پس یہ حقوق اگر وقت عقد یعنی پٹہ لکھنے کے صراحۃً کہدے اور لکھدے اور وہ راضی ہو جاوے جائز ہیں، لقولہ تعالیٰ الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم ورنہ جائز نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم (امداد ص ۷۳، ج ۳)

حلہ کسے کہ دیگرے را بجائے خود نوکر نہد

سوال (۴۰۶) شخصے نوکری خود را استعفا دادہ دیگرے را بجائے خود قائم مقام نمود آں شخص دیگر بدیں احسان او را روپیہ داد آں روپیہ برائے مستعفی رشوت شود یا چہ؟

الجواب: اگر ایں چنیں تبرع مشروط یا معروف نباشد رشوت نیست وگرنہ رشوت و حرام است

(۲۱ ربیع الاول ۱۳۳۴ھ تتمہ رابعہ ص ۱۸)

تدبیر دا کردن تنخواہ ایام غیر حاضری اگر گرفتہ باشد بدون اطلاع غیر حاضری

سوال (۴۰۷) خادم قصبہ کے مدرسہ سرکاری میں نائب مدرس ہے اور سکونت قصبۂ ہذا سے ۵ میل کے فاصلہ پر ہے، ایام تعطیل میں اپنے گھر جانے کا اتفاق ہوا، بارش و دیگر کار خانگی کے سبب ایک یوم زائد علاوہ تعطیل کے صرف ہو گیا، جب ایک روز غیر حاضر رہ کر مدرسہ پہنچا تو ہیڈ مدرس نے زبانی فہمائش کرکے سمجھا دیا کہ آئندہ سے غیر حاضری نہ کرنی چاہئے لیکن غیر حاضری کی رپورٹ نہ مدرس موصوف نے دفتر کو کی، اور نہ کسی نے آج تک اس کی تفتیش کی، اب دل میں خیال آیا کہ غیر حاضری کی تنخواہ اپنے صرف میں نہ لانی چاہئے، پھر کیا کیا جائے، تنخواہ ماہانہ مبلغ بیس روپے ملتی ہے

الجواب: کبھی ایسا کیجئے کہ کچھ معین ایام کی رخصت لے کر ایک روز قبل حاضر ہو کر کام کیجئے اور وہ دن رخصت ہی میں لکھا رہنے دیجئے۔ ۶ جمادی الاول ۱۳۴۲ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۶۹)

عدم جواز فضل منافع دلال را

سوال (۴۰۸) چند بیوپاریوں نے ایک بیوپاری کے پاس اپنا کچھ مال بھیجدیا، اور کہدیا کہ پانچ روپے من فروخت کرکے ہمارے پاس روپیہ بھیجدو، بیوپاری مذکور نے مال مذکور چھ روپے من فروخت کرکے پانچ روپے کے حساب سے مالکوں کے پاس روپیہ بھیجدیا، اور روپیہ من جو زیادہ پڑا وہ خود رکھا، اور اس امر کی مالکوں کو خبر بھی ہو گئی، اور وہ راضی ہو گئے، کیونکہ اصل قیمت حسب دل خواہ ہمارے پاس آ گئی، اور اس نے اپنا حق المحنت رکھا، پس اس طور سے ہمیشہ کوئی

کیا کہے یہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب، یہ مال جو چھ روپے من کو فروخت ہوا ہے، یہ سب روپے مالکوں کا حق ہے کیونکہ ان کے مال کا بدل ہے، اس میں سے بیوپاری مذکور کو فی من ایک روپیہ رکھنا جائز نہیں ہاں اگر مالکوں کو خبر ہو جاوے اور وہ اس کو معاف کردیں، تو بعد معاف کردینے کے اس کو حلال ہو جاویگا، اگر مالکوں کو خبر نہ ہوتی یا وہ معاف نہ کرتے تو اس کو وہ روپیہ حرام رہتا، قال اللہ تعالیٰ ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم الآیۃ، فقط

۵ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ (امداد ص ۶۲ ج ۳)

اسٹامپ انسپکٹر کی ملازمت جائز ہے

سوال (۴۰۹) (از یکے منصف صاحب ساعی عہدہ انسپکٹر اسٹامپ) انسپکٹر اسٹامپ کے فرائض یہ ہیں کہ صوبہ بھر میں دورہ کرنا ہوگا، اور ہر عدالت دیوانی وکلکٹری و سرکاری دفاتر کا معائنہ کرنا ہوگا، اور یہ دیکھنا ہوگا کہ مقدمات دیوانی اور مال میں اور درخواستوں پر سرکاری رسوم یا فیس کافی ادا کی گئی ہے، یا کم ہے، اگر کم ہے تو رپورٹ کرنا ہوگا کہ عدالت یا دفتر متعلقہ فریق قاصر سے وصول کرے۔

الجواب، یہ حقیقت میں اعانت ہے اسٹامپ کی، اور جواز و عدم جواز میں اس کے تابع ہے اب قابل تحقیق اسٹامپ کا حکم ہے، سو غور کرنے سے اس میں گنجائش کی یہ توجیہ ہوسکتی ہے، کہ مقدمات کے فیصلہ وغیرہ میں جو عملہ خرچ ہوتا ہے وہ اہل مقدمہ سے بعوض عمل کے جن کا نفع اہل مقدمہ کو پہنچا ہے وصول کرکے عملہ کی تنخواہ وغیرہ میں صرف ہوتا ہے، گویا اسٹامپ کی قیمت جو احد الفریقین سے وصول کی جاتی ہے، وہ معاوضہ و اجرت ہے، اس کام کی جو عدالت بواسطہ عملہ کے اس فریق کا کام کرتی ہے، پھر عدالت عملہ کو اس کام کا عوض و اجرت دیتی ہے، جو عملہ سے کام لیتی ہے، جیسے منی آرڈر کی فیس، یا ٹکٹ کی قیمت کہ ڈاک خانہ اپنی خدمت کی اجرت لیتا ہے، پھر عملہ کو ان کی اجرت دیتا ہے، اس توجیہ سے جب اسٹامپ میں جواز کی گنجائش ہے تو اسٹامپ کی انسپکٹری میں بھی اسی طرح گنجائش ہے، اور ہر حال میں منصفی سے غنیمت ہے۔

۱۶ ربیع الاول ۱۳۵۵ھ (النور ص ۳۰، ذیقعدہ ۱۳۵۵ھ)

ناجائز ملازمت سرکاری کا حکم

السوال (۴۱۰)، ایک مسئلہ بہت روز سے دریافت کرنا چاہتا تھا اب کے زبانی بھی موقع نہ ملا، وہ یہ کہ عدالتی عہدے خواہ تنخواہ دار ہوں مثلاً سب جج، منصفی، ڈپٹی کلکٹری، تحصیلداری، خواہ بلا تنخواہ مثلاً آنریری مجسٹریٹی غیر مسلم حکومت کے تحت میں قبول کرنے جہاں فیصلے لامحالہ غیر اسلامی قانون کے مطابق کرنا پڑیں گے، کہاں تک جائز ہے، بظاہر تو صورت عدم جواز ہی کی

معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر یہ عہدے سرے سے نہ قبول کئے جائیں، تو امتِ اسلامیہ کے ہی دوسرے مصالح فوت ہوتے ہیں، جناب کی کسی تحریر میں کوئی قول اس باب میں نہیں دیکھا، ورنہ الگ دریافت کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔

الجواب: میں نے اس کے متعلق لکھا تو ہے، مگر اس وقت مقام مجھ کو یاد نہیں، اس لئے اس وقت جو ذہن میں حاضر ہے مختصراً عرض کرتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ بعض افعال ایسے ہیں کہ شرعی کلی قانون سے حرام ہیں، لیکن ضرورت میں شرعاً ہی اس کی اجازت دیدی جاتی ہے، خواہ نصاً خواہ اجتہاداً، جیسے اکل میتہ تناول خمر مخمصہ میں، یا اکراہ میں یا اساغۃ لقمہ غاصہ کے لئے، ایسے ہی افعال میں باقتضاء قواعد مناصب مسئول عنہا بھی داخل کئے جاسکتے ہیں، اگرچہ کوئی نقل جزئی اس وقت میری نظر میں نہیں، مگر کلیات ونظائر سے تمسک ممکن ہے، چنانچہ اس کی نظیر فقہاء نے ذکر کی ہے دفع النائبۃ والظلم عن نفسہ اولی الی قولہ ویوجر من قام بتوزیعھم بالعدل وان کان الاخذ باطلا قولہ ویوجر من قام بتوزیعھا بالعدل ای بالمعادلۃ کما غیر فی القنیۃ ای بان یحمل کل واحد بقدر طاقتہ لانہ لو ترک توزیعھا الی الظالم ربما یحمل بعضھم مالا یطیق فیصیر ظلماً علی ظلم ففی قیام العارف بتوزیعھا بالعدل تقلیل للظلم فلذا یوجر وھذا الیوم کالکبریت الاحمر بل ھو اندر اھ (درمختار وردالمحتار قبیل باب المصرف من کتاب الزکوٰۃ) نظیر ہونا ظاہر ہے کہ مقصود کا فی نفسہ غیر مشروع ہونا اور اہل کے ساتھ میں ہونے سے اشد المفسدتین کا اخف المفسدتین سے متبدل ہوجانا دونوں میں مشترک ہے، البتہ کلام ضرورت میں ہے، اور یہی اہم ہے، سو اس کی تحقیق یہ ہے کہ ضرورت کی عرفی دو قسمیں ہیں، ایک تحصیل منفعت خواہ دینی ہو یا دنیوی، خواہ اپنی ہو یا غیر کی: دوسری دفع مضرت اسی تعمیم کے ساتھ، سو تحصیل منفعت کے لئے تو ایسے افعال کی اجازت نہیں، مثلاً محض تحصیل قوت ولذت کے لئے دوائی حرام کا استعمال، یا اجتماع لاستماع الوعظ کے لئے آلات لہو وغنا کا استعمال ومثل ذلک، اور دفع مضرت کے لئے اجازت ہے جب کہ وہ مضرت قواعد صحیحہ منصوصہ یا اجتہادیہ سے معتد بہا ہو اور شرعی ضرورت یہی ہے مثلاً دفع مرض کے لئے دوائے حرام کا استعمال جبکہ دوسری دوا کا نافع نہ ہونا تجربہ سے ثابت ہوگیا ہو کیونکہ بدون اس کے ضرورت ہی کا تحقق نہیں ہوتا، اور مثلاً مسئلہ منقولہ مذکورہ میں بضرورت دفع ظلم اشد کے توزیع کی، گو وہ بھی ظلم اخف ہے اجازت دی گئی، بس یہی تفصیل واقعہ مسئول عنہا میں سمجھنی چاہئے، کو یہ مناصب

فی نفسہ شرعاً حرام ہیں، جس کی وجہ خود سوال میں بھی مذکور ہے، اور اگر عمل کے ساتھ خاص یہ فاسد عقیدہ بھی ہو کہ حکم قانونی کو بمقابلہ حکم شرعی کے مستحسن و راجح سمجھا جاوے تو کفر ہے، جس کو میں نے بیان القرآن سورۂ مائدہ آیت ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون، کی تفسیر میں بیان بھی کیا ہے، مگر اس وقت کلام صرف اس درجہ میں ہے جو محض معصیت اور حرام ہے، پس فی نفسہ حرام ہونے کے بعد ان کو اگر جلب منفعت مالیہ یا جاہیہ کی غرض سے اختیار کیا جاوے تو کسی حال میں جائز نہیں، اور اگر دفع مضرت کی غرض سے اختیار کیا جاوے کہ امت مسلمہ پر کفار کی طرف سے جو مظالم و مضرات پہنچتے، یہ اہل مناصب بقدر امکان ان کو اگر دفع نہ کر سکیں تو اس صورت میں حکم جواز کی گنجائش ہے واللہ اعلم،

نوٹ:- میں نے یہ مسئلہ کسی نقل جزئی سے نہیں لکھا، استدلال سے لکھا ہے، جس پر مجھ کو اعتماد نہیں، اس لئے مناسب بلکہ واجب ہے کہ دوسرے علماء محققین سے بھی اطمینان کر لیا جاوے اور پھر بھی عمل کرتے وقت حضرت امام مالکؒ کے ارشاد نفعل و نستغفر کو معمول رکھیں،

۲۳ رمضان ۱۳۵۵ھ (النور ص ۷، ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ)

چند ٹکٹوں میں ایک کا سامان ریل میں لیجانا ناجائز ہے

سوال (۴۱۱) پرسوں جب فلاں صاحب یہاں سے جانے لگے تو انھوں نے بسلسلۂ گفتگو مجھ سے یہ کہا کہ میرے ساتھ اسباب بہت زیادہ ہے اگر یہاں سے وزن کرا کے جائے قیام تک لیجاتا تو بہت محصول دینا پڑتا، مگر اب تو چھ سات آدمی اسی گاڑی سے میرے ساتھ سہارنپور جا رہے ہیں، لہذا وہاں تک بلا محصول چلا جائیگا، کیونکہ چھ سات ٹکٹ سے زائد کا اسباب نہیں ہے، سہارنپور سے البتہ تُلوا کر لیجانا ہوگا، میں نے کہا کہ چھ سات آدمیوں سے کیا مطلب، اسباب تو تنہا آپ کا، انھوں نے کہا اس طرح لیجانا جائز ہے، مجھے کچھ علم تو ہے نہیں کہ آگے بڑھتا لہذا خاموش ہو گیا، مگر یہ بات جی کو لگی نہیں، نہ شرح صدر ہوا، چونکہ اس قسم کے واقعات اکثر لوگوں کو پیش آیا کرتے ہیں، اور ممکن ہے مجھ ہی کو پیش آجائے، تو ایسی حالت میں کیا کرنا چاہئے؟

الجواب چونکہ یہ عقد اجارہ ہے، اس لئے مالک کے جائز قانون کے خلاف کرنا جائز نہیں اب یہ امر قابل تحقیق رہ گیا کہ قانون کا حاصل کیا ہے، سو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قانون میں یہ قید تو نہیں ہے کہ وہ مال اسی مسافر کا ہو؛ اسی لئے اگر مسافر کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ یہ کسی دوست کا یا اس کے آقا کا سامان لئے جا رہا ہے، تب بھی اس کو کوئی ذمہ دار منتظم نہ روکے گا، لیکن یہ قید ضرور معلوم ہوتی ہے کہ وہ اسباب اس کی تحویل و سپردگی میں ہو، خلاصہ یہ کہ ملک شرط نہیں مگر قبضہ و نگرانی شرط

ہے، پس اس کا مقتضا یہ ہے کہ صرف معیت سفر کی اور ٹکٹوں کی مبتدا و منتہا کا اتحاد کافی نہیں، بلکہ اگر اسباب سب اس طرح تقسیم کر دیا کہ ہر شخص ایک ایک حصہ مثل اپنے سامان کے اپنی نگرانی میں لیکر سفر کرے تو یہ صورت جائز ہے، اور اگر نگرانی مالک ہی کی رہی تو جائز نہیں، باقی کسی قانون داں سے اگر مزید تحقیق قانون کی کرلی جاوے تو ممکن ہے کہ اس کا حاصل کچھ اس کے خلاف کو مقتضی ہو واللہ اعلم

۱۸ ذیحجہ ۱۳۵۵ھ (النور ربیع الاول ۱۳۵۷ھ ص ۱۵)

اجرت دہانیدن حاکم قاضی یا شاہدان را از فریقین

سوال (۴۱۲) اگر سرکارے برضامندی فریقین عالمے را برائے فیصلہ شرعی منصف سازد و اجرت از فریقین دہانند یا مسلمان را کہ عالم باشد منصف فریقین بہائے تصفیہ شان سازد و اجرت از فریقین ایں منصف را دہانند یا فریقین خود کے را حاکم سازد و چیزے اجرت فیصلہ دہند گرفتن جائز ست، و علیٰ ہذا القیاس شاہدان را بمدعی خرچہ خرچہ می دہانند شاہدان را گرفتن جائز؟

الجواب، اولاً فقہاء رزق القاضی را جائز نوشتہ اند اگر ایں اجرت بقدر کفایت حوائج باشد داخل رزق القاضی ست در جوازش شبہ نیست و ہمچنیں شاہدان را بقدر خرچہ راہ و خوراک سفر گرفتن جائز ست و زیادہ ازیں اجرت ست بر شہادت چوں شہادت عبادت ست مثل قضا براں اجرت گرفتن جائز نباشد،

۷ شعبان ۱۳۲۱ھ (امداد ج ۳ ص ۸۱)

طبیب و عطار میں چہارم کا معاملہ

سوال (۴۱۳) حکیم و عطار میں جو چہارم کا معاملہ طے ہو جاتا ہے یعنی حکیم، عطار سے یوں کہتا ہے کہ جس قدر ہم تمہارے یہاں نسخہ جات بذریعہ مریض روانہ کریں اس کی قیمت وصول ہو، اس میں سے چہارم ہمکو دینا، چنانچہ اس کو عطار تسلیم کرلیتا ہے، تو اب فرمائیے کہ یہ چہارم عطار کو دینا اور حکیم کو لینا درست ہے یا نہیں؟

الجواب، درست نہیں، ۲۵ شعبان ۱۳۲۶ھ (تتمہ اولیٰ ص ۲۰۱)

فیس مقدمات

سوال (۴۱۴) گھر کے بعض تعلقات پھر سرکاری بھی کسی قدر تعلقات ہیں، جو کہ حکومت کا معاملہ ہے پانچ روپیہ تک جرمانہ کرنا اور ایک شبانہ روز قید کرنے کی اقتدار ہے، اس میں ہر مقدمہ میں ایک روپیہ فریادی سے لیا جاتا ہے، جو کہ بحکم سرکار ہے، اس کا حکم شرعی حضور سے بذریعہ مولوی محمد دریافت کیا تھا حضور نے یہ جواب لکھا تھا کہ یہ عہدہ اور یہ فیس ایک تاویل سے درست ہے مگر تصریح اس کی نہیں فرمائی گئی تھی، مولوی محمد نے جو سمجھا تھا وہ بیان کیا تھا، لیکن حضور کی طرف سے اگر اس تاویل کی تصریح فرمائی جاوے تو اطمینان کی صورت میں وہ عہدہ رکھا جائے۔

الجواب، وہ تاویل وہی ہے جو آج کے فتوی یعنی ۳۹ سنہ ۳۸ میں لکھی ہے کہ استیلاء بواسطہ نائب کے ہے۔

۲۵ ذی قعدہ ۱۳۳۸ھ (حوادث اول ۲، ص ۱۱)

تقسیم تنخواہ درمیان سوار و مالک

سوال (۴۱۵) میرا ایک ہمشیر زادہ میرے گھوڑے کا بارگیر ہے اور میں اس کا سلحدار ہوں، یعنی گھوڑا میرا ذاتی ہے، اور وہ نوکری کرنے والا سلحدار کی ماہوار مقرر ہے، اس میں ۱؎ بعوض خدمت سرکار سے بارگیر کو دیئے جاتے ہیں، اور باقی مجھ سلحدار کو، اب عرض یہ ہے کہ میرا بارگیر تارک الصوم والصلوٰۃ زناکار، تشم باز، ریش تراش، گرفتار افعال ممنوعہ و رسوم قبیحہ ہے، میں نے برسوں اس کو زجر و توبیخ و تنبیہ و سزا و معطل سازی و ترک معاملات وغیرہ کی سزا دی اور اقرار نامے لئے کہ آئندہ نماز روزہ احکام شرع برابر ادا کروں گا اور گھوڑے کو اچھی حالت میں رکھوں گا اور رقم سلحداری ماہ بماہ بھیجوں گا، وغیرہ الخ لیکن اس نے جملہ اقراروں کے خلاف عمل آوری کی اور کر رہا ہے، کوئی تغیر و تبدل اُس کے افعال میں نہیں ہوا، بلکہ روز افزوں حالت شنیعہ میں گرفتار ہے، گھوڑے کو لاغر کر دیا ہے، اور میری معتدبہ رقم کھا گیا ہے میں اس کو برطرف کر دینے کے ارادہ میں ہوں لیکن میری والدہ صاحبہ جو میرے بارگیر کی نانی ہیں اس سے سخت رنجیدہ و بددعا کناں رہتی ہیں، حضرت چونکہ میرے راہ نمائے دین و دنیا ہیں، ان حالات پر نظر فرما کر جو ارشاد فرماویں گے اس پر عمل کروں گا اور مزید شکریہ ادا اور غرق بحر ذغار احسان عظیم رہوں گا؟

الجواب، اس کے اوپر کے سوال کا جو جواب لکھا گیا ہے، اسی کی بناء پر اس تقسیم تنخواہ کی یہ تاویل ہو سکتی ہے، کہ تنخواہ تو کل کی کل بارگیر کا حق ہے مگر وہ آپ کے گھوڑے کا کرایہ ہے، اگر یہ تاویل کسی وجہ سے نہ چل سکے تو خود یہ معاملہ ہی جائز نہیں، اور اگر کوئی امر مانع تاویل نہ ہو تو اس صورت میں ان افعال شنیعہ کا وبال خود اس بارگیر پر ہوگا، آپ کیوں پریشان ہوں البتہ گھوڑے کی لاغری کے سبب اگر آپ اس کو موقوف کرانا چاہیں تو دوسری بات ہے، اور اس صورت میں ماں کی اطاعت فرض نہیں، کیونکہ دابہ کا حق تلف کرنا معصیت اور لا طاعۃ للمخلوق فی معصیۃ الخالق۔

۲۳ جمادی الاخری ۱۳۳۷ھ (حوادث اول ۲، ص ۱۰۱)

اگر کوئی لفافہ بیرنگ ہونے سے بچ جائے

سوال (۴۱۶) اگر کوئی لفافہ بیرنگ ہونے سے بچ جائے اور قانوناً وہ بیرنگ ہونا چاہئے تھا مثلاً اس پر ٹکٹ لگا ہوا نہیں تھا تو اس شخص کے ذمہ ۰ کا

ٹکٹ تلف کرنا ہے یا ایک آنہ کا۔

الجواب، عقد اجارہ کاتب و مرسل کے ساتھ منعقد ہوا ہے اجرت اُس کے ذمہ واجب ہے نہ کہ مکتوب الیہ کے اس کا ادا کرنا نیابۃً و تبرعاً ہوتا ہے اور اجارہ مختلف باختلاف الشروط جائز ہے پس عدم تعجیل ادائے اجرت میں جو ایک آنہ مقرر ہے وہ بذمہ کاتب واجب ہے۔ ۲۵ شوال ۱۳۳۵ھ

کتاب الدعویٰ

حکم دعویٰ اقارب بعد سکوت وقت بیع عقار

سوال (۴۱۷) ایک شخص نے اپنی جائداد موروثی سکنی و زرعی کو مختلف اوقات میں اپنی بہن حقیقی کی جس کی عمر اب زائد از تیس سال اور خاوند و اطفال والی ہے، موجودگی اور علم کی حالت میں بذریعہ بیع جائز اپنے عزیز رشتہ دار اور ہمسایوں کی طرف منتقل کر دی، اور عرصہ زائد گیارہ سال میں ہر ایک مشتری کے مالکانہ تصرف میں زمین مبیعہ اس صورت سے آ گئی کہ زمین مسکونہ پر مکانات بن گئے، اور زمین مزروعہ پر درخت لگ گئے، اور کاشت کی آمدنی وصول کرتے رہے، بالفعل بائع جائداد مذکور نے اپنی بہن حقیقی کے ساتھ بوجہ بدنیتی اور طمع فاسد کے سازش کر کے دعویٰ وراثت شرعیہ کا کرایا، اور تمادی قانونی سے محفوظ رہنے کی وجہ سے اپنی بہن مدعیہ کی عمر بست سالہ اور اپنی والدہ کے انتقال کو اندر میعاد بارہ سال کے بیان کیا حالانکہ مدعیہ کی عمر زائد از ۳۲ سال اور اس کی والدہ کے انتقال کو سترہ سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے، مدعیہ کا باوجود ایسے طور پر علم بیع ہونے اور تصرف خریداروں کے ایک عرصہ دراز تک چپ رہنا شرعاً بجائے اقرار و اعتراف و تسلیم بیع کے ہے یا نہیں؟ چند روایات بغرض استفادہ لکھی جاتی ہیں، باع عقارا و امراتہ او ولدہ او بعض اقاربہ حاضر یعلم البیع و وقع التقابض بینھما و تصرف المشتری فی ذلک زمانا ثم ادعی من کان حاضرا عند البیع انہ عقارلہ ولم یکن للبائع لا تسمع دعوی المدعی لان حضورہ عند البیع و ترک المنازعۃ اقرار منہ انہ ملک للبائع و قیل سکوتہ فی ھذہ الحالۃ کالافصاح بالاقرار دلالۃ قطعا للاطماع الفاسدۃ لاھل العصر فی الاضرار بالناس و فی الجامع الصغیر سکوت المالک فی ما اذا باع رجل ملکہ وھو حاضر لا یکون رضی بالبیع وھذا فی غیر الاقارب (خزانۃ المفتین) حاضر باع شیئا و زوجتہ او بعض اقاربہ ساکت ثم ادعاہ لا یسمع واختار القاضی فی فتاواہ انہ یسمع فی زوجتہ لا فی غیرھا و ائمۃ خوارزم ما ذکرناہ بخلاف الاجنبی فان

سکوته وقت البیع والتسلیم لایکون رضیً من البزازیة فی نکاح البکر السکوت کالاذن الا فی ثلثین مسئلة مذکورة فی العمادیة وجامع الفصولین وغیرهما الاولیٰ سکوت البکر عند تزویجها الثانیة والثالثة ان قال الثانیة والعشرون سکوت القریب عند بیع عقار بحضرته وکذا سکوت احد الزوجین الثالثة والعشرون سکوت من رأی غیره یتصرف زمانا فی ملکه ثم ادعی انه ملکه الرابعة والعشرون سکوت المالك اذا رأی غیره یبیع متاعه الخ کذا فی الفتاوی الظهیریة من الفوائد الزینیة لابن نجیم،

الجواب، فی الشامیة عن الاشباه (۴۴۴) سکوته عند بیع زوجته او قریبه عقاراً اقرار بانه لیس له علی ما افتی به مشائخ سمرقند خلافاً لمشائخ بخارا فلینظر المفتی ای لاختلاف التصحیح کما سیذکر الشارح لکن المتون علی الاول فقد مشی علیه فی الکنز والملتقی اٰخر الکتاب فی مسائل شتی واحترز بالبیع عن نحو الاجارة والرهن (۴۲۵) رأه یبیع عرضا اودارا فتصرف فیه المشتری زمانا وهو ساکت تسقط دعواه ای ان الاجنبی کالجار مثلا لایجعل سکوته مسقطا لدعواه بمجرد رؤیة البیع بل لابد من سکوته ایضا عند رؤیة تصرف المشتری فیه زرعا وبناء بخلاف الزوجة والقریب فان مجرد سکوته عند البیع یمنع دعواه اه وفیها ایضا عن البزازیة فی اٰخر الفصل الخامس عشر من کتاب الدعوی اذا باع عقارا او امرأته او ولده حاضر ساکت الی ان قال بعد حکایة اختلاف الفتوی ما نصه وفی الفتاوی یتامل المفتی فی ذلك فان رای المدعی الساکت الحاضر ذا حیلة افتی بعدم السماع لکن الغالب علی اهل الزمان الفساد فلا یفتی الا بما اختاره ائمة خوارزم اه وفیها ایضا قلت لکن لایلزم من غلبة الفساد ان لایوجد من یعلم حاله بالصلاح وعدم التزویر تامل اه،

ان روایات سے چند امور معلوم ہوئے :۔ ۱ یہ حکم کہ بیع کے وقت زوجہ یا کسی عزیز قریب کا سکوت کرنا گویا ان کا اقرار ہے کہ مبیع ملک بائع ہے یہ حکم اصلی نہیں ہے، بلکہ معلل ہے علت کے ساتھ کہ قرینہ تسلیم ہے، ۲ یہ کہ مختلف فیہ ہے، ۳ یہ کہ جنھوں نے اس کی تصحیح کی ہے بوجہ عارض یعنی غلبہ فساد زمان کے کی ہے، ۴ چونکہ فساد غالب ہے اسی لئے مناسب اسی پر فتویٰ دینا ہے، ۵ یہ کہ اگر قرائن قویہ سے مدعی کی صلاحیت معلوم ہو جاوے تو اس پر فتویٰ نہ ہوگا، میں کہتا ہوں کہ امور خمسہ ثابتہ سے لازم آگیا کہ اگر مشتری کو قرائن و شہادت قلب سے معلوم ہو جاوے کہ بائع

کی قرابت دار مدعی کا واقع میں اس مبیع میں حق ہے، اور یہ بھی معلوم ہو جاوے کہ اس کا سکوت بیع کے وقت کسی لحاظ و دباؤ سے تھا، اجازت و اذن بطیب خاطر اُسے نہ تھا، تو اس صورت میں اس کے حق کے قدر کا امساک اس مشتری کو حلال نہ ہوگا، اور اگر اس کا حق ہی ثابت نہ ہو تو اس صورت میں اس کا وہ سکوت اقرار بملک بائع سمجھا جاوے گا، اور اگر حق ثابت ہوا اور سکوت کسی دباؤ سے نہ ہو، تو سکوت گو اقرار بملک بائع نہ ہوگا، مگر اجازت لبیع الفضولی ہوگی، جو موجب نفاذ بیع و قاطع حق مدعی ہے، اس تفصیل سے سوال کی سب شقوق کا جواب ہو گیا، فقط واللہ اعلم، ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۱ھ (امداد، ج ۳، ص ۲)

عدم خروج شے از ملک بنام دیگرے کردن

سوال (۴۱۸) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عمرو نے بوجہ بغاوت حاکم وقت اپنی جائداد بغرض محفوظی زید اپنے برادر زادہ حقیقی کے نام کرادی اور ہمیشہ وہ جائداد بقبض و تصرف عمرو رہی، اور کبھی قبضہ زید کا مالکانہ اس پر نہیں ہوا اب زید بعد وفات عمرو فقط اس وجہ سے کہ وہ جائداد اس کے نام بغرض مذکور کرادی تھی، وارثان عمرو سے دعویٰ ملکیت کرتا ہے تو اس صورت میں ملک اس کی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اور یہ دعویٰ اُس کا صحیح و درست ہے یا نہیں؟

الجواب، اس صورت میں عمرو نے محفوظی جائداد کے واسطے ایک حیلہ کیا ہے، پس زید کسی طرح اس جائداد کا مالک نہیں ہو سکتا، کیوں کہ نہ تو استیلاء حاکم اس جائداد پر پایا گیا، کہ یوں کہیں کہ حاکم کی طرف سے زید کی ملکیت ہو گئی، اور نہ قبضہ زید کا اس جائداد پر مالکانہ پایا گیا، پس دعویٰ زید کا غلط ہے، اور وہ جائداد وارثان عمرو کی ہے، فقط (امداد، ج ۳، ص ۷۶)

ایضاً مثل بالا

سوال (۴۱۹) کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مرد مسلمان جو کچھ نقد و جنس اپنی آمد و تجارت یا نوکری وغیرہ کے ذریعہ سے پیدا کر کے بغرض حفاظت اپنی زوجہ کے تحویل میں رکھے، یا کوئی جائداد بغرض انتظام و حفاظت اپنے روپیہ سے خرید کرے، اور بیعنامہ میں زوجہ کے نام تحریر کرائے اور اس جائداد کی آمدنی بھی اپنے خرچ خانگی میں صرف کرتا ہے، اور جب زوجہ مذکور بقضائے الٰہی انتقال کر جائے تو وہ مرد مسلمان اس جائداد کو اپنے قبضہ و تصرف میں رکھے، تو ایسی حالت میں اس شخص کے پسر جو اس زوجہ کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں اپنی والدہ کا ترکہ سمجھ کر کہ بیعنامہ میں زوجہ کا نام لکھا دیا تھا، اپنے باپ سے واپس مانگتے ہیں، اور شوہری حصہ ایک ربع دیتے ہیں، لہٰذا وہ جائداد شرعاً اس مرد مسلمان کی ہے یا اس کی زوجہ کی، اور مہر زوجہ

ادا ہو گیا تھا، اس کا جھگڑا اس میں کچھ نہیں

الجواب، اگر واقعہ مطابق صورت مذکورہ سوال کے ہے تو زوجہ کے حق میں کوئی امر اسباب ملک سے نہیں پایا گیا، یعنی نہ وہ مشتری ہے، اصالۃً یا وکالۃً، اور نہ یہ ہے کہ شوہر نے بطور اشترا فضولی کے اس کی طرف سے خریدا ہو اور اس نے اس بیع کو اپنی طرف سے جائز رکھا ہو، پھر خواہ ثمن خود دیتی یا تبرعاً کوئی دوسرا دیدیتا، اور نہ زوج کی طرف سے کوئی صیغہ ہبہ پایا گیا، اور نہ زوج کی جانب سے کوئی اقرار اس کا کہ یہ جائداد زوجہ کی ملک ہے پایا گیا، اور یہی اسباب ملک کے اس صورت میں ہو سکتے تھے جو منتفی ہیں، تو جائداد ملک زوج کی ہے، زوجہ کی نہیں، البتہ اگر اسباب مذکورہ میں سے کوئی امر باقرار زوج کے یا ورثہ زوجہ کے بینہ یعنی گواہ قائم کرنے سے ثابت ہو جاوے تو اس وقت جائداد ملک زوجہ کی ہے، اور میراث جاری ہوگی، ہذا کلہ ظاہر واللہ تعالیٰ اعلم،

۱۷ جمادی الاخری ۱۳۲۵ھ (امداد، ج ۳، ص ۷۰)

حق خود گرفتن بحیلہ از غیر جنس | **سوال** (۳۰۴) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے بکر کو کہا کہ فلانی زمین میرے دادا کی تیرے دادا نے بہ ورا پنے قبضہ و تصرف میں کر کے کچھ غلہ مقرر کر لیا تھا، وہ ملتا بھی رہا. اب عرصہ چالیس بیتالیس سال سے وہ بھی نہیں ملا، بکر نے جواب دیا کہ اس حال کی مجھ کو بالکل خبر نہیں، نہ میں نے کبھی اپنے موروثوں سے سنا نہ کوئی کاغذ ایسا دیکھا، اور نہ کسی سے ثابت ہوا، اور زمانہ حیات موروث میں کیوں دعویٰ نہ کیا، اور اس زمانہ میں بکر کے دادا کی جائداد ورثہ پر بھی تقسیم ہو گئی ہے، مگر زید کا دعویٰ صرف بکر سے ہے، اس بنیاد پر اگر بفریب و جھوٹ کوئی مقدمہ عدالتی حکام وقت زید بکر پر قائم کر کے نقد روپیہ وصول کرے، تو اس کو جائز ہے یا نہیں،

فقط ظہیر الدین، از انبہٹہ،

الجواب، اگر زید اس دعویٰ میں سچا ہے تو جس حالت میں کہ وہ زمین سب ورثہ میں منقسم ہے فقط بکر پر دعویٰ کرنا جائز نہیں، مدعا علیہم سب ہیں، سب سے دعویٰ کر کے اول تو اگر کسی طور پر ممکن ہو تو وہ زمین ہی لے لے، اور اگر نہ ہو سکے تو جھوٹا مقدمہ قائم کر کے تو روپیہ وصول کرنا جائز نہیں، ہاں بقدر اپنے حق کے روپے ورثہ سے چھین لے یا چرا لے یا کسی حیلہ کر لے، مثلاً قرض کا بہانہ لے کر پھر نہ دے یہ جائز ہے، یعنی جتنے جتنے کسی وارث کے پاس ہیں بقدر اس کی قیمت کے اس سے لے لے، مگر احتیاط کرنا یعنی روپیہ نہ لینا بہتر ہے، کیونکہ صاحب حق کا خلاف جنس سے لینا مختلف فیہ ہے، فی کتاب الحجر من الشامی قال الحموی فی شرح الکنز

نقلاً عن العلامة المقدسی عن جد الاشقر عن شرح القدوری للاخصب ان عدم جواز الاخذ من خلاف الجنس کان فی زمانهم لمطاوعتهم فی الحقوق والفتویٰ الیوم علی جواز الاخذ عند القدرة من ای مال کان لاسیما دیارنا لمداومتهم العقوق قال الشاعر عفاء علی هذا الزمان فانه زمان عقوق لا زمان حقوق وکل رفیق فیه غیر مرافق وکل صدیق فیه غیر صدوق ج ۵ ص ۹۹ ولیس لذی الحق ان یاخذ غیر جنس حقه و جوزه الشافعی وهو الاوسع ۱۲ درمختار قوله وجوزه الشافعی قدمنا فی کتاب الحجر ان عدم الجواز کان فی زمانهم اما الیوم فالفتویٰ علی الجواز ۱۲ شامی جلد خامس ص ۲۷۱

۴ ربیع الثانی سنہ ۱۳۲۸ھ (امداد، ج ۳، ص ۷۷)

تحقیق عدم سماعت دعویٰ بعد میعادی

سوال (۴۲۱) قدیم زمانہ میں جب کہ معاملات کے انفصال کا شریعت پر حصر تھا، تمام معاملات اور دعاوی میں سوائے اوقاف اور ایسے دعاوی کے جو منافع عام کے متعلق ہیں سماعت کے لئے پندرہ سال تک تحدید کردی گئی تھی جس کو علماء شریعت نے (مرور زمان) سے تعبیر کیا ہے، اور عملدرآمد اسی پر رہا ہے، کہ اگر مدعا علیہ اس قدر میعاد گذرجانے کی وجہ سے قابل سماعت نہ رہنے کا عذر پیش کرتا تھا، تو عذر اس کا مسموع ہوتا تھا، بالفعل عثمانی حکام شریعت اور حکام عدالت دیوانی اس تحدید کے پابند ہیں، سہولت کے لئے چند معتبر کتب شرعیہ کا حوالہ بھی ذیل میں دیا گیا ہے اگر جناب کے نزدیک بھی عملدرآمد اسی پر ثابت ہوجاوے، اپنے قلم یا مہر سے اس پرچہ کو مزین فرمادیں فی فتاوی العتابی لا تسمع الدعوی بعد ست وثلاثین سنة ولکن المختار الآن ان لا تسمع بعد خمس عشرة سنة الا بالامر السلطان وعلیه الفتویٰ، بزازیه من کتاب الدعوی ورد الامر من السلطان بعدم سماع حادثة لها خمس عشرة سنة وقد افتیت بعدم سماعها النهیه من البحر فی کتاب الدعوی القضاء یجوز تخصیصه وتقییده بالزمان والمکان واستثناء بعض الخصومات کما فی الخلاصة فعلی هذا لو امر السلطان بعدم استماع الدعوی بعد خمس عشرة سنة لا تسمع الاشباه والنظائر وهکذا فی الظهیریة لان السلطان نهی عن کل بسماع الدعوی بعد خمس عشرة سنة فیکون الافتاء بقول الشارع لا القانون نقط

الجواب: فی الدر المختار (فرع) القضاء مظهر لا مثبت ویتخصص بزمان ومکان وخصومة حتی لو امر السلطان بعدم سماع الدعوی بعد خمسة عشر فسمعها لم ینفذ قلت فلا

تسمع الآن بعدها لاباء مر الخ اس روایت سے حکم مسئول عنہ کی لم او حقیقت اور مبنیٰ اصلی منکشف ہو گیا یعنی چونکہ ولایت قاضی کی مستفاد ہوتی ہے، امر سلطانی سے تو جس قدر سلطان نے اس کو اختیارات دیئے ہیں، ان سے زائد میں وہ قاضی ہی نہیں، اسی لئے اس کے احکام ان امور میں نافذ ہوں گے، پس جب سلطان نے اس کو کہدیا کہ اتنی مدت کے بعد تم دعویٰ مت سننا، اور بتصریح روایت فقہیہ قضا کی تقیید مکان وزمان کے ساتھ جائز ہے، اس لئے معنیٰ کلام سلطان کے یہ ہوئے کہ تمہاری قضا خاص ہے، ان ہی واقعات کے ساتھ جو اس میعاد کے اندر ہوں، اور دوسرے واقعات میں ہم تم کو قاضی نہیں بناتے، یہ وجہ ہے قضا نافذ نہ ہونے کی، اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقع میں صاحب حق کا حق زائل و باطل ہو جاوے یا خود سلطان کو اس قید کا رفع کرنا جائز نہ ہو، چنانچہ قول الاباء مر خود اس کا صریح مؤید ہے، اور جب اس حکم کی علت معلوم ہو گئی تو یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ تقیید اسی وقت اور اسی شخص کے حق میں ہے، جو اس سلطان کا محکوم ہو، اور جب تک وہ سلطان زندہ رہے اور اپنے اسی حکم پر قائم رہے، اور اگر کوئی حاکم و قاضی اُس سلطان کے دائرہ حکومت سے خارج ہو، یا وہ سلطان مرجائے جس کے مرنے سے بتصریح فقہاء اس کا حکم مرتفع ہو جاتا ہے یا خود وہ سلطان اپنا حکم منسوخ کر دے ان صورتوں میں یہ حکم نہیں، خلاصہ یہ ہو کہ حکم مقصود شرعی نہیں بلکہ شعبہ ہے توکیل بامر خاص کا، چنانچہ عبارت سوال میں سے یہ قول لان السلطان لم یوکل الخ اس کی صریح دلیل ہے اس بنا پر غیر حدود سلطنت عثمانیہ میں ان روایات کو حکم فقہی سمجھ کر عمل کرنا جائز نہیں، اور حدود عثمانیہ میں بھی صرف قضاۃ پر عمل واجب ہے، نہ اہل حقوق پر۔ (امداد ج ۳، ص ۸۰)

کتاب الصلح

تحقیق کفایت تحلیل اجمالی الخ

سوال (۴۲۲) بندہ کو یاد ہوتا ہے کہ بندہ نے زبانی یہ دریافت کیا تھا کہ جس شخص پر کسی کا مالی حق ہے اور ظاہر کرنا اس کا صاحب حق کو مناسب نہ ہو تو اس سے مدیون یہ کہدے کہ جس قدر تمہارے حقوق مجھ پر ہیں وہ کل معاف کر دو تو حضور نے یہ فرمایا تھا کہ غیبت وغیرہ حقوق تو اس سے معاف ہو جاویں گے مگر مالی حقوق میں تصریح کی ضرورت ہے اگر یہ یاد بندہ کی صحیح ہے تو یہ پرچہ ملفوفہ کی بعض عبارات اس پر دال ہیں

کہ مالی حقوق بھی بغیر تصریح کے معاف ہو جائیں گے۔ یہ پرچہ اسی سوال پر ایک مولوی صاحب نے دیا ہے نہ ان کو حضور کے جواب کی اطلاع ہے نہ مباحثہ مقصود ہے بلکہ تحقیق مسئلہ ہی ضرورتاً مقصود ہے اور اگر یہ میری یاد غلط ہے تو جواب میں اطمینان ہے۔ وہ عبارت یہ ہے قال جعلتك فی حل الساعة اوفی الدنیا بری فی الساعات کلها وفی الدارین خلاصة غصب عینا فحلله مالکها من کل حق هو له قبله قال ائمة بلخ التحلیل یقع علی ماهو واجب فی الذمة لا علی عین قائم کذا فی القنیة وعن محمد رحمه الله تعالیٰ اذا کان لرجل علی اخر مال فقال قد حللته لك قال هو هبة وان قال حللتك منه فهو براءة کذا فی الذخیرة من الجزء الثانی من تکملة رد المحتار

سوال (۴۲۳) بطلان ابراء عن الاعیان — کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ مسماۃ ہندہ کے چار پسر اور ایک دختر تھی اور سب صاحب مال تھے منجملہ چار لڑکوں کے ایک لڑکے نے عرصہ ۱۹ سال کا ہوا انتقال کیا اور دوسرے لڑکے نے عرصہ گیارہ سال کا گذرا کہ انتقال کیا اور دونوں لڑکے صاحب اولاد تھے مسماۃ ہندہ نے جوان کی والدہ تھی اُن کے متروکہ میں کچھ حصہ نہیں لیا بعد ازاں تیسرے لڑکے نے انتقال کیا جس کو عرصہ پانچ سال کا گذرا اور تیسرا لڑکا بھی صاحب مال وصاحب اولاد تھا حسب شریعت جو حصہ لڑکوں اور لڑکیوں کا تھا مال متروکہ تیسرے لڑکے سے ان کو دیدیا گیا۔ سوائے والدہ متوفی کے کہ اس نے حصہ لینے سے انکار کیا اور یہ کہا کہ ہم کو حصہ لینے کی ضرورت نہیں ہم نے اپنا حصہ بحق اولاد تیسرے پسر اپنے کے چھوڑ دیا اور معاف کر دیا ازاں بعد اس تیسرے پسر کے مرنے کے تین سال بعد مسماۃ ہندہ نے انتقال کیا اب مسماۃ ہندہ کا ایک لڑکا اور ایک لڑکی باقی رہے۔ اب قصہ یہ درپیش ہے کہ یہ چوتھا لڑکا اپنی والدہ کی حقیت کا اپنے بھائی تیسرے کے متروکہ میں مدعی بنتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھ کو میری والدہ کی حقیت میں بقدر میرے حصہ کے ملنا چاہئے اور بہن کہتی ہے کہ میں نہیں لے سکتی اس لئے کہ ہماری والدہ نے حصہ لینے سے انکار کیا اور معاف کر دیا۔ اور بحق اولاد پسر اپنے کے چھوڑ دیا۔ اب دریافت طلب چند امور ہیں اول یہ کہ اس صورت مذکورہ میں مدعی اپنی والدہ کی حقیت کا اپنے تیسرے بھائی کے متروکہ میں شرعاً بطریق وراثت کسی حصہ کا مستحق ہو سکتا ہے یا نہیں، دوسرے یہ کہ یہ الفاظ کہ حصہ لینے سے انکار کیا اور معاف کر دیا اور بحق اولاد پسر اپنے کے چھوڑ دیا ہم کو حصہ لینے کی ضرورت

نہیں جُدا جُدا ہر لفظ سے کیا سمجھا جاتا ہے اور مجموعہ الفاظ سے کیا آیا یہ ہبہ سمجھا جاتا ہے یا کچھ اور۔ اور چھوڑ دیا اور حصہ لینے سے انکار کیا اور معاف کر دیا ہر ایک صراحۃً الفاظ ہبہ سے ہے یا نہیں اور بحیثیت مجموعی الفاظ ہبہ ہو سکتے ہیں یا نہیں یا ہبہ کے کسی قاعدہ کلیہ کے تحت میں داخل ہو سکتے ہیں یا نہیں جواب ہر جزو مع نقل عبارات و حوالہ کتب و تعداد صفحات مزین بمواہیر مرحمت فرمانا ضروریات سے ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب۔ فی الدر المختار والابراء عن الاعیان باطل قہستانی وفیہ وقولہ والابراء عن الاعیان باطل معناہ بطل الابراء عن دعوی الاعیان ولو بجعلہ ملکا للمدعی علیہ ولن الوظفر بتلک الاعیان حل لہ اخذھا لکن لا تسمع دعواہ فی الحکم فی رد المحتار ابرأتک عن ھذہ الدار او عن خصومتی فیھا او عن دعوی فیھا وھذا کلہ باطل حتی لو ادعی بعدہ تسمع ولو اقامت بینۃ تقبل اھ تامل ج ۴ ص۳۰۲، و ص۳۰۴، ان روایات سے معلوم ہوا کہ حصہ نہ لینے سے یا الفاظ مذکورہ سوال کہدینے سے والدہ کا حق باطل نہیں ہوا اور جن کے لئے چھوڑ دیا ہے ان کی ملک نہیں ہوا اس لئے وہ خود بھی بعد اس انکار کے اپنا حصہ لے سکتی تھی اور اب اُس کے بعد اس کے ورثہ بھی لے سکتے ہیں، اس تقریر سے سب سوالوں کا جواب نکل آیا۔ ۲۴ رجب ۱۳۳۲ھ (تتمۂ ثانیہ ص۱۵۳)

حکم روپیہ خونِ زخم بعقد صلح

سوال (۴۲۴) دو شخصوں نے مار پیٹ کی ایک کے سر میں سخت چوٹ آئی اور زخم ہو گیا، مجروح نے نالش کر دی اور لوگوں نے اس طرح صلح کرادی کہ تمہیں پچیس روپے مدعا علیہ سے دلوا دیئے جائیں گے تم مقدمہ کو خارج کرادو اس نے صلح کرلی اب وہ روپیہ مدعی کو لینا درست ہے یا نہیں۔

الجواب۔ ایسے زخم میں حکومت عدل ہے جس کا مدار تخمین یا باہمی رضامندی پر ہے اس لئے یہ روپیہ لینا مدعی کو درست ہے۔ ۱۰ ذالحجہ ۱۳۳۱ھ

کتابُ المضاربَت

مضارب سے کوئی خاص مقدار نفع کی ٹھہرانا

سوال (۴۲۵) زید نے مثلاً عمرو کو ایک ہزار روپیہ بایں شرط دیا کہ فی آڑھا ہر لوں گا خواہ عمرو کو نفع ہو یا نقصان مجھکو

ہم آڑا نفع سے کام ہے، اب جس قدر مال عمرو خریدتا ہے اس قدر زید مہاجن کے یہاں تحریر کرادیتا ہے جس وقت ہزار روپیہ کا مال تیار ہو جاتا ہے اس وقت مہاجن حساب کر کے نفع واصل دام وصول کرلیتا ہے اور مہاجن کو مال کے خرید و فروخت سے کوئی نسبت نہیں ہوتی، اس صورت میں زید کو یہ نفع لینا درست ہے یا کیا۔

الجواب:۔ درست نہیں۔

عدم جواز شرکت و مضاربت در مضارب را ربح

سوال (۴۲۶) زید نے چار سو روپیہ تجارت میں لگائے اس روپیہ میں کسی دوسرے کی شرکت نہیں ہے خود زید اس کا مالک ہے اس کے ساتھ ہی عمرو نے اور چار سو روپیہ بطور مضاربت زید کو دیئے کہ اس روپیہ چار سو کا جو نفع ہوگا نصف مالک کا اور نصف مضارب کا ہوگا محنت زید کی ہے اور منجملہ آٹھ سو روپے کے چار سو روپیہ عمرو کا ہے اور محنت سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے ایسی صورت میں اپنے چار سو کا نفع علیحدہ لیکر بقیہ چار سو کا نصف نفع زید نے لیا اور نصف عمرو نے یہ شرکت اور مضاربت جائز ہے یا نہیں۔

الجواب۔ اگر عمرو کو یہ بات معلوم ہے کہ زید اپنی رقم تجارت کے ساتھ ملا کر کام کریگا اور معلوم ہونے کے بعد اس کی اجازت دی تو جائز ہے۔ فی الدر المختار کتاب المضاربۃ لایملك المضارب ۃ الشرکۃ والخلط بمال نفسہ الا باذن اواعمل برایك اذالشئ لایتضمن مثلہ اھ

سوال (۴۲۷) اس ضمن میں دوسرا سوال یہ ہے کہ زید سے ایک تیسرے شخص نے کہا کہ اپنی مجموعی تجارت میں دو سو روپیہ ہمارا شامل کرلو ہم محنت میں برابر شریک رہیں گے اور عمرو سے اس تیسرے شخص کو کوئی تعلق کوئی معاہدہ نہیں ہے نہ اس سے کوئی شرط ہوئی زید نے دو سو روپے کے منافع سے شریک کیا ہے کیا یہ تیسرا شخص عمرو کے روپیہ کا جو منافع بطور مضاربت زید لیتا ہے یہ تیسرا شخص بھی شرعاً باوجود نفی وانکار کے کہ اس میں تمہارا کوئی حق نہیں ہے مستحق ہو سکتا ہے؟

الجواب۔ اس تیسرے شخص کا عمرو کے روپیہ کے نفع میں شریک ہونے کا استحقاق موقوف ہے اس ثالث کے مضارب ہونے پر اور وہ موقوف ہے دو امر پر۔ ایک یہ کہ عمرو زید کو اس کی اجازت دے دوسرے یہ کہ زید اس کا معاہدہ اس ثالث سے کرے اگر یہ شرط نہ پائی جاوے تو

اس ثالث کا اس عمرو کی رقم میں کوئی حق نہیں ہے بلکہ اس ثالث کا خود شریک بلا مضاربت کرنا بھی اذن عمرو پر موقوف ہے۔ کما ذکر فی الجواب عن السوال الاول ۔

(۱۵ صفر المظفر ۱۳۳۲ھ)

روپیہ بنام مضاربت گرفتن و تجارت الخ

سوال (۴۲۸) اگر کسی شخص سے روپیہ اس واسطے لیا گیا ہو کہ تجارت کریں گے اور وہ روپیہ تجارت میں لینے والے نے نہیں لگایا بلکہ اپنے کام میں صرف کرلیا گیا، سال تمام میں لینے والا اس کو کچھ روپیہ دیدے کہ یہ نفع کی بابت ہے اور روپیہ والے کو اس کی خبر نہ ہو تو وہ نفع کی بابت روپیہ لیتا جائز ہے یا نہیں ۔

الجواب۔ بے خبری میں معذور ہے لیکن خبر ہونے کی صورت میں لینا جائز نہیں اور جس نے یہ دھوکہ دیا ہے اس کو ہر حال میں گناہ ہوا اور اس کو اس کا نفع حلال نہیں اور وہ مقروض ہے مال والے کا روپیہ واپس کرنا اس کو واجب ہے۔ ۱۲ شعبان ۱۳۳۱ھ

سوال (۴۲۹) روپیہ جس شخص نے لیا ہے اس کو اس طور سے منافع دینا جائز ہے یا نہیں کہ تجارت میں تو لگایا نہیں اور اپنے کام میں لگا کر بدون نفع ہوئے اپنے پاس سے نفع دیوے

الجواب۔ اس طرح دینا سود ہے کیونکہ وہ روپیہ کام میں لگانے سے قرض ہوگیا باقی خود بلا اطلاع ایسا تصرف حرام ہے جیسا اوپر مذکور ہوا۔ ۱۲ شعبان ۱۳۳۱ھ

عقد مضاربت

سوال (۴۳۰) محمد فخرالدین محمد بشیر نے مل کر ایک اشتہار دیا کہ ہم نے ایک کمپنی قائم کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حصہ لوگ خریدیں اور اس کے روپیہ سے کتاب چھاپ کر بیچیں نفع ہو نفع کے تین حصے ہوں ایک صاحب روپیہ کا۔ دوان دونوں کے لوگوں نے روپیہ دیا فخرالدین محمد بشیر کے درمیان اختلاف ہوگیا۔ دوران اختلاف میں حصہ داران نے بذریعہ تحریر یہ کہا کہ ہمارے روپیہ کا مال محمد بشیر کے سپرد ہونا چاہئے ہم کو فخرالدین پر اعتبار نہیں ہے فیصلہ کرنے والوں نے مال مجموعی حیثیت سے حساب تخمینی لگا کر مال دلوا دیا فخرالدین کے قبضہ سے دیگر فیصلہ کرنے والوں نے ذریعہ فروخت فخرالدین کو دیدیا۔ اور مال حصہ داروں کی خواہش سے محمد بشیر کو دیدیا۔ محمد بشیر کے پاس ذریعہ فروخت نہ تھا اس لئے مال پڑا رہا دیگر ذریعہ پیدا ہونے کے لئے زمانہ کی ضرورت تھی۔ حصہ داروں نے محمد بشیر پر سخت تقاضا شروع کیا کہ ہمارا روپیہ دیدو۔ ایسی حالت میں محمد بشیر کے ذمہ یہ بات ہے کہ وہ روپیہ کی فکر کر کے دیدیا جاوے یا شریعت مال صاحب مال کو دلوائے گی۔ محمد بشیر نے باقاعدہ حساب کر کے مال کا دیکھا تو مبلغ اما ۵۵

چار سو پچاس کا مال فخرالدین سے کم بلا یہ اسامان کے چار سو پچاس صرف محمد بشیر کے ذمہ رہیں گے یا سب حصہ داروں کے ذمہ "ذریعہ فروخت" حاصل کرنے کے لئے بعض حصہ داروں کی رائے سے محمد بشیر نے مقدمہ لڑا یا مقدمہ کی کامیابی ہوئی، مصارف مقدمہ سب کے ذمہ ہوں گے یا صرف محمد بشیر کے ذمہ رہیں گے فقط

الجواب ۔ یہ عقد مضاربت ہے ۔ فخرالدین محمد بشیر مضارب ہیں اور روپیہ والے رب المال اور اس کے بعد جو حصہ داروں نے محمد فخرالدین سے مال محمد بشیر کو دلوانا چاہا اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک مضارب کو علیحدہ کیا اور مضارب کو مضاربت سے معزول کرنے اور اس سے عقد مضاربت کے فسخ کرنے کا حکم یہ ہے کہ جتنا مال موجود ہے اس کو مضارب کو فروخت کرے اور نفع تقسیم کر کے اصل روپیہ رب المال کو دیدیا جاوے لیکن اگر سب رضامند ہو کر مال ہی کو تقسیم کرنا چاہیں تو بھی درست ہے بلا رضامندی درست نہیں اور صورت مسئولہ میں چونکہ رضامندی سے ایسا کیا گیا جائز ہو گیا ۔ پس فخرالدین کے حصہ میں جتنا مال آ گیا وہ فخرالدین کی ملک ہو گیا ۔ اور محمد بشیر کے پاس رہا اس میں حسب شرط مقررہ وقت عقد مضاربت قائم رہی اور رب المال کو مضاربت سے روپیہ مانگنے کا اختیار نہیں ہوتا صرف مضارب کے ذمہ فروخت کرنے کی کوشش کرنا ہے اس لئے حصہ دار محمد بشیر پر جبر نہیں کر سکتے جب مال فروخت ہو گا حسب شرط نفع تقسیم کر کے حصہ داروں کو اصل روپیہ دیدیا جاوے گا ۔ اور اگر خسارہ ہوا صرف حصہ داروں پر پڑے گا ۔ پھر اس کے بعد جو حساب کرنے سے مال کم بلا ثابت ہوا یہ سب حصہ داروں کے ذمہ ہے کیونکہ سب کی رضامندی سے یہ مال کی تقسیم ہوئی ہے اور ذریعہ فروخت ایک مبہم لفظ ہے جب تک اس کی تعیین و تصریح نہ کی جاوے اس کے متعلق جو سوال آخیر میں کیا گیا ہے اس کا جواب نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے متعلق دوسرے احکام کی تحقیق ہو سکتی ہے کہ آیا اس کا دینا فخرالدین کو جائز تھا یا ناجائز اور آیا دینے سے فخرالدین کا حق اس سے متعلق ہو گیا یا نہیں اور آیا فخرالدین کو دینے کے بعد یہ مقدمہ لڑانا جائز تھا یا نہیں اور پھر مصارف کس کے ذمہ ہوئے اگر اس کے متعلق پھر سوال آوے تو یہ پرچہ ہمراہ آنا چاہئے ۔ ۲۷ محرم ۱۳۳۲ھ (حوادث اول ص ۱۳۰)

جواب سوال متعلق مضارب

سوال (۴۳۰) رام لال جو ہمارا پہلا مضارب تھا جس وقت وہ علیحدہ ہونے لگا تو نفع کا حساب کر کے جو رقم اس کے حصہ کی نکلتی تھی وہ

اس کے حوالہ کی گئی، حساب اس طور پر جوڑا گیا (۱) زرنقد جو تحویل میں تھا (۲) مال چمڑہ وسامان وغیرہ جو دوکان وکارخانہ میں تھا (۳) بقایا جو بیوپاریوں وکاریگروں کے ذمہ تھا ان تینوں کو جمع کرکے نفع نکال لیا گیا، مثلاً جس وقت کام شروع کیا تھا تو دس ہزار روپیہ لگائے گئے تھے۔ اور جب کام ختم کیا گیا تو از روئے حساب بالا چودہ ہزار ہوگئے اس سے معلوم ہوا کہ چار ہزار نفع ہے۔ رام لال کے علحدہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے فرائض ادا کرنے میں کوتاہی کرتا تھا اور اسی وجہ سے جو نفع ہوا وہ دراصل خدا کا فضل اور بظاہر دوسرے مضارب اور رب المال کی مساعی کا نتیجہ تھا۔ بقایا میں کچھ اور رقوم بھی تھیں جو ناقابل وصول سمجھ کر خارج از حساب کردی گئی تھیں اور اگر وہ بھی شمار کرلی جائیں تو نفع کی مقدار اور بڑھ جاتی، طے شدہ حساب کے بعد دوسرے مضارب اور رب المال کی کوشش اور روپیہ اور وقت خرچ کرنے سے بعض ناقابل وصول رقوم وصول ہوگئیں جو مضارب اول رام لال کے خیال میں ڈوبی ہوئی تھیں اور بعض رقوم جو بقایا میں قابل وصول سمجھ کر داخل کی گئی تھیں اور اُسی حساب سے رام لال کا حساب کیا گیا تھا باوجود محنت ووقت اور مزید روپیہ خرچ کرنے کے ڈوب گئیں۔ اس صورت میں مضارب ڈوبی ہوئی رقوم کا ذمہ دار اور وصول شدہ رقوم کا حصہ دار ہے یا نہیں، یہ ظاہر ہے کہ جو رقوم وصول نہ ہوتیں اور بعد میں خارج از حساب کرنی پڑتی تو وہ یہ کہہ کر انہیں مجرا دینے سے انکار کرتا کہ ہم تو الگ ہوگئے۔ اب ہمیں کیا تعلق۔ اس نے بعض بقایا کے وصول کرانے میں ایک بددیانتی یہ بھی کی کہ جس پر سو روپے آتے تھے اس کا مثلاً اسی کا مال سو روپے میں خرید لیا گو اس مقروض سے اُسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اس صورت میں اس سے کس طرح حساب کیا جائے۔ جو رقوم ناقابل وصول وصول ہوئیں ان پر روپیہ اور محنت اور وقت صرف ہوا ہے اس وجہ سے ان کی تعداد کسی قدر ڈوبی ہوئی رقوم سے زیادہ ہی ہوگی لیکن حساب میں اندازہ سے مہنگے خریدے ہوئے مال اور صرف شدہ روپے کا اندازہ ہوسکتا ہے مگر جو وقت مضارب ثانی اور رب المال کا صرف ہوا ہے اس کی قیمت کا کوئی اندازہ کرنا مشکل ہے کیونکہ اسے کسی روز سوا دو یا پانچسو روپے کی آمدنی ہوتی ہے اور کسی دن کچھ بھی نہیں۔ اسی طرح سال کی اوسط آمدنی بھی متفاوت ہوتی ہے کبھی کم نفع ہوا کبھی زیادہ۔

الجواب۔ رام لال کے ذمہ ہے کہ سب رقوم یا فتنی وصول کرے۔ اس کو انکار

کرنے کا کوئی حق نہیں، لیکن اس کا حصہ دار ہونا اس کے وصول کرنے پر موقوف نہیں یعنی اگر بدون اس کی سعی کے یا رب المال وغیرہ کی سعی سے ہوگئیں تو اگر وہ نفع کی رقم ہے جیسا سوال سے ظاہر ہے تو وہ اس میں حصہ دار ہے اور درصورت وصول نہ ہونے کے اس کو یہ کہنے کا حق نہ تھا کہ ہم الگ ہوگئے ہیں۔ کیا تعلق اس کو وہ رقوم مجرا دینا پڑتیں اور یہ بددیانتی کی کہ اسی کا مال سو میں خریدا یہ غبن یسیر ہے جس کا مضارب کو اختیار ہے گو بددیانتی سے وہ گنہگار ہو مگر عقد نافذ ہو جاوے گا اور اس کے سب احکام مرتب ہوں گے اور جو رقوم متوقع الوصول تھیں اور وصول نہیں ہوئیں وہ حساب سے خارج کی جاویں گی۔ پس اگر رقوم غیر متوقع الوصول جو کہ وصول ہوگئی مقدار میں رقم متوقع الوصول سے جو کہ وصول نہیں ہوئیں زیادہ ہے تو اس زیادہ کی بھی تقسیم حسب شرط مضاربت ہوگی اور وقت وسعی کی کوئی قیمت بدون عقد کے نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کا اعتبار نہیں مقتضی عقد کا تو یہی جواب ہے لیکن اگر اس خلجان سے متعاقدین بچنا چاہیں تو اس کی صورت یہ ہے کہ چڑھی رقوم میں عام اس سے کہ وہ متوقع الوصول ہوں یا غیر متوقع الوصول جتنا حصہ مضارب کا بتراضی متعاقدین قرار پاوے اس مجموعی کے حصہ کے عوض میں رب المال کوئی چیز گو کیسی ہی خفیف قیمت کی ہو مضارب کو دیدے تو وہ تمام چڑھی ہوئی رقوم رب المال کی ملک ہو جاویں گی اور یہ اشکال مذکور فی السوال اس میں پیش نہ آوے گا۔ اب بھی ایسا ہی کرلیا جاوے۔ ۱۲ رمضان المبارک ۱۳۳۰ھ

کتاب القضاءِ

قضاء علی الغائب کا بضرورت جائز ہونا

سوال (۱۳۱۴) شوہر غائب ہے، اور عورت کو دعویٰ طلاق ہے، اور احضار مدعیٰ علیہ متعذر بلکہ خود عورت کو شوہر تک پہنچنا بھی دشوار ہے۔ اس صورت میں شہادت علی الغائب پر عند الضرورۃ دفعاً للحرج باتباع دیگر ائمہ کرام حنفی المذہب کو حکم طلاق دینا جائز ہے (جیسا کہ امر مفقود الخبر میں اتباع امام مالک عند الحنفیہ جائز ہے) یا نہیں؟

الجواب ۔ قال العلامۃ الشامی ملا حسن جامع الفصولین بعد بحث طویل

فالظاهر عندی ان یتامل فی الوقائع الی قولہ ولا یناقی ما مر لان تجویزهن ؟ المصلحۃ والضرورۃ ج۴، ص ۵۲۵، ۵۲۶ وفی الدر المختار ولو قید ہ السلطان بصحیح مذھبہ کزماننا نقید بلا خلاف اھ ان روایات سے امور ذیل ثابت ہوئے

۱ قضا علی الغائب کے جواز پر مطلقاً فتویٰ نہ دیا جاوے گا، بلکہ جہاں قاضی کی رائے میں ضرورت ومصلحت ہو یہ جواز اس صورت کے ساتھ مقید ہوگا، ۲ صورت مسئول عنہا میں ضرورت ہے اس لئے قضاء علی الغائب کو جائز کہیں گے، ۳ بہتر ہے کہ اس غائب کی طرف سے کوئی اس کا پیروکار مقرر کر دیا جاوے کہ وہ بمقابلہ مقضی لہا کے جرح وقدح کر سکے ۴ اگر قاضی کے منشور قضاء میں یہ قید لکھی ہو کہ صرف مذہب حنفی کے قول راجح کے موافق قضاء کرے تو اس صورت میں احتیاط یہ ہے کہ والی سے اس قضاء علی الغائب کے نفاذ کا اختیار حاصل کرے۔ فقط واللہ اعلم،

۱۳ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۸۵)

ایلاء بودن بعرف وتحلیف قاضی دراں | **سوال** (۴۳۲) میاں بیوی میں کسی وجہ سے تکرار ہوگیا۔ میاں نے حالت غصہ میں بیوی سے کہا کہ میرے گھر کا کھانا تجھ کو حرام ہے اگر میں تیرے اوپر ازار بند کھولوں تو اپنی لڑکی پر ازار بند کھولوں اور اپنی ران پر ہاتھ مار کر کہا جامردوں کے سے بول ہیں، یہ مذکورہ بالا بیان عورت کا ہے اور مرد اس بیان سے انکار کرتا ہے کہ میں نے نہیں کہا، فقط حالت غصہ میں یہ کہا تھا کہ میرے گھر کا کھانا تجھ کو حرام ہے، اور اس میں میری کوئی نیت طلاق وغیرہ کی نہیں تھی، عورت کے پاس گواہ نہیں ہیں، یہ دونوں میاں بیوی اگر کسی عالم کے پاس رجوع کریں تو کس طرح فیصلہ کرنا چاہئے اگر عورت کا قول صحیح مانا جاوے تو مرد کا یہ کہنا کہ تجھ کو میرے گھر کا کھانا حرام ہے، اگر میں تیرے اوپر ازار بند کھولوں تو اپنی لڑکی پر ازار بند کھولوں، عورت کے حق میں ایلاء ہوگا یا طلاق اس بارہ میں جو حکم شرع شریف ہو اس سے مطلع فرمایا جاوے، تاکہ اسی کے مطابق ان کا فیصلہ کر دیا جاوے۔ اور ان کو شرعی حکم سنایا جاوے۔ کیا البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر پر عمل کیا جاوے؟

الجواب۔ فی الدر المختار من حرم ای علی نفسہ شیئا ثم فعلہ کفر لیمینہ لما تقرر ان تحریم الحلال یمین الی قولہ کل حل او حلال اللہ او حلال

المسلمین علی حرام فہو علی الطعام والشراب والفتوی فی زماننا علی انہ تبین امرأتہ بتطلیقۃ فی ردالمحتار والحاصل ان المعتبر انصراف ہذہ الالفاظ عربیۃ او فارسیۃ الی معنی المتعارف بلانیۃ فیہ فان لم یتعارف سئل عن نیتہ وفیما ینصرف بلانیۃ لو قال اردت غیرہ لا یصدقہ القاضی وفیما بینہ وبین اللہ تعالیٰ ہو المصدق اھ ج ۳ ص ۹۵ تا ص ۱۰۰ وفی الدرالمختار والفاظہ (ای الایلاء) صریح وکنایۃ فی ردالمحتار عن البحر لو ادعی فی الصریح انہ لم یعن الجماع لا یصدق قضاءً ویصدق دیانۃً والکنایۃ کل لفظ لا یسبق الی الفہم معنی الوقاع منہ ویحتمل غیرہ ولا یکون ایلاء بلانیۃ ویدین فی القضاء وفیہ عن المنتقی لا انام معک ایلاء بلانیۃ وکذا لا یمس فرجی الی قول الشامی مؤید المنتقی ان الصراحۃ منوطۃ بتبادر المعنی والمتبادر من قولک فلان نام مع زوجتہ ہو الوطی الخ جلد ۲ ص ۹۰۰، ان روایات سے تو اسی جملہ کا اگر میں تیرے اوپر الخ یمین و ایلاء ہونا ثابت ہوا کہ عرفاً متبادر اس سے یہی ہے اور چونکہ عرفاً یہ صریح ہے، اس لئے متکلم اگر دعویٰ کرے کہ صحبت کرنا مراد نہ تھا، تو قضاءً اس کی تصدیق نہ کی جاوے گی، البتہ اگر کسی جگہ عرفاً اس سے یہ معنی متبادر نہ ہوں تو اس صورت میں قضاءً بھی تصدیق کیا جاوے گا، اور اگر کسی جگہ عرفاً یہ طلاق میں لزوماً مستعمل ہوتا ہو تو اس سے طلاق بائن ہو جاوے گی، اگرچہ نیت نہ کی ہو، اور نیت خلاف کے دعویٰ میں قضاءً مصدق نہ ہوگا، اور اگر طلاق وغیر طلاق دونوں میں مستعمل ہوتا ہو تو جس کی نیت کی ہوگی وہی ہوگا، خلاصہ یہ کہ اس جملہ کے مفہوم کی تعیین کا مدار عرف پر رہا، پس اول اس کی تعیین کی جاوے، اس کے بعد اگر زوجین میں سے ایک یعنی زوج انکار کرے اور زوجہ دعویٰ کرے اور دونوں متفق و رضامند ہو کر کسی عالم کو حکم بناویں تو وہ مثل قاضی کے ذیل کے موافق فیصلہ کرے، اور اگر حکم نہ بناویں تو محض افتاء اس فیصلہ ذیل کے موافق نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا حکم روایات بالا کے ضمن میں جابجا جو مذکور ہوا ہے وہ بتلا دیا جاوے گا۔ اور وہ فیصلہ بصورت تحکیم یہ ہے کہ اگر مدعیہ بینہ پیش نہ کر سکے تو مدعی علیہ یعنی زوج سے حلف لیا جاوے گا، اور اگر وہ حلف کرلے تو حکم کر دیا جاوے گا کہ یہ جملہ اس نے نہیں کہا، اور اگر حلف سے انکار کرے تو حکم کر دیا جاوے گا کہ اس نے کہا ہے، پھر بعد فرض اس تقدیر کے اس جملہ کے مفہوم میں جو تفصیل لکھی گئی ہے، اس کے

موافق حکم کردیا جاوے گا۔ والحلف لان الایلاء من الاشیاء التی اختلف فی التحلیف فیہا وھی النکاح والرجعۃ والفیٔ عن الایلاء والاستیلاء والرق والنسب والولاء والحد واللعان کذا فی الدر المختار ثم نقل الفتوی علی التحلیف فی الکل الا الحد ود و منہا حد قذف ولعان ج ۲ ص ۶۵۲ مع رد المحتار اور ایلا اگر ثابت ہو تو اس کا حکم مشہور ہے۔ ۲۵ ذالحجہ ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۲۰۲)

بودن حکام مسلمین از جانب نصاریٰ در حکم قضاۃ

سوال (۴۳۳) قاضی دریں ملک نصاریٰ در کسے جا موجود است یا نہ و قاضی چگونہ می شود اگر مردم قصبۂ کلان اعلیٰ ادنیٰ جمع شدہ امام جمعہ و جماعت و عیدین یکے عالم را سازند آن عالم کار قاضی کردن می تواند یا نہ، مولانا رشید احمد صاحب درجواب نوشتہ بودند کہ نابالغہ نکاح کردہ برادر چوں بالغہ شد و بفور علامت حیض انکار کرد نکاح فسخ میشود پس یکی نابالغہ خاندان ما کہ از بیوقوفی و تعصب قوم بنکاح صغیر درآمدہ بود، بالغ شدہ انکار کرد، پدر نابالغ را راضی کردہ حکم ساختہ از حکم فسخ کنانیدیم و بدیگر خویش نکاح کردیم بعض اقوام ما معترض ہستند دریں حکم چیست فقط

جواب، قاضی آں کہ برائے فصل خصومات حاکم ساختہ شود و برائے عموم نفاذ احکامش دو طریق ست تولیت از سلطان گو کافر باشد و تولیت از عامہ مسلمین و اگر در واقعہ خاصہ صرف متخاصمین بر نفس خود ہا او را والی سازند آن حکم ست و در حق نفس آنہا مثل قاضی ست نہ در حق غیر آنان پس بناءً علیہ دریں ملک آں احکام کہ برائے این غرض از سرکار مامور کردہ می شوند اگر مسلمان باشند در حکم قضاۃ ہستند مثل ڈپٹی وغیرہ فی الدر المختار و یجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائر ولو کافرا ذکرہ مسکین وغیرہ وفیہ ولو فقد وال بغلبۃ الکفار وجب علی المسلمین تعیین وال و امام للجمعۃ، فقط، پس آنکس کہ مسلمانان او را محض برائے اقامت اعیاد و جمعہا قائم کردہ اند در حکم قاضی نیست البتہ او را متخاصمین حکم می توانند ساخت، پس در صورت مسئولہ اگر شوہر نابالغ بشرطیکہ خود بالغ باشد و منکوحہ مذکورہ کسے را حکم ساختندے، قضایش برایشان نافذ گردیدے و پدر شوہر اگر کسے را حکم سازد نا معتبر ست چرا کہ حکم حکم بر غیر محکم نافذ نمی شود۔ فی الدر المختار ھو ای التحکیم تولیۃ الخصمین حاکما یحکم بینہما وفیہ لا یتعدی حکمہ الی غیرہما پس چوں از شوہر تحکیم صادر نشد لہذا قضائے حکم نافذ نہ گردید، واللہ اعلم، ۲۱ رجب ۱۳۲۱ھ (امداد ج ۳ ص ۹۷ و حوادث ۱۶۰۲ ص ۲۰۱)

عدم کفایت فتویٰ از نکاح مفقود الزوج

سوال (۴۳۴) اگر حنفیہ مفقود الزوج را از شافعی عالم فتویٰ گرفتہ عمل کردن جائز باشد مطلع فرمایند از نام و مقامش تا رجوع باو کنند،

جواب ، فتوئے محض کافی نیست لما مرّ فی الجواب عن السوال الاول وایضاً فی فتاوی المفتی المرحوم مانصہ وایضاً فیما کان بمنزلۃ الفتویٰ منہ فلا یرفع الخلاف فصار وجودہ کعدمہ فاذا رفعت الحادثۃ الی حنفی فانہ یحکم بمقتضی مذہبہ ولا یمنعہ حکم المالکی، من ذلک فانہ فتویٰ ولیس بحکم اھ ، پس ازیں عبارت نیز معلوم شد کہ فتویٰ صرف دریں خصوص کافی نیست واللہ اعلم، ، شعبان ۱۳۲۱ھ (امداد جلد ۳ ص ۸۱ وحوادث اول ۲ ص ۹۴)

اجرت دہانیدن حاکم قاضی یا شاہدان را از فریقین

یہ مسئلہ بایں عنوان کتاب الاجارہ میں درج ہوچکا ہے۔

حلف ہندو

سوال (۴۳۵) ہندو را مبالغ دادم منکر شد، تنہا بودم منکر شد، در شرع باو حلف اگر آید چہ حلف دادہ آید؟

الجواب - فی الدرالمختار والوثنی باللہ تعالیٰ لانہ یقربہ وان عبد غیرہ اھ ازیں روایت مفہوم شد کہ ہندو را کہ بت پرست بود حلف باللہ کافی است، واللہ اعلم - ، شعبان ۱۳۲۱ھ (امداد ج ۳، ص ۸۲ وحوادث اول ۲ ص ۹۶)

معزول کردن حَکَم را قبل فیصلہ

سوال (۴۳۶) اگر فریقین نے بذریعہ عدالت کسی کو پنچ مقرر کیا پھر قبل فیصلہ دینے کے ایک فریق نے انکار کردیا تو آیا اس کے بعد اس پنچ کو جبراً فیصلہ کردینا شرعاً درست ہے یا نہیں ۔ گو عدالت اس فیصلہ جبریہ کو جائز رکھتی ہے۔

الجواب ، جب تک حَکَم فیصلہ نہ دے ، اس وقت تک مدعی اور مدعا علیہ میں سے ہر ایک کو حَکَم کو معزول کردینے کا اختیار ہے ، اور بعد معزول کردینے کے اب حَکَم کو جبراً فیصلہ کرنا درست نہیں ، اور یہاں ایک شبہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ اس وقت ہوتا جب صرف فریقین ہی حَکَم بناتے اور یہاں تو عدالت نے مقدمہ سپرد کیا ہے ، تو یہ شخص حَکَم نہیں ، حاکم بنیابت عدالت ہے ، اور حاکم کو جبراً فیصلہ کردینا جائز ہے ، جواب یہ ہے کہ عدالت نے اپنے اختیارات سے یہ مقدمہ سپرد نہیں کیا بلکہ فریقین کی درخواست پر تو گویا عدالت لسان اور معبّر اور حاکی ہے فریقین کی ، اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر

باوجود عدالت کے سپرد کر دینے کے حکم اپنی خوشی سے فیصلہ سے انکار کر دے تو خود عدالت باز پرس نہیں کرتی، بخلاف اس کے کہ کوئی آنریری مجسٹریٹ مقدمہ کی سماعت چھوڑ دے تو اس سے اس کی بابت باز پرس ہوتی ہے، پس وہ حکم حکم ہی رہا حاکم نہ رہا، اور وہ شبہ جاتا رہا۔

۷ شعبان ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ص ۱۰۹)

حکم اجرت حکم تجویز عدالت انگریزی

سوال (۴۳۷) مدعی عدالت میں جب دعویٰ دائر کرتا ہے تو بعض اوقات یہ صورت پیش آتی ہے کہ حاکم ہر دو فریق کو ایک یا دو اشخاص پر رضامند کرتا ہے کہ وہ اس مقدمہ کی تحقیقات کریں، بعض دفعہ تو ان اشخاص کو صرف تحقیقات کا اختیار ہوتا ہے، اور اس صورت کا نام یا ان اشخاص کا نام کمیشن ہوتا ہے۔ اور اُن کے حسب تحقیق حاکم حکم دیتا ہے، اور بعض دفعہ اُن اشخاص کو ہی حکم قرار دیا جاتا ہے جس کا نام ثالث ہے، کہ وہ تحقیقات کر کے فیصلہ دیں، دونوں صورتوں میں فریقین سے ایک رقم بتجویز ہو کر وصول کی جاتی ہے، اور وہ اس کمیشن اور ثالث کو دی جاتی ہے، آیا یہ رقم اس کو لینی درست ہے یا نہیں یا دونوں صورتوں میں سے کسی کو لینی درست ہے اور کسی کو ممنوع ہے؟

الجواب ۔ یہ تحقیق اور فیصلہ دونوں باب قضاء سے ہیں، اور قضاء پر اجرت لینا جائز نہیں، البتہ بیت المال سے بقدر کفایت نفقہ پانے کا مستحق ہے، بوجہ اس کے کہ یہ شخص محبوس بحق مسلمین ہے، اور بیت المال مال مسلمین ہے، اور محبوس کا نفقہ من لہ الحبس کے مال میں بوجہ جزاء الحبس کے ہوتا ہے، پس اس بنا پر اس مفتش و حکم کو اجرت لینا تو جائز نہیں، لیکن چونکہ یہ ایک وقت خاص تک ان کے کام میں مشغول رہے ہیں، اس وقت کے لئے ان کا ضروری نفقہ اہل معاملہ کے مال میں ہوگا، پس بقدر نفقہ ضروریہ اس وقت کے رکھ لینا جائز ہوگا، باقی جو زائد ہو وہ اہل معاملہ کو واپس کر دیں۔

۲ رمضان ۱۳۳۱ھ (حوادث ۱، ۲، ص ۱۱۵)

مقرر کردن ہر فریق یک یک حکم را

سوال ۔ (۴۳۸) بعض دفعہ ایک فریق ایک کو اپنا ثالث مقرر کرتا ہے اور دوسرا فریق دوسرے شخص کو، دونوں کا متفقہ کوئی شخص حکم نہ ہوا، اگر ان ہر دو ثالث میں اختلاف رہا تو تیسرا شخص متفقہ بنام سرپنچ مقرر ہوتا ہے، کہ وہ احد التجویزین کو پسند کر کے فیصلہ دیتا ہے، یا خود حاکم احد التجویزین پر فیصلہ کرتا ہے

اول حالت میں جب ہر دو فریق کا علیحدہ علیحدہ ثالث ہوا، اور متفقہ کوئی حکم نہ ہوا، اور ان دونوں ثالثوں نے متفق ہو کر فیصلہ دیا تو یہ فیصلہ صحیح ہوا یا نہیں کیونکہ یہ صورت ظاہراً وکالت کی ہے کہ ہر فریق کا گویا ایک وکیل اور حکم کے لئے ایسا شخص ہونا چاہئے کہ ہر دو فریق کا اس پر اتفاق ہو؟

الجواب واقعی یہ شخص حکم نہیں وکیل ہے، جب دونوں کے وکیل راضی ہوگئے فیصلہ نافذ ہوگیا۔ ۲ رمضان ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ص ۱۱۶)

فیصلہ مطابق قانون سلطنت غیر اسلامی

سوال (۴۳۹) فی زمانہ جو مسلمان منجانب سرکار انگریزی مقدمات فیصل کرتے ہیں وہ مطابق احکام شریعت نہیں ہوتے مثلاً شریعت میں حکم ہے البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر، قانون انگریزی میں اثبات ونفی دونوں کے لئے ثبوت مطلوب ہے، شریعت میں شاہد عدل شرط ہے، قانون میں جو شہادت مقبول ہے اس کے لئے شاہد کے واسطے وہ شرائط لازمی نہیں جو شریعت میں لازم ہیں، شریعت میں بحالت اثبات سرقہ وزنا قطع ید وسنگسار کا حکم ہے، قانون میں یہ نہیں، نیز دیگر حالتوں میں قانون میں قید جرمانہ مقرر ہیں، جو شریعت میں نہیں ہیں، آیا شریعت کی اس خلاف ورزی کا اثر بادشاہ وقت پر ہے یا مسلمانانِ مامور پر، اور اگر مسلمانان مامور پر نہیں تو حکم عام من لم یحکم بما انزل اللہ کی کیا تعبیر ہے؟

الجواب - قاعدہ شرعیہ ہے کہ اشد الضررین کے دفع کے لئے اخف الضررین کو گوارا کر لیا جاتا ہے، اور یہ بھی قاعدہ ہے کہ حصول نفع کے لئے ضرر دینی کو گوارا نہیں کیا جاتا، اس بناء پر اس مسئلہ میں تفصیل ہوگی کہ جو لوگ ان حکومتوں کو اختیار کرتے ہیں دیکھنا چاہئے کہ ان کے قبول نہ کرنے سے خود ان کو یا عامۂ اہل اسلام کو کوئی ضرر شدید لاحق ہونا غالب ہو یا نہیں، دوسری صورت میں تو ان حکومتوں کو قبول کرنا جائز ہے، اور اول صورت میں دیکھنا چاہئے کہ آیا اس شخص کی نیت اس ضرر کے دفع کی ہے یا کوئی نفع مالی یا جاہی حاصل کرنے کی، اول نیت میں جواز کی گنجائش ہے اور دوسری نیت میں ناجائز، پس کل تین صورتوں میں سے صرف ایک صورت میں جواز کی گنجائش ہوئی، اور اس صورت میں محل آیت کا بقیہ دو صورتیں ہوں گی، خصوص اگر جائز یا مستحسن سمجھے کفر ہے البتہ اگر دو نا جائز صورتوں میں بھی سلطنت کی طرف سے مجبور کیا جاوے۔ اور عذر قبول

نہ کیا جاوے تو پھر ان میں بھی گنجائش ہے، لیکن ہر حال میں جہاں تک ممکن ہو خلاف شریعت سے بچنے کی کوشش کرے، اور صرف اس خیال سے خلاف شرع فیصلہ نہ کرے کہ آگے جا کر یہ منسوخ ہو جاوے گا، البتہ جہاں جرم قانون وعتاب شاہی کا اندیشہ ہو صرف وہاں بھی گنجائش ہوگی، ایک صورت میں تو بلا جبر بھی اور دو صورتوں میں بجبر،

۷ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ (حوادث اول ۲ ص ۱۶۰)

رفع شبہات متعلقہ بمسئلہ نفاذ قضاء قاضی ظاہراً و باطناً

سوال (۴۴۰) ایک کتاب موسوم بہ مجموعہ فتاوی حصہ اول صفحہ ۵۶ باب اٹھارہویں میں یہ مسئلہ ہے کہ قضائے قاضی ظاہراً و باطناً نافذ ہو جاتا ہے، یعنی اگر کوئی شخص کسی عورت پر دعویٰ کرے کہ یہ میری عورت ہے اور قاضی کے سامنے جھوٹے گواہ پیش کرکے مقدمہ جیت لیا، اور وہ عورت اس کو مل جاوے تو وہ عورت عنداللہ و عندالناس حلال ہو جاوے گی، اور صحبت اس سے جائز ہوگی، اور خدا کے نزدیک مواخذہ میں گرفتار نہ ہوگا، جیسا کہ ہدایہ چھاپہ مصطفائی کی جلد دوسری صفحہ ۱۲۵ میں موجود ہے، اب گذارش یہ ہے کہ یہ حکم عندالناس کے مقابلہ میں تو جیسا کہ لکھا ہے ٹھیک معلوم ہوتا ہے، مگر عنداللہ خیال میں نہیں آتا ہے، کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ سمیع و بصیر ہیں، ان کو ان سب واقعات کی خبر ہے، تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ عورت کیسے حلال ہوئی، نور الہدایہ ترجمہ اردو شرح وقایہ مولفہ مولوی وحید الزماں نفاذ قضاء قاضی ملاحظہ فرما کر حضور اس کے جواب سے مطلع فرماویں تاکہ جو شبہ ہے وہ رفع ہو جاوے۔

الجواب، مفصلاً سمجھنا تو اس مسئلہ کا زبانی آسان ہے، باقی مجملاً اتنا لکھے دیتا ہوں کہ صحبت کا حلال عنداللہ ہونا موقوف ہے، نکاح کے منعقد ہو جانے پر خواہ طریق انعقاد میں گناہ ہی ہو، مثلاً اگر کوئی شخص کسی کو قتل کی دھمکی دے کر اس کی بی بی کو طلاق دلوائے اور وہ جب طلاق دیدے تو بعد عدت کے عورت کو قتل کی دھمکی دے کر اس سے ایجاب و قبول کے الفاظ کہلوائے تو طلاق بھی واقع ہو جائے اور نکاح بھی منعقد ہو جائے گا۔ البتہ اس طریق کے اختیار کرنے کا اس کو سخت گناہ ہوگا، بس اسی طرح اس طریق مذکور فی السوال میں یہ شخص سخت گنہگار رہوگا، لیکن نکاح منعقد ہو جاویگا پس صحبت کے حلال ہونے پر کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ فرع ہے صحت نکاح کی، البتہ نکاح موقوف

منعقد ہونے کا سوال ہو سکتا ہے جب کہ واقع میں نکاح نہیں ہوا، سو اس انعقاد کا سبب قضاء قاضی ہے و وشخصوں کی شہادت پر جن کو قاضی سچا سمجھتا ہے، بشرطیکہ عورت کسی کی منکوحہ یا معتدہ نہ ہو، باقی تمغا۔ قاضی کا سبب ہو جانا یہ لکھنے سے سمجھ میں نہ آوے گا، کبھی ملاقات کے وقت پوچھیے گا۔ انشاء اللہ اطمینان کر دوں گا۔ ۲۲ جمادی الاولی ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۳۴)

ضمیمہ متعلقہ مسئلہ نفاذ قضاء قاضی ظاہراً و باطناً

اصل میں سب حقوق ملک حق تعالیٰ کی ہیں مگر احتیاج عبد کی مصلحت سے حق تعالیٰ نے ان حقوق کے احداث و انہاء کا (کہ عبارت ہے عقد و فسخ سے) اختیار عبد کو بھی دیدیا جس طرح عبد کی مصلحت اس کو مقتضی ہے کہ اس کو اس کے نفس میں یہ اختیارات دیئے جاویں اسی طرح بعض احوال میں اس کی مصلحت اس کو بھی مقتضی ہے کہ اس کے نفس میں اس کے حکام کو بھی یہ اختیارات دیئے جاویں، اور وہ بعض احوال اختلاف و نزاع فیما بین کا حال ہے، کیونکہ ایسے وقت میں بجز عطاء اختیار احکام کے ان حقوق کے طے ہونے کی کوئی صورت نہیں، اور گو اس میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ صورت اختیار بھی اس کے لئے کافی ہے، حقیقت اختیار کی حاجت نہیں، لیکن ایسا ہونے سے نزاع و فساد کبھی منقطع نہیں ہو سکتا، مثلاً ان مدعی علیہا کا واقع میں اگر نکاح صحیح نہ ہوا تو ہمیشہ وہ اپنے کو بچائے گی یا مرد مدعی عورت کے حقوق ادا نہ کرے گا، اور ہمیشہ تباغض و تزاحم رہے گا، پس صورت اختیار کیسے کافی ہوگی، پس ضرور حقیقت اختیار ثابت ہونا چاہیے، اور چونکہ ملک کا اثبات اور رفع خود اپنے نفس میں تصرف کرنے کے وقت بھی اسی عقد و فسخ پر مبنی ہے، اس لئے احکام کے اختیارات کا محل بھی یہی ہوگا املاک مرسلہ نہ ہوں گے کہ وہ بلا واسطہ عقد و فسخ کے خود صاحب حق کے تصرف سے بھی مثبت و رافع حقوق کے نہیں ہوتے، گو بعض جگہ اباحت ہو جاتی ہے کالاموال، اور بعض جگہ اباحت بھی نہیں ہوتی، کالفروج، اس لئے ان عقود و فسوخ کو محل نفاذ قضاء ظاہراً و باطناً رکھا گیا۔ اب یہ بات محتاج دلیل نقلی رہ گئی کہ حق تعالیٰ نے ایسے اختیارات حکام کو عطا فرمائے ہیں یا نہیں، سو اس کے لئے حدیث شاھداک زوجاک کہ مرفوع حکمی ہے اور حدیث تفریق فی اللعان کہ مرفوع حقیقی ہے، کافی دلیل ہے، اور نظائر اس کے بعض متفق علیہا ہیں، کالولایۃ فی النکاح والتفریق فی اللدانۃ اور بعض مختلف فیہا ہیں، اس میں بعضے صرف امام صاحب کے

نزدیک ہیں محل البحث اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک ہیں، امام صاحب کے نزدیک نہیں، جیسے تفریق فی العسار تو امام صاحب پر اس میں شبہ توسع کا بھی نہیں ہو سکتا چونکہ بعض اُن کے یہاں تضیق اور حقیقت امر کی ان سب نظائر سے متحد ہے، خصوصیت شہادت کو محل شبہہ قرار دینا ناشی قلت تدبر سے ہے، ۶ جمادی الاخری ۳۳ھ

(تتمہ ثالثہ ص ۴۰)

جواز جبر حاکم بر تطلیق بحالت اضرار زوج

سوال (۴۴۱) ہندہ کا خالد سے نکاح ہوا، خالد ہندہ کو بُری طرح بلکہ طرح طرح کی تکلیفیں دیتا ہے، جس سے ہندہ کو زندگی وبال ہو رہی ہے، خالد سو مطالبہ طلاق کرتی ہے تو طلاق نہیں دیتا، اور حسن معاشرت چاہتی ہے تو وہ بھی نہیں کرتا، جب گفتگو ہوتی ہے تو کہتا ہے اپنا مہر لے کر باپ کے یہاں جا کر رہو، مگر میں طلاق نہ دوں گا اور نہ کبھی تیرے پاس پھٹکوں گا، گو ہندہ یہاں بھی کالمعلقہ ہے، میاں بیوی کا معاملہ بالکل نہیں، چونکہ چند عورتوں نے اس قسم کے خاوندوں کی طرف سے بدعنوانیاں دیکھ کر ایسا کیا ہے کہ بعض عیسائی ہو گئیں، اور بعض ہندو ہو گئیں، لہذا اگر یہ عورت قاضی یا حاکم کے یہاں یہ استغاثہ کرے کہ مجھ کو میرے شوہر سے جبراً طلاق دلوا دی جاوے، اور حاکم جبراً خاوند کو مجبور کر کے طلاق دلوا دے تو یہ فعل جائز ہے، اور شرعاً عورت ایسا دعوے رجوع کرنے کا حق رکھتی ہے یا نہیں؟

الجواب، قال اللہ تعالیٰ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا یہ آیت اپنے عموم الفاظ سے دال ہے تحریم اضرار پر اور ایجاب تسریح پر، جبکہ امساک بالمعروف نہ ہو سکے، پس جب صورت مسئولہ میں زوج پر تطلیق واجب ہے، اور واجب پر قادر شخص پر جبر جائز ہے، اس لئے حالت کذائیہ میں حاکم سے استغاثہ و استعانت جبر فی التطلیق میں بلا شبہ جائز ہے، باقی اگر شوہر باوجود اس کے طلاق نہ دے تو خود حاکم کا حکم بالتفریق نا کافی ہے لفقد شرائطہ، ۱۱ شعبان ۱۳۳۵ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۰)

فرق درمیان عیدین وکتاب القاضی در شرائط

سوال (۴۴۲) جب عیدین میں مثل معاملات کے شہادت رجلین اور رجل وامرأتین مشروط ہے تو کیا وجہ ہے کہ کتاب القاضی الی القاضی کے تمام شرائط عیدین میں معتبر نہ ہوں۔

الجواب، عبارات وجزئیات فقہ سے تصریحاً ثابت ہے کہ عیدین من کل الوجوہ مثل معاملات

وحقوق العباد کے نہیں بلکہ من وجہ دیانت ہے، اسی لئے اس کے بعض احکام مثل دیانات کے ہیں، پس کتاب القاضی کے شرائط کا معتبر ہونا ضروری اور لازم کسی دلیل سے نہیں، وتلک الجزئیات ھٰذہ فی الدر المختار وشرط للفطر نصاب الشہادۃ ولفظ اشہد وعدم الحد فی قذف لتعلق نفع العبد لکن لا یشترط الدعوی کما لا تشترط فی عتق الامۃ وطلاق الحرۃ فی رد المحتار (والفطر) ان کان فیہ حق عبد لکن فیہ حق اللّٰہ تعالیٰ لحرمۃ صومہ ووجوب صلوٰۃ العید وھو بعتق الامۃ اشبہ فلا یشترط فیہ الدعوی ص ۱۴۲ جلد ثانی، وفی الدر المختار ولو کانوا ببلدۃ لا حاکم فیہا صاموا بقول ثقۃ وافطروا باخبار عدلین فی العلۃ للضرورۃ، فی رد المحتار ای ضرورۃ عدم وجود الحاکم یشہد عندہ ص ۱۴۶ جلد ثانی فی رد المحتار فی تعبیر المصنف کغیرہ بالظن اشارۃ الی جواز التسحر والافطار بالتحری الی قولہ لان التحری یفید غلبۃ الظن وھی کالیقین جلد ثانی ص ۱۶، فقط

۱۵ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ (امداد، ج ۳ ص ۴۳)

بودن حاکم مسلم انگریزی بجائے قاضی	**سوال** (۴۳۴) جن مسائل میں قضا اور قاضی کی ضرورت ہے ان میں انگریزی عدالت کا حکم وفیصلہ وہی حکم رکھتا ہے یا نہیں۔

الجواب ۔ اگر صاحب اجلاس مسلم ہو وہ شرعاً قاضی ہے ۔ ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۳ھ

کتاب الشہادت

شہادت قتل بوجہ فسق کے مردود ہونے کی صورت میں کیا حکم ہے	**سوال** (۴۳۴) یہاں ایک محلہ میں اہل محلہ نے چندہ کرکے محفل رقص کی، حسب دستور بہت تماشائی جمع ہوگئے، مکان میں

تو جو لوگ تھے ان کے علاوہ اور لوگ ایک دیوار پر جو صرف پتھروں کی چنی ہوئی بلا چونہ وگل کی تھی بیٹھے ہوئے اور زیادہ ہوتے جاتے تھے۔ تماشائی جو داخل مکان رقص تھے وہ ان کو اس دیوار پر بیٹھنے سے بار بار منع کرتے تھے اور وہ باز نہ آتے تھے، یکایک وہ دیوار گری اس دیوار کے بیٹھنے والے بھاگے، اور اُن کے پیچھے وہ لوگ جو داخل مکان رقص میں محصور تھے۔ بھاگے یہ کہتے تھے کو پکڑو پکڑو، غرض ان لوگوں نے دو آدمیوں کو پکڑ لیا، اور اس میں مار پیٹ شروع ہوگئی ان دو آدمیوں میں سے ایک آدمی اسی ضرب سے مارا گیا، جب تحقیق ہوئی تو معلوم ہوا کہ

مقتول پولیس کا نوکر ہے، اس وقت یہ تماشا دیکھنے آیا تھا اور جو ضارب وقاتل ہے تماشائی ہیں اس قتل پر گواہی پوری گزر گئی کہ فلاں فلاں شخص نے اس شخص کو مارا ہے، یہاں تک کہ اس کا اٹھا کر لیجانا اور پانی پلانا اور اس کا کسی شخص کی گود میں دم نکلنا سب گواہان بیان کرتے ہیں، اگر یہ سب گواہ وہی ناچ دیکھنے والے فساق ہیں۔ ان کی شہادت پر حکم قصاص یا دیت ہو سکتا ہے یا نہیں؟ یا یہ گواہی بوجہ فسق شہود کالعدم سمجھ کر اس قتیل کو (لایعلم قاتلہ) کا مصداق مان کر حکم قسامۃ جاری کریں، یعنی مع لحاظ دیگر شروط قسامۃ مثل دعویٰ وغیرہ، صرف دریافت طلب یہ امر ہے کہ جب شہادت بوجہ فسق کے مردود ہے، تو کیا حکم کیا جاوے، اور درصورت رد شہادت قسامت اہل محلہ محلہ پر عائد ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اور اگر قسامت بوجہ عدم تزکیہ گواہاں یا بوجہ عدم نصاب شہادت وغیرہ رد کی جائے اور دعویٰ مدعی موجود ہو تو قسامت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ یا قسامت کے مواقع اور ہیں؟

الجواب - فی العالمگیریۃ الفصل الثانی من الباب الرابع من کتاب الشہادات اتفقوا علی ان الاعلان بکبیرۃ یمنع الشہادۃ وفی الصغائر ان کان معلنا بنوع فسق مستشنع یسمیہ الناس بذلک فاسقا مطلقا لاتقبل شہادتہ وان لم یکن کذلک فان کان صلاحہ اکثر من فسادہ وصوابہ اغلب من خطائہ ولایکون سلیم القلب یکون عدلا تقبل شہادتہ کذا فی فتاوی قاضی خان وعن ابی یوسف رح الفاسق اذا کان وجیھا فی الناس ذا مروۃ تقبل شہادتہ والاصح ان شہادتہ لاتقبل کذا فی الکافی - چونکہ فسق مذکور فی السوال علاوہ خلاف شرع ہونے کے مروت یعنی تہذیب و شائستگی کے بھی خلاف ہے، اس لئے ایسے فاسق کی رد شہادت میں کسی کا اختلاف بھی نہیں بالجملہ یہ شہادت تو مقبول نہیں، پس کالعدم ہوئی، اب دیکھنا چاہئے کہ ولی مقتول دعویٰ کس پر کرتا ہے، آیا اہل محلہ پر کرتا ہے، خواہ کل پر خواہ بعض غیر معین پر، خواہ بعض معین پر یا کہ غیر محلہ کے اس معین تماشائی شخص پر کرتا ہے، جس کا نام وہ گواہ لیتے ہیں، پس اول صورت میں قسامت و دیت اہل محلہ پر ہوگی. کما فی الھدایۃ باب القسامۃ ھذا الذی ذکرنا اذا ادعی الولی القتل علی جمیع اھل المحلۃ وکذا اذا ادعی علی البعض لاباعیانھم والدعوی فی العمد او الخطاء لانھم لایتمیزون عن الباقی ولو ادعی علی البعض باعیانھم

انہ قتل ولیہ عمداً او خطاءً فکذلک الجواب یدل علیہ اطلاق الجواب فی الکتاب وھکذا الجواب فی المبسوط الخ اور صورت ثانیہ میں مدعا علیہ سے حلف لیا جاویگا، اگر حلف کرلیا بری ہو جاوے گا اور اگر نکول کیا تو دیکھنا چاہئے کہ قتل بالحدید یا بالمثقل ہے صورت ثانیہ میں نکول سے حکم دیت کا کیا جاوے گا اور صورت اولیٰ میں نکول کرنے والے کو محبوس کردیا جاوے گا، اگر اقرار کرلیا قصاص لیا جاوے گا اور اگر حلف کرلیا بری کردیا جاوے گا۔ کما فی الہدایۃ بخلاف ما اذا ادعی علی واحد من غیرھم الی قولہ ثم حکم ذلک ان یثبت ما ادعاہ اذا کان لہ بینۃ وان لم تکن استحلف یمیناً واحدۃ ثم ان حلف برئ وان نکل والدعویٰ فی المال ثبت بہ وان کان فی القصاص فہو علی اختلاف مضی فی کتاب الدعویٰ وقال فی کتاب الدعویٰ ومن ادعی قصاصا علی غیرہ فجحدہ استحلف بالاجماع الی قولہ وان نکل فی النفس حبس حتی یحلف اویقر، فقط ۸ ارمحرم ۱۳۲۶ھ (تتمہ اولیٰ ص ۸۶)

دیوار کے پیچھے سے سنکر طلاق و عتاق کی شہادت دینا

سوال (۵۴۸) اگر شاہد دیوار کے پیچھے یا مکان کے باہر سے سنکر طلاق و عتاق کی شہادت دے تو شرعاً مقبول ہوگی یا نہیں؟

الجواب، مقبول نہ ہوگی، کما فی الہدایۃ ولو سمع من وراء الحجاب لایجوز لہ ان یشھد ولو فسر للقاضی لایقبلہ لان النغمۃ تشبہ النغمۃ فلم یحصل العلم۔ البتہ ایک خاص صورت جس کا تحقق بہت نادر ہے اس سے مستثنیٰ ہے، جس کو اس کے بعد ہی اس عبارت میں مستثنیٰ کیا ہے۔ الا اذا کان دخل البیت وعلم انہ لیس فیہ احد سواہ ثم جلس علی الباب ولیس فی البیت مسلک غیرہ فسمع اقرار الداخل ولا یراہ لہ ان یشھد لانہ حصل العلم فی ھذہ الصورۃ جلد ثانی ص ۱۴۲ جس کا حاصل یہ ہے کہ پہلے سے کوئی گھر خالی ہو، اور ایک شخص اس گواہ کے روبرو اس کے اندر گیا اور بجز اس دروازہ کے اور کوئی آنے کی جگہ بھی اس گھر میں نہ ہو اور ایسی حالت میں اندر سے کوئی مضمون سنائی دیا تو یقین کیا جاوے گا کہ اس جانے والے ہی کی آواز ہے پس اس صورت میں شہادت جائز ہے، اور اس زمانہ کے اعتبار سے یہ بھی شرط ہے کہ اس مکان میں گراموفون بھی نہ ہو۔ فقط،

۳۰ ذی الحجہ ۱۳۲۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۰۷)

باپ کا ملازم ہونا اولاد کے حق میں مانع قبولِ شہادت نہیں

سوال (۶۴۴) اگر فی الحقیقت زوجہ کے والدین طلاق کے مدعی ہوں، لیکن چونکہ شاہدین ان کے خادم وملازم ہیں، اس لئے زوجہ کو مدعی ظاہر کردیں، تو اس حیلہ سے باپ کے خدام کی شہادت بیٹی کے حق میں معتبر ہو جائے گی یا نہیں فقط،

الجواب - اول تو جس پر مدعی کی تعریف صادق آوے گی اسی کو مدعی کہیں گے خواہ اپنی رائے سے دعویٰ کرے یا دوسرے کے اغواء سے اور خواہ صادق ہو یا کاذب پس زوجہ سے پوچھا جاوے اگر وہ دعویٰ کرے گی مدعی کہی جاوے گی، پس شاہدوں کا اس کے باپ کا خادم ہونا مانع قبول نہ ہوگا، جب کہ وہ عادل ہوں، دوسرے طلاق کی شہادت میں خود دعویٰ کا تقدم ہی شرط اور ضروری نہیں، فی الدر المختار اول کتاب الشہادۃ وبلا طلب فی حقوق اللہ تعالیٰ کطلاق امرأۃ وعتق امۃ، پس اس شہادت میں شاہد ومشہود لہ کی خصوصیت وتبعیت مانع قبول نہ ہوگی۔ فقط

۳۰ ذی الحجہ ۱۳۲۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۸۸)

عدم کفایت شہادت محض زنان در حقوق

سوال (۶۴۷) رویت ہلال ماہ شوال یا ذی الحجہ کی و یا طلاق وعقد نکاح کی اگر صرف چار پانچ عورتیں شہادت دیں تو ان امور میں ان کی شہادت مقبول ہے یا نہیں، یعنی چار پانچ عورتوں کی شہادت سے طلاق وعقد نکاح وماہ شوال وماہ ذی الحجہ ثابت ہو جاوے گا یا نہیں؟

الجواب - ثابت نہ ہوگا، فی الدر المختار اول کتاب الشہادات بعد ذکر نصابہا فی الزنا والحدود والقصاص والولادۃ والبکارۃ وعیوب النساء مانصہ ونصابہا لغیرہا من الحقوق سواء کان الحق مالا اوغیرہ کنکاح وطلاق الی قولہ رجلان اورجل وامرأتان ثم قال ولم تقبل شہادۃ اربع بلا رجل، واللہ تعالیٰ اعلم

۶ رجب ۱۳۲۲ھ (امداد ج ۳، ص ۸۲)

شہادت دو کس بریک جزو دعویٰ وشہادت دو کس بر جزو دیگر

سوال (۶۴۸) کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ ایک شخص نے دو امر کے دعوے کئے، اس کے ثبوت میں شہادت پیش کی، دو شخصوں نے ایک امر کی شہادت دی، اور دو نے دوسرے امر کی، اول دو شخصوں میں سے ایک نے بیان کیا کہ مجھے دوسرے امر کا علم نہیں، اور وہ اسی جلسہ میں تھا

مگر یہ نہیں معلوم ہوا کہ اول سے آخر تک یا تھوڑی دیر، پس اس صورت میں دوسرے امر کی شہادت ثابت ہو جاوے گی یا نہیں، نصاب شہادت موجود ہے، اس شخص کا انکار ہے اور تردد ہے کہ تمام جلسہ میں رہا یا نہیں؟

الجواب۔ فی الہدایۃ باب الاختلاف فی الشہادۃ واذا شہد شاہدان انہ قتل زیداً یوم النحر بمکۃ وشہد اخران انہ قتلہ یوم النحر بالکوفۃ واجتمعوا عند الحاکم لم یقبل الشہادتین لان احدہما کاذبۃ بیقین ولیست احدہما باولی من الاخری اس روایت سے معلوم ہوا کہ جہاں دو دو شاہد ایسے دو امر پر ہوں جن میں تنافی نہ ہو، دونوں شہادتیں مقبول ہیں، پس صورت مسئولہ میں دونوں شہادتیں مقبول وثابت ہیں، وہذا ظاہر جدا واللہ اعلم۔

۱۱ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ (امداد ثالث ص ۸۳)

عدم جواز شہادت بسماع واقعہ

سوال (۴۹۴) جو واقعہ چشم دید نہ ہو اور اکثر لوگوں میں مشہور ہونے کی وجہ سے یا بعض قرائن سے ظن غالب ہو جائے ایسے واقعہ کی شہادت دینی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب۔ جائز نہیں۔ ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ ص ۳۱)

تقدیم گواہان شخصیکہ خلاف ظاہر دعوی کند

سوال (۴۹۵) ایک عورت تھی وہ بیماری کی حالت میں اپنے باپ کے ہمراہ اپنے خاوند کے گھر سے خوشی بخوشی خاوند سے گئی اور لڑکا لڑکی اس عورت کے کچھ نہیں ہوا، وہ قریب ایک ہفتہ کے اپنے باپ کے گھر جا کر مر گئی بعد میں اس کے باپ نے اپنے داماد پر دعویٰ کر دیا کہ مہر مجھ کو بتا دیا ہے، اور دو گواہی بھی پیش کی، اور اس عورت کے خاوند نے اپنے خسر سے کہا کہ مہر مجھ کو معاف کر دیا، کئی برس ہوئے اور اس نے بھی گواہ پیش کئے، مگر یہ جھگڑا برادری میں ہے۔ عدالت میں نہیں، اس کی بابت کیا حکم ہے؟

الجواب۔ خاوند کے گواہ مقدم ہیں، اگر معتبر ہوں۔ لانہ یدعی خلاف الظاہر

۲۴ رمضان ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ ص ۸۰)

کتمان شہادت بخوف جرح وکلاء

سوال (۴۹۶) کتمان شہادت سخت گناہ ہے لیکن عدالت انگریزی میں سچی شہادت میں بھی شاہد سے جرح وغیرہ میں گھبرا کر جھوٹ کہلاتے ہیں

اور نا تجربہ کار سیدھے ملا کو اس کا زیادہ اندیشہ ہے، اس اندیشہ سے انکار کر دینا جائز ہے یا نہیں

الجواب - اگر اس واقعہ کے ثبوت کا مدار اس کی شہادت پر ہو تو کتمان و عذر ناجائز ہے اور جرح میں سچا آدمی جس کو خاص کسی شق کا ثابت کرنا مقصود نہ ہو بلکہ یہ نیت رکھے کہ خواہ مقدمہ بگڑے یا سنورے بجز سچ کے کچھ نہ کہوں گا، ایسا شخص جرح میں کبھی پریشان نہیں ہوتا، ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ص ۲۱)

عدم جواز کتابت شہادت بلا تحقیق

سوال (۵۲۴) دوسری بات یہ ہے کہ جب کام ختم ہو جاتا ہے تو روپے کا حساب کا جو کاغذ ہوتا ہے اس پر ہم کو گواہ کے طور پر دستخط کرنا ہوتا ہے، اور اس میں اکثر بعض بعض انگریز کچھ زیادہ روپیہ بڑھا لیتا ہے تو اس کاغذ پر ہم کو جھوٹی گواہی دینی ہوتی ہے، اگر ویسے کچھ انکار کیا جاوے تو رنج پڑتا ہے تو یہ دستخط کرنا جائز ہے یا نہیں؟ **الجواب** - یہ تو ظاہر بات ہے اس میں پوچھنا کیا (حوادث اول ص ۱۳۵)

جواز شہادت زور در بعض مواضع

سوال (۵۳۴) یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی، خلاصہ جواب عنایت فرماویں کہ گواہی پر دستخط کروں یا نہ کروں، اگرچہ صاحب سے رنج ہو یعنی نہ کرنے میں ضرور رنج ہوگا، اگر اس میں گنہگار ہوتا ہوں تو مجھ کو اس کی ناراضگی قبول ہے جواب تحریر فرماویں، **الجواب** - ہاں جائز تو نہیں اگر بہت ہی ضرر کا اندیشہ ہو تو مجبوری میں گنجائش ہے، ربیع الاول ۱۳۳۴ھ (حوادث اول ص ۱۳۵)

نفقہ شاہد یعنی خوراک گواہ از عدالت

سوال (۵۴۴) سرکاری عدالتوں میں شہادت دینے کے لئے زاد راہ ملتا ہے، کیا اس کا لینا جائز ہے؟

الجواب - جائز ہے، لیکن ضروری خرچ سے جو بچے وہ صاحب رقم کو واپس کر دیا جائے اور اگر یہ شخص اہل و عیال کے لئے کوئی کام کرتا ہو، اور اس کے کام کا کوئی حرج ہو تو اس میں سے اہل و عیال کا خرچ بھی لے لے پھر جو بچے واپس کر دے -
۱۳ صفر ۱۳۳۴ھ (تتمہ رابعہ ص ۶۲)

حکم خوراک گواہ کہ از عدالت می یابد

سوال (۵۵۴) اگر عدالت بلا کر کے شہادت لیوے اور بصیغہ خوراک عدالت سے ملے اس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب - اس شخص کا جتنا خرچ ہوا ہے اس کو رکھ کر باقی روپے والے کو واپس کر دے، ۲۷ شعبان ۱۳۳۱ھ (حوادث اول و دوم ص ۱۱۵)

کتاب الشفعہ

استحقاق الشفعہ در زمین کہ بعوض کمی سابق کہ بوجہ استحقاق غیر در مبیع باشد دادہ می شود

سوال (۵۶۴) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس میں کہ مسمی امیر احمد نے مسماۃ وزیر النساء کے بعوض اس اپنے روپے کے کہ اس نے بشمول اراضی ملکیت اپنے کے لعیہ ذرعہ اراضی ملکیت مساۃ عیدو زوجہ کلو و چمن پسر کلو کے خرید کری تھی، ایک زمین تعدادی تیرہ ذرعہ لی کہ جس کا مسمی رشید احمد شفیع لاصق ہے، کہتے ہیں کہ جو وزیر النساء نے اکتالیس درعہ نو گرہ اراضی بذریعہ بیع نامہ سابق بنام امیر احمد بیع کی تھی اس میں انیس درعہ اراضی کی کمی بسبب ثبوت استحقاق غیر یعنی عیدو وغیرہ کے امیر احمد کو پڑی، وزیر النساء نے اس تعداد اراضی اکتالیس درعہ نو گرہ مذکور مبیعہ سابق کو اس تیرہ درعہ اراضی سے پورا کر دیا پس یہ معاوضہ کمی بیعنامہ سابق ہے، کوئی بیع جدید نہیں کہ جو رشید احمد کو شفعہ پہونچے، اب رشید احمد کو شفعہ بموجب شرع شریف کے لینا پہنچتا ہے یا نہیں۔ اور یہ معاوضہ اقرار نامہ بیع ہے یا نہیں۔

الجواب - صورت مسئولہ میں جو وزیر النساء نے امیر احمد کے ہاتھ زمین فروخت کری، اور اس میں غیر کا حق نکل آیا، اور اس کی وجہ سے اس مبیع میں کمی ہوگئی تو بقدر اس کمی کے وزیر النساء پر امیر احمد کا روپیہ واپس کرنا واجب ہوا، لیکن وہ دونوں باہم راضی ہوگئے ہیں، اور اس روپیہ کے عوض کچھ زمین وزیر النساء نے امیر احمد کو دیدی پس یہ بیع جدید ہوئی، کہ مبادلہ مال بمال ہے، اور اس میں رشید احمد شفیع کو شفعہ شرعاً پہونچے گا اور بظاہر اگرچہ یہ بیع تکمیل بیع اول کی معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت میں بیع اول سے کچھ علاقہ نہیں بیع جدید ہے، کیونکہ جب بوجہ استحقاق غیر اس زمین میں کمی آگئی تو بقدر اس کی کمی کے وزیر النساء بائعہ پر مشتری کا روپیہ لوٹانا واجب ہوا اور مشتری وہ روپیہ اس بائع سے برجبر لے سکتا ہے، بائعہ کو مجاز نہیں کہ روپیہ نہ دے اور عوض میں زمین دے اور اسی طرح اگر بائعہ روپیہ دے تو مشتری کو مجاز نہیں کہ روپیہ لینے سے انکار کرے اور زمین عوض میں طلب کرے۔ غرض واجب الادا روپیہ مذکور ہے زمین کے دینے لینے پر بائعہ و مشتری مجبور نہیں بلکہ زمین کا معاوضہ تراضی طرفین پر موقوف ہے تو اگر یہ بیع اول نہ ہوتی تو بوجہ ایجاب و قبول و تراضی سابق بائعہ و

مشتری پر زمین کے دینے لینے میں جبر کیا جاتا اور روپیہ کا دینا یا لینا بلا رضا مشتری و بائع کے جائز نہ ہوتا کیونکہ روپیہ کا واپس ہونا فسخ ٹھہرتا اور فسخ بیع بلا رضا جانبین جائز نہیں تو جب زمین کے معاوضہ میں کسی کا جبر نہیں۔ اور روپیہ لینا دینا بجبر جائز ہے تو معلوم ہوا کہ یہ بیع اول نہیں بیع جدید ہے، کہ تراضی طرفین کی حاجت پڑی، پس جب بیع جدید ہوئی تو استحقاق شفعہ سے اب کون مانع ہے، یہ بات بہت ظاہر ہے ذرا تامل سے معلوم ہوسکتی ہے۔

۳۰ ربیع الاول ۱۳۰۱ھ (امداد ثالث ص ۸۶)

شفعہ شریک وقت مبایعت شریکین

سوال (۴۵۷) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک جائداد مشاع غیر منقسم ہے، اس میں کئی شخص شریک ہیں اگر ایک شریک اپنا حصہ دوسرے شریک کے ہاتھ بیع کرے، تو دیگر شرکاء کو دعویٰ شفعہ کا پہنچتا ہے یا نہیں اور سب کو برابر پہنچتا ہے یا کم و زیادہ؟

الجواب - دیگر شرکاء کو دعویٰ شفعہ کا پہنچتا ہے کیونکہ سب کا استحقاق جائداد میں برابر ہے، اور سب شرکاء کو برابر حق پہونچے گا، کم و زیادہ نہیں۔ واذا اجتمع الشفعاء فالشفعۃ بینھم علی عدد رؤسھم ولا یعتبر اختلاف الاملاک، ھدایہ ج ۲ ص ۳۰۳

واللہ اعلم۔ ۵ صفر ۱۳۰۱ھ (امداد جلد ۳ ص ۸۷)

عدم استحقاق شفعہ باتصال بالمتصل۔

سوال (۴۵۸) کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص مسمیٰ زید ایک موضع کا مالک ہے کہ جس کا نام الہداد پور ہے، اس کے متصل دوسرا موضع پرورہ نام کا واقع ہے اور موضع پرورہ کے متصل ایک تیسرا موضع ہے کہ جس کا نام محکم پور ہے۔ موضع پرورہ اور محکم پور کا ایک شخص دوسرا مالک تھا اسی نے ان ہر دو مواضعات کو ایک ہی بیعنامہ کے ذریعہ سے کسی غیر شخص کے ہاتھ فروخت کردیا۔ موضع پرورہ کا پانی بہہ کر موضع الہداد پور میں جاتا ہے اور موضع الہداد پور کا پانی اراضی موضع پرورہ میں جاتا ہے اور اسی طرح سے آب پاشی موضع الہداد پور کے کھیتوں کی موضع پرورہ کے چاہات سے ہوتی ہے اور موضع پرورہ کے کھیتوں کی موضع الہداد پور کے چاہات سے ہوتی ہے اور راستہ ہر دو مواضعات کا ایک دوسرے میں ہوکر جاتا ہے اور اسی طرح موضع محکم پور کا راستہ اراضی موضع پرورہ سے گزرتا ہے اور پرورہ کا راستہ موضع محکم پور سے گزرتا ہے اور منافع آمد و رفت راستہ

اور پانی وغیرہ کے ہردو مواضعات کے یعنی پرورہ اور محکم پور کے متحدین اس صورت میں زید یعنی مالک موضع الہداد پور کو آیا استحقاق شفعہ بعینامہ مشترکہ ہر دو دیہات مذکورہ یعنی پرورہ اور محکم پور حاصل ہوگا یا نہیں۔ فقط

الجواب ۔ ملک جل / الہداد پور — ملک رجل / پرورہ محکم پور — فی عالمگیریۃ المجلد السادس صفحہ ۱۲ سطر ۴، ما نصہ صاحب الطریق اولی بالشفعۃ من صاحب مسیل الماء اذا لم یکن موضع مسیل الماء ملکا لہ اہ سوال کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مالک موضع الہداد پور شریک فی نفس المبیع تو نہیں مگر ان مواضع میں باہمی تعلقات ثابت کر کے ان کے شریک فی حق المبیع ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر اول تو الہداد پور اور پرورہ میں اس کا احتمال ہو سکتا تھا سو چونکہ ان دونوں کا کوئی طریق یا مسیل وغیرہ مدعی شفعہ و بائع میں مشترک بملک متماثل نہیں اور عالمگیری کی روایت بالا سے اس کا اشتراط معلوم ہوتا ہے لہذا خلط فی حق المبیع بھی ثابت نہیں اب صرف حق جوار رہ گیا جو صرف موضع پرورہ میں حاصل ہے سو اس میں دعویٰ شفعہ کا ہو سکتا ہے۔ بشرط عدم مبطل۔ واللہ اعلم

۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ

(۵۹۳) **سوال** ۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین بیچ اس مسئلہ کے کہ ایک شخص نے ایک مکان بیچ لیا اس مکان کے پڑوسی نے (جس کی بیچ کی دیوار ملی ہوئی ہے اور راستہ ہر دو مکانات کا شارع عام میں ہے) بعد طلب مواثبت اور استشہاد شرعی کے بعدالت دیوانی دعویٰ شفعہ کر دیا اور بتحریک مدعیٰ علیہ فیصلہ ثالث شخص پر منقطع ہوا (جس کا میں بھی ایک رکن ہوں) اس لئے از روئے شرع شریف فتویٰ لکھا جاوے تاکہ حق بجانب حقدار رسید کر دیا جائے۔

حکم شفعہ کی ایک صورت کا الخ

(ا) اگر مدعیٰ علیہ (مشتری) نے کوئی کسی قسم کی لاگت مکان مبیعہ میں لگائی ہو تو اس کی برداشت کون کرے گا شفیع یا مشتری۔

(ب) خرچہ عدالت فریقین کس طرح ڈالا جائے اس کا جواب مع اثبات مہر علماء دین استفتاء ہذا کی پشت پر تحریر فرمایا جاوے اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم عطا فرماوے۔

الجواب ۔ فی الدر المختار ویاخذ الشفیع بالثمن وقیمۃ البناء والغرس مستحق القلع کما مر فی الغصب قلت واما لو صبغها بالوان کثیرۃ او طلاها

بجصٍ کثیر وخیر الشفیع بین ترکہا او اخذھا واعطاء مازاد الصبغ فیھا لتعذر نقضہ ولا قیمۃ لنقضہ بخلاف البناء حاوی الزاھدی وسیجئ لوبنی المشتری او غرس او کلف الشفیع المشتری قلعھما الا اذا کان فی القلع نقصان الارض فان الشفیع لہ ان یاخذھا مع قیمۃ البناء والغرس مقلوعۃ غیرثابتۃ قہستانی فی ردالمحتار قولہ او کلف عطف علی یاخذ ج ۵ صـ ۲۲۷ عبارت بالا سے یہ امور ثابت ہوئے ۱؎ شفیع کو حق شفعہ دلایا جاوے ۲؎ جو لاگت مشتری نے لگائی ہے دیکھنا چاہئے اس کی کیا صورت ہے اگر کوئی عمارت بڑھائی ہے تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اس کے توڑنے پھوڑنے میں زمین کا کچھ نقصان ہے تب تو شفیع سے اصل قیمت اور ملبہ کی قیمت دونوں چیزیں دلائی جاویں گی مگر ملبہ کی وہ قیمت دلائی جاوے گی جو انہدام کے بعد قرار دی جاوے اور اگر زمین کا کوئی نقصان نہیں تو شفیع کو اختیار ہے خواہ مشتری سے کہدے کہ اپنی تعمیر جدا کرلے اور خواہ اصل زرثمن اور قیمت ملبہ بقید مذکور دیکر مکان لے لے، اور اگر کوئی تعمیر نہیں بنائی بلکہ کچھ لیپ پوت کیا ہے تو شفیع کو دو اختیار ہیں خواہ حق شفعہ چھوڑدے اور خواہ لاگت دے کر مکان لے لے اور خرچہ عدالت آیا مشتری کی جوابدہی کے سبب ہوا یا ابتدائی درخواست میں شفیع کا صرف ہوا؟

۲۲ شوال المکرم ۱۳۳۳ھ

کتابُ الغصب

براءۃ از حق باوارحق بلا اطلاع مالک

سوال (۴۰۰) کسی چور یا چور کے دوست کے پاس مال مسروقہ رکھا ہے۔ اب اللہ نے چور کے دل میں یا جس کو چور نے وہ مال مسروقہ ہبہ کردیا ہے، یہ بات ڈالی کہ یہ مال ہمارے لئے حرام ہے، اس کو واپس کرنا چاہئے، یا اگر وہ مال خرچ ہوگیا ہے، تو اس کی قیمت مالک تک پہونچانا چاہئے۔ مگر چور اور چور کے دوست جس کو چور نے وہ مال مسروقہ ہبہ کیا ہے۔ دونوں کو اندیشہ ہے کہ اگر مال یا مال کی قیمت مالک تک پہنچائیں گے تو حال کھل جائے گا، اور بے عزتی کے علاوہ قید کا خوف ہے تو کیا حیلہ کرے جس سے مالک کو مال یا قیمت پہونچ جائے، اور چو

اور چور کے دوست کی بے حرمتی بھی نہ ہو؟

الجواب ۔ پوشیدہ طور پر وہ مال مالک کے قبضہ میں جس تدبیر سے چاہے پہنچا دیئے سے یہ بریٔ الذمہ ہو جاوے گا۔ مالک کو اس کی اطلاع کی حاجت نہیں، کہ فلاں شخص نے یہ میرا حق دیا ہے۔ فی الدر المختار کتاب الغصب ویبرء بردها ولو بغیر علم المالك الی قولہ وکذا لو سلمها الیہ بجهة اخری کهبة او ایداع او شراء اھ واللہ اعلم

۸ ذیقعدہ ۱۳۳۲ھ (امداد ج ۳ ص ۸۴)

حکم تنخواہ از ریاست کہ بمال مغصوب دادہ شود

سوال (۴۶۱) زید کا ایک اسلامی ریاست سے بطور تنخواہ کے کچھ مقرر ہے، زید اس بات کو خوب جانتا ہے کہ ریاست اسلامیہ میں روپیہ بوجہ موافق احکام شرعیہ کے رعایا سے وصول نہ کئے جانے کے ظلماً وصول کیا جاتا ہے اور استیلا مسلم علی مال المسلم موجب ملک ہے نہیں، پس اس صورت میں زید کی یہ آمدنی جائز ہوگی یا نہیں، اور اسی بنا پر ایسی ریاستوں کی نوکری بھی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، ہر چند کہ غصب وظلم کا مال اپنے مال میں یا دوسرے مغصوب مال میں ملا دینے سے ملک غاصب میں داخل ہو جاتا ہے، مگر وہ ملک خبیث ہوگی، نہ اس کو خود اس کا صرف کرنا جائز ہے، نہ دوسروں کو اس کا قبول کرنا جائز ہے، جب تک کہ غاصب اس کا ضمان ادا نہ کردے، پس صورت مسئولہ میں زید کی آمدنی جائز نہ ہوگی، نہ ایسی ریاست کی نوکری جائز ہوگی، والروایات هذه اما التملك بالخلط بمال نفسه او غیرہ فلما فی الدر المختار ولو خلط السلطان المال المغصوب بماله ملکه فیجب الزکوٰة فیه ویورث عنه لان الخلط استهلاك اذا لم یکن تمییزه عند ابی حنیفة وقوله ارفق اذ قلما یخلو مال عن غصب ۱۳۵ وفیه اما اذا اخذ من انسان مائة ومن آخر مائة وخلطهما ثم تصدق لا یکفر لانه لیس بحرام لعینه بالقطع لاستهلاکه بالخلط ۱۳۵، قلت وافاد ایضا کون هذا المخلوط حراما خبیثا ولو حراما لا لعینه ۱۲ واما حرمة الانتفاع به فلما فیه ایضا فان غصب وغیر المغصوب فزال اسمه واعظم منافعه او اختلط المغصوب بملك الغاصب بحیث یمتنع امتیازه او یمکن بحرج ضمنه وملکه بلا حل الانتفاع قبل اداء ضمانه ای رضاء مالکه باداء او ابراء او تضمین قاض والقیاس حله وهو روایة فلو غصب طعاما فمضغه

حق صار مستهلکا یبتلعه حلالا فی روایة حراما علی المعتمد حسما لمادة الفساد ۲۶۶، واما حرمة قبول الغیر له فلما فیه ایضا وجاز رزق القاضی من بیت المال لو بیت المال حلالا والا لم یحل ۳۱۹ قلت والفرع بعد تمهید الاصول ظاهر حکمه واللہ اعلم فقط (امداد ص ۸۴ ج ۳)

حق مسیل | **سوال** (۴۶۲) پانی پرنالہ ہمسایہ کا اپنی چھت یا صحن میں لے کر اور حق متعلقہ آج تک پرنالہ کے بزور بازو یا زور عدالت زائل کرانا جائز ہے یا نہ

الجواب۔ مسیل یعنی پرنالہ وبدرو وغیرہ نکالنا حقوق ملک سے ہے۔ جو شخص اس جگہ کا مالک ہے اس کو ہر طرح کا تصرف پہنچتا ہے، پس یہ شخص جو حق پرنالہ ہمسایہ کو زائل کرنا چاہتا ہے، اگر وہ پرنالہ گرنے کی جگہ اس شخص کی مملوک ہے اور اب تک بطور تبرع واحسان ورعایت ہمسایہ کو پانی ڈالنے کی اجازت دے رکھی تھی اور اب زائل کرنا چاہتا ہے اور پرنالہ بند کرتا ہے، یہ جائز ہے، اپنی ملک کا اختیار ہے۔ اور اگر وہ جگہ ہمسایہ کی مملوک ہے تو اس شخص کو اس کا پرنالہ بند کرنا جائز نہیں کہ یہ غصب ہے۔

ومن اشتری بیتاً فی دار او منزلا او مسکنا لم یکن له طریق الا ان یشتریه بکل حق هوله او بمرافقه او بکل قلیل وکثیر وکذا الشرب والمسیل هدایہ ج ۲ ص ۹۴ واللہ اعلم۔ ۳ جمادی الاول ۱۳۰۸ھ (امداد ج ۳ ص ۸۵)

سفر ریل بلا کرایہ باجازت گارڈ | **سوال** (۴۶۳) زید نے بتحریک گارڈ ریلوے گاڑی پر بلا کرایہ سفر کیا، چونکہ گارڈ نے اسٹیشن ماسٹر وغیرہ سے کہہ دیا کہ یہ شخص میرا دوست ہے، لہذا کسی ملازم ریلوے نے کرایہ زید سے نہ مانگا، گارڈ کہتا ہے کہ مجھ کو اختیار ہے کہ بلا کرایہ اپنے ہمراہ دو ایک اشخاص کو ریل پر سفر کراؤں، حالانکہ یہ بیان گارڈ کا بالکل ہی غلط ہے، گارڈ ملازم ریلوے کمپنی کا ہے، نہ کہ مالک ریل کا، لہذا اس صورت میں زید کا سفر ریل بلا کرایہ جائز ہے یا نہیں، اور اگر ناجائز ہے تو اب کرایہ کیونکر ادا کرے۔ اپنی اس غلطی کے اظہار میں خوف ہے کہ فوجداری سپرد نہ ہو جاوے، لہذا اس کو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے۔ بینوا توجروا۔

الجواب۔ زید کو یہ دیکھنا چاہئے کہ میرے ذمہ کتنا کرایہ واجب ہے، اس قدر داموں کا ایک ٹکٹ اسی ریلوے کا خرید کر اس ٹکٹ کو ضائع کر دے، اس سے کام نہ لے

حق واجب کمپنی کا ادا ہو جاوے گا۔ ۲۵ رجب ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ۲ ص ۱۰۷)

جواز وصول کردن حق خود از جنس حق وعدم جواز آن از غیر جنس

سوال (۴۶۴) کیا فرماتے ہیں علمائے دین ان مسائل میں (۱) زید نے عمرو کے مبلغ عہ یا ایک ٹوپی جس کی قیمت مبلغ عہ ہے، غصب کر لی، اور عمرو بوجہ کمزور ہونے کے وصول نہیں کر سکتا، کیا عمرو کو یہ حق ہے کہ زید کا جوتہ جو کہ مبلغ عہ کا ہے یا اور کوئی چیز اسی قدر قیمت کی یا نقد عہ جس طرح ممکن ہووے، وصول کرے۔ اگر ایسا کیا تو مال اور معاملہ درست ہے یا نہیں؟

جواب۔ غیر جنس حق[1] کو وصول کر کے اس کو محبوس کر لے پھر اپنے حق کا مطالبہ کرے اگر وہ دیدے تو اس کی چیز واپس کر دے۔ (تتمہ خامسہ ص ۱۸۹)

سوال (۲) زید نے اپنے موروثی کاشتکار سے یہ کہدیا کہ جو زمین موروثی تو مبلغ صہ لگان پر کاشت کرتا ہے، اب تم کو عہ لگان پر کاشت کرنا ہوگا اگر تو اس قدر لگان پر رضامند نہیں ہے تو اراضی کو چھوڑ دے، کاشتکار بوجہ موروثیت کے نہ زمین چھوڑتا ہے اور نہ مبلغ عہ لگان ادا کرتا ہے، کیا زید کو یہ حق ہے کہ کاشتکار سے بقیہ مبلغ صہ امکانی صورت میں خواہ سود سے خواہ نقد یا اس کے سامان سے جس طرح ممکن ہو وصول کرے، جب کہ زید قانون حکومت کی وجہ سے اراضی پر قبضہ کرنے سے مجبور ہے۔

جواب۔ روپیہ وصول کرنے کا تو حق ہے، جس طرح وصول ہو سکے اور دوسری چیز میں حق حبس ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، ۳ رفروری ۱۹۲۱ء (تتمہ خامسہ ص ۱۸۹)

عدم جواز انتفاع از اراضی موروثی باوجود رضائے مالک زمین

سوال (۴۶۵) زمین موروثی کا کاشتکار زمیندار سے یہ کہتا ہے کہ اپنی زمین لے لو، اور زمیندار کہتا ہے کاشتکار سے کہ تم موروثی مت چھوڑو، کیونکہ اگر تم چھوڑ دوگے تو ہمارا کچھ نفع نہیں ہوتے کا، یا تو اس زمین کو تمہارے پچا برتیں گے، یا تمہارے بھائی لوگ برتیں گے مجھے ملے گی نہیں، بلکہ زمیندار یوں کہتا ہے کہ زمین کی میری طرف سے اجازت ہے تم خود برتو اور کچھ لگان زیادہ کر دو، یعنی تین روپے کی جگہ چار روپے کر دو یا پانچ کر دو، مگر میری طرف سے خوشی سے برتو، اور سخت مجبور ہو کر زمیندار نے ایسا کیا ہے، اس زمین کا برتنا جائز ہے یا ناجائز؟

---

[1] مفتی بہ قول پر غیر جنس سے بھی اپنا حق وصول کرنا جائز ہے قال فی العلائیۃ لیس لذی الحق ان یاخذ غیر جنس حقہ وجوزہ الشافعی وہو الاوسع وفی الشامیۃ قدمنا فی کتاب الحجر ان عدم الجواز کان فی زمانہم اما الیوم فالفتوی علی الجواز۔ رد المحتار ص ۵ رشید احمد عفی عنہ

الجواب ۔ چونکہ اس صورت میں یہ یقینی امر نہیں کہ یہ رضا مندی زمیندار کی ہمیشہ رہے گی، یا اگر خاص اس کاشتکار کے حق میں رہی تو یہ یقینی نہیں، کہ اس کی اولاد و ورثہ کے حق میں ہمیشہ رہے گی۔ اسی طرح یہ یقینی نہیں کہ اس زمیندار کے ورثہ کی بھی اسی طرح رضا مندی رہے گی پس اگر رضا مندی مذکور جو کہ شرط ہے حلت انتفاع کی، آئندہ نہ ہوئی: اور کاشتکار نے اس وقت زمین چھوڑنا نہ چاہا تو ظاہر ہے کہ زمیندار مجبور ہو گا۔ پس اس وقت کی رضا مندی کی بنا پر قابض رہنا آئندہ کے ظلم کی بنا ڈالنا ہے، اور ظلم جس طرح مباشرۃً حرام ہے: اسی طرح تسبباً بھی جب کہ تسبب مظنون ہو، اور یہاں واقعات سے یہ تسبب یقینا مظنون ہے۔ اس لئے اس وقت کی رضا مندی سے منتفع نہ ہونا چاہئے، اور گو اس وقت اس کے چھوڑنے سے دوسرے ظالم لے لیں گے۔ مگر اس ظلم کا سبب یہ تو نہ ہو گا، اس کا قصد تو اپنا تبریہ ہے۔ ۵ رذی الحجہ ۱۳۳۹ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۰۱)

حکم منافع اراضی خریدشدہ الخ

سوال ۔ (۴۶۶) زید مسکین و نابینا است و قوت کسب ہم ندارد و اورا قطعہ زمین از راہ وراثت بدست آمدہ است لیکن مورث متوفی او حین حیات خود از شخصے ہندو مذہب چند نقد غصب کردہ بود پس آں ہندو در سرکار انگریزیہ مقدمہ بر آں مورث کردہ بود و مقدمہ او ناثابت شد لیکن زید بہ یقین یا ظن میداند کہ مورث او زمین مذکور باں نقد مغصوب خریدہ بود حالا زید را پیدائش آں زمین خوردن جائز است یا نہ۔

الجواب ۔ حکم ایں چنیں غلہ تصدق است بر مساکین پس زید تا وقتیکہ مسکین ست بحیثیت مسکین بودن اگر منتفع شود گنجائش است نہ بحیثیت وارث بودن کہ مال حرام از وراثت حلال نمی شود و ہر گاہ مسکنت و حاجت نماند لان المال غادر ائمہ باز بر مسکینان تصدق نماید۔ ۱۱ رجب ۱۳۳۹ھ (تتمہ ثالثہ ص ۱۹۱)

تفصیل ضمان متلفات در عمر نابالغی

سوال (۴۶۷) زید حالت صغر میں لوگوں کے باغ سے بلا اجازت کبھی کبھی میوہ کھاتا تھا یہ تو ظاہر ہے کہ حالتِ صغر میں مکلف نہ تھا، لیکن دریافت کرنا اس امر کا ہے کہ بعد بلوغ کے صاحب ثمر سے معاف کرالینا زید پر واجب ہو گا یا نہیں، باغ اس قسم کا تھا کہ اہتمام سے اس کی حفاظت نہیں ہوتی تھی کیونکہ صاحب باغ کو باغ سے چنداں معتد بہ نفع حاصل نہیں ہوتا تھا لیکن جب کبھی کسی کو باغ

میں دیکھتا تھا منع کرتا تھا، اور اس سے رنجیدہ ہوتا تھا۔

الجواب ۔ فی الدر المختار وان اتلفوا ای ھؤلاء المحجورون (من العبد والمجنون والصبی) سواء عقلوا او لا ودرّ شیئا مقوما من مال ونفس ضمنوا اذ لاحجر فی الفعل لکن ضمان العبد بعد العتق علی ما مر وفی الاشباہ الصبی المحجور مؤاخذ بافعالہ فیضمن ما اتلفہ من المال للحال واذا قتل فالدیۃ علی عاقلتہ الا فی مسائل لو اتلف ما اقترضہ وما اودع عندہ بلا اذن ولیہ وما اعیر لہ وما بیع منہ بلا اذن اھ وفی رد المحتار تحت قولہ مواخذ بافعالہ ھذا من باب خطاب الوضع وھو لا یتوقف علی التکلیف لان الخطاب نوعان خطاب وضع وخطاب تکلیف کما فی جمع الجوامع وفیہ تحت قولہ لو تلف ما اقترضہ وفی قول ابی یوسف ھو ضامن ثم قال ولو اتلف مال غیرہ بلا سبق ایداع او اقراض ضمن بالاجماع (ج ۵ ص ۱۴۰، ۱۴۱) وفی رد المحتار ولو اقرض صبیا و عبدا محجورین لا ضمان فی الحال ولا المال بلا خلاف وقیل القرض علی الخلاف ۔ شرنبلالی ج ۵ ص ۱۴۲، ان عبارات سے جو میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ صورت مسئولہ میں ضمان تو لازم ہوا، مگر بطور خطاب تکلیف کے نہیں، بلکہ بطور خطاب وضع کے یعنی اتلاف کے وقت اگر اس صبی کی ملک میں کچھ مال ہوتا تو اس میں سے اس متلف کا ضمان دینا ولی پر واجب تھا اور اگر ولی نہ دیتا اور اسی حالت میں وہ بالغ ہو جاتا، اور وہ مال بھی جس سے ضمان کا تعلق ہو گیا تھا باقی رہتا تو اس پر بعد بالغ ہونے کے اس ضمان کا ادا کرنا واجب ہوتا، لتعلق حق الغیر بمالہ اور ادا نہ کرنے سے عاصی اور اگر اس وقت مال نہ تھا، یا وہ مال قبل بلوغ کے ہلاک ہو گیا تو اس کے ذمہ اس متلف کا کوئی مواخذہ نہیں، لانعدام خطاب التکلیف لعدم البلوغ وانعدام خطاب الوضع لعدم محل تعلقہ ای المال فقط، اور قرض میں جو ایک قول عدم ضمان حالاً و مآلاً کا ہے، اس پر اس کو قیاس نہ کیا جاوے کیونکہ اقراض میں مالک کی طرف سے تسلیط پائی گئی تھی، اور یہاں نہیں پائی گئی، لیکن سائل کو چاہئے کہ دوسرے علماء سے بھی تحقیق کرلے ۔ یکم رجب ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۷۴)

جواز وصول معارف در گم شدہ پارسل	**سوال** (۴۶۸) دو ریلوے پارسل ریلوے کمپنی نمبر ۱ کے ذریعہ سے فیروز پور بھیجے گئے، اتفاقاً اس شخص نے جس کے لئے وہ بھیجے گئے

تھے نہیں لئے تو پھر کمپنی نمبر ۳ کو فیروز پور لکھا کہ وہ پارسل واپس کر دو۔ اس نمبر ۳ کمپنی نے

پارسل واپس کئے اور یہ لکھا کہ کمپنی نمبرا سے اپنے پارسل لے لو، جب کمپنی نمبرا سے پارسل لینے گئے تو وہاں بجائے دو کے ایک ہی پارسل تھا، اور ایک گم ہوگیا تھا۔ جب اس سے بہت خط وکتابت کی تو اس نے لکھا کہ ہم نے کمپنی نمبر۲ سے ایک ہی پارسل پایا، تم اپنے گم شدہ پارسل کا مطالبہ کمپنی نمبر۲ سے کرو، حالانکہ پارسل نمبر۳ نے گم کیا تھا، مگر کمپنی نمبرا نے کمپنی نمبر۲ کا غلط حوالہ دیا، بہرحال ہم کمپنی نمبر۲ سے دو برس تک خط وکتابت کرتے رہے، اس نے کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا بلکہ وقت اپنی غفلت اور لاپرواہی سے ضائع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قانوناً ہم کمپنی نمبرا یا نمبر۳ سے جو پارسل لانے اور لیجانے والی ہیں کسی قسم کا مطالبہ نہیں کرسکتے تھے۔

اس لئے ہم نے کمپنی نمبر۲ الف اصل مالیت کی ب اُس کے سود کی ج خطوط کے مصارف کی بحساب فی خط ۳؍ نالش کردی، عدالت نے باوجود فریق ثانی کی سخت جدوجہد کے ہمارا کل مطالبہ تسلیم کرکے ڈگری دیدی اور اس کی رقم سرکاری خزانہ میں کمپنی نمبر۲ سے وصول کرکے داخل کرلی، اور اب ہماری درخواست پر ہمیں سرکاری خزانہ سے وہ رقم ملیگی۔

دریافت طلب یہ ہے کہ مذکورہ نالش سے ہم اپنا روپیہ لے سکتے ہیں، نیز سود کے نام کی رقم جو ایک حربی سے وصول ہوئی ہے اور جس پر پہلے گورنمنٹ مستولی ہوگئی ہے اور اسی طرح ارکے خط کا ۳؍ یہ سب جواب ہیں گورنمنٹ کے ہاتھوں سے ملے گا، کسی طور پر ہم اس کے مستحق ہوسکتے ہیں، کمپنی نمبر۲ کا وکیل یہ بھی کہتا تھا کہ جو روپیہ ہم نے تمہیں دیا ہے، یہ ہم کمپنی ۱ سے وصول کرلیں گے، سود کی رقم اس لئے مجبوراً لگانی پڑتی ہے کہ عدالت سے پورا خرچہ نہیں ملتا، اور خرچہ وصول کرنے کا سوائے سود کے اور کوئی حیلہ بھی نہیں ہے۔

تشریح

ابتداءً جسے پارسل دیا گیا تھا وہ کمپنی نمبرا ہے، اور اس کمپنی نے وہ پارسل کمپنی نمبر۳ کے سپرد کیا۔ پھر نمبر۳ نے ہماری درخواست پر نمبرا کو واپس کیا، یہ نمبرا کی غلطی تھی کہ ہمیں بجائے اس کے کہ یہ ہدایت کرتی کہ تم اپنا گم شدہ پارسل کمپنی نمبر۳ سے لو، یہ لکھدیا کہ نمبر۲ سے لو ہم نے اسی تحریر کی بناء پر جس کی غلطی اب دوران مقدمہ میں ثابت ہوئی، کمپنی نمبر۲ سے مطالبہ کیا، اس کمپنی نمبر۲ کا یہ فرض تھا کہ یہ ہم سے صاف کہدیتی کہ اس پارسل سے ہم کو کچھ تعلق نہیں ہے بلکہ بجائے صاف جواب کے ہم سے ہمارے مال کا بل (حساب) مانگا، جس سے ہمیں

اپنے مطالبہ کے جائز اور وصول ہو جانے کا یقین ہوگیا۔ نالش کمپنی نمبر ا یا نمبر ۲ پر اس لئے نہیں ہوسکتی کہ نالش کے لئے چھ ماہ کے اندر ہونے کی شرط ہے، اب جبکہ دو برس شخص کمپنی نمبر ۲ کی غفلت ولا پروائی سے گذر گئے۔ اس لئے ہم نے اس پر نالش کی، غالباً باہمی تعلقات کمپنیوں میں یہ ہیں کہ ایک کمپنی دوسری کمپنی کے ٹکٹ یا پارسل کا لین دین بطور وکالت بلا اجر کے کرتی ہے۔ بطور اجر کے چند پیسے جو کبھی ایک آنہ سے زائد نہیں ہوتے جسے وہ حق تحریر کہتے ہیں۔

الجواب۔ اصل مصارف وصول کرنا جائز ہے، اور خرچہ ضروری بھی اصل مصارف کے ساتھ ملحق ہے، جن میں خطوط کے ٹکٹ بھی داخل ہیں، اور سود لینا جائز نہیں نہ فی خط عہ لینا البتہ اگر یہ خرچ بدون عنوان سود کے وصول نہ ہو تو بمقدار اس کے بعنوان سود بھی وصول کر سکتے ہیں زائد نہیں، اور حربی کا مال جو عقود فاسدہ سے مباح ہوتا ہے، اس میں اس کی رضا شرط ہے، اور استیلاء جو موجب ملک ہے وہ ہے جو بہ نیت تملک کے ہو، اور یہاں استیلاء صرف مستغیث کے حق کی حفاظت کے لئے ہے، لہذا حق سے زائد حلال نہ ہوگی۔

۱۴ شوال ۱۳۳۹ھ (حوادث خامسہ ص۲۴)

تعیین ضامن در واقعہ مذکورہ سوال

سوال (۷۶۹) شہر رنگون کا ایک تازہ واقعہ یہ ہے کہ زید کی بلا اجازت بکر نے زید کے نام وی پی پارسل ڈاک اپنے پاس سے روپیہ دے کر وصول کرلیا، پھر بکر نے وہ پارسل عمرو کے ہاتھ سے زید کے جائے قیام لب سڑک بالاخانہ پر جس میں دوسرے لوگ بھی رہتے ہیں، اس کی عدم موجودگی میں پہنچا دیا جس کو زید کے خاص عزیز خالد نے رکھ لیا تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص نے آکر خالد سے یہ کہا کہ زید بکر کی دوکان میں بیٹھا ہوا ہے، اور وہ آیا ہوا پارسل مانگتا ہے، اس لئے بکر نے مجھ کو بھیجا ہے، خالد نے یہ گمان کیا کہ آیا ہوا شخص بکر کا ملازم ہے بکر نے زید سے کہا ہوگا کہ میں تمہارا پارسل چھڑا کر تمہارے جائے قیام پر دے آیا ہوں اس لئے زید نے پارسل کھول کر پارسل کی چیزیں بکر کو دکھانے کے لئے منگایا ہوگا، لیکن چونکہ خالد بکر کے نوکر کو پہچانتا نہ تھا، اس لئے احتیاطاً وہ خود پارسل کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس آنے والے شخص کے ہمراہ ہوگیا، جب بالاخانہ کی سیڑھیوں سے نیچے سڑک پر اترا تو وہ پارسل اس شخص کے ہاتھ میں دیکر خود اس کیساتھ ہولیا، بیس پچیس قدم دونوں ساتھ رہے، جب چوراہے کی چوڑی سڑک پر جس پر موٹر

گھوڑا گاڑیاں وغیرہ بکثرت چلتی ہیں دونوں پہنچے تو آیا ہوا شخص پارسل ہاتھ میں لئے ہوئے بکر کی دوکان کی جانب ہلکی رفتار سے دوڑا، خالد بھی تیز رفتاری سے اس چوڑی سڑک کو قطع کرکے کچھ قدم اس کے پیچھے دوڑا، جو واپسی سے تقریباً سو قدم پر بکر کی دوکان لب سڑک تھی، اس قدر فاصلہ طے کرنے میں لوگوں کے ہجوم کے سبب سے وہ شخص نظر سے غائب ہوگیا، بکر کی دوکان تک پہنچنے پر جب خالد نے بکر سے دریافت کیا کہ آپ کا کوئی آدمی ابھی پارسل لے کر آیا ہے؟ اس نے کہا کوئی آدمی ابھی نہیں آیا، غرض یہ ہے کہ اس طور پر اتنے وقفہ میں وہ آیا ہوا شخص پارسل لیکر غائب ہوگیا۔ پس ارشاد ہو کہ مذکورہ بالا میں آیا زید خالد پر ضروری ہے کہ پارسل مذکورہ کی قیمت بکر کو ادا کرے اگر ضروری ہے تو دونوں میں سے کون شخص قیمت ادا کرنیکا ذمہ دار ہے، بینوا توجروا

الجواب تجار سے تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ وی پی کے ضائع ہونے کی صورت میں حرف مرسل الیہ سے قیمت کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عملہ ڈاک کا بائع کا وکیل ہوتا ہے۔ اور ثبوت بیع کا وصول کے وقت بطور تعاطی کے ہوتا ہے۔

اس مقدمہ کے بعد جواب مسئلہ کا ظاہر ہے کہ زید نے جب نہ وصول کیا نہ وصول کو جائز رکھا تو یہ بیع زید کے ساتھ نہیں ہوئی بلکہ یہ پارسل بکر کے ہاتھ میں مرسل کی امانت رہی جو اس کے پاس سے خالد کے پاس چلی گئی۔ آگے خالد کی بے احتیاطی سے ضائع گئی، پس اصل ضمان اس بکر کے ذمہ ہے جو کہ قیمت ادا کرنے سے بائع کے پاس پہنچ گیا، اب بکر اس ضمان کو خالد سے وصول کرے گا، البتہ اگر اس پارسل کی قیمت مع خرچہ کے اس مقام پر وی پی کی رقم سے کم ہو تو بھی مقدار خالد کے ذمہ ہوگی، اور اگر بکر کے وصول کی خبر سنکر زید نے اس وصول کو جائز رکھا ہو تو یہ بیع زید کے ذمہ لازم ہوگی، اب خالد اس زید کا امین ہوگا۔ اور خالد سے زید ضمان لیگا

ہذا کلہ ظاہر، بعد تمہید المقدمۃ المذکورۃ، ۱۸ محرم الحرام ۱۳۴۲ھ (حوادث خامس ص ۴۶)

ضمان بتلف بر حاضر باحق یعنی تلف شدہ کا ضمان ناحق گڑھا کھودنے والے پر	**سوال** (۴۷۰) ایک شخص نے پھادہ کے کنارے میں اپنے مکان کے احاطہ اور اطراف میں نالی کھودی،

اپنی زراعت کی حفاظت کے لئے اور وہ جگہ چراگاہ بیلوں کی ہے، اس نالی میں ایک شخص کا بیل گر کر مرگیا، صاحب بیل صاحب نالی سے قیمت بیل کی طلب کرتا ہے کہ معاملہ استہلاک کا سمجھ کر شرعاً قیمت اس بیل کی لینا جائز ہوگا یا نہیں، اور اس نالی والے پر قیمت بیل کی دینی پڑیگی، یا نہیں تحریر فرمادیں کہ اس میں جانبین کا بہت فساد برپا ہو رہا ہے، وہ نالی بہت تنگ ہے

کہ صاحب نالی کہتے ہیں کہ نالی میں گائے بیل گرنے سے از خود نہیں اٹھ سکتا ہے کہ بار ہا ایسا ہوگیا، اور جس زمین میں اس نے نالی بنائی تھی وہ حق عامہ تھی۔ اور اس نے نالی خود بنائی تھی حاکم کی اجازت سے نہیں ؟

الجواب، چونکہ یہ حفر ناحق ہوا ہے اس لئے حفر کو سبب ہلاک کہا جاویگا، اور حافر سے قیمت اس ہلاک ہونے والے بیل کی دلائی جاوے گی۔

۲۳ رمضان ۱۳۳۳ھ (حوادث ثالثہ ص ۱۵۲)

آب پاشی با گِل آوردن از تالاب کسے

سوال (۴۷۱) جو تالاب کہ جنگل میں خود بخود ہو جاتے ہیں اُن سے پانی بارش کا جو جمع ہو جاتا ہے وہ بغیر اجازت مالک کے کھیت کو دینا جائز ہے یا نہیں، اور بلا اجازت مالک کے اس کی مٹی لانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب، فی الدر المختار فصل الشرب ولا سقی ارضه وشجرہ وزرعه ونصب دولاب ونحوها من نهر غیرہ وقناته وبئرہ الا باذنه لان الحق له فیتوقف علی اذنه اھ، اس سے معلوم ہوا کہ بغیر اجازت مالک کے اپنے کھیت کو پانی دینا یا مٹی لانا جائز نہیں،

۴۲ جمادی الاخری ۱۳۲۲ھ (امداد ج ۴ ص ۱۶۱)

استعمال گھیکوار کہ از زمین غیر حاصل کردہ باشد

سوال (۴۷۲) کسی شخص نے اپنی زمین میں بہت سا گھیکوار واسطے دوا کے بو رکھا ہے، اگر کوئی شخص اس کو بدون اجازت مالک کے لا کر دوا میں ڈالدے تو درست ہے یا نہیں، اور اگر اس کے مالک سے پوچھیں تو لینے نہیں دیتا اور گھیکوار کا حکم گھاس جیسا ہے یا نہیں، کیونکہ گھیکوار ساق دار درخت نہیں اور اس دوا کا استعمال جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب، فی الدر المختار فصل الشرب وحکم الکلاء کحکم الماء فی رد المحتار وهو ما ینبسط وینتشر ولا ساق له کالاذخر ونحوہ والشجر ما له ساق فعلی هذا الشو[illegible] من الشجر الی قوله واخص من ذلك کله وهو ان یحتش الکلاء او انبته فی ارضه فهو ملك له ولیس لاحد اخذہ بوجه لحصوله بکسبه ذخیرہ وغیرها، جلد ۵ ص ۳۵۴ اس سے معلوم ہوا کہ اول گھیکوار کے گھاس ہونے میں کلام ہے، دوسرے اگر گھاس بھی ہو تب بھی اگر گھاس کو خود کوئی اپنی زمین میں بوھے تو اس کی ملک ہو جاتا ہے، دوسرے کو بدون اس کی اجازت کے لینا اور استعمال کرنا حرام ہے، پس ایسی دوا کا استعمال جائز نہیں واللہ اعلم

۲۹ ذیقعدہ ۱۳۲۲ھ (امداد ج ۲ ص ۱۶۸)

عدم جواز استعمال چیزے بدون اذن مالکین | **سوال** (۴۷۳) ایک دوکان تھی جس میں نصف روپیہ میرے والد کا تھا۔ اور نصف میں اور ایک شخص شریک تھے اور وہی شخص کام کرتے تھے، وہ دوکان نہ چلی حتیٰ کہ کل سامان میرے مکان میں آگیا اور کوئی اس کا خریدار بھی نہیں ہوتا ادھر والد صاحب نے سکوت اختیار کرلیا، نہ بوجہ ناراضگی بلکہ دکان نہ چلنے اور اس کے سامان فروخت نہ ہونے سے گویا صبر کرلیا اس طرف وہ شخص مجھ سے کہہ گئے کہ ہم صبر کرتے ہیں اور سامان کو سب تمہارے والد کو دیتے ہیں وہ چاہے جو کریں ان کو اختیار ہے، اب نہ والد صاحب کچھ کہتے ہیں اور نہ وہ شخص اور سامان خراب ہوا جاتا ہے، اکثر خراب ہوگیا، تھوڑا شہد ہے، اگر میں اس میں سے کھالوں یا جو چیز خراب ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو کام میں لے آؤں تو درست ہے، یا نہیں؟

الجواب تعجب ہے ایسی موٹی بات میں شبہ ہوا، جب روپیہ مشترک تھا مال دونوں شریکوں میں مشترک ہے، سکوت اسباب خروج عن الملک سے نہیں، غیر مالک کو استعمال کیسے جائز ہوگا جب تک دونوں مالکوں سے تصریحاً اجازت نہ لے۔ وہ اگر آپ کے قبضہ میں ہے امانت ہے۔

۱۲ شعبان ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۶۴)

قبضہ کردن زمینداران بر متبۂ کاشتکاران وقت گذاشتن سکونت | **سوال** (۴۷۴) زمینداروں میں دستور ہے کہ جس وقت کاشتکار موضع سے سکونت ہٹائے تو چھپر، اُپلے، کواڑ وغیرہ غرض جو چیز بھی وہ چھوڑ جائے وہ زمیندار کی ہوگی، زمیندار اس کو اپنے صرف میں لائے گا۔

الجواب اس کا لینا بھی ناجائز ہے کہ حق غیر ہے، اور اس کا چھوڑنا دلیل رضا نہیں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں لیجانا چاہوں تو زمیندار مزاحمت کرے گا۔

۲۶ شوال ۱۳۳۳ھ (حوادث ثالث ص ۱۵۸)

مدرس کو اسکول کی روشنائی اور قلم سے خطوط لکھنا اور پیکٹ یا پارسل کے اندر خط رکھنا | **سوال** (۴۷۵) (۱) اکثر اوقات اسکول سے ملی ہوئی روشنائی و قلم سے خطوط لکھنے کا اتفاق ہوتا ہے یہ امر کیسا ہے، آیا متعارف میں داخل ہوکر جائز سمجھا جا سکتا ہے، اگر ناجائز ہے تو اب تک اس فعل کے ارتکاب کا تدارک کیونکر کیا جاوے ہے

(۲) پیکٹ یا پارسل یا لفافہ کے اندر کچھ ٹکٹ بھیجنا (دو چار آنہ کا) جائز ہوگا یا نہیں پیکٹ کے اندر کوئی خط رکھ دینا کیسا ہے؟

الجواب: میں نے سنا ہے کہ روشنائی و قلم چونکہ ایک اندازے سے ملتا ہے اگر بچ رہے واپسی کا مطالبہ نہیں اگر کمی رہے تو ذمہ داری نہیں، اگر یہ صحیح سنا ہے تو اس سے خط لکھنا جائز ہے۔ اور پیکٹ کے اندر خط یا ٹکٹ سنا ہے کہ قانوناً ممنوع ہے، اور پارسل کے اندر جائز ہے۔ اگر یہ صحیح سنا ہے تو اسی تفصیل سے حکم شرعی ہے۔

۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۹ھ (تتمہ اولیٰ ص ۲۰۶ و حوادث ۱، ۱ ص ۴)

کتاب الرہن

عدم جواز انتفاع بمرہون

سوال (۴۷۰) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس میں کہ مرتہن کو انتفاع مرہون سے باذن راہن جیسا آج کل ملکوں میں رائج و شائع ہے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: انتفاع مرہون سے اگر مشروط یا معروف ہو جیسا کہ آجکل ہے ربوا حرام ہے اور ربوا اذن سے حلال نہیں ہوتا۔ قال فی المنح وعن عبد اللہ محمد بن اسلم السمرقندی وکان من کبار علماء سمرقند انہ لا یحل لہ ان ینتفع بشیئ منہ بوجہ من الوجوہ وان اذن لہ الراھن لانہ اذن لہ فی الربا لانہ یستوفی دینہ کاملا فتبقی لہ المنفعۃ فضلا فیکون ربا وھذا امر عظیم (وقال بعد اسطر) قال الطحاوی قلت والغالب من احوال الناس انھم انما یریدون عند الدفع الانتفاع ولولاہ لما اعطاہ الدراھم وھذا بمنزلۃ الشرط لان المعروف کالمشروط وھو مما یعین المنع واللہ تعالیٰ اعلم انتھی، شامی جلد خامس مطبوعہ مجتبائی ص ۳۱۰، ۳۱۱ واللہ اعلم سنہ ۱۳۳۰ھ (امداد ج ۳ ص ۸۴)

مرتہن کے بعض ورثہ کا مرہون میں سے اپنے حصہ کو فک کرالینا

سوال (۴۷۱) زید بڑا عمرو چھوٹا دونوں حقیقی بھائی حصہ کے تقسیم برابری سے ہو گئے تھے۔ عمرو اپنے حصہ کا مختار زید اپنے حصہ کا، زید نے ہندو کے یہاں نوکری کر کے اصل تنخواہ سے بھی تحویل سے بھی خرچ کر ڈالا یعنی تغلب و تصرف بیجا میں بعد حساب و کتاب مامعہ نکلا، زید نے اپنا حصہ اپنے آقا ہندو کے یہاں مامعہ پر رہن رکھدیا، عمرو نے دوسری جگہ سے روپیہ لیکر اس سے فک رہن کرا کر منتقل کر دیا۔ اور تھوڑے زمانہ کے بعد اپنا حصہ بھی اس کے یہاں رہن رکھ دیا، زید کے لڑکوں کو عمرو کہتا رہا کہ تم اپنا چھوڑالو، مگر چالاکی سے اپنا حصہ کا بھی روپیہ ولانا چاہا، اسی

اثناء میں زید کے دو لڑکے ایک لڑکی اول بی بی سے اور ایک عورت منکوحہ اور ایک لڑکی اس عورت سے چھوڑ کر فوت ہوا، بعد تھوڑے دنوں کے زید کا بڑا لڑکا چار لڑکے اور عورت چھوڑ کر فوت ہوگیا، اب زید کا چھوٹا لڑکا اور لڑکی اپنے اپنے حصہ کا روپیہ دے کر اپنے چچا سے حصہ لینا چاہتے ہیں، کس قدر حصہ لازم آتا ہے، اور اس طریق سے اپنے حصہ کا مدعی بننا اور لینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب[1]

سب ۱۴ ۶۲	بالنصف	مسئلہ ۱۶ و ۳۲	زید	مسئلہ ۸ ۶۴ ۸ ۶۷

میـــــــــــــــــــــــــت

ابن	ابن	ابن	ابن	زوجہ	بنت	ابن بنت	ابن	زوجہ ثانیہ
ف	ع	ط	ص	س	ر	د	ج	ب	الف

الف	ب	ج	د	ر	س	ص	ط	ع	ف
زوجہ ثانیہ	ابن	ابن بنت	بنت	زوجہ	ابن	ابن	ابن	ابن	
۱/۸ ۹۶	(۱۴)	۱۴ ۲۲۴	۷ ۱۱۲	۷ ۱۱۲	۱/۸ ۲۸	۷ ۴۹	۷ ۴۹	۷ ۴۹	۷ ۴۹

المبـــــــــ ۷۶۸ ـــــــلغ

الاحیـــــــــــــــــــــــاء

الف	ج	د	ر	س	ص	ط	ع	ف
۹۶	۲۲۴	۱۱۲	۱۱۲	۲۸	۴۹	۴۹	۴۹	۴۹

بعد تقدیم ما یتقدم علی المیراث کل ترکہ زید کا اس طرح تقسیم ہوگا کہ زید کی زوجہ ثانیہ کو (۹۶) اور زید کے پسر کو (۲۲۴) اور زید کی دونوں دختروں میں سے ہر ایک کو (۱۱۲) اور زید کے پسر متوفی کی زوجہ کو (۲۸) اور اس کے چاروں پسروں میں سے ہر ایک کو (۴۹) ملیں گے اور چونکہ زمین رہن رکھنے سے ملک سے خارج نہیں ہوتی، اس لئے زید کی وہ زمین مرہونہ ان ہی سہام کے موافق اس کے ورثہ بالا میں منقسم ہوگی، اور زر رہن ملنے پر فک رہن سے انکار جائز نہیں، البتہ اصل مرتہن کو یہ اختیار تھا کہ جب تک اپنا زر رہن پورا نہ لے لے، رہن نہ چھوڑے، خواہ ایک وارث دیدے یا سب مل کر دیدیں۔ کما فی الھدایۃ قبیل باب وضع الرھن علی ید العدل وان رھن رجلان بدین علیھما رجلا رھنا واحدا فھو جائز و

---

[1] تخریج مذکور فی الجواب اس صورت میں ہے کہ جب اس بڑے لڑکے کی ماں اول مرگئی ہو ۱۲

الرهن رهن بكل الدين وللمرتهن ان يمسكه حتى يستوفى جميع الدين، لیکن چونکہ عمرو اس رہن کو فک کرا کر دوسری جگہ رہن کرچکا۔ اس لئے عمرو متبرع ہے۔ اور متبرع کو حق حبس حاصل نہیں، لہذا عمرو پر واجب ہے کہ ورثہ زید کی چیز ان کو فوراً دیدے لیت و لعل کرنا ظلم اور حرام ہوگا فقط

۲۹ محرم ۱۳۲۶ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۹۷)

حکم فک رہن زمین ضبط نمودہ سرکار

سوال (۴۷۸) (یہاں سوال نقل نہیں کیا گیا جواب سے خود ظاہر ہے)

حکم فک رہن جائداد مرہونہ کہ سرکار بعلت بغاوت راہن ضبط کردہ نیلام نمود

جب سرکار نے زید راہن کی جائداد ضبط کرلی، تو مثل اصل راہن کے اس جائداد کے مالک اور مرتہن کی مقروض ہوگئی، کیونکہ تسلط سے ملک اور مالک کو قرضہ سے بری کر کے خود اپنے ذمہ لے لینے کی مقروضیت ثابت ہوئی، پھر جب عمرو نے وہ جائداد سرکار سے خریدلی، تو یہی حال عمرو کا ہوگیا، جو کہ سرکار کا تھا، کہ جائداد کا مالک بھی ہوگیا، اور مرتہن کا مقروض بھی ہوگیا جس کے مقابلہ میں وہ جائداد مرتہن کے پاس محبوس ہے، جو حاصل ہے رہن کا، غرض عمرو راہن ٹھیرا اور جو مرتہن تھا وہ بدستور مرتہن رہا پس رہن کا جو حکم ہے کہ جب راہن زر رہن ادا کردے مرتہن پر واجب ہوتا ہے کہ روپیہ لے کر شے مرہون کو چھوڑ دے وہ حکم اس راہن اخیر اور مرتہن کے درمیان بھی ثابت ہوگا، واللہ تعالیٰ اعلم،

۲۸ صفر ۱۳۲۲ھ (امداد ج ۳، ص ۸۸)

تقدم حق مرتہن بر مہر وغیرہ در ترکہ

سوال (۴۷۹) زید جائداد موروثی پر قبضہ اور زوجہ منکوحہ اور چار لڑکے چھوڑ کر فوت ہوگیا، اور بھی اس کے ذمہ دین مہر مقدم ہے تو متوفی کی جائداد مرہونہ سے اس کی منکوحہ قبل ادائے قرضہ کے دین مہر وصول کر سکتی ہے یا نہیں مکرر یہ کہ متوفی کی منکوحہ نے نکاح ثانی بھی کرلیا ہے، تو اس صورت میں دین مہر کی سابق شوہر متوفی کی جائداد سے مستحق ہے یا نہیں؟

الجواب، فی الدر المختار یبدأ من ترکۃ المیت الخالیۃ عن تعلق حق الغیر بعینها کالرھن الی قولہ تجھیزہ ثم دیونہ الخ، فی رد المحتار قولہ کالرھن مثال للعین التی تعلق بها حق الغیر فاذا رھن شیئاً وسلمہ ولو یترک غیرہ فدین المرتھن مقدم علی التجھیز

فان فضل بعد شیٔ صرف الیہ اھ پس صورت مسئولہ میں جس جائداد پر قرضہ ہے اگر وہ مرہون اس قرضہ کے عوض میں ہو، اور مرتہن کی مقبوضہ بھی کرا دی گئی تھی۔ تب یہ دین رہن دین مہر سے مقدم ہے، اس کو ادا کرکے اگر کچھ بچے یا متوفی کے پاس اور ترکہ بھی ہو تو اس میں سے مہر ادا کیا جاوے گا اور اگر مرتہن کا قبضہ اس پر نہیں ہوا تھا تو وہ اور مہر برابر ہیں اور دین رہن کی وہ مقدار معتبر ہو گی جس قدر اصل قرض بذمہ رہن ہے۔ اور اگر مرتہن کچھ سود لے چکا ہو یا مرتہن اس شئے مرہون سے کچھ آمدنی حاصل کر چکا ہو کہ وہ بھی سود ہے، تو یہ سود اور آمدنی منہا کرکے جو باقی رہے گا وہ قرضہ شمار کیا جاوے گا۔ اور نکاح ثانی کرنے سے دین مہر ساقط نہیں ہوا، واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم، ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ (امداد ج ۳ ص ۱۲۱)

تعلیق بیع بعدم فک رہن در زمانہ محدود **سوال** (۴۰۰) زید نے اپنی جائداد رہن کرکے عمرو سے کچھ روپیہ قرض لیا۔ شرائط رہن یہ تھے میعاد اس رہن کی صرف ایک مہینہ قرار پائی ہے، بعد انقضائے میعاد مذکور فوراً بادائے کل زر رہن یکمشت جائداد مرہونہ کو فک رہن کرالونگا اگر منقر بعد انقضائے میعاد ایک ماہ فوراً زر رہن ادا کرکے جائداد کو فک نہ کرالوں تو یہی دستاویز رہن نامہ بجائے بیع نامہ کے اور یہی زر رہن بجائے زر ثمن کے متصور ہوگا، اور جائداد مرہونہ بیع شدہ سمجھی جاوے گی، اور اسی وقت سے قبضہ جائداد مرہونہ پر مرتہن کا مالکانہ ہو جاوے گا، اور مرتہن مثل میرے ان تمام حقوق کے مالک کامل مشتریانہ ہو جاویں گے جو مجھ کو جائداد مرہونہ میں اس وقت حاصل ہیں۔

لہذا یہ چند کلمے بطور دستاویز بالوفا کے لکھدیئے، بعد اس رہن کے عمرو مرتہن کا قبضہ جائداد مرہونہ پر ہوا۔ اور جائداد مرہونہ کا کرایہ عمرو مرتہن کرایہ داروں سے وصول کرتا رہا۔ مگر جزو جائداد مرہونہ پر زید راہن کا قبضہ رہا، اور زید راہن بھی عرصہ تک کرایہ اس جزو جائداد مرہونہ جس پر اس کا قبضہ تھا، عمر مرتہن کو ادا کرتا رہا، ساڑھے چار برس کے بعد عمرو مرتہن نے زید راہن کو ایک نوٹس دیا جس کا مضمون بعبارتہ یہ ہے، بموجب دستاویز بیع بالوفار مورخہ (تاریخ و ماہ و سنہ) آپ نے مبلغ (تعداد کل زر رہن) یہ رہن املاک واسطے میعاد ایک ماہ کے قرض لئے اور چونکہ معاملہ رہن کا باقبضہ تھا اس وجہ سے بعض املاک مرہونہ کو بکرایہ آپ نے اپنے قبضہ میں رکھا، چنانچہ اب مبلغ (تعداد کل زر رہن) اصل زر رہن اور مبلغ (تعداد) بابت زر کرایہ تاغایت (ماہ و سنہ) جملہ (تعداد روپیہ) آپ کے ذمہ واجب الادا ہیں،

لیکن آپ نے ادا نہیں فرمایا: اندر میعاد پندرہ یوم ادا و بے باق کر دیجئے۔ (یہ صورت واقعہ کی ہے۔ آپ حضرات علمائے کرام مدظلہم سے یہ سوالات بکمال ادب ہیں)

۱۔ صورت مذکورہ میں جائداد مرہونہ بیع ہو گئی یا نہیں۔ ۲۔ جو کرایہ جائداد مرہونہ کا کرایہ داروں اور نیز زید راہن سے عمرو مرتہن کو وصول ہوتا رہا وہ اصل زر رہن میں ادا ہوتا گیا یا نہیں، ۳۔ عمرو مرتہن کو اب اسی قدر اصل روپیہ رہن کا حلال ہے جو بعد مجرا کرلنے کرایہ وصول شدہ کے باقی ہو یا کل زر رہن بدون وضع کرایہ وصول شدہ کے لینا حلال ہے، ۴۔ جس وقت زید راہن اس قدر روپیہ جو بعد کرایہ وصول شدہ کے عمرو مرتہن کا اصل زر رہن میں باقی ہو ادا کر دے تو عمرو مرتہن پر جائداد مرہونہ چھوڑ دینا واجب ہے یا نہیں؟

الجواب۔ فی فتح القدیر ولا یجوز تعلیق البیع کان یقول اذا دخلت الدار فقد بعتک کذا بمائۃ فقبل الاٰخر لا یثبت البیع عند الدخول فی الکفایۃ عن الزہری ان اہل الجاہلیۃ کانوا یرتھنون ویشترطون علی الراہن انہ ان لم یقض الدین الی وقت کذا فالرہن مملوک للمرتھن فابطل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذلک بقولہ لا یغلق الرہن وقیل لسعید بن المسیب اھو قول الرجل انہ لم یأت بالدین الی وقت کذا فالرہن بیع بالدین فقال نعم وفی الدر المختار وبیع الوفاء ذکرتہ ھھنا تبعا للدرر وصورتہ ان یبیعہ العین بالف علی انہ اذا رد علیہ الثمن رد علیہ العین وفی الدر المختار عن الاشباہ کل قرض جر نفعا فھو حرام فکرہ للمرتھن سکنی المرھونۃ باذن الراہن وفی الدر المختار نقل عن التھذیب انہ یکرہ للمرتھن ان ینتفع بالرہن وان اذن لہ الراہن قال المصنف وعلیہ یحمل ما عن محمد بن اسلم من انہ لا یحل للمرتھن ذلک ولو باذن لانہ ربوا قلت وتعلیلہ یفید انھا تحریمیۃ فتامل وفی الدر المختار اباح للمرتھن ان یوجرہ قال لا قیل فلو اٰجرہ ومضت المدۃ فالاجرۃ لہ او للراہن قال لہ ان اٰجرہ بلا اذن وان باذنہ فللمالک وبطل الرہن وفی الدر المختار ویبطلھا ای الشفعۃ صلح منھا علی عوض وعلیہ ردہ لانہ رشوۃ اھ وفی الھدایۃ الکتابۃ والاجارۃ والرہن بمنزلۃ البیع لانھا تبطل بالشرط الفاسد،

ان روایات مذکورۂ بالا سے معلوم ہوا ۱۔ صورت مسئولہ میں یہ جائداد بیع نہیں ہوئی کیونکہ تعلیق بیع باطل ہے، بلکہ یہ صورت غلق رہن کی ہے جو کہ حرام اور باطل ہے، اور بیع بالوفا کی یہ صورت نہیں ہے، بلکہ اس میں فی الحال بیع ہوتی ہے، اور اقالہ کا وعدہ جس میں خود ہی کلام ہے، سو یہاں

یہ صورت نہیں ہوئی، لہذا یہ رہن ہے اور رہن بھی فاسد۔ کیونکہ اس میں شرط فاسد لگائی گئی ہے ۲؎ اور چونکہ کرایہ ملک راہن کی ہے، اور مرتہن کو بوجہ اشتراط فی الرہن اس کا لینا حرام ہے، لہذا یہ واجب الرد ہے، ۳؎ اس لئے جس قدر روپیہ کرایہ میں مرتہن کو وصول ہوا ہے، اس مقدار میں مقاصہ ہوگیا، یعنی ذمہ راہن سے ساقط ہوگیا، بقیہ روپیہ کا مطالبہ راہن سے کرنا مرتہن کا حق ہے۔

۴؎ جب اس باقی روپیہ کو راہن ادا کردے گا۔ مرتہن کا دین رہن ادا ہو جاوے گا۔ پھر جائداد مرہونہ کا چھوڑ دینا مرتہن پر واجب ہوگا، ۲۰ جمادی الاخریٰ ۱۳۲۱ھ

"الجواب صحیح" بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ (امداد ج ۳ ص ۸۹)

رعایت راہن مرتہن را

سوال (۱۸۴۸) نمبر (۱) رہن بالقبض میں اگر راہن نے بلا منشاء سود ایک رقم مرتہن کو معاف کردی ہے اور یہ کہا ہے کہ باقی منافع سے تم اپنا قرض ادا کرلو تو جائز ہے یا نہیں ؟ نمبر (۲) راہن نے ایک رقم خود لی، باقی مرتہن کو معاف کردی، اور یہ کہا کہ باقی منافع تم لو جب میں یہ قرض ادا کرلوں گا منفک کرالوں گا، مثلاً راہن نے ایک ہزار روپے کی جائداد پانچ ہزار میں مکفول کی، شرط یہ ہوئی کہ سالانہ ایک ہزار میں سے دو سو مجھے دیا کرو، باقی تمہارا جب میں پانچ ہزار ادا کرلوں گا منفک کرالوں گا یہ دو سو کی رقم قرض میں نہیں ادا ہو رہی ہے، بلکہ مرتہن کی جیب میں جاتی ہے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب۔ چونکہ یہ یقینی بات ہے کہ یہ دونوں رعایتیں قرض کی وجہ سے ہیں اس لئے ناجائز ہیں اور کل قرض جر نفعا کے کلیہ میں داخل اگر عقد رہن میں مشروط ہیں، تب تو ظاہر ہی ہے، اور اگر مشروط بھی نہ ہوں، لیکن چونکہ متعارف ہیں اس لئے حسب قاعدہ المعروف کالمشروط کے علاوہ بھی ناجائز ہے، البتہ بلا اشتراط و بلا تعارف ایسی رعایتیں جائز ہیں واللہ اعلم

۹ رجمادی الاخریٰ ۱۳۲۲ھ (امداد ج ۳، ص ۹۱)

جلد تحصیل مصلحت عقد رہن

سوال (۱۸۴۲) رہن لینے میں جو آسانی ہوتی ہے اس کی کوئی صورۃ شرعاً پیدا ہو سکتی ہے یا نہیں (کیونکہ فرض کیجئے کہ ایک موضع میں میرا حصہ بندہ آنہ ہیں، ایک آنہ والا حصہ دار بضرورت قرض لینا چاہتا ہے، مجھ سے رہن بالقبض یا بلا قبض کی درخواست کرتا ہے، اگر میں نہیں لیتا تو دوسرے کے قبضہ میں جاتا ہے جس سے پھر ملنے کی امید نہیں، اور گویا مجموعی انتظام میں ہزاروں طرح کے رخنے پڑنے کا احتمال ہے یا مثلاً

کوئی زیادہ قیمت کی جائداد تھوڑے روپیوں میں ہمارے پاس اٹک جاتی ہے، جسے ہم سمجھتے ہیں کہ راہن میں ادا کرنے کی قوت نہیں ہے۔ بھنس جانے پر رفتہ رفتہ ہم قیمت ادا کردیں گے اور اس طرح ہمارے پاس ایک معقول جائداد ہوجاوے گی، آسانی صرف اس قدر ہوئی کہ یکمشت قیمت نہ دینی پڑی)

الجواب، صرف اس قدر ممکن ہے کہ مدت رہن کے اندر جو منافع حاصل ہوں انکو امانۃً جمع رکھے، اور جب وہ زمین فروخت ہوجاوے تب وہ امانت اس راہن کو واپس کردی جائے، زمین بھی آسانی سے آجاوے گی، اور منافع رہن کے استعمال سے بھی محفوظ رہے گا، البتہ اس صورت میں اتنا امر کھٹکتا ہے کہ اگر اس صورت میں راہن کو اطلاع ہوجاوے کہ اتنا واپس ملے گا تو امید ہے کہ وہ فک کرا سکے، تو اطلاع نہ کرنا یہ ایک قسم کا دھوکہ ہے، جس میں گناہ کا اندیشہ ہے، البتہ سود کھانے کا گناہ اس کو نہیں ہوا واللہ اعلم، ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۲ھ (امداد ج ۳، ص ۹۱)

ارتہان بضرب اجل و شرط انتفاع | **سوال** (۴۸۳) زید نے زمین بکر کے پاس پانچ برس کو رہن رکھی اور یہ اقرار کیا کہ اس زمین کو میں جوتوں گا، اور جو منافع رہن صریح ہوگا وہ میں لوں گا۔ پہلے مدت سے اگر راہن روپیہ ادا کرے تب بھی نہ دونگا۔ نفع پیداوار زمین مرہونہ کا مباح ہے یا حرام؟

الجواب، اس رہن میں دو فساد ہیں۔ ایک تو مدت پانچ برس مقرر کرنا، کہ اس سے پہلے فک پر قدرت نہ ہو۔ کیونکہ معنی رہن کے شرع میں یہ ہیں کہ کسی شے کا دین کے بدلے میں محبوس کرنا۔ فی الدر المختار ہو حبس شئ مالی بحق یمکن استیفاؤہ منہ کالدین، پس جب محبوس بوجہ دین کے ہے تو جس وقت راہن دین ادا کردے گا مرتہن کو حق حبس باقی نہ رہے گا، خواہ پانچ برس سے پہلے ہو یا بعد ہو۔ اب یہ شرط ٹھہرانا کہ اگر راہن روپیہ بھی ادا کردے تب بھی نہ دونگا شرط فاسد ہے، دوسرا فساد شرط انتفاع کی لگانا کیونکہ بمقتضائے حدیث کل قرض جر منفعۃ فہو ربا مرتہن کو انتفاع مرہون سے بالکل جائز نہیں۔ خصوصاً جبکہ مشروط ہو اس وقت تو ربوا صریح ہے۔ اگرچہ راہن اذن دیدے کیونکہ ربوا اذن سے حلال نہیں ہوتا۔ لا یحل لہ ان ینتفع بشئ منہ من الوجوہ وان اذن لہ الراہن لانہ اذن لہ فی الربوا، شامی مصنبائی ج ۵ ص ۳۱۰، (امداد ج ۳، ص ۹۲)

مرتہن کا زمین مرہونہ راہن کو کاشت کے لئے دینے اور اس کاشت کی آمدنی کا حکم

سوال (۴۸۴) ایک شخص زیدؔ کی زمین عمروؔ مہاجن کے پاس رہن ہے تو عمرو مہاجن کاشت نہیں کرتا ہے، تو عمرو مہاجن نے زید ہی کو وہی رہن زمین بٹائی پر دیدی ہے، اور ہمارے یہاں بٹائی کا دستور پانچ من میں تین من کاشت کرنے والے کا ہے، اور دو من اصل مالک کا ہے، اب اگر زید اس اپنی زمین میں سے جو عمرو کے پاس رہن ہے، اناج چرالیوے، تھوڑا سا یا بہت تو کچھ مواخذہ ہوگا یا نہیں، میری دلیل یہ ہے کہ عمرو کے پاس جتنا اناج جائے گا سب سود ہے، یہ جتنا ہے وہ سب موجود ہے، چرالینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ قبضہ مرتہن کا شرائط رہن سے ہے، جب راہن کے قبضہ میں آگئی شرعاً رہن جاتا رہا، اس لئے راہن نے اپنے تخم سے جتنا حاصل کیا ہے وہ سب مِلک راہن کی ہے، اگر سب رکھ لے گناہ نہیں، بلکہ جتنا مرتہن کو دے گا سود دینے کا گناہ ہوگا۔

۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۹ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۸۹)

مرتہن کا مرہون کو سوائے راہن کے دوسرے کو کاشت پر دینا اور اس کی آمدنی کا حکم

سوال (۴۸۵) دیگر یہ ہے مثلاً اسی عمرو مہاجن نے اصل مالک کو بٹائی پر نہیں دی، کسی اور شخص کاشتکار کو دیدی ہے وہ بھی چرالیوے یا نہ ؟

الجواب :۔ یہاں رہن باقی ہے اور ثمار رہن کا مرہون ہے، اس لئے مرتہن کے حصہ میں جتنا غلہ آوے گا مرہون ہونے کی وجہ سے اس پر مرتہن کو قبضہ کا استحقاق ہے، پھر فک رہن کے وقت اس کی واپسی راہن کی طرف واجب ہے، پس چونکہ مرتہن کو قبضہ کا استحقاق ہے اس لئے اس صورت میں راہن کو اس مرتہن کے حصہ میں لینا جائز نہیں فقط

۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۹ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۹۰)

مرتہن کو رہن سے منتفع ہونیکا اور راہن کو حق انفکاک کی بیع کا عدم جواز

سوال (۴۸۶) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی حقیت زمینداری بکر کے پاس اس شرط پر مبلغ دو سو روپے پر رہن بالقبض کیا کہ جب روپیہ ادا کر دیا جاوے جائداد فک رہن ہو جاوے اور ایام رہن میں لعہ سالانہ منافع مرتہن لیا کرے، بکر فوت ہو گیا۔ بذریعہ ترکہ حقیت مرہونہ پر اس کی زوجہ ہندہ قابض ہوئی بعد اس کے زید نے حقیت مرہونہ کا انفکاک لِہ رہن کو عمرو وغیرہ کے باپ عبید کے پاس بعوض سو روپیہ

لہ راہن ۱۲ لعہ مرتہن ۱۲

بیع کر دیا تھا، اگرچہ زید نے بیعنامہ کی رجسٹری کسی مصلحت سے کرادی۔ اور سب حیثیت ادر کے رد برو زرِ ثمن کے وصول ہونے کا اقرار بھی مصلحتاً کر لیا، مگر واقع میں زید کو زرِ ثمن اب تک نہیں ملا زید اور عبید کے درمیان ایام رہن میں یہ معاہدہ ہو کر اقرارنامہ لکھا گیا کہ عبید نے حق انفکاک رہن بیع شدہ کو بحق زید واپس کر دیا، اس شرط سے کہ اگر زید ایک یا دو سال میں وہ سو روپیہ مذکور عبید کو ادا کر دیوے تو حق انفکاک رہن بیع شدہ کا مالک زید ہوگا۔ اگر زید ادا نہ کر سکے تو عبید بدستور سابق مشتری حق انفکاک رہن مذکور کا متصور ہوگا، چنانچہ وعدہ گذر گیا اور زید نے حق انفکاک رہن کو فک نہیں کرایا تو ایسی صورت میں بلا امداد قاضی کے بیع ہوگی یا نہیں۔ اسی اقرارنامہ میں عبید نے یہ اقرار بھی لکھا تھا، کہ میں عرصۂ قلیل میں درخواست پر بکر و زید کا نام داخل خارج میں چڑھوا دوں گا، مگر اس نے درخواست نہ دی، اور خلاف معاہدہ قابض رہا۔ اور اسی حالت میں وفات پا گیا، اس کے بعد عمرو بکر وغیرہ اس کے وارث قرار پائے، ہندہ کے فوت ہونے پر حقیت مرہونہ مذکورہ عمرو کو ترکہ میں ملی، عمرو اٹھارہ سال تک اس پر قابض رہ کر مبلغ دو سو سولہ روپے بحساب عـہ سالانہ وصول کر کے اپنے تصرف میں لایا۔ اب یہ مبلغ ما عـہ روپے منافع جو عمرو اپنے تصرف میں لایا شرعاً جائز ہے یا نہیں، اگر ناجائز ہے تو اصل زرِ رہن میں مجرا ہو کر عـہ زید کو واپس ملنا چاہئے یا نہیں، پھر بعد وفات عمرو کے اس حقیت پر خالد اس کا لڑکا قابض ہوا۔ اتفاق سے خالد نے حقیت مرہونہ مندرجہ صدر کا مبلغ دو سو روپے زرِ رہن مذکور عمرو بکر وغیرہ کو معاف کر دیا، اور جائداد پر قابض کرا دیا، تو ایسی صورت میں زرِ منافع اس کا جب شرعاً ناجائز ہوا اور حسب صورت بالا اصل زرِ رہن زرِ منافع ادا ہو کر عـہ روپیہ زید کا نکلا تو خالد کو اس دو سو روپے ادا شدہ کو عمرو بکر وغیرہ کے حق میں معافی کا حق حاصل ہے یا نہیں، اگر نہیں ہے، اور خالد نے زرِ رہن مذکور عمرو بکر وغیرہ کو معاف کر دیا، تو عمرو بکر وغیرہ کو اس کا منافع لینا اور تصرف کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زید راہن نے بکر مرتہن سے یہ شرط کی، مرتہن ایام رہن میں بارہ روپیہ سالانہ منافع لیا کرے شرعاً باطل ہے، صرف زرِ رہن میں اس کا حق ہے، پس بعد وفات بکر کے اس کے ورثہ کا جس میں زوجہ ہندہ بھی ہے۔ صرف زرِ رہن ہی میں حق ہے، سوال میں صرف ہندہ کا ذکر کیا ہے مگر حق شرعی بکر کے سب ورثہ کا ہے، اور حق فک رہن کا زید کی

کو حاصل ہے، زید کا اس حق فک کو عبید یا ع۔ بز وغیرہ کے ہاتھ بیع کرنا شرعاً باطل ہے
اس بیع سے عبید کا کوئی حق نہیں ہوا، اگر عبید سے روپیہ بھی وصول ہو جاتا تب بھی زید پر
واجب تھا کہ وہ روپیہ عبید کو واپس کر دیتا، کہ یہ روپیہ رشوت ہے اور جبکہ روپیہ بھی عبید
سے وصول نہیں ہوا، تب تو کسی قسم کا بھی حق عبید کو حاصل نہیں ہوا، اور جو اقرار نامہ لکھا گیا
محض لاشے ہے، اس کا کوئی اثر نہیں، اگر زید کو روپیہ بھی مل جاتا اور زید میعاد کے اندر
روپیہ عبید کو واپس بھی نہ کرتا، اور میعاد بھی گذر جاتی اور کوئی قاضی بھی اس بیع باطل کے
نفاذ کا حکم کر دیتا۔ تب بھی حق فک رہن زید ہی کو حاصل رہتا اور سائل کا یہ کہنا کہ عبید خلاف
معاہدہ قابض رہا سمجھ میں نہیں آیا، کیونکہ جائداد مرہونہ کا اول بکر کے قبضہ میں پھر ہندہ کے
قبضہ میں رہنا اوپر سوال میں مذکور ہے، بہر حال اگر اس پر بھی عبید کا قبضہ ہو جاتا تب بھی
حکم مذکور آنفاً میں کچھ تغیر نہ ہوتا، عبید کو غاصب و قابض بالباطل کہا جاتا، جب عبید کا اس
میں کوئی حق نہیں تو اس کے مرنے کے بعد ع۔ بز وغیرہ اس کے وارثوں کا بھی اس میں کوئی حق
نہیں ہوگا، پھر جب ہندہ کی وفات ہوئی تو عمرو اگر اس کا یا بکر کا شرعی وارث ہے تو اس کا بھی
مثل اصل مرتہن کے صرف واپسی زر رہن ہی میں حق ہے، اسی طرح اگر بکر کے یا ہندہ کے اور
ورثہ شرعی بھی ہوں، تو بھی یہی حق واپسی زر رہن سب میں مشترک ہے، اب عمرو نے
اس جائداد سے دو سو روپے یو وصول نہیں کیا تو اس رقم وصول شدہ سے سولہ روپیہ
زید کو واپس کئے جائیں گے اور دو سو روپیہ بکر مرتہن سب ورثہ شرعیہ کو موافق ان کے
حق میراث کے تقسیم کیا جاوے گا، اور جائداد مرہونہ چھوڑ دینا واجب ہوگا اور اگر بکر
یا ہندہ کو بھی کچھ وصول ہوا تھا، تو وہ بھی ہندہ اور بکر کی جائداد سے وصول کر کے زید کو
واپس دیا جاوے گا، یا ان کے حصہ میں تقسیم کے وقت اتنی کمی کر دیں گے اور اس دو سو
روپے میں سے وہ وصول کردہ ہندہ و بکر بھی زید کو واپس کیا جاوے گا، جب جائداد میں
وارثان مرتہن کا کوئی حق نہ رہا تو اب خالد کا قبضہ محض باطل ہے، اسی طرح جب زر
رہن وارثان مرتہن کے پاس پہونچنے سے بذمہ راہن یا وارثان راہن دین نہیں رہا تو خالد
کا معاف کرنا بھی باطل ہے۔ خاصکر ایسے اشخاص کو یعنی جو شرعاً کبھی دائن یعنی مستحق وصول
دین نہیں ہوئے، جیسا اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ عبید و ع۔ بز کا کوئی حق شرعاً ثابت نہیں
ہوا۔ پس ع۔ بز وغیرہ کا قبضہ اس جائداد پر باطل ہوگا، اور انتفاع اس سے حرام ہوگا۔

بلکہ سب پر واجب ہے کہ اپنا قبضہ اٹھا کر زید راہن یا اس کے ورثہ کے قبضہ میں دیدیں

(حوادث اول ۲ ص ۲۴ تتمہ اولیٰ ص ۱۹۰)

جواب حدیث مبیح انتفاع از شے مرہونہ

سوال (۴۰۷) آجکل اراضی مرہونہ سے انتفاع حاصل کرنے کا مرض عام طور سے پھیلا ہوا ہے، اور میں حتی الوسع اپنے احباب معتقدین کو روکتا رہتا ہوں، مگر ایک غیر مقلد انتفاع کی ترغیب دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ جب گائے بھینس مرہونہ کا دودھ بعوض چارہ کے مرتہن کے لئے حلال ہے تو ارض مرہونہ کی آمدنی بعوض محنت کشتکاری کے کون حرام کہہ سکتا ہے، اس کا جواب کافی مدلل مختصر عنایت ہو

جواب :- مسئلہ ظاہر اور یقینی ہے باقی جواب حدیث کا یہ ہے کہ اول تو وہ حدیث مبیح ہے اور محرم کو مقدم ہونا چاہئے مبیح پر، دوسرے اگر حدیث کی اباحت کو معمول بہ کہا جاوے تو اس عام میں سے اس کو خاص کیا جاوے گا۔ تاکہ دلائل شرعیہ میں تعارض نہ ہو۔ تیسرے مقیس علیہ اور مقیس میں تماثل نہیں، پس قیاس مع الفارق ہے۔ وجہ فرق ظاہر ہے کہ مقیس علیہ میں خاص مرہون کو بھی نفع پہنچ رہا ہے جو کہ نفع راہن کا بھی ہے اور اس کا خرچ بچتا ہے، مقیس میں یہ بات کہاں، نیز مقیس علیہ میں مؤنت مرہون کی بذمہ راہن تھی، اور منفعت بھی اسی کی تھی، حساب میں بعض اوقات خلجان ہوتا ہے، بطور صلح یہ صورت تجویز فرمادی بشرطیکہ معروف یا مشروط نہ ہو، کما ہو مقتضی النصوص الاخر۔ پس یہ حکم کلی حلت کا بالکل نہیں، ۱۳ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۷۴)

عدم جواز انتفاع از زمین موروثی مرہونہ

سوال (۴۰۸) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید مثلاً ایک بیگہ موروثی زمین کا کاشتکار ہے، جس کا زمیندار خالد ہے، زید نے بایں خیال کہ یہ زمین موروثی کاشتکاری ہے، اور زمیندار کو تا توناً تخلیہ و بیدخلی کا اختیار نہیں، بکر سے کچھ روپیہ قرض لے کر اس زمین کو رہن رکھ دیا اور بخوشی اس کو اجازت دیدی کہ بجائے میرے تم زراعت کرتے رہو، اور جو لگان میں زمیندار کو دیا کرتا تھا تم اس کو دیا کرو بکر اس زمین پر قبضہ کر کے زراعت کرنے لگا، اب بکر کو یہ خیال ہو رہا ہے کہ زمین اگرچہ شرعاً مرہون نہیں ہوئی، کیونکہ کاشتکار شرعاً مالک زمین نہیں ہے، مگر چونکہ مجھ سے کاشتکار نے قرض بھی لیا ہے، شاید یہ انتفاع سود نہ ہو، دریافت طلب یہ امر ہے کہ زید کاشتکار نے جو زمین مذکورہ بطور رہن کے بکر کو حوالہ کر دیا ہے اور زراعت کی اجازت دیدی ہے اور

بکر سے کچھ قرض بھی لیا ہے، آیا وہ انتفاع و استقراض دونوں تبرع قرار دے کر جائز سمجھے جائیں یا حکماً رہن قرار دے کر انتفاع ناجائز سمجھا جائے، کاشتکار چونکہ شرعاً مستاجر ہے اور بکر دائن اس کا قائم مقام ہے، اگر یوں کہا جائے کہ اصل مستاجر یعنی زید نے اپنے اجارہ کو تبرعاً بکر کو دیدیا ہے۔ اور بکر نے تبرعاً زید کو قرض دے دیا ہے تو شرعاً ممکن ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب۔ بکر کو یہ انتفاع جائز نہیں گو عدم جواز کی بناء یہ نہیں، کہ یہ عقد رہن ہے کیونکہ زید کو اس رہن رکھنے کا کوئی حق نہیں، لیکن تاہم بکر کو اس زمین سے جو انتفاع ہوگا وہ اس قرض ہی کے سبب ہوگا، چنانچہ ظاہر ہے اور تبرع کا احتمال دونوں جگہ غلط ہے چنانچہ یقینی امر ہے کہ اگر ان متعاقدان میں سے ایک کو بھی معلوم ہو جاوے کہ اس نفع رسانی کے عوض میں مجھ کو انتفاع نہ ہوگا تو وہ کبھی اس نفع رسانی پر راضی نہ ہو تو تبرع کیسے ہوا۔ دوسری وجہ اس انتفاع کی حرمت کی وہی ہے جو خود زید کے لئے تھی، یعنی غیر کی چیز سے بلا اذن شرعی منتفع ہونا، غرض بکر کے لئے یہ انتفاع دو وجہ سے حرام ہے، ایک مالک کا اذن نہ ہونا، دوسرا مجرد بالقرض ہونا، یکم صفر ۱۳۳۵ھ (تتمہ خامسہ ص ۱۰۵)

| حکم صورت رہن مذکورہ سوال |

سوال (۴۰۹) ایک شُول[1] مکان پختہ احمد کا محمود نے سولہ برس کے لئے مبلغ دو ہزار روپے میں مجری کیا ہے، جس کا کرایہ عسہ ماہوار ہے اور شرائط ذیل ہیں۔

نمبر ۱، مرمت شکست و ریخت بذمہ راہن ہے، نمبر ۲، قبضہ مرتہنانہ دے کر اختیار دیدیا ہے کہ چاہے خود رہے یا کرایہ پر اٹھاوے، نمبر ۳، سولہ برس کے اندر بے باقی مقرر پاکر جائداد مرہونہ فک رہن ٹھہری ہے، نمبر ۴، صرف پوتائی و صفائی و گل اندازی سقف بذمہ مرتہن ہے۔ نمبر ۵، اگر راہن کوئی جزو جائداد مرہونہ کا کرایہ پر لے گا تو اس کا کرایہ نامہ باضابطہ لکھے گا چنانچہ جو کرایہ پر اس کو دیا گیا ہے وہ علاوہ عسہ کے ہے اور شرط دفعہ نمبر ۴ کا متحمل راہن کو کر دیا گیا، نمبر ۶، اندر میعاد سولہ سال بلا رضامندی مرتہن اختیار انفکاک رہن ہے، نمبر ۷، شکست و ریخت میں جو روپیہ مرتہن صرف کرے وہ ہم راہنان ادا کریں گے، اگر نہ ادا کریں تو بعد سولہ سال کے بحساب ماہ عسہ سال تا بے باقی زر لاگت مرتہن اور قبضہ رکھنے کا مستحق ہوگا۔

محمود کا یہ خیال ہے کہ فی الحال گو مکان کرایہ داران کو کرایہ پر عسہ ماہواری کا اٹھا ہوا ہے، مگر احتمال یہ بھی ہے کہ آئندہ نہ اٹھے، اور خالی رہے، یہ معاملہ سودی نہیں ہے شرعاً جائز ہے

---

[1] شُول (SOLEI) اکیلا

الجواب - شریعت میں ربوا یعنی سود کچھ زیادہ وصول کرنے ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر عقد باطل وفاسد ربوا ہے۔ اور اگر کوئی اپنی اصطلاح میں اس کا نام ربوا نہ رکھے تو احکام کا مدار نام نہیں ہے، بلکہ حقیقت ہے، اور حرمت صرف ربوٰ کے ساتھ خاص نہیں۔ جو عقد کہ شرائط جواز کا فاقد ہو وہ بھی حرام ہے، صورت مسئولہ میں اصل عقد رہن ہے، اور اس کا مقتضا صرف یہ ہے کہ جب راہن زر رہن مرتہن کو ادا کر دے، مرتہن اس رہن کو چھوڑ دے اور اس درمیان میں اس سے جو آمدنی ہوئی ہو وہ مرتہن کے پاس امانت ہے، شے مرہون کے ساتھ اس کو بھی واپس کر دے اور ظاہر ہے کہ صورت مسئولہ میں بعض شرائط اس مقتضائے عقد کے خلاف ہیں۔ اس لئے یہ معاملہ حرام ہے گو سود نہ ہو۔

۲۵ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۵۹)

مزارعت در زمین مرہونہ مملوکہ کافر

سوال (۴۹۰) ایک ہندو کی زمین مسلمان کے پاس رہن ہے، اب مرتہن سے مزارعت پر لے لی جاوے یا نہ، یہ بھی معلوم ہے کہ نفع یہ شخص ہی اٹھاوے گا۔

الجواب - بعض علماء کے قول پر ربیلح مال الحرب برضاہ ولو بعقد فاسد جائز ہے۔

۲۲ رجب ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ۲ ص ۱۰۶)

کتابُ الہبہ

ثبوت ہبہ بقرائن

سوال (۴۹۱) زید نے بلا تصریح و اعلان شرع ودین کے کسی قدر روپیہ عمرو عم حقیقی اپنے کو دیا، کہ ایک نشستگاہ اندر زمین اپنی کے بنالو، عمرو نے اس روپے سے اپنی زمین مملوکہ میں اپنی خشت سے ایک مکان بنالیا۔ اب زید وارثان عمرو سے بعد وفات عمرو طالب اس زر کل ہے جو مزدوری مزدوران ومعماران میں صرف ہوا ہے پس عند اللہ وعند الرسول استرداد اس روپیہ کا زید کو وارثان عمرو سے آتا ہے یا نہیں؟

الجواب - صورت مسئولہ میں زید نے جو عمرو کو روپیہ دیا ہے عند الشرع ہبہ ہے، اگرچہ کوئی تصریح نہیں مگر ظاہراً قرینہ ہبہ پر دلالت کرتا ہے اور ہبہ میں قرینہ بھی تملیک کیلئے کافی ہے قلت فقد افاد ان التلفظ بالایجاب والقبول لا یشترط بل تکفی القرائن الدالۃ علی التملیک لکن دفع الی الفقیر شیئاً وقبضہ ولم یتلفظ واحد منہما بشیء انتہی درمختار

اور جب ہبہ متحقق ہوگیا اور عمرو وفات پاچکا ہے اب زید کو وارثانِ عمرو سے کچھ دعویٰ نہیں پہنچتا، اور استرداد اس کا ہرگز جائز نہیں، کیونکہ موت احد المتعاقدین مانع رجوع ہبہ ہے۔ والمیم موت احد المتعاقدین، درمختار باشامی ص۵۱۶، واللہ اعلم (امداد ج ۳ ص ۳۳)

ثبوت ہبہ بقرائن | **سوال (۴۹۲)** عمرو زید ہردو ایک مکان مشترک میں رہتے تھے۔ لیکن قبضہ دار مسکن ہر فریق کا جداگانہ طور پر تھا، حصہ عمرو با علان نصفی مکان بحالت بغاوت حاکم وقت نیلام ہوگیا زید نے بوقت نیلام روپیہ اس کے نیلام کا عمرو کو بلا تصریح کسی امر کے کہ وہ بچا اس کا حقیقی بھی تھا دیا، کہ وہ نیلام خرید کرلے، عمرو نے وہ مکان اپنے نام پر خرید کرلیا اور تا حیات عمرو کے قبض و تصرف میں رہا اور بعد وفات عمرو اس کے وارثان کے اور اس قسم کے تبرعات زید عمرو کے ساتھ اکثر کرتا رہا۔ اب زید وارثانِ عمرو سے دعویٰ اس امر کا کرتا ہے کہ مکان میرے روپیہ سے خریدہ ہے، شرعاً یہ دعویٰ زید کا جائز ہے یا ناجائز اور استرداد اس روپیہ کا زید کو پہنچتا ہے یا نہیں؟

الجواب۔ صورت مسئولہ میں زید نے جو روپیہ عمرو کو واسطے خرید نے نیلام کے دیا، اور عمرو نے اپنے نام پر خریدا۔ اور قبضہ میں عمرو ہی کے رہا۔ پس یہ روپیہ دینا ہبہ ہے۔ اگرچہ تصریح نہیں کی، مگر قرائن ظاہرہ ہبہ پر دلالت کرتے ہیں، اور وہ ملکیت عمرو کی ہے، اور جب عمرو مر گیا اب رجوع ہبہ کا نہیں ہوسکتا۔ فقط (امداد ج ۳، ص ۹۹)

حصہ خود گذاشتن وارثے | **سوال (۴۹۳)** میت کے تین وارثوں میں سے ایک وارث نے کہا کہ میرا حصہ بقیہ دونوں کو دیدو میں خود لے لیا کروں گا، یہ نہیں کہا کہ میں نے اپنا حصہ چھوڑا، اپنا حصہ میں نہ لوں گا، تو اس طرح کہنے سے بھی یہ تخارج ہوجاوے گا، یا یہ ہبہ ناجائز ہے، وہبہ مشاع ہوجاوے گا؟

الجواب۔ اگر خود ان وارثوں سے کہا کہ میں نے تم کو دیا تو ہبہ ہے۔ اور جو اور کسی سے کہا کہ دیدو تو یہ توکیل بالہبہ ہے، بہرحال یہ تخارج نہیں جس کی حقیقت تصالح علی الاقرار ہے جو حکم بیع میں ہے، اور چونکہ ہبہ مشاع کا ہے لہذا جہاں مشاع ہونا مانع صحت ہو وہاں جائز نہ ہوگا۔ فقط (امداد، ج ۳ ص ۹۳)

بودن روپیہ اشیاء غیر منقسمہ | **سوال (۴۹۴)** روپیہ اشیاء غیر منقسمہ میں سے ہے یا منقسمہ سے یعنی دو شخصوں کو ہبہ کرنا درست ہے یا نہ، چونکہ چاندی آجکل ارزاں ہے لہذا روپیہ کی تقسیم

کر دینے سے وہ نفع نہیں رہ سکتا، لہٰذا یہ بھی غیر منقسم ہوئے۔ لیکن اگر چاندی گراں ہو جائے تو کیا اس وقت حکم بدل جاوے گا؟

الجواب ۔ روپیہ اشیاء منقسم میں سے ہے، خواہ چاندی ارزاں ہو یا گراں کیونکہ اس کا نفع موضوع لہ باقی نہیں رہتا، وہو المراد بقاء نفعہ و عدمہ، در مختار میں جزئیاً مذکور ہے (فروع قبیل باب الرجوع فی الہبۃ وھب لرجلین درھما ان صحیحا صح وان مغشوشا لا لانہ مما یقسم لکونہ فی حکم العروض فقط واللہ اعلم، (امداد ج ۳، ص ۹۳)

تحقیق قرائن ہبہ زوجہ را

سوال (۴۹۵) زید ملازم بادشاہ وقت تھا، جب اس کو تنخواہ ملتی تھی وہ سب کی سب لاکر اپنی بیوی ہندہ کو حوالہ کر دیتا تھا، اور ہندہ جو چاہتی تھی وہ کرتی تھی وہ اصلاً پرساں نہیں ہوتا تھا بلکہ حالت یہ تھی کہ زید کو اگر آنہ دو آنہ یا روپیہ دو روپیہ یا کچھ کم و بیش کی حاجت ہوتی تھی تو ہندہ سے مانگتا تھا، اگر ہندہ نے دیدیا تو خرچ کیا، ورنہ چپ ہو رہتا تھا، پس اسی تنخواہ کے روپے سے ہندہ نے زید کی حیات میں جائداد اپنے نام سے خریدی اور وقت خریدے اس وقت تک وہی اس پر قابض ہے، اور زید نے اس سے اصلاً تعرض نہیں کیا، اب عرصہ چار پانچ سال کا ہوتا ہے کہ زید انتقال کر گیا، پس یہ جائداد علی ما فی الشامی وغیرہ ہبہ میں صرف قرائن دالّہ علی التملیک کے بھی کافی ہونے کی وجہ سے ہندہ کی قرار پاوے گی یا زید ہی کی سمجھی جا کر اس کے کل ورثہ اس میں حصہ پاویں گے۔

الجواب ۔ ہر چند ہبہ قرائن سے ثابت ہو جاتا ہے، لیکن صورت مسئولہ میں اسی میں کلام ہے کہ یہاں قرائن ہبہ کے ہیں یا نہیں، سو جہاں تک غور و تامل کیا گیا یہ دینا ہبہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ بی بی کو محض تحویلدار سمجھتے ہیں، اور محض اس وجہ سے سب کمائی سپرد کر دیتے ہیں کہ اس کو امور خانہ داری میں تجربہ کار سمجھتے ہیں تو اس کو دیدینا ایک گونہ انتظام کی سہولت سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جو عورتیں سلیقہ شعار نہیں سمجھی جاتیں ان کو اس طرح کے اختیارات نہیں دیئے جاتے اسی طرح اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اپنے رشتہ دار کو دیتی ہے، تو یقیناً شوہر ناخوش ہوتا ہے ان سب قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہبہ نہیں محض توکیل وایداع ہے، رہا نہ پوچھنا اور تعرض نہ کرنا یہ اس وجہ سے نہیں کہ اس کو مالک کر دیا ہے: بلکہ اس وجہ سے ہے کہ زوجہ پر اعتماد ہے کہ بے موقع صرف نہ کرے گی، بہرحال روپیہ بچا ہوا تو شوہر ہی کی ملک ہوگا، جب اس نے جائداد خریدی گویا مغصوب روپے سے خریدی - لہٰذا جائداد زوجہ کی ملک

ہو گی اور یہ روپیہ ترکہ زوجہ سے وصول کرکے سب ورثۂ زید کو تقسیم ہو گا جس میں خود زوجہ بھی داخل ہے، پس بقدر اس کے حصہ کے ساقط ہو جاوے گا، بقیہ روپیہ بقیہ ورثہ کے لئے وصول کیا جاوے گا۔ البتہ اگر شوہر کو یقیناً یہ معلوم ہو کہ یہ میرے ہی روپے سے خریدی گئی ہے اور بی بی نے اپنے ہی لئے خریدی ہے، اس میں میرا کوئی حق نہیں، یہ سکوت البتہ دلیل ہبہ کی ہے، مگر جب تک یہ احتمال باقی ہو کہ شاید شوہر کو اس کی اطلاع نہ ہو کہ یہ میرے روپے سے خریدی گئی ہے، یا یہ کہ اطلاع ہو مگر اس نے یہ سمجھا ہو کہ گو اپنے نام خرید لی ہے مگر اس کو میری ہی سمجھتی ہے اور میرے بعد میرے ورثہ کو محروم نہ کرے گی، یا اس لئے وہ خاموش ہو گیا ہو کہ اس کے نام ہونے سے جائداد محفوظ رہے گی، میرے پاس سے شاید کوئی نیلام قرضہ میں کرالیوے تو ان احتمالات سے ہبہ ثابت نہ ہو گا۔

خلاصہ یہ کہ جب تک مجموعہ قرائن کی تفتیش و تعیین نہ ہو حکم ہبہ کا مشکل ہے، واللہ اعلم

۲۷ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ (امداد ج ۳ ص ۹۴)

زیور صرف کردن زوجہ بعمارت زوج

سوال (۴۹۶) بر وقت تعمیر اور مکان تیار ہوتے کے بعد حاجی صاحب مرحوم نے بہت دفعہ کہا کہ یہ مکان مسماۃ زوجہ ثانیہ کے لئے بنوایا گیا ہے، اور اسی وجہ سے چار سو روپیہ کا زیور مسماۃ مذکورہ کا حاجی صاحب نے فروخت کرکے اس میں لگایا، آیا اس مکان میں میراث جاری ہو گی یا اور سب وارثوں میں تقسیم ہو گا یا مسماۃ کا ہو گا؟

الجواب: اگر اس کو ہبہ مان لیا جاوے تو ہبہ اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جب ہبہ کرنے والا بالکل اس مکان کو اپنی چیزوں سے خالی کرکے موہوب لہا کو قبضہ کرادے، اگر ایسا ہوا ہے تو بعد اقامت شہود ہبہ صحیح ہو گا ورنہ نہیں: فی الدر المختار وتتم الهبة بالقبض الكامل ولو الموهوب شاغلا لملك الواهب لا مشغولا به الى قوله فلو وهب جرابا فيه طعام الواهب او دارا فيها متاع او دابة عليها سرج وسلمها كذلك لا تصح وبعكسه تصح اھ

اور زیور اس میں لگانا غایۃ ما فی الباب قرینہ ہبہ کا ہو گا، مگر ہبہ میں جو شرط ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے، جیسا اوپر بیان ہوا پس جب تک ہبہ صحیح نہ ہو گا وہ زیور بطور احسان کے زوجہ کی طرف سے سمجھا جاوے گا، فقط واللہ اعلم (امداد، ج ۳، ص ۹۵)

تفضیل بعضے اولاد در عطا

سوال (۴۹۷) کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ زید کی اولاد میں چند لڑکے اور لڑکیاں ہیں، ان میں سے کبیر سن اولاد کی تعلیم اور شادی

وغیرہ میں حسب لیاقت روپیہ صرف کر چکا ہے اور صغیر سن اولاد کی نہ تعلیم ہوئی ہے اور نہ شادی
اب زید اپنے بڑھاپے کی وجہ سے اپنی حیات میں ورثہ کو شرعی طور پر مال و اسباب تقسیم کرنا چاہتا ہے
تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ صغیر سن اولاد کی تعلیم اور شادی وغیرہ کا صرف ان کو مثل اولاد کبیر
سن کے علاوہ ترکہ کے شرعاً دے سکتا ہے یا نہیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب – فی الدر المختار قبیل باب الرجوع فی الهبة عن الخانية لا باس بتفضيل بعض الاولاد فی المحبة لانها عمل القلب وكذا فی العطايا ان لم يقصد به الاضرار وان قصده سوى بينهم يعطى البنت كالابن عند الثانی وعليه الفتوى فی رد المحتار ای علی قول ابی يوسف من ان التنصيف بين الذكر والانثى افضل من التثليث الذی هو قول محمد رملی، چونکہ صورت مسئولہ میں بعض اولاد کو بغرض شادی و تعلیم کے زیادہ دینے سے مقصود دوسری اولاد کو ضرر پہنچانا نہیں، بلکہ ایک ضرورت و مصلحت کو زیادہ دیتا ہے، بنا بر روایت بالا اس میں کچھ حرج نہیں، اس زائد کے علاوہ اور جو کچھ ترکہ ہو سب اولاد ذکور و اناث کو برابر تقسیم کر دینا چاہئے لیکن صحت تقسیم کے لئے ہر حصہ کا جدا کرنا اور بالغین کا قبضہ بھی کرا دینا ضروری ہے، اور آخر میں جو پوچھا ہے کہ جن کی حفاظت میں الخ۔ ان سے مراد اجنبی ہے یا وارث اس وقت جواب ہو سکتا ہے، واللہ اعلم، ۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۳ھ (امداد، ج ۳، ص ۹۵)

نقض بعض اولاد بر بعضے در عطایا | **سوال** (۴۹۸) ہم زید میخواہد کہ متوفی اول را از کاروبار خود نصف عطا رساند و دیگران را نصف پس ہمچنیں غیر تعدیل میان اولاد ذکور خود را عطا جائز است یا نہ واضح باد کہ فرق میان متوفی اول و متوفی دیگر ایں قدر ست کہ متوفی اول از دیگران در کار تجارت فی الحال چہار حصے دارد؟

الجواب – ہکمش در نمبر ۴ گذشت وایضاً فی الدر المختار ویقسم بینہم بالسویة ان لم یرتب البطون وان قال للذکر کالانثیین فکما قال مع رد المحتار ج ۳ ص ۷۹۴ ہرگاہ بلا تفاوت فی العمل تفاوت در صلہ نافذ ست پس مع التفاوت فی العمل بدرجہ اولیٰ نافذ باشد، ۷ محرم ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ، ص ۱۰۹)

جائداد بخشیدن بعض اولاد را و محروم کردن بعض را | **سوال** (۴۹۹) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک عورت کی کوئی جائداد مملوکہ بلا شرکت غیرے ترکہ مادری یا پدری سے ہے اور اس عورت کے ایک پسر دو دختر موجود ہیں، اگر وہ عورت بحالت صحت و رضا و رغبت

بے ۹ کیونکہ مرض الموت میں کسی وارث کو نہیں دے سکتا اور اجنبی کو ثلث سے زائد نہیں دے سکتا ۱۲ منہ

اپنی کل جائداد اپنی دختروں کو ہبہ کردے۔ اور بوجہ ناراضی کے پسر کو بے حق کردے اور کچھ نہ دے، اور پسر صاحب جائداد بھی ہے تو آیا شرعاً اس امر کا اختیار رکھتی ہے یا نہیں اور وہ پسر دعویدار ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب۔ وہ عورت اختیار رکھتی ہے کہ اپنی زندگی میں بحالتِ صحت کل جائداد اپنی دختروں کو ہبہ کردے۔ اور پسر کو کچھ نہ دے، پسر کو کچھ دعوی نہیں پہنچتا، باقی گناہ ہونا نہ ہونا دوسری بات ہے، اگر کسی وجہ شرعی سے مثل نافرمانی وایذارسانی وفسق وظلم وغیرہ پسر کو بے حق کیا ہے گناہ بھی نہ ہوگا، اگر بے وجہ کیا تو گناہ ہوگا، مگر حاکم دونوں صورتوں میں اس تصرف کو جائز ونافذ رکھے گا۔ رجل وھب فی صحتہ کل المال للولد جاز فی القضاء و یکون اٰثما فیما صنع کذا فی فتاوی قاضیخان وان کان فی ولدہ فاسق لاینبغی ان یعطیہ اکثر من قوتہ کیلا یصیر معینا فی المعصیۃ کذا فی خزانۃ المفتین ولو کان ولدہ فاسقا واراد ان یصرف مالہ الی وجوہ الخیر ویحرمہ عن المیراث ھذا خیر من ترکہ کذا فی الخلاصۃ عالمگیری نولکشوری ج ۳ ص ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، واللہ اعلم، فقط، ۳ رصفر ۱۳۲۰ھ (امداد ج ۳ ص ۹۹)

توقف صحت ہبہ برقبضہ وشرائط رجوع در ہبہ

سوال (۵۵۰) کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مسمی زید نے مسمی خویلد کو اپنے مال کا ہبہ کیا اور اس کی تحریر بھی کردی ہے لیکن تحریر ہبہ نامہ میں مال واسباب وجائداد منقولہ وغیر منقولہ کا مفصل ذکر نہیں کیا بلکہ صرف لفظ کل مال وزیور وبرتن کا تحریر ہے، اس زیور وبرتن سے قدرے مال خویلد کے پاس ہے، باقی کل مال واسباب وجائداد منقولہ وغیر منقولہ زید کے قبضہ میں ہے اور مکان میں بھی اب تک زید ہی رہتا ہے۔ اب زید اس ہبہ سے رجوع کرکے اپنا مال جو خویلد کے پاس ہے واپس لینا چاہتا ہے آیا زید کا اس ہبہ کی طرف رجوع کرنا درست ہے یا نہیں بموجب حکم شرع شریف مفصل تحریر فرماویں، بینوا توجروا!

الجواب۔ جس قدر خویلد کے پاس ہے اس کا ہبہ صحیح ہوگیا، اور جس قدر زید کے قبضہ میں ہے اس کا ہبہ صحیح نہیں ہوا، اور جس کا ہبہ صحیح ہوچکا اس کا رجوع کرنا اس وقت درست ہے کہ موانع رجوع بھی نہ پائے جاویں اور خویلد بھی رضامند ہوجاوے یا کوئی حاکم دلادے اور اگر نہ حکم حاکم ہوا اور نہ خویلد واپس کرنے پر راضی ہو تو زید کو رجوع کرنا حرام ہے۔ اور اگر اس طرح رجوع

کرے گا غاصب ہوگا، فی الہدایۃ ولا یصح الرجوع الا بتراضیہما او بحکم الحاکم قال العینی لو استردھا بغیر قضاء ولا رضاء کان غاصبا فلو ھلکت فی یدہ یضمن قیمتہ للموہوب لہ واللہ اعلم۔ ۸ رمضان ۱۳۲۴ھ (امداد ج ۳، ص ۹۶)

دلیل حنفیہ در مانعیت محرمیت از رجوع ہبہ

سوال (۵۰۱) جاء فی الحدیث قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الواھب احق بھبتہ مالم یثب منہا کذا فی القسطلانی پس امام صاحب کے نزدیک قرابت محرمیہ میں رجوع کس دلیل سے جائز نہیں؟

الجواب، وہ دلیل یہ ہے قال علیہ السلام اذا کانت الھبۃ لذی رحم محرم لم یرجع منہا رواہ البیہقی والدارقطنی فی سننہما والحاکم فی المستدرک کذا فی حاشیۃ الہدایۃ عن علی القاری شرح نقایہ،

۱۴ ربیع الاول ۱۳۲۵ھ (امداد، ج ۳، ص ۹۷)

دفع تعارض در عبارات فقہیہ در اسقاط وارث حق خود راجع بعض احکام ہبہ

سوال (۵۰۲) اوصی لرجل بثلث مالہ و مات الموصی فصالح الوارث من الثلث بالسدس جاز الصلح ذکرہ یحتمل السقوط بالاسقاط الخ شامی جلد ۴ کتاب الصلح فی التخارج قول اول اشباہ والنظائر میں ہے جس کا حوالہ قول مذکور میں دیا ہے ولو قال الوارث ترکت حقی لم یبطل حقہ اذ الملک لا یبطل بالترک ص ۲۶۳، مطبوعہ کلکتہ اس کی شرح حموی میں ہے۔ اعلم ان الاعراض عن الملک ضابطتہ انہ ان کان ملکا لازما لم یبطل بذلک کما لو مات عن ابنین فقال احدھما ترکت نصیبی عن المیراث لم یبطل لانہ لازم لا یترک بل ان کان عینا فلا بد من التملیک وان کان دینا فلا بد من الابراء بظاہر دونوں عبارتوں میں تعارض ہے، تعجب یہ ہے کہ شامی نے خود اشباہ کا حوالہ دیا ہے۔ جو اس کے خلاف ہے، قیاس کے مطابق قول اشباہ معلوم ہوتا ہے۔ البتہ یہ کہ جب تملیک ہے تو چونکہ تملیک مجازاً ہے۔ اس لئے ہبہ میں داخل ہونا چاہئے، اور شرائط مثل قبض و عدم شیوع شرط ہوگا، البتہ اگر وہ شے قابل تقسیم نہ ہو تو بظاہر ہبہ صحیح ہونا چاہئے۔ شبہ یہ ہے کہ اگر متروکہ میت میں سے ایک ایک چیز مختلف جنس سے ہے، مثلاً ایک الماری ہے، ایک کرسی ہے، یا اور کوئی چیز جس کو ملا کر تقسیم کئے جانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، اور ہر چیز کو علیحدہ علیحدہ تقسیم کرنے سے وہ شے منتفع بہ نہیں رہتی ایسی چیز اگر ایک وارث دوسرے کو ہبہ کرے

تو یہ ہبہ صحیح ہوگا یا نہیں، ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ صحیح ہو جاوے کیونکہ مثلاً اس کا الماری میں علیحدہ حصہ ہے، اور وہ بھی قابلِ تسلیم نہیں، پس شیوع مانع صحتِ ہبہ نہ ہوا، علیحدہ کرسی اگر سی میں علیحدہ حصہ ہے، اور وہ بھی قابل تقسیم نہیں، اگر یہ تمام باتیں صحیح ہیں تو پھر یہ اور جواب طلب ہے، کہ کتبہائے مختلفہ خواہ ایک فن کی ہوں مثلاً شرح وقایہ، ہدایہ، یا مختلف فن کی ہوں ان کا کیا حکم ہے، مثلاً ایک مولوی نے انتقال کیا اور اپنا کتب خانہ چھوڑا، تمام ورثہ نے اپنا اپنا حصہ خاص ایک وارث کو دے ڈالا۔ تو یہ ہبہ بطریق سابق صحیح ہو سکتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر کتاب میں تمام ورثہ کا حصہ ہے، اور چونکہ ہر کتاب علیحدہ قابل تقسیم نہیں، اس لئے وہ ہبہ صحیح ہوگیا، البتہ اگر کتاب کے دو نسخے ہوں تو صحیح نہ ہو، کیونکہ قابلِ تقسیم ہے، اور آیا عدم صحت ہبہ (جب کہ کتاب کے دو نسخے ہوں) اسی وقت ہوگا جبکہ دو وارث ہوں، اور زائد ہونے سے پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کتابیں صرف دو ہیں۔ اس لئے قابل تقسیم نہیں، یا کہ تمام کتابوں کو ایک ساتھ شامل کرکے سب کو ایک نوع قرار دیدیا جاوےگا اور ہر صورت میں ہبہ صحیح نہ ہوگا۔ اس مسئلہ کی نسبت بڑا تردد، اور پریشانی ہے، توضیح کی وجہ سے تطویل ہوگئی۔

الجواب، میرے نزدیک دونوں میں تعارض نہیں، کیونکہ لم یبطل حقہ الخ اس صورت میں ہے جب بالکلیہ دست بردار ہو جاوے، جیسے ہندی بہنیں اپنا حق بھائیوں سے نہیں لیتیں اور یحتمل السقوط اُس صورت میں ہے کہ جب اپنے حق سے کم پر صلح کرے چنانچہ جائز الصلح کی دلیل میں بیان کرنا اس کا قرینہ ہے، اور حاجت بیان یہ ہے کہ اپنے حق سے کم پر صلح کرنے کا جواز مخصوص معلوم ہوتا ہے دین کے ساتھ، اور یہاں صلح عن العین ہے پس محتمل تھا عدم جواز کو اس لئے تصریح کردی، اب تدافع نہ رہا اور جن امور کو لکھ کر آپ نے لکھا ہے کہ اگر یہ تمام باتیں صحیح ہیں الخ سو واقع میں یہ سب باتیں صحیح ہیں اور ظاہر یہی ہے کہ کتب مختلفہ اجناس مختلفہ ہیں۔ اور ایک کتاب کے مختلف نسخے جنس واحد کے مختلف افراد ہیں، مگر جب وارث زیادہ ہوں اور نسخے کم ہوں تو مجموعہ قابلِ تقسیم نہ ہوگا، واللہ اعلم،

۱۰ رجب ۱۳۲۵ھ (امداد، ج ۳، ص ۹۸)

رد ہبہ یا عاریت

سوال (۵۰۳) زید کو ایک دربار سے تعلق تھا، اس کے صلہ خدمت میں وہاں سے بطور اراضی وغیرہ کے بہت کچھ انعام ملا۔ بعد اذن آقا و نوکر کے درمیان میں

مخالفت واقع ہوئی پس آقا نے جو کچھ دیا تھا واپس لے لیا، زید بھی ناخوش ہو کر دوسری جگہ چلا گیا۔ بعد مدت دراز کے اولاد زید سے دو لڑکے پھر اسی بستی میں گئے، اور اسی سرکار میں نوکر ہوئے، اور منجملہ عطیہ مذکورہ پھر ان کو دیا گیا اب اس میں باقی زید کی اولاد شریک ہو سکتی ہے یا نہیں، اور یہ ہبہ جدید ہے یا قدیم، بعد اس کے سرکار کی عادت یوں ہی رہی کہ دو چار برس کے لئے وہ زمین چھوڑ دیا کرتی، پھر ضبط کر لیا کرتی اور پھر مہینہ دو مہینہ بعد چھوڑ دیتی، آخر کار یہ بات ہوئی کہ ان دونوں بھائیوں میں سے ایک بھائی کی تنخواہ میں لکھدی، اب اس کا مالک کون ہے؟

الجواب ، اگر آقا نے زید کو بطور عاریت اراضی مذکور دی تھی تو استرداد جائز ہے۔ لقولہ علیہ السلام العاریۃ مؤداۃ والمنحۃ مردودۃ رواہ الترمذی اور اگر بطور ہبہ دی تھی، بعد وجود شرائط جواز ہبہ بحکم حاکم یا رضائے زید استرداد جائز ہے، اگرچہ مکروہ تحریمی ہے، اور بلا حکم حاکم یا بلا رضائے زید استرداد ناجائز، ولا یصح الرجوع الا بتراضیہما او بحکم الحاکم للاختلاف فیہ درمختار، اور کوئی یہ وہم نہ کرے کہ آقائے واہب اگر خود حاکم ہے، تو رجوع بحکم حاکم پایا گیا، کیونکہ حکم حاکم کا اس کے نفع کے لئے نافذ نہیں ہوتا۔ وفیہا لا یقضی القاضی لنفسہ ولولدہ درمختار، البتہ اگر واسطے حکم کے کسی کو نائب کر کے اس سے فیصلہ کراتا، تو نافذ ہو جاتا، اذا وقع للقاضی حادثۃ او لولدہ فاناب غیرہ فقضی نائب القاضی لہ او لولدہ جاز قضاءہ درمختار علی ہذا القیاس زید کے دو لڑکوں کو جو دیا گیا، اس میں بھی یہی تفصیل ہے، اگر عاریۃ دیا تو استرداد جائز اور اگر ہبۃ بدون تقسیم دیا تب بھی استرداد جائز، کیونکہ ہبہ غیر مقسوم کا صحیح نہیں، وہب اثنان دارا لواحد صح وبقلبہ لکبیرین لا درمختار البتہ اگر وہ دونوں محتاج ہوں تو بدون تقسیم بھی صحیح ہے۔ قولہ لکبیرین ای غیر فقیرین والا کانت صدقۃ فتصح شامی اور اگر بعد تقسیم دیا تو بحکم حاکم یا برضاء ہر دو شخص استرداد جائز ورنہ ناجائز، پس صورتہائے مذکورہ میں سے جس صورت میں زید سے استرداد جائز نہیں، اس صورت میں اگر زید زندہ ہے تو، ورنہ اس کے ورثہ مالک اس کے علی قدر الحصص الشرعیہ ہوں گے، نہ تخصص ہر دو پسران کی نہ اس کی جس کی تنخواہ میں لکھدیا اور جس صورت میں زید سے استرداد جائز تھا لیکن ان دونوں لڑکوں سے جائز نہ تھا اس صورت میں وہی دونوں

لہ اگر حکومت مسلمہ میں ایسا ہوا تو یہ تفصیل ہوگی اور اگر حکومت غیر مسلمہ تھی تو استیلا کافر کی وجہ سے بہر حال استرداد صحیح ہوگا ۱۲ رشید احمد عفی عنہ

مالک ہیں نہ ورثۂ زید کے مستحق ہیں نہ وہ خاص جس کی تنخواہ میں لکھدیا، اور جس صورت میں ان سے بھی استرداد جائز ہے اس صورت میں صرف وہی مالک ہے جس کی تنخواہ میں لکھدیا گیا واللہ اعلم، ۸ رصفر ۱۳۲۰ھ (امداد، ج ۳، ص ۱۰۰)

واجب الرد بودن مال مسروقہ موہوبہ

سوال (۵۰۴) زید نے عمرو کی ایک چیز چرائی اور بکر کو ہبہ دیدی اور بکر نے خالد کو ہبہ کردی اب معلوم ہوا کہ زید نے چوری کی تھی اس حالت میں شئے مسروق کا ادا کرنا کس کے ذمہ واجب ہوگا۔

الجواب۔ جس کے پاس اب ہے اس پر رد واجب ہے اور اگر اس کو خبر نہ ہو تو جس کو خبر ہو اُس پر خبر کرنا واجب ہے اور اگر اس صاحب خبر کو ہبہ میں بھی دخل ہے تو اس پر استخلاص و استرداد میں بھی سعی واجب ہے۔

ہبہ جائداد بدختر

سوال (۵۰۵) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مادر حقیقی نے اپنی ایک دختر کو کل جائداد از اں خاص منقولہ اور غیر منقولہ بمقابلہ اعزا و اقربا کے جمع کرکے ہبہ کردیا اور بعض جائداد اس میں جو منقولہ تھی جیسے ڈگری عدالت وغیرہ اس کے کاغذات سپرد موہوب لہ کے کردیئے گئے، اور بہ نسبت جائداد غیر منقولہ جیسے حصص دیہات وغیرہ اس کی تحصیل بند۔ برآمدنی اور ادائے مالگذاری سرکار وغیرہ کار ضروری متعلق زمینداری سپرد موہوب لہ کردیا گیا، اور اجازت عام دیدی، کہ تم جانو اور یہ جائداد جو شئے موہوب ہے جانتے ہیں تم کو دے چکی تو ایسی ہبہ لسانی شرعاً جائز ہے کہ نہیں، اور موہوب لہ نے موہوب کو قبول کیا۔

الجواب:۔ روپیہ کا ہبہ محض کاغذات کے دینے سے صحیح نہیں ہوا کیونکہ موہوب کا موجود ہونا ضروری ہے، تملیک العین، بلکہ اس کو روپیہ وصول کرکے مالک ہوجانے کی اجازت دی ہے، پس یہ توکیل بالاقتضاء ہے، پس اگر قبل معزول ہونے کے روپیہ وصول کرکے اس پر قبضہ کرتی جاوے تو مالک ہوجاوے گی، اور بعد عزل مالک نہ ہوگی، اور معزول ہونے کی کئی صورتیں ہیں منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ وہ موکلہ معزول کردے یا موکلہ مرجاوے۔ ان دونوں صورتوں میں وہ وکیلہ معزول ہوجاوے گی، اور وصول کرنے کی مجاز نہیں بلکہ سب ورثہ اپنے حصص میں برابر استحقاق رکھتے ہیں۔ واما تملیک الدین من غیر من علیہ الدین فان امرہ بقبضہ صحت درمختار ای یکون وکیلا عنہ فیہ ۱۲ شامی فللموکل العزل متی شاء ۱۲ وینعزل بموت احدھما ۱۲ بوجب ۔ ہے کہ حالت

صحت واہبہ میں وصول کرکے قبضہ کرلیا ہو۔ اور اگر واہبہ کے مرض الموت میں یا بعد الموت قبضہ کرلیا تو بدون اجازت ورثہ صحیح نہ ہوگا، ویبطل اقرارہ ووصیتہ وہبتہ لابنہ کافرا ان اسلم، اور دیگر اشیاء موجودہ منقولہ یا غیر منقولہ جو ہبہ کی ہیں اس میں دیکھنا چاہئے کہ یہ لڑکی صغیرہ نابالغہ ہے یا کبیرہ بالغہ، اگر نابالغہ ہے تو دیکھنا چاہئے کہ کس کی تربیت میں ہے۔ اگر باپ دادا یا ان کا وصی موجود نہیں، یا موجود ہے لیکن سفر میں ہے اور بالفعل ماں کی ولایت میں ہے۔ تب تو محض زبانی کہہ دینے سے ہبہ صحیح ہوگیا۔ اور اگر بالغہ ہے یا نابالغہ ہے لیکن باپ دادا یا وصی موجود ہے تب یہ ہبہ زبانی کہہ دینے سے تام نہ ہوگا، تاوقتیکہ قبضہ باپ دادا کا یا لڑکی یا اس کے نائب کا نہ ہو۔ وھبۃ من لہ ولایۃ علی الطفل فی الجملۃ تتم بالعقد ۱۲ وان وھب لہ اجنبی یتم بقبض ولیہ وھو احد اربعۃ الاب ثم وصیہ ثم الجد ثم وصیہ وان لم یکن فی حجرھم وعند عدمہم ولو بالغیبۃ المنقطعۃ تتم بقبض من یعولہ، اور جس صورت میں ماں کا قبضہ کافی نہیں اس میں یہ بھی شرط ہے، کہ جو چیز قابل تقسیم ہو اس کو جدا کرکے اس کو یا اس کے ولی نائب کو قابض کردے۔ اور قبضہ محض حساب وکتاب دینے سے نہیں ہوتا تاوقتیکہ تسلط تام نہ ہو جس کو عرف قانون میں دخلیابی کہتے ہیں وتتم الھبۃ بالقبض الکامل وکل الموھوب لہ لرجلین لقبض الدار فقبضاھا جاز ۱۲ خانیۃ: جو چیزیں قابل تقسیم نہیں اس میں اشتراک واشاعۃ مضر نہیں فی محوز مقسوم ومشاع لا یقسم لا فیما یقسم ولو لشریکہ والروایات کلھا من الدر المختار واللہ اعلم، فقط

(امداد ج ۳، ص ۱۰۱)

داخلخارج سبب ہبہ ہے یا نہیں

سوال (۵۰۶) بی بی کا قبضہ بحیثیت داخلخارج کاغذات سرکاری میں ہوگیا، اور اس کی بی بی وصول تحصیل لگان کرتی ہے۔

الجواب۔ اگر قرائن سے معلوم ہو کہ خاوند کو یہ جائداد بی بی کو دینا ہی مقصود ہے تو یہ ہبہ ہوگیا، ۱۴ شعبان ۱۳۳۰ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۹۳)

وقت ہبہ موہوب کا مشاع ہونا اور بعد میں تقسیم ہوجانا،

سوال (۵۰۷) جائداد وقت تحریر ہبہ نامہ کے مشترک تھی، لیکن بعد میں تقسیم ہوکر جداگانہ محالی ہوگیا۔

الجواب۔ اگر اس تقسیم کے بعد بی بی کے قبضہ پر خاوند راضی ہے تو ہبہ تام ہوگیا، ۱۴ شعبان ۱۳۳۰ھ (تتمہ اولیٰ، ص ۱۹۳)

تتمہ سوال بالا (۵۰۸) اور اس جائداد کی آمدنی خاوند کے پاس رہتی ہے، بلا اجازت بی بی کے خرچ کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب، نہیں۔ ۱۴ شعبان ۱۳۳۳ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۹۳)

حکم اعطاء زوج زیور را بزوجہ خود وعدم تصریح مالک نمودن او

سوال (۵۰۹) زوج اگر اپنی زوجہ کو زیور نقرئی یا طلائی دے اور اس کی تصریح نہ کرے کہ یہ زوجہ کی ملک ہے تو بعد انتقال زوج آیا وہ زیور کل متروکہ میں شمار ہو کے سب ورثہ کو بقدر حصہ شرعی ملیگا، یا خاص زوجہ کا ہی مملوکہ سمجھا جائے گا بعد انتقال شوہر زوجہ کہتی ہے کہ شوہر نے میری ملک کر دیا تھا، اور دیگر ورثہ کہتے ہیں کہ ہمیں اس کی خبر نہیں، تو قول زوجہ معتبر ہوگا یا نہیں؟

الجواب جو قرائن سے ثابت ہوتا ہے، اگر ایسے قرائن موجود ہوں زوجہ کی ملک ہے، ورنہ متوفی کا، اور بعد وفات زوج اگر زوجہ ملک کا دعویٰ کرے اس سے ثبوت کا مطالبہ ہوگا، اگر کافی ثبوت نہ ہو تو ورثہ سے یمین علی العلم لی جاوے۔ یعنی یہ قسم کھاویں کہ ہم کو علم نہیں کہ متوفی نے زوجہ کی ملک کیا ہو، ۲۴ رمضان ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثانیہ ص ۵۵)

زمین موہوبہ بالعوض میں واہب کا یہ شرط کرنا کہ اگر تم اس کو فروخت کرو تو چوتھائی قیمت مجھ کو دینا پڑے گی

سوال (۵۱۰) ملک برہما میں ایک شخص امیر کبیر لقب اس کا تو فرنگنگ ہے، اور اس کے ماتحت چند گاؤں ہیں۔ سرکار عالی یعنی انگریز نے اس کو اس دیہات کا والی و مالک بنا دیا، اور یہ بھی کاغذ میں رجسٹری کر دیا کہ ہر سال میں اتنا روپیہ خزانہ سرکار عالی میں یعنی انگریز کو دینا پڑے گا۔ اور یہ دیہات جو تمہارے تحت میں ہے اس کو بھی تم بیع و فروخت کرنے کے مختار ہو یعنی اگر کسی کو بیچ ڈالو گے۔ سرکار انگریزی اس سے مانع نہیں ہے، اور جس کو فروخت کروگے اس کو بھی میرے یہ سب حکم ماننے پڑیں گے۔ اور تمہارے مرنے کے بعد تمہاری اولاد کے لئے بھی یہ حکم جاری ہے۔ یعنی وہ بھی اس کو بیع و فروخت کرنے کے مختار ہیں۔ لیکن تیس برس بعد سرکار انگریزی کی طرف سے جو حکم صادر ہوگا ماننا پڑے گا۔ یعنی اگر خراج وغیرہ افزود ہو جاوے اس کا حکم مان لینا پڑے گا۔ پس تو فرنگنگ مذکور رعیت کو جو اس کے زیر حکومت ہے، ایک کاغذ چند روپیہ نذرانہ لے کر چند بگیہ زمین دیتے ہیں اور یہ لکھ دیتے ہیں کہ فلاں طرف کی

فلاں زمین مثلاً چار بیگہ زمین تم کو دیا، بشرطیکہ فی سال فی بیگہ للعہ خراج دینا پڑیگا اور اس زمین کو صدقہ و ہبہ اور بیع و فروخت کرنے کے بھی تم با اختیار رہو. اور تمہارے مرنے کے بعد تمہارے وارثوں کو بھی اس کا اختیار ہے. لیکن جو زمین تمہارے تصرف میں ہے اس کو اگر فروخت کروگے اس کا چوتھائی قیمت مجھے دینا پڑے گا. یعنی اگر سو روپے کی زمین فروخت کروگے پچیس روپے مجھے دینا ہوگا اور جس کو فروخت کروگے اس کو بھی فی بیگہ تمہارے حساب سے خراج دینا پڑے گا۔ اور سرکار انگریزی جو حکم تیس برس کے بعد کرے گا، تم اور ہم دونوں کو اس کا حکم بجالانا پڑے گا، پس رعیت کو اس زمین کا مالک کہا جائے گا یا نہیں، اور اگر جو فرگنگ مذکور نے کسی رعیت سے جبراً زمین چھین کر دوسری رعیت کو نذرانہ لے کر زمین دیدی اور رعیت اول اس زمین کا مالک ہوگا یا رعیت ثانی اور کس کو ان دونوں میں سے اس زمین میں تصرف کرنا جائز ہوگا اور کس کو نہیں۔ از روئے شرع شریف کے؟ باوجود کہ سرکار انگریزی میں ایک رعیت سے چھینکر دوسری اور کسی رعیت کو دینے سے یا جو فرگنگ کو خود اس زمین میں تصرف کرنے کا حق ہے۔

الجواب. فی رد المحتار عن غایۃ البیان قال اصحابنا ان العوض الذی یسقط بہ الرجوع ما شرط فی العقد الی قولہ ولیس کذلک اذا شرط فی العقد لانہ یوجب ان یصیر حکم العقد حکم البیع ویتعلق بہ الشفعۃ ویرد بالعیب الخ ج۴ ص۴۹

چونکہ جو فرگنگ کو جو سرکار سے ملا ہے وہ تو بوجہ ہبہ صحیحہ کے اس کی ملک ہو گیا، کما ہو ظاہر آگے جو فرگنگ نے بشرائط مذکور کسی اور کو دیا ہے ظاہر صیغہ سے یہ ہبہ بالعوض معلوم ہوتا ہے اور ہبہ بالعوض حکم بیع میں ہے، جیسا روایت مذکورہ سے ثابت ہوا، اور اگر بیع ان شرائط سے ہو وہ فاسد ہے، اور بیع فاسد میں جیسا فقہاء نے تصریح کی ہے۔ قیمت متعارفہ واجب ہوتی ہے۔

نیز بیع فاسد میں مشتری اگر قبضہ کرے مالک ہو جاتا ہے، نیز بیع فاسد میں اگر مشتری نے اس کو کسی اور شخص کے ہاتھ بیع صحیح نہ کیا ہو یا ہبہ کر کے تسلیم نہ کیا ہو یا وقف نہ کو دیا ہو یا رہن نہ کر دیا ہو۔ ومن التصرفات التی ذکرہ فی الدر المختار باب البیع الفاسد اس وقت تک بائع کو حق فسخ و استرداد حاصل ہے، اور جو مشتری سے لیا ہے اس کا واپس کرنا بھی واجب ہے، اس لئے صورت مسئولہ میں جو فرگنگ نے جس شخص کو زمین

دی ہے اگر وہ قبضہ کرلے گا تو مالک ہو جاوے گا، اور جو شرائط ٹھیرائے ہیں سب لغو ہوں گے، البتہ اس زمین کی جو قیمت مروجہ ہوگی وہ واجب ہوگی۔ اور جب تک اس زمین لینے والے نے تصرفات مذکورہ منقولہ عن الدر المختار نہ کئے ہوں جو فرگنگ اگر واپس کرلے جائز، لیکن جو فرگنگ نے جو اس شخص سے لیا ہو وہ واپس کرے اور اگر ان تصرفات میں سے کوئی تصرف کرلیا ہو تو جو فرگنگ زمین واپس نہیں کرسکتا

۲۸ شوال ۱۳۲۵ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۵۶ و حوادث ۱۱۱ ص ۲۹)

عدم خروج شے از ملک بنام زد کردن دیگرے | (نوٹ) یہ مسئلہ بایں عنوان و حوالہ کتاب الدعویٰ میں آچکا ہے

صحت ہبہ للصغیر بدون القبض | **سوال** (۵۱۱) مورث نے کچھ زیور نقرئی و طلائی و برتن وغیرہ اس نیت سے تیار کرلئے کہ بوقت شادی اپنی فلاں لڑکی کو بطور جہیز دیں گے۔ وقتاً فوقتاً کسی کسی زیور کو جو تیار ہو کر آتے رہے اپنے اعزا و احباب کو یہ کہہ کر دکھایا بھی کہ فلاں لڑکی کو بطور جہیز بوقت شادی دینے کے لئے بنوایا ہے منجملہ اشیاء مسطورہ بالا بعض اشیاء دختر مذکورہ کے زمانہ عدم بلوغ میں تیار ہوئی تھیں اور بعض بعد بلوغ قطعی طور سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کون کون سی قبل از بلوغ تیار ہوئی تھیں اور کونسی بعد بلوغ، بعد بلوغ دختر مذکورہ مورث زائد از یک سال زندہ رہے، اور کل اشیاء بدستور بحالت موجودہ بقبضۂ مورث رہیں اور مورث نے دختر مذکورہ کی شادی سے قبل انتقال کیا۔ اس صورت میں اشیاء متذکرہ بالا شرعاً متروکۂ متوفی قابل ورثہ متصور ہوں گی، یا تنہا ملک دختر اور مورث کی محض نیت ہبہ یا وصیت کی حد تک پہنچتی ہے یا نہیں، بینوا توجروا۔

الجواب۔ فی الدر المختار اتخذ لولدہ اولتلمیذہ ثیابا ثم اراد دفعہا لغیرہ لیس لہ ذلک مالم یبین وقت الاتخاذ انہا عاریۃ فی رد المحتار قولہ لولدہ ای الصغیر واما الکبیر فلابد من التسلیم کما فی جامع الفتاوی ج ۴ ص ۸۴۲ و ۸۵۵ وفی الہدایۃ اذا وھب الاب لابنہ الصغیر ھبۃ ملکہا الابن بالعقد فی العنایۃ والقبض فیہا باعلام ما وھبہ لہ ولیس الاشہاد شرطا الا ان فیہ احتیاطا للتحرز عن جحود الورثۃ بعد موتہ اوجحودہ بعد ادراک الولد اھ۔

ان روایات سے امور ذیل مستفاد ہوئے۔ نمبر (۱) جو زیور وغیرہ اس دختر

کی نابالغی کے زمانہ میں بنا ہے، وہ اسی کی ملک ہو گیا، جن وارثوں کو یہ بات معلوم ہو، یا معلوم نہ ہونے کی صورت میں اس پر شرعی گواہ قائم ہوں۔ اُن کو اس ذیور وغیرہ میں دعویٰ حرام ہوگا، نمبر (۲) جو اس دختر کے بلوغ کے بعد تیار ہوا ہے وہ مورث کی ملک ہے، اور سب ورثہ کا اس میں حق میراث ہے، نمبر (۳) البتہ اگر دختر یا وکیل کا اس پر بھی قبضہ ہو گیا ہو تو وہ بھی اس کی ملک میں داخل ہو جائے گا، اور اگر مصنوع قبل البلوغ و مصنوع بعد البلوغ متمیز نہ ہوں باہم صلح کے ساتھ متمیز کرلیں۔

۳۰ محرم ۱۳۳۴ھ (تتمہ رابعہ ص ۱۱)

حکم آنچہ اطفال را مید ہند از عطیات

سوال (۵۱۲) نابالغ بچوں کو ان کے نانا یا دادا کچھ عطا کریں تو اس عطا کو بچوں کے ماں باپ ان بچوں پر کس طرح سے صرف کریں، اگر روٹی کپڑے میں صرف کیا جائے تو یہ ماں باپ کے ذمہ ہے، تا وقتیکہ بالغ ہوں، تو اس عطا کو امانۃً جمع کریں بلوغ "تک" یا شیرینی و بالائی میں خرچ کر دیویں، کیا صورت کریں،

الجواب :- فی الدر المختار ولطفلہ الفقیر الحر لان نفقۃ المملوک علی ملکہ والغنی فی مالہ الحاضر۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ جو بالغ مالک کسی مال کا ہو اول نفقہ اسی مال میں ہوگا۔ مال کے ہوتے ہوئے باپ پر واجب نہ ہوگا، پس صورت مذکورہ میں یہ عطیات اس نابالغ کے ضروری نفقات میں صرف کر دیئے جائیں،

۲۷ ربیع الاول ۱۳۲۵ھ (امداد ج ۲ ص ۸۰)

انعام کارندہ از جرمانہ

سوال (۵۱۳) اگر ایسی آمدنی سے کوئی رقم کارندہ کو بطور انعام گرفتاری ملزم یا صلہ کارگذاری ملے تو کارندہ کو لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب - نہیں وہ مالک اپنے پاس سے دے۔

۲۶ جمادی الثانی ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ۲ ص ۱۰۰)

حکم انعام گرفتن از دست افسران بلا اطلاع گورنمنٹ

سوال (۵۱۴) چھتر پور سے بجاور ایک مقام ہے۔ اس میں ایک تار نیا لگانا تھا۔ اس کے خرچہ کی منظوری گورنمنٹ سے آٹھ سو روپے کی تھی، اور وہ کام چار سو روپے میں ہو گیا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جو کہ ہمارے ہمراہ تھا اس نے کہا ہم تم کو بیس روپے انعام دیتے ہیں، اور پانچ روپے دوسرے آدمیوں کو دیتے ہیں اور شاید اس نے خود بھی کچھ لیا ہوگا تو یہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

یہ دیکھئے جلد دوم ص ۲۰۲ ۵ ۶۵۵

الجواب - یہ بتلایئے کہ اُس ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو سرکار سے ایسے اختیارات دیئے گئے ہیں یا نہیں؟ اور اس انعام کی اطلاع اگر گورنمنٹ کو ہو وہ جائز رکھے گی یا نہیں؟ جواب اس پر موقوف ہے۔ ۲۲ ربیع الاول ۱۳۳۲ھ (حوادث اول ص ۱۳۴)

سوال (۵۱۵) اس انعام کی اطلاع اگر گورنمنٹ کو کی جاوے تو امید غالب ہے کہ شاید نہ منظور کرے فقط۔

الجواب - بس تو جائز نہیں، ربیع الاول ۱۳۳۲ھ (حوادث اول ص ۱۳۵)

تفصیل ہدیہ مشرکین بالخصوص در دیوالی وغیرہ

سوال (۵۱۶) (نمبر۱) ہندو اپنے تہواروں میں اگر مسلمانوں کو ہدیۃً کچھ دیں (مثلاً دیوالی کہ اس میں اکثر ہندو مسلمانوں کے یہاں مٹھائی وغیرہ لایا کرتے ہیں) قبول کرنا جائز ہے یا نہیں (نمبر۲) اور اگر کوئی شخص قبول کر کے کسی دوسرے کو کھلانا چاہے تو اس شخص کو اس کا کھانا جائز ہے یا نہیں (نمبر۳) اگر کفار خاص اپنے تہوار کے لئے کوئی خاص مٹھائی بنائیں مثل کھلونے وغیرہ کے تو اس کا دوکان سے خریدنا جائز ہے یا نہیں (نمبر۴) مہاداۃ مطلقہ بین المسلم والکافر جائز ہے یا نہیں (نمبر۵) یہ جو مشہور ہے کہ خاص اس رات کو کھانا جائز نہیں آیا یہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب، فی العالمگیریۃ ولا باس بضیافۃ الذمی وان لم یکن بینھما الا معرفۃ کذا فی الملتقط وفی التفاریق لاباس بان یضیف کافرا لقرابۃ او لحاجۃ کذا فی التمرتاشی ولا بالذھاب الی ضیافۃ اھل الذمۃ ھکذا ذکر محمدؒ ثم فیھا ولا بأس بان یصل الرجل المسلم المشرک قریبا کان او بعیدا محاربا کان او ذمیا واراد بالمحارب المستأمن واما اذا کان غیر المستامن فلا ینبغی للمسلم ان یصلہ بشیئ کذا فی المحیط وذکر القاضی الامام رکن الاسلام علی السغدی اذا کان حربیا فی دار الحرب وکان الحال حال صلح ومسالمۃ فلا باس بان یصلہ کذا فی التاتارخانیۃ ھذا ھو الکلام فی صلۃ المسلم المشرک وجئنا الی صلۃ المشرک المسلم فقد روی محمدؒ فی السیر الکبیر اخبارا متعارضۃ فی بعضھا ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قبل ھدایا المشرکین وفی بعضھا انہ صلے اللہ علیہ وسلم لم یقبل فلابد من التوفیق واختلف عبارۃ المشائخ رح فی وجہ التوفیق فعبارۃ الفقیہ ابی جعفر الھندوانی انہ ما روی انہ لم یقبلھا محمول علی انہ انما لم

عہ بعد والا سوال اور جواب اس سے متعلق ہیں ۱۲ منہ

یقبلها من شخص غلب علی ظن رسول الله صلی الله علیه وسلم انه وقع عند ذلك الشخص ان رسول الله صلی الله علیه وسلم انما یقاتلهم طمعا فی المال لا لاعلاء کلمة الله ولا یجوز قبول الهدیة من مثل هذا الشخص فی زماننا وما روی انه قبلها محمول علی انه قبل من شخص غلب علی ظن رسول الله صلی الله علیه وسلم انه وقع عند ذلك الشخص ان رسول الله صلی الله علیه وسلم انما یقاتلهم لاعزاز الدین ولاعلاء کلمات الله العلیاء لا لطلب المال وقبول الهدیة من مثل هذا الشخص جاز فی زماننا ایضا ومن المشائخ من وفق من وجه اخر فقال لم یقبل من شخص علم انه لو قبل منه یقل صلابته وعزته فی حقه ویلین له بسبب قبول الهدیة وقبل من شخص علم انه لایقل صلابته وعزته فی حقه ولا یلین بسبب قبول الهدیة کذا فی المحیط ج ۶ ص ۲۳۲، ان روایات سے مہاداتِ مسئول عنہا کے احکام کی تفصیل معلوم ہوگئی کہ اگر کوئی ضرر دینی نہ ہو تو کفار مصالحین سے ہدایا کا لین دین جائز ہے اور اس سے اکثر سوالوں کا جواب حاصل ہوگیا، صرف دو جزو خاص قابل تعرض کے باقی رہ گئے، ایک یہ کہ ہدیہ دیوالی کا شاید اس تہوار کی تعظیم کے لئے ہو جس کو فقہاء نے سخت ممنوع لکھا ہے، دوسرا یہ کہ اس میں تصاویر بھی ہوتی ہیں، ان کا اقتناء واحترام مستلزم للتقوم واستعمال لازم آتا ہے اور بعض فروع میں تصاویر کے تقوم کی نفی کی گئی ہے، تو اس میں اس حکم شرعی کا بھی معارضہ ہے جواب اول کا یہ ہے کہ یہ عادت سے معلوم ہے کہ اس ہدیہ کا سبب مہدی لہ کی تعظیم ہے نہ کہ تہوار کی تعظیم، اور جواب ثانی کا یہ ہے کہ مقصود اہداء میں صورت نہیں بلکہ مادہ ہے، البتہ یہ واجب ہے کہ مہدی لہ فوراً تصاویر کو توڑ ڈالے، یکم محرم ۱۳۳۴ھ (تتمہ رابعہ ص ۸)

ہدیہ دادن در تعلیم یتیم از مال یتیم

سوال (۵۱۷) یتیم مالدار را حامیش پیش صاحب ہنر برائے آموختن ہنر سپرد، آن حامی می گوید کہ از مال یتیم گاہ گاہ آں ہنرمند را ہدیہ دادن تا کہ برغبت والفت ہنر بیاموزاند روا است یا نہ وبغیر اہداء راغب نخواہد شد ودریں چنیں معاملہ تعیین عقد اجارہ مروج نیست، واگر بالفرض اجارہ منعقد شود پس اجرت از مال یتیم در آموختن حرفت دادن جائز یا نہ؟

الجواب، فی الهدایة کتاب الماذون ولایهب بعوض ولا بغیر عوض وکذا لا یتصدق الا ان یهدی الیسیر من الطعام او یضیف من یطعمه لانه من ضرورات التجارة استجلابا

لقلوب المجاهزین بخلاف المحجور علیه لانه لا اذن له اصلا فکیف یثبت ما هو من ضرورا ته ازیں روایت ہویدا شد کہ اذن بالشئ اذن بلوازم اوست وولی یتیم ماذون ست باتفاق، در مصالح تعلیم یتیم وایں اہدا رسول عنہ عادۃً از لوازم اوست پس بآں ہم ماذون خواہد بود، ۵ ذی الحجہ ۱۳۲۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۰۸)

بلا عذر ہدیہ قبول نہ کرنے کا منکر ہونا

سوال (۵۱۸) ایک بات میں بندہ نے بہت خوض کیا، مگر کتابوں سے یا اس ملک کے اور صاحبوں سے حل نہ ہونے کی وجہ سے پریشان ہوں، اور بارگاہ عالی میں عرض کیا جاتا ہے کہ ایک آدمی کسی دوسرے آدمی کو کچھ تحفے یا روپے پیسے نہایت خوشی سے دینے لگے، جس کو دینے لگے وہ شخص نامنظور کرنے لگے، دینے والے نے کہا یہ تحفے نہیں لینے سے میں نہایت ناخوش ہوتا ہوں لینے والے نے کہا میں اس کو نہیں لینے سے بہت خوش ہوتا ہوں، اب ہردو ناخوش اور ناراض ہیں، اس صورت میں کیا کرنا چاہیے، بالتفصیل تحریر کریں گے، حالانکہ یہ تحفے کچھ عیب شرعاً نہیں ہے

الجواب، جب اس ہدیہ قبول کرنے سے کوئی امر مانع شرعی نہیں تو لینے والے کا یہ کہنا کہ میں اس کو نہیں لینے سے بہت خوش ہوتا ہوں سخت غلطی اور شعبہ کبر کا ہے، جو سنت کے بالکل خلاف ہے حدیث میں تہادوا تحابوا صریح حکم ہے، اگر بلا عذر[1] مہدی الیہ انکار کرے تو تہادوا پر عمل کس طرح ہوگا؟ فقط، ۲۹ ذی الحجہ ۱۳۲۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۲۰۳)

وہم واضح ماند کہ پدران رامی رسد کہ میان الخ

سوال (۵۱۹) وہم واضح ماند کہ پدران رامیرسد کہ میان اولاد ذکور خود در اعطار امتیاز سازند یا نہ. برصورت اول در دار آخرت عند اللہ قابل مواخذہ شوند یا نہ۔ وقواعد تصرف مال موقوفہ چیست و بچہ صورت صحیح گردد و بچہ صورت غیر صحیح از حوالہ کتب معتبرۂ فقہیۂ و احادیث نبویہ بالتفصیل جواب ہر سوال ارقام نمودہ تا تشنہ لباں را از سحاب جواب باصواب مترددی و آسودہ گردانند۔

الجواب۔ فی الدر المختار عن الخانیة لا بأس بتفضیل بعض الاولاد فی المحبة لانها عمل القلب وکذا فی العطایا ان لم یقصد به الاضرار وان قصده یسوی بینهم یعطی البنت کالابن عند الثانی وعلیه الفتوی ولو وهب فی صحته کل المال للولد جاز واثم فی رد المحتار وعلیه الفتوی ای علی قول ابی یوسف

---

[1] البتہ عذر کے وقت انکار جائز ہے ۱۲ منہ

من ان التنصیف بین الذکر والانثی افضل من التثلیث الذی ھو قول محمد رملی ج ۳ ص ۲۰۷ وفی الدر المختار کتاب الوصیۃ وندبت باقل منہ ولو عند غنی ورثتہ او استغنائھم بحصتھم کترکھا ای کما ندب ترکھا الخ فی رد المختار فی اٰخر الحاشیہ علی قولہ ولو عند غنی ورثتہ ما نصہ (تنبیہ) قال فی الحاوی القدسی من لا وارث لہ ولا دین علیہ فالاولی ان یوصی بجمیع مالہ بعد التصدق بیدہ ج ۵ ص ۶۶۴ ازیں روایات مستفاد شد کہ ایں تفاوت در عطایا یا حرمان بعضے یا تنقیص نصیب بعضے ہرگاہ کہ قصد اضرار ایشاں باشد یا موجب ضرر ایشاں باشد موجب گناہ است اگرچہ نافذ باشد و اگر محذور مذکور نباشد مضائقہ نیست وکذلک الوقف اگرچہ تصرفات مذکورہ اسئلہ بالاہمہ نافذ صحیح باشند کما ذکر فی الاجوبۃ لاکن اگر بحیلہ دعوی نیت قربت ورثہ را محروم کردن منظور ست وقف مقبول نباشد واللہ اعلم وانچہ سوال کردہ شدہ است کہ قواعد تصرف مال موقوف چیست و بچہ صورت صحیح گردد و بچہ صورت غیر صحیح پس انچہ سوال کردنی باشد جزئیا سوال کردہ شود۔ ۷ محرم ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۰۹)

ہبہ بالعوض میں بھی شرائط الخ (تتمہ جلد ۳ ص ۱۹۶) حتی کہ ہبہ بالعوض میں بھی وہ شرائط ضروری ہیں ۱۲ ایں علی الاطلاق مسلم نیست نعم اذا کان بکلمۃ علی ھذا اذا قال وھبتک علی ان تعوضنی کذا اما لو قال وھبتک کذا فھو بیع ابتداءً وانتہاءً ۱۲ الدر المختار۔

کتاب الشرکۃ

عدم براءۃ مستقرض باداء بعض ورثہ مشترکین

سوال (۵۲۰) ہندوستان کے عام رواج کے موافق زید اور اس کے تمام ورثہ ایک ہی گھر میں رہتے سہتے کھاتے پیتے ہیں، عمرو نے زید سے کوئی چیز خریدی اور ابھی قیمت نہیں دی تھی کہ زید کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے بعد عمرو نے قیمت ورثہ زید میں سے ایک وارث کو دیدی، ہر ہر وارث کو ان کے حصوں کے موافق نہیں دی، تو کیا عمرو اپنے بار سے سبکدوش نہیں ہوا۔ اور کیا دوبارہ ہر وارث کو ان کے حصوں کے موافق دینا چاہیے، زید کے ورثا اب تک بدستور سابق ایک ہی گھر میں رہتے سہتے کھاتے پیتے ہیں اور ان کے

اموال باہم مشترک ہیں، اور زید کے بعد اسی اشتراک اور ایک گھر میں ہونے کے سبب زید کا کچھ ترکہ تقسیم نہیں ہوا اور نہ آئندہ ہونے کی امید ہے۔

الجواب، یہ شرکت املاک ہے، شرکت عقد نہیں، جس میں ہر شریک دوسرے شریک کا وکیل ہوتا ہے، پس جب شرکت املاک میں وکالت نہیں تو ایک وارث کو دینے سے دوسرے ورثہ کا مطالبہ اپنے اپنے حصہ کا باقی رہے گا، البتہ اگر سب مل کر اس وارث کو اذن دیدیں یا میت اس وارث کو اپنا وصی بنا گیا تھا، تب البتہ اس کا قبض سب کا قبض ہے، البتہ اگر دوسرے ورثہ عمرو سے مطالبہ کریں تو عمرو اس وارث سے باشتنا اس کے حصے کے بقیہ رقم واپس لے سکتا ہے،

۲۷ محرم ۱۳۳۲ھ (امداد جلد ۳ ص ۱۰۳)

اختراط النقدیۃ مال شرکت وغیر معین بلود ن ربح

سوال (۵۱۲) مجھے کچھ روپیہ قرض لینے کی ضرورت پڑگئی ہے، ایک صاحب روپیہ دینے پر تیار ہیں، مگر کہتے ہیں کہ تجارت میں مجھکو بھی شریک کر لو بہت سے امور ایسے ہیں جن کی وجہ سے میں کسی کی شرکت پسند نہیں کرتا، لیکن اس وقت ایسی مجبوری ہوگئی کہ لامحالہ مجھے اس کو منظور کرنا پڑا، مگر خواہش یہ ہے کہ شرکت ایسے طریقے سے کی جائے کہ روپیہ جلدی ادا ہو کر علیحدگی ہو جائے، لہذا اس کے واسطے میں نے یہ صورت تجویز کی ہے کہ جس قدر روپیہ کی مجھ کو ضرورت ہو وہ میں لے لوں، اور جن کتابوں کی خواہش ہو ان کو خرید کر لوں، اور اپنی کل تجارت میں ان صاحب کو شریک کر لوں، تاکہ روپیہ جلدی ادا ہو جائے اور میں سبکدوش ہو جاؤں ورنہ اگر چند کتابوں میں شریک کروں گا تو روپیہ بہت دنوں میں ادا ہوگا۔ اور فی روپیہ ۲ر نفع طے پایا ہے، مثلاً میں نے ۱۶ روپیہ لے کر کتابیں منگوالیں، اب ۲ر کے حساب سے ۱۶ میں ۲ نفع کے ہوئے۔ اصل و نفع ملاکر ۱۸ ہوئے اب اگر ۱۶ کی کتابیں علیحدہ دو چار رکھی جاویں تو مدت میں نکلیں گی، اس لئے روپیہ لے کر میں کتابیں اپنی ضرورت کی منگواؤں گا، باقی اس خیال سے کہ روپیہ جلدی ادا ہو جائے، اپنی کل کتابوں میں ان کی شرکت کئے لیتا ہوں اور اس امر کی اطلاع ان کو کر دی گئی ہے، وہ اس پر راضی ہیں، اگر یہ صورت شرعاً جائز ہو تو اجازت مرحمت فرمائی جاوے۔ اور اگر ناجائز ہو تو کوئی ایسی آسان صورت سے اطلاع فرمائی جاوے کہ میری ضرورت بھی نکل آوے اور روپیہ آسانی کے ساتھ جلدی ادا ہو جاوے، کل تجارت سے میرا یہ مقصود ہے کہ جو کتابیں میرے پاس پہلے سے موجود ہیں اور جو کتابیں اس روپیہ کے ساتھ خریدوں گا دونوں کو ایک ہی میں

ملا کر شرکت کرلوں، قدیم و جدید دونوں ذخیرے ایک کردیئے جائیں،

جواب۔ فی الدر المختار کتاب الشرکۃ وشرطھا ای شرط العقد کون المعقود علیہ قابلاً للوکالۃ وعدم ما یقطعھا کشرط دراھم مسمّاۃ من الربح لاحدھما لانہ قد لایربح غیر المسمّٰی وفیہ واما عنان الیٰ قولہ ومع التفاضل فی المال دون الربح وعکسہ وببعض المال دون بعض وفیہ ولایصح مفاوضۃ وعنان بغیر النقدین والفلوس النافقۃ والتبر والنقرۃ

آہ ان روایات مذکورہ سے معلوم ہوا کہ یہ صورت شرکت عنان کی ہے، اور شرکت عنان میں دو شرطیں ہیں وہ یہاں نہیں ہیں، کیونکہ ایک کا مال نقد ہے، دوسرے کی کتابیں، اور نقد والے کا نفع معیّن ہے لہذا یہ شرکت ناجائز ہے۔ اور یہ نفع معین سود ہے جو ایک حیلہ سے قرض لینا مقصود ہے۔ ۱۲ رجب ۱۳۲۲ھ (امداد، جلد ۳، ص ۱۰۴)

۵۲۲/ القصص السنی فی حکم حصص کمپنی

بعد الحمد والصلوٰۃ میرے پاس ایک مقام سے کمپنی ہائے متعارفہ تجارت کے حصوں کے متعلق جن کو عرف میں شیر کہتے ہیں سوال آیا، چونکہ سوال میں ان کی مفصل حقیقت نہ لکھی تھی اس لئے میں نے ضروری تنقیح کے ساتھ واپس کردیا۔ پھر خیال آیا کہ ایسی کمپنیوں کی مختلف صورتوں کے متعلق ایسے سوال اکثر آتے رہتے ہیں ان کے ضروری جوابوں کو بشکل ایک رسالہ کے ایک جگہ جمع کردینا اہل معاملہ کے لئے تحقیق حکم میں مفید ہوگا، اس لئے اس رسالہ کی ایک ایک فصل میں کثیر الوقوع صورتوں میں سے ایک ایک صورت کا حکم لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے اور اپنے پرانے فتاویٰ میں سرسری مطالعہ سے اگر کوئی جز و اس مجموعہ کے مناسب نظر پڑ گیا اس کو بھی بشکل فصول اس کا ضمیمہ بنا دیا جاوے گا۔

فصل اوّل **سوال** (۵۱۲) جس امر کے متعلق میں نے (سابق میں) استفسار کیا تھا (اور آپ نے اس میں تنقیحات کی تھیں) اس کی صورت یہ ہے کہ جس قدر بینک ہیں سب کی صورت تقریباً ایک ہی ہے۔ جو حسب ذیل ہے۔

ایک شخص کچھ کاروبار کرنا چاہتا ہے، اور ایک دکان کی شکل قائم کرتا ہے لیکن اس دکان میں سب نقد ہوتا ہے یعنی نقد ہی سے نقد کمانا چاہتا ہے۔ اور اس کا اعلان کرتا ہے اس کے کچھ ممبر مخلوق کے اطمینان کے لئے بنالیتا ہے، لوگوں کو اس امر کی طرف ترغیب دلاتا ہے

ف بمعنی الجزء ۱۲ منہ والتبر بمعنی الربیع ۱۲ ص

کہ ہمارے یہاں روپیہ جمع کرو، اور جس کو حاجت ہو، ہم سے قرض (بھی) لو، جس کو قرض دیا جاتا ہے اس سے سود لیا جاتا ہے، اور جو شخص رقم جمع کرتا ہے اس کو بھی سود دیتا ہے رقم مجتمعہ پر کم سود دیتا ہے اور جو رقم بطور قرض دیتا ہے اس پر زیادہ سود لیتا ہے اس میں کوئی قید نہیں، قرض لینے والا اور رقم جمع کرنے والا خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، یہ بینک عموماً غیر مذہب کی کمپنیوں کے ہوتے ہیں، ایسے بینک میں رقم جمع کرنا اور اس کا سود لینا جائز ہے یا نہیں، اگر سود نہ لیا جائے تو وہ کمپنی والے جو یقیناً عیسائی یا یہودی یا ہندو ہیں اس سود کے مالک بن جاتے ہیں، اور بعض بینک والے اس رقم کو اپنے مذاہب مذکورہ کی اشاعت میں دیدیتے ہیں۔ اگر رقم جمع نہ کی جائے، اور اپنے گھر میں محفوظ رکھیں تو سرقہ وغیرہ کا ظن غالب ہے، ایسی صورت میں رقم بینک میں جمع کرنا جائز ہے یا کیا، اور اس سود کو لیا جائے یا نہیں، سود لیکر کیا کیا جائے، آیا اپنے ذاتی مصارف میں لاسکتا ہے یا نہیں، یا فقراء مساکین کو تقسیم کیا جائے، ایسی تقسیم پر کوئی ثواب ملے گا یا نہیں؟

الجواب۔ واقعات اور احکام میں غور کرنے سے حقیقت اس معاملہ میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو لوگ ایسے بینک میں روپیہ جمع کرتے ہیں وہ اس دوکاندار کے شریک یعنی بینک کے حصہ دار نہیں بلکہ اس دوکاندار کو وہ قرض دیتے ہیں اور وہ انکو اس قرض پر سود دیتا ہے تو یہ رقوم کے جمع کرنے کی حقیقت ہے، باقی جو لوگ اس بینک سے روپیہ لیکر اس کو سود دیتے ہیں۔ اس کا قرض ہونا تو بالکل ظاہر ہے، پس اگر یہ دوکاندار مسلمان ہے خواہ ایک ہو یا جماعت ہو گو ایسا عادۃً غیر واقع یا کم واقع ہو تب تو رقم جمع کرنے کا حکم ظاہر ہے، کہ مالکانِ رقوم مسلمان سے سود لیتے ہیں، اور اگر یہ دوکاندار حربی ہے (اور اسلامی ریاستوں کے باشندے غیر مسلم حربی نہیں ہیں) تو یہ سود لینا حربی سے ہے، جس کا مختلف فیہ ہونا مشہور ہے۔ یہ تو ایک جزو پر کلام ہوا باقی دوسرا جزو سو حقیقت تو اس کی اوپر مذکور ہو چکی، کہ مستقرضین بینک سے روپیہ لیکر سود دیتے ہیں۔ اور حکم میں یہ تفصیل ہے کہ اگر مقرض اور مستقرض دونوں مسلمان ہیں تو حکم ظاہر ہے، کہ ایک مسلمان اخذ ربوا کا مرتکب ہوا دوسرا اعطاء ربوا کا اور اگر دونوں حربی ہیں تو مستفتی کو اس کا حکم پوچھنا ہی مقصود نہیں، اور اگر مقرض مسلمان ہے اور

مستقرض حربی تو اس میں وہی ربوانی دارالحرب کا مسئلہ جاری ہوگا جو اوپر مذکور ہوا اور اگر مقرض حربی ہے اور مستقرض مسلمان تو حسب تصریح فقہا، گو اخذ ربوا من الحربی میں تو گنجائش ہے، ولو مع الاختلاف، مگر اعطاء ربوا للحربی میں گنجائش نہیں، اور جن صورتوں میں مع الاختلاف اخذ میں گنجایش ہے، ترک سے اخذ بہتر ہے، اور گو مجوزین نے اس کے مصارف میں کوئی قید نہیں لگائی، لیکن احوط یہ ہے کہ فقراء و مساکین پر صرف کردے اور نیت میں بھی احوط یہ ہے کہ ثواب کا قصد نہ کرے، صرف اخراج عن الملک کا قصد کرے پھر مالک ثواب کو اختیار ہے خواہ ثواب بھی دیدے، کیونکہ ہر ثواب قصد پر موقوف نہیں، باقی سرقہ کے غالب ظن کا دعوے محض وہم ہے، ہزاروں سرمایہ دار بینک میں جمع کرنا پسند نہیں کرتے اپنے ہی گھر رکھتے ہیں، اور کیا ایسے بینک میں دیوالہ نکلنے کا احتمال نہیں، اور کیا جائز تجارت کی کمپنیاں نہیں؟ فقط

فصل ثانی، اس میں سہارنپور کی ایک بجلی کی کمپنی کے واقعات ہیں، جو میرے استدعاء پر ایک دوست نے لکھ کر بھیجے جس میں میرے بعض سوالات کے جواب بھی ہیں، وہ تحریر ذیل میں درج ہے۔

سیدی و مولائی دام مجدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ، والا نامہ صادر ہوا، قبل اس کے کہ سوالات کا جواب عرض کروں، کمپنی کی ہیئت ترکیبی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، جس سے جوابات پر زیادہ وضاحت ہونے کی امید ہے، قانون کمپنی کے موافق دس یا دس سے زیادہ اشخاص کچھ روپیہ اپنے پاس سے فراہم کرکے کمپنی کا کوئی نام تجویز کرتے ہیں، اور کمپنی کے مقاصد و اغراض تحریر کرکے اس نام سے اور ان اغراض کے لئے رجسٹری کراتے ہیں، رجسٹری کراتے وقت ان کو اختیار ہے کہ جس قدر سرمایہ کے لئے چاہیں رجسٹری کرالیں، اور جو جو سامان ان کو بنانا ہے، فروخت کرنا ہے، وہ تحریر میں پیش کردیں فرض کیجئے کہ ایک لاکھ روپیہ کے سرمایہ کے لئے اور بجلی اور دیگر اشیاء کے لئے رجسٹری کرائی، اس وقت تھوڑا سا روپیہ کافی ہے، جس پر کام کرنے کا سرٹیفکٹ مل جاتا ہے، مثلاً ایک لاکھ تک کے سرمایہ سے کام کرنے والوں کو دس ہزار روپیہ فراہم کرلینے پر کام کرنے کا سرٹیفکٹ مل جائیگا اور وہ لوگ جنھوں نے روپیہ فراہم کرکے رجسٹری کرائی کمپنی کو ترقی دینے والے کہلاتے ہیں اب یہ لوگ ایک لاکھ روپے کے ایک ہزار حصص فی حصہ سو روپیہ قائم کرتے ہیں، اور حصص

فروخت کرنا شروع کرتے ہیں ان کو اختیار ہے کہ پورے ایک ہزار حصص فروخت کردیں، یا صرف پانچسو حصص فروخت کرکے اپنا کام شروع کریں۔ اور بقیہ حصص فروخت کرنا بند کردیں اور ایک کام کے ساتھ اگر پھر ان کو دوسرا کام جاری کرنا ہو جس کی اجازت شروع میں حاصل کرلی گئی تھی تو بقیہ حصص میں سے جس قدر حصص چاہیں فروخت کرکے دوسرا کام جاری کریں اس تحریر سے حضرت اقدس کے پہلے سوال کا جواب آگیا، یہ ضروری نہیں ہے کہ اول کل حصص فروخت کرکے تب کام شروع کریں، اگر کام میں صرف پچاس ہزار روپے صرف آویں اور حصص اس سے زیادہ فروخت ہو جاویں تو زائد روپیہ بیکار پڑا رہیگا۔ اس کو بنک میں جمع کرکے بہت کم سود ملے گا اور منافع ان کو بھی تقسیم ہوگا تو حصہ داران کو منافع کم ملے گا۔

دوسرا سوال (۲۲ ۵) بجلی کی طاقت کے متعلق میں یہ نہیں عرض کرسکتا کہ وہ کوئی مادہ ہے، برقی قوت کی تعداد کس قدر ہے، اس کے لئے حساب ضرور ہے جیسے یہ کہا جاوے کہ انجن میں دس گھوڑوں کی طاقت ہے، ایک معیار مقررہ سے اس کی قوت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

تیسرا سوال ۔ جو لوگ بجلی کی طاقت کمپنی سے لیتے ہیں وہ جملہ سامان اپنے صرف سے اپنے گھر میں لگاتے ہیں اور قمقمہ وغیرہ جہاں ان کو ضرورت ہو لگا لیتے ہیں، کمپنی سے بجلی کی طاقت لیتے ہیں، اور اس بات کے لئے کہ ایک ماہ میں کس قدر بجلی کی طاقت ایک گھر میں صرف آئی ایک آلہ ہے جس کو کمپنی قیمت سے دیتی ہے، اور یا بازار سے خریدا جاوے، اور اس کی جانچ بجلی کمپنی کا انجنیر کرے گا، کہ صحیح ہے یا نہیں، اس سے یہ معلوم ہو جاوے گا کہ کل طاقت کس قدر صرف میں آئی، اور اسی حساب سے قیمت مقررہ یعنی ۸ر فی یونٹ جو ایک معیار خاص قوت کے لئے مقرر ہے وصول کرلی جاوے گی،

زکوٰۃ کے متعلق التماس ذیل ہے، جو منافع حصہ دار کو ملا اس کا تعین تو ظاہر ہے جو رقم زائد بطور پس انداز کمپنی کے پاس رہتی ہے وہ ہر حصہ دار معلوم کرسکتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ کل حصص کس قدر فروخت ہوئے، جس سے پس انداز روپے میں اپنا حصہ قائم کرسکتا ہے۔

اب سوال متعلق سود ہے کوئی کمپنی اس وقت ایسی نہیں کہ جس کو سود لینا دینا نہ پڑے اگر کسی جگہ سے کسی وقت کمپنی قرضہ لے گی سود دینا پڑے گا، اور بعض وقت اپنے روپے پر جو

کسی کی طرف واجب ہو تو سود لیتی ہے اس سے کسی کمپنی کو مفر نہیں،

تحریر ایک مولوی صاحب کی بتائید بعض اجزاء سوال، کمپنی کے حصوں کے متعلق

میں نے ایک بہت معتبر اور واقف کار صاحب سے جو معلومات حاصل کئے تو انھوں نے کہا کہ صرف یہی نہیں کہ کوئی چھوٹی بڑی کمپنی ایسی نہیں جو سودی کاروبار نہ کرتی ہو، بلکہ بلا اس کے چل ہی نہیں سکتی، مثلاً قانون کی رو سے اپنا کچھ فی صدی سرمایہ آفات ارضی وسماوی کے لئے بنک میں سود پر محفوظ رکھنا پڑتا ہے، اسی طرح ہر کمپنی کا جتنا سرمایہ ہوتا ہے اس سے بہت زیادہ اس کے کاروبار میں لگا کے رکھنا پڑتا ہے جس کا معاملہ بنک سے ہوتا ہے اور وہ سود لیتا ہے اس کے علاوہ کوئی حصہ دار اپنے حصہ کا روپیہ واپس نہیں لے سکتا، البتہ بازار میں اپنے حصہ کو کم یا زیادہ پر جیسا نرخ ہو فروخت کرسکتا ہے، اس میں تو غالباً کوئی شرعی قباحت نہیں۔

الجواب تحقیق حکم حقیقت اس معاملہ کی شرکت ہے یعنی متعدد حصہ دار اپنا سرمایہ جمع کرکے تجارت کرتے ہیں، اور جو اس سے نفع ہوتا ہے وہ باہم تقسیم کرلیتے ہیں، اور تحریر بالا میں جو یہ عبارت ہے کہ یہ لوگ ایک لاکھ روپے کے ایک ہزار حصے، فی حصہ سو روپے قائم کرتے ہیں، اور حصص فروخت کرنا شروع کرتے ہیں الخ اس کو اصطلاحاً فروخت کرنا کہا جاتا ہے، ورنہ در حقیقت شرکت ہے، اور کارکنان کمپنی تمام کاروبار میں ان حصہ داروں کے وکیل ہیں اور اس شرکت کے دو جز ہیں، ایک جز یہ کہ جو اعیان وسامان اس کارخانہ میں موجود ہوتے رہتے ہیں، ہر شریک بواسطہ کارکنان کمپنی کے حصہ رسد اس سامان کا مالک ہوجاتا ہے، یعنی مثلاً اگر کسی نے سو روپے داخل کئے تو گویا سامان موجودہ کا ہزارواں حصہ خرید لیا، دوسرا جز و یہ کہ آگے جو کاروبار میں نفع ہوگا وہ حصہ رسد ہر شریک کی ملک ہوگا، اور اگر اس حصہ کے داخل کرنے کے بعد کچھ سامان خریدا گیا اسی نسبت سے یہ حصہ دار مذکور اس کا بھی مالک ہوتا رہیگا حتیٰ کہ سب شرکاء تمام سامان کے برابر کے مالک ہوتے رہیں گے، اور جو اوپر کہا گیا ہے کہ ہر شریک بواسطہ کارکنان کمپنی کے حصہ رسد اس سامان کے مالک ہوتا جاتا ہے الخ اس میں یہ تفصیل ہے کہ جو چیز حصہ داخل کرنے کے بعد خریدی جاوے گی، اس میں تو وہ کارکنان حصہ دار کے وکیل ہوں گے، اور جو سامان قبل سے موجود ہے اس میں وہ کارکنان خود بائع اور حصہ دار مشتری ہوگا، اور یہ بیع تعاطی ہوگی جس میں بائع ثمن پر بلا واسطہ قابض ہوگیا، اور مشتری مبیع پر بواسطہ بائع کے کہ وہ اس کا وکیل بھی ہے قابض ہوگیا۔

اس[ف] واقعہ میں صرف ایک جزو سمجھ میں نہیں آیا، جو اس عبارت میں مذکور ہے، اور ڈائرکٹران جس قدر روپیہ کی ضرورت سمجھیں اسی حد تک حصے فروخت کرکے سرمایہ فراہم کرتے ہیں اھ غالبا مراد یہ ہے کہ اس کمپنی کے جاری کرنے کے لئے جتنے روپے کی ضرورت سمجھتے ہیں مثلاً ایک لاکھ روپیہ اس کا اعلان کرتے ہیں، اور جو شخص اس کمپنی میں شریک ہونا چاہیں وہ اس کمپنی میں روپیہ داخل کرتے ہیں، اس روپیہ کو داخل کرنے کو خریداری حصہ سے اور کارکنان کمپنی کے اس داخلہ کے منظور کرلینے کو فروخت حصہ سے تعبیر کیا ہے، پس حاصل یہ کہ عام لوگ اس کمپنی میں شرکت کرتے ہیں، حتیٰ کہ وہ ایک لاکھ روپیہ مثلاً جمع ہوجاتا ہے، پھر اس کے بعد کاروبار جاری ہوجاتا ہے جس کی تفصیل بعد کی عبارت میں آخر تک ہے۔

اب اس کا حکم لکھا جاتا ہے کہ حقیقتِ شرعیہ اس معاملہ[ص] کی شرکت ہے، یعنی روپیہ داخل کرنے والے اس تجارت کے شرکاء ہیں اور کارکنان کمپنی تمام کاروبار میں اُن کے وکیل ہیں، اور چونکہ یہ تجارت یعنی بجلی تیار کرکے اہل حاجت کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے، اس لئے اس کا نفع وغیرہ بھی حلال ہے، رہا وہ امر خلاف شرع جو اخیر میں لکھا ہے اس عبارت میں کہ بعض اوقات قرضہ لی تولہ وصول کرتی ہے، سو جس حصہ دار کو حصہ داخل کرتے وقت اس کی اطلاع نہ ہو اس نے تو کارکنانِ کمپنی کو ان دو امر کا وکیل ہی نہیں بنایا، اس لئے کارکنوں کا یہ فعل اس کی طرف منسوب نہ ہوگا۔ اور جن کو اطلاع ہو وہ تصریحاً اس سے ممانعت کردیں، گو اس ممانعت پر عمل نہ ہوگا، مگر اس ممانعت سے اس فعل کی طرف نسبت تو نہ ہوگی، یہ کلام تو منسوب ہوتے نہ ہونے میں ہے، لیکن یہ سوال اب بھی باقی ہے کہ کمپنی جو سود وصول کرے گی حصہ داروں پر وہ بھی تو تقسیم ہوگا تو سود سے یہ حصہ دار منتفع ہوئے سو اس میں کئی حالتیں ہیں، ایک تو یہ کہ اس کا وقوع لازم تو ہے نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ کمپنی کا کسی کے ذمہ قرضہ ہی نہ ہو، اس لئے سود لینے کی نوبت ہی نہ آئے، اور اصل صورت تجارت کمپنی کی حلال تھی، تو شک سے حرمت کا حکم نہ کریں گے، اور تفتیش ایسے امور میں واجب نہیں، نہ تفتیش سے ہر شخص کو اس جزو کا وقوع یا عدم وقوع معلوم ہوسکتا ہے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ کمپنی نے یہ سود غیر مسلم سے لیا ہے، تو اس میں ربوا من الحربی کا مسئلہ

ف سوال ہذا سے قبل جو سوال آیا اس میں یہ عبارت تھی اور سوال ہذا میں بھی یہی مضمون اس عبارت میں مذکور ہے حصص فروخت کرنا شروع کرتے ہیں ۱۲

ص بعضے جملے بظاہر مکرر آگئے ہیں، مگر سیاق کی وجہ سے جو کہ مقصود بھی وہ لائے گئے ہیں ۱۲

جاری ہوگا جس کا مختلف فیہ ہونا معلوم ہے۔ اس لئے مبتلا کو اس میں تنگی نہ ہوگی، اور جو سود کمپنی نے دیا ہے اس میں شرکا کا سود سے انتفاع محتمل ہی نہیں، یہ تو تحریر پیش کردہ کا جواب ہوگیا اب بعض چیزیں اس کے متعلق قابل تحقیق رہ گئیں ان کو بھی عرض کرتا ہوں، ایک یہ کہ بعضے شریک حصہ دار اپنا حصہ دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ اس میں بدلین کا یداً بید تقابض نہیں ہوتا، صرف حساب میں بائع کا نام خارج ہو جاتا ہے، دوسرے بعض اوقات بلکہ اکثر اوقات بدلین کی مقدار برابر ہی نہیں ہوتی، مثلاً کسی کا حصہ سو روپے کا ہے وہ ایک سو دس میں فروخت کرتا ہے، سو یہاں تماثل و تساوی بھی نہیں، سو دوسرے محذور کا تو جواب ظاہر ہے، اس لئے کہ بائع دو چیزوں کا مالک ہے، ایک تو کھمبوں اور تاروں کا اور عمارت وغیرہ سامان کا، دوسرے کچھ روپے کا جو وہاں داخل ہے سو وہ ایک سو دس روپیہ کے عوض میں نہیں ہے، بلکہ کچھ سامان کے عوض میں ہے کچھ روپے کے عوض میں، اور جو روپے کے عوض میں ہے وہ غالباً و عادۃً اس کی مقدار ایک سو دس کی نہیں، اگر ایک روپیہ بھی کم ہو تو دوسرا محذور لازم نہیں، مثلاً وہاں اگر اس بائع کا ایک سو نو روپیہ ہو تو مشتری کے ایک سو دس روپے میں سے ایک سو نو تو اس ایک سو نو روپے کے مقابلہ میں ہو گیا اور ایک روپیہ دوسرے سامان کے عوض میں ہو گیا، رہا قصہ تقابض کا سو اس کا ایک حیلہ ہو سکتا ہے، وہ یہ کہ مشتری بائع سے یوں کہے کہ تمہارا جتنا روپیہ کمپنی میں ہے میں اپنے اس زرِ ثمن میں سے تم کو اس قدر دیتا ہوں، اور تم اس قرض کا حوالہ اسی کمپنی پر کر دو، کہ اس سے وصول کروں یا کسی کام میں لگوا دوں اور جو زرِ ثمن میں اس روپے سے کچھ زیادت ہے، اس کے عوض تمہارے حصہ کا سامان از قبیل عروض خریدتا ہوں، اسی حیلہ سے وہ محذور بھی دفع ہو گیا، البتہ اس پر ایک سوال ہوگا کہ اس روپیہ کی مقدار تو معلوم نہیں جس کے عوض یہ قرض دیتا ہے تو مجہول کا قرض کیسا، اس کا حل منقول تو دیکھا نہیں لیکن قواعد و نظائر میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جہالت مضر نہیں بلکہ صرف وہ جو مفضی الی النزاع ہو اور یہاں یہ احتمال نہیں، لہذا گنجائش ہو سکتی ہے۔ دوسرا امر قابل تحقیق یہ ہے کہ حصہ داروں کے ذمہ ان رقوم کی زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ سو زکوٰۃ کا وجوب تو ظاہر ہے لیکن اس تفصیل سے جو کہ سامان از قبیل نقد نہیں جیسے کھمبے وغیرہ ان پر زکوٰۃ نہیں، صرف نقد روپیہ پر زکوٰۃ ہے، جس کے دو حصے ہیں، ایک حصہ وہ جو اس شخص کو نفع میں ملا دوسرا وہ جو کمپنی میں بچا لیا گیا، اس کی مقدار معاینہ

کمپنی سے بہت آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے، تیسرا امر یہ کہ بجلی کیا مال متقوم ہے جس کی بیع وشراء کی جاتی ہے، اس کے دو جواب ہیں، ایک وہ جو تکریر فصل ثانی نمبر۳ میں آتا ہے، وہاں ملاحظہ کیا جاوے۔ دوسرا یہ کہ اس کو بیع وشراء مجازاً کہا جاتا ہے، اور حقیقت اس کی کرایہ ہے، یعنی روشنی کا انتظام واہتمام کر دو، اس کی اجرت ملے گی، اور ظاہر ہے کہ اس اہتمام میں مشقت بھی ضروری ہے، قمقمہ لگانا، تار کا ملانا خاص پابندی سے روشنی کا پہنچانا وغیرہ وغیرہ رہا یہ شبہ کہ اجارہ تو محض منافع پر ہوتا ہے، اور یہاں ایک مادہ بھی صرف کیا جاتا ہے، جو عین ہے، اگرچہ لطیف ہی، سو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک کرایہ ہر چند کہ منافع پر ہوتا ہے، مگر تعامل کی وجہ سے بعض صورتوں میں منافع کی ساتھ عین بھی معقود علیہ کا جزو ہوتا ہے، جیسے رنگریز کا رنگ اس تاویل سے اس کی اجازت ہو سکتی ہے۔ فقط،

تکریر الفصل الثانی بعبارۃ اخریٰ استکتبتہٗ من بعض اعزتی[عہ] اوردفیہ من الروایات الکثیرۃ التی لم تکن فی جوابی۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین صورت ذیل میں کہ

(۱) قانون کمپنی کے موافق دس یا دس سے زیادہ اشخاص کچھ روپیہ اپنے پاس سے فراہم کر کے کمپنی کا کوئی نام تجویز کرتے ہیں، اور کمپنی کے مقاصد واغراض تحریر کر کے اس نام کو اُن اغراض کے لئے کمپنی کو رجسٹری کراتے ہیں، رجسٹری کے وقت اُن کو اختیار ہی کہ جس قدر سرمایہ کے لئے چاہیں رجسٹری کرالیں، اور جو سامان بھی اُن کو بنانا ہے فروخت کرنا ہے وہ تحریر میں پیش کر دیں، اگر ایک لاکھ روپیہ سرمایہ کے لئے اور بجلی فروخت کرنے اور دیگر اشیاء کے لئے رجسٹری کرائی گئی، تو یہ ضرور نہیں کہ اسی وقت ایک لاکھ روپے موجود ہو بلکہ اس وقت تھوڑا سا روپیہ فراہم ہونا بھی کافی ہے، جس پر کام کرنے کا سرٹیفکٹ مل جاتا ہے، مثلاً ایک لاکھ روپے تک سے کام کرنے والوں کو دس ہزار روپیہ فراہم کر لینے پر کام کرنے کا سرٹیفکٹ مل جاوے گا، اور یہ لوگ جنھوں نے اول روپیہ فراہم کر کے کمپنی کو رجسٹری کرایا ہے، کمپنی کو ترقی دینے والے کہلاتے ہیں" اب یہ لوگ ایک لاکھ روپیہ کے ایک ہزار حصص فی حصہ سو روپیہ (مثلاً) قائم کرتے ہیں، اور حصص فروخت کرنا شروع کرتے ہیں یہ ہے آج کل کمپنیوں کی ہیئت ترکیبی" اس کے متعلق سوال یہ ہے کہ جو لوگ کمپنی کے شیئرز (حصص) خریدتے ہیں، شرعاً ان کی اس خریداری کی حقیقت کیا ہے؟

نیز یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ کمپنی قائم ہو جانے کے بعد جو لوگ اس کے حصص خریدتے ہیں

عہ مولانا ظفر احمد تھانوی

وہ اعیان ونقود دونوں میں شریک ہوتے ہیں، یعنی کمپنی میں اس وقت جو سامان از قسم مال تجارت اور اس کے لئے جس قدر عمارت ہے ہر خریدار اس میں بھی شریک ہے، اور جو نقد سرمایہ کمپنی کے پاس ہے اس میں بھی شریک ہے، غرض یہ شرکت اعیان میں بھی ہے اور نقود میں بھی یہ صورت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

۲- جب کمپنی کے مقررہ حصص فروخت ہو جاتے ہیں تو آئندہ کے لئے حصص کی فروخت بند کر دی جاتی ہے، اس وقت اگر کوئی کمپنی میں داخل ہونا چاہے تو وہ پہلے خریداروں میں سے کسی کا حصہ خرید لیتا ہے، یہ بیع وشرا صحیح ہے یا نہیں؟ کیونکہ اس وقت سارا معاملہ زبانی اور خط وکتابت سے طے ہوتا ہے، باہم تقابض طرفین سے نہیں ہوتا۔ اور چونکہ یہ شرکت نقد میں بھی ہے اور اعیان میں بھی، تو نقد میں کمی بیشی کا بھی احتمال ہے۔

۳- ایک کمپنی گورنمنٹ سے بجلی خرید کر دوسروں کے ہاتھ فروخت کرتی ہے، یہ شرا وبیع درست ہے یا نہیں، اور اس کمپنی میں شرکت جائز ہے یا نہیں؟ کمپنی جس کے ہاتھ بجلی فروخت کرتی ہے، اس کے گھر میں ایک آلہ لگاتی ہے جس سے معلوم ہوتا رہتا ہے کہ اس شخص نے کتنی بجلی خرچ کی۔

۴- عموماً سب کمپنیاں سود لیتی بھی ہیں اور دیتی بھی ہیں، اس صورت میں ہر شریک کے حصہ میں سودی روپیہ بھی آتا ہے تو شریک کو کمپنی سے اپنے حصے کا منافع لینا جس میں سودی رقم بھی شاید مخلوط ہو جائز ہے یا نہیں؟

۵- کمپنی ہر حصہ دار کو پورا منافع نہیں دیتی، بلکہ ہر حصہ دار کی رقم منافع میں سے کچھ رقم پس انداز کرتی ہے، پس جو منافع حصہ دار کو ملا اس میں زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ اور جو رقم پس انداز ہوئی اُس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

الجواب واللہ الموفق للحق والصواب

۱- بظاہر اس عقد کی حقیقت شرکت عنان ہے، کیونکہ جو لوگ کمپنی قائم کرتے ہیں وہ دوسروں کو شریک کرنے کے وقت خود کو بھی کمپنی کا ایک حصہ دار قرار دیتے اور اپنی عمارات مملوکہ متعلقہ کمپنی اور جملہ سامان ومال تجارت کو نقد کی طرف محمول کر لیتے ہیں، مثلاً ان لوگوں نے دس ہزار روپیہ کمپنی قائم کرنے کے عمارات وسامان وغیرہ میں لگایا تو وہ اپنے کو کمپنی کے

سو حصوں کا حصہ دار ظاہر کریں گے، البتہ اس صورت میں کمپنی قائم کرنے والوں کی طرف سے شرکت بالنقد نہ ہوگی، بلکہ بالعروض ہوگی، سو بعض ائمہ کے نزدیک یہ صورت جائز ہے:

یجوز الشرکۃ والمضاربۃ بالعروض بجعل قیمتھا وقت العقد راس المال عند احمد فی روایۃ وھو قول مالک وابن ابی لیلیٰ کما ذکرہ الموفق فی المغنی (ص ۱۲۵ ج ۵)

پس ابتلائے عام کی وجہ سے اس مسئلہ میں دیگر ائمہ کے قول پر فتویٰ دے کر شرکت مذکورہ کے جواز کا فتوےٰ دیا جاتا ہے۔

۲- قال فی الدر بیع البراءات التی یکتبھا الدیوان علی العمال ولا یصح بخلاف بیع حظوظ الائمۃ لان مال الوقف قائم ثمہ (ای فی بیع حظوظ الائمۃ) ولا کذلک ھذا اشباہ وقنیۃ ومفادہ انہ یجوز للمستحق بیع خبزہ قبل قبضہ من المشرف (ای المباشر الذی یتولی قبض الخبز) بخلاف الجندی اھ مع الشامیۃ (ص ۱۹ ج ۴)

وحاصلہ جواز بیع الحقوق الموجودۃ قبل القبض دون المعدومۃ، پس یہ صورت بھی بیع حظوظ کے مشابہ ہے، کیونکہ جو خریدار اپنا حصہ بیع کرتا ہے وہ معدوم یا غیر مملوک کی بیع نہیں کرتا، وفی الاشباہ بیع البراءات التی یکتبھا الدیوان علی العمال لا یصح (وسمیت براءۃ لانہ یبرء بدفع ما فیھا شامی) فاوردات ائمۃ بخارا جوزوا بیع حظوظ الائمۃ نفرق بینھما بان مال الوقف قائمۃ ثمہ ولا کذلک ھھنا کذا فی القنیۃ الخ ص ۱۹۹ ولم یتعقبہ الحموی بشیٔ فلا یضرنا ما تعقبہ بہ فی النھر کما فی الشامیۃ (ص ۱۹ ج ۴) لاسیما وفتوی ائمۃ بخارا مؤیدۃ بالاثر فقد اخرج البیھقی فی باب بیع الارزاق التی یخرجھا السلطان قبل قبضھا "من طریق سفیان عن معمر عن الزھری عن ابن عمر وزید بن ثابت انھما کانا لا یریان ببیع الرزق بأساً (ص ۳۱۴ ج ۵) اور ظاہر ہے کہ صورت مسئولہ میں ایک شریک جو اپنا حصہ دوسرے کے ہاتھ بیع کرتا ہے، یہ بیع حظوظ ائمہ کے مشابہ ہے، نہ بیع برأت کے واللہ تعالیٰ اعلم۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ بائع حصہ جس قدر نقد روپیہ خریدار حصہ سے لے رہا ہے، کمپنی میں اس کا نقد روپیہ اس مقدار سے کسی قدر کم ہو اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ خریداروں کی رقم کا زیادہ حصہ مال تجارت لگ کر بصورت عروض منتقل ہو جاتا ہے، نقد کم ہوتا ہے۔

---

[۱] لانہ لا یستحق الا الاجر وھو دین غیر عین ولا یجوز بیع الدین من غیر من ھو علیہ ۱۲ ظ

۳۔ بظاہر یہ بیع و شرا محض روشنی کی نہیں ہے بلکہ یہ ایسا ہے جیسے کسی کی بوتل میں تیل بھر دیا جائے اور بجلی کا نظر نہ آنا اس کے جوہر نہ ہونے کو مستلزم نہیں کیونکہ بعض جواہر غیر مرئی بھی ہیں جیسے ہوا، البتہ بیع کے لئے مبیع کا مقدور التسلیم ہونا ضروری ہے تو ہر شئے پر قبضہ اور قدرت تسلیم اس کے مناسب ہوا کرتی ہے، بجلی کا کرنٹ اور میٹر وغیرہ جو خریدار کے گھر میں لگایا جاتا ہے، یہ اس کے مناسب قبضہ اور تسلیم ہے اور آلہ ہے اس بات کا اندازہ لگانا کہ اس شخص نے کتنی بجلی خرچ کی ہے اس کے جوہر موجود اور جسم ہونے کی دلیل ہے، پس یہ ایسا ہے جیسے کسی کے تکیہ یا موٹر اور سائیکل کے پہیہ میں ہوا بھر کر اجرت لی جائے۔ والبیع مبادلۃ مال بمال والمال ما هو مرغوب فیه ولا یخفی کون البرق والهواء مما یرغب فیه فکل منهما بعد القدرة علیه والقبض مال کالماء فی القربة واللہ تعالیٰ اعلم۔

۴۔ قال الموفق فی المغنی اذا اشتری الوکیل لموکله شیئا باذنه انتقل الملك من البائع الی الموکل ولم یدخل فی ملك الوکیل وبهذا قال الشافعی وقال ابوحنیفة یدخل فی ملك الوکیل ثم ینتقل الی الموکل لان حقوق العقد تتعلق بالوکیل بدلیل انه لو اشتراه باکثر من ثمنه دخل فی ملکه ولم ینتقل الی الموکل، ویتفرع عن هذا ان المسلم لو وکل ذمیا فی شراء خمر او خنزیر فاشتراه له لم یصح الشراء وقال ابوحنیفة یصح ویقع للذمی لان الخمر مال لهم لانهم یتمولونها ویتبایعونها فصح توکیلهم فیها کسائر اموالهم اھ (ص ۲۶۳ ج ۵) وفیه ایضا ولیس للمضارب ان یشتری خمرا او خنزیرا سواء کانا مسلمین او کان احدهما مسلما والآخر ذمیا فان فعل فعلیه الضمان وبهذا قال الشافعی وقال ابوحنیفة ان کان العامل ذمیا صح شراءه للخمر وبیعه ایاها لان الملك عنده ینتقل الی الوکیل اھ (ص ۱۶۳ ج ۵) وفی المبسوط یکره للمسلم ان یدفع الی النصرانی مالا مضاربة وهو جائز فی القضاء (ص ۱۲۵ ج ۲۲) وفیه ایضا وابوحنیفة یقول الذی ولی الصفقة هو الوکیل والخمر مال متقوم فی حقه یملك ان یشتریها لنفسه فیملك ان یشتریها لغیره وهذا لان الممتنع ههنا بسبب الاسلام هو العقد علی الخمر لا الملك فالمسلم من اهل ان یملك الخمر الا تری انه لو تخمر عصیر المسلم یبقی ملکا له ثم اذا تخلل جاز له بیعه واکله او اذا مات قریبه عن خمر یملکها بالارث فان اعتبرنا جانب العقد فالعاقد من اهله وهو فی حقوق العقد کالعاقد لنفسه وان اعتبرنا جانب

الملک فالمسلم من اہل ملک الخمر فیصح التوکیل اھ (ص ۲۱۶ ج ۱۲) فان قیل ذکر فی الھندیۃ فی باب المضاربۃ بین اھل الاسلام واھل الکفر اذا دفع المسلم الی النصرانی مالا مضاربۃ بالنصف فھو جائز الا انہ مکروہ فان اتجر فی الخمر والخنزیر فربح جاز علی المضاربۃ فی قول ابی حنیفۃ وینبغی للمسلم ان یتصدق بحصتہ من الربح وعندھما یجوز علی المضاربۃ وان اربی فاشتری درھمین بدرھم کان البیع فاسدا اھ ولکن لایصیر ضامنا لمال المضاربۃ والربح بینھما علی الشرط اھ (ج ۲ ص ۵۷) قلنا قولہ ینبغی للمسلم ان یتصدق بحصتہ محمول علی الورع کما ھو الظاھر وان حمل علی الوجوب فھو اذا کان قد اتجر فی الخمر والخنزیر ولم یتجر فی غیرھما والا فحکمہ ما سیجیٔ فی المخلوط وقولہ فی صورۃ ارباء الوکیل کان البیع فاسدا لایضرنا فان الوکیل بالبیع کالعاقد لنفسہ وفساد البیع فی حق الذمی لایستلزم حرمۃ الربح علی المسلم فان تبدل الملک یدفع خبث الفساد واما علی قول من جوز الربا بین المسلم والکافر فی دار الحرب فالامر اوسع، پس صورت مذکورہ میں مال مستفاد میں حرمت نہ ہوگی، جب کہ کمپنی قائم کرنے والے کافر ہوں، البتہ کفار کی کمپنیوں میں شرکت خود مکروہ ہے، جیسا مبسوط کے قول سے معلوم ہوا، اگرچہ مسلمانوں کی کمپنیاں بھی سودی لین دین کرتی ہوں جیسا آجکل غالب یہی ہے تو کفار کی کمپنیوں کی شرکت مسلم کمپنیوں کی شرکت سے اہون ہے"۔ ولنذکر بعد ذلک حکم المال المختلط بالحرام والحلال" قال قاضی خان ان کان غالب مال المھدی من الحلال لاباس بان یقبل الھدیۃ ویاکل مالم یتبین عندہ انہ حرام لان اموال الناس لاتخلو عن قلیل حرام فیعتبر الغالب واذا مات عامل من عمال السلطان واوصی ان یعطی الحنطۃ للفقراء قالوا ان کان ما اخذہ من اموال الناس مختلطا بمالہ لاباس بہ وان کان غیر مختلط لایجوز للفقراء ان یاخذوہ واذا علموا انہ مال الغیر وان لم یعلم الآخذ انہ من مالہ او مال غیرہ فھو حلال حتی یتبین انہ حرام وفیہ ایضا ان کان للسلطان مال ورثہ عن آبائہ یجوز اخذ جائزتہ فقیل لہ لو ان فقیرا یاخذ جائزۃ السلطان مع علمہ ان السلطان یاخذھا غصبا ایحل لہ ذلک قال ان کان السلطان خلط الدراھم بعضھا ببعض فانہ لاباس بہ وان دفع عین الغصب من غیر خلط لم یجز اخذہ قال

الفقیہ ابو اللیث ھذا الجواب یستقیم علی قول ابی حنیفۃ لان عندہؒ اذا غصب الدراھم من قوم وخلطہ بعضھا ببعض یملکھا الغاصب اما علی قولھما لا یملکھا ویکون علی ملک صاحبھا اھ ملخصا (ص ۳۹۳، ۳۹۴، ج ۴) فاذا خلط الوکیل دراھم الربوا بعضھا ببعض الدراھم التی اخذھا من حلال یجوز اخذ الربح منھا لکون الخلط مستھلکاً عند الامام لاسیما اذا کان الوکیل کافرا، لاسیما والتقسیم مطھر عندنا کما اذا بال البقر فی الحنطۃ وقت الدیاسۃ فاقتسمھا الملاک حل لکل واحد اکلھا مع التیقن بکون الحنطۃ مختلطۃ بالطاھر والنجس ولکن القسمۃ اورثت احتمالاً فی حصۃ کل واحد من الشرکاء فحکمنا بطھارۃ نصیب کل واحد منھم فکذا ھھنا اذا ربح الوکیل بالتجارۃ وخلط الدراھم بعضھا ببعض ثم قسمھا علی الشرکاء یحکم بحل نصیب کل واحد منھم واللہ تعالیٰ اعلم، واخرج البیھقی فی سننہ فی باب کراھیۃ مبایعۃ من اکثر مالہ من الربا وثمن المحرم من طریق شعبۃ عن مزاحم عن ربیع بن عبد اللہ انہ سمع رجلاً سأل ابن عمران لی جارا یاکل الربا اوقال خبیث الکسب وربما دعانی لطعامہ افاجیبہ قال نعم، ومن طریق مسعر عن جواب التیمی عن الحارث بن سوید قال جاء رجل الی عبد اللہ یعنی ابن مسعود فقال ان لی جارا ولا اعلم لہ شیئاً الا خبیثا او حراما وانہ یدعونی فاحرج ان آتیہ واتحرج ان لا آتیہ فقال ائتہ او اجبہ فانما وزرہ علیہ قال البیھقی جواب التیمی غیر قوی وھذا اذا لم یعلم ان الذی قدم الیہ حرام فاذا علم حراما لم یاکلہ اھ (ص ۳۳۵ ج ۵) قلت جواب التیمی وثقہ ابن حبان ویعقوب بن سفیان کما فی التھذیب (ص ۱۲۱ و ۱۲۲ ج ۲)

۵۔ مال تجارت پر زکوٰۃ ہے، جب کہ بقدر نصاب ہو، اور بجلی بھی مال ہے، جیسا مذکور ہوا۔ تو اس میں بھی بوقت تجارت زکوٰۃ ہے، اور جو نقد پس انداز ہوا اس میں بھی زکوٰۃ ہے جب کہ بقدر نصاب ہو، اور حولان حول ہوگیا ہو، اور جو رقم منافع میں آتی ہے، اس پر بھی زکوٰۃ ہے، جب کہ مال تجارت اور منافع کا مجموعہ بقدر نصاب ہو، یا خریدار کے پاس پہلے سے سونا یا چاندی یا نقد بقدر نصاب موجود ہو اور اثنائے حول میں یہ بھی اس کے ساتھ مل جائے تو مجموعہ پر سال تمام پر زکوٰۃ واجب ہوگی ولعل ہذا ظاہر واللہ تعالیٰ اعلم،

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۵ شوال ۱۳۵۵ھ

تتمہ من المجیب یعکر علی ما ذکرنا من احکام الخلط قاعدة اذا اجتمع الحلال والحرام
غلب الحرام ولکن صرح فی الاشباہ بانہ خرجت عن ہذہ القاعدة مسائل عشرة الاولی
من احد ابویہ کتابی والآخر مجوسی فانہ یحل نکاحہ وذبیحتہ ویجعل کتابیا وہی تقتضی
ان یجعل مجوسیا وبہ قال الشافعی ولکن اصحابنا ترکوا ذلک نظرا للصغیر فان المجوسی
شر من الکتابی فلا یجعل الولد تابعا لہ (بل یتبع خیر الابوین) والثانیة الاجتہاد فی الاوانی
اذا کان بعضہا طاہرا وبعضہا نجسا والاقل نجس فالتحری جائز۔ الثالثة الاجتہاد فی ثیاب مختلطة
بعضہا نجس وبعضہا طاہر جائز سواء کان الاکثر نجسا اولا والفرق انہ لا خلف لستر العورة وللوضوء
خلف وہو التیمم۔ والرابعة لو سقی شاة خمرا ثم ذبحہا من ساعتہ فانہا تحل بلا کراہة ومقتضی علاقة القاعدة
التحریم ولکن ابو حنیفة علفہا علفا حراما لم یحرم لبنہا ولحمہا (للاستہلاک) الخامسة ان یکون الحرام مستہلکا فلو
اکل المحرم شیئا قد استہلک فیہ الطیب فلا فدیة (قلت ویدخل فیہ مسئلة
الخلط ایضا فانہ استہلاک عند الامام ولکنہ ذکرہا علی حدة ایضا فقال) الثامنة
اذا کان غالب مال المہدی حلالا فلا باس بقبول ہدیتہ واکل مالہ مالم یتبین
انہ (ای المہدی اسم مفعول) من حرام وان کان غالب مالہ الحرام لا یقبلہا ولا یاکل
الا اذا قال انہ حلال ورثہ او استقرضہ وعن الامام ان المبتلی بطعام السلطان
والظلمة یتحری فان وقع فی قلبہ حلہ قبل واکل والا لا لقولہ علیہ الصلوة والسلام
استفت قلبک الحدیث العاشرة قال فی القنیة من الکراہة غلب علی ظنہ ان
اکثر بیاعات اہل السوق لا تخلو عن الفساد فان کان الغالب ہو الحرام تنزہ عن
شراءہ ولکن مع ہذا لو اشتراہ یطیب لہ اہ قال الحموی ووجہہ ان کون الغالب
فی السوق الحرام لا یستلزم کون المشتری حراما لجواز کونہ من الحلال المغلوب والاصل
الحل اہ (ص ۹۱و۹۲) فلم یثبت خروج ہذہ المسائل عن القاعدة فلا اشکال واللہ اعلم
یقول اشرف علی ان ہذا التوسع کلہ فی امثال ہذہ المعاملات لمن ابتلی بہا او
اضطر الیہا واما غیرہ فالتوقی الورع فقط ۴ لمنتصف شوال ۱۳۵۵ھ

فصل ثالث۔ اس میں ایک کپڑے کی خالص مسلمانوں کی کمپنی کے قواعد اور احکام ہیں
(قواعد ضروریہ) یہ قواعد کمپنی کے مینیجنگ ڈائرکٹر کی تحریر سے معلوم ہوئے
ہیں اور انھوں نے اس کا قصد ظاہر کیا ہے، کہ کمپنی کے قواعد جو انگریزی میں ہیں، اور جس کا

صرف ایک نسخہ رکھا ہے اس کا ترجمہ کر کے شائع کیا جائے اس کو دیکھ کر اگر ضرورت ہوئی
اس فصل میں اضافہ کر دیا جائے گا، جو قواعد اس وقت معلوم ہوئے ہیں وہ نقل کئے جاتے ہیں۔
۱۔ مینجنگ ڈائرکٹر کو پورا اختیار ہے کہ کمپنی کے مفاد کے لئے جو امور ضروری ہیں ان کو عمل میں لائے اس میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ کمپنی کے روپے کو مناسب طور اور نفع کے لئے کہیں اور لگائے اور کمپنی کی طرف سے لین دین کرے (بلا سودی)
۲۔ کمپنی کا تمام روپیہ حسب ضرورت بنک میں رکھنا ناگزیر ہے تاکہ آسانی سے دوسری جگہ روپیہ بھیجا جا سکے۔
۳۔ حسابات سال میں ایک بار ہوں گے، اور منافع فی صدی جو ڈائرکٹروں نے طے کیا ہو تمام حصہ داروں کو تقسیم کیا جائے گا۔
۴۔ زکوٰۃ سال پورے ہونے پر جو اپریل میں ختم ہو گا ادا کی جائے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔
۵۔ اگر کوئی حصہ دار اپنا روپیہ وصول کرنا چاہے، تو اس کی یہ صورت ہے، کہ دوسرا اسی رقم کا حصہ دار تلاش کیا جائے وہ ان حصص کو خرید لے، پھر کمپنی نئے حصہ دار سے روپیہ وصول کر کے پرانے حصہ دار کو ادا کر دے تلاش خریدار اور رجسٹروں کی درستی وغیرہ کا معاوضہ کچھ فی صدی لیکر باقی روپیہ پہلے حصہ دار کو ادا کیا جا سکتا ہے، اور یہ تبادلہ اس وقت تک نہیں ہو گا جب تک کہ ڈائرکٹروں کی رضامندی نہ ہو، ڈائرکٹروں کی اجازت کے بعد ہر حصہ کی تبدیلی پر صرف ایک روپیہ فیس عائد کی جائے گی۔
(احکام مبنیہ بر قواعد مذکورہ نمبر وار) ان امور اور تصرفات کے جواز و عدم جواز کے موافق احکام جاری ہوں گے، اور یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ بعد میں شریک ہوں گے ان کی شرکت میں ایک بدل عروض ہوں گے، سو اس کی تحقیق تکریر فصل ثانی میں گذر چکی ہے اور بلا سودی کی قید سے یہ کمپنی دوسری اکثر کمپنیوں سے اقرب الی الخیر ہو گئی۔
۲۔ بنک کے معاملات میں علماء کا اختلاف مشہور ہے اور فصل ثانی میں مذکور۔
۳۔ اگر نفع کی مقدار معین ہوتی تو وہ ربوا ہوتا۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں۔
۴۔ بلا قید یہ معمول جائز نہیں، البتہ اگر اس تفصیل سے قاعدہ مقرر کیا جائے تو جائز ہے کہ نابالغ کے حصہ کی زکوٰۃ کو کسی کی اجازت سے بھی جائز نہیں، اور یا لعین میں جس کا حصہ نصاب سے کم ہو، یا حصہ دار اتنا مقروض ہو کہ منہائی قرض کے بعد اس کا حصہ نصاب سے کم رہ جائے

اس کی زکوٰۃ اس کی اجازت سے جائز ہے، لیکن چونکہ ان لوگوں کے ذمہ واجب نہیں، لہذا ان کو اس عدم وجوب کی اطلاع کردینی چاہیے، پھر اجازت دینے نہ دینے کا اُن کو اختیار ہے یا اگر کسی کے ذمہ واجب بھی ہے مگر وہ کمپنی کو ادا کرنے کی اجازت نہیں دیتا، اس کے حصہ میں سے بھی دینا جائز نہیں، چونکہ اس تفصیل پر عمل سخت دشوار ہے، لہذا زکوٰۃ کی اس دفعہ کو نکال ہی دینا مناسب ہے، نیز اس میں ایک اور فروگذاشت بھی ہے، وہ یہ کہ زکوٰۃ قمری سال کے حساب سے واجب ہوتی ہے، اور ان دونوں حسابوں میں ایک سال میں تقریباً دس روز کا فرق پڑتا ہے تو چھتیس سال میں ایک سال کا فرق ہوگا، تو اگر شمسی حساب سے ادا کرتا رہے تو چھتیس سال میں ایک سال کی زکوٰۃ اس کے ذمہ واجب رہ جائے گی، اور یہ اپنے کو سبکدوش سمجھے گا۔

۵۔ اس مبادلہ کے احکام اور تصحیح کا طریق فصل دوم میں مفصلاً مذکور ہے، اور اس صورت میں جو رجسٹروں کی درستی وغیرہ کا کچھ معاوضہ مثلاً فی صدی ایک روپیہ یا کم زیادہ لیا جائے وہ اجرت ہے اہل دفتر کی اس کا کچھ حرج نہیں، اور احقر کے نزدیک منی آرڈر کی فیس بھی اسی توجیہ سے جائز ہو سکتی ہے، ھذا ما حضر فی ھذا الحین، وفی کل امر بہ نستعین

ضمیمہ فصل ثالث متعلق دفعہ زکوٰۃ:

یہاں سے زکوٰۃ کے متعلق جب جواب گیا تو کمپنی کے ڈائرکٹر کا خط آیا، کہ واقعی میری ناقص نظر ان امور پر نہ تھی جس کے متعلق حضور والا نے تحریر فرمایا ہے، مگر بعض شبہات مجھے اب پیدا ہو گئے ہیں جو حضور والا سے عرض کرتا ہوں، تاکہ ازالہ ہو جاوے۔

اس وقت تک جو رقم بارہ تیرہ ہزار اس کمپنی میں لگائی گئی ہے وہ بسر دست تقریباً ڈیڑھ چند ہو گئی ہے، مگر چونکہ علاوہ فرنیچر اور الماریوں اور دیگر اشیاء ضروری کے سب چیزیں اشیاء تجارت میں سے ہیں اور ان پر سال گذرنے والا ہے، لہذا اگر ان کی زکوٰۃ نہ نکالی جاوے تو جس شخص نے ایک سو روپے کے حصص خریدے ہیں اور وہ مقروض بھی نہیں ہے اور صاحب نصاب بھی ہے اس کا مشترکہ حصہ بصورت مال تجارت ڈیڑھ سو روپیہ ہو گیا ہے، اب وہ زکوٰۃ کیا ادا کرے، اگر ایسی صورت میں کمپنی اپنی ذمہ زکوٰۃ کا ادا کرنا لازم کرلے تو سب مال تجارت کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، مگر واقعی اس صورت میں

جیسا حضور والا نے تحریر فرمایا ہے ان حضرات کی طرف سے بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی جن کے ذمہ زکوٰۃ واجب نہیں، اب جو صورت حضور والا تحریر فرمادیں اسی کے مطابق عمل کیا جائیگا انشاء اللہ تعالیٰ۔ انتہی السوال

اس کا جواب حسب ذیل گیا، تخمینہ سے ادا کی جائے گی۔ اور حصہ داروں کو تو تخمینہ کرنا دشوار ہے سہل صورت یہی ہے کہ ختم سال پر جب حصہ داروں کو منافع کی رقم تقسیم کیجاوے اس کے ساتھ ہی آپ تخمینہ کر کے اس کی بھی اطلاع ان کو کر دیں اور مسئلہ بتلادیں کہ آپ کے ذمہ اس کی زکوٰۃ واجب ہے علماء سے پوچھ کر ادا کر دی جاوے۔ پھر ان کو اپنے واجب کے ادا کرنے نہ کرنے کا اختیار ہے۔

مسئلتان زید تاوقت النظر الثانی الاولیٰ منی والثانی من المولوی محمد شفیع الدیوبندی فی جواب سوالی بعد عدۃ اشھر، فالاولیٰ فی الدر وسببہ ای وجوب الزکوٰۃ ملک نصاب حولی الخ فی رد المحتار فلا زکوٰۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلۃ لعدم الملک الخ قلت وکذا فی دراھم الوقف لاشتراک العلۃ وقلت ایضاً ودلیل المسئلۃ من الحدیث قولہ علیہ السلام لما اخبر بمنع خالد الزکوٰۃ اما خالد فانکم تظلمون خالداً قد احتبس ادراعہ واعتدہ فی سبیل اللہ الحدیث للشیخین وابی داؤد والنسائی عن ابی ھریرۃ الخ ای جمع الفوائد بیان وجوب الزکوٰۃ واثم تارکھا) والثانیۃ فی صورۃ السوال والجواب:

السوال (۵۲۳) ایک ضروری سوال حل طلب ہے، جس کا منشاء چند فروع فقہیہ ہیں، اول وہ فروع نقل کرتا ہوں پھر وہ سوال لکھوں گا، اور چونکہ وہ فروع محض یاد سے لکھی ہیں، اس لئے ان کے صحیح یا غلط یاد ہونے کی بھی تحقیق مقصود ہے، وہ فروع یہ ہیں

۱۔ دراہم و دنانیر کا وقف کرنا متاخرین کے قول پر صحیح ہے، اس صورت سے کہ اصل سرمایہ باعتبار مقدار کے محفوظ رہے، اور اس کو بذریعہ تجارت بڑھا کر اس کے منافع کو مصارف وقف میں صرف کیا جاوے۔

۲۔ واقف کو منافع وقف سے تاحیات خود اپنی ذات کے لئے انتفاع کی شرط ٹھہرانا جائز ہے، باقی دوسرے شرائط صحت وقف کا تحقق ہر حال میں ضروری ہے۔

۳۔ وقف میں زکوٰۃ واجب نہیں، کیونکہ اس کے وجوب کے لئے دلیل سے ملک محل کی شرط ہے

اور اس علت کا مقتضا یہ ہے کہ دراہم موقوفہ اور اس کے ربح میں بھی زکوٰۃ واجب نہ ہو یہ مقتضا کلیات سے لکھا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر دراہم موقوفہ بشرط انتفاع النفس کی آمدنی پر اپنے خرچ میں لانے کے لئے قبضہ کرلیا تو کیا اسی نیت سے قبضہ کرنے سے وہ رقم اس کی ملک میں داخل ہوگئی یا داخل نہیں ہوئی، صرف اباحت کے طور پر اس سے انتفاع جائز رہے گا، دوسری صورت میں یہ سوالات متوجہ ہوں گے، کہ اگر قبل استہلاک اس پر حولانِ حول ہوگیا تو اس پر زکوٰۃ نہ ہونا چاہئے۔ نیز اگر واقف مرگیا تو اس میں میراث جاری نہ ہونا چاہئے، پھر کیا اس صورت میں واقف پر واجب ہوگا کہ اس کے متعلق وصیت کر جاوے اور کیا اس حالت میں اس کا مصرف اس وقف کے مصارف مقصودہ ہوں گے، اور اگر اس کو دوسرے مال میں مخلوط کردیا تو خلط سے مالک ہو کر کیا اس کا ضمان واجب ہوگا اور پہلی صورت یعنی تملک میں یہ سوالات تو متوجہ نہ ہوں گے، لیکن ایک علمی اشکال رہے گا، کہ جب منافع وقف کے بھی وقف ہیں جس کے لوازم سے عدم تملک ہے یہ لازم اُس سے کیسے منفک ہوگیا؟ بینوا توجروا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب:۔ فروع مذکورہ جن پر سوال مبنی ہے سب صحیح اور کلام فقہاء میں مصرح ہیں فروع نمبر۱ عالمگیری کتاب الوقف باب دوم صفحہ ۲۰۲ میں نیز درمختار و شامی میں مصرح موجود ہے، اور فروع نمبر۲ بھی عالمگیری، شامی، درمختار اور عامۂ متون و شروع میں مصرح موجود ہے، اور فروع نمبر۳ کے متعلق شامی کی تصریح درمختار کے قول سببہ ملک نصاب کے تحت میں بالفاظ ذیل ہے، فلا زکوٰۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلۃ لعدم الملک (شامی ص ۲۶۵)

اب جواب سوال دو مقدموں پر موقوف ہے، اول یہ کہ منافع وقف وقف نہیں ہوتے (جیسا سوال کے آخر میں کہا گیا ہے) بلکہ واجب التصدق والانفاق فی مصارفہ ہوتے ہیں دوسرے یہ کہ جن لوگوں کو منافع وقف سے حصہ دیا جاتا ہے، وہ بطور تملیک ہوتا ہے بطور اباحت نہیں، ہاں اگر واقف اس کی تصریح کردے کہ بطور اباحت خرچ کیا جاوے تو یہ دوسری بات ہے کہ پابندی اس کی بوجہ اتباع شرائط واقف کے ضروری ہوجائے گی، نہ کہ اصل وقف کا اعتبار سے) دلیل مقدمہ ثانیہ کی عبارات ذیل ہیں (۱) فی الدرالمختار فی تعریف الوقف ھو لغۃ

الحبس وشرعاً حبس العین علی حکم ملک الواقف والتصدق بالمنفعۃ ولو فی الجملۃ (الی قولہ) عندہ وعندھما ھو حبسھا علی حکم ملک اللہ تعالیٰ وصرف منفعتھا علی من احب الخ قال الشامی فی قولہ فی الجملۃ فیدخل فیہ الوقف علی نفسہ ثم علی الفقراء وکذا الوقف علی الاغنیاء ثم الفقراء (شامی ص ۳۹۴ ج ۳) ومثلہ فی العالمگیریۃ (ص ۲۰۲ ج ۲)

(۲) والصدقۃ کالھبۃ بجامع التبرع وحینئذ لا تصح غیر مقبوضۃ ولا فی مشاع یقسم (درمختار مع شامی ص ۵۱۸ ج ۴) (۳) وفی البدائع مستدلا علی وجوب التملیک فی الصدقات مانصہ والایتاء ھو التملیک ولذا سمی اللہ تعالیٰ الزکوٰۃ صدقۃ بقولہ عز وجل انما الصدقات للفقراء والتصدق التملیک (بدائع ص ۲۶ ج ۲)

عبارات مذکورہ میں منافع وقف کو صدقہ قرار دیا گیا ہے اور عبارت ۲ میں صدقہ کا مثل ہبہ ہونا مصرح ہے، اور ہبہ کا موہوب لہ کی ملک تام ہونا معلوم ومعروف ہے، اور عبارت ۳ میں التصدق کا عین تملیک ہونا بصراحت مذکور ہے، اس مجموعہ سے ثابت ہوا کہ منافع وقف جن لوگوں کو بطور صدقہ دیا جاتا ہے وہ بطور تملیک ہے بطور اباحت نہیں، اور اغنیاء کو یا خود واقف کو جو حصہ دیا جاتا ہے وہ اگرچہ حقیقۃً صدقہ نہیں بلکہ ہبہ ہے، مگر اس کو بھی بلفظ تصدق تعبیر کیا گیا ہے کما فی تنقیح الحامدیۃ، التصدق علی الغنی ھبۃ وان ذکر لفظ الصدقۃ وعلی الفقیر صدقۃ وان ذکر لفظ الھبۃ (تنقیح الفتاوی الحامدیۃ ص ۹۱ ج ۲)

الغرض صدقہ ہو یا ہبہ دونوں پر متصدق علیہ اور موہوب لہ کا قبضہ قبضۂ مالکانہ ہوتا ہے اباحت نہیں، واللہ اعلم۔

اور دلیل مقدمہ اولیٰ (یعنی اس امر کی کہ منافع وقف وقف نہیں ہوتے) عبارات ذیل ہیں

(۱) عبارت مذکورہ سابقہ ۱ جس میں منافع وقف کو بخلاف اصل وقف کے صدقہ قرار دیا ہے۔

(۲) متولی المسجد اذا اشتری من غلتہ داراً او حانوتاً فھذہ الدار وھذہ الحانوت ھل تلحق بالحوانیت الموقوفۃ علی المسجد ومعناہ ھل تصیر وقفاً اختلف المشائخ فیہ قال الصدر الشھید المختار انہ لا تلتحق ولکن تصیر مستغلاً للمسجد وھذا لان الشرائط التی یتعلق بھا لزوم الوقف وصحتہ حتی لا یجوز فسخہ ولا بیعہ لم یوجد شیئ من ذلک ھھنا فلم یصر وقفاً فیجوز بیعہ، فی التاسع عشر من وقف الذخیرۃ (فتاوی انقرویہ ص ۲۲۱ ج ۱) عبارات مذکورہ سے معلوم ہوا کہ منافع وقف وقف نہیں بلکہ اگر ان سے وقف کیلئے

کوئی جائداد بھی خرید لی جاوے تو وہ جائداد بھی وقف نہیں ہوتی (یہ دوسری بات ہے کہ
واقف نے تصریح کردی ہو، کہ وقف کی آمدنی کے کل یا جزو سے کچھ جائداد خرید کرو وقف
کے ساتھ ملحق کردی جاوے تو اتباع شرائط واقف کی وجہ سے وہ بھی وقف ہو جائے گی کما
یستفاد من القواعد) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

اب خلاصہ جواب یہ ہے کہ دراہم موقوفہ علی نفسہ کے منافع پر جب خود واقف نے
حسب شرائط وقف اپنے صرف میں لانے کے لئے قبضہ کرلیا تو یہ قبضہ ملک ہے، اگر اس طرح
بقدر نصاب روپیہ جمع ہوگیا تو حولان حول کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور بعد وفات
مالک اس میں میراث جاری ہوگی، اور چونکہ منافع وقف کا وقف نہ ہونا بلکہ واجب التصدق
مثل قیمت حرم قربانی وغیرہ کے ہونا عبارات مذکورہ سے مستفاد ہے اس لئے یہ شبہ نہ رہا کہ
منافع وقف ملک میں کس طرح داخل ہوگئے واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

ضمیمہ ملتقطہ از فتاویٰ عتیقہ احقر موعودہ خطبہ رسالہ ہذا یعنی القصص السنی

فصل رابع سوال (۵۲۴) (۱) کپڑے اور روئی بنانے کی ملوں کے شیر یعنی حصص کمپنی
مذکورہ کے خریدنا درست وجائز ہے یا نہیں، (۲) اور ٹرام ریلوے کے حصص خریدنا درست ہے، یا
نہیں، (۳) مذکورہ بالا کمپنی نے دو ہزار روپے کے اگر حصص خریدے تو اس کی آمدنی کے
اوپر زکوٰۃ دینا واجب ہے یا دو ہزار روپے مذکورہ کے اوپر بھی زکوٰۃ دینا واجب ہے یا آمدنی
اور مذکورہ دو ہزار روپیہ پر بھی زکوٰۃ دینا واجب ہے۔ (۴) دار الحرب میں بعض لوگ
سیونگ بنک میں پیسہ رکھتے ہیں اور سالانہ سود بھی لیتے ہیں کیا مسلمان کے لئے یہ جائز ہے۔

الجواب (۱) و (۲) اگر حصہ صرف نقد روپیہ تھا تب تو اس کے خریدنے کے لئے
برابر سرابر ہونا شرط ہے، اور اگر حصہ میں آلات کا جزو بھی ہے تو بدون اس شرط کے بھی
درست ہے۔ (۳) زکوٰۃ اصل ونفع دونوں پر واجب ہوتی ہے۔ (۴) یہ فعل معصیت
ہے، مگر اس سے جو مال حاصل ہوا وہ مباح ہوسکتا ہے، اور اس مسئلہ میں اختلاف بھی ہے

سوال کانپور کی میور ملس کمپنی کے منیجر نے حسب قاعدہ
مروجہ ایک اشتہار کمپنی قائم کرنے کا دیا۔ اور اس کے مجوزہ سرمایہ کے مطابق پندرہ لاکھ روپیہ

جمع ہوگیا جس سے کاروبار شروع کیا گیا۔ اور ہر سال نفع تقسیم کرتا رہا، اور جیسے کہ عموماً کمپنیوں کا قاعدہ ہے کہ ہر سال کے نفع میں سے کچھ بچاکر تقسیم کیا جاتا رہا کہ اتفاقی حوادث کے وقت وہ نفع کام دے، چونکہ شرکاء میں کمی بیشی کمپنی میں نہیں ہوسکتی۔ اس واسطے رقم نفع میں کچھ بلکہ کل تک اگر بچا رکھا جاوے تو قواعد شرعیہ کے کچھ خلاف بھی نہیں ہے، ہر سال وہ نفع کی رقم بچتے بچتے اس قدر بچ گئی کہ اصل سرمایہ کے برابر یعنی پندرہ لاکھ کو پہونچ گئی اس وقت مینیجر نے یہ مناسب سمجھا کہ اب اس رقم کو شامل اصل کردیا جاوے، اس لئے اس نے تمام شرکاء کو اطلاع دی کہ یا تو لوگ اپنا نفع جو بجگر اصل کے برابر پہونچ چکا ہے اس کو واپس لے لیں، اور یا اس کو اصل میں شامل کردیں، اس تقدیر پر اس کی اصل دونی سمجھی جاوے گی لیکن تقسیم نفع کے وقت اس نے یہ شرط کرلی ہے کہ جدید حصص پر نفع خواہ کسی قدر ہو سیکڑہ سے زائد تقسیم نہ کرے گا، اور جو اس سے زائد نفع ہوگا وہ قدیم حصص پر تقسیم کیا جاوے گا فرض کیا جاوے کہ اصل میں ایک شخص نے سو روپے دیئے تھے، اور اب رقم نفع ملاکر اس کے دو سو کا حصہ سمجھا گیا، تو اگر کمپنی میں نفع اس قدر ہوا کہ ہر سو پر ۶ر تقسیم ہوسکتا ہی تو وہ اس شخص کو ۱۲ر دے گا، اصل روپے پر ۶ر اور زائد پر ۶ر اور اگر اس قدر نفع ہوا کہ ہر سو پر ۸ر سے صحیح تقسیم ہوسکتا ہے تو وہ اصل پر آٹھ آنہ دے گا، اور رقم نفع پر ۸ر لیکن اگر نفع اس قدر زائد ہو کہ ہر سو پر ۱۰ر صحیح تقسیم ہوجاتے ہیں تو وہ رقم نفع پر ۸ر دے کر باقی ۱۲ر رقم اصل کے نفع دیدے گا۔

خلاصہ یہ کہ رقم نفع میں نفع کی کمی مقدار گو مقرر نہیں، بلکہ اگر نقصان ہو تو بھی لیا جاویگا لیکن زائد میں مقدار نفع مقرر کردی ہے کہ ۸ر سے زائد اس کو نفع میں کوئی حق نہیں ہی، بلکہ وہ تمام زیادتی صرف قدیم رقم کے متعلق سمجھی جاوے گی، چنانچہ اس اشتہار کے مطابق اکثر لوگوں نے اپنا روپیہ اس کمپنی میں جمع کردیا۔ اور بعض نے واپس بھی منگوالیا، چنانچہ پندرہ لاکھ رقم نفع میں تیرہ لاکھ سے کچھ اوپر اس میں رکھ کر شامل اصل کردی گئی، اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ لوگوں نے واپس کرلیا،

اب سوال یہ ہے کہ یہ معاملہ جائز ہوا یا نہیں، اور اگر کوئی شخص اپنے حصص رقم اصل یا حصص رقم نفع دوسرے کے ہاتھ فروخت کرے تو اس سے خریدنا جائز ہی یا نہیں، اور آیا زائد از ۸ر تقسیم نہ کرنے کی شرط جو حصص قسم ثانی میں ہی اس سے اس شرکت میں فساد آتا ہے یا نہیں

شرکت میں حسب تصریح فقہا کمی و بیشی کی شرط ہوسکتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ وہی شرط ہونا چاہئے جس میں تعیین مقدار نہ ہو، اور یہاں آٹھ آنہ سے زائد ملنے کی معین شرط ہے، اور اگر فساد آوے گا تو صرف حصص قسم ثانی میں یا اس کا اثر اول قسم تک بھی پہونچ جاوے گا۔ اس وجہ سے کہ جب قسم ثانی میں یہ شرط فاسد ہوئی تو شرکت فاسدہ میں نفع راس المال کے مطابق تقسیم ہونا چاہئے، اور یہاں مالکان حصص قسم اول کو اگر نفع زائد ہو تو ۸ سے زائد مل سکتا ہے، اور حالانکہ وہ مطابق راس المال تقسیم ہونا چاہئے، تو گویا قسم ثانی کا نفع جو ان کا حق تھا وہ قسم اول کے مالکان کو ملا جاتا ہے، اس لئے وہ نفع لینا قدیم حصص کے مالکان کو جائز نہ ہو، یا کہ دونوں قسموں کو اس بنا پر جائز کہا جاوے کہ دونوں قسم کے حصص کا مجموعہ نفع غیر متعین ہے اور مالک دونوں کا ایک ہی شخص ہے، نہ علیحدہ علیحدہ، البتہ جو صرف حصص قسم ثانی کسی سے خرید لے گا تب اس کو جائز نہ ہوگا، یا کہ صرف قسم اول کے حصص کوئی خرید لے تو اس کو جب ۸ سے نفع زائد ملے گا تو بسبب تعلق حصص قسم نفع زائد از ۸ میں وہ زیادتی جائز نہ ہو، لیکن جو شخص دونوں قسم کے حصص کا مالک ہو یا دونوں قسم کے حصص خرید لے اس کے لئے نفع جائز ہو جاوے، علی الخصوص اس وقت جبکہ دونوں قسم کے حصص برابر ہوں، اس لئے کہ اس وقت اگر کمی بیشی ہوئی ہے تو اس سے اسی کو ملتا ہے، نہ کہ دوسرے کا مال آتا ہے، یقین ہے کہ اعلیحضرات اس پر توجہ فرما کر جواب باصواب تحریر فرمائیں گے؟

الجواب، میں نے پوری توجہ سے اس سوال کو پڑھا، میرے نزدیک یہ شرط مفسد عقد نہیں، کیونکہ قسم ثانی کے نفع کی مقدار اکثر متعین ہے، مگر اس سے زائد کو دوسرے شریک کے لئے شرط نہیں ٹھیرایا، اگرچہ کسی شریک کے فعل خاص سے کہ وہ اپنا جزو حصہ کسی اجنبی کے ہاتھ بیچ ڈالے یہ امر کہ ایک کے حق کا نفع دوسرے کو مل جاوے لازم آجاوے، لیکن اصل عقد میں تو یہ شرط نہیں بلکہ مجموعہ منافع متعلقہ ہر دو قسم ایک ہی حصہ دار کا حق ہے کہ اس کے جزو کو ایک قسم کے متعلق قرار دیدیا، اور ایک جزو کو دوسری قسم کے متعلق، البتہ جواز نفع اسی کیلئے ہے جو مجموعہ ہر دو قسم حصص کا مالک ہو، یا مجموعہ ہر دو قسم حصص کو خرید لے، بشرطیکہ دونوں قسم کے حصص برابر ہوں، اور اگر کم و بیش ہوں گے تو بوجہ اُن مفاسد کے جو سوال میں مذکور ہیں عقد میں فساد آجاوے گا، واللہ اعلم اسی طرح اگر ایک حصہ ایک کا ہو اور دوسرا حصہ دوسرے کا تو یہ صورت بھی جائز نہیں، للزوم المفاسد المذکورۃ فی السوال واللہ اعلم ۶ رذی الحجہ ۱۳۲۶ھ

فصل سادس، سوال (۵۲۶) آجکل بعض انگریزی تجارتوں کا یہ حال ہے کہ کاغذ فروخت کرتے ہیں اور اس میں چار ٹکٹ لگے ہوتے ہیں جس کو وہ شخص اسی قیمت کو مثلاً ایک روپیہ پر چار اشخاص کے ہاتھ فروخت کر ڈالتا ہے، اور ان اشخاص سے وہ روپیہ وصول کر کے اور ان کا پتہ کمپنی کو لکھ کر بھیجدیتا ہے، صاحب کمپنی ایک گھڑی اس شخص کو بھیجتا ہے، اور ان چار اشخاص کے نام ایک ایک کاغذ ویسا ہی بھیجدیتا ہے جس میں ویسے ہی ٹکٹ بھی ہوتے ہیں، جن کو وہ چاروں شخص لوگوں کے ہاتھ اسی قیمت کو مثلاً ایک روپے کو پھر بیچ ڈالتے ہیں جب روپیہ ان لوگوں کے پاس آجاتا ہے تو وہ لوگ بھی صاحب کمپنی کے نام اور جن کے ہاتھ وہ ٹکٹ فروخت کئے ہیں ان کا پتہ وغیرہ لکھ کر بھیجدیتے ہیں، صاحب کمپنی ایک ایک گھڑی ان کے نام بھیجدیتا ہے، اور ایک ایک کاغذ ایسا ہی جن کے نام انھوں نے ٹکٹ فروخت کئے ہیں، صاحب کمپنی کو فروخت کر دیتا ہے، پھر وہ لوگ بھی ویسا ہی عمل کرتے ہیں، اور اسی طرح اجرا رہتا ہے، ہاں البتہ جس شخص کے ٹکٹ فروخت نہ ہوں گے وہ البتہ نقصان اٹھاویگا تو شرعاً یہ بیع جائز ہے یا نہیں، اور شرعاً ایسا کرنا کیسا ہے؟

الجواب۔ حاصل حقیقت اس معاملہ کا یہ ہے کہ بائع مشتری اول سے بلاواسطہ اور دوسرے مشتریوں سے بواسطہ مشتری اول یا ثانی یا ثالث وغیرہم کے یہ معاہدہ کرتا ہے کہ ہم نے جو روپیہ بھیجا ہے اگر تم اپنے خریدار پیدا کرلو تو اس روپے مرسلہ کے عوض ہم نے تمہارے ہاتھ گھڑی فروخت کردی، ورنہ تمہارا روپیہ ہم ضبط کرلیں گے، سو اس میں دونوں شرطیں فاسد یا باطل ہیں دوسرے خریداروں کے پیدا کرنے کی تقدیر پر فروخت کرنا بھی کہ وہ تنجیز بیع کے وقت (مقرون بشرط فاسد مخالف مقتضائے عقد ہونے کی وجہ سے) عقد فاسد بحکم ربوا ہے اور تعلیق کی وجہ (تعلیق الملک علی الخطر ہونے کی وجہ سے) قمار ہے، اور ربوا اور قمار دونوں حرام ہیں، اسی طرح دوسری شرط یعنی خریدار نہ پیدا کرنے کی تقدیر پر روپیہ کا ضبط ہو جانا بھی کہ صریح اکل بالباطل ہے، اور یہ تاویل ہرگز مقبول نہیں ہوسکتی کہ روپے کے عوض ٹکٹ دیا ہے، کیونکہ ٹکٹ مبیع نہیں ہے، ورنہ بعد خرید ٹکٹ معاملہ ختم ہو جاتا، ٹکٹ فروخت کرکے گھڑی کا استحقاق ہر گز نہ ہوتا جیسا تمام عقود میں یہی ہوتا ہے، پس صاف ظاہر ہے کہ ٹکٹ مبیع نہیں بلکہ روپیہ کی رسید ہے، جب دونوں شرطوں کا فاسد اور باطل ہونا ثابت ہو گیا تو ایسا معاملہ بھی بالیقین حرام اور متضمن ربوا اور قمار اور اکل بالباطل ہے، اور کسی طرح اس میں جواز کی گنجائش نہیں،

قال اللہ تعالیٰ احل اللہ البیع وحرم الربوا، وقال اللہ تعالیٰ انما الخمر والمیسر الیٰ قولہ رجس من عمل الشیطان الآیۃ وقال اللہ تعالیٰ ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الآیۃ، وقال صلے اللہ علیہ وسلم کل شرط لیس فی کتاب اللہ تعالیٰ فھو باطل ونھی علیہ السلام عن بیع وشرط، وفی جمیع الکتب الفقہیۃ صرحوا بعدم جواز بیع مشروط بما لا یقتضیہ العقد ولا یلائمہ وفیہ نفع لاحد ھما کما لا یخفی علی من طالعھا واللہ اعلم،

فصل سابع۔ سوال (۵۲۷) یہ مسئلہ استفسار طلب ہے کہ حضور والا کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں اکثر کمپنیاں (جماعت تجارت) ایسی ہیں جو جان ومال کا بیمہ کیا کرتی ہیں، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جماعت تجارت کو جو مشترک قائم ہیں وہ مال منقولہ وغیر منقولہ پر ایک کمیشن سالانہ لیا کرتی ہیں، اور اگر اندر سال کے وہ مال صرف بذریعہ آتشزدگی تلف ہو جاوے تو جس قدر تعیین مال پر انہوں نے کمیشن لیا ہے۔ اس قدر تعیین یکمشت مالک مال تلف شدہ کو دیدیا کرتے ہیں، اکثر لوگ اپنی جائداد کا بیمہ کرایا کرتے ہیں۔ یہ طریقہ اس قدر رائج ہے کہ غالباً اس سے آنجناب بھی واقف ہوں گے، پس آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ یہ طریقہ بیمہ کا شرعاً جائز ہو سکتا ہے یا نہیں، مثلاً یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ اکثر لوگ نوٹ وغیرہ بذریعہ رجسٹری شدہ لفافہ کی ڈاک کی معرفت روانہ کیا کرتے ہیں، جس سے مقصود صرف حفاظت نوٹ ہوتی ہے، پس اگر بیمہ کرانا ناجائز ہوگا تو غالباً رجسٹری کر کے نوٹ روانہ کرنا بھی خلاف شرع شریف ہوگا۔ امید کہ سمع خراشی معاف فرمائی جاوے؟

الجواب۔ ان اشتہاری اور تجارتی بیموں میں کمپنیاں جو مالک کو خاص صورتوں میں معاوضہ دیتی ہیں۔ صورۃً تو وہ عوض ہے اس مال تلف شدہ کا، مگر واقع میں عوض ہے اس رقم کا جو ماہانہ یا سالانہ داخل کی جاتی ہے، کیونکہ ان کو مقصود وہی ہے، ورنہ مال ضائع سے اس کو کیا نفع ہو سکتا ہے، پس باعتبار صورۃ کے تو یہ قمار ہے، لانہ تعلیق المساواۃ فی الجانبین فیما یجب فیہ المساواۃ، اور قمار اور سود دونوں حرام ہیں، پس یہ معاملہ یقیناً حرام ہے، اسی طرح جان کا بیمہ وہ صورۃً رشوت ہے لان المال عوض من غیر متقوم وھو النفس اور حقیقۃً سود ہے، یعنی ما مر فی المال، رہا بیمہ زیور وغیرہ کا جو ڈاکخانہ میں کرایا جاتا ہے، اس کی حقیقت اور ہے کیونکہ ڈاکخانہ والے اس چیز کو پہونچاتے ہیں اور

اجرت لیتے ہیں، پس یہ معاملہ عقد اجارہ ہے، وہ عملۂ ڈاک اجیر ہیں اور بیمہ زیادہ اجیر ہے، اور اُن کی یہ ذمہ داری تاوان کی اشتراط ضمان علی الاجیر ہے جس کو بعض فقہاء نے جائز کہا ہے، بخلاف مذکورہ بیموں کے کہ کمپنی اس مال یا جان میں کوئی عمل نہیں کرتی اس میں یہ تاویل محتمل نہیں، فی الدر المختار باب الودیعۃ، واشتراط الضمان علی الامین الخ وفی رد المحتار وانظر حاشیۃ الفتال (؟) قد یفرق بانہ ھھنا مستاجر علی الحفظ قصدا بخلاف الاجیر المشترک فانہ مستاجر علی العمل تامل وفی الدر المختار باب ضمان الاجیر ولا یضمن ماھلک فی یدہ الی قولہ خلافا للاشباہ فی رد المحتار ای من انہ ان شرط ضمانہ ضمن اجماعا ء وھو منقول عن الخلاصۃ وعزاہ ابن الملک للجامع قلت وفی ھذا البیمۃ یستاجر بالزیادۃ علی الحفظ قصدا فکان اولی بالجواز من الاجیر المشترک یضمن علی العمل واللہ اعلم ۱۵ رمضان المبارک ۱۳۲۳ھ

فصل ثامن سوال

زید نے ایک میل کمپنی کے حصے خریدے، ایک ۰۰ ۔ میں خریدا، آج وہ حصہ ۰۰ ۴ میں بکتا ہے، اصل حصہ سو روپے کا ہے، اس کی آمد سالانہ کبھی سو کبھی کم کبھی زیادہ ہے زید زکوٰۃ کس طرح دے، اور مفصل گذارش یہ ہے کہ کمپنی کی جائداد یعنی عمارت اور اس کی مشینیں سانچے وغیرہ یہ کل پچیس لاکھ روپے کی ہیں اور روپیہ جمع پچیس لاکھ ہیں، زید کے حصہ میں اگر یہ جائداد و روپیہ جمع ہوا تقسیم ہووے تو دو سو روپے آنے کی امید ہے، یہ تو جواب ہے اب بندہ پھر تفصیل سے عرض کرتا ہے، شروع کمپنی جب ہوئی تو ایک حصہ ایک سو روپے کا تھا، ایسے دس ہزار حصے کے خریدار لوگ ہوئے جس سے دس لاکھ روپیہ جمع ہو گیا اس کی ایک عمارت بنائی اور کچھ مشینیں لا کر نصب کر دی گئیں، پہلے سال سو روپے پر اس کمپنی نے نفع دس روپے تقسیم کیا تو ایک حصہ جو سو کا تھا دو سو روپے میں پہلے خریدار سے عمر نے خرید لیا، دوسرے سال بیس روپے ایک حصہ جو کہ سو کا تھا، اس پر تقسیم کئے، جس کی وجہ سے حصہ کی قیمت ۳۰۰ کی ہو گئی، عمرو سے ایک حصہ بکر نے ۳۰۰ میں خریدا ایسے ہی زیادہ نفع ہونے سے قیمت بڑھ گئی، اور بکر سے خالد نے ۴۰۰ میں خریدا پھر خالد سے زاہد نے ۶۰۰ میں خریدا، پھر زاہد سے اب زید نے ۰۰ ۔ میں خریدا؛ اب اس سال وہی ۴۰۰ میں بکتا ہے، سرمایہ اور عمارت وغیرہ جمع کی جاوے تو زید کو ۲۰۰ روپے حصہ میں آسکتے ہیں؛ اور سالانہ نفع کبھی سو روپے کبھی دو سو روپے کبھی ڈیڑھ سو روپے ایسا سوال یہ ہے کہ آمدنی سالانہ پر زکوٰۃ دیتے یا سرمایہ و جائداد کی قیمت کر کے

جو حصہ جس قدر زید کے حصہ میں آوے اس مقدار پر زکوٰۃ دے۔ یا اصل حصہ سنو کا تھا اس مقدار پر زکوٰۃ دے۔ یا آجکل اس کی قیمت ۰۰ ۲ کی ہوگئی ہے، اس مقدار پر زکوٰۃ دے، تحریر فرماویں

الجواب: جواب سے پہلے یہ مقدمات سن لینا چاہئیں۔

۱- تجارت کی اصل اور نفع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہے۔

۲- عمارات و آلات حرفہ پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

۳- مال حرام پر اگر وہ اپنی ملک میں مخلوط ہو جاوے زکوٰۃ ہے، مگر بقدر حق غیر دین ہونے کی سبب زکوٰۃ سے مستغنیٰ ہو جاوے گا۔

ان مقدمات کے بعد اب سمجھنا چاہئے کہ ابتدائی شرکت میں اصل شریک کا جو مثلاً سو روپے کا تھا، اس میں سے کچھ حصہ تو عمارات و آلات میں لگ گیا، اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی اور کچھ حصہ تجارت میں لگا، اس پر مع نفع کے زکوٰۃ واجب ہوئی، خواہ وہ نفع پورا اس شریک کو مل گیا ہو خواہ کچھ تقسیم ہو کر بقیہ سرمایہ میں شامل ہو گیا، مثلاً سو روپے میں بیس تو عمارات و آلات میں لگ جاویں، اور اسی تجارت میں لگ جاویں، اور اسی پر پندرہ روپے نفع ہو جس میں دس تو شریک کو ملے، اور پانچ سرمایہ میں داخل کر دیئے گئے، اب زکوٰۃ پچانوے روپے پر واجب ہوگی، پھر جب یہ حصہ مثلاً کسی نے خریدا تو حقیقت عقد کی یہ ہوگی کہ پچاسی روپے تو پچاسی روپے کے عوض میں ہو گئے۔ اور ایک سو پندرہ حصہ آلات و عمارت کے عوض میں کیونکہ بدون اس تاویل کے یہ بیع جائز نہ ہوگی، اب شبہ رہا تقابض کا، سو آلات و عمارات کے حصہ میں تو تقابض شرط ہی نہیں، اب حصہ پچاسی کا رہا، سو بیع صرف کی بنا پر تو تقابض فی المجلس ضرور تھا، جو یہاں ممکن نہیں، اس لئے اس کی صحت کا یہ حیلہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص صورۃً وعرفاً بائع ہے وہ مشتری کے حصہ سے پچاسی روپے قرض لیلے، پھر اس پچاسی روپے کا حوالہ اس پچاسی روپے سے کر دے، جو کہ کارخانہ میں اس کے امین یعنی مینجر کے قبضہ میں ہے، اور اسکو یہ مشتری اپنی طرف سے وکیل و امین بناتا ہے، پس حوالہ مع قبض الامین سے وہ پچاسی روپے اس مشتری حصہ کی ملک میں آگیا، اور معاملہ مکمل ہو گیا۔ اب یوم ملک سے حولان حول ہونے پر حساب کرنے سے دیکھا جائے گا۔ کہ علاوہ آلات و عمارات کے کل سرمایہ کتنا ہے، اور اس پچاسی روپے والے کا اس میں اصل اور نفع ملا کر کتنا ہے، اس مجموعہ پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اس قیمت کا اعتبار نہ ہوگا جس کے عوض میں یہ حصہ خریدا ہے، اسی طرح اگر یہ حصہ

کسی اور نے خریدا، یہی تفصیل تاویل اور احکام کی اس میں ہوگی، اور اگر بلا اس تاویل کے خریداری ہوئی، تو اگر قیمت کی مقدار حصہ سے زائد ہے، تو گو یہ عقد ناجائز ہے، مگر اس حصہ میں کسی کا حق نہیں، اس لئے زکوٰۃ صرف حصہ میں ہوگی، اور اگر قیمت کی مقدار حصہ سے کم ہے تو عقد بھی ناجائز ہے، اور زائد حصہ دوسرے شخص یعنی بائع کا حق ہے، مگر چونکہ اس مشتری کے قبضہ میں اور اس کی ملک میں مخلوط ہے، اس لئے زکوٰۃ مجموعہ میں ہوگی، مگر بقدر حق مذکور کے یہ شخص مدیون ہے، اس لئے اس حیثیت سے یہ مقدار زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوگی، البتہ اگر صاحب حق معاف کردے تو پھر باوجود خبث مال کے بوجہ دین نہ ہونے کے پھر مجموعہ پر زکوٰۃ ہوگی اور یہ بائع حربی ہے تو بنا بر روایت اباحت زیادۃ من الحربی یہ زائد حصہ حق غیر بھی نہ ہوگا۔ امید ہے کہ اس تقریر سے سوال کے سب اجزاء کا جواب ہو گیا، واللہ اعلم ۳ شوال ۱۳۳۹ھ

دوسرے علماء کو بھی دکھلا لینا یا خود غور کرلینا ضروری ہے۔

فصل تاسع سوال (۵۲۹) کپاس کی ایک مشین ہے، اس میں کچھ ہے، اس کا منافع ہر سال ملتا ہے، جو منافع ملتا ہے اس کی تو زکوٰۃ برابر دیدی جاتی ہے، اور جو روپیہ مشین میں لگا ہے اس روپے کی زکوٰۃ دینے کی ضرورت ہے یا نہیں، کیونکہ یہ مشین لوہے کی ہے، اس میں ہر سال مرمت بھی ضرورت پڑتی ہے، اور اس مشین میں بہت سے آدمیوں کا حصہ ہے چندہ سے ہے اس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہیں۔

الجواب۔ وہ مشین آلۂ صنعت ہے، مالِ تجارت نہیں لہٰذا اس میں زکوٰۃ نہیں، ۱۷ جمادی الثانی ۱۳۳۳ھ

تمت الضمیمۃ بتمامہا

تمت رسالۃ القصص السنی بتوفیق القادر الغنی

محض قرائن سے شریک پر خیانت کا الزام نہ آویگا بلکہ نقصان اگر ہوگا تو خسارہ سمجھا جاوے گا

سوال (۵۳۰) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس معاملہ میں کہ ایک شخص نے اپنے لڑکے کو دوسر شخص کے شریک کیا، اور لڑکے کے والد نے اس شریک سے یہ کہا کہ تم ہوشیاری سے کام کرو، اور لڑکے سے ہوشیار رہو، اور تالی صندوقچہ اور دوکان کی تالیاں اور حساب وکتاب تمہارے قبضہ میں رہے، مگر اس کے والد نے یہ نہیں کہا تھا کہ تم کہیں جاؤ تو ہمارے لڑکے کو دوکان پر چھوڑ کر نہ جانا، چنانچہ وہ شخص کھانا کھانے گیا یا نماز پڑھنے گیا، یا دہلی گیا تو دوکان ان کے لڑکے پر چھوڑی گئی۔ ڈیڑھ سال تک ایسا ہی برتاؤ رہا، تو بسبب کم فرصتی کے سالانہ حساب نہ کیا گیا۔ ماہواری منافع کو جو روزمرہ کی بکری سے زیر قلم ہوتا رہا، جوڑ کر ہر ماہ تقسیم کرکے وہ شخص تو لیتا رہا، کیونکہ وہ شخص غریب تھا منافع میں دو سو روپے اس کے جمع بھی ہوگئے تھے، دوکان میں چونکہ اس کے لڑکے کی شادی ہوئی اس نے وہ روپے منافع کے لیے، اور ان کے جمع ہوتے رہے، ڈیڑھ برس میں جو حساب دوکان کا کیا گیا ۔۔ ۹ عدد جوڑے قیمتی ایک ہزار ایک سو انیس روپے کے کم ہوئے تو اس کی جانچ کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس شخص کے لڑکے نے تماشبینی کی، جو شخص شریک تھا اس کو ڈیڑھ سال تک یہ نہ معلوم ہوا کہ اس قسم کا ہے، جب پھر اس کے والد نے یہ کہا کہ تم تالی صندوقچہ اور تالیاں دوکان کی ہمارے لڑکے کے سپرد کردو، چنانچہ جوتیاں شمار کرکے اور لکھ کرکے اپنے لڑکے کے قبضہ میں کیں برائے آزمائش کے سوا ماہ کے بعد جوتیاں جوڑی گئی ہیں کی کمی آئی اور ۔۔۔ ایک دوکاندار کے ہاں لے کر گیا اس کے ہاں نہ دیئے، چنانچہ وہ مجرا نہیں دیتا ہے، اس طرح سے ۔۔۔ کی کمی آتی ہے، اب از روئے شرع شریف کے اس کمی ایک ہزار روپے کا کون مستحق ہوتا ہے۔ بہت جلد مطلع فرمائیے گا، اور داخل حسنات ہوجے گا، فقط۔

الجواب : خیانت محض قرائن سے ثابت نہیں ہوتی اگر شہادت کافیہ یا اقرار خائن کا ہو تو خائن سے ضمان لیا جاوے گا، ورنہ دوکان میں خسارہ سمجھا جاوے گا، اور اس لڑکے کے والد سے ضمان نہ لیا جاوے گا، اول تو اس نے مطلع کردیا تھا دوسرے اس نے کچھ کفالت نہ کی تھی۔

۲۴ جمادی الاولی ۱۳۲۹ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۹۵)

مجرای یا عدم مجرائی منافع محصلہ بعض شرکا ریا متعلقین شان از جائداد مشترک

سوال (۵۳۱) کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ معروضہ ذیل میں، بینوا توجروا۔

ایک ریاست مشترکہ ہے، جس کی ہندہ زوجہ مورث اور چار پسران نابالغ و تین دختران بالغ وارث ہیں، ہندہ منتظم ریاست اور زید کارندہ کارپرداز جانب ہندہ ہے خاندان ہندہ میں دختران کا ترکہ پدری اپنے برادران کے حق میں بخوشی معاف کردینے کا رواج تھا اور دختران کے ساتھ کافی طور پر امداد ہمیشہ ہوتی ہے، اسی خیال سے ہندہ نے اپنی دختران کے ساتھ مراعات جاری رکھیں، عمرو ایک داماد ہندہ جو پسر زید کارندۂ ہندہ کا ہے، اس کو ہندہ نے ریاست کا کام کرنے کی اجازت دی؛ عمرو نے تحصیل وصول کا کام کیا، اور اکثر رقوم اپنے اور اپنی اہلیہ کے تصرف میں لگائیں، اور سفر حج کے واسطے ہندہ سے زر نقد بھی لیا، اب عمرو اپنی اہلیہ یعنی دختر ہندہ کے منافع کا مطالبہ کرتا ہے، ہندہ کا یہ عذر ہے کہ میں نے جو رقم بطور مراعات دیں، اور جو رقوم عمرو نے وصول کرکے اپنے تصرف میں لیں اور جو زر نقد سفر حج کے واسطے دیا گیا، یہ جملہ رقوم منافع میں منہا و محسوب ہوکر مابقی ادا کروں، عمرو کا یہ عذر ہے کہ ہندہ نے جو کچھ اپنی دختر کو بطور مراعات دیا نا قابل مجرائی ہے، اور جو زر نقد سفر حج کے واسطے لیا، وہ اس وجہ سے نا قابل مجرائی ہے، کہ عمرو نے اپنے پدر زید سے لیا، زید کا یہ بیان ہے کہ جو رقوم تمتع عمرو ریاست مشترکہ میں بنام عمرو درج ہوئیں، ان کو ہندہ نے بارہا وقت تذکرہ منافع زوجہ عمرو میں مجرا لینے کا ذکر کیا جس کا علم خود عمرو کو ہے، نہ زید کی وہ رقوم تھیں نہ زید نے عمرو کو دیں، صورت مسئولہ بالا میں جو رقوم ہندہ نے بطور مراعات دیں، اور جو رقوم عمرو نے خود وصول کرکے خرچ کیں اور جو ہندہ سے عمرو نے سفر حج کے واسطے حاصل کیں، یہ سب ہندہ کو منافع زوجہ عمرو سے مجرا پانیکا حق ہے یا نہیں، نیز دواب ریاست اور ملازمان سے جو مالکانہ طور پر عمرو نے کام لیا، اور سائر خرچ اور پیداوار باغ سے جو تمتع مالکانہ طور پر حاصل کیا اس میں بقدر تصرف عمرو کے ہندہ خرچ میں حصہ پاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب۔ اگر زوجہ عمرو کی جو کہ مورث کی دختر اور حقدار میراث ہے، خود ریاست مشترکہ سے کچھ لیتی، یا اپنے شوہر کو وکیل بناتی تو اس کا وصول کیا ہوا مال زوجہ عمرو کے حصہ میں مجرا کیا جاتا، لیکن عمرو خود حقدار نہیں ہے؛ اس لئے اس نے جس قدر ہندہ کی خوشی سے لیا وہ ہندہ پر پڑے گا، اور جس قدر زید سے بلا اذن ہندہ کے لیا وہ زید کے ذمہ سب ورثہ کا مشترک قرضہ ہے اور جس قدر عمرو نے خود لیا کہ نہ زید سے اجازت لی اور نہ ہندہ سے، اور ہندہ نے اسکو جائز بھی نہ رکھا ہو وہ عمرو کے ذمہ مشترک قرضہ سب ورثہ کا ہے، ان صورتوں میں زوجہ عمرو کے

حصہ میں مجرا نہیں ہو سکتا، زوجہ عمرو اپنا پورا حق لے گی، پھر ہندہ یا ورثہ زید کو یا عمرو سے جس کے ذمہ بھی جس کا قرضہ ہو وہ اس سے مطالبہ کرے گا۔ اور ہندہ کے خرچ میں حصہ پانے کا جو سوال کیا گیا ہے یہ میری سمجھ میں نہیں آیا، اگر تقریر بالا سے سائل کو اس جزو کا جواب سمجھ میں نہ آیا ہو تو مکرر واضح کر کے پوچھ لیں۔ ۴ رجب ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۴۹)

حکم مال اہل بیت کہ ایشان کسب کنند و مال مکسوب را کسے علیحدہ نمی دارد

سوال (۵۳۲) ایک استفسار آیا ہے جس کا جواب یہ سمجھ میں آتا ہے لیکن دو متضاد روایت نقل کر کے لکھا ہے کس کو ترجیح دی جاوئے۔ شامی فاروقی ص ۴۹ ج ۳ فصل فی الشرکۃ الفاسدۃ (تنبیہ) یوخذ من ھذا ما افتی بہ فی الخیریۃ فی زوج امرأۃ وابنہا اجتمعا فی دار واحدۃ واخذ کل منہما یکتسب علی حدۃ ویجمعان کسبہما ولا یعلم التفاوت ولا التساوی ولا التمیز فاجاب بانہ بینہما سویۃ الخ، چند سطر کے بعد لکھا ہے فقیل ھی للزوج وتکون المرأۃ معینۃ لہ الا اذا کان لہا کسبًا علی حدۃ فہو لہا وقیل بینہما نصفان زیادہ والسلام!

الجواب۔ میرے نزدیک ان دونوں روایتوں میں تضاد نہیں، وجہ جمع یہ ہے کہ حالات مختلف ہوتے ہیں جن کی تعیین کبھی تصریح سے کبھی قرائن سے ہوتی ہے، یعنی کبھی تو مرد اصل کاسب ہوتا ہے اور عورت کے متعلق عرفاً کسب ہوتا ہی نہیں وہاں تو اس کو معین سمجھا جاوے گا اور کہیں گھر کے سب آدمی اپنے لئے کسب کرتے ہیں، جیسا اکثر بڑے شہروں میں مثل دہلی وغیرہ کے دیکھا جاتا ہے وہاں دونوں کو کاسب قرار دے کر عدم امتیاز مقدار کے وقت علی السویہ نصف نصف کا مالک سمجھا جاوے گا۔ واللہ اعلم ۱۵ رمضان ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۶۹)

اشتراط التفاوت در ربح درمیان شرکاء

سوال (۵۳۳) چار شخصوں نے مل کر تجارت کی، اور باہم یہ بات قرار پائی کہ ایک سال دو شخص مال تجارت لیکر پردیس کو جاویں اور دو شخص اپنے وطن میں مکان پر رہیں اور دوسرے سال دو شخص جو مکان پر وطن میں رہے تھے وہ مال تجارت لیکر پردیس کو جاویں اور جو پردیس کو مال لے کر گئے تھے وہ وطن میں مکان پر رہیں، اب صرف دو ہی شخص مال تجارت لیکر پردیس کو جاتے ہیں اور دو شخص اپنے وطن میں مکان پر رہتے ہیں اب تحقیق طلب یہ بات ہے کہ جو شخص پردیس کو مال تجارت لے کر جاتے ہیں وہ ان دو شخصوں سے جو مکان پر رہتے ہیں اور مال تجارت لے کر پردیس کو نہیں جاتے منافع زیادہ لینے کے مستحق ہیں یا نہیں، اگر منافع زیادہ نہیں لے سکتے تو اپنا حق المحنت پردیس جانے بطور حق زادہ کے

لے سکتے ہیں یا نہیں، اگر اس سوال میں کوئی اور شق بھی رہ گئی ہو تو اس کا جواب بھی مرحمت فرما دیا جاوے، تاکہ تکمیل جواب ہو جاوے۔ اور حضور والا کو مکرر تکلیف نہ دی جاوے؟

الجواب، فی الدر المختار کتاب الشرکۃ، وشرطہا کون المعقود علیہ قابلا للوکالۃ فلا تصح فی مباح کاحتطاب وعدم ما یقطعہا کشرط دراھم مسماۃ من الربح لاحدھما لانہ قد لا یربح غیر المسمی وحکمہا الشرکۃ فی الربح فی رد المحتار تحت قولہ وحکمہا الشرکۃ واشتراط الربح متفاوتا عندنا صحیح فیما سیذکر، ج ۳ ص ۵۲۰ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ باہر جاتے ہیں وہ منافع زیادہ لے سکتے ہیں، مگر تنخواہ معین کر کے نہیں لے سکتے اور منافع جو زیادہ لیں گے وہ نسبت سے ہونا چاہئے، مثلاً دو ثلث یہ لیں گے اور ایک ثلث دوسرے شرکا جو باہر نہ جاویں گے، مثلاً، اور یہ جائز نہیں کہ بیس بیس روپے ماہوار لیا کریں گے، ۴ ذیقعدہ ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۸۰)

عدم رجوع شریک بر شریک دیگر بمنفق بلا اذن قاضی

سوال (۵۳۴) کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مسمی زید نے جائداد کثیر زمانۂ شاہی میں چھوڑی، اس کے بعد اغیار قابض جائداد ہو گئے۔ اور قریب سو برس کے اغیار قابض رہے، بعد انگریزی ہونے کے زید مذکور کی اولاد میں سے صرف چند نے دعویٰ کیا اور باقی اولاد نے کوئی دعویٰ وغیرہ نہیں کیا، جن چند نے دعویٰ کیا انھوں نے منجملہ کل جائداد کے ایک بہت بڑے جزو کی ڈگری پائی، جو ان کے حق سے بھی بہت کم ہے، ڈگری کے بعد سے ڈگری شدہ جزو پر وہ لوگ تنہا قریب پچاس سال سے قابض ہیں۔ اب دیگر اولاد زید مذکور میں سے بعض لوگ ڈگری یافتگان سے متقاضی حساب فہمی ہیں۔ تو آیا شرعاً یہ لوگ مستحق حساب فہمی ہیں، باوجودیکہ حصول جائداد میں ان لوگوں نے باوجود علم کے: کوئی کوشش کی، نہ کچھ خرچ، اور ان لوگوں کے جواب میں مورثوں نے عملاً ڈگری داران کو قابض جائداد تسلیم بھی کر لیا، بینوا توجروا۔

الجواب، فی الدر المختار المشترک اذا انہدم فابی احدھما العمارۃ ان احتمل القسمۃ لا جبر ویقسم والا بنی ثم اجرہ لیرجع بما انفق لو باذن القاضی والا فبقیمۃ البناء وقت البناء ج ۵ ص ۴۷۴، ح رد المحتار اس نظیر سے معلوم ہوا کہ صورت مسئول عنہا میں مدعین بھی حصہ جائداد کے مستحق ہیں، اور ان مدعین پر کوئی خرچ نہ پڑے گا، جو خلاص

جائداد میں صرف ہوا ہے ۱۶ ذیقعدہ ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۹۹)

عدم اختیار بعض شرکاء بعض را از دفن در گورستان مشترک

سوال (۵۳۵) گروہ اثنا عشریہ اہل کتاب و اہل قبلہ ہیں یا نہیں ان کو بلا مدت اور بلا خرید نے دوسرے گورستان کے نکال دینا از روئے شرع شریف انصاف ہو یا نہیں۔ اور تاوقتیکہ دوسرا گورستان نہ خریدا جاوے اس وقت تک یہ اپنے مُردے کہاں رکھیں، چنانچہ ان کی جائے زر خرید نہیں ہے، اور سرکاری جائے پر دفن کرنا خلاف قانون سرکار ہے۔ اس حالت میں ان کے لئے جو حکم کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو بہت جلد تحریر فرما دیں؟

الجواب۔ جب وہ زمین فریقین کے مشترک روپے سے خریدی گئی ہے تو بقدر نسبت باہمی ہر دو رقم کے وہ زمین دونوں فریق میں شرعاً مشترک ہوگی، یعنی دونوں فریق اپنا اپنا حصۂ رقم کے موافق اس زمین کے مالک ہوں گے، اور ہر مالک کو اپنی ملک میں تصرف کرنے کا حق حاصل ہے، کوئی کسی کو نہیں روک سکتا۔ نیز اہل تشیع سب خارج از اسلام بھی نہیں تاوقتیکہ وہ ضروریات دین کا انکار نہ کریں اس پر بھی اگر مصلحت یہی ہو کہ فریقین کے اموات مختلط طور پر مدفون نہ ہوں تو بقدر حصص اس زمین کو تقسیم کر لیا جاوے، اور درمیان میں حد قائم کر دی جائے، تاکہ دونوں کا قبرستان الگ الگ ہو جاوے۔ گویا ہم مجاورت رہے، اور اگر یہ زمین خرید کر سب مالکوں نے یا اُن کے وکیلوں نے صریح لفظوں سے وقف کر دی ہو تو دوبارہ سوال کیا جاوے اور وہ الفاظ وقف کے بھی سوال میں لکھے جاویں، اس وقت جواب دیا جاویگا، ۹ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ (تتمہ رابعہ ص ۱۵)

فاسد بودن عقد شرکت از شرط کردن عمل بریک شریک

سوال (۵۳۶) زید، بکر، عمرو تین شخصوں نے مساوی روپیہ لگا کر تجارت کی اور یہ قرار پایا کہ اس تجارت کو زید کرے، جو نفع ہو اس کا نصف تو زید کو ملے گا، اور نصف میں آدھا آدھا بکر اور عمرو کو، اور جو نقصان ہو اس کو تینوں شخص برابر برداشت کریں یعنی نفع ایک روپیہ ہو تو آٹھ آنے زید کے اور چار چار آنے بکر و عمرو کے۔ اور نقصان ایک روپیہ ہو تو سوا پانچ آنے ہر شخص برداشت کرے۔ تو آیا یہ صورت جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب۔ یہ شرکت ہے[۱] اور باوجود مساوات سرمایہ کے نفع میں تفاوت کی شرط بھی جائز ہے مگر

---

[۱] ایک شریک پر عمل کی شرط جائز ہے اور شرط تفاوت ربح میں یہ تفصیل ہے کہ اگر عمل یا کثرت عمل علی احد الجانبین مشروط فی العقد ہو تو عدیم العمل یا قلیل العمل کے لئے قدر راس المال سے زیادہ کی شرط صحیح نہیں، یہ شرط باطل ہوگی اور بقدر راس المال کے منافع میں شریک ہوگا عامل یا کثیر العمل کیلئے زیادہ ربح کی شرط صحیح ہے البتہ اگر عمل من احد الجانبین عقد میں مشروط نہ ہو بلکہ تبرعاً ایک شخص عمل کر رہا ہو تو غیر عامل کے لئے بھی زیادہ ربح کی شرط جائز ہے (رد المحتار) ۱۲۔ رشید احمد عفی عنہ

کام ایک شریک کے ذمہ ڈالنے کی شرط ناجائز، اس لئے یہ شرط فاسد ہوئی، نفع سب کو برابر ملے گا

سوال (۵۳۷) زید، عمرو، بکر نے مساوی روپیہ لگا کر تجارت کی، اور یہ کل رقم زید کو دیدی کہ تم کام کرو اور نفع میں تم چار آنے حق محنت پاؤگے اور بارہ آنے حصہ مساوی بلحاظ روپیہ تینوں میں تقسیم ہوں گے، اور اگر نقصان ہوگا تو نقصان تینوں مساوی برداشت کریں گے، نفع چار آنہ میں تم مضارب ہوا اور بارہ آنے میں شریک، تو آیا یہ صورت جائز ہے، کہ ایک شخص شرکا میں مضارب بھی ہو اور شریک بھی ہو؟

الجواب - ایک معاملہ میں دوسرے معاملہ کی شرط مفسد عقد ہے ایک معاملہ الگ ہو دوسرا اس طرح الگ ہو کہ وہ قبول وعدم قبول میں مختار رہے۔ اور حساب دونوں رقموں کا الگ رہے یہ جائز ہے۔ (تتمہ خامسہ ص ۳۶۶)

شرکت مال حرام در تجارت

سوال (۵۳۸) والد صاحب قبلہ نے پہلے غلہ کی تجارت کی تھی اس میں بہت نقصان ہوا، اب بجائے اس کے نمک کی سوداگری کی ہے، اور بفضلہ تعالیٰ صورت اچھی معلوم ہوتی ہے، ایک شخص شریک ہونا چاہتے ہیں، یہ صاحب پہلے پولیس میں ملازم تھے۔ اب معزول ہوگئے ہیں: مال ان کا مشکوک بلکہ غالب خراب ہے: ان کی شرکت کی نسبت کیا حکم ہے، نمک کی خریداری اس طرح ہوتی ہے کہ روپیہ سرکاری خزانہ میں ہر جگہ جمع کیا جا سکتا ہے، وہاں سے رسید لیکر سرکاری پرمنٹ گودام واقع چیس سانبھر کو بھیجدی جاتی ہے، اور نمک وہاں سے آجاتا ہے، یا نوٹ خرید کر کسی آڑتی کو بھیجدیئے جاتے ہیں، وہ نمک خرید کر بھیجدیتا ہے، ان صورتوں میں خراب روپیہ شامل کرنے میں کیا حکم ہے؟

الجواب - جن کا مال خراب ہے وہ کسی سے قرض لیکر شرکت کرلیں، پھر وہ قرض اپنے ذخیرہ سے ادا کردیں: اور بدون اس تدبیر کے خزانہ میں جمع کرنا یا نوٹ خریدنا اس خرابی کا رافع نہیں ہوسکتا، لان البدل فی حکم المبدل بخلاف القرض فانہ لیس بمبادلۃ کما لایخفی۔

(امداد جلد ۳ ص ۲)

ے سوال سابق کے جواب کا حاشیہ ملاحظہ ہو۔ ۱۲ رشید احمد عفی عنہ

کتاب القسمۃ

تقسیم مشترک

سوال (۵۳۹) عمرو زید ہر دو ایک مکان مشترک میں رہتے ہیں، اور ہر فریق کی تعمیر جداگانہ قبضہ وار علٰحدہ علٰحدہ ہے، اور صحن مکان وزینہ و پاخانہ و دروازہ مشترک ہے اور صحن مشترکہ جنوباً شمالاً ۷ گز ہے اور شرقاً غرباً ۸ گز، اور مکان ہر فریق کے جنوباً شمالاً بنے ہوئے ہیں، زید چونکہ ایک تونگر آدمی ہے، بغرض ایذا رسانی عمرو کے یہ کہتا ہے کہ نصف صحن میں ایک دیوار کر لو اور دروازہ و پاخانہ و زینہ بھی تقسیم کر لو، چونکہ زید کے پاس بوجہ امارۃ و دولت ظاہری اور مکان بھی ہیں، لہٰذا بعد تقسیم زید کو تنگی مکان مضر نہ ہوگی، اور عمرو کے پاس بجز اس مکان کے کوئی دوسرا مکان نہیں، اس کو تنگی صحن باعث ایذا و مضر صحت ہوگی، زید کا تقسیم پر مصر ہونا بغرض ایذا رسانی عمرو شرعاً جائز ہے یا نہیں۔

الجواب منجملہ شرائط تقسیم کے ایک شرط یہ بھی ہے کہ بعد تقسیم کے اُس شئے مشترک کی منفعت مقصودہ فوت نہ ہو، پس اس صورت میں صحن کی تقسیم تو جائز ہے، کیونکہ بعد تقسیم بھی منفعت صحن کی باقی رہتی ہے، اور پاخانہ اور زینہ اور دروازہ کی تقسیم جائز نہیں کیونکہ بعد تقسیم ان کی منفعت باقی نہیں رہ سکتی۔ وشرطہا عدم فوت المنفعۃ بالقسمۃ ولذا لا یقسم نحو حائط وحمام درمختار وقال الشارح تحت قولہ المنفعۃ ای المعہودۃ وھی ما کانت قبل القسمۃ اذ الحمام بعدہا ینتفع بہ کنحو ربط الدواب شامی ص۱۶۱ ہاں اگر دونوں شریک تقسیم چاہیں تو درست ہے، فقط ایک کے اصرار پر جائز نہیں، اما اذا رضی الجمیع صحت شامی ص ۱۶۱ فقط (امداد ج ۳، ص ۱۰۵)

تقسیم ماہی مشترک بلاوزن بحالیکہ تفاوت از جانبین

سوال (۵۴۰) مچھلی کے بچے ساجھے میں خرید کر کے تالاب میں چھوڑ دیئے گئے، جب بڑے بڑے ہوئے پکڑوا کر اندازے تقسیم کر لئے جاتے ہیں، اور دونوں اس بات پر راضی ہیں کہ اگر کسی کے حصے میں کچھ زیادہ گیا، تو وہ معاف ہے۔ اس کا دعویٰ نہیں، ایسی تقسیم جائز ہے، یا نہیں؟

الجواب چونکہ سمک عرفاً موزوں ہے۔ اور متجانس ہونا ظاہر ہے، اس لئے بلا وزن کے تقسیم اس کی جائز نہیں، فی ردالمحتار کتاب الاضحیۃ تحت قولہ لا جزافا ما نصہ

لان القسمة فیها معنی المبادلة ولو حل بعضہم بعضا الی قولہ واما عدم جواز التحلیل فلان الربوا لا یحتمل الحل بالتحلیل الخ ص ۳۱۰ ج ۵، اشرف علی ۲۰ شعبان ۱۳۳۶ھ

(تتمہ ثالثہ ص ۱۴۵)

کتابُ الزّراعة

عدم استحقاق زمیندار درختان کاشتکار

سوال (۵۴۱) جو درخت کہ کاشتکار لگاتے ہیں اُن کے لاپتہ ہوجانے یا مرجانے پر زمیندار کو کوئی حق مثل قبضہ و فروخت ثمر حاصل ہے یا نہیں؟ اور جائز ہے بھی یا نہیں؟

الجواب چونکہ درخت کا مالک وہ شخص ہے جو اس کو لگاوے، لہذا ایسے درخت زمیندار کی ملک نہ ہوں گے، البتہ زمیندار کو یہ اختیار ہر وقت حاصل ہے کہ کاشتکار کو مجبور کرے کہ ہماری زمین خالی کرو اگر وہ نہ مانے یہ اکھاڑ کر پھینک سکتا ہے، اگر لگانے والا مرجاوے اس کے وارث مالک ہوں گے، اور اگر کوئی وارث بھی نہ ہو یا خود وہ بے نشان ہوجاوے تو پہلی صورت میں وہ مساکین کا حق ہے، اس کو یا ثمر کو جب فروخت کریں گے دام مساکین کو دینے ہوں گے، اور اگر زمیندار خود کھاوے گا تو بھی اس کے دام لگا کر خیرات کرنا ضروری ہوگا، اور دوسری صورت میں یعنی جب بے نشان ہوجاوے اس کو نوے سال کی عمر تک کا انتظار کرکے اب کہیں گے کہ وہ مرگیا اگر اس کے وارث ہوں تو ان کا حق ہے، ورنہ پھر مساکین کا:

واللہ تعالےٰ اعلم، ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۲ھ (امداد ج ۳، ص ۱۰۵)

سوالات متعلقہ جواب بالا

سوال (۵۴۲) نمبر ا کاشتکار جو درخت لگتے ہیں اس کی صورت یوں ہے کہ انھوں نے زمیندار سے یہ کہہ کر زمین حاصل کی کہ آپ کوئی زمین بتادیجئے جس پر میں چار درخت لگادوں، جس کا مطلب رواجاً یہ ہے کہ درخت لگانے والا اپنی زندگی تک اس کا پھل کھائے گا اس کے مرنے یا لاپتہ ہونے پر زمیندار کو اس پر قبضہ کا حق حاصل ہے یہ جائز ہے یا ناجائز؟

نمبر ۲، اگر زمیندار لگائے ہوئے درخت پر بجبر قبضہ کرے تو یہ گوارا ہوسکتا ہے بمقابلہ اس جبر کے کہ دس بارہ برس تک جن درختوں کو کاشتکار نے نہایت جانفشانی سے بچوں کی طرح پرورش

کی ہو اس سے زمین خالی کرالی جائے، اگرچہ کاشتکار کو دبانے کا یہ جائز طریق ہو، لیکن کیا اس کی نقصان رسانی کی منشاء کے ساتھ بضرورت ہی ایسا کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

جوابات۔ نمبر ۱، غایۃ ما فی الباب اس کا حاصل یہ ہوگا کہ ایک امر واقع فی المستقبل پر زمیندار کے مالک ہونے کو معلق کیا ہے، سو تملیکات میں اس تعلیق کی صلاحیت نہیں ہوتی قمار کی حقیقت شرعاً یہی ہے، البتہ اگر کاشتکار تصریح وصیت کی کردے کہ جب میں مرجاؤں یہ درخت زمیندار کے ہیں تو یہ وصیت ہوجاوے گی، اور جس قدر احکام وصیت کے ہیں سب جاری ہوں گے، مثلاً ہر وقت کاشتکار کو اس وصیت کے واپس لینے کا اختیار حاصل ہوگا، اور مثلاً اس زمیندار کے اول مرجانے سے یہ وصیت باطل ہوجاوے گی، اور مثلاً ثلث ترکہ سے زائد میں جاری نہ ہوگی اور مثلاً یہ تبرع محض ہے، اس میں جبر یا شرط لگانا جائز نہ ہوگا، اور مفقود کا حکم اس کی نوے سال کی عمر ہونے سے پہلے احیاء کا ہے، اس کا مال امانت رہے گا، اور بعد اس مدت کے وہ میت ہے اس وقت وصیت کے احکام مذکورہ ملحوظ ہونگے۔

نمبر ۲۔ جب زمین کا خالی کرالینا جائز ہے واقع میں یہ جبر ہی نہیں، اگر کاشتکار اس کو جبر ناگوار سمجھے اس کا کوئی اعتبار نہیں اور بجبر قبضہ کرلینا چونکہ ناجائز ہے اجازت تو اس لئے نہیں رہا کاشتکار کا اس کو گوارا کرلینا یہ دلیل طیب خاطر کی نہیں، کیونکہ حقیقۃً اس کو گوارا نہیں بلکہ واقع میں تو ناگوار ہی ہے، لیکن دوسری ناگواری سے یہ ناگواری کم ہے، جب ناگواری ثابت ہے اس لئے گوارائی کو علت اجازت نہیں قرار دے سکتے، البتہ اگر سچ مچ گوارا ہے تو صاف لفظوں میں کہدے کہ میں آپ کو بخوشی ہبہ کرتا ہوں، بشرطیکہ قرائن سے معلوم بھی ہے کہ واقع میں طیب خاطر ہے، اور یہ عبارت سمجھ میں نہیں آئی "لیکن کیا اس کی نقصان رسانی الے قولہ یا نہیں" اگر اس جواب کے بعد بھی شبہ باقی ہو اس کو ذرا واضح عبارت سے مکرر پوچھا جاوے شاید یہ مطلب ہو کہ گو یہ طریق جائز ہو، لیکن اگر نیت نقصان رسانی کی ہے تب بھی جائز ہے یا نہیں، اگر یہ مطلب ہے تو جواب یہ ہے کہ طریق مروت کے خلاف ہوگا مگر گناہ بالکل نہ ہوگا واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۹ جمادی الاخریٰ ۱۳۲۲ھ (امداد، ج ۳ ص ۱۰۶)

تحقیق عدم جواز شرکت فی البذر بین المزارع واہل الارض

سوال (۵۴۳) السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اما بعد معروض خدمت اقدس ہے کہ رسالہ النور ماہ ربیع الاول ۱۳۵۰ھ کے صفحہ ۹ میں ہے۔ "**السوال**، نیرہ اور پھونس اور کڑب کا ہمارے یہاں یہ دستور ہے کہ

زمیندار اگر کسان کو نصف تخم دے تو نصف غلہ اور نصف پھونس لے اگر زمیندار تخم نہ دے تو پھونس کا حصہ کسان نہیں دیتا۔

الجواب۔ جائز ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مزارعت میں شرکت فی البذر بین المزارع واہل الارض ہی، بدائع ج ۶، ص ۱۸۰ مطبوعہ جمالیہ مصر میں ہے منہا ان یشترط فی عقد المزارعۃ ان یکون بعض من قبل احدھما والبعض من قبل الآخر وھذا لایجوز لان کل واحد منہما یصیر مستاجرا صاحبہ فی قدر بذرہ فیجتمع استیجار الارض والعمل من جانب واحد وانہ مفسد اھ اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شرکت فی البذر جائز نہیں، دونوں میں تطبیق کیا ہے ؟

الجواب۔ السلام علیکم، النور اور بدائع کو دیکھا آپ کی دونوں نقلیں صحیح ہیں واقعی مجھ سے جواب میں غلطی ہوئی، کیونکہ النور ہی میں اس سے متصل اوپر کی سطروں میں مزارعت کی جائز صورتوں کو ضبط کیا گیا ہےعہ، اور یہ صورت اُن کے علاوہ ہے، تو اس میں جواز کا شبہ ہی نہیں ہوسکتا، اتنا قریب ذہول ہوجانا عجیب ہے، واللہ اعلم ذہن کو کیوں غلط ہوا، بہرحال اس سے رجوع کرتا ہوں، اور انشاء اللہ تعالیٰ مستفتی مسئلہ مذکورہ کو بھی اطلاع کردی جاوے گی، اور ترجیح الراجح کے سلسلہ میں شائع بھی کردیا جائے گا۔ احتیاطاً اس مقام کے متعلق درمختار وردالمحتار سے بھی بقدر ضرورت نقل کرتا ہوں تاکہ اس صورت کا حکم بھی معلوم ہوجاوے اور جس قید کے ساتھ اس صورت میں جواز منقول ہے وہ بھی معلوم ہوجاوے،

نصہما فی الدر المختار دفع رجل ارضہ الی آخر علی ان یزرعہا بنفسہ وبقرہ والبذر بینہما نصفان والخارج بینہما کذلک فعملا علی ھذا فالمزارعۃ فاسدۃ ویکون الخارج بینہما نصفین ولیس للعامل علی رب الارض اجر لشرکتہ فیہ والعامل یجب علیہ اجر نصف الارض لصاحبہا لفساد العقد الی قولہ لاشتراطہ الاعارۃ فی المزارعۃ عمادیۃ فی رد المحتار قولہ فالمزارعۃ فاسدۃ لما سیذکرہ من اشتراط الاعارۃ قولہ لاشتراط الاعارۃ فی المزارعۃ ای اعارۃ بعض الارض للعامل فافہم الی قولہ واذا فسدت فالخارج بینہما علی قدر بذرہما وسلم لرب الارض ما اخذ لانہ نماء ملکہ فی ارضہ

عہ وہ سوال وجواب یہاں ص ۵۲۵ پر ہیں ۱۲

ويطيب للعامل قدر بذره ويرفع قدر اجر نصف الارض وما اتفق ايضا ويتصدق بالفضل لحصوله من ارض الغير بعقد فاسد ولو كانت الارض لاحدهما والبذر بينهما وشرطا العمل عليهما على ان الخارج نصفان جاز لان كلا عامل في نصف الارض بين فكانت اعارة لا بشرط العمل بخلاف الاول اھ اى فلم تكن مزارعة حتى يقال شرط فيها اعارة كما افاده في الفصولين وتمام هذا المسائل في الخانية فراجعها۔

۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۱ھ (النور، ص ۷ جمادی الاخری ۱۳۵۱ھ)

زراعت میں تخم ریزی اور کھیت کاٹنا وغیرہ کاشتکار کے ذمہ ہونے کی شرط

سوال (۵۴۴) شخصے زمین خود را بکشت کار بایں شرط داد کہ تخم و حصاد و خرمن کوبی ہم بر ذمہ مزارع بود بعد ازاں آنچہ حاصل آید نصف زارع راست ونصف اہل زمین را ایں معاملہ درست است یا نہ؟

الجواب۔ درست است فی الدر المختار وصح اشتراط العمل کحصاد ودیاس ونسف على العامل عند الثاني للتعامل وهو الاصح، ج ۵، ص ۲۷۵ (تتمہ اولیٰ ص ۱۹۶)

چند صور مزارعت وشرکت

السوال (۵۴۵) زید نے بکر کو ایک بیل کاشتکاری کے لئے خرید کر دیا، اور اپنی ہی ملک رکھا، اور شرائط یہ قرار پائیں کہ بیل کی خوراک اور نصف لگان زید کے ذمہ ہوگا، باقی اخراجات بکر کے ذمہ ہوں گے، مثلاً کھیتی کاٹنا، ہل چلانا، بیل کی خدمت وغیرہ اور آمدنی غلہ وغیرہ نصف نصف مابین زید و بکر ہوگا۔ یہ رواج ہمارے یہاں اس معاملہ کا عام ہے حضور ارشاد فرمادیں کہ یہ معاملہ درست ہے یا نہیں، اگر نہیں ہے تو کس صورت سے معاملہ کیا جائے؟

الجواب: یہ بات اس میں رہ گئی کہ زمین کس کی ہے۔ اب میں قاعدہ کلیہ بتلائے دیتا ہوں کہ اگر زمین کسی تیسرے شخص کی ہو تب تو یہ شرکت ہے، اور اس صورت میں ہر چیز دونوں کی ہونی چاہئے اور اگر زمین کسی ایک کی ہے تو صرف تین صورتیں اتفاقاً اور ایک صورت اختلافاً جائز ہے، باقی ناجائز۔ نمبر ا، زمین اور تخم ایک کا ہو اور بیل اور عمل ایک کا، نمبر ۲ زمین ایک کی اور عمل اور بیل اور تخم ایک کا، نمبر ۳۔ زمین اور تخم اور بیل ایک کا اور عمل ایک کا، نمبر ۴۔ زمین اور بیل ایک کا اور تخم اور عمل ایک کا اس میں اختلاف ہے، کذا فی الهدایہ ۱۱ شعبان ۱۳۴۹ھ (النور ص ۸۔ ربیع الاول ۱۳۵۰ھ)

گھاس پھونس کا نصف پر معاملہ

سوال (۵۴۶) نیز اور پھونس اور کرب کا زیرہ اور پھونس کرتے ہے

مراد مولیشیوں کا چارہ ہے) ہمارے یہاں یہ دستور ہے کہ زمیندار اگر کسان کو نصف تخم دے تو نصف غلہ اور نصف بھونس لے اگر زمیندار تخم نہ دے تو بھوتس کا حصہ کسان نہیں دیتا ہو

الجواب، جائز ہے۔ تاریخ مذکور (النور ص ۹ ربیع الاول ۱۳۵۵ھ)

باوجود تخم نہ دینے کے بھوسہ مقرر کرنا | **سوال** (۵۴۷) اگر زمیندار اور کسان کے مابین باوجود تخم نہ دینے کی حالت میں بھونس کا کوئی حصہ مقرر کر لیا جائے جس پر کسان بھی رضامند ہو جائے تو زمیندار کو لینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب اگر ثلث یا ربع وغیرہ مقرر کر لیا جاوے جائز ہے، اور اگر اس طرح مقرر ہو کہ اتنے من یا اتنے پیمانے تو جائز نہیں، تاریخ مذکور (النور ص ۹ ربیع الاول ۱۳۵۵ھ)

درخت لگانے میں بٹائی | **السوال** (۵۴۸) زمیندار نے اپنی زمین کاشتکاری کے لئے کسان کو دیدی، اور اسی زمین میں کچھ درخت پھل دار اور بے پھل دار مثلاً نیم، کیکر، شیشم وغیرہ جن کی لکڑی کار آمد ہو، زمیندار لگوانا چاہتا ہے کسان کے ہاتھ سے، اگر چوتھا یا پانچواں حصہ درختوں کا بھی اور پھل کا بھی کسان کا مقرر کر دیا جاوے تو یہ صورت درست ہے یا نہیں ؟

الجواب۔ درست ہے، اگر کوئی مدت معین کر دے، ورنہ درست نہیں کذا فی رد المحتار تحت قول الدر المختار دفع ارضا بیضاء الخ باب المساقاۃ۔

(النور ص ۹، ربیع الاول ۱۳۵۵ھ)

دفع ثمار خام بر شرط خدمت و شرکت نصفاً نصف | **سوال** (۵۴۹) اگر باغ کا پھل غیر پختہ اس طرح دیا جائے کہ اس کی برداخت تیرے اوپر ہے، جو پیداوار ہو گی نصفا نصف کیجائیگی یہ کیسا ہے ؟

الجواب، جائز ہے، فی الدر المختار ہی (ای المساقاۃ) دفع الشجر الی من یصلحہ بجزء معلوم من ثمرہ وہی کالمزارعۃ الخ، ۲۸ رمضان ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ، ص ۷۹)

تحقیق جواز کاشت افیون | **سوال** (۵۵۰) افیون کی کاشت جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب، جائز ہے (حوادث اول ۲ ص ۱۹)

حکم پیداوار کاشت بذرگاؤ خریدکردہ بمال حرام | **سوال** (۵۵۱) اگر چند شریک زراعت کریں، ان میں سے بعض کے بیل بقیمت حلال خرید کئے ہوں، اور بعض کے بقیمت حرام، تو جس کا بیل حلال قیمت سے ہے اس کی شرکت کرنا جائز ہے یا نہیں، یعنی غلہ مشترک جو کہ زراعت سے حاصل ہوا ہے تقسیم کے بعد حلال ہو گا یا حرام ؟

الجواب۔ اگر بیل حرام مال کے بھی ہوں مگر چونکہ وہ پیداوار کا آلہ ہے جزو نہیں ہے اس لئے پیداوار میں حرمت نہ آوے گی، اور غلہ مشترک حلال ہوگا، ۱۶ ذیقعدہ ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۹۹)

صورت جواز سود از کاشتکار موروثی

السوال (۵۵۲) یوپی کے اضلاع میں قانون موروثی جاری ہے یعنی کاشتکار کو حق دیا جاتا ہے کہ زمیندار کی زمین سے اپنی کاشت نہ چھوڑے لیکن اس کا لگان غیر موروثی زمین کے مقابلہ میں بہت ہی کم دلایا جاتا ہے، لیکن نالش کی صورت میں گورنمنٹ لگان پر سود دلاتی ہے، پس اگر زمیندار موروثی زمین کے لگان کی کمی کو سود کے نام سے کاشتکار پر نالش کر کے کاشتکار سے وصول کرلے تو شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، منافع کا تقوم موقوف ہے عقد اجارہ پر، اور صورت مسئول عنہا میں عقد پایا نہیں گیا، لہذا بنا مذکور فی السوال پر لینا جائز نہیں صرف ایک صورت جواز کی ہو سکتی ہے وہ یہ کہ کاشتکار سے تصریحاً کہدیں کہ موجودہ لگان پر (مثلاً دس روپے) ہم زمین دینے پر راضی نہیں اگر اتنا لگان (مثلاً بیس روپے) دینا ہو تو زمین کاشت کرو ورنہ چھوڑدو۔ اگر اس کے بعد وہ کاشت کریگا، تو بیس روپے کے لگان کو وہ تسلیم کرلیگا، اور اس پر بیس روپے واجب ہو جاویں گے اس وجوب کے بعد پھر اپنا حق واجب جس عنوان سے بھی ہو وصول کرے گا، وہ رقم مباح ہوگی ۴ جمادی الاولی ۱۳۵۳ھ (النور ص ۱۰، بابت ماہ جمادی الاولی ۱۳۵۳ھ)

زراعت بیع و شراء زمین ہندوستان

سوال (۵۵۳) کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسائل ذیل میں :۔

نمبر ۱۔ صوبہ یوپی میں زمینداریاں اور اراضیات صدہا سال سے زمینداروں کی اس طرح ملکیت میں ہیں کہ وہ بیع، ہبہ، تملیک، وراثت، وقف وغیرہ کے ذریعے ہر حکومت کے عہد میں بطور جائز ہمیشہ منتقل کرتے رہے ہیں، اور زمینداران اپنی اراضیات میں دوسروں سے کاشت کرا کر پیداوار میں سے یا نصف غلہ اور جنس کی بٹائی کر لیتے ہیں، یا زر نقد مقرر کر کے وصول کرتے رہتے ہیں، سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا ملکیت کی صورت اور کاشت کا طریقہ جو یوپی میں رائج ہے، اسلام کی پہلی صدیوں میں اس کا وجود ملتا ہے یا نہیں، زید کا خیال ہے کہ اس سسٹم (طریقہ) کا پتہ اسلام میں نہیں ہے

نمبر ۲۔ اس قسم کی اراضیات کی ملکیت اور اس طریقے سے دوسروں سے کاشت کرانا شریعت اسلامیہ اور فقہ کی رو سے جائز ہے یا نہیں، اور پیداوار میں سے مالک کے حق کی مقدار شریعت مقدسہ نے کس قدر مقرر کی ہے؟

نمبر ۳۔ اگر یہ ملکیت اور یہ طریقہ جائز ہے تو مالک اراضی کے لئے اپنے حقوق ملکیت کو اور اس قدر مفاد کو جس قدر کہ فقہ میں جائز قرار دیا گیا ہو محفوظ رکھنے کی نفس کوشش کرنا درست ہے یا ناجائز؟

نمبر ۴۔ زید کے اس دعویٰ کو صحیح فرض کرتے ہوئے کہ زمینداراں انگریزی شاہنشاہیت کی پیدا کردہ جماعت ہے اور انگریزوں نے اپنی حکومت کو مضبوط اور پائیدار بنانے کے لئے اس کی بنیاد ڈالی ہے ارشاد فرمایا جائے کہ موجودہ زمینداریاں اور ان کے حقوق مالکانہ جواب ارثاً یا شراءً یا ہبۃً یا متولیانہ ہیں وہ جائز طور پر ہیں یا ناجائز طریقے سے اور ان کا منافع از روئے شرع شریف جائز و حلال ہے یا حرام، اور اس منافع کو صدقات و کار ہائے خیر میں صرف کرنا صحیح ہے یا نادرست؟

نمبر ۵۔ زید کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ زمینداریاں مثل شراب کے ٹھیکہ کے ہیں جس طرح شراب کا ٹھیکہ فسخ ہوتا ہے اسی طرح زمینداروں سے ان کی مملوکہ زمینداریاں واراضیات بھی نکال کر کاشتکاران موجودہ کی ملکیت یا ان کے قبضہ مستقل مالکانہ مخالفانہ میں دی جاسکتی ہیں، اب فرمایا جائے کہ سوال نمبر ۴، ۵ کے اندر مذکور زمینداریوں کی شراب کے ٹھیکہ سے مثال دینا کیا صحیح اور جائز ہے، اور آیا مذکورہ زمینداریاں مالک کی مرضی کے خلاف بالکل مفت یا واقعی اور بازاری قیمت سے کم معاوضہ میں شرعاً منتقل ہو سکتی ہیں یا نہیں؟

نمبر ۶۔ مذکورہ بالا اراضیات کو مصارف خیر کے لئے وقف کرنا صحیح ہے یا غیر صحیح، اور ان اوقاف کا بھی جبریہ انتقال جائز ہے یا نہیں؟

نمبر ۷۔ ایسے انتقالات کرنے والوں میں اگر کوئی عالم یا غیر عالم مسلم بھی شامل ہو تو اسکو شرعاً اس حق تلفی کی مخالفت کرنا چاہئے یا نہیں؟

الجواب یہ تعامل تصرفات مالکانہ کا جب کوئی دلیل معارض نہ ہو، شرعاً خود دلیل مستقل ہے ملک کی، اور جب تمام حکومتوں نے نیز حکومت حاضرہ نے ان تصرفات کو قانوناً بھی جائز رکھا تو یہ ان کی طرف سے اس مالکیت کا اقرار اور تسلیم ہے، اور بتصریح فقہاء اقرار سے رجوع کرنا بدون رضائے مقرلہ کے جائز نہیں اور یہ حکم اس قدر ظاہر ہے کہ اس پر دلائل قائم کرتے بھی شرم آتی ہے، لیکن تبرعاً دلائل کی طرف بھی اجمالی اشارہ کرتا ہوں، وہ دلائل ابواب بیع و ہبہ و مزارعت و تقسیم غنائم و وقف وغیرہا کی احادیث اور بیع و ہبہ و اجارات و وقف وغیرہا کے مسائل فقہیہ ہیں، جن کی قدر مشترک نصاً و اجماعاً قطعی ہے، ثبوتاً بھی اور دلالۃً بھی، اور جو جواز شرعی کے مثل وقوع تاریخی پر بھی دال ہیں، بلکہ ان عقود میں جو صورتیں فاسد ہیں، یا امام صاحبؒ نے مزارعت میں کلام فرمایا ہے وہ بھی

دلیل ہے ملک کی، کیونکہ اس فساد کی علت عدم ملک نہیں کی گئی، بلکہ بعض عوارض سے فساد کا حکم کیا گیا، اور جب مالکوں کا حق صحیح ثابت ہو گیا تو اس کے لئے کوشش کرنا یقیناً جائز بلکہ بعض صورتوں میں طاعت واجب یا مستحب ہے، اور اس میں کوتاہی کرنے کو ناپسند فرمایا گیا ہے کما یدل علیہ حدیث ابوداؤد عن عوف بن مالک ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قضی بین رجلین فقال المقضی علیہ لما ادبر حسبی اللہ ونعم الوکیل فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ تعالیٰ یلوم علی العجز ولکن علیک بالکیس فاذا غلبک امر فقل حسبی اللہ ونعم الوکیل (رباب الاقضیة و الشہادات) حتیٰ کہ اس کی حفاظت میں جان جاتے رہنے کو شہادت فرمایا گیا ہے، حدیث من قتل دون مالہ فہو شہید اس میں نص ہے اور جب ان کی ملک صحیح ہے تو اس سے انتفاع کے حلال و طیب ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے الا لعارض، اور اول تو کثرت سے وہی اراضی ہیں جو حکومت حال سے پہلے سے زمینداروں کے پاس ہیں، انگریزوں کی دی ہوئی نہیں، لیکن جو انگریزوں کی بھی دی ہوئی ہیں دینے کے بعد ان کی ملک ہو گئیں، اور جب وہ مالک ہیں تو ملک اور ٹھیکہ کیسے جمع ہو سکتے ہیں، اس کو ٹھیکہ کہنا اور اس پر ٹھیکہ کے احکام کو متفرع کرنا خود باطل ہے اسی طرح جب وہ مالک ہیں تو ان کی مرضی کے خلاف اس میں کسی کا کسی قسم کا تصرف کرنا خواہ بعوض ہو یا بلا عوض خود حرام اور ظلم ہے، اور جب اراضی مملوکہ میں جو کہ فی نفسہ قابل انتقال ہیں ایسے تصرفات حرام ہیں تو اوقاف میں جو کہ قابل انتقال بھی نہیں ایسے تصرفات بدرجۂ اولیٰ حرام ہوں گے، اور ایسے ظلم کرنے والوں کے ساتھ اول تو شرکت ہی جائز نہیں، اور جو غلطی سے شرکت ہو گئی ہو تو ان مظالم کے علم کے بعد جدا ہو جانا واجب ہے اور جدا ہونے کے قبل بھی ان پر نکیر واجب ہے کما قال تعالیٰ لا تعاونوا علی الاثم والعدوان، وکما قال تعالیٰ لولا ینہاہم الربانیون والاحبار الآیہ، واللہ اعلم۔ کتبہ اشرف علی ۱۲ رجب ۱۳۵۵ھ (النور ص ۷، بابت ماہ شعبان ۱۳۵۵ھ)

کاشتکار کا گیہوں لگان کے بدلہ چھوڑ لینے کا حکم

سوال (۵۵۴) کاشتکار سے کاغذ صرف غلہ گندم کیلئے لکھایا گیا تھا، اور زبانی اس سے یہ معاہدہ کر لیا تھا کہ اگر ہم کو اپنی خواہش سے ضرورت چھوڑہ (دھان) لینے کی پیش آئی تو جس قدر ہم چاہیں گے خریف میں حسب ضرورت چھوڑہ لے لیا کریں گے، اگر ہمیں ضرورت نہ ہوئی چھوڑہ لینے کی تو کل غلہ گندم لیا کریں گے جس قدر چھوڑہ لیا کریں گے فصل خریف میں اسی قدر گندم وضع ہو جایا کریں گے۔

ف اس تقریر مختصر وجامع سے ساتوں سوالوں کا جواب حاصل ہو گیا ۱۲

فصل ربیع میں، اب ہماری خواہش اور مرضی پر ہے، مدت سے چھوڑہ لینے کا کوئی اتفاق بھی نہیں ہوا، کاشتکار ہمیشہ خواہش کرتا ہے، اگر فصل خریف چھوڑہ لے لیا جاوے، تو دوسری فصل ربیع میں اس کو آسانی ہو جاوے۔

الجواب۔ یہ تو متعلق معاہدہ ہے، جو دونوں کی مرضی پر ہے، یعنی یہ طے نہیں ہوا کہ ہم گندم کی عوض ضرور چھوڑہ لیں گے اور اس کاشتکار کی اس خواہش اور درخواست کا بھی کچھ ڈر نہیں کہ چھوڑہ لے لو۔

تتمہ السوال کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر فصل ربیع میں پیداوار کم ہوا، غلہ جارہ باقی کچھ جزو رہ گیا تب بھی زمیندار کو اختیار ہے وہ اپنی خواہش سے اگر ضرورت ہو بقایا غلہ میں کل چھوڑہ لے لے اگر چھوڑہ کی ضرورت نہ ہو تو فصل ربیع ہی میں اپنا غلہ پورا لے لیوے؟

الجواب۔ اس کا بھی کچھ حرج نہیں،

تتمہ السوال اور اکثر جگہ یہ عام رواج ہے، پانی پت میں سب جگہ ہے، جس قدر غلہ کاشتکار سے طے ہو جاتا ہے فصل خریف کی پیداوار میں مکی یا چھوڑہ ایک ثلث اور ربیع کی فصل میں غلہ گندم دو ثلث، اگر کاشتکار فصل خریف بوجہ عدم پیداوار مکی یا چھوڑ ایک ثلث نہ ادا کر سکے تو فصل ربیع میں کل گندم ہی پورا ادا کرے گا۔

الجواب۔ کیا غلہ سے گندم مراد ہے۔ اور لینے کے وقت مکی یا چھوڑہ لیتے ہیں، یا یہ کہ طے اسی طرح ہوتا ہے جیسے تفصیل لکھی ہے، ہر صورت کا حکم جدا ہے عبارت صاف نہیں

تتمہ السوال اب دریافت طلب یہ ہے کہ اپنی ضرورت سے کل غلہ گندم کے بجائے اسی قدر برابر چھوڑہ لے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب۔ لے سکتے ہیں، ایک شرط سے وہ شرط ذیل میں آتی ہے،

تتمہ السوال یا حسب ضرورت پانچ من چھوڑہ خریف میں وصول کیا، باقی ربیع میں پانچ من غلہ چھوڑہ وضع کرکے برابر باقی غلہ وصول کیا جاوے یہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب۔ یہ بھی جائز ہے اسی شرط مذکور سے، وہ شرط جواز کی یہ ہے کہ جس مجلس میں بات طے ہوئی ہے کہ مقرر شدہ گندم کے عوض مکی یا چھوڑہ لیں گے، خواہ کل گندم کے عوض یا جزو گندم کے عوض اسی مجلس میں اس مکی یا چھوڑہ پر قبضہ ہو جاوے، یہ نہ ہو کہ طے تو ہوا ایک مجلس میں اور قبضہ ہو دوسری مجلس میں، اگر فرض کیجئے کہ جس مجلس میں یہ مبادلہ تجویز ہوا ہے اس وقت گندم یا مکی موجود نہیں اور

اس لئے قبضہ نہیں ہو سکتا تو ایسا کرنا چاہئے کہ اس مجلس میں صرف وعدہ ہو جاوے کہ ہم اس طرح لے لیں گے، پھر جب کا شتکار دینے کے لئے مکی یا چھوڑ لاوے اُس وقت زبان سے پھر کہا جاوے کہ ہم یہ مکی یا چھوڑہ اتنے گندم کے عوض دیتے ہیں اور زمیندار کہدے کہ میں منظور کرتا ہوں یہ بہت آسان بات ہے۔ ۱۲ رجب ۱۳۵۵ھ (النور ص ۸ بابت ماہ رمضان ۱۳۵۵ھ)

جوابات متعلق استعفاء از کاشتکاری

سوال (۵۵۵) آجکل ایک فتویٰ حضرت کے دست مبارک کا لکھا ہوا خادم کے مطالعہ سے گذرا جس میں سائل نے حضرت سے کاشتکاری کے متعلق کچھ سوال کیا تھا اور استعفائے کاشتکاری کے متعلق چند عذر بیان کئے تھے جن کو ذیل میں درج کرتا ہوں:

۱۔ اگر میں استعفا دیدوں گا زمیندار کو نہ ملے گا، جو شریک کاشت ہے وہ لے لیگا، قانوناً وہ مستحق ہوگا؟

۲۔ اس کاشت کے نو زمیندار ہیں۔

۳۔ استعفا میں پچیس روپے میرے خرچ ہوں گے،

۴۔ گھر والے یعنی شریک کاشت دشمن ہو جائے گا،

۵۔ مقدمہ لڑے گا تو میں تھانہ بھون نہ آسکوں گا تا فیصلہ بہیں رہنا پڑے گا۔

۶۔ زمیندار کہتا ہے آپ استعفا نہ دیں، کچھ لگان مقررہ سے زیادہ دیدیجیے، میں بخوشی اجازت کاشت دیتا ہوں، ان سب عذروں کے بعد حضرت نے تحریر فرمایا کہ اس صورت میں گناہ نہ ہوگا دریافت طلب جواب میں یہ بات ہے کہ صورت مسئولہ میں باضابطہ استعفا کی ضرورت نہیں محض زبانی معاملہ کر لینا کافی ہوگا؟

الجواب۔ فی نفسہ کافی ہے، مگر عارض سے نفی کفایت کی ہو سکتی ہے۔

تتمۂ **سوال** (۵۵۶) اور عذروں کے متعلق یہ امر دریافت طلب ہے کہ کس عذر پر یہ حکم متفرع ہے؟

الجواب، نمبر ۶ پر۔

تتمۂ **سوال** ــــــ اور عذر مندرجہ نمبر (۱) کے متعلق یہ گذارش ہو کہ اگر مستعفی کی شہادت وغیرہ سے زمیندار کو مل سکے تو مقدمہ کی زیر باری مستعفی اٹھاوے اور شہادت دے یا نہیں۔؟

الجواب۔ ضرور دے

تتمۂ **سوال** ــــــ اور عذر نمبر ۲ کے متعلق یہ عرض ہے کہ اگر ایک ہی زمیندار ہو تو کیا کرنا چاہئے

الجواب۔ رضا پر مدار ہے، تعدد پر نہیں

تتمہ **سوال** ——— اور عذر نمبر ۳ کے متعلق یہ عرض ہے کہ اگر خرچہ استعفار زمیندار دے تو کیا حکم ہے؟

الجواب - پس یہ عذر نہ رہے گا،

تتمہ **سوال** ——— اور عذر نمبر ۴ کے متعلق یہ عرض ہے کہ استعفار حکم شرعی ہے، اس میں گھر والوں کی مخالفت کا خیال کیا جائے گا؟

الجواب ، نہیں، مگر یہ مستقل عذر نہیں ،

تتمہ **سوال** ——— اور عذر نمبر ۵ کے متعلق یہ گذارش ہے کہ اگر کوئی شریک کاشت نہ ہو اور مقدمہ لڑنے والا کوئی نہ ہو، اس صورت میں کیا حکم ہے ؟

الجواب - اس واقعہ کو دخل نہیں ؟

تتمہ **سوال** ——— اور عذر نمبر ۶ کے متعلق یہ عرض ہے کہ زمیندار جو اس بات پر راضی ہوا کہ استعفار نہ دیا جائے اور کچھ بیشی مقرر کر لی جائے اس وجہ سے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر دیدیا جائے گا تو مجھے تو ملے گا نہیں، شریک کاشت لے لیگا، تو بہتر یہی ہے کہ کاشتکار سابق کے پاس رہے، کہ ان سے کچھ تو مجھے بیشی مل جائے گی،

الجواب - جو رضا طیب خاطر سے نہ ہو کالعدم ہے

تتمہ **سوال** ——— اور اس عذر کے متعلق ایک نئی بات اور دریافت کرتا ہوں کہ اگر زمیندار اس خیال سے کہ ان کو نکال کر کچھ فائدہ نہ ہوگا دوسرا ہی لے لیگا، لگان سابق ہی پر راضی ہو گیا تو یہ صورت جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب - اس کا مدار وہی طیب خاطر ہے

سوال ——— اور اس مسئلہ کے متعلق اتنی اور عرض ہے کہ حضرت نے سفر اعظم گڈھ بمقام بھاگلپور میں فرمایا تھا کہ استعفار کاشتکاری ضروری ہے تاکہ اس کی اولاد اس کے بعد مدعی کاشتکاری نہ ہو، صورت مسئولہ میں اس صورت پر نگاہ نہ کی جائے گی ؟

الجواب ، ضرور کی جائے گی، انتقال الی الاولاد کے قبل باضابطہ استعفا ضروری ہی نمبر ۵ میں عارض سے ایسے امور مراد ہیں ان سائل کو یہ سب تمبر سمجھا دیجئے، (تتمہ خامسہ ۵۹)

حکم نشاندن درخت در زمین زمیندار **سوال** ——— نمبر (۱) ایک مسئلہ اور دریافت کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں کا دستور ہے کہ لوگ غیر آباد زمین میں انبہ و جامن کے درخت لگاتے ہیں اور زمیندار کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، اور نہ پھل وغیرہ کچھ لیتا ہے، ہاں جب

درخت لگانے والا درخت کو فروخت کرتا ہے تو قیمت میں سے زمیندار چہارم یعنی چوتھائی قیمت لیتا ہے، اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ اس کا پھل وغیرہ کھانا درست ہے یا نہیں، اگر نہیں درست ہے تو کیا کیا جاوے زمیندار سے اجازت لے لی جاوے۔ یا درخت خرید لیا جاوے۔

نمبر ۲۔ اور اس دستور کے موافق زمیندار کی زمین پر بلا اجازت درخت لگانا جائز ہے یا نہیں

نمبر ۳۔ اور اگر بلا اجازت لگا دیا تو درخت کس کا ہوگا؟

جواب نمبر (۱) پھل کھانا درست ہے، اگر زمیندار کی اجازت ہو صراحۃً یا دلالۃً۔

نمبر (۲) بلا اجازت درست نہیں، لیکن اجازت عام ہے صراحت و دلالۃ کو۔

نمبر (۳) لگانے والے کا، مگر مالک زمین جب چاہے زمین خالی کرالے، رجب ۱۳۳۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۰۶)

شرائط اعتبار اجازت زمیندار کاشتکار موروثی را

سوال (۵۵۰) نمبر (۱) زمیندار اگر بطیب خاطر یہ کہدے کہ تم اپنی کاشتکاری برتا بقض ہو مجھے کچھ رنج و ملال نہیں، میری مالگذاری مجھے وقت پر دیا کرو۔ بس اسی میں خوش ہوں، اس بات کو کاشتکار کے رو برو بھی کہا، اور غیبت میں بھی اور لوگوں سے کہا یہ کاشتکاری جائز ہے یا نہیں؟

نمبر ۲، اور اس کے مرنے کے بعد بھی دوسرے زمیندار کے وقت میں یہ کاشتکاری جائز رہے گی یا اس کی رضامندی لینا ہوگا؟

نمبر ۳۔ اور اس کا یہ کہنا کہ میں نے ہمیشہ کے لئے دیدیا، یہ کچھ کام کرے گا یا نہیں؟

الجواب، نمبر (۱) یہ کہنا اس لئے کافی نہیں کہ مستقبل میں رضامندی اس شخص کی معتبر ہوتی ہے کہ جب چاہے اپنے اس تبرع سے رجوع بھی کر سکے، اور یہاں اس پر قدرت نہیں، اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ یہ کاشتکار ایک دفعہ باقاعدہ استعفا دیدے کہ وہ موروثیت ٹوٹ جاوے اور پھر کرایہ پر لے لے جائز ہے،

نمبر (۲) خود اصل ہی کے لئے وہ کہنا کافی نہیں اس کے لئے تو کیسے ہوگا، اور اگر اصل کے لئے بھی فرضاً کافی ہوتا تب بھی اس کے لئے ناکافی تھا، جیسا ظاہر ہے۔

نمبر (۳) بالکل لغو ہے، ۹ ربیع الاول ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۱۳۲)

کتاب الشرب

منع آب خیر کہ دران ماہی مملوکہ باشند

سوال (۵۵۸) اکثر ملاح مچھلی کے بچے دریا سے پکڑ کر بیچتے ہیں اور لوگ خرید کر گڑھے میں پالتے ہیں، جن میں آسمانی پانی جمع ہوتا ہے، تو مچھلی کی حفاظت کے لئے پانی روکنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب۔ اگر یہ زمین اپنی ملک ہو اور دوسرا پانی قریب ہو تو روکنا جائز ہے، جبکہ اس کے لینے سے مچھلی کو ضرر ہو، ۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ ص ۲۶)

منع آب غدیر عظیم کہ دراں ماہی مملوکہ وغیر مملوکہ باشند

سوال۔ (۵۵۹) اور ایسے ہی اگر بڑے تال میں مچھلی پالدیا جس میں قدرتی مچھلی بھی ہو تو اس میں بھی مچھلی روکنا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب، نہیں، تاریخ بالا، (تتمہ ثانیہ ص ۲۶)

کتاب الذبائح والاضحیۃ والصید والعقیقۃ

حکم قربانی ، بمیت وحکم لحم آن اضحیہ

سوال (۵۶۰) گائے یا اونٹ کی قربانی میں دو تین آدمی شریک ہوں ان میں سے ایک نے یا ایک سے زائد نے یہ خیال کیا کہ جب سات آدمی تک گائے یا اونٹ کی قربانی میں شریک ہو سکتے ہیں تو میں رسول اللہ صلعم یا اور کسی بزرگ کی طرف سے یا اور کسی اپنے عزیز قریب دوست کی طرف سے خواہ وہ زندہ ہیں یا ان کا انتقال ہو چکا ہے شریک ہو جاؤں اور سات حصے پورے کر لوں اور ان کی طرف سے بقدر حصہ قیمت ادا کروں یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، جائز ہے کیونکہ حی اور میت کی طرف سے قربانی کا یکساں حکم ہے فی الدر المختار وان مات احد السبعۃ وقال الورثۃ اذبحوا عنہ وعنکم صح الی قولہ لقصد القربۃ من الکل اھ۔ واللہ اعلم۔ ۱۸ ذیقعدہ ۱۳۲۰ھ (امداد ج ۲، ص ۱۱۲)

سوال (۵۶۱) میت کی طرف سے اگر قربانی کی جائے تو اس کے گوشت کی تقسیم کا کیا حکم ہے؟

الجواب فی الدر المختار ج ۵ ص ۲ من ضحی عن المیت یصنع کما یصنع فی اضحیۃ نفسہ من التصدق والاکل والاجر للمیت والملک للذابح قال الصدر والمختار انہ ان بامر المیت لا یاکل منہا والا یاکل بزازیۃ وسیذکرہ فی النظم اھ اس روایت سے معلوم ہوا کہ قربانی میت کی طرف سے دو طور پر ہے، ایک یہ کہ میت اپنے ترکہ میں سے قربانی کرنے کی وصیت کر مرا اس قربانی کا تمام گوشت مساکین کو دینا واجب ہے، دوسرے یہ کہ کوئی شخص اپنے مال سے تبرعاً میت کی طرف سے قربانی کرے، اس میں قربانی کرنے والے کو اختیار ہے جتنا چاہے کھائے جتنا چاہے دے خواہ کل خود کھالے، فقط واللہ اعلم، ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۲۴ھ (امداد ج ۲ ص ۱۱۵)

سوال (۵۶۲) متوفی کی طرف سے قربانی کرنے کا کیا مطلب ہے آیا اپنی طرف کا ایک حصہ قربانی کرکے اس متوفی کو ثواب پہنچادے، یا مثل دیگر شرکاء زندہ کے اس کا نام حصہ پر قرار دے کر قربانی کرلے۔

الجواب۔ دونوں طرح درست ہے، فقط یکم ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۷۵)

حکم چرم قربانی وحکم صرف کردن آں در مدارس وحکم چرم دادن غنی را

سوال (۵۶۳) اس وقت مدرسہ کی یہ حالت ہے کہ اکثر لڑکے مسکین وغریب کے پڑھتے ہیں اور کچھ طلباء باہر کے بھی ہیں مدرسہ میں پڑھتے ہیں اور غنی کے بھی لڑکے پڑھتے ہیں، مگر بعض لوگ جو غنی ہیں مدرسہ میں چندہ بھی دیتے ہیں، مگر چندہ کافی نہیں ہو سکتا زیادہ پائداری قربانی کی کھال ہی سے معلوم ہوتی ہے، تو آیا قربانی کی کھال فروخت کرکے مدرس کی تنخواہ دینا جائز ہے یا نہیں، اور مدرسہ کے دوسرے مصرف میں خرچ کرنا جائز ہے یا نہیں، اور مدرسہ کے کس کس مصرف میں جائز ہے۔ یا کسی میں جائز نہیں۔ جیسا آپ تحریر فرمائیں ویسا کیا جائے، اور غنی کو قربانی کی کھال دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب ۔ فی الدر المختار فان بیع اللحم او الجلد بہ ای بمستہلک او بدراہم تصدق بثمنہ فی رد المختار وسکت عن بیع اللحم بہ ای بما ینتفع عینہ للاختلاف فیہ الی قولہ والصحیح انہما سواء الخ، ان روایتوں سے دو امر معلوم ہوئے، ایک یہ کہ کھال کے دام کا تصدق واجب ہے پس غریب طلباء کی اعانت کے سوا دوسرے مصارف میں صرف کرنا جائز نہیں دوسرا امر یہ کہ غنی کو کھال بعینہ دیدینا جائز ہے، لیکن اگر اس سے یہ غرض حاصل کرنا ہو کہ اہل قربانی غنی کو دیدیں پھر وہ غنی بیچ کر جہاں چاہے صرف کرے، سو اس کی صحت کے لئے دو شرط ہیں اول یہ کہ دینے والے اسی کو مالک بنانے کی نیت کردیں، ایسا نہ ہو کہ ایک بار اس طریق کے مشتہر

کرنے کو کافی سمجھا جاوے، کیونکہ جب تک دینے والے لفظی تصریح نہ کریں، کہ ہم خاص تم ہی کو دیتے ہیں تم مالک ہو اس وقت تک ظاہر اور غالب عوام کی حالت سے یہی ہے کہ وہ نیت مدرسہ میں صرف کرنے کے دیں گے، اور اس صورت میں وہ غنی مالک نہ ہوگا، بلکہ وکیل ہوگا، جس کی بیع بمنزلہ صاحب قربانی کے ہے، اور پھر تصدق واجب ہوگا، جس کی وجہ سے بجز طلبا ر غربار کے دوسرے مصارف مندرجہ سوال میں صرف کرنا درست نہیں، دوسری شرط یہ ہے کہ مالک بھی حقیقتاً بنایا جائے صرف حیلہ نہ ہو جس کی علامت اور امتحان یہ ہے کہ اگر یہ غنی اس کو بیع کرکے اپنے خاص حوائج میں خرچ کرے تو اہل عطا کو ناگوار اور گراں نہ ہو اور اس کی شکایت و مذمت یا دل میں اس سے کدورت وانقباض نہ کریں، اور اگر ان دو شرطوں میں سے ایک بھی مفقود ہوگی تو وہ غنی مالک ہی نہ ہوگا، بلکہ وکیل ہوگا جس کا حکم بضمن بیان شرط اول گذر چکا ہے، خوب سمجھ لیا جاوے اور مدرسہ چلانے کی ضرورت سے نامشروع افعال کسی طرح مشروع و مباح نہیں ہو سکتے واللہ اعلم، ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ (امداد ج ۲ ص ۱۱۴)

سوال (۵۶۴) قربانی کی کھال کی قیمت سے مدرس کو تنخواہ دینا جائز ہے یا نہیں، اگر جائز ہے تو اس کا ثبوت کیا ہے؟

الجواب - فی الدر المختار ویتصدق بجلدها الی قوله فان بیع اللحم او الجلد به او بدراهم تصدق بثمنه ، فیه والصدقة کالهبة بجامع التبرع وحینئذ لا تصح غیر مقبوضة الخ

ان روایات سے معلوم ہوا کہ قیمت چرم قربانی کا تصدق بطور تبرع کے واجب ہے، اور ظاہر ہے کہ مدرسین کو تبرعاً نہیں دیا جاتا، لہذا تصدق واجب ادا نہ ہوگا، اس لئے جائز نہیں، علی ہذا جس میں تملیک و قبض نہ ہو، جیسے مساجد وغیرہ میں خرچ کرنا یہ بھی جائز نہیں، جیسا دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم، ۲ ربیع الاول ۱۳۲۴ھ (امداد ج ۲ ص ۱۱۵)

سوال (۵۶۵) چرم قربانی مدارس میں دینا یا اس کی قیمت جائز ہے یا نہیں اور در صورت جواز متولی کو مدرسہ کی ضرورت کے واسطے چرم کو بیع کر کتابیں، فرش وغیرہ بنانا یا خریدنا بلا تملیک جائز ہے یا نہیں؟

الجواب ، مدارس میں مصارف مختلف ہیں، مصرف جائز میں صرف کرنے کے لئے مدارس میں دینا درست ہے اور متولی وکیل ہے مالک کا جو تصرف مالک کو درست ہے متولی کو بھی درست ہے

جس کی تفصیل یہ ہے کہ یا تو کھال کسی حاجت مند طالب علم کو مثلاً دیدے یا خود کھال کی کوئی چیز بنوا لیجاوے جیسے کتابوں کی جلدیں یا ڈول وغیرہ بنوالے یا خود کھال کے عوض اگر مل سکے ایسی چیز بدل لے جو باقی رہ کر کام آسکے، جیسے فرش وکتاب ولباس وامثال ذالک اور یہ سب صورتیں قبل بیع ہیں، اور اگر کھال کو بعوض روپیہ کے بیچ ڈالا تو اس وقت بجز اس کے کہ کسی حاجت مند کو تملیکاً دیدے اور کسی محل میں صرف کرنا اس کا جائز نہیں، سو ان داموں سے کتابیں یا فرش وغیرہ خریدنا درست نہ ہوگا، اور اگر ایسا کیا تو ان چیزوں کا تصدق واجب ہوگا، اور اگر تصدق کے وقت کسی وجہ سے ان کی قیمت کم ہو جاوے تو اس کمی کا اپنے پاس سے ضمان دینا ہوگا، اور وہ ضمان بھی تصدق کیا جاوے گا۔ فی الدر المختار ویتصدق بجلدها او یعمل منه نحو غربال وجراب وقربة وسفرة ودلو او یبدله بما ینتفع به باقیا کما مر لا بمستهلك كخل ولحم ونحوه كدراهم فان بیع اللحم او الجلد به ای بمستهلك او بدراهم تصدق بثمنه اھ فی رد المختار کما مر ای فی اضحیة الصغیر وقال فی اضحیة الصغیر وما بقی یبدل بما ینتفع الصغیر بعینه کثوب وخف فی رد المختار ظاهره انه لا یجوز بیعه بدراهم ثم یشتری بها ما ذکر ویفیده ما نذکره عن البدائع وفی رد المختار قبیل باب الرجوع فی الهبة والصدقة کالهبة وقال فی الدر المختار فی بدء کتاب الهبة هی تملیك الخ مجانا اھ قلت فافاد اشتراط التملیك فی الصدقة فحیثما وقع التصدق یجب فیه التملیك فقط والله تعالیٰ اعلم، ۵ جمادی الاولیٰ ۲۳ھ (امداد ج ا ص ۱۶۱)

صرف چرم قربانی نوودن وغیرہ

سوال (۵۶۲) بعض جگہ دستور ہے کہ قربانی کی کھالیں مسجد کے خادم یا سقوں کو دیدیتے ہیں اگر نہ دی جائے تو جھگڑا ہوتا ہے اس صورت میں قربانی میں تو کوئی فرق اور خرابی تو نہیں آتی۔

الجواب۔ قربانی میں تو کسی حال میں فرق نہیں آتا مگر یہ امر کہ یہ فعل جائز ہے یا نہیں سو اس کا یہ حکم کہ اگر یہ کھالیں بعوض خدمت دی جاتی ہیں اس طرح کہ مشروط یا معروف ہے تو جائز نہیں کیونکہ یہ مبادلہ ہے بمقابلہ منافع خدمت کے جس میں معنے بیع کے ہیں اور بیع اسی غرض سے منہی عنہ ہے اور اگر تبرعاً دی جائے تو جائز ہے چونکہ تبرعات میں جبر حرام ہے اس لئے جھگڑنا جائز نہیں۔ فقط واللہ اعلم (امداد ج ۲ ص ۱۱۲)

سوال (۵۶۷) قربانی کی کھالوں کا روپیہ آیا ہوا تنخواہ مدرسین میں دینا جائز ہے یا نہیں اور طلبہ کو بطور انعام کے دینا جائز ہے یا نہیں، ہندو ہوں یا مسلمان غنی ہوں یا فقیر فقط

الجواب - فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ جب تک کھال فروخت نہ ہو ہر شخص کو اس کا دیدینا اور خود بھی اس سے منتفع ہونا جائز ہے، اور جب فروخت کردی تو اس کی قیمت کا تصدق کرنا واجب ہے، اور تصدق کی ماہیت میں تملیک ماخوذ ہے، اور چونکہ یہ صدقہ واجب ہے اس لئے اس کے مصارف مثل مصارف زکوٰۃ کے ہیں، پس مدرسین کی تنخواہ میں اس کا صرف کرنا جائز نہیں، البتہ غریب مسلمان طالب علم جو زکوٰۃ کا مصرف ہو سکے، اس کو بطور انعام یا امداد خوراک و پوشاک تملیکاً دیدینا جائز ہے اور ہندو اور غنی اس کے مصارف نہیں، فقط

(امداد جلد اول ص ۶۸)

السوال (۵۶۸) جناب کے رسالہ بہشتی زیور حصہ سوم صفحہ ۴۸ میں قربانی کے مسائل کے سلسلہ میں تحریر ہے کہ قربانی کی کھال یا تو یوں ہی خیرات کردے یا بیچ کر اس کی قیمت خیرات کردے حضور کی اس تحریر کے موافق ہمارے ملک میں عوام الناس قربانی کی کھال بہ نیت خیرات فروخت کرکے خیرات کردیتے ہیں، لیکن امسال ایک شخص حضور کے اس فرمان کی مخالفت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ قربانی کا چمڑا بہ نیت خیرات فروخت کرنا مکروہ تحریمی ہے، لہٰذا جواب سے جلد مستفید فرماویں فقط۔

الجواب - قال العینی فی شرح الکنز ولا یبیعہ بالدراھم لینفق الدراھم علی نفسہ وعیالہ والمعنی انہ لا یتصرف علی قصد التمول واللحم بمنزلۃ الجلد فی الصحیح حتی لا یبیعہ بما لا ینتفع بہ الا بعد الاستھلاک ولو باعھا بالدراھم لیتصدق بھا جاز لانہ قربۃ کالتصدق باللحم والجلد اھ یہ عبارت نص ہے بہشتی زیور کے مسئلہ کی صحت میں اور مخالف کے قول کی عدم صحت میں، واللہ اعلم

۵ محرم ۱۳۵۳ھ (النور ص ۷، جمادی الاولیٰ ۱۳۵۳ھ)

حکم ذبح فوق العقدہ

سوال (۵۶۹) عقدہ کے اوپر جانور ذبح ہو یا درمیان تو کھانا اس جانور کا حلال ہے یا حرام؟

الجواب - اس میں علامہ شامی نے بہت سا اختلاف نقل کرکے یہ فیصلہ کیا ہے، کہ

تجربہ کاروں سے دریافت کرنا چاہیے کہ فوق العقدہ ذبح کرنے سے تین رگیں منجملہ چار رگ یعنی حلقوم و مری و ودجین کے قطع ہو جاتی ہیں یا نہیں، اگر قطع ہو جاتی ہوں تو حلال ہے ورنہ حرام، ۱۴ رمضان ۱۳۲۱ھ (امداد ج ۲ ص ۱۱۳)

سوال (۵۷۰) کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ عروق ذبح کون کون ہیں اور ذبیحہ کی کل عروق قطع نہ ہوویں تو ذبیحہ درست ہے۔

الجواب، عروق ذبح ایک حلقوم ہے یعنی سانس آنے جانے کی راہ جس کو نرخرا کہتے ہیں، دوسری مری یعنی طعام و شراب کی راہ، تیسرے چوتھے ودجین یعنی دونوں شہ رگ جو حلقوم اور مری کے چپ و راست ہیں، وعروقہ الحلقوم والمری والودجان درمختار اگر کل عروق قطع نہ ہوں تو تین کا کٹ جانا کافی ہے وحل المذبوح بقطع ای ثلاث منہا، درمختار (امداد ج ۲ ص ۱۱۶)

سوال (۵۷۱) مذبوح فوق العقدہ کا کیا حکم ہے، حلال یا حرام یا مکروہ؟

الجواب۔ مذبوح فوق العقدہ میں فقہاء کا اختلاف ہے، بعض کے نزدیک مطلقاً حرام ہے، بعض کے نزدیک مطلقاً حلال ہے، چنانچہ طحطاوی نے یہ سب اختلاف نقل کئے ہیں اور جانبین کے دلائل ذکر کئے ہیں لیکن ترجیح حرمت کو دی ہے اور کہا ہے کہ احتیاط متفق علیہ میں ہے، یعنی مذبوح تحت العقدہ بالاتفاق حلال ہے، اسی کو حلال کہنا چاہیے، اور مختلف فیہ سے احتراز واجب ہے، قال صاحب المواہب یتعین الذبح بین الحلق واللبۃ تحت العقدۃ وقیل مطلقا وکذا قال ابن کمال باشا لم یجز فوق العقدۃ وافتی بعضہم بالجواز ومال الزیلعی الی تعین الذبح تحتہا وکذلک الشمنی وذکر نحوہ ملا علی وذکرہ الشرنبلالی عن الزیلعی واقرہ وقال الاتقانی عن الرستغفنی ویجوز اکلہا سواء بقیت العقدۃ مما یلی الراس او مما یلی الصدر وشنع علی من افتی بالحرمۃ فی ذلک والذی ظہر لی ان الحق قول الزیلعی ومن معہ وعلی کل فالاحتیاط فی المتفق علیہ طحطاوی مختصر الکلکتی، ج ۴ ص ۱۵۰ واللہ اعلم۔ ۲۳ جمادی الاولی ۱۳۱۲ھ (امداد ج ۲ ص ۱۱۴)

سوال (۵۷۲) اگر کسی بکرے ..... کا ذبح کرتے وقت ٹیٹوا سب کا سب دھڑ کی طرف چلا جاوے تو ایسے ذبیحہ کا کھانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، اگر فوق العقدہ ذبح کرتے ہیں مری اور حلقوم اور ودجین کٹ جاویں تو ذبیحہ

ملہ اس سے رجوع ص ۵۰۳ میں مطلب ہے ۱۲

حلال ہو، یہ بات اہل تجربہ سے تحقیق کرنا چاہئے، اور جس نے اس صورت میں حرام کہا ہے اس بنا پر کہ اس طرح ذبح کرنے میں عروق نہیں کٹتے، پس اگر یہ بنا صحیح ثابت نہ ہو تو حرمت کا حکم ثابت نہ ہوگا،
۲۶ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۰۴)

سوال (۵۷۳) ہدایہ میں ہے الذکاۃ ذبحی اختیاریۃ کالجرح فیما بین اللبۃ واللحیین اور قاضی خاں میں ہے ومحل الذکاۃ فی المقدور ذبحہ اہلیاً کان او وحشیاً الحلق کلہ لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام الذکاۃ ما بین اللبۃ واللحیین، اور سراجیہ میں ہے موضع الذکاۃ الاختیاریۃ ما بین اللبۃ واللحیین،

ان عبارتوں میں سے میں نے یہ سمجھا ہے کہ حالت اختیار میں محل ذبح کا جس ہڈی پر دندان قائم ہیں اس کے نیچے سے سر سینہ تک، اب عرض کرتا ہوں کہ یہ سمجھ میری صحیح اور مفتی بہ ہے یا نہیں

الجواب: آپ عبارتوں کے معنی صحیح سمجھے ہیں، مگر گفتگو یہ ہے کہ یہ مابین مطلق ہے، یا مخصوص اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ عروق خاصہ کا کٹنا ضروری ہے، مگر بعض نے اپنے مشاہدہ سے دعویٰ کیا ہے کہ فوق العقدہ کاٹنے سے یہ عروق نہیں کٹتیں اس لئے انہوں نے اس مابین کا مصداق تحت العقدہ کہا ہے، تو اس کی تحقیق تشریح عروق سے ہر شخص کر سکتا ہے
فقط ۲ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۳۴)

سوال (۵۷۴) جناب حضرت مولانا مولوی محمد اشرف علی صاحب سلمکم اللہ تعالیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ مطلب کہ آنچہ دربارۂ مذبوحہ فوق العقدہ فتویٰ اوشان باشد ازان مطلع فرمودہ باشند و از مولانا خلیل احمد صاحب نیز جواب خواستہ بندہ شدہ است و از مدرسہ دیوبند شریف نیز جواب باین الفاظ اقول باللہ التوفیق حل المذبوح فوق العقدۃ ہو الراجح روایۃً ودرایۃً فقط واللہ تعالیٰ اعلم، کتبہ الاحقر عزیز الرحمٰن عفی عنہ مفتی دار العلوم دیوبند) آمدہ است اکنون آنچہ بنظر اوشان موجب شریعت غرا آمدہ است ارسال داشتہ باشند تا عند الناس مشکور بودہ باشند،

نقل تحریر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مد ظلہ العالی

مکرم محترم جناب حاجی شیر محمد شاہ صاحب سلمکم اللہ تعالیٰ، گرامی نامہ مع تحریر فریقین مسئلہ ذبح العقدہ میں پہنچا، اس مسئلہ میں مجھ کو سالہا سال سے تحقیق کا اتفاق ہوا ہے، اور میں نے اس کی تحقیق کے لئے خود گائے کا سر ننگا کر کے دیکھا ہے، میرے نزدیک محرمین جو یہ کہتے ہیں کہ

اگر ذبح فوق العقدہ ہوگا تو حلقوم اور مری قطع نہیں ہوں گے، صحیح نہیں ہے، منشا اس کا عدم تجربہ ہے دیکھو حلقوم عقدہ پر منتہی نہیں ہوگیا، بلکہ سر کی طرف عقدہ سے اوپر تک چلا گیا ہے لہٰذا یہ دعویٰ کہ اگر ذبح فوق العقدہ واقع ہوگا تو حلقوم اور مری قطع نہ ہوں گے، نہایت تعجب انگیز ہے، اور یہ ایک ایسا قول ہے کہ نہ اس کی کتاب اللہ سے تائید ہوتی ہے نہ حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بلکہ حدیث الزکاۃ ما بین اللبۃ واللحیین خود اس کو مصدق ہے اس کے متعلق جس قدر روایات مولانا محمد سعد اللہ صاحب انصاری مفتی خیر پور نے لکھی ہیں کافی ووافی ہیں، مجھ کو اس سے زیادہ لکھنے کی حاجت نہیں لیکن صرف آپ کے اطمینان کے لئے امام شمس الائمہ سرخسی کی مبسوط سے نقل کرتا ہوں، وان نحر البقرۃ حلت و یکرہ ذلک کما بینا ان السنۃ فی البقر الذبح قال اللہ تعالیٰ ان اللہ یامرکم ان تذبحوا بقرۃ بخلاف الابل فالسنۃ فیہ النحر وھذا لان موضع النحر من البعیر لا لحم علیہ وما سوی ذلک من حلقہ علیہ لحم غلیظ فکان النحر فی الابل اسہل فاما فی البقر اسفل الحلق واعلاھا فاللحم علیہ سواء کما فی الغنم فالسنۃ فیہ ایسر والمقصود تسییل الدم والعروق من اسفل الحلق الی اعلاہ فالمقصود بالقطع فی ای موضع کان منہ فلھذا احل وھو معنی قولہ علیہ السلام الذکاۃ ما بین اللبۃ واللحیین ولکن ترک الاسہل مکروہ فی کل جنس لما فیہ منہ زیادۃ ایلام غیر محتاج الیہ مبسوط جز ۱۲ کتاب الذبائح۔

الجواب من اشرف علی

حلت و حرمت دونوں قولوں میں اختلاف کا مبنیٰ صرف یہ ہے کہ ذبح فوق العقدہ میں حلقوم اور مری قطع ہوں گے یا نہیں، سو یہ امر مشاہدہ کے متعلق ہے، مشاہدہ کے بعد اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں۔ اور چونکہ مشاہدہ قطع کا روایت ثقات سے محقق ہو چکا اس لئے اس کی حلت کا حکم دیا جاوے گا، مدت ہوئی کہ احقر نے اس کی حرمت کا فتویٰ کتب فقہ سے نقل کیا تھا، اب اس سے رجوع کرتا ہوں، ۲۳ ذیقعدہ ۱۳۳۹ھ (ترجیح خامس ص ۱۲۲)

جواز اختیار ذبیحہ بعوض چرم ذبیحہ دیگر وحکم تصدق برشرکائے ذبیحہ

سوال (۵۰۵) جو جانور صدقہ نافلہ کی نیت سے ذبح کیا جائے اس کی کھال میں جو فقراء اور مساکین کا حق ہے اس طور پر تصرف کرنا کہ کھال بیچکر کھال کے داموں سے دوسرا جانور صدقہ کی نیت سے

لیا جاوے اور اس کو ذبح کر کے کھال کی قیمت کی بجائے فقراء اور مساکین کو گوشت تقسیم کیا جاوے درست ہے یا نہیں۔

(۲) صدقہ نافلہ کے لئے چند لوگوں نے چندہ کر کے جانور خریدا، اور چندہ دینے والوں میں بعض لوگ فقیر اور محتاج بھی ہیں، تو اب اس جانور کا گوشت ان فقراء اور محتاج لوگوں کو جو چندہ میں شریک ہیں دینا کیسا ہے، اگر درست نہیں ہے تو یہ حیلہ جواز کے لئے کافی ہو سکتا ہے یا نہیں کہ مثلاً پانچ آدمی ایک ایک روپیہ کے شریک ہیں تو گوشت کے پانچ حصے کر کے ایک حصہ مثلاً زید کا ایک عمرو کا ایک فلاں کا ایک فلاں کا علیحدہ علیحدہ کیا گیا، اور زید کے حصہ سے عمرو کو اور عمرو کے حصہ سے زید کو گوشت دیا گیا؟

الجواب، درست ہے! قبل تقسیم اگر ایسا کیا تو اس میں جس قدر خود اس شخص کا حصہ ہے جس کو گوشت دیا گیا ہے وہ صدقہ نہ ہوگا، اور بعد تقسیم اگر ایک نے دوسرے کو دیدیا سب کا صدقہ ادا ہو جاوے گا، لیکن اگر پہلے سے یہ شرط ٹھیرالی تو ثواب کی امید نہیں، بلکہ اگر اس شرط کے خلاف کر لے سے جبر یا نزاع کا احتمال ہو تو معصیت ہوگی،

۱۵ شوال ۱۳۲۱ھ (امداد ج ۱ ص ۱۵۶)

حکم دادن قیمت چرم قربانی در جانز ریلوے	**سوال** (۵۷۶) قیمت چرم قربانی حجاز ریلوے میں دینا کیسا ہے، درست ہے یا نادرست؟

الجواب۔ چونکہ قیمت چرم قربانی میں تملیک واجب ہے، اور چندہ ریلوے میں تملیک نہیں ہوتی اس لئے اس میں دینے سے ادا نہ ہوگا، ۷ ذی الحجہ ۱۳۲۱ھ (امداد ج ۲ ص ۱۱۳)

حکم قربانی گوسپند کہ بشیر خنزیر پرورش یافتہ	**سوال** (۵۷۷) بکری کا بچہ جس نے سور کے دودھ سے پرورش پائی ہو حلال ہے یا نہیں اور اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں

الجواب فی الدر المختار کما حل اکل جدی غذی بلبن خنزیر لان لحمہ لا یتغیر وما غذی بہ یصیر مستہلکا لا یبقی لہ اثر فی رد المحتار ان ابن المبارک قال معناہ اذا اعتلف ایاما بعد ذلک کالجلالۃ وفی شرح الوهبانیۃ انہ یحل اذا ذبح بعد ایام والا لا، ان روایات سے معلوم ہوا کہ وہ بچہ حلال ہے، لیکن کئی روز تک اس کو دوسرا چارہ دینا چاہئے اس طرح قربانی بھی درست ہے، فقط واللہ اعلم

۱۷ رمضان ۱۳۲۲ھ (امداد ج ۲ ص ۱۱۳)

حکم قربانی جانور خریدکردہ از نیلام کانجی ہاؤس وحکم ادخال جانوردران

سوال (۵۷۸) نیلام کانجی ہاؤس سے کوئی جانور خریدنا اور اس کی قربانی کرنا جانوروں کا کانجی ہاؤس بھیجنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، فی الدر المختار وان غلبوا (اہل الحرب) علی اموالنا واحرزوہا بدارہم ملکوہا، اور عملہ کانجی ہاؤس نائب ہیں مستولین کے پس اس استیلاء تملک کا سے وہ جانور ملک سرکاری ہوجائے گا، لہذا بیع کے وقت اس کو خریدنا جائز ہے، اور جب یہ بیع صحیح ہوئی ملک میں داخل ہوگیا قربانی بھی اس کی درست ہے، البتہ عرفاً بدنامی کا موجب ہے اس لئے بلا ضرورت بدنام ہونا بالخصوص مقتدا کے لئے زیبا نہیں اور کانجی ہاؤس میں جانور کو داخل کرنا اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی جانور کھیت میں خود گھس گیا ہے اس کا داخل کرنا تو بالکل جائز نہیں کیونکہ اس میں مالک پر ضمان نہیں تو اس سے کچھ لینا یا لینے میں اعانت کرنا ظلم ہے، اور اگر کسی نے قصداً جانور کو کھیت وغیرہ میں داخل کردیا ہے اس پر بقدر اتلاف ضمان ہے، اس مقدار تک اگر کانجی ہوس میں یا ویسے ہی اس سے وصول کیا گیا تو جائز ہے اور اس سے زائد بطور جرمانہ کے ناجائز ہے کیونکہ یہ تعزیر بالمال ہے، اور حنفیہ کے نزدیک منسوخ ہے، کما صرحوا بہ فی الدر المختار آخر باب جنایۃ البہیمۃ ادخل غنما او ثورا او فرسا او حمارا فی زرع او کرم ان سائقا ضمن ما اتلف والا لا وقیل یضمن وقال الشامی مرجحا للقول الثانی اقول ویظہر ارجحیۃ ہذا القول الموافقۃ لما مر اول الباب من انہ یضمن ما احدثتہ الدابۃ مطلقا اذا ادخلہا فی ملک غیرہ بلا اذنہ لتعدیہ واما لو لم یدخلہا ففی الہدایۃ ولو ارسل بہیمۃ فافسدت زرعا علی فورہا ضمن المرسل وان مالت یمینا او شمالا ولہ طریق آخر لا یضمن لما مر اھ

۵ محرم ۱۳۲۳ھ (امداد ج ۲ ص ۱۱۳)

سوال (۵۷۹) مویشی نیلام شدہ کانجی ہاؤس کہ جو مالک کے پاس سے خواہ بطور آوارگی یا بذریعہ چوری کانجی ہاؤس میں بند کی گئی ہے، چوری کی تشریح یہ ہے کہ کوئی چور مویشی لایا، اور اس نے کسی الزام سے بچنے کی غرض سے کانجی ہاؤس میں کردی، گورنمنٹ مالک کو کسی ذریعہ سے اطلاع نہیں دیتی، پندرہ روز کانجی ہاؤس میں رکھ کر اپنے اختیار سے نیلام کردیتی ہے اور اس کی قیمت خود سرکار رکھ لیتی ہے ایسے مشتری نیلام کو جائز ہے کہ وہ اس مویشی کو قربانی کرے یا نہیں؟

الجواب ان دونوں حالتوں میں شرعاً قیمت کا تصدق واجب ہے، خود رکھنا درست نہیں جب بائع کی نیت قیمت خود رکھنے کی ہو اور مشتری کو معلوم ہو تو اس کا خریدنا اعانت علی غیر

المشروع ہے اس لئے درست نہیں، اور استیلاء کا مسئلہ یہاں غامض ہے،

۲۲ ذیقعدہ ۱۳۳۹ھ (حوادث خامسہ ص ۴۶)

حکم قربانی گاوے کہ پوست شاخش دور شدہ باشد

سوال ( ) جس گائے کا ایک سینگ کی خول اتر جاوے اور گودی سینگ کی نہ ٹوٹے تو اس کی قربانی درست ہے یا نہیں؟

الجواب - ایسی گائے کی قربانی درست ہے کذا فی الدر المختار ورد المحتار واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۵ رمضان ۱۳۲۳ھ (امداد، ج ۲ ص ۱۱۴)

قربانی کے جانور کے سینگ کا ٹوٹنا عیب ہے یا نہیں حضرت علی کی حدیث میں جو کسر قرن کا عیب ہونا مذکور ہے اس کے معنی

سوال ( ) ۱؎ سینگ ٹوٹنا داخل عیب قربانی ہے یا نہیں ۲؎ اگر ہے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے تو ہر سینگ میں کس قدر شکست داخل عیب ہے، اور ہر ہر سینگ کا مستقل لحاظ ہوگا یا مجموعہ کا کرنا پڑے گا؟

الجواب، ۱؎ نہیں، کذا فی رد المحتار، ۲؎ وہ حدیث محمول ہے اولویت پر یا مکسور الی المخ پر۔ ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۲۹ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۳۷)

سینگ اگر مغز تک ٹوٹ گیا ہو تو اس قربانی کا عدم جواز

سوال ( ) قاضی خاں جلد چہارم صفحہ ۳۳۴ میں لکھا ہے: یجوز الجماء فی الاضحیۃ وھی التی لا قرن لھا خلقۃ وکذلک مکسور القرن اس عبارت کا مطلب میں نے یہ سمجھا کہ جس جانور کا سینگ بالکل یعنی مغز سمیت ٹوٹ گیا ہو قربانی اس کی بلا کراہت درست ہے یہ سمجھ میری درست ہے یا نہیں بتلا دیجئے۔

الجواب - آپ کا یہ سمجھنا بوجہ اس کے کہ اس کے خلاف کتب میں مصرح ہے صحیح نہیں، فی رد المحتار فان بلغ الکسر الی المخ لم یجز قہستانی ج ۵ ص ۳۱۵

۹ ذیقعدہ ۱۳۳۰ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۳۸)

عدم جواز قربانی گاوے کہ شاخش از بیخ رفتہ باشد

سوال (۵۸۳) ایک گاؤ واسطے قربانی کے ہے، کہ جس کے سینگ دونوں جڑ سے ٹوٹ گئے ہیں اور اندر کے گودے یعنی ہڈی نہیں ٹوٹی ہے، تو ایسے جانور کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، فی رد المحتار ویضحی بالجماء ھی التی لا قرن لھا خلقۃ وکذا العظماء التی ذھب بعض قرنھا بالکسر او غیرہ فان بلغ الکسر الی المخ لم یجز قہستانی وفی البدائع

ان بلغ الکسر المشاش لایجزئ والمشاش رؤس العظام مثل الرکبتین والمرفقین
جب گائے کے سینگ ٹوٹ گئے تو اندر کی جو ہڈی جوڑ کی ہے جس کے اندر مغز ہے، وہاں
تک شکستگی پہونچ گئی، پس بر روایت مذکورہ اس کی قربانی جائز نہیں، گو اندر کی ہڈی
نہ ٹوٹی ہو، واللہ اعلم، ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ (امداد ج ۲، ص ۱۱۵)

عدم وجوب قربانی بر فقیر بہ نیت قربانی در جانور معین

سوال (۵۰۴) ایک شخص غیر صاحب
نصاب نے موسم قربانی میں ایک جانور قربانی کیا، اور ایک بزغالہ جو اس کی ملک تھا اس کو
اشارہ کر کے کہا کہ بسال آئندہ انشاء اللہ اسے قربانی کریں گے، آیا یہ نیت منعقد ہو گئی، اور اس
جانور کی قربانی واجب ہو گئی یا اس کے بدلے دوسرا بھی کر سکتا ہے؟

الجواب، فی رد المحتار تحت قول الدر المختار وفقیر شراها لها ما نصه فلو کانت
فی ملکه فنوی ان یضحی بها او اشتراها ولم ینو الاضحیة وقت الشراء ثم نوی بعد ذلک
لا یجب لان النیة لم تقارن الشراء فلا تعتبر بدائع، بنا بر اس روایت کے صورت مسئولہ
میں اس شخص پر اس بزغالہ کی قربانی واجب نہیں، فقط یکم جمادی الثانیہ ۱۳۲۵ھ (امداد ج ۲ ص ۱۱۶)

حکم ذبیحہ کتابی و اہل یورپ

سوال (۵۰۵) کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ ذبیحہ کافر کتابی
و ذبیحہ مسلم تارک الصلوٰۃ اور فروختہ ہندو کیسا ہے؟

الجواب، ذبیحہ کتابی کا بنص قرآنی حلال ہے۔ قال اللہ تعالیٰ وطعام الذین
اوتوا الکتاب حل لکم ای ذبائح الیہود والنصاری جلالین، مگر شرط یہ ہے کہ غیر خدا
کے نام سے ذبح نہ کرے ورنہ حرام ہے۔ فی الدر المختار الا اذا سمع منه عند الذبح ذکر
المسیح علیه السلام، اور بعض فقہاء نے شرط لگائی ہے کہ کتابی یہودی معتقد الوہیۃ
عزیر علیہ السلام و نصرانی معتقد الوہیۃ عیسیٰ علیہ السلام نہ ہو، مگر عامہ روایات مطلق ہیں مگر
احتیاط یہ ہے کہ موضع اختلاف سے تحرز کریں، ہکذا حققه العلامة الشامی فی رد المحتار، ذبیحہ
تارک الصلوٰۃ کا حلال ہے، کیونکہ نماز شرائط جواز ذبح سے نہیں، فی الدر المختار وشرط کون
الذابح مسلما الخ من غیر تقییده بالمصلی، ذبیحہ فروختہ ہندو حلال نہیں، اگرچہ وہ کہے کہ
اس کو مسلمان نے ذبح کیا ہے، واصله ان خبر الکافر مقبول بالاجماع فی المعاملات لا فی
الدیانات در مختار وفی رد المحتار عن التاتارخانیة عن جامع الجوامع لابی یوسف
من اشتری لحما تعلم انه مجوسی واراد الرد فقال ذبحه مسلم یکره اکله اه ومفاده

ان مجرد کون البائع مجوسیا تثبت الحرمۃ اھ البتہ اگر وقت ذبح سے وقت اشترا تک کوئی مسلمان اس کو دیکھتا رہے اس وقت حلال ہے۔ (امداد ج ۲ ص ۱۱۶)

سوال ۔ (۵۰۰) حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم ای ذبائحھم کما اجمع علیہ المفسرون تو کیا بلاد یورپ کے سفر کرنے والے مسلمانوں کو وہاں کے حلال مواشی کا ذبیحہ کھانا درست ہے یا نہیں۔

الجواب ۔ اس مسئلہ میں کئی مقام پر کلام ہے۔ **مقام اول** یہ کہ آیت اہل کتاب کے باب میں ہے، اور اہل کتاب کسی قوم کا نام نہیں، بلکہ اس مذہب والوں کا لقب ہے جو کسی نبی مرسل کی تصدیق کرتے ہوں کسی کتاب منزل کا اقرار کرتے ہوں، کذا فی الدر المختار کتاب النکاح، اور آجکل جو اہل یورپ کے حالات مسموع ہوئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اکثر ایسے ہیں جو محض قوم کے اعتبار سے عیسائی سمجھے جاتے ہیں، لیکن مذہب کے اعتبار سے وہ عیسائی بالکل نہیں بلکہ خود وہ لوگ نفس مذہب ہی کو بیکار بتلاتے ہیں اور محض الحاد و دہریت کے خیالات رکھتے ہیں جو کہ ان میں سائنس کے اشتغال وانہماک سے یا ایسے لوگوں کی صحبت سے پیدا ہوگئے ہیں، چنانچہ ان کی تقریرات و تحریرات اس کی شاہد ہیں، پس ان لوگوں کا قوم عیسائی سے شمار کیا جانا یا ان کا اپنے کو بمصلحت تمدنی عیسائی کہدینا کافی نہیں، جب عیسائی نہیں تو ایسے شخصوں کے احکام بھی مثل اہل کتاب کے نہ ہوں گے، پس ذبیحہ بھی ...... ان کے ہاتھ کا حلال نہ ہوگا؛ اور جب اکثر ایسے ہی ہیں تو تاوقتیکہ بالیقین کسی خاص ذبیحہ کے ذابح کا اعتقاداً کتابی ہونا بالیقین نہ ثابت ہو جاوے ان ذبائح سے عموماً احتیاطاً احتراز واجب ہے، فی الدر المختار مسائل شتی غنم مذبوحۃ ومیتۃ فان کانت المذبوحۃ اکثر تحری واکل والا بان کانت المیتۃ اکثر او استویا لا یتحری اھ۔

مقام ثانی کتابی کے ذبیحہ کے حلت کی یہ بھی شرط ہے کہ اس نے ذبح کرنے کے وقت اس پر اللہ کا نام بھی لیا ہو، اگر عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے یا کچھ بھی نہ کہے تو وہ حلال نہ ہوگا، فی الدر المختار کتاب الذبائح او کتابیا ذمیا او حربیا الا اذا سمع منہ عند الذبح ذکر المسیح اھ بلکہ بعض نے تو اعتقاد تثلیث کو بھی مانع حل ذبیحہ کہا ہے، اور بعض نے گو اس قاعدہ کو مانع نہیں کہا ہے، مگر اولیٰ ہر حال میں عدم اکل ہی کو کہا ہو کذا فی رد المختار لیکن

اگر ان اخیر کے دونوں قولوں پر عمل نہ بھی کیا جاوے تب بھی یہ تو اجماعاً شرط ہو کہ اس ذبیحہ پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، جب یہ شرط ہے اور وہاں اس کا بھی اطمینان نہیں، بلکہ حالات سننے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذابحین اس کا التزام نہیں کرتے یہ بھی مانع حلت ہوگا، غرض نہ ذابحین کا کتابی ہونا معلوم اور نہ ذبح کے وقت تسمیہ کا التزام معلوم، لہٰذا ان ذبائح کے حلت کی کوئی صورت نہیں۔

مقام ثالث، اگر ذبح بشرائط[1] مذکورہ بھی ہوا ہو لیکن یہ امر کہ یہ ذبیحہ کتابی کے ہاتھ کا ہے نہ مشاہدہ سے معلوم ہوا اور نہ کسی مسلم عادل کی خبر سے تب بھی بوجہ اس کے کہ دیانات میں مخبر کا اسلام اور عدالت شرط ہے، کما صرح الفقہا، پس اس صورت میں حلت کا حکم نہ ہوگا، البتہ اگر سب شرطیں حلت کی متحقق و متیقن ہوں یعنی مشاہدہ یا معتبر ناقل مسلم سے یہ امر متیقن ہو جاوے کہ جس شخص نے ذبح کیا ہے اس نے تصدیق و اقرار نبوت عیسیٰ علیہ السلام و انجیل کا کیا ہے، اور ذبح کے وقت محض اللہ تعالیٰ کا نام بھی لیا ہے تو ایسا ذبیحہ حلال ہو جاوے گا، لیکن ایسی صورت بہت شاذ و نادر ہو سکتی ہے، بعض لوگوں کو شرط ثانی یعنی وجوب تسمیہ پر ابوداؤد کی ایک روایت سے شبہ ہو گیا ہے، روایت یہ ہے، عن ابن عباس قال فکلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ فنسخ واستثنی من ذلک فقال طعام الذین اوتوا الکتٰب حل لکم الخ اور شبہ یہ ہے کہ ابن عباس کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابی کا ذبیحہ بلا تسمیہ بھی حلال ہے سو اس سے شبہ کا جواب سمجھنا ضروری ہے مگر اس جواب سے پہلے چند مقدمات معلوم کر لینے چاہئیں ایک یہ کہ قطعی اور ظنی میں جب تعارض ہو تو قطعی پر عمل کیا جاوے گا اور ظنی متروک یا مؤول ہوگا دوسرا مقدمہ یہ کہ نسخ فرع ہے تعارض کی جب تعارض دوسری طرح مرتفع ہو سکے تو نسخ کے قائل ہونے کی ضرورت نہیں، اب جواب سنئے۔ حضرت ابن عباس کا ظاہر قول جو کہ دلیل ظنی ہے معارض ہے ظاہر آیت فکلوا الخ ولا تاکلوا الخ کے پس ابن عباس کے قول میں اگر تاویل نہ کی جاوے تو ظاہر آیت کو ترجیح دے کر ابن عباس کے قول کو چھوڑ دیں گے بحکم مقدمہ اولیٰ اور متروک قابل حجیت نہیں ہوتا، پس شبہ کا استیصال ہو گیا لیکن چونکہ حضرت ابن عباس کی نسبت معارضہ قرآن کا قائل ہونا بھی جائز نہیں اس لئے ان کی اس تفسیر کی یہ تاویل کی جاوے گی کہ وہ آیت فکلوا الخ ولا تاکلوا الخ میں منکم کی قید لگاتے ہیں، جس سے حاصل آیت کا یہ ہوگا کہ جس ذبیحہ پر مسلمان کی زبان سے تسمیہ نہ ہوا اس کو کھانا درست نہیں اور قرینہ اس تقیید کا خود فاعل کلوا ولا تاکلوا کا ہو سکتا ہے، اس طرح سے کہ فعل مجہول کو تعیین فاعل میں تابع فعل معروف کا کر دیا جاوے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مشرکین کے ذبائح بالاجماع

---

[1] اسی طرح اور بھی تمام شرائط ذبح کا پایا جانا ضروری ہے، اگر ایک بھی نہ ہوگی تو حلت نہ ہوگی، مثلاً سنا گیا ہے کہ وہ لوگ مذبح

حرام ہیں، اور حرمت بلادلیل ہوتی نہیں، اور حرمت ذبائح مشرکین کی کوئی دلیل مستقل پائی نہیں جاتی، اس لئے بہتر ہے کہ اس کو اس آیت لاتاکلوا میں داخل کیا جاوے، اور ظاہر ہے کہ آیت وطعام الذین اوتوا الکتاب کے قبل ذبائح اہل کتاب بھی حرام تھے، اور وہ بھی اسی دلیل سے اس آیہ لاتاکلوا میں داخل ہوگا پس اس آیت میں ایسی قید ضروری ہے جو ان دونوں حکموں کو مشتمل ہو اور وہ منکم یعنی من المسلمین ہی ہے پھر اس میں سے اہل کتاب مستثنیٰ ہوگئے، اور مشرکین باقی رہے، جس طرح لاتنکحوا المشرکات ولاتنکحوا المشرکین، اہل کتاب و مشرکین دونوں کو ثابت ہے اور والمحصنٰت من الذین اوتوا الکتٰب نے کتابیات کو مستثنیٰ کر دیا، اور مشرکات اور مشرکین و کتابیین اپنے حکم سابق پر رہے گو یہ قرائن قطعی نہیں، پہلا تو ظاہر ہے، اور دوسرا اس لئے کہ ممکن ہو کہ عبدالرزاق کی حدیث کو جو کہ درباب مجوس ہے سنوا بھم سنۃ اھل الکتاب غیرنا کحی نساءھم ولا اکلی ذبائحھم دلیل حرمت ذبائح مشرکین کہا جاوے پس آیت موصوفہ کے عموم کے قائل ہونے کی ضرورت ہی نہ رہی، یا یہ کہا جاوے کہ اصل دماء و فروج میں حرمت ہے، جب حلت ذبائح مشرکین کی کوئی دلیل نہ ہو یہ بھی حرمت کے لئے کافی ہے، غرض بعد اعتبار قید منکم کے اب آیت طعام الذین اوتوا الکتاب اس سے معارض ہوگی، پھر چونکہ سورۂ مائدہ جو کہ مدنی ہے سورۂ انعام سے جو کہ مکی ہے متاخر ہے، اس لئے آیت وطعام الذین الخ اس جزو خاص یعنی تقیید مذکور میں ناسخ اس کی ہوگی یعنی تسمیہ کہنے والے کا خاص مسلم ہونا ضروری نہ ہوگا، یعنی کتابیہ کا تسمیہ بھی مفید حلت ہو جاوے گا، اور یہ کسی دلیل سے لازم نہ آیا کہ نفس تسمیہ کی بھی حاجت نہیں، بلکہ اس میں لاتاکلوا الخ اپنے عموم و اطلاق پر باقی رہے گا اور یہ اس صورت میں ہے کہ دونوں آیتوں میں نسخ کو مان لیا جاوے، ورنہ واقع میں خود اسی کی حاجت نہیں کیونکہ دونوں میں تعارض ہی ثابت نہیں، بلکہ آیت فکلوا ولاتاکلوا حل ذبیحہ کی ایک شرط کو بتلا رہی ہے کہ ذابح کا غیر وثنی ہونا ہے، پس تعارض نہ رہا، تو نسخ بھی نہ ہوگا بحکم مقدمہ دوم پس کسی دلیل سے تسمیہ کا ساقط ہونا ثابت نہیں ہوا، اور شبہ زائل ہوگیا، فقط واللہ اعلم

۲۳ ربیع الثانی ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ۱۴۷)

حکم ذبیحہ غیر مزکی

سوال (۵۰۷) ذبیحہ جس کی زکات ثابت نہ ہو کیسا ہے؟

الجواب، نہیں معلوم مراد سائل کی لفظ زکات سے کیا ہے، یہ لفظ بذال معجمہ تو بمعنی ذبح کے ہے سو بدون ذبح شرعی کے حقیقی ہو یا حکمی حلت ثابت نہیں ہوتی۔ اور اگر مراد زکوٰۃ دینا ہے سو جو شخص زکوٰۃ نہیں دیتا ہو گر فرض جانتا ہو اس کا ذبیحہ حلال ہے، ورنہ باوجود مسلمان ہونے کے

فرض نہیں جانتا وہ مرتد ہے، اس کا ذبیحہ حرام ہے لایحل ذبیحۃ وثنی ومجوسی ومرتد

درمختار، (امداد ج ۲ ص ۱۱۶)

تعیین مکان ذبح | **سوال** (۵۸۸) ذبیحہ کی جگہ مقرر کرنا تبرک جان کر سوائے عیدگاہ کیسا ہے؟

الجواب، اگر تعظیم غیر اللہ کی مقصود نہ ہو تو تعیین مکان ذبح جائز ہے مگر ضروری نہ جانے

فی المشکوٰۃ عن ثابت الضحاکؓ قال نذر رجل علی عہد رسول اللہ صلعم ان ینحر ابلاً ببوانۃ

فاتی رسول اللہ صلعم فقال ھل فیہا وثن من اوثان اھل الجاھلیۃ یعبد قالوا لا قال

فھل کان فیہا عید من اعیادھم قالوا لا قال رسول اللہ صلعم اوف بنذرک رواہ

ابوداؤد، (امداد، ج ۲ ص ۱۱۶)

بیان آلہ ذبح واحداد سکین | **سوال** (۵۸۹) کس کس اشیاء سے ذبح جائز ہے، اور چھری

کب تیز کرے؟

الجواب، جس سے رگیں کٹ جائیں اور خون بھی بہہ جائے اس سے ذبح جائز ہے وحل بکل ما فری الاوداج

وانھر الدم ولا سنا وظفرا قائمین - درمختار - ۲ جانور کے لٹانے سے پہلے تیز کرنا

چھری کا مستحب ہے، فی الدرالمختار وندب احد الشفرۃ قبل الاضجاع (امداد ج ۲ ص ۱۱۶)

وجوب تسمیہ بر ذبح | **سوال** (۵۹۰) ذبیحہ کے ذبح میں بسم اللہ اللہ اکبر معین کو بھی چاہئے اگر نہ کہے

تو کیسا ہے؟

الجواب، تسمیہ فقط واسطے ذابح کے ہے وشرط التسمیۃ فی الذابح، درمختار (امداد ۲ ص ۱۱۶)

حکم تسمیہ بر اعانت کنندہ در ذبح | **سوال** (۵۹۱) مالابد منہ کے آخر میں رسالہ اضحیہ لگا ہوا ہے، اسمیں

لکھا ہے بحوالہ درمختار کہ ذابح کے معین پر تسمیہ واجب ہے، اگر معین نے تسمیہ نہ کیا تو اس کا کھانا حرام ہوجاتا ہے یہ کیسا ہے

الجواب - فی الدرالمختار کتاب الاضحیۃ وضع یدہ مع ید القصاب فی الذبح واعانہ

علی الذبح سمّی کل وجوبا الخ اس سے ثابت ہوا کہ مطلق معین پر تسمیہ واجب نہیں بلکہ خاص اس معین

پر جو کہ ذابح ہوتے میں شریک ہو، مثلاً چھری کو دونوں پکڑ کر چلاتے ہوں۔

۱۷ صفر ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۱۹)

سوال (۵۹۲) آپ نے اغلاط العوام میں تحریر

فرمایا ہے کہ ذابح کے معین پر تسمیہ واجب نہیں، اور ترجمہ فتاویٰ عالمگیری جلد چہارم ص ۱۴۲

کتاب الاضحیہ میں یہ عبارت تحریر ہے (ایک شخص نے قربانی کرنی چاہی پس اس نے قصاب کے

ہاتھ کے ساتھ اپنا ہاتھ بھی لگایا تاکہ دونوں کی مدد سے اچھی طرح ذبح ہو جاوے، تو شیخ امام ابوبکر بن الفضل نے فرمایا کہ دونوں میں سے ہر ایک پر تسمیہ واجب ہوگا، حتیٰ کہ اگر دونوں میں سے ایک نے تسمیہ چھوڑ دیا تو جائز نہ ہوگی، یہ ظہیریہ میں لکھا ہے، تو محلہ کی مسجد کے امام صاحب میری معرفت آنحضرت سے "اغلاط العوام" کی عبارت کے صحیح ہونے کی کسی معتبر کتاب سے دلیل چاہتے ہیں؟

الجواب، میں نے معین کا حکم لکھا ہے، اور یہ شخص تو شریک ذبح ہے،

۲۴ر رجب ۱۳۴۳ھ (ترجیح خامس ۱۵۷)

| حکم ذبیحۂ امرأۃ وصبی | **سوال** (۵۹۳) ذبیحہ عورت اور نابالغ کا جائز ہے یا نہیں، اور سوائے |

اس کے کون کون ذبیحہ جائز اور کون ناجائز ہے، بینوا توجروا؟

الجواب، (۱) ذبیحہ عورت اور نابالغ کا بشرطیکہ ذبح کر سکتا ہو اور بسم اللہ کہے جائز ہے او امرأۃ او صبیا یعقل التسمیۃ والذبح ویقدر، درمختار

(۲) سوال کی کوئی صورت معین کرنا چاہئے تاکہ جواب دیا جائے، یوں بہت سے جائز بہت سے ناجائز ہیں، (امداد ج ۲ ص ۱۱۶)

| حکم دادن چرم اضحیہ در اجرت جزار | **سوال** (۵۹۴) کیا ہے حکم شرع کا اس میں کہ کھال قربانی |

کی قصاب کو اجرت میں دینا یا قیمت جانور میں محسوب کرنا جیسا فی زماننا اکثر لوگ کرتے ہیں، اور جو لوگ بطمع نفع قلیل دیتے ہیں یا لیتے ہیں ان کا کیا حکم ہے؟

الجواب۔ قربانی کا کوئی جزء کھال ہو یا گوشت اجرت قصاب میں دینا یا قیمت میں مجری کرنا سخت ممنوع ہے، فی الدر المختار ولا یعطی اجر الجزار منہا لانہ کبیع و استفیدت من قولہ علیہ السلام من باع جلد اضحیتہ فلا اضحیۃ، ہدایہ اور جو لوگ ایسا کرکے دنیا کے نفع کو آخرت کے ثواب پر ترجیح دیتے ہیں ان کے عتاب کے لئے یہ آیت بس ہے بل تؤثرون الحیوٰۃ الدنیا والآخرۃ خیر وابقیٰ، واللہ اعلم، ۲۹ ذیقعدہ ۱۳۰۳ھ

(امداد ج ۲ ص ۱۱۸)

| عدم جواز دادن چرم قربانی در اجرت | **سوال** (۵۹۵) میری بستی میں فقیر مسجد کا ہمیشہ پانی بھرتا ہے اور اس کو بعوض اجرت زمین دی گئی ہے اور چمڑے قربانی کے بھی وہ |

اسی حق میں شمار کرتا ہے اور اکثر لوگ دیتے بھی ہیں مگر میں نہیں دیتا ہوں بلکہ فروخت کرکے غرباء و مساکین کو تقسیم کر دیتا ہوں تو ایسے فقیر کو چرم قربانی دینا جائز ہے یا نہیں

اور قربانی کامل طور سے ادا ہوگی یا نہیں۔

الجواب - اجرت میں جلد قربانی کی دینا جائز نہیں گو قربانی میں خلل نہیں آتا لیکن بقدر قیمت جلد کے اس شخص پر مساکین کو تصدق کرنا واجب رہے گا، واللہ اعلم
رمضان ۱۳۲۳ھ (امداد اول ص ۱۶۲)

حکم ہبہ کردن شرکائے قربانی چیزے را قبل از تقسیم،

سوال - (۵۹۶) قربانی کے بقرہ کا کل شرکار آپس میں راضی ہو کر قبل تقسیم گوشت کسی شخص کو للہ دیدیں تو قربانی جائز ہو یا نہیں

الجواب، اگر سب نے کسی فقیر کو دیدیا یا غنی کو دیا، لیکن شرکا میں سے کسی نے قربانی کی نذر نہ کی تھی، تو جائز ہے، کیونکہ تقسیم واجب نہیں، کہ ترک واجب سے کوئی محذور لازم آئے اور اگر اس میں کوئی ناذر تھا اور غنی کو دیا تو جائز نہیں، کیونکہ تقسیم کرکے ناذر کا حصہ فقراء پر تصدق کرنا واجب ہے، پس قربانی تو جائز ہو جائے گی لیکن ناذر پر قیمت اپنے حصہ منجملہ کل کے تصدق کرنا واجب ہے، فی الطحطاوی انظر هل هذه القسمة متعينة اولاحتی لواشترٰی لنفسه ولزوجته ولاولاده الكبار بدنة ولم يقسموها تجزيهم اولا والظاهر انها لا تشترط لان المقصود منها الاراقة وقد حصلت وفی فتاوی الخلاصة والفيض تعليق القسمة علی ارادتهم وهو تؤيد ما سبق غيرانه اذا كان فيهم فقير والباقی اغنياء يتعين عليه اخذ نصيبه ليتصدق به ۱۲ وفی الدرالمختار ولا ياكل الناذر منها فان اكل تصدق بقيمة ما اكل ۱۲ قلت نفسه وطعام الغنی سواء ۱۲ والله اعلم
(امداد الفتاویٰ ج ۲ ص ۱۱۸)

حیوان خصی کی سب قسموں کی قربانی جائز ہے

سوال (۵۹۷) خصی تین طرح کے ہوتے ہیں ایک کے خصیے ل دیتے ہیں، اور دوسرے کے چڑھا دیتے ہیں، اور تیسرے کے نکال دیتے ہیں، ان تینوں میں کون درست یا ہر سہ درست ہیں، اور جبکہ خصیہ نکل گیا، تو تہائی سے زیادہ عضو بلکہ ثابت عضو جاتا رہا۔

الجواب، تینوں درست ہیں، اور یہ عضو چونکہ مقصود نہیں، بلکہ اس اخصاء سے گوشت اور بھی عمدہ ہو جاتا ہے، لہذا اس کا ذہاب مضر نہیں جیسا عالمگیری میں مجبوب کی قربانی کا جواز مصرح ہے۔ ۹ ر جمادی الثانیہ ۱۳۲۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۳۴)

سوال (۵۹۸) جب خصی جانور کی قربانی جائز ہے تو سوال یہ ہے کہ آختہ

کرنے کے عموماً دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ رگ مخصوص کو کوٹ کر یا مسل کر دوسرے شگاف دیکر عضو مخصوص کو قطعی نکال کر ان میں قربانی کی کون سی صورت جائز ہے؟

الجواب، فقہاء کی اطلاق سے دونوں صورت جواز کی ہیں، اگر دوسری صورت میں فوت عضو کا شبہ ہو تو فوت وہ مانع ہے جو منقص قیمت ہو، اور اس سے قیمت اور بڑھ جاتی ہے، لہٰذا مضر نہیں، ۱۰ محرم ۱۳۴۳ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۵۰)

سوال (۵۹۹) لوگ کہتے ہیں کہ قربانی کے بارے میں چیرا ہوا بکرا درست ہے اور میں کہتا ہوں مُلا ہوا یعنی جس کے کوئی عضو نہ نکلا ہو، وہ درست ہے،

الجواب خصی جانور کی قربانی درست ہے خواہ عضو چیر کر نکال دیا ہو یا مل کر بیکار کر دیا ہو۔ لاطلاق الفقہاء من غیر تقیید وتفصیل . ۲۰ شوال ۱۳۴۳ھ (تتمہ خامسہ ص ۳۰۷)

سارق کے ذبیحہ کا حکم

سوال (۶۰۰) ذبیحہ سارق کے بارہ میں کیا حکم ہے، حلال یا حرام؟

الجواب، حلال بمعنی ما ذکر اسم اللہ علیہ ہے، اور حرام بوجہ ملک غیر ہونے کے اگر بعد ذبح[1] مالک اجازت دیدے کھانا جائز ہے بخلاف مالم یذکر اسم اللہ علیہ کے کہ کبھی مباح ہو نہیں سکتا،

۹ رمضان ۱۳۲۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۲۵)

قربانی کے گوشت کا کفار کو دینا

سوال (۶۰۱) قربانی کا گوشت کفار کو دینا جائز ہے یا نہیں، بینوا بالحجۃ والدلیل توجروا بالاجر الجزیل

الجواب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ، قربانی گو خود واجب ہو مگر گوشت تقسیم کرنا واجب نہیں، پس وہ ہدیہ ہو گا یا صدقہ نافلہ و حربی مصالح حکم مستامن ہیں ہے، لہٰذا اس کو دینا جائز ہے۔ البتہ جس قربانی کا گوشت تقسیم کرنا واجب ہو اس میں سے دینا جائز نہیں،

۲۲ ذی الحجہ ۱۳۲۷ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۳۵)

جلد اضحیہ کا ثمن بہرحال واجب التصدق ہے

سوال (۶۰۲) علماء کا اس شہر میں جلد اضحیہ کے متعلق اختلاف ہے، گو خادم کو یقین ہے کہ جلد اضحیہ کی بیع کے بعد اس کا پیسہ مرمت مسجد میں صرف نہ کرنا چاہئے بلکہ فقراء ہی اس کے مستحق ہیں، مگر مجوزین کا خیال یہ ہے کہ فتاویٰ بزازیہ میں ہے لہ ان یبیعہا بالدراہم لیتصدق بہا لا ان ینتفع بالدراہم او یدفعہا علی نفسہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے

---

[1] یعنی جب مسروقہ کو ذبح کیا ہو سوال سے یہی سمجھا گیا، اور اگر مذبوح میں کوئی خرابی نہ ہو تو صرف ذابح کے سارق ہونے سے حرمت نہیں آئی کیونکہ ذابح کا فاسق ہونا مضر نہیں ۱۲ منہ

تموّل اور نفع کے لئے بیع ناجائز ہے، اور اگر کوئی بیع کرے تو اس کا تصدق واجب ہوگا، جیسا کہ عینی
میں ہے فاذا تموّلته بالبیع وجب التصدق اور اگر بیع اس نیت سے کرے کہ صدقہ کردوں گا تو
بیع جائز ہے جیسا کہ بزازیہ میں ہے، اب اگر کوئی یہ نیت کرے کہ مسجد کی مرمت میں اس کی قیمت
صرف کردونگا اس نیت سے بیع جائز ہوئی لیکن وجوب صدقہ ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ عبارت
بزازیہ لہ ان یبیعها بالدراهم لیتصدق بها میں عموم ہے اور چونکہ نفس تصدق جلد مندوب ہے
بعد بیع بھی مندوب رہیگا، لہذا مرمت مسجد بوجہ صدقہ مندوبہ ہونے کے جائز ہوگی، عبارت بزازیہ
کا یہ مطلب لینا کہ تصدق واجب ہے اس عبارت سے ثابت نہیں ہوتا، لہذا عرض ہے کہ کلام فقہاء رحمہم اللہ
میں ایسے مقام پر جہاں بہ نیت تصدق بیع جائز لکھا ہو اس کے ساتھ کوئی لفظ وجوب تصدق
جس سے ثابت ہو اگر مل جاوے تو مجوزین کے اسکات کے لئے کافی ہوگا، خادم نے بہت تلاش
کیا نہیں ملا، صرف بقصد تموّل اگر بیع ہو تو اس میں وجب التصدق کا لفظ ملتا ہے، لہذا حضور
تحریر فرماویں فقط

الجواب شبہ ہی کی تقریر میری سمجھ میں نہیں آئی در مختار وغیرہ کی عبارت فان بیع اللحم او الجلد بالدراہم تصدق بثمنہ میں بیع عام ہے، ہر بیع کو خواہ بہ نیت تموّل ہو یا بہ نیت تصدق ہو، دونوں صورتوں میں تصدق بثمنہ کا جس کا مدلول وجوب تصدق ہی حکم ہوگا، اور یہ بحث دوسری ہے کہ آیا یہ بیع مکروہ ہے یا غیر مکروہ، پس نیت تصدق انتفاء کراہت کی شرط ہے نہ کہ وجوب تصدق کے لئے مانع، بلکہ وجوب تصدق کا موجب حسب روایت بالا نفس بیع بالمستہلک بالدراہم ہے مطلقاً، اس کے بعد جو شبہ کرنا ہو اس کی تقریر کافی و واضح جس میں تقریب بھی تام ہو کیجئے، واللہ اعلم،

۲۷ ذی الحجہ ۱۳۲۶ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۳۵)

بعد گذرنے ایام قربانی کے قیمت چرم قربانی کی اپنے اصول و فروع یا کافر پر تصدق کرنیکا حکم

سوال (۶۰۳) قربانی جس کے ذمہ واجب تھی اس نے اپنی سستی سے ایام قربانی میں نہ کی، بعد ایام گذرنے کے جب وہ قیمت قربانی خیرات کرے تو اصول یا فروع یا کافر کو خیرات کرسکتا ہے، اگر وہ مفلس اور حاجتمند ہوں یا نہیں؟

الجواب فقہاء کے کلام میں اس باب میں یہ الفاظ ہیں تصدق بقیمتها جو دال ہے وجوب تصدق پر، اور صدقہ واجبہ کا مذکورین فی السوال پر صرف کرنا جائز نہیں، اور در مختار کتاب الاضحیہ میں ایک جزئیہ ہے، جس میں ایسے وکیل بذبح الاضحیہ پر جس نے عمداً تسمیہ ترک کیا ضمان لازم کیا ہے، اس میں تصریح ہے تصدق بقیمتها علی الفقراء ج ۵ ص ۳۲۶، اور صدقہ واجبہ کے مصارف جو فقراء ہوتے

ہیں ان سے مذکورین فی السوال خارج ہیں، اور رد المحتار میں ایک جزئیہ ہے جس میں اضحیۂ مشتراۃ کو بعد ایام تضحیہ کے ذبح کرنے کی صورت میں لکھا ہے، لایحل لہ الاکل منہا اذا ذبحہا کما لا یجوز لہ حبس شیٔ من قیمتہا، ج ۵، ص ۳۱۴، اور جس چیز کا خود کھانا خرچ کرنا جائز نہیں مذکورین فی السوال کو دینا بھی درست نہیں، ۳ محرم ۱۳۲۶ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۳۶)

عین جلد اضحیہ کا اصول و فروع اور کافر کو دینا جائز ہے

سوال (۶۰۴) کھال قربانی کا جو تصدق کرنیکا اختیار ہے اس کو اصول یا فروع یا کافر کو دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب، ہاں دے سکتا ہے، فی الہدایہ واللحم بمنزلۃ الجلد فی الصحیح، جب دونوں کا حکم ایک ہے اور لحم دینا ان سب مذکورین فی السوال کو جائز ہے پس عین جلد بھی دینا درست ہے،

۳ محرم ۱۳۲۶ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۳۷)

بلی سے چھڑائی ہوئی مرغی یا کسی اور جانور کو ذبح کیا اور خون نکلا مگر حرکت نہیں کی اسکا حکم

سوال (۶۰۵) مرغی کو بلی نے پکڑ لیا مگر گردن درست ہے اس کو چھڑا کر جو ذبح کیا تو خون بکثرت نکلا مگر مرغی نے کچھ حرکت نہیں کی،

الجواب، حلال ہو گئی، کذا فی الدر المختار ورد المحتار، ج ۵ ص ۳۰۱ (تتمہ اولیٰ ص ۱۳۷)

سوال (۶۰۶) ۱؎ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک بھینس بیمار تھی جس وقت زیادہ تکلیف ہوئی تو ذبح کرتے وقت اس سے خون قطرہ دو قطرہ نکلا اور اعضاء حرکت کر رہے تھے۔

۲؎ ایک بیل بیمار تھا جس وقت زیادہ تکلیف ہونے لگی، اس کو ذبح کیا، اس میں سے خون تو نکلا مگر کسی اعضاء نے ذرا بھی حرکت نہ کی، تو دونوں جانور درست ہو گئے یا نہیں۔

الجواب، فی الدر المختار ذبح شاۃ مریضۃ فتحرکت او خرج الدم حلت والا لا ان لم تدر حیاتہ عند الذبح وان علم حیاتہ حلت مطلقا وان لم تتحرک ولم یخرج الدم فی رد المحتار قولہ فتحرکت ای بغیر مد نحو رجل وفتح عین مما لا یدل علی الحیاۃ کما یاتی قولہ او خرج الدم ای کما یخرج من الحی الی قولہ وھو ظاہر الروایۃ ج ۵ ص ۳۰۱

اس روایت سے یہ تفصیل مفہوم ہوتی کہ اگر ذبح کے قبل متصل اس کی حیات یقینی ہو تب تو ذبح سے وہ حلال ہوتا ہے خواہ حرکت کرے یا نہ کرے اور خواہ خون نکلے یا نہ نکلے اور اگر حیات یقینی نہ ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کو ایسی حرکت ہو جو علامات حیات کی ہو جیسے منہ کا بند کر لینا یا آنکھ کا بند کر لینا یا

پاؤں کا سمیٹ لینا یا بال کھڑے ہو جانا (کما فی الدر المختار ایضا) یا اتنا خون نکلے جیسا زندہ کے نکلتا ہے تب تو حلال ہے، ورنہ حرام، ۲ ربیع الثانی ۱۳۴۱ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۳۴)

چرم قربانی وزکوٰۃ کا روپیہ چندہ بلال احمر میں دینے کا حکم

سوال (۶۰۷) چرم قربانی وزکوٰۃ یا اس کی قیمت وہاں کو روانہ کرنا حدیث میں تو یہ آیا ہے کہ کوئی عمل اللہ کے نزدیک ان ایام میں قربانی سے بہتر نہیں، استثناء فرائض کا تو خود سمجھ میں آتا ہے، لہٰذا مطلب یہ ہے کہ مقدار فرض کے دینے کے بعد نیز جب یہ فرض ہوگا تو جن اشخاص نے صرف زکوٰۃ ہی دی ہے وہ زکوٰۃ ان کی کیسے ادا ہوگی، اشتہار میں اس کی تصریح ہونی چاہئے کہ مقدار فرض کے دینے کے بعد دینا زکوٰۃ کا جائز ہے، نیز لوگوں کی طرف سے اطمینان کافی تملیک کا نہیں معلوم ہوتا

الجواب، قیمت چرم قربانی کا دینا چونکہ سہل ہے، اس لئے اس کو تجویز کیا گیا، البتہ تملیک کا انتظام خود کر کے دینا چاہئے، نفل قربانی کا ترک چونکہ جائز ہے اس لئے بعض علماء کی یہ بھی تجویز ہے اور فضیلت ہر عمل میں جدا قسم کی ہے، فقط

۸ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ یوم سہ شنبہ (تتمہ اولیٰ ص ۲۱۲)

وہ صاحب نصاب جس کا روپیہ تجارتی کمپنی میں ہے اس پر قربانی کا حکم

سوال (۶۰۸) بکر صاحب نصاب ہے یعنی مبلغ اسی روپے ہیں مگر روپیہ ایک تجارتی کمپنی میں دیا ہے، اور بغیر ایک سال گذرے روپیہ مل نہیں سکتا، غرض کہ بکر کے قبضہ میں نہیں ہے، اور بکر اس وقت حالت افلاس میں ہے، قربانی کرنے کو روپیہ نہیں ہے نہ قرض مل سکتا ہے تو کیا کیا جاوے۔ فقط

الجواب، اگر کوئی چیز ضرورت سے زائد فروخت کر کے قربانی کر سکے تو واجب ہوگی ورنہ نہیں، فی رد المحتار له مال کثیر مال غائب فی ید مضاربہ او شریکہ ومعہ من الحجرین او متاع البیت ما یضحی بہ قلزم، ج ۵ ص ۳۰۵، ۲ ذی الحجہ ۱۳۲۶ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۳۷)

قربانی کا گوشت فروخت کرانے کا حکم اور تحقیق اس کی کہ اس کے خریدنے سے قربانی ادا ہوگی یا نہیں

سوال (۶۰۹) ایک عورت نے بلا اجازت اپنے خاوند کے قربانی میں ایک حصہ خرید لیا اور قیمت بھی دیدی جس وقت گوشت حصہ کا گھر آیا اس کے خاوند کو قصہ قربانی کا معلوم ہوا اس نے ناراضگی ظاہر کی اور خفا بہت ہو کر اس حصہ کو کہا فروخت کر دو اس عورت نے وہ حصہ دوسری عورت کے ہاتھ فروخت کر دیا، اور قیمت لے لی، اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ جس نے حصہ خرید لیا، اس کو قربانی کا ثواب ہوا یا نہیں، پہلی عورت جس نے شروع میں حصہ خرید لیا تھا، شاید قدرے

زیور کی مالک ہے بلکہ وہ بھی خاوند ہی کی ملک ہو تحقیق نہیں، اگر عورت صاحب نصاب ہو تو کیا صورت مسئلہ ہے اور غیر نصاب کی کیا صورت فقط؟

الجواب، جس دوسری عورت نے گوشت کا حصہ خریدا ہے اس کی قربانی نہیں ہوئی، اور پہلی عورت نے جب حصہ خرید کر ذبح کرا دیا اس کی طرف سے قربانی ہو گئی خواہ وہ غنی ہو یا فقیر اور ہر حال میں اس کو گوشت فروخت کرنا جائز نہیں تھا، اور جب گوشت فروخت کر دیا اس کے دام جو وصول ہوئے، حق مساکین کا ہے اور چونکہ اس نے مساکین کو نہیں دیا اس لئے اب دینا واجب ہوگا فقط ۲۶ ذی الحجہ ۱۳۲۹ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۳۷)

قربانی کی نذر کرنے سے قربانی واجب ہے یا تصدق

سوال (۶۱۰) ایک شخص بیمار رہا اس کے لواحقین نے کہا کہ خداوندا اگر یہ مریض صحت پاوے تو تین گائے مسلّم قربانی کروں بفضلہ تعالیٰ مریض نے صحت پائی، اور ذی الحجہ کے مہینہ میں گائے ذبح ہو گی یہ قربانی کے حکم میں ہے، یا صدقہ کے؟

الجواب، قربانی کے کذا فی ردالمحتار (تتمہ اولیٰ ص ۱۳۸)

قربانی منذور کے لحم کا مصرف

سوال (۶۱۱) اور اس گوشت کے مصارف کی کیا صورت ہو گی؟

الجواب، مساکین کو دینا چاہئے، کذا فی ردالمحتار تحت قولہ ویاکل من لحم الاضحیۃ ہذا فی الضحیۃ الواجبۃ والسنۃ سواء اذا لم تکن واجبۃ بالنذر وان وجبت فلا یاکل منہا شیئاً ولا یطعم غنیاً، ج ۵ ص ۳۲۰، (تتمہ اولیٰ ص ۱۳۸)

قربانی کی نذر کی صورت میں اگر قیمت کسی مدرسہ میں دیدے تو بری الذمہ ہوجائیگا یا نہیں

سوال (۶۱۲) اور گائے کی قیمت تخمینہ کر کے روپیہ کسی مدرسہ میں یا غربا کو دینے سے نذر سے بری الذمہ ہو گا یا نہیں؟

الجواب، ایام قربانی اگر گذر جاویں تو مساکین کو دام دینا چاہئے، فقط
۲۷ ذیقعدہ ۱۳۳۰ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۳۸)

ترک مجروحین کے لئے چندہ میں قیمت قربانی دینے سے قربانی کا ادا نہ ہونا اور پوست قربانی کی قیمت اس چندہ میں دینے کا طریقہ

سوال (۶۱۳) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارہ میں کہ جو جنگ آجکل خلافت عثمانیہ اور ریاستہائے بلقان میں جاری ہے، اور جس کا منشا قطعی طور پر سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ عیسائی سلطنتیں اسلام کو (خدانخواستہ) مٹانا چاہتی ہیں۔ اور اگر اس لڑائی میں ترکوں کو شکست ہو گئی تو بظاہر حالات پھر حرمین شریفین کی حفاظت کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی کیا ایسی حالت میں یہ جائز ہے کہ عید البقر کے موقع پر بجائے قربانی کرنے کے اضحیہ کی قیمت ترکوں کے

امدادی سرمایہ میں دیدی جائے، اگر ایسا کیا جاوے تو کیا مسلمان فرض قربانی سے سبکدوش ہو سکتے ہیں، اور جو لوگ قربانی کریں اُن کو اس موقع پر قربانی کے پوست سرمایہ مذکور میں دینا بہتر ہے یا مدارس اسلامیہ میں دینا افضل ہے، بینوا توجروا۔

الجواب۔ خود قربانی کی قیمت دینے سے تو واجب قربانی ادا نہ ہوگی، اگر کسی نے ایسا کیا گنہگار ہوگا، لان الابدال لا تنصب بالرائ کما صرح بہ الفقہاء، البتہ قیمت چرم قربانی اس وقت مدارس میں دینے کی نسبت اس چندہ میں دینا بہتر ہے، ہاں ضرورت شدیدہ مستثنیٰ ہی لیکن اس قیمت چرم کا دینا اس طرح ہونا چاہئے کہ اول کوئی مسکین کوئی خاص مقدار روپیہ کسی سے قرض لیکر اس چندہ میں داخل کرے پھر قیمت چرم اس مسکین کو بطور مالک کے دیدی جائے اور وہ مسکین اس سے اپنا قرضہ ادا کرے، اگر قیمت چرم براہ راست اس چندہ میں دیدی جاوے گی ادا نہ ہوگی،

۳ ذیحجہ ۱۳۳۰ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۳۸)

باوجود قدرت کے قربانی کو چھوڑنا اور بجائے اس کے قیمت چندہ مجروحین ترک میں دینے کے جواز پر ہدایہ کی عبارت سے استدلال کا جواب

سوال (۶۱۴) بضرورت چندہ ہلال احمر علمائے حنفی المذہب کے جو فتوے شائع ہوئے ہیں ان میں عموماً یہ صراحت فرمائی گئی ہے کہ جن لوگوں پر قربانی واجب ہو انھیں قربانی ہی کرنی چاہئے، قربانی کی قیمت دینے کی شریعت اجازت نہیں دیتی، مگر بعض علماء کہتے ہیں کہ قیمت کا دیدینا بھی جائز ہے، گو افضل یہی کہ قربانی کی جائے، ثانی الذکر علماء کا استدلال ہدایہ کی عبارت ذیل ہے۔ وایام النحر ثلثۃ (الی ان قال) والتضحیۃ فیہا افضل من التصدق بثمن الاضحیۃ (ہدایہ جلد رابع ص ۷۰) ہدایہ کی اس عبارت کے متعلق صاحب کفایہ نے کچھ حوالہ قلم نہیں فرمایا اور صاحب ہدایہ نے افضلیت تضحیہ کی ایک دلیل یہ لکھی ہے لانہا تقع واجبۃ او سنۃ والتصدق تطوع محض فتفضل علیہ، اس پر نہ معلوم کس کتاب سے ایک تو بین السطور کسی موقع پر یہ حاشیہ لکھا ہے، وان کان یسقط عنہ الواجب، دوسرے عنایہ سے ایک بڑی عبارت نقل کر کے تصدق ثمن پر تضحیہ کی افضلیت ثابت کی گئی ہے، جس کا ماحصل بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ایام نحر میں قربانی افضل ہے، لیکن تصدق قیمت بھی جائز ہے، اور ایسا کرنے سے واجب ساقط ہو جاتا ہے، یہ صورت جمہور علمائے حنفی المذہب کے موجودہ فتووں کے خلاف ہونے کے علاوہ مسلمانان ہندوستان کی تمدنی حالت کے بھی خلاف ہے اس لئے ہدایہ اور اس کے حواشی متذکرہ صدر کی کیا تاویل ہونی چاہئے، اس سے مشرف باطلاع فرمایا جاوے،

الجواب، لفظ افضل سے ترک یا ابدال کے جواز پر استدلال کرنا محض غلطی ہے جبکہ اس کے ساتھ ہی تضحیہ کو واجب یا سنت بھی کہا ہے، کہ اس سے مراد بھی مؤکدہ ہے جو قریب واجب کے ہے، مگر دوسرے ائمہ کے یہاں اصطلاح واجب نہ ہونے سے لفظ سنت اختیار کیا گیا ہے، بہر حال نہ کوئی واجب کے ترک یا ابدال کو باوجود قدرت علی الاصل کے جائز کہتا ہے، نہ ایسی سنت کے ترک یا ابدال کو، پس دلیل میں اس کے وجوب وسنیت کی تصریح خود اُن کے دعوے سے معارض ہے، رہا یہ الفعل عموماً کو غیر جائز سے افضل کہنے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے اس سے دوسری شق کا فاضل یا جائز ہونا لازم نہیں آتا، کیا بعوتھن احق بردہن سے غیر بعولتھن کا مستحق رد ہونا لازم آسکتا ہے، رہا یہ کہ مفہوم تصانیف حجۃ ہوتا ہے، سو اول تو اس کا مفہوم ہونا مسلّم نہیں، جیسا اوپر بیان ہوا، پھر یہ جب ہے کہ اس کے خلاف کی تصریح نہ ہو، اور تصریح اس کے وجوب وسنیت کی اوپر مذکور ہو چکی ہے، رہا یہ کہ لفظ افضل موہم ضرور ہے، سو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو بعد تصریح کے ایہام مضر نہیں، پھر اس میں نکتہ یہ ہے کہ اراقۃ دم میں بوجہ اس کی عبارت غیر معقولہ ہونے کے عقلاً شبہ عدم جواز کا تھا، ختم مادہ شبہ کے لئے ترقی کر کے لفظ افضل اختیار کیا گیا، یعنی صرف جائز ہی نہیں بلکہ اس میں فضیلت بھی ہے، اور فضیلت بھی بہت زیادہ اور آگے اس کی وجہ بتلا دی کہ واجب یا سنت ہے اور کبریٰ مطوی ہے کہ واجب اور سنت کی کمال فضیلت مسلّم وثابت ہے، پس مادہ شبہ کا بالکلیہ قطع ہو گیا، اور بین السطور کا حاشیہ مجہول ہے، کچھ حجت نہیں، اور بفرض محال اگر سقوط ثابت بھی ہو جاتا تب بھی مفید نہ تھا، اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ جمعہ کے روز صلوٰۃ ظہر سے جمعہ ساقط ہو جاتا ہے لیکن ترک جمعہ اور صلوٰۃ ظہر کی رائے دینا کیا حرام نہیں ہے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے ایک مبسوط مضمون اس کے متعلق لکھا ہے، اس کی نقل سہارنپور سے ضرور منگا لیجئے، ۲۱ ذیقعدہ ۱۳۳۸ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۳۹)

طریق ذبح اضطراری

سوال (۶۱۵) کوئی جانور جگہ حلالی سے مٹی یا بوجھ میں دبا ہوا ہے اور جب تک نکالا جاوے اندیشہ مرنے کا ہے تو اس کو حلال کس جگہ سے کیا جاوے، اور اگر وہ جانور بے موقع دبا ہوا ہے آدمی نہیں جا سکتا ہے تو دور کھڑا ہو کر برچھی تکبیر پڑھ کر مارے اور وہ خون بہہ جاوے تو وہ حلال درست ہے یا کہ نہ؟

الجواب، درست ہے، ۳ رجادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ ص ۲۵)

قدم نہادن برگردن ذبیحہ

سوال (۶۱۶) قربانی کا جانور ذبح کرتے وقت گردن پر قدم رکھ کر ذبح کرنا کوئی سنت کہتا ہے کوئی مستحب کوئی مکروہ کوئی حرام کہتا ہے، اب بندہ کی عرض

یہ ہے کہ ان اقوال میں سے کون سا قول حق قابلِ قبول ہے ؟

الجواب ، فی المشکوٰۃ عن انس قال ضحّی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بکبشین اقرنین ذبحھما بیدہ وسمّی وکبر قال رأیتہ واضعا قدمہ علی صفاحھما ویقول بسم اللہ واللہ اکبر متفق علیہ فی اللمعات قولہ صفاحھما جمع صفح بالفتح وسکون الفاء قیل ھو الجنب وقیل الوجہ مطبوعہ انصاری ص ۱۱۹ ج ۱ قلت ھذا الدلیل السمعی واما الحکمۃ العقلیۃ فیہ فھو انہ امکن للذبح فیستحب کما استحب ذبح بعض الحیوانات مضطجعا بمثل ھذہ الحکمۃ کما فی العالمگیریۃ والسنۃ فی الشاۃ والبقرۃ ان تذبح مضطجعۃ لانہ امکن بقطع العروق ویستقبل القبلۃ فی الجمیع کذا فی الجوھرۃ النیرۃ ، ج ۶ ص ۱۹۳ (تتمہ ثانیہ ص ۱۸۱)

اصطیاد سمک بخراطین

سوال (۶۱۷) اکثر لوگ کیچوؤں ہی سے مچھلی کا شکار کرتے ہیں اور شکار ہی کو ذریعہ گذر بسر بنائے ہوئے ہیں آٹے سے مچھلی کم ملنے کے باعث کیچوؤں ہی سے مچھلی پکڑتے ہیں پس بوجہ افلاس و محتاجی سالن پیدا کرنے کے لئے ان کو کیچوؤں سے شکار کرنا جائز ہوگا کہ نہیں ،

الجواب ، اگر کیچوے کو اول مار دیا جاوے پھر اُس سے شکار کیا جاوے جائز ہے ، اس وقت ایک شکاری نے بیان کیا کہ مردہ کیچوے سے بھی ویسی ہی مچھلی آتی ہے ۱۲ شعبان ۱۳۳۳ھ

کشتن خراطین برائے اصطیاد ماہی

سوال (۶۱۸) فتوئ حضورِ عالی سن کر مریدان حضور پابند ہیں مگر تفہیم کے لئے ادبًا عارض کہ زندہ کیچوے جو کُنڈ پر لگائے جاتے ہیں اُن کو مچھلی نگل جاتی ہے وہ اس کے پیٹ میں جا کر مر جاتے ہیں ہم اگر کیچوؤں کو پانی اور مٹی میں نہ رکھ کر دھوپ میں رکھ کر مار دیں گے تو دونوں صورتوں میں اتلاف جان مردار محقق ہوتا ہے غرض شکار ماہی کے لئے مردار جانور کی جان کے اتلاف کا جواز شرعًا کس درجہ پر مبنی ہے اُس سے بصراحت ارشاد ہو تو راہ نمائی ہوگی اور دونوں صورتوں کا فرق بہ وضاحت ارشاد ہو تو احسان ہے کہ ایسا سوال پیش آنے پر ہم بوجہ بے علمی جواب نہ دے سکے ۔

الجواب ، دھوپ میں مارنا جائز نہیں بلکہ کسی ایسے آلہ سے ماریں کہ فورًا مر جاویں تاکہ ایلام و تعذیب بلا ضرورت نہ ہو ، اسی طرح کانٹے میں چھوتے سے ایلام و تعذیب بلا ضرورت ہے اور محض اتلاف جان اس کی علت نہیں ۔ ۱۰ رمضان ۱۳۳۳ھ

تحقیق حلت متروک التسمیہ ناسیاً

سوال (۶۱۹) ایک شخص قربانی کرتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہنا بھول گیا، جب وہ گلے پر چھری چلا چکا اور چھری بکرے کی گردن میں رکھی ہوئی ہے، پھر یاد آئی تو اس نے بسم اللہ اللہ اکبر کہہ لیا، اور وہ غریب مسلمان تھا اور نمازی اب قربانی اس کی ہوئی یا نہیں؟

الجواب، متروک التسمیہ ناسیاً حلال ہے، لہٰذا ذبیحہ بھی حلال ہے اور قربانی بھی درست ہے۔ (تتمہ ثانیہ ص ۲۰۰)

عدم تنفل بہ ذبح در محل غیر منقول

سوال (۶۲۰) جیسا کہ نفل نماز اور روزہ جب چاہے ادا کرے ثواب ہوتا ہے اسی طرح اگر ذی الحجہ کی دسویں، گیارہویں، بارہویں تاریخ کے علاوہ اور تاریخوں میں یا دوسرے مہینوں کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے واسطے اللہ تعالیٰ کے نام پر بغیر وجوب کے بکرا ذبح کرے تو ثواب ہوگا یا نہیں؟

الجواب، عن ابی ھریرۃ عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال لافرع ولا عتیرۃ قال والفرع اول نتاج کان ینتج لھم کانوا یذبحونہ لطواغیتھم والعتیرۃ فی رجب متفق علیہ وعن مخنف بن سلیم قال کنا وقوفا مع رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بعرفۃ فسمعتہ یقول یا ایھا الناس ان علی کل اھل بیت فی کل عام اضحیۃ وعتیرۃ ھل تدرون ما العتیرۃ ھی التی یسمونھا الرجبیۃ رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ وقال الترمذی ھذا حدیث غریب ضعیف الاسناد وقال ابوداؤد والعتیرۃ منسوخۃ کذا فی المشکوٰۃ قولہ لافرع وفی شرح السنۃ کانوا یذبحون لآلھتھم فی الجاھلیۃ وقد کان المسلمون یفعلون فی بدء الاسلام ای للہ سبحانہ ثم نسخ ونھی عنہ للتشبہ کذا فی المرقاۃ قولہ ولا عتیرۃ ھی شاۃ تذبح فی رجب یتقرب بھا اھل الجاھلیۃ والمسلمون فی صدر الاسلام قال الخطابی وھذا ھو الذی یشبہ معنی الحدیث ویلیق بحکم الدین الی قولہ فی النھایۃ کانت بالمعنی الاول فی صدر الاسلام ثم نسخ وفی شرح السنۃ کان ابن سیرین یذبح العتیرۃ فی رجب اھ ولعلہ مابلغہ النسخ ذکرہ مولانا علی القاری کذا فی الحاشیۃ علی الحدیثین المذکورین، ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ بجز دماء منقولہ کے کہ ان میں سے عقیقہ بھی ہے، دوسرے دماء سے تقرب غیر مشروع ہے نیز ان میں تشبہ بھی ہے مشرکین کے ساتھ کہ وہ تقرب کے لئے ایسا کرتے ہیں، نیز ہمارے علماء نے

تصریح فرمائی ہے کہ اراقۃ دم قربۃ غیر معقولہ یعنی خلاف قیاس ہے، پس خاص ہوگی وارد کے ساتھ اور صورت مسئولہ عنہا وارد نہیں لہذا بدعت ہے، ۷ ارذیحجہ ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۲۰۰)

تحقیق توجہ ذبیحہ یا ذابح بسوئے قبلہ

سوال (۶۲۱) ذبح میں ذبیحہ کا منہ قبلہ کی طرف ہونا شرعاً ضروری ہے یا ذابح کا منہ یا دونوں کا، اگر کوئی شخص جانور کا منہ قبلہ کی طرف یعنی پچھم کی طرف سر، دم پورب کی طرف کرکے لٹادے۔ اور خود دکھن کی طرف کھڑا ہو کر ذبح کرے تو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، ظاہراً کلام فقہا سے معلوم ہوتا ہے کہ ذابح کا منہ قبلہ کی طرف ہونا سنت ہے اور سنت بھی موکدہ اس کا ترک بلا عذر مکروہ ہے، کذا فی الدر المختار ورد المحتار، باقی ذبیحہ کے متعلق کہیں نظر سے صریحاً نہیں گذرا، ۲۵ رذی الحجہ ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۲۰۳)

حکم قربانی بقرۂ عقیمہ و بقرۂ حاملہ

سوال (۶۲۲) کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسائل مندرجہ ذیل میں۔

نمبر ۱۔ بانجھ گائے جس کو یہاں پر بہیلا گائے کہتے ہیں، اور اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک وہ جو کہ شروع ہی سے نہیں جنتی، دوسرے وہ کہ ایک بچہ جن کر پھر نہ جنے تو ایسی گائے کی قربانی درست ہے یا نہیں؟

ضمیمہ سوال اول نمبر ۲۔ ایک گائے قربانی کی نیت سے خریدی گئی بعد خریدنے کے معلوم ہوا کہ یہ تو گابھن ہے اور گابھن گائے کی قربانی کو عالمگیری میں مکروہ لکھا ہے، تو اس کے عوض میں دوسری گائے خرید کر قربانی کردے یا اسی کو رہنے دے اور سال آئندہ اس کو مع اس کے بچہ کے قربانی کردے اور قربانی کرنے والا غنی بھی ہے اور زمانہ قربانی کا بھی موجود ہے۔

الجواب، نمبر ۱۔ درست ہے،

نمبر ۲، اگر بچہ میں جان نہ پڑی ہو تب تو شبہ ہی نہیں، ورنہ بہتر ہے کہ دوسری کرلے اور اس گابھن کو جو چاہے کرے، البتہ اگر دوسری گائے کم قیمت ہو تو بقدر تفاوت قیمت کے خیرات کردے

ضمیمہ سوال نمبر ۳ اور اگر دوسری گائے کی تلاش میں زمانہ قربانی کا گذر گیا اور دوسری گائے نہ ملے اور وہ گابھن گائے اس کے پاس موجود رہے، یہاں تک کہ اس نے بچہ دیا تو اس کا دودھ کھانا درست ہے یا خیرات کردے؟

نمبر ۳ دودھ کھانا درست ہے اور اس کی قیمت کا تصدق بجائے قربانی کے واجب ہے اگر قربانی نہ کی ہو، محرم ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ ص ۷)

تحقیق عدم وجوب ضحیہ بر مسافر و وجوب صدقۂ فطر بر آں!

سوال (۶۲۳) مسافر جو مکان میں صاحب نصاب ہے

اس کو حالتِ سفر میں اگر قربانی و فطرہ دینے کی قدرت . . . .
ہو تو اس پر قربانی یا فطرہ واجب ہوگا یا نہیں، لیکن فی الحال سفر میں مقدار نصاب مال ساتھ نہیں ہے لیکن بوقت ضرورت منگانے پر قادر ہے ایسے شخص پر کیا حکم ہے؟

الجواب، فی الدر المختار باب المصرف وابن السبیل وھو کل من لہ مال لا معہ فی رد المحتار عن الفتح ولا یحل لہ ای لابن السبیل ان یاخذ اکثر من حاجتہ ج ۲ ص ۹۹ وفی الدر المختار باب صدقۃ الفطر علی کل حر مسلم ولو صغیرا مجنونا ذی نصاب فاضل عن حاجتہ الاصلیۃ وان لم یتم بہ ای بھذا النصاب تحرم الصدقۃ وتجب الاضحیۃ وشرطہا الاسلام والاقامۃ والیسار الخ۔ ان روایات سے یہ امور مستفاد ہوئے۔

۱ ایسے مسافر پر نہ صدقۂ فطر واجب ہے اور نہ قربانی، کیونکہ وجوب صدقہ و حرمت اخذ صدقہ مجتمع نہیں ہوتے، اور اس شخص کو زکوٰۃ لینا جائز ہے پس صدقہ فطر و قربانی واجب نہیں،

۲ ایسے شخص کو زکوٰۃ لینا گو درست ہے، مگر حاجت سے زیادہ نہ لے، اور دینے والا بھی اس سے تحقیق حاجت کی کر لے، زیادہ حاجت سے نہ دے۔

۳ اور اگر اس مسافر کے پاس نصاب ساتھ ہی موجود ہو تو قربانی تو پھر بھی واجب نہیں مگر صدقہ فطر واجب ہے۔

۴ لیکن اگر ایام قربانی میں مقیم ہو گیا تو پھر قربانی واجب ہو جاوے گی۔

۵ سفر سے مراد سفر شرعی ہے،　　۲۶ شوال ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ ص ۸۰)

جواز تصدق چرم قربانی بر غنی

سوال (۶۲۴) چرم قربانی غنی کو تصدق کر دینا جائز ہے یا نہیں اور وہ غنی بعد فروخت کرنے کے قیمت اپنے تصرف میں لا سکتا ہے یا نہیں،

الجواب، جلد کا حکم مثل لحم کے ہے، جس طرح لحم اضحیہ کا غنی کو دینا جائز ہے، اسی طرح جلد بھی غنی کو دینا جائز ہے، جب کہ اس کو تبرعاً دیا جاوے، اس کی کسی خدمت و عمل کے عوض میں نہ دیا جاوے اور جب اس غنی کی ملک کر دیا جاوے اس کو فروخت کر کے اپنے تصرف میں لانا بھی مثل دیگر اموال مملوکہ کے جائز ہے۔　　۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۰۵)

حکم چرم قربانی برائے متولی یا امام مسجد

سوال (۶۲۵) متولی یا امام مسجد جو غنی ہے اس کو بہ نیت عمارت مسجد یا مصالح مسجد دیدینا اور اس کا بعد فروخت کرنے کے عمارت یا مصالح مسجد میں خرچ کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر اس کو مالک بنا دیا ہے تو حکم اس کا اوپر گذرا لیکن اگر وہ متولی یا امام مسجد میں صرف نہ کرے تب بھی جائز ہے۔ اور اگر اس کو مالک نہیں بنایا بلکہ وکیل بنایا ہے تو اس کو کوئی ایسا تصرف کرنا جائز نہیں جو کہ مؤکل کے لئے ناجائز ہو، اس لئے اس کا یہ تصرف مذکور فی السوال درست نہ ہوگا۔

۱۸ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۰۵)

اشتراط تملیک در ثمن جلد اضحیہ مع چند سوالات وجوابات

سوال (۶۲۶) (۱) قربانی کے بعینہ چمڑے کو یہ کہہ کر کوئی مہتمم مدرسہ یا متولی مسجد کو دینا جائز ہے یا نہیں کہ اس کو بیچ کر دام یا جس طرح سے ہوسکے مدرسہ کی بنا یا مسجد کی بنا رہیں لگائے اور اس کی دلیل یا نقل کیا ہے؟

(۲) اس پر کیا دلیل ہے کہ مصارف قیمت جلود اضاحی بعینہ مصارف زکوٰۃ ہیں درحالیکہ کتابوں کے اندر ہے کہ بعد فروخت تصدق واجب ہے یعنی خود تصرف کرنا جائز نہیں ہے نہ کہ یہ صاف کہیں ہے کہ یہ صدقہ واجبہ ہے۔

(۳) کل صدقہ میں قبض یا تملیک شرط ہے، یا فقط واجبہ میں اگر سب میں ہے تو صدقہ جاریہ میں تو ممکن نہیں اس کا کیا جواب اور دلائل ہیں؟

(۴) یہ چمڑے کے فروخت سے جو کراہت آتی ہے وہ تحریمی ہے یا تنزیہی اگر تحریمی ہے تو علماء اس کا خلاف کیوں نہیں کرتے، اگر تنزیہی ہو تو اس سے جو روپیہ آئیگا وہ مال خبیث ہوگا یا نہ نیز مال خبیث سے اگر کوئی مدرسہ بنایا جائے تو اس کا کیا حکم ہوگا یہ دلائل مطلوب

(۵) کہیں صدقہ واجبہ و نافلہ کا تفصیل وار بیان ہے یا نہ، اگر ہے تو کون کتاب میں سارے دلائل وشواہد و حنفی مسلک پر ہونا چاہئے۔

الجواب (۱) یہ صریح توکیل ہے اور وکیل کو وہی تصرف جائز ہے، جو مؤکل کو جائز ہے اور تصرف مذکور فی السوال خود مؤکل کو بھی جائز نہیں، لہٰذا وکیل کو بھی جائز نہیں۔

(۲) صدقہ واجبہ کے تو یہی معنی ہیں کہ تصدق اس کے ساتھ واجب ہے کیونکہ صدقہ تو اعیان سے ہے اور وجوب صفت ہے فعل کی تو اعیان کا اس کے ساتھ موصوف ہونا مجاز اہی حقیقت اسکی فعل لازم ہے پس اس کا وجوب ہے پس جب تصدق کو واجب مان لیا، اسی سے اس صدقہ کا واجب ہونا بھی بالمعنی المذکور لازم آگیا، اور بجز اس کے تو کوئی معنی ہی نہیں پس صدقہ واجبہ ہونا اسکا ثابت ہو گیا تو اب اس کے صدقہ واجبہ کے مصارف ہیں کیا شبہ رہا یہی دلیل اس پر کافی ہے۔

(۳) چونکہ عین تو جاری ہے نہیں اس کے منافع جاری ہیں اور وہ محل ملک ہیں جیسا اجارہ میں تملیک منافع بعوض اور اعارہ میں بلا عوض کی تصریح کی گئی ہے، پس تخلف ملک کا صدقہ سے کہاں لازم آیا،

فقہا، کا علی الاطلاق یہ کہنا الصدقۃ کالہبۃ لاتصح غیر مقبوضۃ ولا فی مشاع، پھر ہبہ کی تعریف میں تملیک العین کہنا ردالروایتان فی الدر المختار وغیرہ) صاف دلیل ہے کہ مطلق صدقہ میں تملیک شرط ہے اور اگر واجب ہی کے ساتھ بھی خاص کیا جاوے تو اس کا واجب ہونا بھی اوپر ثابت ہوگیا،

(۴) عینی شرح کنز میں ہے ولو باعہا بالدراہم لیتصدق بہا جاز الخ اس سے معلوم ہوا کہ اس نیت سے بیع کرنے میں کچھ کراہت نہیں۔

(۵) درمختار باب مصرف الزکوٰۃ میں بقدر ضرورت یہ احکام مذکور ہیں، ۴ محرم ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۰۰)

جواز قربانی غنم متعددہ از اشخاص متعددہ بالاشتراک

سوال (۶۲۷) زید اور عمرو دو بھائی ہیں، ان کا مال ایک جگہ جمع ہے اور کھانا پینا علیحدہ ہے، یہ ہمیشہ اس مال ہی سے قربانی کرتے ہیں مگر اس طریق سے کرتے ہیں کہ حصہ مقرر نہیں کرتے، صرف دو حصے ہوگئے ہیں اور کبھی چار ہوجاتے ہیں کہ ایک ماں کا ایک باپ کا، بس، آیا اس طریق سے قربانی کرنا درست ہوجاوے گی یا نہیں، اگر اس طریق سے درست نہ ہو تو طریق بتلا دیجئے؟

الجواب - فی العالمگیریۃ عن الاضاحی للزعفرانی اشتری سبعۃ نفر سبع شیاہ بینہم ان یضحوا بہا بینہم ولم یسم لکل واحد منہم شاۃ بعینہا فضحوا بہا کذالک فالقیاس ان لا یجوز وفی الاستحسان یجوز فقولہ اشتری سبعۃ نفر سبعۃ شیاہ بینہم یحتمل شراء کل شاۃ بینہم ویحتمل شراء شیاہ علی ان یکون لکل واحد شاۃ ولکن لا بعینہا فان کان المراد ھو الثانی فما ذکر فی الجواب باتفاق الروایات لان کل واحد منہم یصیر مضحیا شاۃ کاملۃ وان کان المراد ھو الاول فما ذکر فی الجواب علی احد الروایتین فان الغنم اذا کانت بین رجلین ضحیا بہا ذکر فی بعض المواضع انہ لا یجوز کذا فی المحیط شاتان بین رجلین ذبحاھما عن نسکیہما اجزاھما بخلاف العبدین بین اثنین اعتقہما عن کفارتہما لا یجزاہ ج ۶ ص ۲۰۵، اس سے معلوم ہوا کہ صورت مسئولہ میں قربانی درست ہوجاوے گی، باقی بہتر یہ ہے کہ ہر جانور پر ایک خاص شخص کا نام لگا دیا جاوے کہ یہ فلانے کی طرف سے ہے اور وہ فلانے کی طرف سے۔

(۳ شوال ۱۳۳۲ھ تتمہ ثانیہ ص ۱۷۶)

حکم تضحیہ بساقط القرن

سوال (۶۲۸) ایک گائے جس کا ایک سینگ گر گیا ہے اور تین باقی ہیں، قربانی کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب ، فی رد المحتار وفی الابل والبقر ان ذهبت واحدۃ یجوز او اثنتان لا ، ج ۵ ص ۳۱۷ ، اس سے معلوم ہوا کہ ایسی گائے کی قربانی جائز ہے ، ۲۳ ذیقعدہ ۱۳۳۱ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۹۲)

حکم اکل واطعام اغنیاء از اضحیہ منذورہ -

سوال (۶۲۹) اضحیہ منذورہ سے ناذر کو کھانا اور غنی کو کھلانا جائز ہے یا نہیں بظاہر تو اراقت دم سے نذر کا ایفا ہوگیا ، اب لحم کا مثل اضحیہ مطلقہ کے حکم ہونا چاہیے ، جو تحقیق ہو ارشاد فرمائیں -

الجواب فی العالمگیریۃ نذر ان یضحی ولم یسم شاۃ فعلیہ شاۃ ولا یاکل منہا وان اکل علیہ قیمتہا کذا فی الوجیز للکردری ج ۶ ص ۱۹۸ وفیہا ان وجبت بالنذر فلیس لصاحبہا ان یاکل منہا شیئا ولا ان یطعم غیرہ من الاغنیاء سواء کان الناذر غنیا او فقیرا لان سبیلہا التصدق ولیس للمتصدق ان یاکل صدقتہ ولا ان یطعم الاغنیاء کذا فی التبیین ج ۶ ص ۲۰۱ ، ان روایات سے ثابت ہوا کہ اضحیہ منذورہ سے نہ خود ناذر کو کھانا جائز ہے اور نہ غنی کو کھلانا جائز ہے ، ۲ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۹۲)

جواز اکل معسر از اضحیہ خود

سوال (۶۳۰) بندہ نے ایک بکرا لیکر پالا برائے قربانی گرچونکہ بندہ صاحب نصاب نہیں تھا ، اس واسطے ایک مولوی صاحب نے فرمایا کہ تم اس بکرے کی قربانی سے خود گوشت نہیں کھا سکتے کیونکہ تم صاحب نصاب نہیں ہو ، اور یہ بکرا تمہارا بارادہ قربانی خرید کیا ہوا بجائے نذر معین کے سمجھا جائے گا ، میں نے ایک دوسرے مولوی صاحب سے جاکر استفسار کیا تو انھوں نے ارشاد فرمایا کہ کچھ حرج نہیں تم بلا شک کھا سکتے ہو بحوالہ کتب معتبرہ مسئلہ حق سے مطلع فرما کر ممنون ومشکور فرماویں۔

الجواب ، فی العالمگیریۃ ولہ ان یدخر الکل لنفسہ فوق ثلثۃ ایام الا ان اطعامہا والتصدق بہا افضل الا ان یکون الرجل ذا عیال وغیر موسع الحال فان الافضل لہ حینئذ ان یدعہ لعیالہ ویوسع بہ کذا فی البدائع ان وجبت بالنذر فلیس لصاحبہا ان یاکل منہا شیئا ولا ان یطعم غیرہ من الاغنیاء سواء کان الناذر غنیا او فقیرا ج ۶ ص ۲۰۱ ، اس روایت سے معلوم ہوا کہ جب زبان سے نذر کرلے اس کا کھانا تو خود جائز نہیں اور جو نذر نہ کی ہو گو مثل نذر کے اس پر واجب ہو گیا ہو اس کا کھانا جائز ہے کما یدل علیہ قولہ غیر موسع الحال ،

۱۰ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۲۰۱)

مبادلہ لحم بچرم قربانی

سوال (۶۳۱) یہاں چرم قربانی قصاب کو دیتے ہیں اور اُن سے بعوض چرم قربانی محرم میں گوشت لے کر خود کھاتے ہیں اور کھلاتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب۔ جن بلاد میں چرم وزن سے فروخت ہوتا ہے وہاں تو یہ بیع ہی درست نہیں، کہ یہ دلہ موزون کا موزون سے نسیئۃً ہوا ہے، اور جن بلاد میں عدداً فروخت ہوتا ہے وہاں یہ بیع تو درست ہے جب گوشت کی مقدار اور صفت پورے طور پر بیان کردی جاوے لیکن اس کے عوض میں جو گوشت آویگا اس سب کا خیرات کرنا مساکین پر واجب ہے اگر خود کھا دیگا یا غنی کو کھلا دیگا اتنی مقدار کی قیمت کا تصدق واجب ہوگا فی الدر المختار لا بما یستھلک کخل ولحم ونحوہ کدراھم فان بیع اللحم او الجلد بہ ای بمستھلک او بدراھم تصدق بثمنہ اھ قلت ولا تغلط بما فی رد المحتار عن القنیۃ اشتری بلحمھا ماکولا فاکلہ لم یجب علیہ التصدق بقیمتہ استحسانا اھ ج ۵ ص ۳۲۱، لانہ مخصوص باللحم دون الجلد والفرق ان اللحم ماکول دون الجلد فاقیم ماکول مقام الماکول دون غیر الماکول، ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ (تتمہ ثانیہ ص ۲۰۱)

سوال (۶۳۲) ذبح کرنا گائے بھینس وغیرہ کا کب سے جاری ہوا ہے اس معاملہ میں آیۃ قرآن مجید و حدیث شریف جو ہوں مطلع فرماویں گے	تحقیق بودن ذبح انعام از عہد آدم علیہ السلام

الجواب۔ جب کہ حضرت آدم علیہ السلام زمین پر تشریف لائے جب ہی سے ان جانوروں کی ذبح کرنا بحکم الٰہی جاری ہے، حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں ہابیل وقابیل کا قصہ قرآن شریف میں مذکور ہے کہ ہابیل نے قربانی کی تھی، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوئی اور وہ جانوران کی قربانی کا یا اونٹ تھا یا مینڈھا علی اختلاف روایات التفسیر قال اللہ تعالیٰ اذ قربا قرباناً فتقبل من احدھما ولم یتقبل من الاٰخر الآیۃ وہابیل صاحب ضرع وقرب جملا سمینا، بیضاوی ۱۲ وھو کبش لھابیل، جلالین ۱۲ اور جب سے اب تک سب امتوں میں ان جانوروں کا ذبح کرنا جاری و مشروع رہا۔ قال اللہ تعالیٰ لبنی اسرائیل ان اللہ یامرکم ان تذبحوا بقرۃ الآیۃ وقال تعالیٰ انعاماً علینا اللہ الذی جعل لکم الانعام لترکبوا منھا ومنھا تاکلون الآیۃ، ۱۲ محرم ۱۳۱۸ھ واللہ اعلم (امداد ج ۳ ص ۱۵۵)

سوال (۶۳۳) کتاب احکام العیدین مصنفہ نواب قطب الدین	حکم تسمیہ بر اعانت کنندہ در ذبح

خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں ایک مسئلہ دیکھا جس سے سخت تردد ہوا، اس لئے بغرض اطمینان خدمت والا میں ارسال کرتا ہوں، امید ہے کہ جواب شافی سے جلد سرفراز فرمایا جاوے، اول انھوں نے ایک حدیث نقل کی ہے وھو ھذا وعن ابی الاسد الاسلمی عن ابیہ عن جدہ قال کنت سابع سبعۃ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ثم بعد کلام طویل) فامر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاخذ رجل برجل ورجل برجل ورجل بید ورجل بید ورجل بقرن ورجل بقرن وذبحھا السابعۃ وکبرنا جمیعا رواہ احمد، اس کے ترجمہ کے بعد نواب صاحب نے

ایک فائدہ تحریر کیا ہے وہ بھی بعینہٖ منقول کرتا ہوں۔

ف، اس سے یہ معلوم ہوا کہ جو ذبح کرے قربانی کو اور جو شخص قربانی کے ہاتھ پاؤں وغیرہ پکڑے ہوئے ہوں سب تکبیر کہیں، اور اپنے استاد مکرم حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب سے سنا میں نے، کہ فرماتے تھے ضرور ہے قربانی کے گلے یا ہاتھ پاؤں وغیرہ پکڑنے والے کو کہ وہ بھی بسم اللہ کہے، اگر نہ کہے تو وہ جانور حرام ہوتا ہے اھ مجھے تو یہ یاد تھا کہ اگر دو آدمی یا زائد ذبح میں شرکت کریں کہ چھری پر سب ہاتھ ڈالیں تو ہر ایک پر تسمیہ واجب ہے اور اگر ذبح میں شرکت نہ کریں تو محض ہاتھ وغیرہ پکڑنے والوں پر تسمیہ واجب نہیں بلکہ اس صورت میں تسمیہ صرف ذابح کے ذمہ واجب ہے، اور وہی کافی ہے شامی میں صورت اول یعنی شرکت الاثنین فی الذبح کا حکم وجوب علی کل واحد تو مل گیا۔ مگر صورت ثانیہ کا حکم یعنی جب کہ ذابح صرف ایک شخص ہو اور دوسرے آدمی ہاتھ پیر پکڑنے والے ہوں نہیں ملا فبینوا بالتفصیل ولکم عند اللہ الاجر الجزیل۔

الجواب، عالمگیریہ و قاضی خاں و درمختار وغیرہا میں جہاں وجوب تسمیہ علی المعین فی شرط اسلامیہ کو لکھا ہے، وہاں ہی اعانت کی تفسیر ان الفاظ سے کی ہے وضع صاحب الشاۃ علی السکین یدہ مع ید القصاب حتی یتعاونا علی الذبح او عجز عن مد قوسہ فاعانہ علی یدہ مجوسی او اخذ مجوسی بید المسلم فذبح والسکین فی ید مسلم اس سے صاف ظاہر ہے کہ جس پر یہ تفسیر صادق نہ آتی ہو وہ شخص معین واجب علیہ التسمیہ نہیں، وقد صرحوا ان مفاہیم الکتب الفقہیۃ حجۃ، پس صرف ہاتھ پاؤں پکڑنے والے پر تسمیہ واجب نہیں، فتاویٰ سعدیہ قلمی صفحہ ۱۱۲ میں اس پر کافی بحث ہے، پس نواب صاحب کی تحریر میں جو اشتباہ ہے کہ معین کو مطلق سمجھ گئے، اور تفسیر پر باعتبار قید احترازی نظر نہیں فرمائی، شاید تمثیل سمجھا ہو، اور حضرت استاد سے جو نقل فرمایا ہے ممکن ہے کہ اس کا بھی یہی منشا ہو، یا یاد میں خلط ہو گیا ہو یا عدم تدبر فی الحدیث سبب ہوا ہو احتجاج بالحدیث کا، ورنہ تھوڑا سا غور کرنے سے صاف ظاہر ہے کہ حدیث سے صرف وقوع تسمیہ کا ثابت ہے اور وقوع مستلزم وجوب نہیں، ممکن ہے کہ یہ وقوع بطور استحباب ہوا ہو، اور استحباب کے انکار کی کوئی وجہ نہیں، اور لفظ امر کا معمول حدیث میں اغذ سے ذکر ؟ تکبیر فقط، قرب ۱۳۳۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۳۹)

علت وجوب ذبح شاۃ ثانیہ بر فقیر نہ بر غنی | **سوال** (۲۳۴۶) میں بہشتی زیور حصہ تیسرا دیکھ رہا ہوں صفحہ ۴۴ بیان قربانی مسئلہ ۱۲ کی یہ عبارت ہے، اگر قربانی کا جانور کہیں گم ہو گیا اس لئے

دوسرا خرید اپھر وہ پہلا بھی مل گیا اگر امیر آدمی کو ایسا اتفاق ہو تو ایک ہی جانور کی قربانی اس پر واجب ہوگی، یہ عبارت ۱۲ کے مسئلہ صفحہ ۴۴ بہشتی زیور میں درج ہے یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ غریب پر دونوں جانوروں کا بار اور امیر پر صرف ایک جانور کا بار۔

الجواب۔ اس بار کی وجہ خود اس غریب کا دوسرا جانور خرید کرلینا ہے، اگر یہ دوسرا جانور نہ خرید تا تو اس کے ذمہ کچھ بھی نہ تھا، پھر اگر پہلا بھی مل جاتا تو اس کے ذمہ وہی ایک رہتا کہ وہ بھی خریدنے ہی سے واجب ہوا تھا، سو جب اس نے دوسرا خرید لیا وہ بھی واجب ہوگیا اور امیر آدمی پر خود شرع سے قربانی واجب ہے گو نہ خریدے تب بھی خریدنا واجب ہے اور یہ واجب ایک ہی ہے پس خواہ کتنے ہی خریدے وہ ایک ہی واجب رہیگا، اور اگر پہلا نہ ملتا تو دوسرا خریدنا واجب ہوتا اور غریب آدمی جتنے خرید تا جائے گا سب واجب ہوتی جائیں گے، ۷ رمضان المبارک ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۷)

دلیل عدم جواز صرف ثمن چرم قربانی در مسجد

سوال (۶۳۵) احقر نے قربانی کے مسائل کو گجراتی زبان میں کیا ہے آپ نے جو مسائل بہشتی زیور کے تیسرے حصہ میں درج کئے ہیں اس کے متعلق وھو ہذا، مسئلہ ۷ قربانی کی کھال یا تو یوں ہی خیرات کردے الخ مسئلہ ۱۲ اس کھال کی قیمت کو مسجد کی مرمت الخ یہ عرض ہے کہ یہ کہاں سے لئے گئے ہیں اور کون سی کتاب کے ہیں، مجھ کو اپنی گجراتی زبان میں اس کا حوالہ دینا ہے، کیونکہ لوگ یہاں اس مسئلہ میں مختلف ہیں، آپ مہربانی فرماکر حوالہ اس کا مرحمت فرمادیں۔

الجواب۔ یہ احکام مختلف ابواب سے لئے ہیں، فی الدر المختار فان بیع اللحم او الجلد بہ ای بمستھلک او بدراھم تصدق بثمنہ وفیہ کتاب الھبۃ وصدقۃ کالھبۃ لاتصح غیر مقبوضۃ وفیہ ھو ای الھبۃ تملیک العین مجانا وفیہ باب المصرف للزکوٰۃ وجازت التطوعات من الصدقات وغلۃ الاوقاف لھم الخ، ان روایات سے ثمن جلد کے تصدق کا وجوب اور تصدق میں اشتراط تملیک اور صدقات واجبہ کا مصرف مثل زکوٰۃ کے ہونا ثابت ہوا اور اس مجموعہ سے وہ احکام مجموعی ثابت ہوئے، ۴ ذیقعدہ ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۹۷)

تحقیق وقف چرم قربانی در مسجد

سوال (۶۳۶) کھال قربانی کے عین سے انتفاع جائز ہے پس اسی طرح اگر کسی غنی کو یا سید کو دیدیا جاوے تو بظاہر جائز معلوم ہوتا ہے، البتہ فروخت

کرکے غنی کو یا سید کو دینا جائز نہ ہوگا کہ تصدق واجب ہے، اب بعد عین کے ہبہ کر دینے کے سید اور غنی کو فروخت کر دینے کا اور قیمت اپنے مصرف میں لانے کا اختیار ہے یا نہیں، ظاہر شق اول ہے پس اگر یہ صحیح ہے تو اگر کوئی شخص مسجد میں وقف کر دے تب بھی جائز ہوگا، پھر متولی مسجد کو اختیار ہوگا کہ بعد فروخت کے اس کی قیمت جس مصرف میں چاہے خرچ کر دے، البتہ اگر متولی کو وکیل بنائے اور وہ وکالۃ بیچے اور پھر اجازت سے مسجد میں صرف کرے تو بوجہ عدم تملیک درست نہ ہوگا، علیٰ ہذا اگر خود ہی بطریق نیابت عن الفقراء فروخت کر ڈالے تب بھی بظاہر تصدق واجب کے شرائط ضروری معلوم نہیں ہوتے یعنی سیدوں کو غیرہ کو دینا جائز معلوم ہوتا ہے بلکہ اس طریق سے تو حجاز ریلوے میں بھی دینے کی گنجائش نکلتی ہے، اور مدارس میں جو کھالیں آتی ہیں ان کا مہتمم کو بعد فروخت تمام ضروریات مدرسہ میں خرچ کرنا جائز ہوگا خواہ تملیک پائی جائے یا نہیں

الجواب، فی الدر المختار تعریف الوقف حبسہا علی حکم ملک اللہ تعالیٰ وصرف منفعتہا علی من احب وفیہ فاذا تم ولزم لایملک ولایملک وفیہ وکما صح ایضاً وقف کل منقول قصداً فیہ تعامل للناس کفأس وقدوم بل ودراہم ودنانیر وفی ردالمحتار ان الدراہم لاتتعین بالتعیین وان کانت لاینتفع بہا مع بقاء عینہا لکن بدلہا قائم مقامہا لعدم تعینہا فکانہا باقیۃ اھ وفیہ یدفع الدراہم مضاربۃ ثم یتصدق بہا فی الوجہ الذی وقف علیہ الخ وفیہ فوقف الدراہم متعارف فی بلاد الروم دون بلادنا ووقف الفاس والقدوم کان متعارفاً فی زمن المتقدمین ولم نسمع بہ فی زماننا فالظاہر انہ لایصح الآن ولئن وجد نادراً لایعتبر لما علمت من ان التعامل ھو الاکثر استعمالاً فتامل اھ، اس عبارت سے چند امور مستفاد ہوئے۔

۱ وقف میں حبس عین ضروری ہے حقیقۃً یا حکماً اس طرح کہ اس کا بدل باقی رکھا جاوے ۲ وقف منقول ان ہی اشیاء کے ساتھ خاص ہے جس میں اس کا عرف ہو۔ ۳ بجز وجہ موقوف علیہ کے دوسرے مصرف میں صرف کرنے کا متولی کو اختیار نہیں۔

اب دیکھنا چاہیے کہ اول تو مساجد میں جو لوگ کھال دیتے ہیں ان کا قصد وقف کا نہیں ہوتا دوسرے اگر قصد بھی ہو تو بوجہ عرف نہ ہونے کے صحیح نہیں اور شاذ و نادر کسی کا عمل پایا جاتا قابل اعتبار نہیں، تیسرے اگر صحیح بھی ہو تو اس چرم قربانی کا باقی رہنا شرط ہوگا، حقیقۃً مثلاً ڈول یا جانماز بنالی جائے یا حکماً کہ اس کو فروخت کرکے بقدر اس کے ثمن کے ہمیشہ باقی

رکھا جاوے اور اس کی منفعت وجہ خیر میں صرف ہوتی رہے، چوتھے منفعت بھی اس کی اسی مصرف میں ہو سکے گی جس میں واقف نے تعیین کی ہے نہ یہ کہ متولی جہاں چاہے، اور ان سب امور کا فقدان ظاہر ہے، پس مسجد میں وقف صحیح نہیں، اور واقع بھی نہیں، بلکہ مقصود توکیل ہی ہوتا ہے اور نیابت کے لئے اول تو نابت کی حاجت اور اگر اس میں وسعت کر لی جائے تاہم ضرور ہے کہ فقراء ہی کو دے، کیونکہ انھوں نے حکماً وتقدیراً اپنی منفعت کے لئے نائب بنایا ہے، نہ کہ جانوروں کے لئے وغیرہ کے لئے اور اگر اس تاویل سے سیدوں کے لئے گنجائش نکالی جائے تو بھی مشکل ہے کیونکہ واقع میں تو نہیں ہوئی صرف کراہت بیع کیلئے تاویل کی جا سکتی ہے، سواس سے مصرف ثمن کا نہیں بدل سکتا و بظاہر کلہ متامل، واللہ اعلم اور مضمون وقف سے پہلے سوال میں جتنا مضمون ہے سب صحیح ہے،

۱۶ محرم ۱۳۲۵ھ (امداد، ج ۲ ص ۱۰۷)

عدم جواز تضحیہ درصورت کمی عمر یک ہفتہ

سوال (۶۳۷) ایک بکرا عید الاضحیٰ تک آٹھ یوم کم ایک سال کا ہوگا ویسے وہ نہایت فربہ اور تیار ہو گیا ہے، جوان ہر دانت بھی کر لئے ہیں مگر سال سے آٹھ یوم کم کی اس کی عمر بقر عید تک ہوگی وہ بکرا قربانی اس عید پر ہو سکتا ہے یا نہیں۔

الجواب۔ فی العالمگیریۃ وتقدیر ھذہ الاسنان بما قلنا یمنع النقصان ولا یمنع الزیادۃ حتی لو ضحی باقل من ذلک شیئاً لا تجوز ولو ضحی باکثر من ذلک شیئاً یجوز ویکون افضل ج ۶ ص ۱۹۹، اس روایت میں لفظ شیئاً میں تصریح ہے کہ صورت مسئولہ میں اس کی قربانی درست نہیں۔ ۲ ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۱۱۴)

سوال (۶۳۸) کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ قربانی کا جانور مثلاً بکرا اگر پورا سال ہونے میں ایک آدھ روز کم ہو اس کی قربانی ہو سکتی ہے یا نہیں، علی ہذا القیاس، گائے کے دو سال پورے ہونے میں بھی اگر ایک دو روز کم ہوں قربانی ہو جاوے گی یا نہیں؟

الجواب۔ نہیں ہوگی۔ فی العالمگیریۃ وتقدیر ھذہ الاسنان بما قلنا یمنع النقصان ولا یمنع الزیادۃ حتی لو ضحی باقل من ذلک شیئاً لا تجوز ج ۶ ص ۱۹۹ قلت قولہ شیئاً یعم یوماً او یومین۔ ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۳۴ھ (تتمہ خامسہ ص ۳۱۵)

حکم ذبح بطور نذر یا شکر

سوال (۶۳۹) کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین

اس مسئلہ میں کہ زید نے نذر مانی کہ اگر میرا فلاں کام پورا ہو گیا اور مجھے اس میں کامیابی ہو گئی تو میں
اللہ کے نام پر ایک بکرا یا گائے ذبح کروں گا یا نذر تو نہیں مانی، اگر یوں ہی کسی مطلب برآری کے
شکریہ میں کوئی جانور ذبح کر کے اس کا گوشت مساکین اور غربا کو تقسیم کر دیا تو آیا اس کی یہ نذر یا
اس کا یہ فعل جائز بھی ہے یا نہیں۔ مع حوالہ کتب و نقل اسناد جواب مرحمت فرمایئے۔ بینوا توجروا

الجواب۔ فی الدر المختار ولو قال ان برئت من مرضی هذا ذبحت شاة او
علی شاة اذبحها فبرئ لا یلزمه شیء لان الذبح لیس من جنسه فرض بل واجب
کالاضحیة فلا یصح الا اذا زاد وا تصدق بلحمها فیلزمه لان الصدقة من جنسها
فرض وهی الزکاة فتح وبحر اه وفی رد المحتار عن الخانیة قال ان برئت من مرضی
هذا ذبحت شاة فبرئ لا یلزمه شیء الا ان یقول فللہ علی ان اذبح شاة اه
ثم قال لان قوله ذبحت شاة وعد لا نذر ثم قال لم یجب (ای الصوم) مالم
یقل للہ علی وفی الاستحسان یجب اه ج ۳ ص ۱۰۷، ان عبارات سے معلوم ہوا کہ اگر
اس طرح نذر کی کہ میں ذبح کر کے مساکین کو کھلا دوں گا، یا دے دوں گا تب تو یہ نذر بالاتفاق
منعقد ہو جاوے گی، اور اگر مساکین کو کھلانے یا دینے کا ذکر نہیں کیا، صرف اتنا ہی کہا کہ ذبح
کروں گا تو اس نذر کی صحت میں اختلاف ہے، مگر علامہ شامی نے ترجیح صحت کو دی ہے، کما
قال بعد العبارة المذکورة ویؤیده ایضا ما قدمناه عن البدائع وبه یعلم ان
الاصح ان المراد بالواجب ما یشمل الفرض والواجب الاصطلاحی لا خصوص الفرض
فقط اه قال العبد الذی اسرف علی نفسه ویرد علیه ان من شرائط صحة النذر
کون المنذور به قربة مقصودة وقد صرح الفقهاء بان الاراقة غیر معقولة مختصة
بزمان مخصوص ویلزم منه کون الاراقة فی غیر ذلک الزمان غیر قربة فکیف
انعقد النذر به واجاب عنه بعض احبابی بانه لعل المراد اعم من ان یکون
نفس المنذور به قربة او یکون جنس المنذور به قربة فالاراقة فی غیر زمان
مخصوص وان لم یکن قربة لکن الاراقة فی زمان مخصوص التی هی من
جنسها قربة فیصح النذر وعورض اولاً بانه خلاف الظاهر فیحتاج الی نقل
صریح وثانیا بانه معارض بنقل صریح وهو ما فی الدر المختار وکان من جنسه
واجب وهو عبادة مقصودة فی رد المحتار هو عبادة مقصودة الخ فلیراجع

للنذر یعنی المنذور وراہ وفی فتح القدیر مما ھو طاعۃ مقصودۃ لنفسھا ومن جنسھا واجب ج ۴ ص ۴ ،۳ وفی رد المحتار بعین العبارۃ المذکورۃ فھذا اصریح فی ان الشرط کون المنذور نفسہ عبادۃ مقصودۃ لاما کان من جنسہ ج ۳ ص ۱۰۲ ثم بدا الی جواب وھو انا سلمنا ان القیاس یقتضی عدم صحۃ ھذا النذر کما قالہ المورد لکنا ترکنا القیاس بالنص وھو ما رواہ ابوداؤد فی سننہ ان رجلا قال یا رسول اللہ انی نذرت ان انحر بوانۃ قال اھنا وثن من اوثان المشرکین او عید من اعیادھم قال لا قال فاوف بنذرک الحدیث کما ان النذر بذبح الولد قلنا بصحتہ وانہ یجب فیہ شاۃ مع کون ذبح الولد غیر قربۃ ومعصیۃ لکنا ترکنا القیاس بالنص کما فی الدر المختار نذر ان یذبح ولدہ فعلیہ شاۃ لقصۃ الخلیل علیہ السلام ج ۳ مع رد المحتار ص ۱۰۲، یہ کلام تو نذر میں تھا اور اگر بلا نذر بطور شکر کے ذبح کرے، اس میں دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ خود ذبح مقصود نہیں بلکہ مقصود اعطاء یا اطعام مساکین ہے، اور ذبح محض اس کا ذریعہ ہے سہولت کے لئے، اور علامت اس تصدق کے مقصود ہونے اور ذبح کے مقصود نہ ہونے کی یہ ہے کہ اگر اتنا ہی اور ویسا ہی گوشت کسی دکان پر مل جائے تو انشراح خاطر سے اس پر اکتفا کرے ذبح کا اہتمام نہ کرے، تب تو یہ ذبح جائز ہے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ خود ذبح ہی مقصود ہو اور ذبح ہی کو مخصوص طریقۂ شکر و قربت سمجھے، سو قواعد سے یہ درست معلوم نہیں ہوتا، لما ان الاراقۃ فی غیر محال واردۃ لم یعرف قربۃ وھذا المزید فیہ نقل کما قد علمت فی تقریر الایراد والجواب عنہ اور یہاں تک جواب ہوگیا اجزائے سوال کا اور اس سے ایک اور صورت کا حکم بھی معلوم ہوگیا جس سے استفتاء میں تو تعرض نہیں کیا گیا، مگر سائل کے خط میں اس کا بھی ذکر ہے، اس عبارت سے کہ جہاں کوئی ایسی ویسی بات پیش آئی، اور بھیڑ یا بکری ذبح کر کے صدقہ کر دیا، محض اللہ کے نام پر الخ اور اس عبارت کے بعد کسی عالم کا جن کی تعیین نہیں کی، قول بھی نقل کیا کہ یہ فعل قطعاً ناجائز ہے الخ اسی طرح خصوصیت کے ساتھ اکثر عوام بلکہ متاز لوگوں میں یہ رسم ہے کہ مریض کی طرف سے جانور ذبح کرتے ہیں یا وبا وغیرہ کے دفع کے لئے ایسا ہی کرتے ہیں، سو چونکہ قرائن قویہ سے ان مواقع پر بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود ذبح ہی مقصود ہے اور اسی کو موثر فی دفع البلاء، خصوص مرض کی حالت میں اس ذبیحہ کو من حیث الذبح فدیہ سمجھتے ہیں، سو اس کا حکم بھی قواعد سے عدم جواز معلوم ہوتا ہے۔ لما مر من قولہ ان الاراقۃ فی غیر

محال وارادۃ الخ ولا یقاس علی العقیقۃ لانہ غیر معقول فلا یتعدی۔ بلکہ اعتقاد موثریت یا فدائیت کی حالت میں تو نذر بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی، لانہ اعتقاد من غیر دلیل فیکون العمل معہ بدعۃ وبالبدعۃ لاینعقد النذر، البتہ اگر یہاں بھی ذبح مقصود نہ ہو محض اعطاء اور اطعام مقصود ہو جس کی علامت اوپر مذکور ہو چکی تب جائز ہے۔ لکنہ بعید من حال عوام الناس فالاحوط منعہم مطلقا من مثل ھذا، اسی طرح اگر تتبع سے کسی موقع پر متکلم فیہا سے کسی روایت کا ورود ثابت ہو جاوے وہاں اس نص کے مقابلہ میں قیاس کو ترک کر کے جواز کا حکم کر دیں گے، بشرط سلامت اعتقاد من موثرت وغیرہا کما نقل فی التفسیر المظہری عن عمرؓ انہ ذبح ناقۃ غالیۃ الثمن لما ختم البقرۃ شکراً للہ تعالی فلو ثبت بدلیل صریح صحیح ان مقصودہٗ کان الشکر بخصوص طریق الذبح فیحکم علی مثلہ بالجواز ایضاً لکن محض الاحتمال لایکفی لصحۃ الحکم بالجواز لان الاصل وھو کون الاراقۃ غیر معقول لایعدل عنہ لمحض الاحتمال بل الغالب بشہادۃ الذوق من مثل عمرؓ ان مقصودہ کان الاطعام وکان تخصیص الذبیحۃ لطیب لحمہا وغلاء ثمنہا، ھذا ما عندی فی ھذا الباب واللہ اعلم بما عندہ من الصواب۔ کتبہ اشرف علی، ۱۲ر شوال ۱۳۳۳ھ

(تتمہ ثالثہ ص ۱۵۵)

حکم قربانی گوسفند خنثیٰ

سوال (۴۴۰) فی العالمگیریۃ لایجوز التضحیۃ بالشاۃ الخنثیٰ لان لحمہا لاینطبخ اھ وفی الدر المختار ولا بالخنثیٰ لان لحمہا لاینضج آہ یہ روایت صحیح ہے یا نہیں، اگر کسی نے اتفاقاً خنثیٰ بکرے کی قربانی کر لی اور وہ علت عدم جواز کی نہ پائی گئی، یعنی گوشت اچھی طرح سے پک گیا، تو قربانی جائز ہو گئی یا نہیں؟ خنثیٰ سے مطلق خنثیٰ مراد ہے یا خنثیٰ مشکل؟ یہاں کے علماء اس بابمیں دو فریق ہو گئے، حضرت کے جواب کے لئے سب منتظر ہیں،

الجواب۔ در مختار کے قول مذکور کے تحت میں صاحب رد المحتار نے کہا ہے وھذا التعلیل اندفع ما اوردہ ابن وھبان من انہا لا تخلو اما ان تکون ذکرا او انثیٰ وعلی کل تجوز آہ ج ۵ ص ۳۱۷، اس تقریر سے دو امر مستفاد ہوئے، ایک یہ کہ لان لحمہا الخ علت ہے حکمت نہیں، اور ظاہر ہے کہ علت کے ارتفاع سے حکم مرتفع ہو جاتا ہے، پس جب گوشت اچھی طرح پک گیا

تو قربانی کو صحیح کہا جاوے گا، دوسرا امر یہ مستفاد ہوا کہ خنثیٰ سے مراد خنثیٰ مشکل ہی ہے مطلق خنثیٰ نہیں کما یدل علیہ قولہ لا تخلو اما ان تکون ذکرا او انثیٰ، ورنہ ظاہر ہے کہ غیر مشکل کا ذکر یا انثیٰ ہونا متعین ہے، اور اس تقریر سے سوال کے دونوں جزو کا جواب ہو گیا۔

۱۵ صفر ۱۳۳۵ھ (تتمہ خامسہ ص ۵)

تحقیق سبق معارف جلد اضحیہ و لحم آں | **سوال** (۱۳۲۷) کیا فرماتے ہیں علمائے دین سوالات ذیل میں (۱) ایک شخص نے ایک مدرسہ کا اہتمام اس شرط پر لیا کہ سابقہ چڑھی ہوئی تنخواہ مدرسین کا میں ذمہ دار نہیں ہوں، اور نہ اس وقت مدرسہ میں کچھ توفیر تھی (۲) اگر مصلحت شرعی سے گوشت قربانی فروخت کیا جاوے تو کیا حکم ہے، صدقہ واجبہ کا یا غیر واجبہ کا، اور اس کو مدرسین کی تنخواہ میں دے سکتے ہیں یا نہیں یا کسی حیلہ سے۔ بینوا توجروا؟

جواب۔ پہلے سوال میں صرف واقعہ لکھا ہے اور یہ نہیں لکھا کہ مقصود بالسوال اس واقعہ میں کیا ہے، لہذا جواب سے معذوری ہے،

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ لحم کا حکم مثل جلد کے ہے، اگر فروخت کیا جاوے گا تو اس کا حکم صدقہ واجبہ کا ہے اور مدرسین کی تنخواہ چونکہ دَین ہے اس میں دینا معنی تمول ہے، لہذا جائز نہیں، اور گو وہ تنخواہ اس دینے والے کے ذمہ نہ ہو، اور شاید سوال اول سے اس کی طرف اشارہ ہے، مگر جب دیا جاویگا من حیث الدین دیا جاتا ہے، اور اس سے دین ہی ادا ہوتا ہے، گو متبرع بادا الدین من علیہ الدین سے حق رجوع نہیں رکھتا لیکن اور سب احکام دین ہی کے ہوں گے، جیسے فراغ ذمہ مدیون عدم استحقاق مطالبہ دائن اس لئے ان احکام میں مثل غیر متبرع کے ہوگا، اس لئے یہ رقم تنخواہ میں نہیں دی جا سکتی اور حیلہ ظاہر کیا جاوے تاکہ اس کا حکم لکھا جاوے، (تتمہ خامسہ ص ۴۲)

عدم جواز استعمال روغن کہ بعوض چرم قربانی خریدہ شود | **سوال** (۱۳۲۸) حضرت نے وعظ میں فرمایا تھا جس کا مطلب میں یہ سمجھا ہوں کہ کھال قربانی یا اس کے عوض دوسری چیز قابل استعمال بدل کام میں لا سکتے ہیں مگر روپیہ یا ایسی چیز جیسا کہ تیل کہ جس کو خود استعمال نہیں کر سکتے ، بلکہ اس کو جلا کر روشنی سے نفع اٹھا سکتے ہیں، یا روپیہ سے کوئی اور چیز خرید کر نفع اٹھا سکتے ہیں ایسے تبادلہ کا استعمال جائز نہیں بلکہ وہ تیل اور روپیہ خیرات کیا جاوے، اس کے متعلق عرض ہے کہ اگر تیل سر میں لگایا جاوے یا کسی چمڑے یا لکڑی کے دروازوں وغیرہ کے ملنے کے کام میں لایا جائے تو یہ تبادلہ اور استعمال جائز ہوگا یا نہ، فقط

الجواب، نہیں، کیوں کہ یہ انتفاع اس کے بقا کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ وہ کھپ کر فنا ہو گیا،

یکم ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۴۲)

جواز تبادلۂ چرم خام قربانی با چرم پختہ بشرطیکہ یک جانب ہمراہ چرم قیمت شامل نکنند

سوال (۶۴۳) قربانی کے اصل چمڑے خام سے چمڑے پختہ کا تبادلہ، برابر یا کچھ قیمت کا جزو خام کے ہمراہ شامل کرکے لینا جائز ہے یا نہیں اور ایسے تبادلہ کے وقت دونوں چمڑوں کی قیمت کا خیال تبادلہ کنندہ ضرور کیا کرتا ہے فقط

جواب۔ جائز ہے، مگر پختہ کے ساتھ قیمت کا شامل ہونا جائز نہیں، فقط تاریخ بالا۔

(تتمہ خامسہ ص ۴۷)

جواز استعمال چرم پختہ بعوض چرم قربانی۔

سوال (۶۴۴) اُس تبادلہ پختہ چمڑہ کو مثل ڈول موٹھی وغیرہ اپنے کام میں لانا جائز ہے یا نہ فقط سائل بالا،

جواب، جائز ہے، فقط تاریخ بالا، (تتمہ خامسہ ص ۴۷)

واجب بودن تصدق بقیمت چرم پختہ کہ او چرم قربانی بدل کردہ شدہ است

سوال (ـــ) اور اگر وہ کسی وقت فروخت کیا جاوے تو کیا اس کی قیمت خیرات کرنا چاہئے؟

جواب۔ ہاں خیرات کرنا چاہئے تاریخ بالا (تتمہ خامسہ ص ۷۵)

جواز شریک کردن چند اموات در یک حصہ قربانی،

سوال (۶۴۵) اگر فوت شدہ عزیزوں یا اہل بیت یا خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی کی جائے تو اس کا کیا طریقہ ہے، آیا مثل دیگر شرکا ہر ایک شخص کی طرف سے ایک ایک حصہ ہو یا ایک ہی میں چند کو شریک کر دے، فقط

جواب۔ ایک ہی میں سب کو ثواب بخش سکتے ہیں، فقط تاریخ بالا (تتمہ خامسہ ص ۵)

میں نے گذشتہ سال زبانی فتویٰ دیا تھا کہ جس طرح اپنی طرف سے قربانی کرنے میں ایک حصہ دو شخص کی طرف سے جائز نہیں، اسی طرح غیر کی طرف سے تبرعاً نفل قربانی کرنے میں خواہ زندہ کی طرف سے یا میت کی طرف سے، ایک حصہ دو شخص کی طرف سے جائز نہیں، مگر روایات سے اس کے خلاف ثابت ہوا اس لئے میں اس سے رجوع کرکے اب فتویٰ دیتا ہوں، کہ جو قربانی دوسرے کی طرف سے تبرعاً[عہ] کی جاوے چونکہ وہ ملک ذابح کی ہوتی ہے، اور صرف اس دوسرے کو ثواب پہنچتا ہے، اس لئے ایک حصہ کئی کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے، جیساکہ مسلم میں ہے کہ اپنی طرف سے ایک حصہ قربانی کرکے متعدد کو ثواب پہنچانا جائز ہے، بس یہ بھی ویسا ہی ہے، والروایات ہٰذہ فرع من ضحی عن المیت یصنع کما یصنع فی اضحیۃ نفسہ من التصدق والاکل والاجر للمیت والملک للذابح قال الصدر والمختار انہ ان بامر المیت لایاکل منہا والا یاکل بزازیہ

عہ تبرعاً کی قید سے وہ صورت نکل گئی کہ میت نے اپنے مال سے قربانی کرنے کی وصیت کی ہو اس صورت میں ایک حصہ ایک ہی کی طرف سے جائز ہے ۱۲ منہ

وسیذکر فی النظم رد المحتار ص ۳۱۸ ج ۵ وعن میت ای لو ضحی عن میت وارثہ بامرہ الزمہ بالتصدق بہا وعدم الاکل منہا وان تبرع بہا عنہ لہ الاکل لانہ یقع علی ملک الذابح والثواب للمیت ولذا لو کان علی الذابح واحدۃ سقطت عنہ ضحیتہ کما فی الاجناس قال الشرنبلالی لکن فی سقوط الاضحیۃ عنہ تامل اھ اقول صرح فی فتح القدیر فی الحج عن الغیر بلا امرانہ یقع عن الفاعل فیسقط بہ الفرض عنہ وللاخر الثواب فراجعہ رد المحتار ج ۵ ص ۳۲۸ وفی البدائع المختار وان مات احد السبعۃ المشترکین فی البدنۃ وقال الورثۃ اذبحوا عنہ وعنکم صح عن الکل استحسانا لقصد القربۃ من الکل ص ۳۱۸ فی رد المحتار قولہ لقصد القربۃ من الکل ہذا وجہ الاستحسان قال فی البدائع لان الموت لا یمنع التقرب عن المیت بدلیل انہ یجوز ان یتصدق عنہ ویحج عنہ وقد صح ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضحی بکبشین احدہما عن نفسہ والاخر عمن لم یذبح من امتہ وان کان منہم من قد مات قبل ان یذبح اھ ص ۳۱۸، قلت وقد دل الحدیث علی جواز التضحیۃ عن الحی تبرعاً وعلی جواز الضحیۃ الواحدۃ عن الکثیرین لورا سی وقوع الذبح عن الذابح وحصول الثواب للغیر کی فرع یہ ہے کہ اس تضحیہ نافلہ عن الحی تبرعا میں اس حی کے اذن کی ضرورت نہیں میں اس ضرورت بھی تبلاتا تھا اس سے بھی رجوع کرتا ہوں، بخلاف زکوٰۃ وصدقات واجبہ وتضحیہ واجبہ کے کہ اس میں اذن غیر کا شرط ہے، قرب ۱۳۳۵ھ۔

(ترجیح خامس ص ۴۴)

عدم سقوط قربانی واجب از ذمہ میت بسبب قربانی کردن از جانب او

سوال (۲۴۶) اگر کسی متوفی کے ذمہ واجب قربانی رہی ہوئی ہو تو کیا اس ثواب سانی سے ساقط ہو جائے گی؟ فقط

جواب: نہیں، فقط، یکم ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۷۵)

نہ ساقط شدن قربانی از ذمہ میت

سوال (۲۴۷) قربانی اپنی طرف سے کر کے ثواب میت کو پہنچانے سے قربانی کرنے والے کو ثواب ملے گا یا میت کی طرف سے حصہ رکھ کر قربانی کریگا بھی ثواب قربانی کنندہ کو ملے گا؟ فقط

الجواب۔ یہ آخرت کے متعلق ہے یہ مسئلہ نہیں اس کی تحقیق کے لئے قیاس و

اجتہاد کافی نہیں نقل و روایت ہونا چاہئے اور وہ نظر سے نہیں گزری فقط
یکم ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ

عدم وجوب قربانی از طرف نابالغان بذمہ مادر و پدر ایشاں

سوال (۶۴۸) نابالغ بچوں کی جانب سے قربانی کرنا ان کے باپ کے ذمہ ہے یا نہ ؟

جواب۔ نہیں، فقط تاریخ بالا۔ (تتمہ خامسہ ص ۵)

تحقیق بودن نیت زیادتی ثواب در رضائے الٰہی از قربانی نافلہ

سوال (۶۴۹) اگر واجب قربانی سے زائد کوئی شخص نذر کرلے کیا اللہ میاں اس سے راضی ہو جائیں گے یا محض ثواب میں زیادتی ہوگی

جواب۔ ان دونوں میں مقابلہ ہی کیا ہے، کیا ثواب کی زیادتی خدا تعالیٰ کی رضا نہیں ہے،
تاریخ بالا۔ (تتمہ خامسہ ص ۵)

جواز استعمال چرم قربانی کہ خریدہ شود

سوال (۶۵۰) قربانی کا چمڑا اگر شریک اپنے حصہ کے علاوہ دوسرے شرکا سے ان کے حصے خرید لے تو پھر وہ تمام چمڑا خریدکنندہ شریک اپنے استعمال میں لا سکتا ہے۔

جواب۔ لا سکتا ہے، ۵ ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۶)

جواز آوردن در مصرف خود قیمت چرم قربانی سوائے حصہ قیمت خود اگر یک شریک کل چرم خرید کردہ فروختہ باشد

سوال (۶۵۱) اگر ایک شریک دوسرے شرکا سے کھال قربانی خرید کر خود فروخت کردے تو کل قیمت کھال خیرات کرنا ہوگی، یا کل قیمت اپنے مصرف میں لا سکیگا، یا بقدر اس حصہ کے جو خریدا تھا اپنے مصرف میں لا سکیگا اور باقی خیرات کرے گا، اس کی اجازت وعدم اجازت کی تفصیل مطلوب ہے ؟

جواب۔ ہاں یہی تیسری صورت ہے، ۵ ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۶)

آوردن قیمت چرم قربانی در مصرف خود اگر بعوض چرم پختہ خرید کردہ فروخت

سوال (۶۵۲) اگر خام کھال قربانی کا تبادلہ پختہ چمڑہ غیر قربانی سے جائز ہو تو پختہ چمڑا دے کر خام چمڑا قربانی والا جس شخص کے پاس تبادلہ میں پہنچیگا وہ شخص اس قربانی کے چمڑے کو فروخت کرکے دام اپنے مصرف میں لا سکتا ہے یا نہ ؟

جواب۔ لا سکتا ہے، ۵ ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۶)

بعد الحمد والصلوٰۃ احقر اشرف علی عرض رسا ہے کہ میں آغاز ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۸ھ میں گونڈ کھپور تھا، ایک روز جناب مولانا عبدالغفار صاحب نے ایک سوال دکھلایا جو گاؤکشی کے متعلق تھا، میں نے مولانا سے اس کا مبسوط جواب لکھنے کے لئے درخواست کی جس کو علامہ موصوف نے منظور فرمایا

پھر وسط جمادی الاولیٰ میں جب وطن پہنچا تو میرے پاس وہی سوال آیا جس کو میں نے جواب کے لئے مولانا حبیب احمد کیرانوی کے سپرد کر دیا۔ دو وجہ سے، ایک اس لئے کہ مجھ کو فرصت نہیں تھی، دوسرے اس لئے کہ وہ مجھ سے اچھا لکھیں گے، جب جواب ثانی تیار ہوا، اسی اثنا میں جواب اول کی نقل بھی میرے استدعا پر میرے پاس پہنچ گئی، چونکہ یہ دونوں جواب ماشاء اللہ کافی وافی شافی تھے، اس لئے دونوں کو جمع کر کے امداد الفتاویٰ کا جزو بنا دینا مناسب معلوم ہوا اول جواب کا لقب "الاعتصام بحبل شعائر الاسلام" دوسرے کا لقب "تصلية سقر لمانع تضحية البقر"

الجواب الاول الملقب باعتصام بحبل شعائر الاسلام

بسم اللہ الرحمن الرحیم ــــــــــــ نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

سوال (۶۵۳) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہنود کے خوش کرنے اور اتفاق پیدا کرنے کے خیال سے گائے کی قربانی یا روزمرہ کے لئے گائے کا ذبح بند کر دینا کیسا ہے، ہندوستان کی حالت ملاحظہ فرماتے ہوئے حکم شرع سے مطلع فرمائیں۔

الجواب محض ہنود سے اتفاق پیدا کرنے اور ان کے خوش کرنے کے لئے گائے کی قربانی کو موقوف کر دینا اور ہمیشہ کے لئے گائے کی قربانی کا گوشت چھوڑ دینا درست نہیں، اس لئے کہ گائے کا ذبح کرنا (قربانی کے لئے ہو یا محض کھانے کے لئے) شعائر اسلام سے ہے، اور گائے کا ذبح نہ کرنا اور اس کے گوشت سے مذہبی حیثیت سے نفرت کرنا شعائر کفر سے ہے، اسلامی شعائر کو چھوڑ کر کفر کے شعائر کو اختیار کرنا اور اس خیال سے خود ذبح کو چھوڑ دینا اور کسی کو ترغیب نہ دینا بلکہ ترک کی رغبت دلانا کہ مخالفین اسلام خوش رہیں مداراۃ ناجائز اور مداہنۃ فی الدین ہے، ہماری شریعت مطہرہ نے ہرگز اس کی اجازت نہیں دی ہے،

یہاں تک تو اصل سوال کا جواب تھا، اب میں اس کی دلیل مختصر طور پر عرض کرتا ہوں، پہلے تمہیدی مقدمات ملاحظہ فرمائیے،

تمہیدی مقدمات

اوّل، یہ امر تو مسلم ہے کہ بعض ماکولات و ملبوسات محض مباح ہیں، ان میں اسلامی شعائر ہونے کو دخل نہیں، جیسے چاول، دال، آٹا، دودھ، دہی، گھی وغیرہ کھانا، اور سوتی اونی کپڑا پہننا

یہ چیزیں ایسی ہیں کہ ہر ملت اور ہر مذہب کے لوگ استعمال کرتے ہیں ان کو اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، تا کہ شعائر اسلام سے کہے جائیں۔

دوم بہت چیزیں شعائر اسلام سے ہیں، ان کو اسلام کے ساتھ خاص تعلق ہے، اور بہت چیزیں شعائر کفر سے ہیں جن کو اہل کفر کے ساتھ خاص تعلق ہے، شعائر اسلام کی تمثیلیں یہ ہیں، ختنہ کرنا نماز کے لئے اذان کہنا، گائے کی قربانی کرنا، گائے کے گوشت سے بحیثیت مذہبی نفرت کرنا، زنار پہننے کو بڑی معصیت سمجھنا، ہنود کی طرح سر پر چوٹی نہ رکھنا، وغیرہ اور شعائر کفر کی تمثیلیں یہ ہیں زنار پہننا، سر پر خاص طور سے چوٹی رکھنا، گائے کو معبود یا مقدس و معزز سمجھ کر ذبح نہ کرنا، گائے کے گوشت سے بحیثیت مذہبی نفرت کرنا، اور اس کے ذبح کو روکنا، اور رک جانے سے بحیثیت مذہبی خوش ہونا، بت خانہ بنانا، اور اس کی تعظیم کرنا، مسلمانوں کے ساتھ چھوت کا برتاؤ کرنا وغیرہ۔

سوم ذبح کا اسلامی ذبیحہ بلکہ شعائر اسلام سے ہونا شرعی دلائل سے ثابت ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں ارشاد فرمایا ہے ومن الانعام حمولة وفرشا کلوا مما رزقکم اللہ ولا تتبعوا خطوات الشیطان انہ لکم عدو مبین ثمانیة ازواج من الضان اثنین ومن المعز اثنین قل آالذکرین حرم ام الانثیین اما اشتملت علیہ ارحام الانثیین نبئونی بعلم ان کنتم صادقین ومن الابل اثنین ومن البقر اثنین۔ اس آیت سے حلت گاؤ کی بنص صریح ثابت ہے کسی اہل حق کو چون وچرا کی گنجائش نہیں اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ازواج مطہرات کی جانب سے گاؤ کی قربانی کی ہے، عن جابر قال ذبح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عن عائشة بقرة رواہ مسلم کذا فی المشکوٰة،

وعن جابر قال نحر النبی صلے اللہ علیہ وسلم عن نسائہ بقرة فی حجتہ رواہ مسلم کذا فی المشکوٰة،

اور رسول پاک صلے اللہ علیہ وسلم نے گاؤ کی قربانی کی عام اجازت بھی دی ہے، اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے عام طور پر گائے کی قربانی کی ہے۔

چنانچہ صحیح مسلم میں ہے۔ عن جابر ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال البقرة عن سبعة والجزور عن سبعة،

اور ترمذی ونسائی وابن ماجہ میں ہے عن ابن عباس قال کنا مع رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فی سفر فحضر الاضحی فاشترکنا فی البقرة سبعة وفی البعیر عشرة۔

اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عام طور پر گاؤ کے ذبح کرنے اور اس کے گوشت کھانے کا تعامل بھی تھا صحیح مسلم میں ہے عن عائشۃ قالت اُتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلحم بقرۃ تصدق بہ علیٰ بریرۃ فقال ہو لہا صدقۃ ولنا ہدیۃ ،

اور گاؤ کی حلت پر اجماع امت بھی ہے ، چنانچہ علامہ دمیری شافعی حیوۃ الحیوان میں تحریر فرماتے ہیں ۔ ویحل اکلہا ای البقرۃ وشرب البانہا بالاجماع اھ

اور قیاس بھی یہی چاہتا ہے اگرچہ قرآن وحدیث میں منصوص ہونے کے بعد قیاس کی ضرورت نہیں کہ خاص گاؤ کا ذبح کرنا اسلامی ذبیحہ میں داخل ہو ، اس لئے کہ اکثر اسلامی احکام تعلیم توحید اور اعلائے حق پر مبنی ہیں ، چونکہ بنی اسرائیل میں گوسالہ پرستی (جو سراسر شرک ہی ہے) جاری ہو گئی تھی اور گوسالہ پرستی کے شرک میں امت سابقہ مبتلا ہو چکی تھی جس کا ذکر قرآن شریف میں یوں کیا گیا ہے ، وجاوزنا ببنی اسرائیل البحر فاتوا علیٰ قوم یعکفون علیٰ اصنام لہم قالوا یموسیٰ اجعل لنا الٰہا کما لہم الہۃ قال انکم قوم تجہلون ۔

تفسیر کبیر میں ہے قال ابن جریج کانت تلک الاصنام تماثیل بقر اھ

اور تفسیر درمنثور میں ہے ۔ اخرج ابن جریر وابن المنذر عن ابن جریج فی قولہ تعالیٰ فاتوا علیٰ قوم یعکفون علیٰ اصنام لہم قال تماثیل بقر من نحاس فلما کان عجل السامری شبہ لہم انہ من تلک البقرۃ فذلک کان اول شان العجل اھ اس شرک کو شریعت الٰہی نے یوں مٹایا کہ ذبح گاؤ اور اس کی قربانی کو مشروع کر دیا اور گمراہوں کو یوں تعلیم دی کہ اے نالائقو بچھڑے کی مورت کو معبود اور مقدس کیوں سمجھتے ہو ، اور اس کی پرستش کیوں جائز خیال کرتے ہو ، دیکھو گائے کی تصویر کی کیا ہستی ہے ، خود گائے ہی میں صلاحیت معبود ہونے کی نہیں ہے ، بلکہ وہ معمولی ماکولات سے ہے ، بکری ، بھیڑ ، دنبہ وغیرہ کی طرح اس کے گوشت پوست انسان کے لئے بنائے گئے ہیں ، وہ معبودیت کے لئے ہرگز قابل نہیں ، بلکہ وہ معبود حقیقی پر نثار اور قربان کرنے کے قابل ہے اس کو یا اس کی تصویر کو معبود یا مقدس خیال کرنا سخت جہالت ہے ، پس معلوم ہوا کہ ذبح گاؤ کی مشروعیت ایک شرک جلی کے ابطال اور توحید کے اجراء والقاء پر مبنی ہے اس لئے اس کا مطابق قیاس کے ہونا ضرور قابلِ تسلیم ہے ۔

یہاں تک تو گائے کے اسلامی ذبیحہ ہونے کا ثبوت تھا ، اب میں اس کے اسلامی شعار ہونے کے متعلق گفتگو کرتا ہوں ۔

ذبح بقر اسلامی شعار ہے اس کا ثبوت

صحیح بخاری میں ہے عن انس انہ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم من صلی صلوتنا واستقبل قبلتنا واکل ذبیحتنا فذلک المسلم الذی لہ ذمۃ اللہ وذمۃ رسولہ فلا تخفروا اللہ فی ذمتہ رواہ البخاری کذا فی المشکوٰۃ۔

غور کرنا چاہیے رسول پاک صلے اللہ علیہ وسلم نے جو افصح العرب والعجم اور صاحب جوامع الکلم تھے جملہ واکل ذبیحتنا کیوں اضافہ فرمایا۔ اور ذبیحہ کو مقید باضافت کیوں کیا۔ بجائے ذبیحتنا کے ذبیحۃ کیوں نہ ارشاد فرمایا اور واؤ عاطفہ کے ساتھ وصل کیوں کیا، یاد رکھئے یہ تینوں امر نکتہ اور فائدہ سے خالی نہیں، مجھ سے سنئے، اس جملہ سے سبق دیتا ہے کہ خاص اسلامی ذبیحہ کا کھانا مثل ادائے اسلامی نماز و استقبال اسلامی قبلہ کے شعائر اسلام سے ہے، ان میں سے کسی کو مدارات غیر مذہب کے لئے نہیں چھوڑ سکتے اور ذمہ داری اللہ اور رسول کی ان تینوں امر کے ساتھ وابستہ ہیں، اگرچہ وہ دونوں عملاً فرض ہیں، اور اکل ذبیحہ فرض نہیں، مگر شعار رہنے کی حیثیت سے سب متساوی ہیں، ولا منافاۃ بین کون الامرین متغائرین بوجہ وبین کونہما متحدین بوجہ اخر اور یہی مناسبت من حیث شعاریت عطف کرنے کا باعث ہے (لان الوصل بالعطف لابد فیہ من المناسبۃ بین المعطوف علیہ کما ھو مصرح فی علم المعانی)

اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ذبیحتنا فرمایا اس سے یہ بتلاتا ہے کہ مطلق ذبیحہ کھالینا ذمہ داری خدا اور رسول کے لئے کافی نہیں، بلکہ خاص اسلامی ذبیحہ کا کھانا شرط ہے، اور پہلے آپ قرآن وحدیث وتعامل صحابہ و اجماع وقیاس سے معلوم کر چکے ہیں کہ گاؤ اسلامی ذبیحہ میں داخل ہے، پس گائے کا ذبح کرنا اور اس کا گوشت کھانا بلاشبہ اسلام کے علامات سے ٹھہرا، اور ہم اسلامی علامات ہی کو شعار اسلام اور شعائر دین اور شعائر اللہ کہتے ہیں، الغرض حدیث نبوی سے ذبح گاؤ کا شعار اسلام سے ہونا بخوبی ثابت ہے۔ وفیہ الکفایۃ لمن لہ درایۃ،

چہارم، ہنود کی مدارات (یعنی خاطرداری) اگرچہ عملاً ہو اعتقاداً نہ ہو اسی قدر جائز ہو سکتی ہے جس سے کوئی شعار اسلام نہ چھوٹ جائے اور مذہبی امور پامال نہ ہوں، حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے واقعہ سے اس کا استدلال ہو سکتا ہے، وہ واقعہ یہ ہے کہ آپ جب یہودیت سے تائب ہوئے مشرف باسلام ہوئے یہ خیال گذرا کہ توریت سے اونٹ کے گوشت کی حرمت ثابت ہوتی ہے، اور

بھی آسمانی کتاب ہے اور قرآن پاک سے اس کی حلت متحقق ہوتی ہے، کیا حرج ہے کہ احتیاطاً ہم اونٹ کا گوشت نہ کھائیں چنانچہ ایسا ہی کر گذرے، اللہ تعالیٰ نے اس احتیاط سے ان کو سختی سے منع کیا، اور یوں آیت نازل فرمائی۔ یاایھا الذین اٰمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطٰن انہ لکم عدو مبین۔ غور کیجئے ایسے خطرات وخیالات جو مزاحم ومناقض شریعت ہوں، ان کو اللہ تعالیٰ نے اتباع شیطان فرمایا، کیوں اس کی وجہ یہی ہے کہ اس سے شعار اسلام کا ترک لازم آگیا، اور ترک شعار اسلام ممنوع ہے، باوجودیکہ یہود اہل کتاب تھے، اور توریت آسمانی کتاب تھی، اور اونٹ کے گوشت کی حرمت اس میں مذکور بھی تھی اگرچہ قرآن شریف سے منسوخ ہو چکی تھی اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ صحیح العقیدہ بھی تھے یعنی اونٹ کے گوشت کو مباح سمجھتے تھے پھر بھی یہود کی مدارات یا توریت کے اس حکم کی عظمت (قصداً ہو یا التزاماً) خدا نے جائز نہ رکھی، بلکہ سختی کے ساتھ اس کی ممانعت کردی، کیونکہ عملاً حکم منسوخ کی تعظیم آتی تھی، تو ہنود کی (جو اہل کتاب بھی نہیں اور ان کی کتاب آسمانی بھی نہیں) اتنی مدارات کرنا جو شعار اسلام کے ترک تک پہنچ جائے کب جائز ہو سکتا ہے، امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں اس آیت مذکورہ کی شان نزول یوں لکھتے ہیں۔ وکانوا یقولون ترک ھذہ الاشیاء مباح فی الاسلام وواجب فی التوراۃ فنحن فترکھا احتیاطا فکرہ اللہ تعالیٰ ذلک منھم وامرھم ان ید خلوا فی السلم کافۃ ای فی شرائع الاسلام کافۃ ولا یتمسکون بشیٔ من احکام التوراۃ اعتقادا لہ وعملا بہ لانھا صارت منسوخۃ اھ جس طرح حضرت عبداللہ بن سلام نے اونٹ کے گوشت کو مباح سمجھا، اور تھوڑی یہ غلطی کی کہ اسکو شعار اسلام نہیں خیال کیا، اسی طرح گاؤ کا قصہ ہے، پس جس طرح وہ مورد عتاب ہوئے یہ لوگ بھی مورد عتاب ہوں گے، اس مقام پر جو شبہ ہو سکتا ہے اس شبہ کا جواب آگے چل کر ہم اخیر میں لکھیں گے۔ **الغرض** ایسی مدارات ہنود کی جو ترک شعار اسلام کا مستلزم ہو جائز نہیں علامہ علی قاری مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں تحریر فرماتے ہیں والفرق بین المداھنۃ المنھیۃ والمداراۃ المامورۃ ان المداھنۃ فی الشریعۃ ان یری منکرا ویقدر علی دفعہ ولم یدفعہ حفظا لجانب مرتکبہ اوجانب غیرہ لخوف او طمع او لاستحیاء منہ او لقلۃ مبالاۃ فی الدین والمداراۃ بترک حظ نفسہ وحق یتعلق بمالہ وعرضہ فیسکت عنہ دفعا للشر ووقوع الضرر منہ قولہ دارھم مادمت فی دارھم اھ،

پنجم، کسی امر موہوم یا مشکوک کی توقع پر (اگرچہ وہ امر مستحسن ہو) ہنود کے ساتھ ایسی

مدارات کرنا جائز نہیں جس سے اسلامی ضرر متبادر اور یقین ہو اس کا ثبوت اس آیت سے ہوتا ہے
یٰایھا الذین اٰمنوا لاتتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء تلقون الیھم بالمودۃ وقد کفروا بما جاءکم من الحق اس آیت کی شان نزول یہ ہے کہ حضرت حاطب بن بلتعہ جو جلیل القدر صحابی تھے اور غزوہ بدر و خندق و دیگر مشاہد میں شریک بھی ہو چکے تھے، اور رسول پاک نے بھی ان کی مدح کی ہے، ان سے یہ ذلت (ممکن ہے خطائے اجتہادی سے ہوئی ہو) ہوگئی تھی، کہ آپ نے مدینہ سے کفار مکہ کو بطور مخبری کے ایک خط لکھدیا تھا، اس توقع سے کہ ان کے اہل وعیال مکہ میں تھے، اگر کفار مکہ خوش رہیں گے تو ان کو آرام دیں گے، اور ان کی خبر گیری کریں گے، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی الہام ربانی کی خبر ہوگئی، اور وہ خط پکڑا گیا، اس پر وہ ماخوذ ہوئے آپ نے صداقت کے ساتھ اقرار کیا اور خط لکھنے کی وجہ بیان کی اس وقت آیت نازل ہوئی، مگر چونکہ آپ بدری تھے اور آپ نے اپنے اعتقاد کامل کا اظہار فرمایا اور یقین دلایا اور وجہ بھی معقول بیان کی رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی زلت معاف کردی، خیال فرمایئے ایسے جلیل القدر صحابی کہ ان کی شان میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا ہے ما یدریک یا عمر لعل اللہ تعالیٰ قد اطلع علی اھل بدر فقال لھم اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم وہ کیوں مورد عتاب ہوگئے، اس وجہ سے کہ اسلامی ضرر جو متبادر اور یقین تھا اس کا لحاظ نہیں کیا؛ اور اہل وعیال کے فائدہ کے لئے مخبری کردی، اگرچہ وہ استحصال نفع بذاتہ مذموم نہ تھا مگر مذہبی ضرر کی وجہ سے اس کا ترک کرنا لازم تھا، کیونکہ اس نفع کا حصول ناجائز مدارات پر موقوف تھا، اس لئے ہمارے فقہائے کرام نے یہ قاعدہ تحریر فرمایا ہے کما فی الاشباہ والنظائر درء المفاسد اولیٰ من جلب المصالح فاذا تعارضت مفسدۃ ومصلحۃ قدم دفع المفسدۃ غالباً لان اعتناء الشارع بالمنہیات اشد من اعتنائہ بالمامورات اھ۔

جب جب مقدمات ممہدہ معلوم ہو چکے تو اب میں صورت استدلال عرض کرتا ہوں،
(الف) مقدمہ اول وثانیہ وثالثہ سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ گائے کا ذبح کرنا اور اس کا گوشت کھانا محض مباح ہی نہیں بلکہ اسلامی شعار ہے۔
(ب) اور مقدمہ رابعہ سے معلوم ہوا کہ ہنود کی ایسی مدارات جس سے اسلامی شعائر چھوٹ جائیں ممنوع وقبیح ہے، پس ان مقدمات اربعہ سے یہ نتیجہ نکلا کہ گاؤ کا ذبح نہ کرنا ہنود کے خوش اور اتفاق پیدا کرنے کے لئے جائز نہیں،

(ج) اور مقدمہ خامسہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ بالفرض اگرچہ ذبح گاؤ کا بند کر دینا کسی فائدہ موہوم پر مبنی ہوتا ہم جائز نہیں، کیونکہ اس کے دینی و دنیوی نقصانات متبادر اور ظاہر ہیں، اور درء المفاسد اولی من جلب المصالح روشن دلیل ہے۔

ہاں اس جگہ چند شبہات قابل ذکر ہیں، ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ شبہات پیدا ہو جائیں،

پہلا شبہ، مذہبی حیثیت سے گاؤ کی قربانی ہم نہیں بند کرتے ہیں، بلکہ تمدنی اور اخلاقی حیثیت سے، اس لئے کہ ہم گائے کے ذبح پر مجبور نہیں، اعتقاداً ہم اس کو جائز سمجھتے ہیں، اگر ہنود کے خوش کرنے اور ان سے اتفاق پیدا کرنے کے لئے مباح فعل کو ترک کر دیں تو اس میں کیا حرج ہے، جس طرح کوئی مسلمان بیماری یا عدم رغبت کے سبب سے یا کوئی ذاکر شاغل کسی خاص وظیفہ کے لحاظ سے کبھی گائے کا گوشت نہ کھائے اور بجائے گائے کے ہمیشہ بکری، دنبہ، بھیڑ قربانی کرتا رہے، اس پر کوئی شرعی جرم نہیں عائد ہو سکتا، اسی طرح ہم بھی بے جرم کیوں نہ سمجھے جائیں گے۔

اور حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے اخلاقی اور تمدنی حیثیت سے اونٹ کا گوشت نہیں چھوڑا تھا بلکہ مذہبی حیثیت سے، کیونکہ ان کا احتیاط کرنا احکام منسوخہ کی توقیر کا مستلزم تھا، اور ہمارا ترک ایسا نہیں، اس لئے ہمارے عمل کو ان کے عمل پر قیاس کرنا مع الفارق ہے۔

جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ جو شئے شرعاً مذہبی ہے اس کو تمدنی اور اخلاقی حیثیت سے تعبیر کرنا پھر اس کو چھوڑ دینا کہاں جائز ہے، عنوان اور تعبیر کے بدل دینے سے معنون معبر عنہ کی حقیقت نہیں بدل جاتی ہے، مثلاً کسی بستی کے لوگ اذان یا ختنہ چھوڑ دیں اور یوں کہتے پھریں کہ مذہبی حیثیت سے نہیں بلکہ تمدنی[1] حیثیت سے ہم نے چھوڑ دیا ہے، یا کوئی مسلمان کسی بت کی ناجائز تعظیم کرے اور یوں کہے کہ مذہبی حیثیت سے نہیں بلکہ اخلاقی حیثیت سے، یعنی فلاں راجہ صاحب کے خوش کرنے کے لئے تعظیم کر لیا کرتے ہیں۔ تو کیا یہ جائز ہو سکتا ہے ہرگز نہیں اسی طرح گائے کا ذبح کرنا چونکہ شعار اسلام سے ہے جیسا کہ پہلے ہم ثابت کر آئے ہیں، ہم ہرگز مجاز نہیں کہ اس کو اخلاقی اور تمدنی حیثیت کے سانچہ میں ڈھال کر کسی ہنود کے خوش کرنے کے لئے چھوڑ دیں۔

وہ مثل گھی دودھ کے محض مباح ہی نہیں ہے تاکہ وہ قابل ترک سمجھا جائے۔

---

[1] مثلاً یوں کہیں کہ بچوں کو ختنہ سے سخت تکلیف ہوتی تھی اس لئے ہم نے ختنہ موقوف کر دیا اور ہمارے جوار کے ہنود جو ہمارے دلی دوست ہیں اُن کو اذان کی آواز سے بہت تکلیف ہوتی تھی، صبح کی اذان سے صبح کی نیند اور ظہر کی اذان سے دن کے خواب استراحت میں خلل آتا تھا اس لئے ہم نے اذان بند کر دی ۱۲ منہ

اور کسی مسلمان کا مرض یا عدم رغبت یا خاص وظیفہ کے سبب سے گائے کا گوشت نہ کھانا اور کسی صحیح الاعتقاد مسلمان کا دنبہ، بھیڑ کی قربانی پر اکتفا کرنا ہنود کی مدارات اور اتفاق کے لحاظ سے نہیں ہوا کرتا، تاکہ اس پر کوئی شرعی جرم عائد ہو، بخلاف صورت متنازعہ کے کہ ہنود کی ناجائز مداراۃ پر مبنی ہے، دونوں ترک کو یکساں خیال کرنا ہرگز صحیح نہیں، اگر آپ انصاف کریں گے تو دونوں کی وجدانی حالت بھی متغایر پائیں گے، یعنی مدارات کرنے والے کو عملاً ضرور گاؤ سے نفرت ہوگی چاہے اعتقاداً نہ ہو، بلکہ دوسروں کو ذبح کرنا بھی اس پر شاق اور ناگوار ہوگا، کیونکہ سطلقاً ذبح گاؤ کو مداراۃ اور اتفاق کے خلاف سمجھتا ہے، اور اس کی دلی کشش اس جانب ہوگی کہ گئے کا ذبیحہ کہیں نہ دیکھوں، بخلاف ان لوگوں کے جو مرض وغیرہ کے سبب سے چھوڑ دیتے ہیں، ان کو نہ کبھی نفرت ہوگی نہ کبھی اس کا خیال ہوگا۔ فبینھما بون بعید۔

رہا عبداللہ بن سلام رض کا واقعہ اس کے متعلق جو شبہ پیدا کیا گیا، وہ بھی صحیح نہیں، کیونکہ یہ تو مسلم ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رض صدق دل سے مشرف باسلام ہو چکے تھے اور اعتقاداً ہرگز مخالف اسلام نہ تھے، قرآن شریف کے الفاظ صاف بتلا رہے ہیں یا ایھا الذین امنوا میں لفظ آمنوا اور کافۃ ثبوت کے لئے کافی ہے، ہاں مخالفت اُن کی بعض امور میں عملاً تھی۔ اب غور کیجئے فریق اول (یعنی تارکین لحم شتر) اور فریق ثانی یعنی (تارکین لحم بقر مداراۃ ہنود) عملاً و اعتقاداً مساوی ٹھیرے یا نہیں، جب دونوں مساوی ٹھیرے تو لامحالہ دونوں لا تتبعوا خطوات الشیطن کے حکم میں داخل ہوں گے، باقی رہی حیثیت کی مغائرت وہ بھی مضر نہیں، اس لئے کہ اصل وجہ عتاب کی ترک شعائر اسلام ہے، اسی لئے آیت نازل ہوئی، جس طرح لحم شتر شعائر اسلام سے ہے اسی طرح لحم بقر بھی اگرچہ دونوں فریق کے منشائے ترک میں مغائرت ہے، مگر منہی عنہ ہونے میں دونوں متحد ہیں، کیونکہ فریق اول کے ترک کا منشاء احتیاط تھا، مگر اس سے احکام منسوخہ توریت کی تبعیت یا عظمت لازم آگئی، جو منہی عنہ تھی، اور فریق ثانی کے ترک کا منشاء مدارات ہنود ہے، جس سے تعظیم و توقیر شاستر ہنود ہے۔ نیز تقویت عقاید باطلہ ہنود لازم آتی ہے جو منہی عنہ ہے بل الثانی اقبح من الاول کما لا یخفی علی من تفطن وتامل چونکہ دونوں منشاء منہی عنہ ہونے میں مشترک ہیں باوجود تغائر حیثیت کے حکم میں اختلاف نہیں پیدا ہوسکتا، پس معلوم ہوا کہ اس جگہ باوجود تغائر حیثیت کے حکم یکساں ہے وھذا ما ادعیناہ وھھنا ابحاث شتی طویت عنھا کشحی لغرابۃ المقام وایجاز الکلام،

علاوہ بریں اہل اسلام خوب جانتے ہیں کہ ہنود کے مذہب میں گائے نہایت مقدس بلکہ دیوتا ہے، اوران کے جذبات دلی گائے کی عظمت اور پرستش کی جانب مائل ہیں۔ پس لامحالہ ترک ذبح سے ہنود کی خوشی اور مسرت قلبی محض مذہبی حیثیت سے ہوگی، نہ اخلاق اور تمدنی حیثیت سے، کیونکہ ہمیشہ ان کی ممانعت مذہبی حیثیت سے ہوا کرتی ہے، نہ تمدنی حیثیت سے چاہے ممانعت، نہ وہ ہو یا خوشامد و تملق کے طور پر، پس جو لوگ ہنود کی خاطرداری سے متفق الرائے ہو کر ذبح بقر کو بند کردیں گے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ لوگ ہنود کے جذبات دلی کے پودے کو سرسبز و شاداب کرتے ہیں، اور اسلامی جذبات کو پامال و پژمردہ،

پہلے شبہ کا جواب تو ہو چکا، اب دوسرا شبہ سنئے،

دوسرا شبہ، حضرت حاطب بن بلتعہ کے واقعات پر اس واقعہ کو قیاس کرنا صحیح نہیں اس لئے کہ ان کی مخبری ناجائز اور مضر رساں تھی، اور ہمارا فعل یعنی ترک ذبح جائز اور غیر مضر ہے، کجا وہ اور کجا یہ

ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ جائز و ناجائز سے کیا مراد، جواز و عدم جواز شرعی ونفس الامری، یا وہ کہ جس کو مرتکب فعل اپنے ذہن میں بطور فیصلہ کرکے سمجھ لے، اگر شق اول مراد ہے تو عدم جواز اور ضرر میں دونوں مشترک ہیں، جس طرح وہ مخبری ناجائز و مضر اسی طرح متفق الرائے ہو کر شعار اسلام کو ترک کردینا ناجائز و مضر، اور اگر شق ثانی مراد ہے تو جس طرح آپ نے ترک شعار اسلام کو مدارات ہنود کے لئے اپنے ذہن میں خود فیصلہ کرکے جائز سمجھ لیا، اسی طرح حضرت حاطبؓ نے بھی اپنے فعل کو جائز غیر مضر سمجھ لیا تھا، دیکھئے وہ خود رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یوں بیان کرتے ہیں

وقد علمت ان کتابی لن یغنی عنھم ای اھل مکۃ شیئاً۔

تیسرا شبہ - اچھا ہم اتفاق ہنود و مدارت غیر مذہب کا خیال چھوڑ کر دوسرے نقصانات جو متعدد ہیں، بلکہ بعض مضر تر ہیں ان کی بنا پر ذبح بقر چھوڑ دیں گے، اور اس قاعدہ پر عمل کریں گے

اذا تعارض مفسدتان روعی اعظمھما ضررا بارتکاب اخفھما کما فی الاشباہ۔

جواب۔ یہ شبہ مبحث سے خارج ہے، آپ جب وہ نقصانات اور بعض کا مضر تر ہونا قوی دلائل سے ثابت کرکے دوسرا سوال پیش کریں گے، اس کا بھی شرعی جواب سن لیں گے، اس وقت نہ اس شبہ کی ضرورت نہ ازالہ کی حاجت۔

باقی رہا منشاء مدارات ہنود یعنی اتفاق، اس سے کیا مراد ہے۔

اول :- اتفاق کل مسلمانوں کا کل ہنود سے۔

دوم :- یا اتفاق کل مسلمانوں کا بعض ہنود سے

سوم :- یا اتفاق بعض مسلمانوں کا کل ہنود سے۔

چہارم :- یا اتفاق بعض مسلمانوں کا بعض ہنود سے۔

یہ چار صورتیں ہوئیں، اور ہر ایک کی دو دو صورتیں ہیں۔ اتفاق دائمی یا اتفاق تا زمان محدود کل آٹھ صورتیں ہیں، بالفرض اگر مان لیا جاوے کہ جملہ نزاعات واختلافات فریقین کا قلع قمع فقط ترک بقر پر مبنی ہے، تاہم ان اتفاقات مذکورہ سے بجز ایک صورت کے کوئی مفید نہیں۔ وہ کون صورت ہے، اتفاق کل مسلمانوں کا کل ہنود سے دائما، اور ظاہر ہے کہ ایسا اتفاق عادۃً ممتنع الوجود ہے،

پس نتیجہ یہ نکلا کہ جو اتفاقات ممکن ہیں (اگر ان کا امکان عادۃً مان لیا جاوے) وہ مفید نہیں، اور جو مفید ہے وہ عادۃً ممکن نہیں؛ اس لئے ایسے اتفاق کی بنا پر شعار اسلام کو چھوڑ دینا بنائے فساد علی الفاسد ہے۔ ھذا ما سنح لی بالبال واللہ تعالیٰ اعلم بحقیقۃ الحال وعندی فلیکن شان المومن کما قال اللہ تعالیٰ یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء وجدا ما قال

البعیث بن حریث

وَلَسْتُ وَاِنْ قُرِّبْتُ یَوْمًا بِبَائِعٍ	خَلَاقِیْ وَلَا دِیْنِیْ ابْتِغَاءَ التَّحَبُّبِ
وَیَعْتَدُّہٗ قَوْمٌ کَثِیْرٌ تِجَارَۃً	وَیَمْنَعُنِیْ عَنْ ذَاکَ دِیْنِیْ وَمَنْصِبِیْ

وھذا آخر الکلام فالحمد للہ علی الاتمام اتمام ھذہ الرسالۃ المسماۃ بالاعتصام بحبل شعائر الاسلام والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ سید الانام وعلی آلہ واصحابہ الغر الکرام الی یوم القیام وانا عبدہ الراجی لطفہ الابدی ابو الانوار محمد عبد الغفار الحنفی النقشبندی الاعظمی المئوی، ۸ جمادی الاولی ۱۳۳۸ھ

الجواب صحیح والمجیب نجیح

ذبح البقر کے متعلق مؤلف علام نے جو تحقیق کی اور قوی دلائل سے اس کا اسلامی شعار ہونا ثابت فرمایا بہت صحیح ہے، اب اس سے زیادہ تحقیق کی چنداں ضرورت نہیں، میں بطور شہادت کے

فقط چار نامی علمائے لکھنؤ کی عبارتیں مجموعہ فتاویٰ جناب مولانا عبدالحی مرحوم و مغفور سے نقل کرتا ہوں لکھنؤ فرنگی محل کے یہ چاروں مقتدر علما ہیں، ان کی عبارتیں یہ ہیں۔

اول[1]۔ مولانا عبدالحی لکھنوی مرحوم مغفور مجموعہ فتاویٰ صفحہ ۲۸ جلد ۲ پس ہندو کی ممانعت تسلیم کرنا موجب ان کے اعتقاد باطل کی تقویت اور ترویج کا ہوگا، اور یہ کسی طرح شرعاً جائز نہیں اھ وایضاً اور گاؤ کشی کے طریقہ کو کہ اہل اسلام کا طریقہ قدیمہ ہے ترک نہ کریں،

دوم:۔ مولانا عبدالحلیم لکھنوی مرحوم و مغفور صفحہ ۲۸ جلد ۲ بہر حال گاؤ کشی کو کہ شعار مسلمانی ہے ترک نہ کریں۔ اھ

سوم[2]۔ مولانا عبدالوہاب لکھنوی مرحوم و مغفور صفحہ ۲۸ جلد ۲ فی الحقیقت قربانی گائے کی ملت اسلامیہ میں شعار اسلام سے واقع ہوئی ہے اس کا موقوف کرنا بسبب ممانعت ہنود موجب معصیت ہے، بلکہ قائم رکھنے قربانی گائے میں مسلمانوں کو سعی و کوشش لازم ہے۔

چہارم[3]:۔ مولانا ابوالغنا محمد عبدالمجید صاحب لکھنوی ثم قیصہ صفحہ ۳۸ جلد ۲ اس آئین دیرین کو کہ شعائر اسلام سے ہے ترک کرنا نہ چاہئے، بلکہ اس طریقہ کے ابقا میں سعی کرنا چاہئے۔ اھ

ان چاروں علما کی تحقیق سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ ذبح گاؤ شعائر اسلام سے ہے اور اسلامی شعار کا چھوڑنا نہ ہنود کی خاطرداری اور دلجوئی کے لحاظ سے جائز ہے نہ ان کی ممانعت سے، ان کی رعایت وہیں تک کی جاسکتی ہے جس کی شریعت میں اجازت ہو۔ جناب مولانا اشرف علی صاحب دامت برکاتہم اپنی تفسیر بیان القرآن صفحہ ۱۰۱ جلد ۲ میں تحریر فرماتے ہیں، اسلام کامل فرض ہو اور اس کا کامل ہونا جب ہے کہ جو امر اسلام میں قابل رعایت نہ ہو اس کی رعایت دین ہونے کی حیثیت سے نہ کی جاوے، اھ واللہ تعالیٰ اعلم کتبہ احقر العباد محمد عبدالحق سیوانی عفی عنہ، حال مدرس انجمن اسلامیہ گورکھپور۔

خلاصہ رسالہ

(۱) گاؤ کی قربانی اور اس کا ذبح کرنا قرآن و حدیث و تعامل صحابہ و اجماع و قیاس سے ثابت ہے۔

(۲) گاؤ کا ذبح محض مباح ہی نہیں، بلکہ شعائر اسلام سے ہے۔

---

[1] مؤلف مجموعہ فتاویٰ و تالیفات کثیرہ ۱۲ [2] یہ مولانا عبدالباری صاحب لکھنوی فرنگی محلی کے والد ماجد تھے ۱۲ [3] یہ فرنگی محل میں اب تک موجود ہیں ۱۲

(۳) چونکہ گاؤ کی قربانی اور اس کا ذبح شعائر اسلام سے ہے ہنود کے اتفاق اور خوشی کے لئے بند کرنا درست نہیں۔

(۴) گاؤ کی قربانی اور اس کے ذبح کو تمدنی اور اخلاقی حیثیت قرار دے کر چھوڑ دینا بھی درست نہیں۔

(۵) کسی فائدہ موہوم کی بنا پر بھی اس کو ترک کر دینا درست نہیں۔

(۶) اتفاق ہنود جو منشائے ترک قرار دیا گیا ہے، عادۃً ناممکن ہے۔

(۷) ذبح بقر کے شعائر اسلام ہونے پر نامی علمائے لکھنؤ فرنگی محل کی شہادتیں۔

لخصہ

محمد متین طالب علم مدرسہ انجمن اسلامیہ گورکھپور ناقل رسالہ ہذا۔

الجواب الثانی الملقب بہ

تصلیۃ سقر لمانع تضحیۃ البقر

اقول: وبہ نستعین، ہنود کی خوشامد اور ان کے خوشنود کرنے کے لئے گلئے کی قربانی کا ترک کرنا یا مطلقاً ذبح گاؤ کو بند کرنا ہرگز جائز نہیں، کیونکہ ترک ذبح بقر شعار کفار ہے اور مسلمانوں کا ترک کرنا اس شعار کفر کی ترویج میں اعانت ہے، اور کسی شعار کفر کی ترویج میں مسلمانوں کی اعانت جائز نہیں ہے۔ دوسرے گو آجکل محض اس کو مصلحت وقت سمجھ کر چھوڑا جاتا ہے، لیکن اس کے شیوع کے بعد نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان کے عقیدوں میں خلل آ جاوے گا۔ اور وہ بھی اس کو مثل ہنود کے برا سمجھنے لگیں گے، اور یہ امر شرعاً مذموم ہے جس سے بچنا واجب ہے اس لئے جو امر مذموم کی طرف مفضی ہو اس سے بچنا بھی شرعاً واجب ہے، کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ ہندوؤں کے اختلاط نے نکاح بیوگان پر کیا اثر کیا ہے، اور علماء کو اس رسم قبیح کے مٹانے میں کس قدر دقتیں اٹھانی پڑی ہیں اور ایک نکاح بیوگان ہی پر کیا خصوصیت ہے، اور بہت سی ہنود کی رسمیں ہیں جو مسلمانوں میں رائج ہو گئی ہیں جن کے مٹانے کے لئے علماء برسوں سے کوشش کر رہے ہیں، مگر اب تک ان کو پوری کامیابی نہ ہوئی، پس اگر طریقہ گاؤکشی متروک ہو گیا تو اس کا اثر دوسری رسوم سے زیادہ برا ہوگا، اس لئے اس میں کسی مسلمان کو حصہ نہ لینا چاہئے، تیسرے بہت سے غریب مسلمان جو

جو مستقل طور پر بکرا نہیں کر سکتے، بلکہ چند آدمی مل کر ایک گائے ذبح کر لیتے ہیں، پس اگر طریقہ گاؤ کشی کو بند کیا گیا تو ان کو نقصان پہنچیگا، چوتھے بہت سے لوگ گائے کے گوشت کے شائق اور عادی ہیں پس گائے کشی کے انسداد میں سعی کرنا ان کو جبراً ان کے جائز حق سے محروم کرنا ہے، پانچویں اگر آج ان لوگوں کی خواہش سے جو صرف گائے کے ذبح کو برا سمجھے ہیں، گائے کے ذبح کی ممانعت کی گئی تو کل کو ہندوؤں کا دوسرا فرقہ جو مطلقاً قتل حیوانات کو برا سمجھتا ہے، ان کی خواہش سے مطلقاً قربانی اور گوشت خواری ترک کرنی پڑے گی اور اس کا ضرر ظاہر ہے، چھٹے اگر اس ضرر کو بھی بالفرض برداشت کر لیا جاوے تو ہندوؤں کو ہماری اذانیں اور نمازیں اور مسجدیں، بلکہ ہمارا مسلمان ہونا بھی برا معلوم ہوتا ہے، لہذا ان کی خاطر سے ان سب کو بھی خیرباد کہنا پڑے گا، ساتویں گو آجکل یہ کہا جاتا ہے کہ ہم ذبح بقر کو ناجائز نہیں سمجھتے، لیکن اس رسم قبیح کے جاری ہونے کے بعد اگر ایک زمانہ کے بعد مسلمانوں کے عقیدوں میں تزلزل آگیا اور علماء کو اصلاح عقیدے کے لئے نکاح بیوگان کی طرح اس سنت کے احیاء کی ضرورت ہوئی تو پھر اس مردہ سنت کا چلانا ناممکن ہوگا، کیوں کہ ہندو اس میں مزاحمت کریں گے، اور جاہل مسلمان ان کے مددگار ہوں گے، الغرض ہندوؤں کے ساتھ ایسا اتفاق ہرگز جائز نہیں جس سے کسی اسلامی عقیدے میں خلل آنیکا اندیشہ ہو یا کسی شعار اسلامی میں خلل پڑے یا دوسرے مسلمانوں کو اس سے کسی قسم کا نقصان پہنچے یا اس میں کسی شعار کفر کی ترویج ہو، اور گاؤ کشی کے ترک میں یہ سب باتیں موجود ہیں، اس لئے اس میں ہندوؤں کی موافقت کسی طرح جائز نہیں، بلکہ اس میں زوال ایمان کا اندیشہ ہے، لہذا مسلمانوں کو کوشش کرنا چاہئے کہ مسلمانوں کا ایک طریقہ جو ابتداء اسلام سے چلا آرہا ہے اس کو قائم رکھنے میں امکانی کوشش کریں، اور نا عاقبت اندیش اور نادان دوستوں کی بظاہر خوشنما تقریروں اور تحریروں سے دھوکا نہ کھاویں، گاؤ کشی اور قربانی گاؤ کا مسئلہ نیا نہیں ہے۔ بلکہ پہلے بھی ہندوؤں نے اس میں کوشش کی ہے۔ مگر اگلے علماء نے اس کی ہرگز اجازت نہیں دی۔ اس وقت چند علماء فرنگی محل کے فتوی نقل کئے جاتے ہیں، تاکہ مسلمانوں پر اس مسئلہ کی اہمیت ظاہر ہو، چنانچہ جناب مولوی عبدالحی صاحب لکھنوی فرنگی محلی تحریر فرماتے ہیں:

"یہ ایک طریقہ قدیمہ ہے، زمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتابعین وجملہ سلف صالحین سے تمام بلاد وامصار میں اس کی اباحت پر اجماع واتفاق ہے تمام اہل اسلام کا ایسے امر شرعی ماثور قدیم سے اگر ہنود روکیں، اور بنظر تعصب مذہبی منع کریں تو مسلمانوں کو اس سے باز رہنا نہیں

درست ہے، بلکہ ہرگاہ ہنود ایک امر شرعی قدیم کے ابطال میں کوشش کریں اہل اسلام پر واجب ہے
کہ اس کے ابقاء و اجراء میں سعی کریں، اور اگر ہنود کے کہنے سے اس فعل کو چھوڑیں گے تو گنہگار ہوں گے"
بقدر حاجت منقول از صفحہ ۲۸۳ جلد ثانی مجموعہ فتاویٰ۔

اور جناب مولوی عبدالوہاب صاحب والد بزرگوار مولوی عبدالباری صاحب لکھنوی فرنگی محلی
تحریر فرماتے ہیں،

"فی الواقع جن بلاد میں رواج گاؤکشی بے قصد فتنہ و فساد کے جاری رہا اور اب کوئی قوم
ہنود سے مانع ہے ان بلاد میں مسلمانوں کو رسم گاؤکشی کے باقی رکھنے میں کوشش لازم ہے" اھ بقدر
الحاجۃ فتاویٰ مذکورہ صفحہ مذکور،

اور جناب مولوی عبدالحلیم صاحب فرنگی محلی تحریر فرماتے ہیں۔

"جن بلاد و امصار و قصبات و قریات و دیہات و مواقعات ہندوستان میں رواج گاؤکشی کا طریقہ
قدیمہ ہے بلا قصد فتنہ و فساد قدیم الایام سے چلا آیا ہے، اور اب کوئی ہندو بپاس تعصب مذہبی مانع
و مزاحم ہے، ایسے مواقع میں مسلمانوں کو بپاس حمیت اسلامی ابقاء رسم گاؤکشی میں کوشش بلیغ
لازم ہے زینہار ترک نہ کریں، اور فقرہ مسئول عنہا سے یہ مراد نہیں ہے کہ تقلید و اتباع ہنود میں قطعاً
گاؤکشی کہ ماثور و قدیم ہے اور جس کی اباحت باجماع و اتفاق جمیع اہل اسلام کا از سلفاً نا خلف
رہا ہے اور رہے گا، ممانعت و مزاحمت ہنود سے ترک ہو جاوے معاذ اللہ من ذلک، و ہرگاہ فی
زماننا ہنود اہل اسلام سے تعصب مذہبی و عداوت بہت ہے، کہ شعائر اسلامیہ سے روکتے ہیں، پس
دریں صورت مسلمانوں کو بپاس حمیت اسلامی روکنے سے ہنود کے واسطے قربانی گاؤ کھانے گوشت
گائے کے کہ طریقہ ماثورہ قدیم ہے رکنا نہ چاہئے۔ اور ان کی ممانعت کو تسلیم نہ کرنا چاہئے، بہر حال گاؤکشی
کو کہ شعار مسلمانی ہے ترک نہ کریں، احیاناً کی استازعت میں احتمال فساد فیمابین ہو تو بذریعہ حکام وقت
دفع کرنا اس کا با بقاء رواج قدیم واجب ہے؛ اور بخوف فساد ہنود قربانی گاؤ سے لوگ باز رہیں،
اس میں کوشش بلیغ کو کام فرماویں ورنہ گنہگار ہوں گے۔ ان ینصر کم اللہ فلا غالب لکم واللہ
غالب علی امرہ ھذا اکم اللہ الی سواء السبیل صفحہ فتاویٰ مذکور، نیز مولوی عبدالحیٰ صاحب
دوسرے فتوی میں تحریر فرماتے ہیں۔

از انجا کہ گائے کے ذبح کرنے کا جواز قرآن و حدیث سے ثابت ہے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم
اور صحابہ نے زمانہ آنحضرتؐ میں اور بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کو ذبح کیا اور اس کے گوشت کے

حلال ہونے پر اور ذبح کے جائز ہونے پر خواہ بروز عید ہو یا کسی اور روز ہو اتفاق ہے تمام مسلمانوں کا کوئی مسلمان اس کے جواز اور حلت میں شبہ نہیں کرتا ہے، بناءً علیہ جب کوئی مسلمان عید الاضحیٰ کے روز خواہ کوئی اور روز گائے ذبح کرے اور کوئی ہندو بنظر اپنے مذہب کے اس کو روکے تو مسلمان کو باز آنا نہیں درست ہے، اور ہندوؤں کی ممانعت کو جو مبنی ہے اس کے اعتقاد باطل پر تسلیم کر لینا نہیں جائز ہے، ہماری شریعت میں بہ نسبت اور جانوروں کے گائے کی کچھ بھی عظمت نہیں ثابت ہے، بلکہ یہ مثل اور جانوروں کے جواز ذبح میں ہے، جو شخص اس کی عظمت کا خیال کرے اس کے اسلام میں قصور ہے، پس ہندوؤں کی ممانعت کو تسلیم کرنا موجب ان کے اعتقاد باطل کی تقویت اور ترویج کا ہوگا، اور یہ کسی طرح شرعاً جائز نہیں ہے،، الیٰ آخر ما قال، مجموعہ فتاویٰ جلد دوم ص۲۵۶ ، اس کی تائید اپنے الفاظ میں مولوی عبد الحلیم صاحب نے بھی فرمائی ہے، دیکھو مجموعہ فتاویٰ صفحہ ۳۰۶، جلد دوم، اور مولوی عبد الوہاب صاحب پدر مولوی عبد الباری صاحب نے اس کی تائید میں یہ عبارت تحریر فرمائی ہے۔

" فی الحقیقت قربانی گائے کی ملت اسلامیہ میں شعار اسلام سے واقع ہوئی ہے، اس کا موقوف کرنا بسبب ممانعت ہنود موجب معصیت ہے، بلکہ قائم رکھنے قربانی میں مسلمانوں کو سعی و کوشش لازم ہے،، مجموعہ فتاویٰ ص۲۶۲ جلد دوم، اسی مضمون کی تائید مولوی عبد المجید صاحب فرنگی محلی و مولوی محمد نعیم صاحب و مولوی محمد اکرم صاحب نے بھی اپنے اپنے الفاظ میں فرمائی ہے، دیکھو مجموعہ فتاوےٰ جلد دوم ص۲۵۶، چونکہ یہ تمام مضامین مجموعہ فتاویٰ میں مطبوع ہو چکے ہیں اس لئے ان کی عبارات کو نقل کرنا موجب تطویل سمجھ کر ترک کیا گیا جس کا جی چاہے مجموعہ فتاویٰ میں دیکھ لے۔

خلاصہ ان تمام فتاویٰ کا یہ ہے کہ کسی ہندو کی خاطر سے کسی ایک شخص یا کسی ایک مقام پر قربانی گاؤ کا ترک کرنا جائز نہیں ہے چہ جائے کہ تمام ہندوستان سے اس شعار اسلامی کو مٹا دیا جاوے، نعوذ باللہ منہ جو لوگ اس شعار اسلامی کے مٹانے میں ساعی ہیں اُن کے استدلال کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ گاؤ کشی شرعاً مباح ہے نہ کہ واجب اس لئے اس کا چھوڑنا جائز ہے، لیکن ان لوگوں کو اتنی خبر نہیں کہ اگر کوئی مباح کسی معصیت کا ذریعہ بن جاوے تو وہ حرام ہو جاتا ہے، پس ترک گاؤ کشی جس میں ایک شعار اسلامی کا مٹانا اور ایک شعار کفر کی ترویج اور مسلمانوں پر ناجائز دباؤ وغیرہ ہیں کیونکر جائز ہوگی؟ دیکھئے، جس طرح قربانی گاؤ واجب نہیں ہے یوں ہی ہفتہ کے روز مچھلی کا شکار بھی واجب نہیں ہے، مگر جس وقت حضرت عبد اللہ بن سلام وغیرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین یہودیت کو چھوڑ کر مسلمان ہوئے تو

انھوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ہم کو اجازت دیجئے کہ ہم ہفتہ کے ساتھ
وہی معاملہ کریں جو ہم یہودیت کے زمانہ میں کیا کرتے تھے یعنی ہم اس روز مچھلی کا شکار نہ کریں. اس پر آیت
یاایھا الذین اٰمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطٰن انہ لکم
عدو مبین نازل ہوئی، کما فی الدر المنثور. جس میں ان کو بتلایا گیا ہے کہ اسلام لانے کے بعد شعار
یہود کا اتباع خلاف اسلام اور اتباع شیطان ہے، گو وہ اتباع صرف درجہ عمل میں ہو نہ کہ درجہ
اعتقاد میں، پس جب کہ اسلام کے بعد سبت کی عملی تعظیم یعنی اس روز قصداً مچھلی کا شکار نہ کرنا
خلاف اسلام اور اتباع شیطان ہوا، حالانکہ تعظیم سبت ایک وقت میں مامور من اللہ رہ
چکی ہے، تو ترک گاؤ کشی بقصد موافقت ہنود کیسے جائز ہو سکتی ہے، پس اگر ایک شخص بھی اس
قصد سے گاؤ کشی چھوڑے گا تو سخت گنہگار ہوگا، چہ جائیکہ تمام مسلمان گاؤ کشی چھوڑ کر علانیہ ہنود بنیں
مسلمانوں کو ہرگز ایسی جرأت نہ کرنی چاہئے اور ایسے خیالات سے توبہ کرنی چاہئے، مسلمانوں کے لئے
کس قدر غیرت اور شرم کی بات ہے کہ ہندو کافر ہو کر اس کو جائز نہیں رکھتے کہ وہ مسلمانوں کی خاطر
اپنے غلط خیال یعنی قبح گاؤ کشی سے دست بردار ہو جاویں یا کم از کم مسلمانوں سے اس بارہ میں
تعرض نہ کریں، اور مسلمان باوجود حق پر ہونے کے ہندوؤں کی خاطر اپنے ایک جائز طرز عمل کو
چھوڑ کر جس کا جواز قرآن میں بنص ومن الابل اثنین ومن البقر اثنین قل آلذکرین
حرم ام الانثیین اما اشتملت علیہ ارحام الانثیین ام کنتم شھداء اذ وصاکم
اللہ بھذا الاٰیۃ مذکور ہے ان جیسے بن جاویں افسوس صد افسوس، اس سے بھی زیادہ عجیب
بات اور سنئے، اگر ہندو یہ کہیں کہ ہم تم سے اس وقت اتفاق کریں گے جب تم اپنی جائدادیں اور
مکانات وغیرہ ہم کو دیدو یا اپنے حقوق سے جو حکومت میں تم کو حاصل ہیں دست بردار ہو جاؤ تو یہی
لوگ جو اس وقت گاؤ کشی کے ترک میں ساعی ہیں کبھی اس صلح پر رضامند نہ ہوں گے تو کیا شعار
اسلامیہ اور احکام الٰہیہ کی اتنی بھی وقعت نہیں جتنی کہ جائدادوں اور زمینوں وغیرہ کی کہ ان کو
دے کر ہندوؤں سے صلح کی جاتی ہے، گو اس قدر تحریر ترک گاؤ کشی کے عدم جواز کے لئے کافی ہے
مگر بعض دیگر ضروری مضامین کا افادہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، سو واضح ہو کہ جس طرح ہندوؤں
نے گائے کو جو منجانب اللہ حلال ہے، اپنی طرف سے حرام کر رکھا ہے یوں ہی مشرکین مکہ نے بعض
جانوروں کو اپنی طرف سے حرام کر رکھا تھا، حق سبحانہٗ اس تحریم ناجائز کی تردید فرماتے ہیں،
اور کہتے ہیں۔ یاایھا الناس کلوا مما فی الارض حلالا طیبا ولا تتبعوا خطوات الشیطٰن

انہ لکم عدو مبین . انما یامرکم بالسوء والفحشاء وان تقولوا علی اللہ مالا تعلمون
پس اس آیت میں جس طرح مشرکین مکہ کو حکم ہے کہ تم اپنی طرف سے حلال کو حرام کرکے شیطان کا اتباع
اور خدا پر افتراء مت کرو، یوں ہی ہندوؤں کو بھی حکم ہے کہ تم گاؤ کشی کو ناجائز بتلا کر شیطان کی
پیروی اور خدا پر بہتان مت باندھو. چونکہ خدا نے اس کو حلال کیا ہے، اس لئے تم بھی حلال سمجھو
اور کھاؤ پس جبکہ خود ہندوؤں کو یہ حکم ہے، کہ اس کو حرام نہ سمجھیں اور اس کے ساتھ حرام کا سا
معاملہ نہ کریں، تو مسلمانوں کو کب اجازت ہو سکتی ہے، کہ وہ ہندوؤں کی موافقت کرکے عملاً
افتراء علی اللہ اور اتباع شیطان میں حصہ لیں، اور سنئے بعض صحابہ نے راہبوں کی روش کا اتباع
کرنا چاہا تھا، اور گوشت خواری اور نکاح وغیرہ کے ترک کا عزم کرلیا تھا، جناب رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس روش کو ناپسند فرمایا، اور فرمایا کہ کیا ہو گیا ہے لوگوں کو کہ وہ
ایسا ایسا کہتے ہیں، میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں؛ سوتا بھی ہوں اور قیام
لیل بھی کرتا ہوں، گوشت بھی کھاتا ہوں، اور نکاح بھی کرتا ہوں (میری سنت یہ ہے) پس جو
میری روش کو چھوڑے وہ مجھ سے نہیں ہے، اخرجہ البخاری ومسلم کما فی الدر المنثور اور عکرمہ
وقتادہ سے مروی ہے، کہ اسی واقعہ میں یہ آیت نازل ہوئی. یا ایھا الذین امنوا لا تحرموا
طیبات ما احل اللہ لکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین، اب غور کا مقام ہے
کہ گوشت خواری وغیرہ تمام امور مباحہ ہیں، واجب ان میں ایک بھی نہیں، مگر عزم ترک
علی الدوام پر جو کہ عملی تحریم ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو کس قدر
ڈانٹا اور حق سبحانہ نے کیسی تنبیہ فرمائی، پس جبکہ صحابہ عزم ترک مباحات علی الدوام پر
جو کہ عملی تحریم ہے ملامت کے مستحق ہوئے تو جو لوگ ارضاء ہنود کے لئے گائے کی عملی تحریم
میں ساعی ہوں وہ کس درجہ حق سبحانہ کے یہاں معتوب اور ملام ہوں گے، خدا محفوظ رکھے
جہل سے، اور لیجئے مشرکین نے کچھ مسلمانوں کو بہکایا تھا کہ تمہارے یہاں یہ مسئلہ ہے کہ اگر
کوئی جانور اپنی موت مرجاوے تو حرام ہے اور جس کو تم ذبح کردو وہ حلال ہے آخر یہ کیا بات
ہے کہ جس کو خدا مارے وہ حرام اور جس کو تم مارو وہ حلال، بعض کمزور مسلمان اس دھوکہ
میں آگئے، حق سبحانہ ان کو تنبیہ فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں مالکم الا تاکلوا مما ذکر اسم
اللہ علیہ وقد فصل لکم ما حرم علیکم الخ جس کا حاصل یہ ہے کہ جس چیز کو خدا نے
تمہارے لئے حلال کردیا ہے تم بھی اعتقاداً وعملاً اس کو حلال سمجھو، اور مشرکین کے

بہکانے میں نہ آؤ، پس مسلمانوں کے لئے کب جائز ہوگا کہ وہ ہندوؤں کی تفریق سے متاثر ہوکر جس کو خدا نے حلال کیا ہے اس کو عملاً اپنے اوپر حرام کرلیں، اور سنئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں من صلی صلوتنا واستقبل قبلتنا واکل ذبیحتنا فذلک المسلم الذی له ذمة الله وذمة رسوله فلا تخفروا الله فی ذمته رواہ البخاری دیکھئے اس حدیث میں صلوٰۃ واستقبال قبلہ کے ساتھ اکل ذبیحہ مسلم کو بھی شعائر وعلامات اسلام سے قرار دیا ہے، پس اگر کوئی اس کا اہتمام کرے کہ میں مسلمان کا ذبیحہ نہ کھاؤں گا تو وہ ایک شعار اسلام کا تارک ہوگا، حالانکہ اکل ذبیحہ مسلم فی نفسہ واجب نہیں یوں ہی گو ذبح بقر فی نفسہ واجب نہ ہو مگر چونکہ شعار اسلام ہے اس لئے اس کا باقی رکھنا واجب ہے، اگر کوئی ایک شخص بھی اس کے ترک کا عزم واہتمام کرے گا تو وہ شعار اسلام کا تارک ہو جائے گا، چہ جائیکہ پوری قوم اور پورا ملک اس کا اہتمام کرلے، اور اس کو مطلقاً ترک کردے۔

پس خلاصہ یہ ہے کہ گائے کا گوشت کھانا اور اس کا ذبح کرنا خواہ قربانی کے لئے ہو یا فقط کھانے کے لئے از روئے قرآن وحدیث جائز ہے، اور ہندوؤں کی خوشامد میں اس کا ترک کسی حال میں ایک شخص کے لئے بھی جائز نہیں چہ جائیکہ تمام ملک کے لئے، پس جو اس میں ساعی ہوگا وہ ایک شعار اسلام کے مٹانے اور شعار کفر کے رواج دینے اور گاؤ پرستی کا عقیدہ مسلمانوں کے دلوں میں جمانے اور ما احل اللہ کے عملاً تحریم اور اتباع شیطان وافترا علی اللہ کا مجرم ہوگا، لہذا مسلمانوں کو ایسے فعل سے احتراز واجب ہے، ہندوؤں کے ساتھ اتفاق کی یہی صورت نہیں کہ مسلمان گاؤکشی چھوڑ دیں۔ بلکہ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ مسلمان اپنے مذہبی شعار پر قائم رہیں، اور ہندو اپنے شعار مذہبی کو قائم رکھیں، یعنی خود گاؤکشی نہ کریں، مگر مسلمانوں کی مزاحمت نہ کریں، اور اگر ہندو اس پر رضامند نہ ہوں تو پھر مسلمانوں کو صاف کہہ دینا چاہئے۔ یا ایها الکافرون لا اعبد ما تعبدون ولا انتم عابدون ما اعبد ولا انا عابد ما عبدتم ولا انتم عابدون ما اعبد لکم دینکم ولی دین، کیونکہ مسلمان آزاد نہیں ہیں کہ اپنی مرضی سے اور اپنے خیالی وہمی منصوبوں کی بنا پر جس سے چاہیں صلح کرلیں، اور جس سے چاہیں جنگ کرلیں، اور جن شرائط پر چاہیں اتفاق کرلیں، بلکہ وہ خدائی قانون کے ماتحت ہیں اور وہ جو کچھ بھی کرسکتے ہیں، قانون الٰہی کے تابع ہوکر کرسکتے ہیں، اور قانون الٰہی ان کو ترک گاؤکشی بغرض ارضاء ہنود کی اجازت نہیں دیتا، لہذا ان کو اس میں ہندوؤں کی موافقت جائز نہیں ہے، اور وہ اس کے خلاف کریں گے تو

آخرت میں سخت سزا کے مستحق ہوں گے، اور دنیا میں جو کچھ رسوائی اور ذلت ہوگی، وہ الگ ہے سخت افسوس کی بات ہے کہ اگر خدا کسی مسلمان کو دنیوی وجاہت عطا کرتا ہے، اور کچھ لوگ اس کو بڑا ماننے لگتے ہیں تو وہ حمایت اسلام کے پردہ میں پہلا وار اسلام پر کرتا ہے۔ اور اس کی شاخیں کاٹ کر پھینکنا شروع کرتا ہے، بلکہ جڑ تک اکھاڑنے کی کوشش کرتا ہے، برخلاف ہندوؤں کے کہ جب ان کو اپنی قوم میں مقبولیت ہوتی ہے تو وہ مخالفت سے یا موافقت سے جس طرح بن پڑتا ہے اپنے مذہب کو تقویت پہنچانے کی فکر کرتے ہیں، پس مسلمانوں کو خدا و رسول سے شرمانا چاہئے، اور ہرگز کوئی کارروائی اسلام کے خلاف نہ کرنی چاہئے، سنا گیا ہے کہ بعض مقامات پر بعض لیڈران ہنود کے خوش کرنے کے لئے جاہل مسلمانوں نے اپنے ماتھوں پر تلک دگلائے، اور بعض دیگر مقامات پر دیگر کفریات کا ارتکاب کیا، پس جبکہ ابتدائے اتفاق میں مسلمانوں کی یہ حالت ہو کہ ماتھوں پر کفر کے نشانات لگاتے ہیں۔ اور دیگر کفریات میں ہندوؤں کی شرکت کرتے، اور شعائر اسلام کو مٹاتے اور شعار کفر کو رواج دیتے ہیں تو آگے چل کر ان کی کیا حالت ہوگی، غرض کہ یہ واقعات نہایت خطرناک ہیں، اور ایک سخت امتحان کا مقام ہے مسلمانوں کو نہایت احتیاط اور حزم سے کام لینا چاہئے اور اسلام کے نادان دوستوں یا ہوشیار دشمنوں کے خطرہ سے اپنے آپ کو بچانا چاہئے، یاد رہے کہ حقیقی عزت آخرت کی عزت ہے جس کا بدون حق سبحانہ کو خوش رکھے حاصل ہونا ناممکن ہے، رہی دنیاوی عزت سواول تو وہ کوئی چیز نہیں، اور اگر کچھ ہو بھی تو وہ بھی حق سبحانہ کے قبضہ میں ہے، تم ہزار ہندوؤں کی خوشامد کرو اور دنیا کے لئے دین برباد کرو مگر خدا تم کو عزت نہ دینا چاہیں تم کچھ نہیں کر سکتے، اور یہی ہندو جن کی خاطر آج اسلام کی بیخ کنی کی جارہی ہے، وقت پر تم کو ذلیل کرنے کیلئے آمادہ ہو جائیں گے، پس مسلمانوں کو اپنے اسلام کی بچاؤ کی فکر چاہئے نہ کہ دنیاوی عزت اور رضاء ہنود کی اور ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم وان یخذلکم فمن ذا الذی ینصرکم من بعدہ کو پیش نظر رکھنا چاہئے، ہاں اگر اسلام کو محفوظ رکھ کر اور جائز تدبیر سے دنیوی عزت بھی حاصل ہو جاوے تو مضائقہ نہیں، مگر دنیاوی عزت کے واقعی یا خیالی منصوبوں کی بناء پر اسلام کو ضرر پہنچانا اور افعال کفریہ کا ارتکاب کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا، حق سبحانہ ایسے ہی دین فروش اور دنیا خرید لوگوں کی نسبت فرماتے ہیں۔ ایبتغون عندھم العزۃ فان العزۃ للہ جمیعا وما علینا الا البلاغ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ الراجی رحمت ربہ الصمد حبیب احمد الکیرانوی مقیم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

التماس از اشرف علی

اس وقت دینی ضرورت ہے کہ ان جوابوں پر علماء سے دستخط کرا کر مسلمانوں میں بکثرت شائع کریں، چنانچہ لوگوں کے خیال میں منسوب الی العلم ہونے کے سبب میں بھی ذیل میں دستخط کرتا ہوں وھو ہٰذا

احقر اشرف علی تھانوی نے یہ دونوں جواب دیکھے، بالکل صحیح اور حق صریح ہیں، قابل غور امر ہے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد یحلفون باللہ لکم لیرضوکم واللہ ورسولہ احق ان یرضوہ ان کانوا مومنین، اور ارشاد ہے۔ یحلفون لکم لترضوا عنہم فان ترضوا عنہم فان اللہ لا یرضیٰ عن القوم الفاسقین، ان دونوں آیتوں میں تصریح ہے کہ اللہ ورسول کو ناراض کر کے جب مسلمانوں کو راضی کرنا بھی موجب عتاب وعقاب ہے تو اللہ ورسول کو ناراض کر کے کافروں کو راضی کرنا تو کس طرح موجب عتاب و عقاب نہ ہوگا، اس امر کو خفیف نہ سمجھیں، اس کا شدید ہونا دلائل شرعیہ سے ثابت ہو چکا ہے، تحسبونہ ھینا وھو عند اللہ عظیم، اس فتاوی پر عمل کرنا واجب ہے، اور اس کی مخالفت حرام ہے۔

تصحیح دیگر علماء

احقر نے دونوں رسالوں کو دیکھا، بحمد اللہ دونوں جواب صحیح اور اثبات مدعا میں کافی وافی ہیں، بیشک گائے کے ذبح کرنے کو ترک کر کے جو کہ شعار دین سے ہے ہنود کی موافقت کو اور اللہ اور رسول کی مخالفت کو کوئی مسلمان گوارہ نہیں کرسکتا،

کتبہٗ انوار الحق امروھوی مدرس مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون

بعد الحمد والصلوٰۃ یہ محتاج رحمت رب احد احقر الوریٰ بندہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ عرض کرتا ہے کہ میں نے رسالہ تصلیۃ سقر کو بالتفصیل اور دوسرے رسالہ کو بالاجمال دیکھا، بحمد اللہ دونوں جواب صحیح اور مقصود کی توضیح میں کافی ووافی ہیں، اللہ تعالیٰ مجیبین کو جزائے وافر عطا فرمادیں، جماعت علماء کو اس وقت اس رائے کا شدت کے ساتھ مقابلہ اور رد کرنا واجب ہے، جو بعض اتفاق پرستوں نے ظاہر کی ہے کہ مسلمانان ہند کو گائے کی قربانی ترک کردینا چاہئے، یہ لوگ محض ہنود کی خوشامد سے ایک اسلامی شعار کو باطل کرنا چاہتے ہیں۔ واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون یحلفون لکم لترضوا عنہم فان ترضوا عنہم فان اللہ لا یرضیٰ عن القوم الفاسقین، حق تعالیٰ دین اسلام کی نصرت کے لئے ہر زمانہ میں ایک جماعت کو کھڑا کردیتے ہیں جو شعائر اسلامی کی حفاظت کرتی ہے، اس لئے

جماعت اہل حق کو اس وقت شعائر اسلامی کی حفاظت کے لئے کھڑا ہونا چاہئے اور تقریرو تحریر سے اس رائے کی پوری تردید کرنا چاہئے، بھلا جس اتفاق کی ابتدا ر اسلامی شعار کے ابطال سے ہو اس میں فلاح و برکت کب ہو سکتی ہے، ومن یطع اللہ ورسولہ فقد فاز فوزاً عظیما والسلام، ۲۰ جمادی الاخریٰ ۱۳۳۸ھ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون۔

امابعد الحمد والصلوٰۃ احقر اہل الزمن احمد حسن ملتمس خدمت ناظرین ہے کہ صورت مسئولہ میں گاؤ کا ذبح بند کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ علاوہ مخالفت شعائر دین کے اخلاق مامور بہا کے بھی خلاف ہے جس کا آجکل کے مہذبین کو بڑے زور سے دعویٰ کیا ہے، کیونکہ یہ ایک سخت بے شرمی ہے اور غیرت اسلامی اس خوشامد کی ہرگز اجازت نہیں دیتی اور حیا سے ہاتھ اٹھالینا گوارا ہو تو اختیار ہے، جو دل چاہے کیا جاوے، فقد قال صلے اللہ علیہ وسلم ان مما ادرک الناس من کلام النبوۃ الاولیٰ اذا لم تستحی فاصنع ماشئت رواہ البخاری اور نیز یہ خوشامد غایت پست ہمتی ہے، اور پست ہمتی حق تعالیٰ نیز مخلوق کو ناپسند ہے فقد روی الطبرانی فی الکبیر عن الحسین بن علیؓ مرفوعاً ورجالہ ثقات کما فی العزیزی ان اللہ تعالیٰ یحب معالی الامور واشرافہا ویکرہ سفسافہا اھ نیز یہ امر مخلوق سے طمع بھی ہے، اور طامع محبوب عند الناس نہیں ہو سکتا فقد روی ابن ماجہ وغیرہ وسندہ حسن کما فی بلوغ المرام عن سہل بن سعدؓ قال جاء رجل الی النبی صلے اللہ علیہ وسلم فقال یارسول اللہ دلنی علی عمل اذا عملتہ احبنی اللہ واحبنی الناس فقال ازھد فی الدنیا یحبک اللہ وازھد فیما عند الناس یحبک الناس، اھ حاصل یہ ہے کہ بے شرمی اور پست ہمتی اور افعال ناپسندیدہ عند الخالق والمخلوق کا ارتکاب کر کے مقصود پورا ہونے کی ہرگز امید نہیں، لہٰذا ہر مسلمان کو اتباع شریعت بطریق کمال اختیار کر کے حق تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا چاہئے اور شیطانی وساوس کے اتباع کو ترک کرنا چاہئے۔ کتبہ احمد حسن (تتمہ خامسہ ص ۱۱۵)

حکم دادن چرم قربانی معلم را تبرعاً

سوال (۶۵۴) کسی معلم کو قربانی کی کھال بطور تصدق دیدی جاوے اور وہ معلم ملازم نہ سمجھا جاوے، کوئی قانون اور زور ملازمت کا نہ برتا جاوے بلکہ اس کی خوشی پر رکھا جاوے اور وہ معلم غربت کی حالت میں ہو اور متوکل ہو، اور متعلمین بھی غربا مساکین ہوں تو یہ صورت جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب، اگر یہ معلم بالکل کام نہ کرے تب بھی دینے والے اس کو دیں گے یا نہیں؟
۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۰ھ (تتمہ خامسہ ص ۱۴۰)

جواز قربانی جانور موئے سوختہ

سوال (۶۵۵) اور اگر مویشی کی کھال جل جانے کی وجہ اس پر بال نہ جمے ہوں اور زخم وغیرہ نہ ہو اور تمام اعضا صحیح وسالم ہوں تو ایسے مویشی کی قربانی درست ہے یا نہیں

الجواب، صریح جزئیہ تو ملا نہیں مگر دو جزیئے او ملے ان سے ان کی قربانی کا بھی جواز معلوم ہوتا ہے۔ فی العالمگیریہ وکذا (ای تجزئ) المجزوزۃ وھی التی جز صوفہا کذا فی فتاوی قاضی خان وفیہا تنتف شعر الاضحیۃ فی غیر وقتہ یجوز اذا کان لہا نقی ای مخ کذا فی القنیۃ ج ۲ ص ۲

۶ ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ (تتمہ خامسہ ص ۱۷۱)

کافی بودن نماز عید ضحی در جائے برائے حلت قربانی

سوال (۶۵۶) ایک گھر میں چند آدمیوں کی جانب سے قربانی ہوتی ہے آیا ایک شخص نماز عید پڑھ کے سب کی جانب سے قربانی کر سکتا ہے اور اگر نماز کسی نے بھی نہیں پڑھی مگر شہر کی کسی مسجد میں عید کی نماز ہو گئی ہو اس صورت میں بغیر نماز پڑھے قربانی کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب، فی الدر المختار واول وقتہا الی قولہ بعد سبق صلوۃ عید ولو قبل الخطبۃ لکن بعدھا احب، فی رد المحتار ولو ضحی بعد ما صلی اھل المسجد ولم یصل اھل الجبانۃ اجزاہ استحسانا لانہا صلوۃ معتبرۃ حتی لو اکتفوا بہا اجزاتھم وکذا عکسہ ج ۵ ص ۳۱۰

اس سے ثابت ہوا کہ خود مضحی کا نماز عید سے فارغ ہونا شرط نہیں ہے، جواز ضحیہ کی ملکہ مسجد یا عید گاہ میں نماز ہو چکنا کافی ہے، اس لئے سوال کی دونوں صورتوں میں قربانی جائز ہوگی۔

۶ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۰۱)

ساقط شدن قربانی از ذمہ خود بسبب قربانی کردن غیر از طرف آں

سوال اول (۶۵۷) قربانی زید پر واجب ہے مگر وہ اس لئے ایثار روپیہ قربانی پر صرف نہیں کرتا کہ اسے یہ علم ہے کہ عمر میری جانب سے تبرعا قربانی کر دے گا اگر واقعی عمر قربانی کر دے، تو زید کے ذمہ سے قربانی ادا ہو جائے گی؟

الجواب، فی العالمگیریہ اذا ضحی بشاۃ عن غیرہ بامر ذلک الغیر او بغیر امرہ لا تجوز لانہ لا یمکن تجویز التضحیۃ عن الغیر الا باثبات الملک لذلک الغیر فی الشاۃ ولن یثبت الملک لہ فی الشاۃ الا بالقبض ولم یوجد قبض الامر ھھنا لا بنفسہ ولا بنائبہ کذا فی الذخیرۃ ج ۶ ص ۲۰۲، اس روایت سے معلوم ہوا کہ زید کے ذمے جو قربانی واجب ہے وہ صورت مسئولہ میں ادا نہ ہوگی۔

۱۳ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ

سوال طریق ادا شدن قربانی از جانب غیر — قربانی کے متعدد جانور زید نے عمرو کے روبرو پیش کر کے یہ کہا کہ ان میں سے ایک ایک پر ایک ایک کے نام کی قربانی کردو، زید نے گو خود تعیین نہیں کی کہ کس پر کس کے نام کی قربانی کی جائے، لیکن عمرو نے ایک ایک جانور ذبح کیا، اور ہر ایک پر ایک ایک کی بالتعیین نیت کرلی تو اس صورت میں قربانی صحیح ہوجائے گی یا نہیں۔

الجواب۔ یہ توکیل مطلق اذن بالتعیین بھی ہے، لہٰذا جس جس کی طرف سے عمرو نے جو جو جانور ذبح کیا، وہ اس کی طرف سے واقع ہوگیا، اب اگر وہ لوگ جن کی طرف سے قربانی کی گئی ہے، اُن جانوروں کے مالک ہیں، تب تو اُن سب کی طرف سے واجب بھی ادا ہوگیا اور اگر صرف زید ہی مالک ہو تو زید کی طرف سے تو واجب ادا ہوا اور دوسروں کی طرف سے نفل ادا ہوا، اور ان لوگوں کے مالک ہونے کے دو طریق ہیں، ایک یہ کہ قبل اشترا سب سے اشترا کی اجازت حاصل کرکے وکیل بالاشترا بن جاوے اور گوشت اس میں سب کے ذمہ واجب ہوگا، مگر تبرعاً خود دیدے دوسرا طریق یہ کہ ماموربالذبح کو سب وکیل بنادیں کہ زید جو جانور ہم کو ہبہ کرے اس پر تم قبضہ کرلو طریق اول کی صحت کی دلیل یہ روایت ہے۔ وفی الاضاحی للزعفرانی اشتری سبعۃ نفر سبع شیاہ بینہم ان یضحوا بہا بینہم ولم یسم لکل واحد منہم شاۃ بعینہا فضحوا بہا کذلک فالقیاس ان لایجوز وفی الاستحسان یجوز فقولہ اشتری سبعۃ نفر سبع شیاہ بینہم یحتمل شراء کل شاۃ بینہم ویحتمل شراء شاۃ علی ان یکون لکل واحد شاۃ ولکن لابعینہا فان کان المراد ہو الثانی فما ذکر فی الجواب باتفاق الروایات لان کل واحد منہم یصیر مضحیا شاۃ کاملۃ وان کان المراد ہو الاول فما ذکر من الجواب علی احدی الروایتین فان الغنم اذا کانت بین الرجلین ضحیا بہا ذکر فی بعض المواضع انہ لایجوز کذا فی المحیط، عالمگیریہ ج ۶ ص ۲۰۵ قلت ولما وقع الذبح ہہنا علی التعیین فیجوز فی القیاس ایضا کما ہو ظاہر

طریق ثانی کی صحت کی دلیل وہ روایت ہے جو اولاً اصل سوال کے جواب میں نقل کی گئی تھی حیث ذکر فیہا لانہ لایمکن تجویز التضحیۃ عن الغیر الا باثبات الملک لذلک الغیر فی الشاۃ ولن یثبت الملک لہ فی الشاۃ الا بالقبض ولم یوجد قبض الآمر ہہنا لا بنفسہ ولا بنائبہ الخ قلت ولما ارتفعت علۃ عدم الصحۃ وہی عدم القبض حیث وجد القبض بالنائب ارتفع حکم عدم الصحۃ کما ہو ظاہر،

فائدہ، ذکر فی العالمگیریۃ بعد ہذہ الروایۃ بسطرین ولو ضحی بدنۃ عن نفسہ

وعرسه واولاده ليس هذا في ظاهر الرواية وقال الحسن بن زياد في كتاب الاضحية ان كان اولاده صغاراً جاز عنه وعنهم جميعاً في قول ابي حنيفة وابي يوسف وان كانوا كباراً ان فعل بامرهم جاز عن الكل في قول ابي حنيفة وابي يوسف وان فعل بغير امرهم او بغير امر بعضهم لا يجوز عنه ولا عنهم في قولهم جميعاً لان نصيب من لو يامر صار لحما فصار الكل لحما وفي قول الحسن بن زياد اذا ضحى بدنة عن نفسه وعن خمسة من اولاده الصغار وعن ام ولدها بامرها او بغير امرها لا تجوز عنه ولا عنهم قال ابو القاسم تجوز عن نفسه كذا في فتاوىٰ قاضيخان اھ وظاهره التعارض بين رواية الشاة وبين رواية البدنة فالوجه عندي ان البدنة يجوز الهبة فيها مشاعاً بقبض الواهب عنهم بامرهم والامر بالذبح امر بالقبض ويقبضه عن الصغار بلا امرهم فاجاز الشيخان تضحيتها عنهم ثم من لم يجوزها ابطلها بعضهم واوقعها بعضهم عن الذابح بخلاف الشاة حيث لم يصح هبتها مشاعاً لكونها محلا للقسمة ويقيد عدم الصحة هذه بكونها عن الكبار فافهم۔ (تتمہ خامسہ ص ۲۰۵)

سوال (۶۵۸) زید کا معمول یہ ہے کہ اپنی بیوہ غریب ماں اور نابالغ اولاد اور بالغ غنیہ بیٹی اور غنیہ بیوی سب کی جانب سے قربانی کے جانور خرید لیتا ہے اور روپے قیمت کے کسی سے نہیں لیتا اور نہ پہلے سے یہ معین کرتا ہے کہ کون جانور کس کے نام کا ہے، ذابح کو سب کے نام بتا کے یہ کہہ دیتا ہے کہ ہر ایک کے نام پر ایک ایک جانور کی قربانی کردو، ذابح ایک خاص ترتیب سے ایک ایک جانور ایک ایک کے نام ذبح کرتا ہے، اس صورت میں سب کی قربانی صحیح ہو جائے گی یا نہیں، اور بیوی اور بیٹی کو جو خود مالدار ہیں یہی قربانی کافی ہو جائے گی یا اپنی جانب سے علیحدہ قربانی کرنی پڑے گی، یہ ضرور ہے کہ اس قسم کے حالات میں دلالۃً امر واجازت ہوتی ہے کہ ہماری جانب سے قربانی کردو۔ اور یہ مامور کا تبرع ہے کہ وہ قربانی کی قیمت نہیں لیتا۔

جواب اس کا جواب بھی سوال بالا کے جواب سے نکل آیا، کہ اس سے دوسروں کا واجب ادا نہیں ہوگا، کیونکہ قبضہ نہیں پایا گیا، اور محض قربانی کا امر قبض کی توکیل نہیں ہے۔ اور تبرع بالقیمت کی وہ صورت معتبر ہے جس کو سوال بالا میں طریق اول سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۱۹ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۰۷)

حکم قربانی جانور مسروقہ کہ بلا علم خرید کردہ شد

سوال (۶۵۹) قربانی کے لئے ایک شخص سے بچھڑا خریدا تھا وہ اس گاؤں کا رہنے والا تھا اور قسم کھاتا تھا کہ یہ چوری کا نہیں، جس سے لیا پھر بعد میں معلوم ہوا کہ چوری کا ہے معتبر آدمی سے پختہ طور پر، قربانی درست ہوگی یا نہیں، پھر کریں قربانی؟

جواب. فی العالمگیریۃ عن المنتقی لو غصب اضحیۃ غیرہ وذبحہا عن نفسہ وضمن القیمۃ لصاحبہا اجزأہ ما صنع لانہ ملکہا بسابق الغصب کذا فی الخلاصۃ لو غصب من رجل شاۃ فضحیٰ بہا لا یجوز وصاحبہا بالخیار ان شاء اخذہا ناقصۃ وضمنہ النقصان وان شاء ضمنہ قیمتہا حیۃ فتصیر الشاۃ ملکا للغاصب من وقت الغصب فیجوز الاضحیۃ استحسانا، وکذا لو اشتری شاۃ فضحی بہا ثم استحقہا رجل فان اجاز البیع جاز وان استرد الشاۃ لم یجز کذا فی شرح الطحاوی ج ۶ ص ۲۰۳

خلاصہ جواب یہ ہے کہ یہ استحقاق کی صورت ہے اور استرداد نہیں ہوا، اور وجوب ضمان سے قربانی جائز ہو جاتی ہے. اصل مالک اگر مل جاوے تو اس کو اطلاع کردے. اگر وہ اس کو تاوان لے تو یہ اپنے بائع سے زرِ ثمن واپس کر سکتا ہے، ۱۵ محرم ۱۳۲۸ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۱۴)

اختلاف در دادن گوشت قربانی ہنود را

سوال (۶۶۰) کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ قربانی کا گوشت ہندوستان کے کفار کو جو ذمی نہیں ہیں دینا جائز ہے یا نہیں، اور ذمی کفار کی تعریف کیا ہے، اور بیان القرآن میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ کافر ذمی یعنی غیر حربی کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں، اور دوسرے صدقات واجبہ ونفل جائز ہیں، اس سے واضح نہیں ہوتا ہے کہ یہاں کے کفار کا کیا حکم ہے اور اگر تکلیف نہ ہو تو مذکور عبارت ملحقات الترجمہ کا ماحصل اردو میں عام فہم لکھئے. تقریرہ ان حاصل نہیہ صلی اللہ علیہ وسلم کان سلبا کلیا وحاصل الآیۃ الایجاب الجزئی المتحقق ببعض الصدقات فلا یرد ان الآیۃ عامۃ فی کل الصدقات فان محط الفائدۃ العموم المصرف لا عموم المصرف بینوا توجروا۔

الجواب فی الدر المختار اما الحربی ولو مستامنا فجمیع الصدقات لا تجوز لہ اتفاقا بحر عن الغایۃ وغیرہا لکن جزم الزیلعی بجواز التطوع لہ اھ وانظر ما علق علیہ فی رد المحتار ج ۲ ص ۱۰۰، اس روایت سے معلوم ہوا کہ کفار ہند کو قربانی کا گوشت دینے کا (کہ صدقہ تطوع یا ہدیہ ہے) جواز مختلف فیہ ہے، مگر معمول ہمارے علماء کا اس کا جواز ہے، یہ تو اصل سوال کا جواب ہو گیا، باقی بیان القرآن کی عبارت کے متعلق یہ امر قابل تنبیہ ہے کہ صدقات واجبہ کے

جواز کا مضمون کسی قدر محتاج تفصیل ہے، جو کتب فقہ میں مذکور ہے، اور اس کے ملحقات ترجمہ کی عربی عبارت کا حاصل یہ ہے کہ نہی تجی عن الصدقات علی الکفار کے بعد جو آیت نازل ہوئی اس ظاہراً جمیع صدقات کا عموم معلوم ہوتا ہے جو زکوٰۃ کو بھی شامل ہے، پھر نہی عن الزکوٰۃ آیت کے خلاف ہے، لا یرد الخ میں اسی اشکال کی تقریر ہے، جواب اس کا یہ ہے کہ مقصود آیت سے حضورؐ کی نہی کا منسوخ فرمانا ہے: اور آپؐ کی نہی کا حاصل یہ تھا کہ کافر کو کوئی صدقہ مت دو، سلب کلی کر یہی مراد ہے، اور آیت کا حاصل یہ ہے کہ کفار کو بعض صدقہ دینا چاہئے، ایجاب جزئی سے یہی مراد ہے اور ظاہر ہے موجبہ جزئیہ نقیض اور معارض ہوتا ہے سالبہ کلیہ کا، پس نسخ صحیح ہوگیا، پھر اگر کوئی کہے کہ آیت ظاہراً تو عام ہے، اور تمہاری تقریر پر آیت عام نہیں رہی بلکہ بعض صدقات کے ساتھ خاص ہے، اس کا جواب اس میں ہے فان محط الفائدۃ الخ یعنی آیت عام بیشک ہے لیکن عموم اس کا باعتبار مصروف یعنی صدقہ کے نہیں ہے، تاکہ زکوٰۃ وغیرہا سب کو شامل ہو، بلکہ عموم باعتبار مصرف کے ہے، یعنی مطلق صدقہ کا مصرف مسلم و کافر دونوں ہیں نہ کہ صرف مسلم، جیسا کہ نہی منسوخ کا حاصل تھا، انتہی حل الملحقات اور یہ عموم مصرف اس قول پر تو ظاہر ہے جس میں حربی کو صدقہ تطوع دینا جائز ہے، باقی دوسرے قول پر عموم باعتبار مسلم کے ہے، یعنی صدقہ خاص نہیں مسلم کے ساتھ، ۱۷ ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۲۹)

ثبوت حرمت گرفتن قیمت چرم قربانی اغنیا را

سوال (۶۶۱) حضور نے بہشتی زیور میں تحریر فرمایا ہے کہ قربانی کی کھال کی قیمت کو فقیر مسکین کے سوا اور کوئی نہیں لے سکتا ہے، ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ مالدار و فقیر سب کو لینا درست ہے اور کہتے ہیں کسی عربی کتاب میں دکھلائیں؟

الجواب، فی خلاصۃ الفتاوی عن مجموع النوازل قولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام لا تحل الصدقۃ لغنی لا لفقیر بنی ہاشم محمول علی الصدقۃ الواجبۃ اما النفل فیجوز وعن ابی یوسف یجوز ان یعطوا من صدقۃ الاوقاف لکن ہذا اذا سمی بہ الاغنیاء وبنوہاشم اما اذا اطلق لفظ الصدقۃ فہی صدقۃ واجبۃ ج ۱ ص ۲۴۵ صدقہ واجبہ کا غنی اور بنی ہاشم کے لئے حلال نہ ہونا، اور اغنیا و بنی ہاشم کے لئے صدقہ وقف حلال نہ ہونے کی بنا اس کے صدقہ واجبہ ہونے کو برقرار دینا اس عبارت میں مصرح ہے و فی البحر الرائق وقید بالزکوٰۃ لان النفل یجوز للغنی کما للہاشمی و اما بقیۃ الصدقات المفروضۃ والواجبۃ کالعشر و الکفارات والنذور وصدقۃ الفطر فلا یجوز صرفہا للغنی لعموم قولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام

لا تحل صدقۃ لغنی لخروجہ النفل منہا لان الصدقۃ علی الغنی ہبۃ کذا فی البدائع ج ۲ ص ۲۴۵

اس میں خلاصہ سے زیادہ اس کی تصریح ہے، اور ثمن جلد اضحیہ کے تصدق کا وجوب بھی مصرح ہے۔ پس ان روایات کی بناء پر اس ثمن کا محل تصدق خاص فقیر ہوگا جو بنی ہاشم میں سے نہ ہو، اور وقف سے شبہ نہ کیا جاوے، کیونکہ اس کا لزوم تابع التزام کے ہے تو بحسب التزام ہوگا اور مبحوث عنہ میں لزوم شرعی ہے۔ (تتمہ خامسہ ص ۲۵۰)

حلت ذبیحہ کہ گفتہ شود وقت ذبح بسم اللہ سنت ابراہیم خلیل اللہ

سوال (۶۶۲) جس جانور کے اوپر بسم اللہ اللہ اکبر کی جگہ بسم اللہ سنت ابراہیم خلیل اللہ کہہ کر ذبح کیا جائے آیا وہ شرع کے اندر جائز ہے یا نہیں یہاں پر چک نمبر ۱۸۹ میں جو کہ راجپوت مسلمان خانپور وغیرہ کے باشندے آباد ہیں، یہاں پر ایک قصائی ہے جو کہ ایک فقیر سے اس طریقہ پر ذبح کراتا ہے اور وہ ہمارے کہنے سے بسم اللہ اللہ اکبر کو نہیں مانتا، اس کا کہنا شرع کے اندر درست ہے یا نہیں؟

جواب - فی الدر المختار وان ذکر مع اسمہ تعالیٰ غیرہ فان وصل بلا عطف کرہ کقولہ بسم اللہ اللہم تقبل من فلان اومنی اومنہ بسم اللہ محمد رسول اللہ بالرفع لعدم العطف فیکون مبتدأ لکن یکرہ للوصل صورۃ ولو بالجر او النصب حرم رد قیل ہذا اذا عرف النحو والاوجہ ان لا یعتبر الاعراب بل یحرم مطلقا بالعطف لعدم العرف زیلعی الخ، اس روایت سے معلوم ہوا کہ جو عبارت وہ شخص پڑھتا ہے اس سے ذبیحہ حرام نہیں ہوتا، البتہ اس طرح پڑھنا خود مکروہ ہے، ۹ ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۶)

حکم قربانی جانورے کہ برحصہ دادہ بود برائے پرورش

سوال (۶۶۳) کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس امر میں کہ کوئی گائے وغیرہ پرورش کے لئے اس شرط پر اجرت دیدیجاوے کہ بعد پرورش پانے کے نصفا نصفی یا تہائی وغیرہ حصہ اجیر کا ہو باقی مالک کا ہو ایسی مویشی کو مالک اس کے حصہ کی قیمت دے کر خرید لے تو اس کی قربانی درست ہے یا نہیں؟

الجواب - درست ہے، کیونکہ اس فعل سے مالک کی ملک میں کوئی خبث نہیں آیا، البتہ پرورش کنندہ سے نہ خریدنا چاہئے۔ ۶ ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۱۷۱)۔

واجب بودن تحقیق برائے جانور قربانی بوقت خرید کہ برحصہ دادہ شدہ است یانہ وقتیکہ شبہ قوی باشد

سوال (۶۶۴) کیا بوقت خرید جانور منجملہ دیگر عیوب کی جانچ کے اس حصہ وغیرہ کی جانچ خریدار پر واجب ہوگی؟

جواب - ہاں جہاں شبہ قوی ہو، ۵ ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۷۶)

غلط بودن نسبت رجوع صاحب فتویٰ اور اضحیہ از شمول لفظ ضأن ہر دو قسم (بھیڑ و دنبہ) را

سوال (۶۶۵) بہشتی زیور مصنفہ جناب میں چھ مہینہ کی موٹی تازی کا بھیڑ قربانی میں جائز لکھی ہے، اور کتب لغت میں بھی ضأن کے معنی ذوات الصوف یا خلاف المعز لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ چنانچہ مجمع البحار، منتہی الارب، صراح ان میں معنی مذکور الصدر بیان ہوئے ہیں، علاوہ ازیں مظاہر حق مصنفہ نواب قطب الدین خاں صاحب مرحوم میں بھی بھیڑ اور دنبہ میں کچھ فرق نہیں بتایا، بلکہ دونوں کا ایک حکم تحریر ہوا ہے، لیکن شرح وقایہ کی باب الاضحیہ میں ضأن کی شرح مالہ الیۃ کی گئی ہے ادھر ایک شخص جناب کی طرف یہ منسوب کرتا ہے کہ مولانا نے ایک کتاب بہشتی در تصنیف فرمائی ہے اس میں اس مسئلہ سے رجوع کیا ہے، اور لکھا ہے کہ حکم ضأن کا دنبہ کی طرف راجع ہے، آیا یہ کتاب جناب کی تصنیف سے ہے اور ایسا جناب نے تحریر فرمایا ہے؟ دوسری عرض یہ ہے کہ لغت میں تفرد شارح وقایہ کا معتبر ہے یا نہیں، اور عرب میں بھیڑ ہوتی ہے یا نہیں، اور بھیڑ کو دنبہ کی جنس سے شمار کیا جاوے جیسا کہ مولانا عبدالحی مرحوم عمدۃ الرعایہ حاشیہ شرح وقایہ باب زکوٰۃ الاموال میں فرماتے ہیں الضأن بفتح الضاد المعجمۃ ذوات الصوف ومنہ مالہ الیۃ یا معز بکری میں شمار کیا جاوے؟

الجواب، بہشتی در نام ہی آج سنا ہے میری کسی کتاب کا یہ نام نہیں، اور نہ مجھ کو اس مسئلہ سے رجوع کرنا یاد ہے، بلکہ غالباً معاملہ بالعکس ہے کہ اول کسی سوال کے جواب میں ضأن کو دنبہ کے ساتھ خاص کیا تھا، پھر اس سے رجوع کیا، بہرحال اگر اس راوی کے پاس کوئی سند ہو دکھلاوے اس میں نظر کروں، عرب میں بھیڑ ہونا نہ ہونا تو یاد نہیں، لیکن لغت حجت کافی ہے، اور عبارت شرح وقایہ کو عمدۃ الرعایہ کی عبارت کے ساتھ ماؤل کیا جاوے، جس کا حاصل تعریف ببعض الاصناف ہے، جیسے کوئی کہے المرأۃ من لہا ثدیان ناہدان، ۲ محرم ۱۳۴۱ھ

(تتمہ خامسہ ص ۲۳۰)

حکم مس کردن مریض جانورے را بہ نیت قربانی آں کردہ باشد

سوال (۶۶۶) ایک شخص کا لڑکا بیمار تھا اس نے ایک بکری پر لڑکے کا ہاتھ پھرا کر نیت کی ہے کہ بعد صحت قربانی کروں گا، چنانچہ لڑکا اچھا ہوگیا، وہ بکری پروردہ گھر کی ہے وہ چاہتے ہیں کہ اس کے عوض میں دوسری بکری یا بکرا یا گائے و بیل قربانی کریں۔ اور وہ بکری گھر میں رہے لہذا اس بارہ میں کیا مسئلہ ہے دوسری ہوسکتی ہے یا نہیں؟

جواب ، بلکہ دوسری زیادہ بہتر ہے اور اگر اس وقت یہ خیال تھا کہ جان کے بدلہ جان صرف کرنے کی نیت کرنے سے مریض کی جان بچ جائے گی تو خواہ کوئی سا جانور ذبح کیا جاوے اس کے جواز کی تحقیق دوسرے علماء سے کرنا چاہئے، مجھ کو شبہ ہے ، ۹ر رجب ۳۹ھ (تتمہ خامسہ ص ۱۹۱)

عدم تحقیق آنکہ در قربانی کردن از طرف میت قربانی کنندہ راہم ثواب باشد یانے

سوال (۶۶۷) قربانی اپنی طرف سے کرکے ثواب میت کو پہنچانے پر قربانی کرنے والے کو ثواب ملے گا یا میت کی طرف سے حصہ رکھ کر قربانی کرنے کا بھی ثواب قربانی کنندہ کو ملے گا ، فقط

جواب ، یہ آخرت کے متعلق ہے ، یہ مسئلہ نہیں ، اس کی تحقیق کے لئے قیاس و اجتہاد کافی نہیں ، نقل و روایت ہونا چاہئے ، اور وہ نظر سے نہیں گذری فقط یکم ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ (تتمہ خامسہ ص)

حکم ذبیحہ یہود

سوال (۶۶۸) نصرانیوں کا ذبیحہ جس طرح وہ کرتے ہیں اس کو تو میں خود بھی حرام سمجھتا ہوں ، کیونکہ وہ ایک حربہ سے جانور کو مار ڈالتے ہیں جس سے کبھی خون باہر نکلتا ہے اور کبھی اندر ہی رہ جاتا ہے ، لیکن یہودیوں کا ذبیحہ میں نے خود جا کر دیکھا ہے ، وہ جانوروں کے گلے پر چھری پھیر کر خون نکال دیتے ہیں ، دریافت کرنے پر یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ ذبح کرتے وقت خدا کا نام لیتے ہیں ، اگر کوئی خاص ضروری باریکیاں مذہب اسلام میں نہیں تو ان کا ذبیحہ دیکھنے میں ہمارے ذبیحہ جیسا معلوم ہوتا ہے : آیا ان حالات میں جب کہ دوسرا ذبیحہ نہیں مل سکتا تو یہودیوں کا ذبیحہ کھانا جائز ہے یا نہیں ، ہماری طرح یہود بھی خنزیر کا گوشت نہیں کھاتے ۔

الجواب ۔ اگر یہ یہودی موسیٰ علیہ السلام کو بھی اور توریت کو آسمانی کتاب مانتے ہوں دہری نہ ہوں تو بحالت مذکورۂ سوال کہ وہ اللہ کا نام بھی لیتے ہیں گو کسی زبان میں لیتے ہوں انکا ذبیحہ حلال ہے (تتمہ خامسہ ص ۱۴۰)

حکم تحرز از طعام ذبیحہ اہل بدعت

سوال (۶۶۹) غیر مقلدین از ذبیحہ واز دعوت حنفی المذہب نفرت دارند یعنی دعوت قبول نمی کنند و ذبیحہ نمی خورند دریں صورت اگر از ذبیحہ و دعوت ادشان مایان متنفر شویم چہ حرج ؟

الجواب ، چوایں تنفر غیر مقلدین ادمباح و حلال خلاف مشروع ہست و زجر بر غیر مشروع ہست لہذا اگر زجراً نہ کہ اعتقاداً از ایشان تنفر کردہ شود مضائقہ نیست ،

۱۸ ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۳۵)

عدم جواز ذبح حیوان بطریق جدید کہ بذریعہ آلہ می شود

سوال (۶۷۰) سوال از انگلستان از اخبار مدینہ بجنور یکم فروری ۱۵۱ء خیال یہ پیدا ہو رہا ہے کہ جانور کو ذبح کے وقت بہت ہی کم تکلیف پہونچے اور ذبح کا کوئی ایسا طریق اختیار کیا جائے جس میں یہ امر حاصل ہو جائے اس غرض کے لئے ایک رائل سوسائٹی بنائی گئی ہے، اور ذبح ہونے والے جانوروں کو تکلیف سے بچانے کے لئے ایک آلہ ایجاد کیا گیا ہے جس سے جانور کو بے ہوش کر دیا جائے، اور بے حسی کی حالت میں اس کو ذبح کیا جائے۔ اگر کوئی مسلمان اس حالت کے بعد جانور کو اپنے طریق پر ذبیحہ کرے تو کیا ایسا جانور ذبح سمجھا جائے گا، جانور کے بے حس کئے جانے سے جانور مرتہیں جاتا اس کی نبض برابر قائم رہتی ہے، اگر مر جائے تو دل کی حرکت بند ہو جانے سے نبض بند ہو جائے گی، اور خون کا حصہ جسم میں رہ جائے گا، لیکن ایسا نہیں ہوتا لہٰذا اسی حالت بیہوشی میں ذبح کرنے والا شاہ رگ کو کاٹ کر خون خارج کر سکتا ہے، ایسے جانور بھی ذبح ہوئے ہیں جو بذریعہ آلہ کئی منٹ تک بیہوش پڑے رہنے کے بعد ذبح کئے گئے، اور کافی خون نکلا، بہر حال استفتاء کی صورت یہ ہے آیا اگر کوئی جانور ذبح کرنے سے پہلے بے ہوش کر لیا جائے یعنی اس کو درد کا احساس نہ رہے اور اس کے بعد ذبح کیا جائے۔ ایسی صورت میں کہ اس کے دل کی حرکت بھی قائم رہے اور نبض بھی اس کی چلتی رہے، اور ذبح بھی اسلامی طریق پر کیا جائے تو کیا ایسا جانور ذبیحہ سمجھا جائے گا، ممکن ہے کہ عنقریب یہاں (یعنی انگلستان) کا یہ قانون ہو جائے کہ کوئی جانور ذبح نہ ہو جب تک اس کو آلہ مذکور سے بے ہوش نہ کیا جائے۔ اس امر کی ابھی پوری اطلاع نہیں کہ وہ آلہ کس قسم کا ہے، اور اس کو کس طرح استعمال کیا جاتا ہے، آیا اس سے جانور کے کسی حصہ پر ضرب لگائی جاتی ہے یا کسی منشی چیز سے اُسے بے ہوش کیا جاتا ہے۔

الجواب یہاں دو مقام پر کلام ہے، ایک یہ کہ ایسی حالت میں ذبح کرنے سے جانور حلال ہوگا یا نہیں، سو چونکہ یہ فعل کسی شرط حلت کے منافی نہیں اور حیات پورے طور پر باقی ہے اس لئے جواب یہ ہے کہ جانور حلال ہو جاوے گا۔ فی الدر المختار ذبح شاۃ مریضۃ فتحرکت او خرج الدم حلت والا لا ان لم تدر حیاتہ عند الذبح وان علم حیاتہ حلت مطلقاً وان لم تتحرک ولم یخرج الدم وھذا یتأتی فی منخنقۃ ومتردیۃ ونطیحۃ والتی بقر الذئب بطنھا فذکاۃ ھذہ الاشیاء تحلل وان کانت حیاتھا خفیفۃ وعلیہ الفتوی لقولہ تعالیٰ الا ما ذکیتم من غیر فصل فی رد المحتار قولہ فتحرکت ای بغیر

نحو مد رجل وفتح عین مما لایدل علی الحیوٰۃ قولہ او خرج الدم ای کما یخرج من الحی الی قولہ عند الامام وھو ظاھر الروایۃ قولہ وعلیہ الفتویٰ خلافا لھما۔ ص ۳۰۱ ج ۵

دوسرا کلام یہ ہے کہ خود یہ فعل جائز ہے یا نہیں، سو اس میں تفصیل یہ ہے کہ یہ دیکھنا چاہئے کہ اس آلہ سے آیا اس جانور کے کسی حصہ پر ضرب لگائی جاتی ہے یا کسی نشہ آور چیز سے اس کو بیہوش کیا جاتا ہے جیسا کہ سائل نے اس میں تردد ظاہر کیا ہے اور غالب طریق ثانی ہے، سو اگر ایسا ہی ہے تو یہ فعل حرام ہے۔ اما الطریق الاول فلما فی رد المختار مکروھات الذبح والنخع بلوغ السکین النخاع وھو عرق ابیض فی جوف عظم الرقبۃ وکرہ کل تعذیب بلا فائدۃ مثل قطع الراس والسلخ قبل ان تبرد ای تسکن من اضطراب فی رد المحتار وقیل النخع ان یمد راسہ حتی یظھر مذبحہ وقیل ان یکسر عنقہ قبل ان یسکن عن الاضطراب فان الکل مکروہ لما فیہ من تعذیب حیوان بلا فائدۃ ھدایہ ج ۵ ص ۲۸۸ و ۲۸۹ واما الطریق الثانی فلما فی الدر المختار وحرم الانتفاع بھا ولو لسقی دواب ج ۵ ص ۴۴۴ اور اگر یہ دونوں طریقے نہیں بلکہ کسی مباح طریق سے اس جانور کے حاسہ کو معطل کر دیا جاتا ہے، تو وہ بھی دو وجہ سے ناجائز ہے اول اس وجہ سے کہ قبل بے ہوش ہونے کے اس کے حواس سالم تھے، اور بعد بے ہوش ہونے کے حواس کا بطلان یقینی نہیں، بلکہ ممکن ہے کہ اس آلہ سے حرکت باطل ہو جاتی ہو مگر حواس باقی ہوں اور بطلان حرکت بطلان حس کو مستلزم نہیں، ممکن ہے کہ اس آلہ کا اثر صرف جوارح معطل کر دینے میں ایسا ہو جیسے کسی شخص کے ہاتھ زور سے پکڑ کر اس کا گلا گھونٹ دیا جاوے تو اس کو حرکت نہ ہوگی مگر احساس ہوگا، پس پہلے سے ذی حس ہونا یقینی، اور اب زوالِ حس میں شک ہو گیا، اور عقلی و شرعی قاعدہ ہے کہ الیقین لا یزول بالشک، پس بقاء حس کی صورت میں یہ آلہ زیادتِ تعذیب کا سبب ہوگا، اس لئے ناجائز ہے، اور خود حیوان متکلم نہیں جو اپنا حال بیان کر سکے اور انسان پر امتحان کر لینے سے دھوکا نہ کھایا جاوے۔ کیونکہ انسان اور بہائم کے بہت سے خواص باہم متفاوت ہوتے ہیں، دوسرے اس وجہ سے کہ ایسا کرنے والا اس طریق کو طریق مشروع سے جس میں بے ہوش نہیں کیا جاتا یقیناً زیادہ مستحسن سمجھ کر طریق مشروع کو ناقص و مرجوح سمجھے گا، اور مخترع کو منصوص پر ترجیح دینا قریب بکفر ہے ان دو وجہ سے خود یہ طریق بدعت سیئہ و تحریف فی الدین ہونے کے سبب خلاف شرع ہے، پس ایسا قانون بنانا خلاف مذہب اسلام ہے، واضعان و حاکمان قوانین کو اطلاع دے کر درخواست کی جاوے کہ اہل اسلام کے لئے ایسا قانون مقرر نہ کریں جیسا کہ معاہدہ ہے، ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ (حوادث خامس ص)

ذبح سے پہلے جانور کو بے ہوش کرنے کا حکم

سوال (۶۷۱) جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں ان جانوروں کو ذبح کی تکلیف نہ ہونے کی خاطر ایک باریک سوئی کی طرح تیز باریک چیز کو پیشانی کے سامنے کی رگ پر چبھو دیا جاتا ہے، چبھونے کے ساتھ ہی وہ جانور مست و مدہوش ہوتا ہے، پھر اس کو ذبح کریں تو جانور کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی اور تھوڑی دیر میں خون سارے بدن کا نکل جاتا ہے، آیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہ بینوا توجروا!

الجواب، دو امر قابل تنقیح ہیں، ایک یہ کہ اس سوئی چبھونے سے جانور کو کتنی اذیت ہوتی ہے دوسرے یہ کہ اس سوئی چبھونے سے جانور کے گوشت میں تو کسی قسم کا اثر نہیں پہنچتا۔

جواب تنقیح، جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں ان جانوروں کو ذبح کی تکلیف محسوس نہ ہونے کی خاطر ایک باریک سوئی کی طرح کی تیز باریک چیز کو پیشانی کے سامنے کی رگ پر چبھو دیا جاتا ہے، اس چبھونے سے جانور کے گوشت میں کسی قسم کا اثر ہونچتا ہی نہیں ہے، اس چبھونے سے جانور کو اذیت نہیں ہوتی، صرف وہ مست و مدہوش ہو جاتا ہے، سانس چلتی رہتی ہے، اور تھوڑی دیر میں سارے بدن کا خون نکل جاتا ہے، آیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہ، بینوا توجروا

تنقیح، کیا ان روایات کا ماخذ کسی ماہر کا قول ہے،

جواب تنقیح، خاکسار نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کا تجربہ ماہر ڈاکٹروں نے کیا ہے اور ان کا مشاہدہ ہے اور اس کو ہمارے معتبر احباب نے بچشم خود دیکھا ہے،

الجواب، اگر یہ دونوں دعوے تجربہ سے صحیح بھی مان لئے جائیں تب بھی اس میں کچھ کلام باقی رہ جاتا ہے، بعض تو میرے قدیم فتوے میں مذکور ہے جس کا بالکل اخیر حصہ یعنی اعتقاد ترجیح غیر منقول علی المنقول کا قبح خاص طور پر قابل نظر ہے، (یہ فتویٰ مرقومہ ۷ ربیع الثانی ۱۳۳۳ھ حوادث اول ثانی حصہ پنجم صفحہ ۵ پر مذکور ہے[ع]) اور بعض اس موقع پر ذکر کرتا ہوں، وہ یہ کہ شریعت نے جو ذبح کو حلال ہونے کی شرط ٹھہرائی ہے اس کی علت جیسا کہ نصوص سے واضح ہے یہ ہے کہ خون سائل ذبیحہ کے بدن سے خارج ہو جاوے اور قواعد سائنس سے اس کا قوی احتمال ہے، کہ جانور کی طبیعت اس کے ہوش کی حالت میں قوی ہوتی ہے، اور بے ہوشی جس درجہ کی ہوگی، اسی قدر طبیعت اس کی ضعیف ہوگی؛ اور خون کا خارج کرنا یہ فعل طبیعت کا ہے پس جس قدر طبیعت میں قوت ہوگی خون زیادہ خارج ہوگا، اور جس قدر طبیعت میں ضعف ہوگا خون کم خارج ہوگا، پس قصداً طبیعت کو ضعیف کرنا قصداً خون کو کم نکلنے دینے کا اہتمام کرنا ہے جو صریح مزاحمت ہے مقصود شارع کی یہ تو شرعی

ع۔ یہ فتویٰ سابق گزرا ہے ۱۲

محذور ہے، اور خون بدن میں کافی موجود ہونے کے بعد جب کم نکلے گا تو وہ گوشت ہی میں متشرب ہوگا جب خنق وغیرہ سے پورا خون متشرب ہونا ان کے خواص مطلوبہ طب نبوی کا مفوت ہے، تو کچھ متشرب ہونا ان خواص کا منقص ہے یہ طبی محذور ہوگا۔ اور اگر کسی صورت میں تقلیل خروج دم بلا تدبیر اختیاری ہو اس میں مکلف معذور ہے اس سے حرمت یا کراہت کا حکم نہ کیا جاوے گا، ان مجموعہ وجوہ مذکورہ فتوی سابقہ و فتوی ہذا کا مقتضیٰ یہ ثابت ہوا کہ یہ فعل جائز نہیں، واللہ اعلم،

۱۵ جمادی الثانی ۱۳۵۱ھ (النور ۹ محرم ۱۹۵۲ھ)

حکم ذبیحۂ شیعہ | **سوال** (۶۷۲) ذبیحہ رافضی کے ہاتھ کا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، شیعہ کے ذبیحہ کی حلت میں علماء اہل سنت کا اختلاف ہے، راجح اور صحیح یہ ہے کہ حلال ہے۔ قال الشامی وکیف ینبغی القول بعدم حل ذبیحتہ مع قولنا بحل ذبیحۃ الیہود والنصاریٰ، ج ۵ ص ۱۸۹ واللہ اعلم، ۲۵ ربیع الاول ۱۳۴۰ھ (امداد، ج ۲ ص ۱۲۷)

حلت ذبیحہ بجملہ ان اللہ ہو العلی الکبیر کہ اہل قرآن اختراع کردہ اند | **سوال** (۶۷۳) بعد سلام مسنون التماس ہے کہ اہل قرآن ذبیحہ پر بجائے بسم اللہ اللہ اکبر کے آیۃ ان اللہ ہو العلی الکبیر پڑھتے ہیں اس تکبیر سے ذبیحہ حلال ہو جاتا ہے یا کچھ شک وشبہ رہ جاتا ہے، اور اس تکبیر قدیمی بسم اللہ واللہ اکبر سے ذبح ہونے کو حلال نہیں جانتے، حرام جانتے ہیں اور لفظ اللہ اکبر کو شرک کہتے ہیں، اگر ان اللہ ہو العلی الکبیر سے اول بسم اللہ بھی کہہ کر ذبح کریں تب ذبیحہ کیسا ہے؟ فقط بینوا توجروا۔

الجواب، صرف ان اللہ ہو العلی الکبیر سے بھی اور اس کے قبل بسم اللہ کہنے سے بھی ذبیحہ حلال ہو جاتا ہے، اگرچہ اللہ اکبر کو شرک سمجھنا جہل عظیم ہے۔ فی الدر المختار والشرط فی التسمیۃ ہو الذکر الخالص عن شوب الدعاء وغیرہ فلا یحل بقولہ اللھم اغفر لی لانہ دعاء وسوال بخلاف الحمد للہ او سبحان اللہ مرید ابہ التسمیۃ فانہ یحل اھ فی رد المحتار بای اسم کان مقرونا بصفۃ کاللہ اکبر او اجل او اعظم او لا کاللہ او الرحمن وبالتہلیل والتسبیح الخ ج ۵ ص ۲۹۳ ۴ شعبان ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۵۶)

اضحیۂ نفل غیر کی جانب سے جائز ہے | **سوال** (۶۷۴) حضرت والا اسلامت السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اللہ تعالیٰ حضور کی ذات بابرکات کو ہم عاجزوں کے سروں پر دائم وقائم رکھے، احقر نے گذشتہ عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی کی گلئے میں ایک حصہ حضرت کی طرف سے لیا تھا، اس وقت اس کی اطلاع حضور کو نہیں کی تھی، اس کی بابت اس وقت مسئلہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اطلاع کرنی

چاہیے تھی یا نہیں؛ اب بہشتی زیور سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص یہاں موجود نہیں اور دوسرے شخص نے اس کی طرف سے بغیر اس کے امر کے قربانی کر دی تو یہ قربانی صحیح نہیں ہوئی۔ اور اگر کسی غائب کا حصہ کسی جانور میں بدون اس کے امر کے تجویز کر لیا تو اور حصہ داروں کی قربانی بھی صحیح نہ ہوگی۔ ص ۲۰۲ جلد ۶ عالمگیری بہشتی زیور حصہ ۳؛

اس عبارت سے احقر نے یہ سمجھا ہے کہ حضور کی طرف سے جو حصہ لیا تھا احقر کو چاہیے تھا کہ اس کی اطلاع حضور کو دیتا، مگر ناواقفی کی وجہ سے اطلاع نہیں دی، تو وہ قربانی صحیح نہ ہوئی؛ اور جتنے لوگ اس گائے میں شریک تھے، اُن میں سے کسی کی بھی قربانی درست نہیں ہوئی، دفع خلجان کے لئے حضور اس بات سے آگاہی بخشیں کہ احقر نے عبارت سے جو کچھ سمجھا ہے وہ صحیح ہے یا غلط صحیح ہے تو اس وقت حضور کو اطلاع دینے سے قربانی درست ہو سکتی ہے یا نہیں، اگر درست ہو سکتی ہے تو احقر حضرت سے اطلاعاً عرض کرتا ہے۔

الجواب۔ بہشتی زیور میں جو مسئلہ مذکور ہے وہ اضحیہ واجبہ کے متعلق ہے، اضحیہ تطوع کے متعلق نہیں، اور اس کی دلیل عالمگیری کا یہ جزیہ ہے۔ لو ضحی ببدنۃ عن نفسہ وعرسہ واولادہ لیس ھذا فی ظاھر الروایۃ وقال الحسن بن زیاد فی کتاب الاضحیۃ ان کان اولادہ صغارا جاز عنہ وعنھم جمیعاً فی قول ابی حنیفۃ وابی یوسف وان کانوا کبارا ان فعل بامرھم جاز عن الکل فی قول ابی حنیفۃ وابی یوسف وان فعل بغیر امرھم او بغیر امر بعضھم لا تجوز عنہ ولا عنھم فی قولھم جمیعاً لان نصیب من لم یامر صار لحما فصار الکل لحما وقال ابو القاسم (الصفار) تجوز عن نفسہ کذا فی فتاوی قاضیخان (ص ۲۰۲، ج ۶)

قلت وقول ابو القاسم ھو الراجح عندنا وفی رد المحتار ولو ضحی عن اولادہ الکبار وزوجتہ لا یجوز الا باذنھم وعن الثانی انہ یجوز استحسانا بلا اذنھم بزازیۃ قال فی الذخیرۃ ولعلہ ذھب الی ان العادۃ اذا جرت من الاب فی کل سنۃ صار کالاذن منھم فان کان علی ھذا الوجہ استحسن ابو یوسف فھو مستحسن اھ (ص ۲۰۸ ج ۵) قلت واما التضحیۃ عن الغیر تطوعا فتجوز بالاذن وبدونہ لما صرحوا بہ من انہ لو تبرع بھا عن المیت لہ الاکل منھا لانہ لم یقع علی ملک الذابح والثواب للمیت ولھذا لو کان علی الذابح واحدۃ سقطت عنہ اضحیتہ کما فی الاجناس قال ابن عابدین وقد صرح فی فتح القدیر فی الحج عن الغیر بلا امرہ انہ یقع عن الفاعل فیسقط بہ الفرض عنہ وللآخر ثواب فراجعہ اھ (ص ۲۲۹ ج ۵)

خلاصہ یہ ہے کہ اضحیہ واجبہ میں چونکہ دوسرے کے ذمہ سے ادائے واجب کا قصد ہوتا ہے وہ تو بدون اس کی اجازت کے درست نہیں، البتہ اپنے متعلقین کی طرف سے بدون اس کی اجازت کے بھی درست ہے، جبکہ ان کی طرف سے قربانی کرنے کی عادت ہو اور اگر قربانی کرنے کی عادت نہ ہو تو ان کی طرف سے بھی قربانی صحیح نہ ہوگی، رہا یہ کہ ذابح کی طرف سے ہو جائے گی یا نہیں تو حسن بن زیاد رحمہ اللہ تعالیٰ کی روایت یہ ہے کہ ذابح کی طرف سے بھی صحیح نہ ہوگی، اور ابو القاسم صفار کا قول یہ ہے کہ ذابح کی طرف سے صحیح ہو جائے گی، ہمارے نزدیک یہی راجح ہے، کیونکہ حج عن الغیر میں تصریح ہے کہ غیر کی طرف سے بلا امر کے حج کیا جائے تو وہ اس شخص کی طرف سے یعنی حج کرنے والے کی طرف سے ہو جائے گا، اور غیر کو ثواب ملے گا، اور اگر دوسرے کی طرف سے تبرعاً تطوعاً بلا اذن کے قربانی کی جائے تو وہ مطلقاً درست ہے خواہ اس کی طرف سے قربانی کی عادت ہو یا نہ ہو اور اس کو عادت کی اطلاع ہو یا نہ ہو، کیوں کہ تبرعاً عن الغیر میں قربانی ذابح کی ملک پر ہوتی ہے دوسرے کو محض ثواب پہونچتا ہے، قربانی اس کی ملک پر نہیں ہوتی، والحی والمیت فی ذلک سواء واللہ تعالیٰ اعلم۔ کتبہ ظفر احمد عفا عنہ بامر سیدہ حکیم الامۃ دام مجدہم۔

۱۰ر جمادی الاول ۱۳۵۵ھ (النور ص ربیع ۲ ۱۳۵۵ھ)

جرم قربانی کا مدرسہ میں آیا ہوا روپیہ چوری ہو جانا

سوال (۵۷۶) زید مدرس کے پاس پوست قربانی کے روپے واسطے صرف طلبہ آئے، زید نے اس کو اپنی حویلی میں ایک بکس غیر مقفل میں رکھا اور اپنا روپیہ زید کا علیحدہ اسی بکس میں تھا، قفل کی ضرورت بکس میں خیال نہ کی گئی کہ کوئی غیر شخص حویلی میں نہ آتا تھا، فقط زید کی زوجہ وابن واخ وابن الاخت رہتے تھے، ابن الاخ مبلغ نو روپے منجملہ چالیس روپے قیمت پوست قربانی کے جو کہ بکس میں علیحدہ زید کے ذاتی روپے سے رکھے ہوئے تھے، لیکر وطن کو فرار ہو گیا، اور یہ ابن الاخ بھی منجملہ طلبہ میں سے ایک طالب علم تھا، اور نام اس کا مدرسہ کے رجسٹر میں درج تھا، اور مدرسہ میں پڑھتا تھا، اور خوراک مدرسہ کی جانب سے اس کی مقرر تھی۔ اور اس نے پہلے اس سے ایسا کام نہ کیا تھا، تاکہ اس کا احتیاط کی جاتی، اس صورت میں مدعیہ پر پورا کرنا اس امانت کا واجب ہے یا نہیں؟

الجواب، فی الدر المختار وللمودع حفظہا بنفسہ وعیالہ وھم من یسکن معہ حقیقۃ او حکما۔ بنا بر روایت مذکورہ زید پر اس روپیہ کا ضمان نہیں، البتہ اس لینے والے پر ضمان واجب ہے، اور زید کے ذمہ واجب ہے کہ بقدر اپنی قدرت کے اس سے ضمان

لینے میں کوشش کرے فقط؛ اور ایک امر زید کے ذمہ پر ضروری ہے کہ جن جن لوگوں کی رقم ضائع ہوئی ہے ان کو اطلاع کردے۔ کیونکہ ان کے ذمہ یہ رقم واجب التصدق رہ گئی ہے؛ وہ لوگ مساکین کو ادا کریں، جبکہ چور سے وصول نہ ہو، فقط واللہ اعلم، ۲۳ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ (تتمہ اولیٰ ص ۱۲۶)

رفع بعض شبہات متعلقہ بعمر ضحایا

سوال (۶۷۶): قربانی کے جانور کو علی العموم سب لوگ لکھتے چلے آئے ہیں؛ کہ بکری ایک سالہ اور گائے دو سالہ اور اونٹ پانچ سالہ ہونا چاہئے؛ اس سے کم عمر والی کی قربانی جائز نہیں، چنانچہ حضور والا نے بہشتی زیور حصہ سوم میں یہی ارقام فرمایا ہے اور ہدایہ ص ۴۳۳ جلد چہارم میں ہے، ویجزئ من ذلک کلہ الثنی فصاعدا الا الضأن فان الجذع منہ یجزی سے معلوم ہوتا ہے کہ ثنایا ہونا چاہئے۔ لقولہ علیہ السلام ضحوا بالثنایا الا ان یعسر علی احدکم فلیذبح الجذع من الضأن وقال علیہ السلام نعمت الاضحیۃ الجذع من الضأن سے معلوم ہوا کہ تنگی کے وقت جذع من الضان جائز ہے، اور جذع کی تفسیر علی الاختلاف چھ یا سات مہینہ ہے اس پر بھی جب ثنایا میں ملا دیا جائے اور ناظرین کو شبہ ہو جائے تو جائز ہے، اور حدیث دوسری نعمت الاضحیۃ الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جذع ہی بہت اچھا ہے اور الثنی کی تفسیر ہدایہ میں کی ہے والثنی منہا ومن المعز ابن سنۃ ومن البقر ابن سنتین ومن الابل ابن خمس سنین اس سے معلوم ہوا کہ ایک سالہ اور دو سالہ اور پنج سالہ ہونا چاہئے جیسا کہ اوپر لکھ چکے ہیں کہ ہر شخص یہی لکھتے ہیں، اور مشکوٰۃ میں حدیث ہے وعن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تذبحوا الا مسنۃ الا ان یعسر علیکم الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسنہ ہونا چاہئے، اور شرح وقایہ جلد اول ص ۲۱۲ مطبع یوسفی لکھنؤ میں ہے، والمسن الذی تم علیہ الحولان والمسنۃ انثاہ اور حاشیہ عمدۃ الرعایہ میں مسن کے معنی دانت نکلے ہوئے کے لکھا ہے، قولہ المسن بضم المیم وکسر السین المہملۃ وتشدید النون ماخوذ من الاسنان وھو طلوع السن۔ ان سب عبارتوں سے معلوم ہوا کہ دانت نکلنا ضروری ہے اور ثنایا کہ معنی غیاث اللغات میں ہے کہ چار دانت نکلے ہوں، دو اوپر کے دو نیچے کے تو باعتبار لغت کے بھی معلوم ہوا کہ دانت نکلنا ضروری ہے، اور ایک حدیث بخاری میں ہے چونکہ بخاری موجود نہیں، اس لئے صرف اشارہ کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ غالباً ابی بردہ کو آپ نے فرمایا تھا کہ مسنہ کرلو دوسرے شخص کے لئے نہیں اس سے بھی معلوم ہوا کہ مجبوراً آپ نے ابو بردہ کو مسنہ کرنے کی اجازت دی ہے، اس کے ساتھ ہی دوسرے

کے لئے منع فرما دیا۔ اور مشکوٰۃ والی حدیث میں جو مسنہ آیا ہے وہ عام ہے کہ مسنہ ہونا چاہئے، اگر مسنہ کے معنی برس کے لئے جاویں تو اونٹ گائے بھی ایک ہی برس کی کافی ہے اور اگر مسنہ کے معنی دانت کے لئے جاویں تو اونٹ گلئے بکری کے اپنی پوری عمر پر دانت نکلیں گے، تو اس بنا پر ایک سالہ دو سالہ پنج سالہ کی قید نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ بہت سے خصیوں کے ایک سال بعد پر مثلاً چودہ پندرہ ماہ پر دانت نکلتے ہیں، اور یہی حال گائے میں بھی ہے، غرض کہ ایک ہی برس پر دانت نکلنا کوئی ضروری نہیں ہے۔ اگر دوسری حدیث سے صاف طور پر ظاہر ہو کہ بکری ایک سالہ ہونا کافی ہے تو وہ حدیث ارقام فرمائیے، ہدایہ میں نقل نہیں ہے؛ خلاصہ یہ کہ مجھ کو صرف دریافت طلب یہ ہے کہ قربانی میں دانت نکلنے کی شرط ہے یا صرف بکری کو ایک سالہ ہونا کافی ہے، اگر شق ثانی ہے تو حدیث مسنۃ اور ثنایا اور لغت کے اعتبار سے غلط ہوتا ہے، اور بخاری والی حدیث کا کیا جواب ہے، اور مولانا عبدالحی صاحب مرحوم کے حاشیہ عمدۃ الرعایہ کا کیا جواب ہے، اور ہدایہ کی عبارت سے کیا ثابت ہوتا ہے، اور اگر شق اول لی جاوے تو اس وقت تمام لوگ یہی عقیدہ رکھتے ہیں، کہ بکری ایک سالہ ہونا چاہئے۔ چنانچہ امسال بھی بہت سے لوگ قربانی کے لئے خصی ایک سالہ جس کا دانت نہیں نکلا ہے رکھے ہوئے ہیں لیکن درمیان میں ایک ملّا نے دانت کی قید لگا کر شبہ میں ڈال دیا۔ اور سب لوگوں کو قربانی کرنے سے رہ گئے ہیں اس بنا پر ان سب عبارات پر شبہ ہوا، اس لئے جواب ضروری طلب ہے، جس کا خلاصہ مع مخالف کا جواب کافی وشافی تحریر فرمائیے۔

الجواب، حاصل سوال کا باوجود بے ربطی عبارت کے یہ امور ہیں، اوّل یہ کہ بعض دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ بجز ضان کے کہ اس میں جزع بھی کافی ہے اور انعام ضحیہ میں مسنہ ہونا چاہئے اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ ثنیہ ہونا چاہئے اور یہ تعارض ہے ثانی یہ کہ مسنہ کی تفسیر میں بعض دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ دانت نکلنا ضروری ہے، بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر خاص کافی ہے، اور یہ تعارض ہے، ثالث یہ کہ بعض دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ جذع ضان کا علی الاطلاق جائز ہے، بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مسنہ میسر نہ ہو اس وقت جذع جائز ہے، اور یہ تعارض ہے، رابع یہ کہ بعض دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ مسنہ کا جواز صرف ابو بردہ کے ساتھ خاص تھا، بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کے لئے عام ہے اور یہ تعارض ہے، پس ان چار تعارضات کا شبہ ظاہراً خلاصہ ہے سوال کا اب جواب لکھا جاتا ہے۔

شبہ اول کا جواب یہ ہے کہ شیخ نے حاشیہ مشکوٰۃ میں لکھا ہے ویجوز من جمیع ہذہ الاقسام الثنی وہو المراد من المسنۃ جب دونوں کے ایک ہی معنی ہیں تو یہ تعارض نہ رہا، شبہ ثانی کا جواب یہ ہے کہ تغییر معتبر و مدار حکم عمر خاص ہی کے ساتھ ہے، مگر چونکہ اس عمر خاص میں اکثر دانت بھی طلوع ہو جاتے ہیں اس لئے اہل لغت طلوع سن سے تعبیر کر دیتے ہیں ورنہ دانت نکلنے پر مدار حکم نہیں ہے، شیخ موصوف ہی نے بعد دعویٰ اتحاد مسنہ و ثنیہ کے لکھا ہے، وہو من الابل ما استکمل خمس سنین ودخل فی السادسۃ ومن البقر ما استکمل سنتین ومن الغنم ضانا کان او معزا ما استکمل سنۃ ہکذا فی الہدایہ، چنانچہ بعض اوقات خود اہل لغت بھی عمر ہی کے ساتھ تعبیر کر دیتے ہیں، چنانچہ تلخیص النہایہ میں ہے کہ والمسن من البقر ما دخل فی السنۃ الثالثۃ اھ ج ۲ ص ۲۰۰، اور اس سے یہ توہم نہ کیا جاوے کہ سن بمعنی عمر لیا گیا ہے، سن تو معنی دندان ہے لیکن طلوع دندان چونکہ عادۃً اس عمر میں ہوتا ہے اس لئے عمر کے ساتھ تعبیر کر دی خواہ دانت طلوع ہو یا نہ ہو، اور جب کہ فقہا تصریح کرتے ہیں کہ اکثر دانتوں کا ہونا یا اتنے دانتوں کا ہونا جس سے گھاس کھا سکے جواز تضحیہ کے لئے کافی ہے، تو کسی خاص دانت کے نکلنے پر کیسے مدار ہوگا، فی الدر المختار ولا بالہتماء التی لا اسنان لہا ویکفی بقاء الاکثر وقیل ما تعتلف اھ

شبہ ثالث کا جواب یہ ہے کہ جمع بین الاحادیث کی ضرورت ہے کہ ایک حدیث میں بلا شرط ہے نعمت الاضحیۃ الجذع من الضأن رواہ الترمذی عن ابی ہریرۃ مرفوعاً اور دوسری حدیث میں ہے لا تذبحوا الا مسنۃ الا ان یعسر علیکم فتذبحوا جذعۃ من الضأن رواہ مسلم عن جابر مرفوعاً استثناء جو حدیث ثانی میں ہے واقع ہے بیان افضل پر یعنی افضل مسنہ ہی ہے ہر جانور میں، لیکن اگر افضل نہ مل سکے تو جذع ضأن اس کے قائم مقام ہو جاوے گا، اور حدیث اول میں تو نعمت آیا ہے، وہ بیان نفس فضیلت کے لئے ہے یعنی نفس فضیلت سے وہ بھی کسی حال میں خالی نہیں، چنانچہ ایک حدیث میں نص بھی ہے عن مجاشع من بنی سلیم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یقول ان الجذع یوفی مما یوفی منہ الثنی رواہ ابوداؤد و النسائی وابن ماجہ کذا فی المشکوٰۃ ہشبہ رابع کا جواب یہ ہے کہ ابو بردہ کی حدیث میں مسنہ نہیں ہے جذع ہے معز کا، اس وقت بخاری تو پاس نہیں مگر لمعات شیخ سے نقل کرتا ہوں کما جاء فی حدیث بردۃ فی جذع المعز اذبحہا ولن تجزئ عن احد بعدک۔

ان تعارضات اربعہ کا تو جواب ہو گیا، اس کے بعد سائل کے ایک جملہ کا کہ وہ بھی ایک شبہ پر مشتمل ہے، کہ وہ شبہ خامسہ ہے جواب لکھا جاتا ہے۔ قولہ اگر کوئی دوسری حدیث سے صاف طور سے ظاہر ہو کہ بکری ایک سالہ الخ اقول جہاں معانی شرعیہ معانی لغویہ کے علاوہ ہوں وہاں تو نص شارع

کی ضرورت ہے، اور جہاں معانی لغویہ کے متعلق حکم ہو وہاں اس کی ضرورت نہیں ورنہ یہ سوال بھی متوجہ ہوگا کہ آیت تحریم نکاح نساء میں جو امہات و بنات و اخوات وغیرہا الفاظ آئے ہیں ان کے معنی قرآن و حدیث میں ہونا چاہئے جب حدیث میں لاتذبحوا الا مسنة مصرح ہے اور مسنة ثنیہ ایک چیز ہے، اور نیز حسب نقل ہدایہ خود ثنایا ہونا شرط ہے اور ثنیہ کی تفسیر ہر بہیمہ میں جدا جدا ثابت ہے تو مسنة کا اسی طرح ثنیہ کا حدیث میں مذکور ہونا بعینہ بکری میں ایک سالہ شرط ہونے کا مذکور ہونا ہے، اب تائید تفسیر فقہاء کے لئے بعض کتب لغت سے ثنیہ معز کی تفسیر نقل کی جاتی ہے، مجمع البحار میں ہے عند احمد من المعز فی الثانیة نہایہ میں ہے، وعلی مذہب احمد بن حنبل ما دخل فی السنة الثانیة، یہ جواز عن السوال نقل کیا گیا، اب تبرعاً جذع غنم شامل للمعز والضأن کی تفسیر موافق قول فقہاء کے نیز کتب لغت سے نقل کئے دیتا ہوں، کہ اس میں بھی عدم نقل لغوی کا شبہ بعض کو ہو جاتا ہے، مجمع البحار میں ہے ومن الضأن ما تمت لہ سنة وقیل اقل منہا آہ وہذہ التفاسیر اللغویة کلہا من کشاف اصطلاحات الفنون الا مختار الصحاح میں تفسیر جذع شاة میں ہے وقیل ولد النعجة انہ یجذع فی ستة اشہر اھ، اس سے معلوم ہوا کہ بعض اہل لغت نے یہ بھی تفسیریں کی ہیں اور حنفیہ نے ان تفاسیر کو اس لئے اختیار کیا کہ جس جس پر ثنی و جذع کا اطلاق ہوتا ہے اطلاق حدیث سے سب کو حکم شامل ہو جاوے، ولم یذہب احد الی اقل مما قال بہ الفقہاء الا ما فی الخزانة فی تفسیر الثنی من الابل بما اتی علیہ اربع سنین ولعلہ لم یثبت عندہم،

۹ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۹۶)

تنقید بر رسالہ جیون رکھشا

سوال (۶۷۰) رہنمائے گمراہان، ہادی دین متین حضرت مولانا السلام علیکم آج جناب کو تکلیف دہی کا ایک موقع ہے جس کے بغیر چارہ کار نہ تھا، کیونکہ بغیر جناب کے عقدہ کشائی کے یہ معاملہ طے نہیں ہوتا تھا، براہ کرم میرا استغاثہ سن کر فیصلہ کیجئے، وہو ہذا۔

جناب والا! نیازمند نے عرصہ ہوا کہ ایک کتاب موسوم بہ جیون رکھشا لکھی تھی، جس کی ایک کاپی ہمرشتہ ہذا ابلاغ ہے۔ اس کے نسبت میرے متعلق مخالف از راہ کوتاہ اندیشی مجھ پر یہ الزام عائد کرنے کی سعی کر رہے ہیں کہ میں نے یہ کتاب اہل ہنود کی حمایت اور اسلام کی اہانت میں لکھی ہے، اگرچہ جناب کا گرامی وقت اس کے مطالعہ میں ضائع ہوگا، مگر ایک مسلمان کے لئے انصاف کرنے میں سوائے اس کے کوئی صورت نہیں ہے، لہذا التماس ہے کہ اگر جناب والا تمام وکمال کتاب کو مطالعہ نہ فرمائیں تو صرف اس قدر حصہ جس کو میں نے سیاہ خط سے محدود کر رکھا ہے، ملاحظہ کریں کہ فرقہ ہنود کے مذہبی عقائد اور رسم و رواج کا کس طرح نمونہ دکھلایا ہے، اور خاص کر مسئلہ آواگون اور گئوماتا سے ہمدردی کی اصلی

حالت کیا ہے، تمام اوراق کے ملاحظہ سے جناب پر واضح ہوگا کہ مصنف کا اصل مقصد کیا ہے، اور وہ اسلام کی حمایت میں ہے یا اہانت میں، براہ کرم قدیمانہ اپنی رائے کے چند الفاظ بطور تنقید تحریر فرما کر مشکور کیجیے۔

جواب۔ مکرمی سلمہم اللہ تعالیٰ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ، میں نے رسالہ جیون کھشا اول سے آخر تک بنظر ما بین الاجمالی والتفصیلی دیکھا، ایسے رسالہ کے مصنف سے اگر بالکل تعلق نہ ہوتا تو مجملاً بھی اپنا خیال ظاہر نہ کرتا کہ تجربہ سے بالکل مفید نہیں، اور اگر بے تکلفی کے درجہ تک تعلق ہوتا تو مفصلاً خیال ظاہر کرتا کہ توقع مفید تام ہونے کی تھی، اب آپ سے تعلق بھی ہے اور بے تکلفی نہیں، اس لئے تفصیلاً تو ظاہر نہیں کرتا، مگر اجمالاً ظاہر کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ سارے رسالہ کا خلاصہ بہائم کی تفضیل انسان پر اور اعتراضات احکام اسلام پر اور پیشوایانِ ہنود کی مدح اور پیشوایان اسلام پر قدح ہے، اس خلاصہ سے ہر شخص کو رائے قائم کرنے میں سہولت ہو سکتی ہے۔ اور گو ہنود پر بھی تعریض کی گئی ہے لیکن دوسرے کے گھر کی ایک کوٹھری گرا دینے سے اپنے گھر کو پورا ڈھا دینے کا تدارک نہیں ہو سکتا ؎

اندکے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم ❊ کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار ست

۲۸ رمضان ۱۳۴۶ھ (تتمۂ خامسہ ص ۵۸۲)

دلیل حل حدیث من باع جلد اضحیۃ الخ برقصد تمول

سوال (۶۷۸) اکثر دستور ہے کہ قربانی کی کھال روپے کے بدلے میں بیچکر تصدق کر دیتے ہیں یا مدارس اسلامیہ میں بھیج دیتے ہیں اور مہتمم بیچکر تصدق کر دیتا ہے۔ نیابۃ للمضحی اور ہدایہ آخر صفحہ ۴۴۸ میں ہے قولہ علیہ السلام من باع جلد اضحیتہ فلا اضحیۃ لہ محشی لکھتا ہے، رواہ الحاکم فی المستدرک فی تفسیر سورۃ الحج ۱۲ اور محشی نے یہ بھی لکھا ہے فاذا تحولت بالبیع وجب التصدق لان ہذا الثمن حصل بفعل مکروہ فیکون خبیثا فیجب التصدق ۱۲ عبارات مذکورہ سے کراہت بیع نکلتی ہے اب یہ امر دریافت طلب ہے کہ اگر جلد اضحیہ کو اس نیت سے روپے کے بدلے فروخت کیا جائے کہ روپیہ کو تصدق کر دیا جائے گا، چنانچہ اسی نیت سے فروخت کرتے ہیں، آیا یہ فروخت کرنا بھی مکروہ ہے مطابق حدیث مذکور، یا مکروہ نہیں، اور جلد کا تصدق اور بیچ کر روپیہ کا تصدق دونوں برابر ہیں، اور اطلاق حدیث کی تقیید کی کیا ضرورت ہے، امید کہ جواب شافی جلدی مرحمت ہو۔

الجواب۔ بہ نیت تصدق ثمن جلد اضحیہ کا بیع کرنا مکروہ نہیں ہے، کما فی العالمگیریۃ ولا یبیعہ بالدراہم لینفق الدراہم علی نفسہ وعیالہ واللحم بمنزلۃ الجلد فی الصحیح حتی لا یبیعہ بما لا ینتفع بہ الا بعد الاستہلاک ولو باعہا بالدراہم لیتصدق بہا جاز لانہ قربۃ کالتصدق کذا فی التبیین ج ۶ ص ۲۰۲، اور فقہاء نے

کسی نے اس کی کراہت کا حکم نہیں کیا، اور جو حاشیہ مشعرہ کراہۃ سوال میں نقل کیا ہے وہ اول تو اس کے متعلق ہی نہیں دیگ کو دوسرے پر قیاس کر کے اس حاشیہ سے استدلال کیا جاوے گا، اور قیاس کرنے کا ہم کو منصب نہیں، دوسرے صحت قیاس کو تسلیم کرنے کے بعد کہا جاتا ہے کہ خود اس عبارت میں استدلال کا جواب موجود ہے، حیث قال فاذا تمولتہ الخ پس اس کی کراہت بیع بقصد تمول کے ثابت ہوتی ہے، نہ کہ بیع بقصد التصدق بالثمن کی، باقی رہی یہ بات کہ عدمِ تقیید کی کیا دلیل ہے، یہ سوال البتہ قابل توجہ ہے، سو اول بطور مقدمہ کے یہ سمجھ لینا چاہئے، کہ کسی نص کو کسی خاص محل پر محمول کرنا جیسا کبھی کسی دلیل جزئی سمعی سے ہوتا ہے، اسی طرح کبھی ذوق اجتہادی سے ہوتا ہے، جو مستفاد و متائید ہوتا ہے قواعد کلیہ شرعیہ سے، مثال اس کی حدیث صحیح ہے لایبولن احدکم فی الماء الراکد مدلول لفظی حدیث کا یہ ہے کہ بول فی الماء الراکد منہی عنہ ہو، اور القاء البول فی الماء، یا التغوط فی الماء منہی عنہ نہ ہو، چنانچہ بعض اہل ظاہر اس طرف گئے بھی ہیں لیکن مجتہدین نے باجمعہم اس کو معلل بالتنظیف سمجھ کر سب صورتوں کو عام کہا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس تعمیم کی کوئی دلیل جزئی نہیں، بجز ذوق اجتہادی کے اور یہی معنی ہیں قول امام ترمذی کے الفقہاء ہم اعلم بمعانی الحدیث اور اس کو تمام علماء وائمہ نے معتبر اور معمول بہ رکھا ہے، جب یہ مقدمہ ممہد ہو چکا تو اب سمجھئے کہ حدیث من باع الخ کا ظاہر گو مطلق ہے مگر فقہاء نے اسی ذوق اجتہادی سے اس کو معلل سمجھا قصد تمول کے ساتھ وحیث لاعلۃ فلا معلول، پس کسی کو فقہاء سے اس میں مزاحمت نہیں پہونچتی اور جن قواعد سے یہ ذوق متائید ہوتا ہے یہ ہیں کہ کسی چیز کی بیع جو منہی عنہ ہوتی ہے، استقراء وتتبع سے اس کے تین سبب ہوتے ہیں، یا تو وہ شے محل بیع کا نہ ہو، جیسے بیع باطل، اور یا باوجود محل بیع ہونے کے کوئی مفسد صلب عقد میں داخل ہو گیا ہو، جیسے بیع فاسد بالشرط الفاسد اور یا کوئی وجہ کراہت باوجود صلب عقد میں داخل نہ ہونے کے خارج سے مقارن ہو گئی ہو، جیسے بیع وقت اذان الجمعہ، اب دیکھنا چاہئے کہ اس بیع سے جو نہی فرمائی ہے ان اسباب ثلثہ میں سے یہاں کون سا سبب پایا جاتا ہے، اول تو یقیناً منتفی ہے کیوں کہ کسی شے کے محل بیع نہ ہونے کا سبب اس شے کا محل تملیک نہ ہونا ہے اس لئے جو محل بیع نہ ہوگی محل ہبہ بھی نہ ہوگی، اور جلد اضحیہ محل ہبہ ہے تو محل بیع بھی ہے اور ثانی کا انتفاء مشاہد ہے، کیونکہ کلام اس صورت میں ہے جب کوئی شرط فاسد نہ ہو، پس ثالث متعین ہوگا، پس اب کوئی وجہ کراہت کی معلوم کرنا چاہئے، سو حدیث لاتنتفعوا الخ، او منہا شیئاً سے تصرف بقصد تمول کا منہی عنہ ہونا صاف معلوم ہوتا ہے، پس یہ مرجح

ہے ما نحن فیہ میں بھی اس کے مدار ہونے کا ، پس حدیث من باع الخ کو اسی پر محمول کرلیا ، اور چونکہ اشیاء
مستہلکہ بھی دراہم کے مثل ہیں توقف الانتفاع علی الاستہلاک میں اس میں بھی اس حکم کو متعدی
کردیا ، یا یہ کہ اس کو بھی لفظ بیع کے عموم میں داخل کرلیا ، بخلاف بدل باقی کے ، کہ اس میں عدم
استہلاک فارق ہے ، اور اس سے استبدال بقصد تمول نہیں ہے ، بلکہ وصف بقاء میں
مثل عین جلد کے ہے ، اس نے اس سے استبدال کرنے کو مثل بقاء عین جلد کے قرار دے کر جائز
قرار دیا گیا ، مگر جب اس کو بیچا جاوے گا پھر اس کے ثمن کا تصدق بھی واجب ہوگا ، فقہاء
نے اس کی تصریح فرمائی ہے ، البتہ جو اس نہی کو خلاف قیاس کہتے ہیں ، ان پر یہ تقریر حجت نہ
ہوگی ، ان کو اس بیع کے باطل کہنے کی گنجائش ہے ، مثل وقف کے ، واللہ اعلم ،

۶ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ (تتمہ ثانیہ ص ۱۹۴)

سوال (۶۷۹) | محرف بودن کسیکہ از خوردن لحم گاؤ منع کند و با حدیث ضعیف استدلال کند | دریں جائے شخصے برطرف ہندوان گردیدہ یک کتاب بنام قول رسول عرف گئو رکھیا تصنیف کردہ است و دراں نوشتہ است کہ بقول پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم خوردن گوشت مادہ گاؤ منع و ناروا است و در حجت ایں حدیث آوردہ است علیکم بالبان البقر وسمنانھا وایاکم ولحومھا فان البانھا وسمنانھا دواء ولحومھا داء ، ودیگر احادیث از جامع صغیر و عدی و مستدرک و کنز العمال وکنوز الحقائق وحیوۃ الحیوان وغیرہ نیز آوردہ است کہ الفاظ آن ہمان طور است کہ نوشتہ شد ودر آن کتاب نوشتہ است کہ ایں حدیث قولی است وحدیث جابر فعلی ست وقولی حدیث از فعلی اقوی است ودیگر نوشتہ است کہ حدیث فعلی بحدیث قولی منسوخ است اکنون عرض است کہ آں حدیث کہ دراں ایں لفظ است کہ ایاکم ولحومھا داء ناسخ است مر حدیث ذبح واکل را یا نہ ؟ وآں احادیث کہ دراں حکم ذبح واکل ست ہم قولی اند یا نہ ؟ وآں حدیث کہ دراں لفظ ایاکم ولحومھا داء ست موافق حکم قرآن ست یا نہ ؟ وبرسازندہ آن کتاب از خوردن گوشت گاؤ منع کردہ است وخوردن گوشت گاؤ را ناروا می گوید شرعاً چہ حکم است ؟

جواب - ایں کس محرف دین است ونسخ فرع تعارض است وتعارض در حکمین شرعیین می باشد احادیث ایاکم الخ اولاً محتاج تصحیح وتحسین سند است ثانیاً آں حکم شرعی نیست حکم طبی است پس جمیع اشکالات مرتفع شد خصوص بعد ارشاد حق تعالیٰ کلوا مما رزقکم اللہ الی قولہ ومن البقر اثنین کہ اقوی از حدیث قولی ست ،

۲۸ جمادی الثانیہ ۱۳۴۶ھ (تتمہ خامسہ ص ۷۷)

جائز بودن اکل شکار کہ از آلات مال حرام الخ

سوال (۶۸۰) ناجائز مال کے ہتھیار یا گولی سے شکار مارا ہوا کھانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب ۔ جائز ہے لیکن گولی میں شرط یہ بھی ہے کہ اُس کو چھری سے ذبح کیا ہو۔
۱۶ ذی قعدہ ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ص ۱۲۳)

فصل فی الصید والعقیقہ

حکم خرگوش کھروار

سوال (۶۸۱) ہمارے اس دریا میں مشہور ہے کہ خرگوش وہی حلال ہے جس کے کھر ہوں، اور یہی بیان کیا جاتا ہے کہ ایسے کھردار خرگوش واقعی ہیں بھی گو ہمارے اس اطراف میں آج تک نظر میں کسی کے نہیں آیا، یہاں جو خرگوش پائے جاتے ہیں، اُن کے پیچے مثل بلی کے پنجوں کے ہیں، دانت مثل چوہے کے دانتوں کے ہیں، ایسے خرگوش حلال ہیں یا کیا؟ تفصیل بیان فرماکر ممنون فرماویں ؟

الجواب ، باوجود حیوٰۃ الحیوان وغیرہا میں تتبع کرنے کے اس تقسیم کرنے کا حکم مختلف نظر سے نہیں گذرا، اور یہ تقسیم ایسی ہو سکتی ہے جیسے مچھلی کی قسمیں مختلف ہیں، مگر ہر مچھلی حلال ہے اسی طرح اگر اس کی بھی مختلف قسمیں ہوں تب بھی ہر قسم حلال ہو سکتی ہے۔

۳ رمحرم ۱۳۵۵ھ (النور ص ۸ شعبان ۱۳۵۵ھ)

رفع شبہ برحلت صید کلب

سوال (۶۸۲) کتے کا لب نجس ہر پھر کتے کا پکڑا ہوا شکار جس کی نجاست بذریعہ دندان ودوران خون کے ساتھ تمام گوشت میں سرایت کر جاتی ہے، کیونکر پاک ہوا، علاوہ ازیں یہ زہریلا جانور ہے جس کا زہر بوسیلۂ دوران دم تمام گوشت میں پہنچ جاتا ہوگا تو اس کا پکڑا ہوا شکار کیونکر حلال ہوگا، حالانکہ زہر حرام ہے۔

الجواب ۔ اگر شبہ کرنے والا مسلمان نہیں تب تو اس وجہ سے جواب لاحاصل ہے کہ کفار سے اصول میں گفتگو ہے فروع میں کیوں تطویل کلام کی جاوے اور اگر وہ مسلمان ہے تو اس کو اتنا جواب کافی ہے کہ دلیل شرعی سے جو امر ثابت ہو ہم کو اس کی لم کی تفتیش اور طبیات ظنیہ بلکہ وہمیہ کے معارضات کا جواب و تطبیق ہم پر ضروری نہیں، یہ جواب تو سائل صاحب کے لئے ہے باقی میں آپ کا انتظار رفع کرنے کے لئے ایک جواب لکھتا ہوں وہ یہ کہ

اس تعلیل میں تامل ہے، کیونکہ یہی دلیل سانپ بچھو کے اور لیورانی کتے وغیرہ کے کاٹنے میں بھی جاری ہے حالانکہ مدعیٰ مختلف ہے نیز اس دلیل سے لازم ہے کہ اس وقت تمام افعال طبعیہ معطل ہو جائیں اور تمام جسم کا انتظام درہم برہم بجز دغش کلیہ موت طاری ہو جاوے حالانکہ یہ خلاف مشاہدہ ہے (نوٹ) یہ عبارت یعنی لفظ "اس تعلیل میں" سے آخر جواب تک تصحیح الاغلاط سے لکھی گئی ہے۔ (امداد، ج ۱ ص ۳)

عدم حل صید از گولی بندوق کردر صید خریدہ بہ گانفدہ وغیر آن

سوال (۶۸۲) بندوق سے شکار کھیلنا کیسا ہے؟

الجواب - جائز ہے، لیکن بدون ذبح کے شکار حلال نہ ہوگا، لانہ یقتل بالثقل لا بالحد، یکم محرم یوم الثلاثا ۱۳۳۲ھ (تتمہ رابعہ ص ۵۹)

ایضاً سوال (۶۸۳) معمولی مروجہ بندوق یعنی چھرہ وگولی سے شکار کرتے ہیں، تسمیہ پڑھ کر شکار کرے، اور ذبح کی مہلت نہ ملے، تو ذبیحہ جائز ہے یا نہیں، یا شق ہونے والی گولی سے شکار مع تسمیہ کے کئے جانے سے شکار بغیر ذبح کئے ہوئے جائز ہو سکتا ہے یا نہیں، کیونکہ اس گولی کے ٹکڑے دھاردار ہوتے ہیں وہ جا کر لگتے ہیں، مگر اندر گولی جا کر پھٹتی ہے، کیونکہ جب کسی چیز سے مس ہوتی ہے تب پھٹتی ہے، بینوا توجروا،

الجواب، لیکن فعل اس گولی کا پھٹنے پر موقوف نہیں، اگر نہ بھی پھٹتی تب بھی قاتل ہوتی، اس لئے اس دھار کی طرف زہوق روح کو منسوب نہ کریں گے، لہذا اس کا شکار بدون ذبح حلال نہ ہوگا، ۲ شوال ۱۳۳۱ھ (حوادث اول ص ۱۳۰)

انتفاع بچرم عقیقہ

سوال (۶۸۴) عقیقہ کی کھال سے بھی مثل قربانی کے عقیقہ کرنے والا خود منتفع ہو سکتا ہے، کہ کوئی چیز بنوا کر اپنے کام میں لاوے یا نہیں؟ اور بعد فروخت کرنے کے قیمت کا صدقہ کر دینا واجب ہے یا نہیں؟

الجواب - چونکہ شرائط واجبہ فی الاضحیہ عقیقہ میں محض مستحب ہیں، اس لئے تصدق بالقیمت بھی مستحب ہوگا اور انتفاع بالجلد کے جواز میں کوئی شبہ نہیں، فقط واللہ اعلم

(امداد ج ۲ ص ۱۱۲)

سوال (۶۸۵) عقیقہ کی کھال کی قیمت کا مصرف کیا ہے اور وہ کھال یا پوست قربانی بعینہ غنی یا بنی ہاشم کو دے سکتے ہیں؟

الجواب، بعینہ غنی و بنی ہاشم کو دینا درست ہے، ۲۴ صفر ۱۳۳۲ھ (تتمہ اولی ص ۱۳۸)

تحقیق شکستن استخوان درعقیقہ **سوال** (۶۸۶) کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ عقیقہ میں ہڈی توڑنا درست ہے یا نہیں، اور اوجھڑی کس کو دی جائے؟ بینوا توجروا۔

الجواب، ہڈی توڑنا جانور عقیقہ کی درست ہے۔ فی رد المحتار وھی شاۃ تصلح للاضحیۃ تذبح للذکر والانثی سواء فرق لحمھا نیا او طبخت بحموضۃ او بدونھا مع کسر عظمھا اولا واتخاذ دعوۃ اولا اھ ج ۵ ص ۲۱۳ اوجھڑی کا کوئی مصرف نہیں جس کو چاہے دے جیسا قربانی میں اختیار ہے فی اشعۃ اللمعات وہرچہ در اضحیہ معتبرست از شرائط احکام در عقیقہ نیز معتبرست ج ۳ ص ۲۹۵ واللہ اعلم (امداد ج ۲ ص ۱۱۸)

حکم عقیقہ گاؤ **سوال** (۶۸۷) گذارش ہے کہ جناب شاہ صاحب ہمارے یہاں ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ عقیقہ گائے کا بھی درست ہے یہ بات اور کبھی کسی عالم نے نہیں کہی، اب عرض کرتا ہوں، اگر لڑکا پیدا ہووے تو دو بکری ذبح نہ کرے ایک گائے ذبح کرے تو عقیقہ درست ہوگا یا نہیں، تحریر فرما کر تسلی فرمادیں، اور یہ بھی عرض کرنا ہے کہ عقیقہ میں بکری ذبح اور گائے ذبح میں سے کون افضل ہے؟

الجواب، گائے کا عقیقہ آثار میں تو منقول دیکھا نہیں گیا، البتہ فقہاء نے گائے میں عقیقہ کا حصہ لینے کو لکھا ہے تو اس کے جواز کا قائل ہونا بھی ضروری ہے۔ کہ گائے کا حصہ بدل ہے شاۃ کا لیکن پوری گائے سے عقیقہ کرنا اس سے فقہاء نے بھی تعرض نہیں کیا، مگر قواعد سے یہ ایسا ہے جیسے سات بکریوں سے عقیقہ کرنا جو ظاہراً سنت سے تجاوز ہے جیسے ظہر کی پانچ رکعت پڑھنا، بہتر یہ ہے کہ اور کسی عالم سے بھی تحقیق کر لیا جاوے۔ ربیع الثانی ۱۳۴۱ھ (تتمہ خامسہ ص ۲۳۵)

سوال (۶۸۸) حضور کے فتاویٰ امداد الفتاویٰ ص ۲۳۵ حصہ خامسہ عقیقہ میں گائے ذبح کرنے کا عدم جواز مستفاد ہوتا ہے اس کی بابت گذارش ہے کہ معجم طبرانی صغیر ص ۵۸ میں حدیث ذیل مذکور ہے، حدثنا ابراھیم بن احمد بن مروان الواسطی ثنا عبد الملک بن معروف الخیاط الواسطی ثنا مسعدۃ بن الیسع عن حریث بن السائب عن الحسن عن انس بن مالک قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ولد لہ غلام فلیعق عنہ من الابل او البقر او الغنم، حدیث کے بعض رواۃ مجروح ہیں، لیکن طبرانی اس کی تخریج میں متفرد نہیں ہیں، بلکہ ابو الشیخ نے بھی اس کو روایت کیا ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی اسناد کے رجال کون لوگ ہیں، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس حدیث کا حوالہ دیا ہے اور کوئی جرح نہیں کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے

کہ ان کے نزدیک کم از کم حسن ہے (کما یظہر من مقدمۃ الفتح)

اس کے علاوہ ابن حجر نے جمہور کا مذہب یہ بیان کیا ہے کہ ذبح بقر عقیقہ میں جائز ہے،
(فتح الباری مصری باب العقیقہ ج ۵)

الجواب : میں نے اپنے جواب کی عبارت دیکھی اس میں حکم عدم جواز جزماً کے عنوان سے نہیں ہے، بلکہ سنت کے تجاوز ہونے کے عنوان سے ہے، جو جواز مع الکراہت کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے، اور تشبیہ خمس رکعات کی ساتھ نفس تجاوز میں ہے، نہ کہ عدم جواز میں، پھر اس میں بھی ظاہراً کی قید ہے، پھر اس کے قواعد ظنیہ پر اور عدم نقل پر مبنی ہونے کی تصریح ہے، نیز دوسرے علماء سے مراجعت کے مشورہ کی بھی تصریح ہے، ان تصریحات کے بعد عبارت مذکورہ سوال کا ان تصریحات کے خلاف کے لئے موہم ہونا ظاہر ہے، سوال کی عبارت یوں مناسب تھی کہ جواب میں تردد فی الکراہۃ کی بنا، عدم روایت نقل معلوم ہوتی ہے، ایک نقل نظر سے گذری ہے، اگر یہ رفع تردد کے لئے کافی ہو غور کر لیا جاوے، اب سوال کو اسی طرح فرض کر کے جواب دیتا ہوں، کہ واقعی تردد مذکور کی بنا، عدم رویت نقل ہے اور اسی ضرورت سے قواعد سے استنباط کیا گیا، اب اس نقل کے بعد تردد سے پوری گائے یا اونٹ کے ذبح کے جواز بلا کراہت کے جزم کی طرف رجوع کرتا ہوں، جیسا ظاہر روایت مذکورہ سوال سے متبادر ہے، گو یہ احتمال اب بھی باقی ہے کہ من تبعیضیہ ہو اور غنم سے تعلق من کا تغلیباً ہو اور کل غنم کا جواز دوسرے دلائل سے ثابت ہو، مگر چونکہ کوئی قول اس کے مساعد منقول نہیں ہے اس لئے یہ احتمال مضر نہیں واللہ اعلم۔

(۴ ربیع الاول ۱۳۴۹ھ (النور ص ۵ جمادی الاخری ۱۳۵۱ھ)

السوال (۶۸۹) تتمہ خامسہ امداد الفتاوی ص ۲۳ ، گائے کا عقیقہ آثار میں تو منقول دیکھا نہیں گیا الخ مولوی حمید اللہ غیر مقلد نے رسالہ خطبات التوحید کے صفحہ ۱۳۶ میں یوں لکھ رہے ہیں،

" اور انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایک حدیث میں مرفوعاً یوں لکھی ہے کہ عقیقہ میں اونٹ یا گائے وغیرہ بھی ذبح کرنا درست ہے نیل الاوطار جلد ۴ ص ۳۴، میرے پاس نیل الاوطار نہیں ہے اور نہ کہیں سے مل سکی۔

الجواب - نیل الاوطار کتاب العقیقہ کے فائدہ مذکورہ اخیر میں اس باب میں ایک اختلاف نقل کر کے کہا ہے، والجمہور علی اجزاء البقر والغنم ویدل علیہ ما عند الطبرانی وابی الشیخ

من حدیث انس مرفوعا بلفظ یعق عنہ من الابل والبقر والغنم اھ

اس کے بعد اس میں اختلاف نقل کیا ہے، کہ گائے، اونٹ کامل شرط ہے، قالہ احمد یا اشتراک سبعہ یا عشرہ کا بھی جائز ہے لیکن حدیث کی سند کی تحقیق نہیں کی گئی، مگر بعض مجتہدین کی تلقی بالقبول ثبوت حدیث کا کافی قرینہ ہے۔ واللہ اعلم پس میرا قول کہ آثار میں منقول نہیں دیکھا گیا، مرجوع عنہ ہے،

۱۸ رمضان ۵۵ھ (النور ص ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۷ھ)

تملک سمک بأخذ و نہی از منع دیگران،

سوال (۶۹۰) تالاب کا پانی چند شخصوں نے مول لیا، اس میں مچھلی نکلی سبھوں نے تقسیم کرلیا، اگر کوئی شخص اپنے حصہ میں سے کسی کو مچھلی بھیجدے، تو اس کا کھانا جائز ہے کہ نہیں؟

الجواب، جائز ہے کیوں کہ قبضہ کرنے سے ملک ہوگئی، البتہ پکڑنے سے دوسروں کو روکنا جائز نہ تھا۔

۱۵ ذی الحجہ ۱۳۲۵ھ (امداد، جلد ۲، صفحہ ۱۸۵)

عقیقہ بزائد از منقول

سوال (۶۹۱) کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ عقیقہ میں ایک یا دو گائے یا زیادہ ذبح کرنا کیسا ہے،

الجواب کہیں جزئیہ تو نظر سے نہیں گذرا لیکن قواعد سے یہ زیادت غیر مشروع معلوم ہوتی ہے، کیونکہ یہ زیادت منصوص تو ہے نہیں اور قیاس سے دو وجہ سے جائز نہیں کہہ سکتے ایک تو اس لئے کہ ہم لوگ قیاس کے اہل نہیں، دوسرے اس لئے کہ اراقت دم قربت غیر معقولہ ہے اور غیر معقول محل قیاس نہیں۔

۲۱ صفر ۱۳۳۳ھ (تتمہ ثالثہ ص ۱۹) (ص ۶۶۹)

جلد سوم تمام شد

فہرست کتب

مطبوعات ادارہ تالیفات اولیا دیوبند یوپی

•

یکم جنوری ۱۹۸۰ء سے ادارہ تالیفات اولیا دیوبند کی کتابوں کی قیمتیں

اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کا بہترین نمونہ تالیف حضرت علامہ ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب خلیفہ حکیم الامت حضرت تھانوی رح فوٹو آفسیٹ پر عمدہ طباعت اور خوشنما جلد کے ساتھ -/۴۵ روپے

المرشد الامین خلاصہ احیاء العلوم مکمل یہ کتاب حضرت امام غزالی رح کی مخصوص اور آخری تصنیف ہے۔ اپنی کتاب احیاء العلوم مکمل کا خلاصہ اور نچوڑ خود انھوں نے آخری عمر میں فرمایا ہے۔ شروع کتاب میں امام غزالی رح کی مکمل سوانح حیات بھی شامل ہے۔ طباعت عمدہ فوٹو آفسیٹ جلد خوشنما قیمت -/۳۰ روپے۔

سیرت رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم و مکاتیب خاتم النبیین یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک پر ایک جامع اور مختصر کتاب حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اور مولانا مقصود احمد صاحب جالندھری، فوٹو آفسیٹ پر جلد خوشنما ریگزین جلد ہدیہ۔

امداد الفتاویٰ جدید جلد اول لیتھو۔

امداد الفتاویٰ جلد دوم لیتھو۔

امداد الفتاویٰ جلد ۳ فوٹو آفسٹ

امداد الفتاویٰ جلد ۴ فوٹو آفسٹ مجلد

امداد الفتاوی جلد ۵ فوٹو آفسٹ مجلد ۳۶/- روپے

امداد الفتاوی جلد ۶ " " ۳۰/- روپے

صداقت اسلام غیر مسلموں کے اسلام لانے کے عجیب و غریب داستان اولیاء اللہ اور بزرگان دین کی بہترین حکایات مجلد قیمت ۱۱/- روپے

مجربات عزیزیہ تعویزات اور عملیات کا بہترین مجموعہ
مولفہ حضرت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی قیمت مجلد ۱۰/۵۰ روپے

برکات الصالحین بزرگان دین اور اولیاء کرام کی حکایات
مولفہ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب بلند شہری قیمت مجلد ۱۰/- روپے

میزان الحقوق اسلامی حقوق اور معاملات کی بہترین کتاب
مصنفہ حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب جگن پوری قیمت ۴/۵۰ روپے

اصلاح فاتحہ اسلام میں ایصال ثواب و نیاز فاتحہ کی حیثیت کیا ہے۔ اس کے کرنے کا صحیح طریقہ۔ قیمت ۴/۵۰ روپے

جزاء الاعمال حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی ۳/- روپے

مردوں کی نماز کامل اور ضروری مسائل قیمت ۳/- روپے

عورتوں کی نماز کامل اور ضروری مسائل " ۳/- "

ہماری مصیبتوں کے اسباب اور ان کا علاج " ۳/- "

معرفت الٰہیہ اللہ تعالیٰ کے پہچاننے کے طریقوں کو مختلف انداز سے حضرت مولانا شاہ عبد الغنی صاحب پھولپوری نے تفصیل سے پیش فرمایا ہے۔ قیمت مجلد ۳۰/- روپے

تربیت السالک حضرت تھانوی کے مواعظ و ملفوظات کا ایک مجموعہ
جلد اول، دوم مجلد قیمت ۸۰/- روپے